اول
گفتنی
نثر نگاروں کا تذکرہ
سلطانہ مہر

شریکِ گفتنی اوّل

الہ آباد میں مسجد خلد آباد گردوارے کے پاس تھی۔ سید محمد حسن آٹھویں جماعت کے طالب تھے۔ عمر ہوگی بارہ تیرہ سال۔ حسن باقاعدہ پانچوں وقت مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تھے چاہے کرفیو ہو یا ملٹری کا پہرہ۔ مسجد میں ہفتے میں دو بار نعتیہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ ان کا ترنم عمدہ تھا لہٰذا نعتیں پڑھتے تھے۔ یہیں سے شعروشاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ نعتیں کہنے کی کوشش بھی کی۔ ان کی اس کم سنی میں کہی ہوئی ایک نعت کا مقطع ملاحظہ ہو۔

حسنؔ کردہ گناہوں پر نہ مضطر، نہ غم گیں
خطائیں بخشوانے صاحبِ اسرار آتے ہیں

مگر اگلے چند سالوں میں حالات تبدیل ہوئے تو انہیں الہ آباد چھوڑنا پڑا۔ جامعہ کراچی سے کیمسٹری میں بی ایس سی کرنے کے بعد 1960ء میں امریکا آگئے۔ کیلی فورنیا کی U.C.L.A سے اور U.S.O سے کیمسٹری اور کیمیکل انجینئرنگ میں پسند اسناد لیں۔ دورانِ تعلیم 1962ء میں انہیں جو پہلی ملازمت ملی وہ ان کے اپنے فیلڈ سے متعلق تھی۔ سید حسن کا ذہن تخلیقی تھا انہوں نے ملازمت پر ہی تکیہ نہیں کیا بلکہ اپنی صلاحیتوں کو بھی آزمایا۔ نئے فارمولے ایجاد کیے اور نئے کیمیکل ڈیولپ کر کے اپنی حیثیت اپنی کمپنی میں منوائی۔ خوش نصیبی محنت کرنے والوں کے دامن کو نہیں چھوڑتی چنانچہ انہوں نے 63ء کے آخر اور 64ء کے اوائل میں اپنی ذاتی کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ چالیس کے قریب کیمیکلز ان کے ایجاد کردہ ہیں جو امریکا میں مقبول ہیں اور انڈسٹری کی بیٹیری اشیا کی تیاری میں بنیادی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ 1956ء میں رشیدہ بیگم سے ان کی شادی ہوئی۔ شریکِ حیات کے سلیقے نے ان کی زندگی کو اور بھی نکھارا۔ فرحت، خالد، رفعت، نصرت، سعیدہ اور طارق ان کے گلشن کے پھول ہیں۔

سید حسن کی کاروباری دنیا سے ہٹ کر ان کی زندگی کے کئی دوسرے پہلو بھی ہیں اور وہ بھی اتنے ہی شاندار اور قابلِ تحسین ہیں۔ 1972ء میں انہوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے پاکستانی امریکن فرینڈ شپ لیگ قائم کی۔ یہ پہلے پاکستانی تھے جو چیئرمین بورڈ آف ٹرسٹیز منتخب ہوئے۔ 1979ء سے اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی میں 1996ء تک ڈائرکٹر رہے۔ لاس اینجلس میں "سٹی ٹیریس" میں پہلی مسجد تھی جو اسلامک سینٹر ڈاؤن ٹاؤن کی چھوٹی سی پہلی شاخ تھی اور یہ سید حسن جیسے لوگوں کی محنت، لگن، خلوص و قربانی کا نتیجہ ہے کہ اب یہاں ایک سو دس مساجد ہیں۔ کیلی فورنیا کی آبادی تقریباً 1,2000000 ہے جس میں تیس فیصد افریقن امریکن ہیں۔ ان میں فور ہنڈریڈ تھاؤزنڈ (400,000) افریقن امریکن نومسلم ہیں۔ یہ انہی لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے جنہوں نے خود کو صرف اپنے لیے زندہ نہیں رکھا بلکہ علم و اخوت کی شمع بھی جلائے رکھی۔ ان میں سے ایک اہم نام سید محمد حسن کا ہے۔ اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (Isna) کا ہر سال مختلف شہروں اور ریاستوں میں اجتماع ہوتا ہے۔ سید محمد حسن اس کے پرانے اور مقبول ممبر ہیں۔ اس پانچ روزہ اجتماع میں 99ء میں تیس ہزار مسلموں نے شرکت کی۔ سید محمد حسن کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ ان کی ادبی خدمات اس کے علاوہ ہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے ہیں مگر جب طبیعت رواں ہوتی ہے۔ اپنے گھر شعری محفلیں بھی منعقد کرتے ہیں اور ادبی و سماجی اداروں کے ساتھ دامے درمے قدمے سخنے تعاون بھی کرتے ہیں۔

زیرِ مطالعہ کتاب "گفتنی" جناب سید محمد حسن کے تعاون سے شائع کی جا رہی ہے۔

گفتنی

حصّہ اوّل

نثر نگاروں کا تذکرہ

تصنیف و تالیف : سلطانہ مہرؔ

مہر بک فاؤنڈیشن

لاس اینجلس، ریاست ہائے متحدہ امریکہ

MEHER BOOK FOUNDATION

20873 East Walnut Canyon Road.

Walnut, CA 91789 U.S.A

Ph: (909)444-0065 - Fax: (909)444-0077

نام کتاب گفتنی اوّل

مؤلفہ و مصنفہ سلطانہ مہر

سن اشاعت 2000ء

ناشر مہر بک فاؤنڈیشن پاکستان و امریکا

کمپوزنگ حروف ساز، کراچی۔ اور دنیائے ادب کراچی

تزئین سیّد اظہر عباس جعفری

طباعت ذکی سنز۔ آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ فون: 2636611

قیمت 400 روپے پاکستان میں۔ $20 امریکی ڈالر۔

Add: **MEHER BOOK FOUNDATION**
20873 East Walnut Canyon Road
Walnut, CA 91789, U.S.A
Ph:(909) 444-0065-Fax:(909) 444-0077
E-mail: REHAN@aol.com

محترمہ قرۃ العین حیدر کے نام

ان سے ملاقات میری زندگی کے یادگار لمحے ہیں

سلطانہ مہر

ترتیب

ا

ب

پ

ت

ث

ج

چ

”سخن ور“ کے بعد

گفتنی

سلطانہ مہر محنت کار گزار، محنتی اور ہنرمند خاتون ہیں۔ جس کام پر لگتی ہیں اسے پوری تن دہی سے کرتی ہیں۔ قدرت نے انہیں سلیقہ بھی دیا ہے اور سوجھ بوجھ بھی۔ باتیں ایسے کرتی ہیں کہ سننے والا قائل ہو کر ان کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ چلتی بھی تیز ہیں، سوچتی بھی تیز ہیں اور لکھتی بھی تیز ہیں۔ صحافتی تربیت نے انہیں جلد کام نمٹانے کا ایسا ہنر دیا ہے کہ اب تک ان کی متعدد تصانیف شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں جن میں ناول افسانے بھی ہیں اور تالیفات بھی۔ ”سخن ور“ کے نام سے جو ”تذکرہ“ انہوں نے لکھا تھا اس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور چوتھی زیرِ طبع ہے۔ یہ تذکرہ ملک اور بیرون ملک شعرا و شاعرات کا ایسا تذکرہ ہے جس میں بزرگ اور مشہور شعرا کے ساتھ نئے شعرا بھی شامل ہیں۔ اس تذکرے کی تین جلدوں کی اشاعت کے بعد انہیں خیال آیا کہ اب ایسا ہی تذکرہ نثرنگاروں کا بھی مرتب کیا جائے جس میں ”سخن ور“ کی طرح پاکستان، ہندوستان اور بیرون ملک کے نئے اور پرانے نثر نگار زیادہ سے زیادہ تعداد میں شامل ہو سکیں۔ زیرِ نظر کتاب اسی خیال کی عملی صورت ہے۔ میں نے اس تذکرے کا مسودہ دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ بھی ویسا ہی مفید اور اچھا کام ہے جیسا تذکرہ شعرا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے کم و بیش متعدد نثرنگاروں کے انٹرویو لے کر ان کے مزاج اور اندازِ فکر کو اپنی تحریر میں سمو دیا ہے۔ وہ لوگ جو اردو زبان کے قابلِ ذکر اور نامور نثرنگاروں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں یہ تذکرہ نہ صرف ان کے لیے مفید ہوگا بلکہ اہلِ علم، اساتذہ و طلبہ بھی اس کے مطالعے سے مستفید ہوں گے۔

میں اس کتاب کی تالیف و اشاعت پر سلطانہ مہر کو مبارک باد دیتا ہوں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

۲۸-۴-۲۰۰۰ء

سلطانہ مہر

(ایک شخصیت۔ ایک ادارہ)

حمایت علی شاعر

اردو ادب کی تاریخ میں تین نام ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں۔ تینوں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تینوں اپنی مادری زبانوں اور آبائی تہذیبوں کے لحاظ سے مختلف پس منظر رکھتے ہیں مگر اردو زبان و ادب پر ان تینوں کا احسان کم و بیش یکساں ہے۔

منشی نول کشور، محمد طفیل اور سلطانہ مہر --- ہندی، پنجابی اور گجراتی، ویسے اردو پر زیادہ بڑے احسانات انہیں کے ہیں جن کی مادری زبانیں کچھ اور رہی ہیں۔

منشی نول کشور کے بارے میں سبھی جانتے ہیں۔ اردو کا شعری ادب عالیہ ان ہی کے دم سے محفوظ رہا۔ انہوں نے شعراء کے کلیات سے لے کر بیشتر اسلامی کتب حتیٰ کہ قرآن کریم کی تفاسیر تک بہت ہی پاکیزگی اور نہایت ہی احترام کے ساتھ اپنے پریس سے شائع کیں اور یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا۔

محمد طفیل نے پاکستان میں "نقوش" کے نام سے جو رسالہ جاری کیا۔ اس کے ادبی، علمی، مذہبی اور تحقیقی نمبر تاریخ ادب کا ایسا سرمایہ ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ طالبان علم و ادب صدیوں ان نمبروں سے فیض حاصل کرتے رہیں گے۔

سلطانہ مہر بنیادی طور پر شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے خوبصورت ناول بھی لکھے ہیں اور صحافت کی دنیا میں بھی عرصے تک خدمات انجام دیں لیکن اب ان کی ایک نئی پہچان متعین ہوئی ہے۔ تذکرہ نگاری، ان کتابوں نے انہیں متذکرہ بالا شخصیتوں کی صف میں کھڑا کردیا ہے۔ وہ بھی ایک تاریخی کارنامہ انجام دے رہی ہیں۔

سلطانہ مہر نے اب تک تقریباً" ساڑھے چار سو شاعروں اور شاعرات کا احوال (ان کے نظریات اور منتخب کلام کے ساتھ) اپنی پانچ کتابوں میں یکجا کردیا ہے۔ ان میں بے شمار اہل قلم وہ ہیں جو بسلسلہ روزگار دوسرے ملکوں میں قیام پذیر ہیں یا تقسیم ہند اور تقسیم پاکستان کے نتیجے میں غیر ممالک میں

مستقلاً" آباد ہو گئے ہیں۔ وہ خود بھی امریکہ میں رہتی ہیں اور اپنا کام کئے جارہی ہیں۔
علم و ادب کی تشنگی بھی عجیب ہوتی ہے' بقول شاعر۔

ہر شعر طلب کرتا ہے خون رگ جاں اور

جس کام کا آغاز انہوں نے پاکستان میں کیا تھا' اس کی تکمیل وہاں ہو رہی ہے۔ "سخن ور" کی چار ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک کتاب "آج کی شاعرات" پر تھی اور اب "گفتنی" کے نام سے نثرنگاروں کی پہلی جلد آرہی ہے' اس میں تقریباً" سو ادیب شامل ہیں جن میں نقاد' محقق' ماہر لسانیات' افسانہ نگار' ناول نویس' ڈراما نگار' صحافی غرض ہر صنف نثر کے اہل قلم موجود ہیں۔ اس کتاب میں بھی پاک و ہند کے علاوہ بیشتر وہ لوگ ہیں جو بیرونی ملکوں میں رہ کر ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ تذکرہ نگاری کے ساتھ سلطانہ مہر اپنی تخلیقات کی طرف بھی متوجہ ہیں۔ امریکہ میں انہوں نے جو شاعری کی' وہ بھی "حرف معتبر" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ سنا ہے کہ اب افسانوں کا مجموعہ آنے والا ہے اور کوئی ناول بھی زیر تحریر ہے۔

کبھی کبھی تو مجھے گمان ہوتا ہے کہ سلطانہ مہر میں کوئی "دیوی" سما گئی ہے۔ وہ ہمارے ادب کی لکشمی ہی نہیں سرسوتی اور پاربتی بھی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی متنوع اور مسلسل ادبی خدمات کی بنا پر سید ضمیر جعفری نے انہیں "عورتوں کی شبلی نعمانی" کہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ضمیر بھائی نے یہ بات ازراہ مذاق کہی ہو گی مگر سلطانہ مہر کے بعض "کرم فرماؤں" کو اس میں تمسخر کا پہلو دکھائی دیا۔ کسی نے کہا۔

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

ٹھیک ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کا مقام بہت بلند ہے۔ سیرت النبی ہو کہ شعر العجم' ان کی کسی علمی' ادبی' مذہبی اور تاریخی تصنیف سے ہمارے عہد کے کسی مصنف کی' کسی کتاب کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ عبدالسلام ندوی کی "شعر الہند" سے بھی سلطانہ مہر کی کسی کتاب کو تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ یہ انداز فکر ہی مناسب نہیں ہے۔ ضمیر بھائی نے اپنی شگفتہ مزاجی کے سبب اس انداز میں سلطانہ مہر کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ ایسی تحریر کے بارے میں اس طرح سوچنا اپنی "ذہنی سطح" کا مظاہرہ کرنا ہے۔

سلطانہ مہر کی اب تک 16 کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں 8 تصانیف ہیں اور 8 تالیفات اور ابھی یہ کام جاری ہے۔ جہاں تک تذکرہ نگاری کی بات ہے تو اس کی افادیت کے سبھی معترف ہیں۔ میر تقی میر کی "نکات الشعراء" سے لے کر عبدالغفور نساخ کے "سخن شعراء" تک تقریباً 50 تذکرے ہیں جن کی روشنی میں محمد حسین آزاد کی "آب حیات" اور "اردو ادب کی تواریخ" مرتب ہوئی ہیں۔ پھر علاقائی تذکرے ہیں جن سے اردو زبان کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چند نام یاد آرہے

ہیں۔ نئی نسل کی خاطر لکھے دیتا ہوں۔ محبوب الزمن عرف تذکرہ شعرائے دکن (عبدالجبار ملکاپوری) دکن میں اردو (نصیر الدین ہاشمی) پنجاب میں اردو (محمود شیرانی) بنگال میں اردو (وفا راشدی) سرحد میں اردو (فارغ بخاری) بلوچستان میں اردو (انعام الحق کوثر) سندھ میں اردو (نبی بخش بلوچ) کشمیر میں اردو (حبیب کیفی) تامل ناڈو میں اردو (علیم صبا نویدی) مغربی بنگال میں اردو (شانتی رنجن بھٹا چاریہ) اڑیسہ میں اردو اور آب خضر (کرامت علی کرامت) مسلم شعرائے بہار (سید احمد اللہ ندوی) دکنی ہندو اور اردو (نصیر الدین ہاشمی) اور آثار الشعرائے ہنود (دیبی پرشاد بشاش) اور محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' وغیرہ۔ ان کے علاوہ شہروں کے حوالے سے بھی تذکرے لکھے گئے ہیں۔ (پاکستان میں) ملتان میں اردو (طاہر تونسوی) بہاولپور میں اردو (مسعود حسن شہاب) اور (ہندوستان میں) حیدر آباد کے شاعر۔ حصہ اول (حمید الدین شاہد) حیدر آباد کے شاعر۔ حصہ دوم (سلیمان اریب) اور حیدر آباد کے ادیب (زینت ساجدہ) وغیرہ۔

کچھ تذکرے غیر ممالک میں لکھے گئے مثلاً ''تذکرہ شعرائے حجاز اور جنوبی افریقہ کے اردو شاعر (امداد صابری) مشرقِ وسطیٰ میں اردو (قمر حیدر قمر) جس میں سعودی عرب 'متحدہ عرب امارات' قطر' بحرین اور عمان کے اہل قلم کا ذکر ہے اور ''دھوپ کے شاعر'' (باقی احمد پوری) جس میں کویت میں آباد شعراء کا تذکرہ ہے۔

ان تمام تذکرہ نگاروں میں صرف ایک خاتون نظر آتی ہیں اور وہ بھی ہندوستانی ہیں۔ ویسے ہندوستان میں فہمیدہ بیگم اور سیدہ جعفر کے نام بھی تحقیقی کتب کی فہرست میں نمایاں ہیں مگر پاکستان میں ''غزل نما'' کی حد تک ادا جعفری کا نام لیا جا سکتا ہے ورنہ سلطانہ مہر کے سوا دور دور تک کوئی نہیں ہے۔

سلطانہ مہر کے تذکروں کی اہمیت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ آزادی سے پہلے برصغیر پاک و ہند میں لالہ سری رام ایک ضخیم تذکرہ ''خم خانہ جاوید'' کے نام سے مرتب کر رہے تھے۔ اس کی تین ہی جلدیں چھپی تھیں کہ بوجوہ یہ کام ادھورا رہ گیا۔ کچھ عرصے بعد اردو زبان اور مرزا غالب کے شیدائی ایک بڑے محقق مالک رام نے ''تذکرہ معاصرین'' لکھنا شروع کیا۔ جب وہ تیسری جلد مرتب کر رہے تھے تو بقول مشفق خواجہ

''یہاں سراج الدین ظفر' سید محمد جعفری' تحسین سروری اور بعض شعراء کا انتقال ہو گیا۔ دہلی سے مالک رام نے ان مرحومین کے حالات طلب کئے۔ ان کے بارے میں سلطانہ مہر کے مضامین کے سوا کچھ نہیں ملا۔ یہی میں نے مالک رام صاحب کو بھیج دیئے۔ ان مضامین سے انہوں نے اپنی کتاب ''تذکرہ معاصرین'' میں خاصہ استفادہ کیا ہے۔''

سلطانہ مہر پاکستان کی واحد خاتون ہیں جو یہ تاریخی کارنامہ تن تنہا انجام دے رہی ہیں۔ ان کی ہر کتاب' مستقبل کی ادبی تاریخ کا ماخذ ہوگی۔ یہ کام ان کی شخصیت کو منفرد ہی نہیں معتبر بھی بنا چکا

ہے۔

"گفتنی" میں شامل ادیبوں کو بھی انہوں نے سوالنامے بھیجے اور ان کے جوابات کی روشنی میں یہ تذکرہ تیار کیا۔ حالات زندگی اور ان کے کارناموں کے ساتھ وہ اپنے اہل قلم کا نقطہ نگاہ بھی ہم تک پہنچاتی ہیں جس کی بنا پر ہمیں اس مخصوص شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ خاص طور پر وہ اہل قلم جو غیر ملکوں میں آباد ہیں اور جن کی تخلیقات کم کم نظر سے گزرتی ہیں۔

"گفتنی" میں کتنے ہی ایسے ادیب ہیں جن کے بارے میں قارئین جاننا چاہتے ہیں' جو اپنی ذات میں ایک "مکتب فکر" بن چکے ہیں جنہیں "عہد آفریں" کہا جا سکتا ہے' جو اپنے اسالیب کی بنا پر بھی منفرد اور یگانہ ہیں۔

میں تین شخصیتوں کا بطور خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اس کتاب کے بزرگ ترین ادیب ہی نہیں' اپنی خدمات کے اعتبار سے بھی اوروں سے مختلف ہیں۔

1- لطف اللہ خاں تاریخ ولادت (25 ستمبر 1916ء)

2- شان الحق حقی تاریخ ولادت (15 ستمبر 1917ء)

3 -رالف رسل تاریخ ولادت (1918ء)

لطف اللہ خاں کسی دور میں افسانہ نگار بھی تھے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ 1943ء میں شائع ہو چکا ہے۔ آج کل وہ موسیقی پر ایک کتاب لکھنے میں مصروف ہیں۔ ادب و فن کی اس خدمت سے قطع نظر وہ ایک بہت بڑا کام بھی کر رہے ہیں۔ سلطانہ مہر نے تو یقیناً" بہت تفصیل سے لکھا ہو گا۔ میں اپنی معلومات کے مطابق مختصراً" یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جو کام اکادمیوں اور بڑے اداروں کے ہوتے ہیں وہ "محدود وسائل کے باوجود" اپنے بل پر کر رہے ہیں۔

انہوں نے تین ہزار پانچ سو سے زیادہ Transparencies اور فوٹو گرافی کی ایک لائبریری بنائی ہے جو مختلف علوم و فنون کی بڑی شخصیتوں پر مشتمل ہے۔ ان کی ایک آڈیو لائبریری بھی ہے جس میں لاتعداد مشاہیر (ادیبوں' شاعروں' فنکاروں' سیاست دانوں اور موسیقاروں وغیرہ) کی آوازیں محفوظ کی گئی ہیں' جن میں جوش صاحب کی آواز میں ان کی تین سو رباعیاں اور فیض صاحب کی آواز میں ان کا پورا کلام ہے۔ لطف اللہ خاں صاحب نے عالمی امن کے موضوع پر میری طویل افسانوی نظم "بنگال سے کوریا تک" کو بھی میری آواز میں ریکارڈ کر رکھا ہے۔ اس نظم کے پاکستان و ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کے علاوہ انگریزی میں بھی دو ترجمے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

1- Flower in Flames (ترجمہ نگار) پروفیسر راجندر سنگھ ورما۔ (پٹیالہ)

2- Floute and Bugle (ترجمہ نگار) پرکاش چندر ریذیڈنٹ ایڈیٹر "ٹائمز آف انڈیا" (لکھنؤ)

لطف اللہ خاں کے بارے میں حفیظ جالندھری اور فیض احمد فیض کے منظوم تاثرات بھی قابل مطالعہ ہیں۔

اے ہنر پرور، ہنرور دوست اے لطف اللہ خاں
تیرا ہر اک نقش صورت اور معنی ہے جواں

اسی طرح مشتاق احمد یوسفی اور دوسرے اہل قلم نے بھی نثر میں اپنے تاثرات لکھے ہیں۔

نثر نگاروں میں دوسری بزرگ ترین شخصیت ڈاکٹر شان الحق حقی کی ہے۔ حقی صاحب شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی (یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "شاخسانے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔) نقاد بھی ہیں اور محقق بھی۔ ماہر لسانیات بھی ہیں اور ترجمہ نگار بھی۔ میں ان کے لسانی اجتہاد اور تراجم کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ حقی صاحب کا ایک شعری مجموعہ "جواہر مالا" کے نام سے بھی آنے والا ہے۔ اسے بھی کم لوگ جانتے ہیں۔ اس کتاب میں ان کا وہ کلام ہے جو "لسانی چھوت چھات" سے پاک ہے۔ انہوں نے اردو کو صرف "اردو" کے طور پر برتا ہے۔ فارسی اور عربی کی "برہمنیت" سے گریز کرتے ہوئے حرف عطف اور اضافتوں کا استعمال "کشادہ فکری" سے کیا ہے۔ لب سڑک، دن بہ دن، برس ہا برس، موسم برسات، رنگ و روپ اور ایسے تمام الفاظ جو ہماری شاعری میں "شجر ممنوعہ" رہے ہیں حقی صاحب نے بلا تکلف استعمال کئے ہیں اور نئے دور کیلئے امکانات کا دروازہ کھول دیا ہے۔ جواز یہ ہے کہ جو لفظ اردو میں آگیا وہ "اردو" ہو گیا۔ اس کے تلفظ اور معنی پر "زبانی اصرار" بے معنی ہے۔ ایسے کئی الفاظ ہیں جو فارسی یا عربی سے اردو میں آکر اپنا تلفظ اور اپنے معنی تک بدل چکے ہیں۔ اس لئے ضروری نہیں ان کی "اصل" کو ملحوظ رکھا جائے۔ حقی صاحب حیدر آباد دکن کے جی ایم خاں (ایڈیٹر "ہندوستانی ادب") کی "املا نویسی" میں بھی ان کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں اکثر حقی صاحب سے گفتگو کی ہے اور ذاتی طور پر خود بھی اردو کی "فردیت" کا قائل ہوں۔ ہماری گرامر بھی فارسی اور عربی سے مختلف ہے۔ اگر "املا" بھی مختلف ہو جائے تو ایک دن وہی "معتبر" ہو جائے گا۔ جی ایم خاں صاحب اس بات کے حامی تھے کہ "جیسا کہا جائے ویسا لکھا جائے" مثلاً "خواب" کہتے میں ہم "و" ادا نہیں کرتے، اس لئے اسے "خاب" لکھا جائے۔ "ہندوستانی ادب" میں وہ یہی املا شائع کرتے تھے۔ بہر حال یہ ایک بحث طلب موضوع ہے۔

تراجم کے اعتبار سے حقی صاحب نے دو بڑے کام کئے۔ میں ان کاموں کو ان کا "کارنامہ" کہتا ہوں۔ اور وہ ہے "ارتھ شاستر" اور "بھگوت گیتا" کا اردو میں ترجمہ۔ پاکستان میں شان الحق حقی صاحب کے علاوہ صرف دو اہل قلم ایسے ہیں جنہوں نے دو قابل قدر کام کئے ہیں۔ ایک قمر ہاشمی (مرحوم) جنہوں نے مہاتما گوتم بدھ کی زندگی اور ان کی تعلیمات کے بارے میں ایک طویل نظم لکھی اور اس طرح دوسرے مذہب کی بڑی شخصیت کا احترام کیا۔ دوسرے نور احمد میرٹھی ہیں جنہوں نے

ہندو شعراء کی نعتوں کے مجموعے شائع کئے۔ ایک "نور سخن" کے نام سے اور دوسرا "بہر زباں، بہر زماں" جو 365 ہندو شعراء کی نعتوں اور ان کے حالات زندگی سے مزین ایک ہزار سے زائد صفحات پر محیط ہے۔ ابھی حال میں طاہر سلطانی کا مرتب کردہ غیر مسلم شعراء کا حمدیہ کلام "اذان دیر" کے نام سے آیا ہے جس میں خدا کی وحدانیت کا تصور نمایاں ہے۔ گویا "اوم" اور اللہ" میں کوئی فرق نہیں۔

حقی صاحب نے ڈھائی ہزار سال پہلے کی اہم ترین سیاسی کتاب "ارتھ شاستر" جو آچاریہ کوتلیہ چانکیہ کی غیر معمولی فکر کا آئینہ ہے اور چندر گپت موریا کے زمانے کی تخلیق ہے۔ مسٹر شام شاستری کے انگریزی ترجمے سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ (شام شاستری نے 1906ء میں سنسکرت سے اسے انگریزی ترجمہ کیا تھا)

افسوس ہے کہ "ارتھ شاستر" کے ناشر نے حقی صاحب کے کام کو پس پشت ڈال کر اپنے مقدمے کی ایسی تشہیر کی کہ حقی صاحب کا نام پیچھے رہ گیا۔ جب یہ کتاب ہندوستان میں (مقدمے کے بغیر) چھپی اور اس پر اہل نظر کے تبصرے شائع ہوئے تو حقی صاحب کے کام کی قدر نمایاں ہوئی۔

اسی طرح "بھگوت گیتا" کا ترجمہ بھی ہندوستان میں چھپا تو لوگوں نے جانا کہ پاکستان میں ایسے مسلم دانشور بھی ہیں جو غیر مسلموں کی مذہبی کتابوں کا بھی احترام کرتے ہیں۔

"بھگوت گیتا" کے تراجم اور مسلمانوں نے بھی کئے ہیں۔ اکبر اعظم کے عہد میں فیضی نے اس کتاب کا فارسی میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ پھر اس کا اردو میں منظوم ترجمہ الم مظفر نگری نے 1954ء میں "آہنگ سرمدی" کے نام سے کیا۔ خواجہ دل محمد نے "دل کی گیتا" کے نام سے 1945ء میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اس کے بعد حسن الدین احمد نے "نغمہ الوہیت" کے نام سے نثر میں ترجمہ کیا جو 1947ء میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوا تھا۔ ہندو شعراء نے بھی "بھگوت گیتا" کے اردو میں نثری اور منظوم ترجمے کئے ہیں 1946ء میں پنڈت ہری رام بھارگو نے سلیس نثر میں ترجمہ کیا جسے نول کشور پریس لکھنؤ نے شائع کیا اور 1961ء میں منور لکھنوی نے "نسیم عرفان" کے نام سے منظوم ترجمہ کیا۔ اس طرح اور بھی تراجم ہیں مگر یہ سب ہندوستان میں کئے گئے اور وہیں سے شائع ہوئے۔ پاکستان میں صرف شان الحق حقی صاحب نے یہ نیک کام کیا۔

حقی صاحب بڑے صاحب علم اور وسیع النظر انسان ہیں۔ انہوں نے ایک اور اہم کام کیا ہے۔ اپنی غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ کردیا یہ کتاب زیر طبع ہے۔

بہت پہلے پروفیسر احمد علی نے ولی سے لے کر داغ تک منتخب غزلوں اور علامہ اقبال کے منتخب کلام کا انگریزی میں ترجمہ "گولڈن ٹریژری" کے نام سے کیا تھا۔ اس کے بعد کئی لوگوں نے مختلف شعراء کے تراجم کئے مثلاً "Dr. Barkar اور V.G Kiernan وغیرہ کے علاوہ بیدار بخت، پروفیسر ضیاء، حفظ الکبیر قریشی، سائیں سچا اور پروفیسر افتخار احمد نے بھی فیض، مخدوم، راشد، میراجی،

علی سردار جعفری' اختر الایمان' ساحر لدھیانوی' بلراج کومل' احمد فراز اور راقم الحروف کے منتخب کلام کو انگریزی میں منتقل کیا۔ لندن میں ساقی فاروقی' کینیڈا' میں شاہین اور اشفاق حسین اور ناروے میں جمشید مسرور کے کلام کا بھی انگریزی میں ترجمہ ہوا مگر حقی صاحب کا خیال ہے کہ شاعر اگر خود اپنی شاعری کا ترجمہ کرے تو وہ اصل سے زیادہ قریب اور معتبر ہو گا۔ دوسرا آدمی کم ہی حقیقت تک پہنچتا ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ بھی توجہ طلب ہے اور اس کا فیصلہ حقی صاحب کا ترجمہ دیکھ ہی کے کیا جا سکے گا۔

تیسری بزرگ ترین شخصیت پروفیسر رالف رسل کی ہے جو لندن میں مقیم ہیں۔ لندن میں ڈیوڈ میتھوز' اوسلو (ناروے میں) فین تھسن اور بوسٹن (امریکہ میں) برائن سلور بھی اردو کے اساتذہ ہیں مگر رالف رسل استاد ہونے کے ساتھ ایک نقاد اور محقق بھی ہیں۔ انہوں نے ایک کتاب

"Urdu in Britain" بھی مرتب کی ہے۔ ویسے روسی مستشرق ڈاکٹر نتالیہ پری گارنا کی طرح رالف رسل نے مرزا غالب پر بھی بڑا کام کیا ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال پر بھی ایک کتاب لکھی ہے اور "Three Mughal Poets" کے عنوان سے میر' سودا اور میر حسن کے تراجم بھی کیے ہیں۔ ابھی حال میں ڈاکٹر سوخا چیف کی روسی کتاب (دکن کے انقلابی شاعر) "مخدوم محی الدین" کا اردو ترجمہ (ترجمہ نگار۔ اسامہ فاروقی) ہندوستان سے آیا ہے۔ یہ وہی سوخا چیف ہیں جنہوں نے پاکستان کے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں بھی بہت لکھا ہے اور ڈاکٹر لیو میلا وسلویا کی طرح فیض' ندیم اور دوسرے کئی شعراء کے تراجم کیے۔ رالف رسل بھی لندن میں یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کر رہے ہیں (جوش صاحب انہیں "برطانیہ کا رسول اردو" کہتے تھے)

ان تمام کتابوں کے مطالعے سے ہمیں دنیا کے سمٹنے اور اردو زبان کے پھیلنے کا احساس ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو اپنی تنگ دامانی' جدید علوم سے محرومی اور اپنوں کی بے اعتنائی کے سبب "دن بہ دن" غریب و نادار ہوتی جا رہی ہے اور بڑے مسائل کی شکار ہے۔

سلطانہ مہر نے بڑے قرینے سے ہر بات ہم تک پہنچادی ہے۔ ایسی کتابیں عالمی زبانوں سے رابطے کا بھی وسیلہ ہوتی ہیں اور ان لکھنے والوں کو ہم سے قریب کرتی ہیں جو اپنے ملکوں سے بہت دور جا بسے ہیں۔ وہ اور ہم دور رہ کر اپنے مسائل سے کتنے باخبر ہیں؟ کیا سوچ رہے ہیں اور کیا لکھ رہے ہیں...؟ "گفتنی" میں سب کچھ آئینہ ہو گیا ہے۔ اور یہ کام وہ خاتون انجام دے رہی ہے جس کی مادری زبان گجراتی ہے۔ جو اردو میں لکھتی ہے۔ اردو میں سوچتی ہے اور امریکہ میں رہتی ہے۔

سلطانہ مہر وہ کام کر رہی ہیں جو ایک ادارے کا کام ہے۔ ایک اکادمی کا منصب ہے۔ بلاشبہ اے سلطانہ مہر۔

"تم ہو اپنی ذات میں اک انجمن"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کارِ جہاں دراز ہے

واقعی میرے رب کا کرم تھا کہ ۹۹ نثر نگاروں کا تذکرہ "گفتنی" صد دشواریوں کے بعد مکمل ہو ہی گیا۔ ۹۹ ناموں کی یہ تعداد بھی میرے لئے پرکشش ہے۔ اس تذکرے میں بہت سے سینئر ادیب اب بھی شامل نہ ہوسکے کیونکہ کتاب کی ضخامت چھ سو صفحات سے اوپر چلی گئی۔ بہت سے لکھے تعارف رہ گئے۔ مگر "کار جہاں بھی دراز ہے" زندگی رہی تو اگلی کتاب یعنی "گفتنی حصہ دوم" میں انشاء اللہ سب کو سمیٹنے کی کوشش کروں گی۔

"سخن ور اول سے گفتنی اول" تک کئی سالوں پر محیط یہ ادبی سفر اکثر مجھے پور پور زخمی تو کر گیا مگر احباب کے تعاون سے جب جب میری محنت کتابی صورت میں سامنے آئی' ایک روحانی طمانیت اور آسودگی بھی ساتھ لائی۔ مجھے یقین ہے کہ میری یہ محنت رائیگاں نہیں جائے گی اور مستقبل کے ادبی مؤرخ کو میرے لکھے چھ تذکروں (۱) آج کی شاعرات (۲) سخن ور اول (۳) سخن ور دوم (۴) سخن ور سوم (۵) سخن ور چہارم اور (۶) گفتنی اول میں تقریباً ۵۴۱ شعراء' شاعرات اور نثر نگاروں کے تعارف سے نہ صرف آج کے دور کے حالات بلکہ قلم کاروں کے نکتہ نظر اور ان کی فکر سے بھی کماحقہ معلومات حاصل ہوں گی۔

مجھے یاد آیا جب محترم ڈاکٹر محمد علی صدیقی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ کہنے لگے "مجھے کوئی معاون مل جائے تو بھی میں اتنا کام نہیں کر سکتا۔"

لیکن میں نے اپنے معاونین کے خلوص کی چھاؤں میں اور ایک مختصر مدت میں بہ یک وقت تین کتابوں کی تحریر سے لیکر اشاعت تک کے تمام مراحل طے کر ہی لئے۔ میں ان سب کی ممنون ہوں۔ خصوصاً سید عرفان علی عابدی' یامین اختر اور صفدر حسین کی۔ زندگی رہی تو ان صفحات پر آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ و ناصر رہے ہم سب کا!

سلطانہ مہر

20873 EAST WALNUT CANYON ROAD,
WALNUT CA 91789 USA
Tel: (909)444-0065 Fax: (909)444-0077
Email: REHANaol.com

سوالنامہ برائے "گفتنی"

س۔ ۱ آپ اپنا پورا نام، قلمی نام، تاریخ و جائے پیدائش، حصول تعلیم و ملازمت اور مختصر سوانح لکھئے۔

س۔ 2 بیسویں صدی ختم ہونے کو ہے، کیا اس صدی میں اردو ادب کی تاریخ میں موجود رہ جانے والے چند ادیبوں کے نام آپ گنوا سکتے ہیں؟

س۔ 3 فکشن ایک لطیف آرٹ ہے، جدیدیت نے اس آرٹ کی لطافت اور اس کے حسن کو نکھارا ہے یا اسے مجروح کیا ہے؟

س۔ 4 موجودہ صدی میں اردو ادب میں بہت کم ناول لکھے گئے ہیں، آپ کے نزدیک اس کی کیا وجوہ ہیں؟

س۔ 5 آج کا ادیب نہ صرف مادی بلکہ ذہنی، نفسیاتی اور روحانی بحران میں مبتلا ہے۔ بہتر زندگی بسر کرنے کے لئے وہ کسی نظام فکر کی تلاش میں ہے، اس کی رہنمائی کس طرح ہو گی؟

س۔6 شاعری ہو یا نثر------معیاری ادب کے پیمانے کیا ہیں؟

س۔ 7 پاکستان اور ہندوستان سے باہر اردو میں شاعری زیادہ ہو رہی ہے جبکہ نثر بہت کم لکھا جا رہا ہے اس کا سبب---وقت اور موضوعات کی کمی ہے یا جرات کی؟

س۔ 8 اردو کئی زبانوں کا مجموعہ ہے لیکن دیکھا یہ جا رہا ہے کہ انگریزی زبان کے الفاظ کی شمولیت سے گریز ہو رہا ہے جبکہ انگریزی زبان دنیا کی بڑی علمی زبان ہے۔ فارسی اور عربی تو نئے علوم سے مجروح زبانیں ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ اس طرح اردو کی ترقی رک نہیں جائے گی؟

س۔9 آپ اپنی زندگی کے چند اہم اور دلچسپ واقعات ضرور لکھئے۔

س۔ 10 اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ نہ عملی ترقی ہو رہی ہے نہ نظریاتی۔ نظریات کا مطلب کسی "ازم" کی نشاندہی نہیں۔ اس اصلاح کو وسیع تناظر میں رکھتے ہوئے اس کے اسباب بتائیں۔ نیز تراجم بھی زیادہ نہیں ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان میں تو علاقائی زبانوں پر بھی کوئی خاص کام نہیں ہوا---کیا اس سے اردو زبان کو نقصان نہیں پہنچ رہا؟

نوٹ : ازراہ کرم تمام سوالوں کے جواب لکھیں تاکہ آپ کے تعارف کے ذریعے، آپ کے خیالات کا اظہار بخوبی ہو سکے۔

احمد خان

شکاگو

مستند افسانہ نگاروں اور نقادان ادب نے افسانے کی مختلف تعریفیں کی ہیں اور ان سب کا لب لباب مختصراً یوں ہوگا کہ ایک اچھے اور کامیاب افسانے کی خوبی یہ ہے کہ وہ نہ تو محض حقائق کا اظہار ہو نہ صرف تخیلاتی خاکہ بلکہ حقائق کو مربوط کرکے ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور تخیل کے امتزاج اور ارتباط سے زندگی کی حرارت اور نمو کو افسانے میں اجاگر کرنا ہی افسانہ نویسی کہلاتا ہے۔ افسانہ کئی ارتقائی مراحل طے کرتا ہے۔ کبھی تیز گام، کبھی ٹھٹکتا، سمٹتا، پھیلتا اور کبھی تضاد کی راہوں سے گزرتا ہے خواہ وہ کرداروں کے مابین ہو یا واقعات کے۔

افسانہ اپنا ڈرامائی سفر بھی طے کرتا ہے اور اس سفر میں تجسس بھی نمایاں ہوتا ہے جو افسانے کے نقطہ عروج تک برقرار رہتا ہے چنانچہ افسانہ جب ختم ہوتا ہے تو قاری کے ذہن پر اپنے دیرپا نقوش چھوڑ جاتا ہے۔

میں نے احمد خاں کے جو افسانے پڑھے۔ کم و بیش وہ انہی خوبیوں سے مزین تھے۔ ادیب کی ہر تخلیق تو کارہائے نمایاں نہیں ہوتی لیکن اگر ادیب کا نام اس کی تخلیق کے حوالے سے قاری کو یاد

رہے تو یہی اس کی کامیابی ہے۔

احمد خاں ہندوستان کے مشہور شاعر مرحوم عزیز قیسی کے بھائی ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا میں پہلے دس بڑے انٹرنیشنل مشاعرے احمد خاں نے اپنی انجمن "اردو سوسائٹی آف امریکہ اینڈ کینیڈا" کے تحت کرائے تھے جس میں ہند و پاک کے کئی نامور شعراء و شاعرات شریک ہوتے رہے تھے۔ 1980ء میں شمالی امریکہ کے تمام بڑے شہروں میں انہوں نے مشاعرے کرائے جن میں علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، عزیز قیسی (مرحوم) بیکل اتساہی، اختر الایمان (مرحوم) مینا قاضی، حسن کمال اور واجدہ تبسم نے شرکت کی۔ 1981ء میں شکاگو میں انہوں نے مشاعرہ کرایا جس میں قتیل شفائی، جگن ناتھ آزاد، حمایت علی شاعر، جمیل الدین عالی، صہبا اختر (مرحوم) ضمیر جعفری مرحوم اور پروین فنا سید نے شرکت کی تھی۔

احمد خاں جولائی 1968ء سے امریکہ میں ہیں۔ ان کی جائے پیدائش حیدر آباد دکن ہے اور تاریخ پیدائش 9 مارچ 1944ء۔ تعلیم ایل ایم ای (میکنیکل انجینئرنگ) حیدر آباد دکن کے پولی تکنیک کالج سے حاصل کی۔ پھر بی ایس ایم ای، یونیورسٹی آف ایلے نائی شکاگو سے کیا۔ اور امریکن سوسائٹی فار کوالٹی سے CQE (سرٹیفکیٹ کوالٹی انجینئرنگ) کی سند حاصل کی۔ تیس سال سے مختلف انجینئرنگ اور مینجمنٹ کے عہدوں پر ملازمت کرتے رہے ہیں۔ ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ اور ایک خوبصورت تبدیلی جنرل موٹر کمپنی میں کام کرنے کے دوران آئی۔ جہاں بقول احمد خاں انسانیت کے محسن ڈاکٹر ڈیمنگ سے ان کی ملاقات اور پھر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر ڈیمنگ سے زندگی کو دیکھنے کا نیا انداز سیکھا۔

"ڈاکٹر ڈیمنگ کی تعلیمات کیا ہیں؟" میں نے ان سے پوچھا تھا۔

احمد خاں کہنے لگے "میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو اختصار سے بتا سکوں۔ اور پھر انہوں نے بہت سی دلچسپ اور کارآمد تفصیلات بتائیں۔

احمد خاں کہنے لگے "نسل انسانی کی تاریخ میں چار افراد نے انسانیت کو دھچکا (jolt) پہنچایا۔ سب سے پہلا تو پولش سائنس داں کوپرنکس تھا جس نے پندرہویں صدی میں ساری دنیا کی مانی ہوئی حقیقت کے خلاف کہا کہ سورج زمین کے اطراف گردش نہیں کرتا بلکہ زمین سورج کے اطراف گردش کرتی ہے۔ دوسرا دھچکا ڈارون نے پہنچایا جب اس نے سارے مذہبوں کے عقیدے کے خلاف اپنی کتاب چھاپی کہ ہم انسان کو خدا نے تخلیق نہیں کیا بلکہ وہ اپنے سے نچلی سطح کی مخلوق سے وقت اور ضرورت کے مطابق تشکیل ہوا۔ تیسرا دھچکا کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے سگمنڈ فرائڈ نے پہنچایا کہ ہم ابھی پوری طرح (evolve) نہیں ہوئے ابھی ہمیں اپنے جذبات کو سمجھنا اور قابو پانا نہیں آیا۔ چوتھا دھچکا ڈاکٹر ڈیمنگ نے 1950ء کے لگ بھگ پہنچایا جب انہوں نے کہا کہ 96 فیصد ہمارے اعمال کی ذمہ داری اس نظام کی مہربانی ہے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ صرف

چار فیصد ذمہ داری ہماری اپنی ہے۔ یہ سائنسی نکتہ ہے جو فلسفیانہ بحث یا مذہبی روشنی میں سمجھ میں نہیں آسکتا۔ کمپنیوں میں سمجھانا اسے قدرے آسان ہے اس لئے کہ وہاں مال یا پرزے بنتے ہیں اور (Variatin) (جس کا اردو لفظ مجھے اب تک نہ مل سکا) کو پایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر ڈیمنگ ہمیشہ اپنے سیمینار کے ماہرین سے ایک سوال پوچھتے۔ a+b+c+d+e=8 کیا کوئی اس (equation) کو حل کرسکتا ہے؟ ظاہر ہے کوئی نہیں کرسکتا۔ وہ کہتے کہ اسے جو بھی حل کرلے اسے حق ہے کہ دوسرے کو gudge کرسکے۔ اس لئے کہ پانچ نامعلوم عناصر ہیں اور ایک ایکویشن۔ اور وہ ہمیشہ کہتے کہ ہمیں جتنا بڑا نظام ہوسکے اسے سنوارنا چاہئے کیونکہ 96 فی صد سدھار نظام کو سنوارنے سے ہوتا ہے کہ نظام کے اجزا جیسے انسان، ممالک، مذاہب وغیرہ۔ ان کی ساری جستجو یہی ہوتی کہ انسان کا بھلا ہو انسانیت سدھر جائے اگر ہم نظام کے حصول کو الگ الگ سدھارنا چاہیں گے (جیسے مسلمان، ہندو، عیسائی، گورے، کالے) تو بڑا نظام یعنی انسانیت بہتر نہیں ہوگی بلکہ بدتر ہوجائے گی۔

If your optimize the parts of a larger system

'The larger system gets sub optimized

میرا دوسرا سوال سن کر انہوں نے کہا۔ شاید آپ مجھ سے میرے پسندیدہ شاعروں اور ادیبوں کے نام سننا چاہتی ہیں۔ شاعروں میں احمد فراز، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، ندا فاضلی، حمایت علی شاعر، نسیم سید، معراج فیض آبادی، جاوید اختر وغیرہ۔

افسانہ نگار و ادیب: سردار جعفری، جیلانی بانو، یوسف ناظم، مجتبی حسین، واجدہ تبسم، ذکیہ مشہدی، رفیعہ منظور الامین، کرامت غوری، طہ آفندی وغیرہ۔ اب مزید سوالوں کے ترتیب وار جواب یہ ہیں۔

3- جو فکشن شمع میں چھپتا ہے وہی مجھے پسند ہے ایک آدھ افسانہ اردو لنک یا دوسرے رسالوں میں پسند آتے ہیں۔

4- ناول پڑھنے کا لوگوں کے پاس وقت نہیں۔

5- ڈاکٹر ڈیمنگ کا نظام فکر ہر بحران کا حل ہے۔

6- معیار قاری مقرر کرتا ہے ہمارے قابل ادیب سمجھتے ہیں کہ وہ مقرر کرتے ہیں یہ ان کی خوش فہمی ہے جس سے وہ جتنا جلد نکل جائیں وہ آئندہ نسلوں کے لئے بہتر ہوگا ورنہ ان کا معیار ان کے ساتھ ہی جائے گا۔

7- پاکستان اور ہندوستان سے باہر کی اردو شاعری صرف ویک اینڈ پر فٹ بال گیم دیکھنے یا گھروں میں دعوتیں کرنے سے زیادہ اہم نہیں۔ شاعری نہیں وہ صرف تک بندی ہے۔

8- اردو کی ترقی رکے یا نہ رکے انسانوں کی ترقی نہیں رکنی چاہئے اس میں کوئی عذر یا خوف نہیں ہونا چاہئے کہ انگریزی سارے عالم کی زبان بن رہی ہے۔ کم از کم سارے عالم کے انسان کسی

دور میں بندھ تو رہے ہیں یہ کیا کم ہے۔

9۔ میری زندگی کے اہم واقعات کو میں کہانیوں میں ڈھال چکا ہوں جب آپ میرا مجموعہ "دور کے ڈھول" پڑھیں گی تو ان اہم واقعات کا علم ہو جائے گا۔ ویسے امریکہ آنا، اپنی پہلی اہلیہ کی وفات، دوسری اہلیہ سے مختصر شادی اور جنرل موٹرس میں کام کرنا میری زندگی کے وہ چند اہم واقعات ہیں جن سے دوسرے بیسوں اہم واقعات جڑے ہوئے ہیں۔ میں جو باتیں پیغمبروں، رسولوں، نبیوں کے بارے میں پڑھتا تھا وہ ایک ایسے شخص میں ایک ایسی جگہ دیکھیں اور غور سے سنیں اور سمجھیں۔ جس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور وہ شخص تھے ڈاکٹر ڈیمنگ۔

اردو ادب کی پرانی تنقید کا انداز بہت جدا تھا آج کی تنقید صاف الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار ہو گا جو شاعروں میں مل جاتا ہے لیکن وہ سب جھوٹ ہوتا ہے۔ ہمارے شاعر اور ادیب ساری عمر جھوٹ کی زندگی گزارتے ہیں۔ سچ بولنے اور سچ سننے کی ہمت نہیں ہوتی اور نہ سلیقہ۔ سب سے اہم چیز ہے علم اور حصول علم۔ اس میں کسی بھی عزم، عقیدہ یا سیاست کو ملوث نہیں کرنا چاہئے ورنہ انسانیت کی بہتری نہیں ہو گی۔" میرا پسندیدہ شعر یہ ہے۔

وقت کو جو بھی بدل دے وہی انساں ہے عظیم
وقت کے ساتھ بدلنا کوئی کردار نہیں

AHMED KHAN
5400 ASTOR LN APT 116
ROLLING MEADOWS IL 60008-4195.U.S.A.

چاند کو روک دیا میں نے صحراؤں میں سہیل
تم مجھے روک بھی لو جادو یہ دکھاؤ تم بھی

احمد سہیل
۱۱ر فروری ۹۹ء

احمد سہیل خان
ٹیکساس۔ امریکا

میں نے احمد سہیل خان کو پڑھ رکھا تھا۔ جب میں نے "سخن ور چہارم اور گفتنی" پر کام شروع کیا تو میری فہرست میں احمد سہیل خان بھی تھے۔ ان کے پتے پر فلسطین ٹیکساس (امریکا) کا نام پڑھ کر میں نے انہیں لکھا کہ "آپ کس فلسطین" میں آباد ہیں۔ کیسی جگہ ہے؟ جواب میں انہوں نے لکھا۔ "میں ٹیکساس ریاست کے چھوٹے سے قصبے فلسطین میں رہتا ہوں۔ میرے آس پاس نہ کوئی اردو بولنے والا فرد رہتا ہے اور نہ ہی کوئی کنبہ یہاں آباد ہے۔ میرا یہ شہر ٹیکساس کے مشہور شہر ڈیلاس سے جنوب کی جانب کوئی ڈیڑھ سو میل دور ہے۔ میں نے کبھی مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔"

اور احمد سہیل خان آپ کرتے کیا ہیں؟

میں نے ان سے پوچھا۔ کہنے لگے۔ "پڑھتا ہوں۔ لکھتا ہوں اور اپنا علم اپنے لوگوں تک پہنچاتا ہوں۔ وقت ضائع نہیں کرتا۔" انہوں نے ایک فہرست ہمارے سامنے کر دی۔ اس میں احمد سہیل کی شب و روز کی عرق ریزی ترتیب وار درج تھی کہ کس پرچے میں کون سا

مضمون کس سن میں چھپا۔ مثال کے طور پر اب سے پندرہ سال پہلے یعنی مارچ ۱۹۸۴ء میں "جریدہ" (علی گڑھ ہندوستان) میں ان کا مضمون "ولیم گولڈنگ" (Willam Goldling) کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ فیض احمد فیض کی "میرے دل میرے مسافر" پر ان کا مضمون ادب لطیف لاہور (پاکستان) ۱۹۹۳ء میں چھپا ہے اور ڈھیروں مضامین ہیں جو الہ آباد ہندوستان کے "شب خون" مالے گاؤں ہندوستان کے جواز' لاہور پاکستان کے فنون اور اوراق کراچی کا اظہار وغیرہ میں چھپے ہیں۔ ویسے سیپ لاہور نیا دور اور آئندہ کراچی کلاسیک راولپنڈی اور جمات سری نگر کشمیر ہندوستان کے علاوہ دیگر پرچوں میں بھی احمد سہیل کی تحریریں مسلسل شائع ہو رہی ہیں۔

تصانیف میں "جدید تھیٹر" کے عنوان سے ان کی کتاب ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی ہے۔ زیر طبع میں ان کی شاعری' تراجم اور ساختیات' تاریخ نظریہ اور تنقید پر ان کا مقالہ شامل ہے۔

سہیل احمد خان ان کا پیدائشی نام ہے۔ ۲ جولائی ۱۹۵۳ء کو کراچی (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ بی اے امتیازی' ایم اے عمرانیات اور تقابلی ادب میں پی ایچ ڈی جامعہ کراچی سے کیا۔ کالم نویسی کی۔ ریڈیو کے لیے ڈرامے اور اسکرپٹ لکھے۔ لاطینی امریکا اور امریکا کی جدید نیگرو شاعری کے تراجم کیے۔ ہائی کنگ' باسکٹ بال' والی بال' بیس بال اور ماہی گیری ان کے پسندیدہ مشاغل ہیں۔ ڈپارٹمنٹ آف کرمنل جسٹس کے فوڈ ڈپارٹمنٹ میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں۔

ہم نے سوالات کی فہرست سامنے رکھی تو دوسرا سوال پڑھتے ہی بولے۔ "بیسویں صدی میں اردو کی تاریخ میں موجود رہ جانے والے چند ادیب نہیں بہت سے ہیں۔ آپ یہ طویل فہرست کیسے شائع کریں گی؟ چنانچہ ہم نے سوال نمبر ۳ پر گفتگو کی تو کہنے لگے۔ "دیکھیے فکشن لطیف ہونے کے ساتھ ساتھ سفاک اور کٹھن فن بھی ہے۔ جدیدیت نے انسان کے اندر کی سچائی کو پیش کیا' موضوعی اظہار ایک تخلیقی مظہر ہے اس کو تسلیم کیا جانا چاہیے کیوں کہ اس کی بھی فنکارانہ جمالیات ہیں۔ ایک جانب تو جدیدیت نے اردو ادب کو سنوارا ہے تو دوسری طرف منفیت کی انتہا پسندی نے فکشن میں بے معنی باتوں کو بھی داخل کر دیا۔ جدیدیت کے نام پر جب بھی چیستانی قسم کا فکشن سامنے آیا تو اس سے اذیت ہی نہیں ہوئی بلکہ اردو فکشن کے تخلیقی تسلسل میں جمود سا پیدا ہو گیا۔ چند لکھنے والوں نے جدیدیت کے حوالے سے اچھا فکشن تخلیق کیا جب کہ دوسری طرف مجہول فکشن نے ان تحریروں سے قاری ہی نہیں چھین لیا بلکہ فکشن کی تاریخ میں اور اس کی ارتقائی نشوونما میں دراڑیں بھی ڈالیں۔ یوں انحرافی سطح پر جدیدیت کے حوالے سے پیش کیے جانے والے فکشن نے "بے معنی" متعلقات کو پیش کیا جس سے اردو فکشن نکھرنے اور سنورنے کے بجائے انحطاط کا شکار ہوا۔ "جدیدیت" جو کہ اصل میں مغربیت کی اظہاری حسیت ہے اردو میں اس وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی کہ مغرب میں

جدیدیت کے حوالے سے جو بات با معنی اور مثبت ہے وہ اردو میں آکر منفی اور "بے معنی" ہو جاتی ہے۔ نظام معاشرت، اقدار اور رسوم و رواج کے تفاوت کے باعث مغرب کی جدیدیت اردو کی جدیدیت میں جڑ نہ پکڑ سکی۔ جدیدیت نے اردو فکشن کو تھوڑا سا وسیع النظر تناظر تو ضرور دیا لہٰذا یہ جلد ہی بے راہ روی کا شکار ہو گیا۔

احمد سہیل کہتے ہیں "موجودہ صدی میں اردو ناول بہت کم لکھے گئے کیوں کہ اردو معاشرے میں ابھی تک لکھنے لکھانے کو بے کاری کا وظیفہ تصور کیا جاتا ہے دوسری وجہ غالباً" یہ تھی کہ غزلیہ مزاج ہمیشہ سے اردو کی جملہ اصناف پر حاوی رہا اور غزل کا جبر ہی نثر کی نشوونما میں رکاوٹ بنا۔ ناول لکھنے کے لیے وقت ہی نہیں اعلیٰ ذہن کی بھی ضرورت ہوتی ہے، ناول لکھنے سے پہلے اس کا پروجیکٹ ترتیب دینا بھی ایک کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ وقت محنت، مطالعہ، مشاہدہ، تجزیہ اور تحقیق اظہار کی تکنیک کے بنیادی عناصر کے علاوہ ناول نگار کو ماحولیات کی عمرانیاتی اور بشریاتی سائیکی کا عمیق ادارک بھی ہونا چاہیے۔ اردو میں ایک تو ناول کا قاری ہے ہی نہیں۔ اب جب کہ سائبر اسپیس کے اس دور میں ہر مطلوبہ چیز حاسب (کمپیوٹر) کا بٹن دباتے ہی ابھر کے روشن ہو جاتی ہے تو ناول وغیرہ کون پڑھے گا! نئے انسان میں تہذیبی اور جمالیاتی اقدار کا مزاج بدل چکا ہے، ناول مطالعے کے لیے وقت مانگتا ہے اور اب نہ قاری کے پاس وقت ہے اور نہ ہی اسے تہذیبی اور ماحولیاتی شعور کا جمالیاتی اور منطقی (عقلی) شعور ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اردو میں جو تھوڑے بہت ناول لکھے گئے ان میں سے چند کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے ناول نگار اپنے اصل "تھیسس" (THESIS) کو خود ہی سمجھ نہیں پا رہا اور واردات جذباتی اور افقی حقیقت پسندی نے بعض اردو ناولوں کو شہرت تو دی لیکن ناول کی حساس جہت کو فکشن کی فکر اور جمال میں سموئے بغیر لکھا گیا۔

لیکن خوشی کی بات ہے کہ گزشتہ دس بارہ برسوں میں اردو میں کئی اچھے ناول لکھے گئے جیسے خدا کی بستی، آگ کا دریا، اداس نسلیں اور انیس ناگی کا دیوار کے پیچھے، جو کہ عام قاری کی دسترس سے باہر ہیں۔ ان ناولوں میں معاشرتی اور ماحولیاتی مخاطبہ (ڈسکورس) بہت واضح اور معروضی ہے اور ان ناولوں کی ترسیل قاری کو بہتر طور پر ہوئی ہے۔

آج کے اردو ادیب کا مسئلہ خالصتاً معاشی، مادی ہے یا عدم شناخت اور مرتبے کا بحران ہے۔ ان ہی عوامل نے اس کو نفسیاتی اور ذہنی بحران میں مبتلا کر کے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا ہے۔ جہاں تک روحانی بحران کا تعلق ہے اصل میں وہ اردو کے کسی ادیب کو نظر نہیں آتا۔ بہت سے معمولی لکھنے والے اپنی تخلیق پر دوسروں کے قلم و زبان سے تبصرہ کرواتے ہوئے اسے "روحانی" ثابت کرنے کی ناکام کوشش بھی کرتے ہیں۔ حالاں کہ سارا مسئلہ معیشت، مرتبے، شخصیت سازی، یا شناخت کی گمشدگی سے پیدا ہونے والے بحران کا ہوتا ہے۔ ان باتوں کی

جینوئن لکھنے والوں کی تخلیقی یا تنقیدی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ بہتر زندگی کی خواہش ہر انسان کو ہوتی ہے۔ لکھنا لکھانا آسان کام نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بہت ساری باتوں کو خیرباد کہنا پڑتا ہے جو عام انسانوں کے لیے تو ضروری ہو سکتی ہیں مگر لکھنے والوں کے لیے بے راہ روی کا سبب بن سکتی ہیں۔

بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے "ہوا کے رخ پہ چلو بادباں گرا ڈالو" والے مقولے کو اپنا لیا جائے تو سب کام آسان ہو جاتا ہے۔ دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے کسی نئے نظام کی ضرورت نہیں۔ معاشرے میں جو نظام فکر رائج ہے اس میں سے ہی (یا کسی ذیلی نظام) کسی نظام کو اپنا کر انسان کی کمزوریوں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لیا جائے تو زندگی "بہتر" ہو جاتی ہے۔

ادیب کو اپنا نظام فکر خود بنانا پڑتا ہے (جو بہت کم ادیبوں میں نظر آتا ہے) ادیب کی رہنمائی کوئی نہیں کر سکتا۔ ان کو حسن عمومی (Common Sence) کی مدد سے اپنی رہنمائی خود کرنی پڑتی ہے کیوں کہ لکھنے والا معاشرے کا سب سے حساس اور ذہین فرد ہوتا ہے لیکن اردو کے ادیبوں کے زیادہ تر بحران "کاغذی" اور "فیشن زندگی" سے عبارت ہیں۔ مجلسی ستائش باہمی کے رجحان نے اردو ادب کو حد درجہ مشکوک بنا دیا ہے۔ اردو کا لکھنے والا بہتر زندگی گزارنے کے لیے جس نظام فکر کی تلاش میں ہے وہ نظام فکر اس کے ادراک سے خارج ہے۔

معیاری ادب کے کوئی خاص متعین پیمانے نہیں ہوتے۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ معیاری ادب آفاقیت اور عام فہمی پر مبنی ہوتا ہے اور یہ معاشرے کا کوئی تاریخی یا جذباتی یا حساس تجربہ اپنے لفظوں میں سمیٹے ہوتا ہے۔ معیاری ادب سمجھ میں آتا ہے اور اس کی ترسیل باسانی قاری کو ہوتی ہے اور قاری کو وسعت فکر بھی فراہم کرتی ہے۔ یہ اس پھول کی طرح ہوتا ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔ اس میں انسانی معاشرے کی آفاقی اقدار کا اسلاک کسی طور پر متن میں اپنی گرفت کمزور نہیں ہونے دیتا اور نہ ہی زمان و مکان کی حدود میں اسے مقید کیا جا سکتا ہے' اس میں فرد' معاشرہ اور ماحولیاتی سائیکی کے عوامل بنیادی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان سے باہر شاعری ہو رہی ہے وہ اصل میں شاعری کی شکل میں کوئی اور چیز ہے۔ بے معنی ادبی سرگرمیوں' اندوہ ناک ثقافتی اور ماحولیاتی احساس تنہائی' ثقافتی صدمے اور خاص کر مغرب کے معاشرے میں مقامی اور ثقافتی سطح پر مدغم نہ ہونے اور کھوکھلی روایات کی خود ساختہ رعونت کے مغالطے کا شکار ہو کر مغرب کا اردو بولنے والا' شاعر' مشاعروں اور مجالس قوالی اور طوائف کے مجرے میں تمیز کرنے کا بھی اہل نہیں۔ لہٰذا یورپ اور امریکہ میں مجلسی انداز کی جو شاعری ہو رہی ہے وہ شاعری کے نام پر دھوکہ ہے لیکن چند گنے لوگ یہاں عمدہ شاعری بھی کر رہے ہیں جنہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ مغرب میں اردو نثر اس لیے نہیں

لکھی جا رہی کہ نثر لکھنے کے لیے وقت دینا پڑتا ہے اور خاص کر تنقید اور مضامین لکھنے کے لیے عمیق مطالعہ درکار ہوتا ہے اور پتہ مارنا پڑتا ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ امریکہ میں اردو والوں کے پاس محفل بازی کے لیے بہت وقت ہے لیکن تخلیقی اور سنجیدہ کاموں سے وہ بھاگتا ہے کیوں کہ لکھنے والا جوہر ان کے پاس نہیں۔

اردو یقیناً" ایک بڑی زبان ہے جو باسانی دیگر زبانوں سے الفاظ لے لیتی ہے اب جب کہ علم اور لسانی تحقیق بہت آگے جا چکی ہے لہٰذا اردو کی اپنی مجرو شناخت کا مسئلہ ہر اہل فکر کو لاحق ہے لہٰذا اب یہ کوشش ہوتی ہے کہ باہر کی زبان کے کسی لفظ کا تحقیق اور افہام و تفہیم کے بعد اردو میں ترجمہ کر دیا جائے تاکہ اس کی اپنی شناخت معتبر ہو اور مزید مستحکم ہو۔ اردو کی شناخت انگریزی نہیں۔ جیسے جیسے اردو پھیلتی جا رہی ہے اردو کا خزانہ بڑھ رہا ہے لیکن یہ غلط ہے کہ جدید عربی اور فارسی نئے علوم سے محروم زبانیں ہیں کیوں کہ جدید عربی اور فارسی میں بڑی تازہ کاری ہے۔ نئے نئے فکری عملی اور جمالیاتی رویوں کی بازگشت ان زبانوں کے تجربے میں آ رہی ہے۔

اردو کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ضعیف الاعتقادی ہے۔ اردو میں اتقادیوں (PURITAN) کی مہارت بندی کے رجحان نے اردو کی ترقی کی رفتار میں رخنے ڈالے۔ دوسری بات اردو کو مخصوص عقائدی رجحان سے بھی منسلک کر دیا گیا لہٰذا اس کے دل خراش نتائج نے اردو کو اب بھی اپنے روایت خود ساختہ پندار کے زندان میں ڈال رکھا ہے۔ جب ہی اردو بڑھنے کے بجائے روز بہ روز گھٹتی جا رہی ہے۔

اپنی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ میں بچپن میں اپنے والد صاحب (ممتاز علی خان) کے پاؤں دبایا کرتا تھا۔ ایک دن والد صاحب تھکے ہوئے باہر سے آئے اور مجھے حسب عادت کہنے لگے بہت تھکا ہوا ہوں میرا سارا بدن دبا دو۔ میں نے معصومیت سے اپنے والد صاحب سے پوچھا "ابو جان گلا بھی..."

ایک بار یوں ہوا کہ افسانہ نگار احمد داؤد نے ایک دن راولپنڈی کے چائے خانے میں مجھ سے اچانک سوال کر ڈالا۔ "یار یہ بتاؤ یہ آخر اردو میں "احمد" نام کے اتنے لکھنے والے کیوں پیدا ہو گئے ہیں؟"

"اردو میں احمدی تحریک زوروں پر ہے" ...... یہ میرا جواب تھا۔

اردو میں تنقید کے میدان میں کم کام ہوا ہے لیکن بہت کم اچھی، عملی، سائنٹفک اور نظریاتی تنقید لکھی گئی ہے۔ جو کچھ بھی اردو میں تنقید کے نام پر لکھا گیا اس میں بہت کم تحریریں ایسی ہیں جنہیں صحیح معنوں میں تنقید کہا جا سکتا ہے، زیادہ تر تحریریں تبصرہ نگاری کی ہیں یا اس کے سہارے شخصیت کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ عصری تنقید میں دو چار لوگوں کے نام دیکھنے میں آتے

ہیں۔ یہ تمام اصحاب تنقید کی آڑ میں اپنی انا کی جنگ لڑ رہے ہیں اور قاری کا وقت ہی خراب نہیں کر رہے بلکہ انہیں گمراہ بھی کر رہے ہیں۔

اردو میں گزشتہ عشرے میں اچھے تراجم ہوئے مگر اس کو سنجیدہ قاری نہ مل سکا کیوں کہ خاص کر مغرب میں اردو والے اچھے اور سنجیدہ ادبی اور علمی تراجم نہیں پڑھتے۔ اردو کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس نے علاقائی زبانوں سے وہ کچھ حاصل نہیں کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ انقادی احساس برتری اردو پر ہمیشہ حاوی رہا ہے لہٰذا اس کی نشوونما ٹھیک طور پر نہیں ہو سکی۔ اس کی کئی ثقافتی، نسلی، علاقائی اور سیاسی وجوہات ہیں۔ علاقائی زبان پر جو کام ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں اس پر اردو کے اسلاک پر کم توجہ دی گئی ہے لہٰذا فی الحال اردو اور علاقائی زبانوں کے درمیان رابطے کی کوئی مثبت رسائی دکھائی نہیں دیتی۔ اس سلسلے میں جو تھوڑا بہت کام ہوا ہے وہ مکسی ہے یا اسٹیبلش منٹ کا سیاسی عنصران تحریروں پر حاوی ہے۔ اس سے وہ بات نہیں بنی جو بنی چاہیے تھی۔"

(اس ضمن میں ماہنامہ شاعر بمبئی مئی ۱۹۹۹ء کی اشاعت میں احمد سہیل کا مضمون "معاصر اردو تنقید کیا ہے کیا نہیں" قابل مطالعہ ہے۔)

MR. AHMED SOHAIL KHAN
321 OLD ELKHART ROAD.#37
PALESTINE, TX 75801 US.A

میں جس کی خاطر نکلا تھا سب سے
وہی محبوب میری منزل ہے یار اب
مجھ کو اس سے شکوہ نہیں ہے
(احسن)
اختر جمال
19.6.99

اختر جمال

کینیڈا

محترمہ اختر جمال اردو ادب کا ایک تابندہ ستارہ رہی ہیں۔ ان کے فن پر متعدد شخصیات نے مضامین لکھے اور ان کی خدمات کو سراہا۔ 8 جون 1990ء کے ڈان انگریزی میں ڈاکٹر طارق رحمٰن نے اس عنوان سے مضمون لکھا۔ "دی شورٹ اسٹوریز پر آف اختر جمال" ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے بھی "ڈان" میں ان کے افسانوں کے مجموعے "زرد پتوں کا بن" پر بڑا خوبصورت مضمون لکھا۔

جناب اکرام بریلوی نے بھی مارننگ نیوز میں "زرد پتوں کا بن" پر مضمون لکھا۔ ان کے انٹرویوز روزنامہ جنگ 'نوائے وقت' ہفتہ وار اخبار خواتین اور ماہنامہ افکار میں شائع ہوئے ہیں۔

ان کے افسانوی مجموعے "انگلیاں فگار اپنی" پر ڈاکٹر سہیل بخاری احسان دانش اور عبادت بریلوی نے تبصرے لکھے اور ریڈیو سے بھی نشر کیے۔ علاوہ اس کے ایک طویل مضمون حکیم یوسف حسین نے "نیرنگ خیال" میں نذیر احمد نے نقوش میں "انگلیاں فگار اپنی" پر شاہد عشقی نے "سیپ" میں "الفاظ میں" ڈاکٹر احسن فاروقی نے اور نوائے وقت میں مرزا ادیب نے مضامین لکھے۔

میں نے پوچھا۔ اختر جمال کچھ اپنے بارے میں بتایئے۔ اور یہ بھی کہ آپ نے لکھنے کا آغاز کب

اور کس طرح کیا۔

اختر جمال نے کہا میرا نام اختر جمال ہی میرا قلمی نام ہے میں بھوپال میں 22 مئی 1930ء کو پیدا ہوئی۔ میرے والد محمود الحسن صدیقی کا تعلق صحافت ادب اور سیاست سے رہا ہے میری والدہ قمر انساء بیگم بھی لکھا کرتی تھیں اور جب میں نے آنکھ کھولی تو والدہ ایک رسالہ مہارت کی ایڈیٹر تھیں جو عورتوں کے گنے چنے رسائل میں سے ایک تھا۔ اس زمانہ میں عصمت اور تہذیب نسواں کے بعد نکلا تھا۔ والد ایک ویکلی "ندیم" نکالتے تھے جو اس زمانے کا اعلیٰ ادبی پرچہ سمجھا جاتا تھا۔

میں نے تعلیم بھوپال اور ناگپور میں حاصل کی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد 1949ء میں شادی ہوئی اور 51 میں پاکستان آگئی۔ شادی کے بعد جب میرا بیٹا ذرا سا بڑا ہوا تو میں نے بی اے کا امتحان دیا اور پھر کئی سال بعد ایم اے پشاور یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس میں اعزازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ پہلے برن ہال اسکول ایبٹ آباد میں پڑھا رہی تھی ایم اے کرکے کالج میں ملازمت کرلی اور گورنمنٹ کالج برائے خواتین میں پڑھایا۔ کچھ عرصہ گجرات اور پھر لمبے عرصے گورنمنٹ کالج برائے خواتین اسلام آباد میں پڑھانے کے بعد 1990ء میں ریٹائر ہوئی۔

میرے میاں احسن علی خاں پہلے کاکول اکیڈمی میں پروفیسر تھے پھر ایک عرصے تک وزارت خارجہ میں ریسرچ ڈائریکٹر رہے اور پھر تقریباً پچیس سال اسلام آباد میں رہے احسن علی خان 1981ء میں ریٹائر ہوئے اور 1991ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ صحافی، ادیب اور شاعر تھے۔ ان کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ "میں محسوس کرتا ہوں میں سوچتا ہوں" اور دوسرا "شعلہ جاں" انہوں نے ہاورڈ فاسٹ کے ناول Freedom Read کا ترجمہ بھی کیا تھا "آزادی کے بعد" اس کا عنوان تھا۔ یہ ہندوستان میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ترکی کے مشہور شاعر یونس امرید کے دیوان کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انگریزی اخبارات میں لکھتے رہے اور مقتدرہ قومی زبان کی اردو انگلش ڈکشنری سے بھی وابستہ رہے اور اس کے علاوہ ریسرچ بھی کرتے رہے۔ ضیاء دور پر بھی ایک کتاب لکھ رہے تھے۔

میرے شوہر نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ مجھے لکھنے کا بچپن سے ہی شوق تھا طالب علمی کے زمانے کی کہانیاں جرائد بعنوان انصاری، افکار، شمع، عصمت، قوم وغیرہ میں چھپ چکی تھیں۔ ترقی پسند تحریک سے ہم دونوں وابستہ رہے۔ اس لئے شادی کے بعد بھی لکھتی رہی۔ طالب علمی کے زمانے کی تحریریں کتاب میں شامل نہیں کی ہیں۔ پاکستان آنے کے بعد جو کچھ لکھا وہی کتابوں میں شامل کیا ہے۔

میری جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

1- پھول اور بارود، امن سے متعلق ناول جو دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھا گیا تھا۔
2- "انگیاں فگار اپنی" افسانوں کا مجموعہ

3- زرد پتوں کا بن مکتبہ "التحریر" نے شائع کیا یہ ادارہ فروغ اردو سے چھپا
4- زرد پتوں کا بن اس کا دوسرا ایڈیشن مقبول اکیڈمی نے شائع کیا۔
5- مجموعہ ایکسپریس افسانوں کا مجموعہ 6- خلائی دور کی محبت 7- ہری گھاس اور سرخ گلاب "
خاکوں کا مجموعہ " یہ سب مقبول اکیڈمی نے شائع کئے۔

اس کے علاوہ مضامین ڈرامے وغیرہ بھی لکھے جو اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئے' کالجوں میں کھیلے گئے اور پی ٹی وی پر بھی آئے۔

1992ء میں احسن کی رحلت کے بعد میں کینیڈا آ گئی یہاں میرا اکلوتا بیٹا طارق احسن پہلے سے آیا ہوا تھا اس لئے پھر میں نے بھی کینیڈا کی شہریت لے لی اور اب اپنے بیٹے کے پاس ہوں۔

میری ایک بیٹی تزئین احسن انیس سال کی عمر میں اپنے خالق کے پاس چلی گئی اس کی موت نے ہم میاں بیوی کو بالکل توڑ سا دیا تھا۔ پھر ڈکٹیٹر شپ کا پہلا وار قائد اعظم یونیورسٹی پر پڑا میرا بیٹا طارق احسن اور دو اور پروفیسر گرفتار کئے گئے سوا دو سال مقدمہ چلائے بغیر انہیں بند رکھا گیا۔

ملٹری کورٹ نے بعد ازاں دو سال قید کے بعد دس ہزار جرمانہ لے کر رہا کیا اور کینیڈا اور امریکہ کے طالب علموں نے ان لوگوں کی رہائی کے لئے بہت شور مچایا تو پھر مقدمہ چلایا گیا۔ بہرحال طارق احسن 1984ء میں کینیڈا آئے اور جب سے یہاں مقیم ہیں۔

میرا میکہ اور سسرال بھوپال میں ہیں۔ بہن بھائیوں میں سے کوئی بھی پاکستان نہیں آیا نہ ہی میرے میاں کے بہن بھائیوں میں سے کسی نے ہندوستان چھوڑا۔ ہند و پاک دشمنی بھی تعلقات میں حائل رہی اور ہر بار بڑی ہی مشکل سے ویزا لے کر میں جا سکی' اور وہاں بھی وہی صورتحال تھی سالہا سال بعد ایک دوسرے سے مل سکے تھے۔ یہ کہانی تو سب کی کہانی ہے۔ مگر میری کہانیوں میں ہجرت قدرتی طور پر ایک موضوع رہا ہے۔ اس کے علاوہ سیاست سے دلچسپی تھی اس لئے پاکستان کی تاریخ کے ہر دور میں لکھتی رہی کینیڈا آ کر بھی لکھنے کا شغل جاری ہے۔

میری ایک بہت پیاری سی پوتی ہے اسے پڑھاتی ہوں اس کے ساتھ کھیلتی ہوں اور یہ خوبصورت مصروفیت خوش رہنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ کینیڈا آ کر جو کہانیاں لکھی ہیں وہ بھی اب اتنی ہیں کہ ایک مجموعہ شائع ہو سکتا ہے۔ انشاء اللہ بشرط فرصت سب کام ہو سکیں گے۔ میرے بہن بھائیوں میں بھی سب کو ادب کا ذوق ہے میری چھوٹی بہن زہرہ جمال اچھی افسانہ نگار ہیں اور بمبئی میں رہتی ہیں۔

بیسویں صدی بھی اپنے ادب کے چاند سورج اور ستارے ایسے ہی روشن رکھے گی جیسے سرسید اور ان کے ساتھی زندہ جاوید ہیں اور اس دور کے بعد پریم چند اور عبدالحلیم شرر اور اس دور کے سب ہی لکھنے والے آج پڑھے جاتے ہیں اسی طرح آج کے نثر نگاروں کرشن چندر بیدی' عصمت' قرۃ العین حیدر' ندیم قاسمی وغیرہ اور شاعروں میں ندیم' فیض' فراق' سردار جعفری' کیفی' ساحر

لدھیانوی، ادا جعفری، پروین شاکر غرض اپنے جلو میں ایک پورا قافلہ لئے یہ سب بھی زندہ و پائندہ ہیں۔

جدیدیت کی تحریک اردو ادب میں زیادہ دم نہ دکھا سکی اور علامت نگار اب کہانی کی طرف آرہے ہیں۔ مشکل اور مبہم لکھنے والوں نے ادب کا ذوق کم کیا ہے اور جاسوسی اور رومانی ناولوں کا زور بڑھا ہے جدیدیت سے لوگ اکتا گئے ہیں۔

موجودہ صدی میں اردو میں بہت اچھے ناول لکھے گئے ہیں اور ان کی تعداد کو کم نہیں کہا جا سکتا۔

ادیب کی رہنمائی کی ضرورت نہیں وہ تو خود راستہ دکھاتا ہے۔ اپنے دور کے لئے اقبال خضر تھے۔ حالی نے بھی اپنے دور میں راہ دکھائی اور پھر ترقی پسندوں کے دور میں بے شمار دریچے کھل گئے۔ ذہنی اور نفسیاتی بحران کا شکار وہ لوگ ہوتے ہیں جو کوئی روحانی مقصد نہیں رکھتے۔

شاعری ہو یا نثر معیاری ادب کے پیمانے ہمیشہ "قبول عام" ہی کی سند کئے رہے ہیں مگر ہمارے دور میں معیار کے لئے نقادوں نے اپنی اپنی منڈلیاں سجا رکھی ہیں گروپ بندیاں ہیں گروہ بندیاں ہیں اور یہی کسی معیار کا فیصلہ کرتی ہیں۔ یا حکومت کی سرپرستی بھی معیار کا فیصلہ کیا کرتی ہے۔ مگر وقت ہی سب سے پکی کسوٹی ہے اس لئے ذوق کو زمانے نے غالب کے بعد ہی جگہ دی۔

پاکستان اور ہندوستان سے باہر شاعری زیادہ ہو رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مشاعرے منعقد ہوتے ہیں اور شاعر اپنی لکھی چیزیں سنا سکتے ہیں نثر نگاروں کے لئے باہر کے ملکوں میں کوئی پلیٹ فارم نہیں ہے اردو پریس نہیں ہے۔ لکھ کر چیزیں ہندوستان پاکستان میں چھپواتے ہیں۔

اردو میں سب سے زیادہ تو انگریزی الفاظ ہی داخل ہو رہے ہیں نئی نسل جو پاکستان یا ہندوستان میں اردو بولتی ہے اس میں اردو کم انگریزی زیادہ ہوتی ہے۔ اور یہاں تو اردو چند ہی گھرانوں میں بچوں کو سکھائی جاتی ہے عام طور پر بچے انگریزی یا فرنچ بولتے اور پڑھتے ہیں۔

اپنی زندگی کا کیا اہم واقعہ لکھوں میرے لئے تو یہی واقعہ اہم ہے کہ مشرق سے مغرب میں آگئی۔

پاکستان میں تنقید گروہی سیاست کا شکار ہے ہندوستان میں زیادہ اچھی کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ تراجم واقعی کم ہوئے ہیں۔

AKHTER JAMAL
401-2710, SARATOGA PLACE
GLONCESTER, ONT KIT 1Z2, CANADA

سایہ آنکہ مست عشقش ہمچو داماں بر زمین
عشق چون صیاد او بر آسمانست ای پسر

عشق را از من مپرس از کس مپرس از عشق پرس
عشق در گفتن چو ابر دُر فشانست ای پسر

ارشاد احمد صدیقی
Oxnard, CA.

ارشاد احمد صدیقی

لاس انجلس۔ امریکہ

اردو افسانے نے کئی کروٹیں لیں اور ایسی تبدیلیوں سے روشناس ہوا کہ اس کی شکل پہچاننا دشوار ہو گئی تھی۔ افسانے کی شناخت کے جتنے اصول مقرر ہوئے تھے تقریباً سب باطن ہو چکے تھے اور وہ ساری تعریفیں بھی بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں جو پریم چند سے چل کر کرشن، منٹو، بیدی اور عصمت تک پہنچتی تھیں۔ تجزیہ کیا جائے تو یہ سب بھی فطری تھا۔ نئے لکھنے والوں کو نئی راہوں کی تلاش تھی۔ وہ نئے تجربے بھی کرنا چاہتے تھے اور بھیڑ سے علیحدہ اپنی راہ متعین کرنے میں کوشاں تھے۔ پھر قاری کو چونکانے کی خواہش بھی ایک بڑا مسئلہ بنی رہی اور خواہش اس حد تک بڑھی کہ اسے جدیدیت کا نام مل گیا مگر اس زمانے میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے کلاسک کے ساتھ چلنا مناسب جانا۔ وہ علامت کے نام پر افسانے کا حلیہ خراب کرنے کے قطعی حق میں نہ تھے۔ ان میں ایک نام ارشاد احمد صدیقی کا بھی ہے۔ گو ارشاد پاکستان سے جانے کے بعد "سفر" میں ہی رہے لیکن قلم سے ان کا ناطہ برقرار رہا اور وہ انگریزی میں لکھنے کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی لکھتے رہے چنانچہ عاشور کاظمی نے اپنی کتاب "فسانہ کہیں جسے" میں جن افسانہ نگاروں کو نمائندگی دی ہے ان میں ارشاد احمد صدیقی کا نام بھی شامل ہے۔ ارشاد کے بارے میں عاشور لکھتے ہیں کہ "اس کتاب میں

ان کی کہانی "وقت بدل رہا ہے" سے ہسپانوی نام نکال دیے جائیں تو یوں لگے کہ جیسے یہ کہانی پاکستان کے پس منظر میں لکھی گئی ہو۔ ارشاد احمد صدیقی کا وطن سے یہی لاشعوری رشتہ یقین دلاتا ہے کہ دو سال بعد جب وہ امریکن سول سروس سے ریٹائرڈ ہوجائیں گے تو اہل وطن کو کھویا ہوا ارشاد احمد صدیقی واپس مل جائے گا۔" (عاشور کی یہ کتاب 1993ء میں شائع ہوئی ہے) میں عاشور کو مبارکباد دیتی ہوں کہ انہیں ان کا ارشاد احمد صدیقی واپس مل گیا ہے۔ سن 1999ء میں میری کتاب "سخن ور" حصہ دوم اور سوم کی تقریب میں ارشاد احمد صدیقی نے اپنی ایک نظم سنائی جس میں پشاور کو یاد کیا گیا تھا۔ پھر وہ اور آصفہ نشاط خاصی دیر تک اپنے "پشاور" کے قصہ خوانی' بازار سے لے کر کڑھائی گوشت اور پشاور کے حسن کے تذکروں میں کھوئے رہے۔ جب میں نے ارشاد احمد صدیقی سے مخاطب ہو کر کہا "قصہ خوانی بازار سے وابستگی کا کچھ فائدہ تو ہونا چاہیے۔ ذرا آپ اپنی بپتی' قصے کے انداز میں سنایئے تو وہ یوں گویا ہوئے۔

"ارشاد احمد صدیقی میرا نام ہے۔ پیدائش یکم جنوری 1938ء کو ہفت زبان' شہر پشاور میں ہوئی۔ خاندانی پیشے کے سلسلے میں ہزارہ گیا۔ وہاں میرے والد صاحب نے ایجنسیاں کھولی ہوئی تھیں۔ ابتدائی تعلیم وہیں سے شروع کی۔ مزید تعلیم پشاور میں حاصل کی۔ ملازمت کا آغاز بھی پشاور سے ہوا۔ U.S Air Bare میں ملازمت کے دوران امریکہ جانے کا پروگرام بن گیا اور رخت سفر باندھا۔ کورنیل یونیورسٹی (Ithaca) نیویارک کے School of Hetel I Managements میں داخلہ لیا اور کورس مکمل کیا۔ اس کے بعد جرمنی روانہ ہوا۔ وہاں ملٹری کلب Management میں ملازمت اختیار کی اور ساتھ ہی ایک یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور U.S. History and Economic کے مضامین پر گریجویٹ کیا۔ اس کے بعد ملازمتی مصروفیات نے سفر کا ایک طویل سلسلہ جاری رکھا۔ اس سفر میں میری ساتھی' میری دوست' میری رازداں' میری بیوی' آرلین میری ہم سفر رہیں۔ ہمیں یو ایس نیوی کی سول سروس کے دوران مختلف ممالک میں سفر کا موقع ملا۔ آجکل کیلی فورنیا میں مقیم ہیں۔ نہ جانے کب تک یہاں بسیرا ہو۔"

دوسرے سوال کے جواب میں کہتے ہیں اگر ہم بیسویں صدی کے ادب کا جائزہ لیں تو ہمیں اس میں ادب کا مقام یقیناً "منفرد نظر آئے گا۔ ادب نے شہنشاہیت کے دربار سے غلامی کی طرف سفر کیا۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ادب کمپنی بہادر کی آنکھوں سے دیکھا کئے۔ پھر ایک طویل تگ و دو کے بعد صبح آزادی کا آفتاب عالم تاب طلوع ہوا۔ ادب نے نئے رنگ' نئے ترنگ سے زندگی کے اس نئے روپ کا مثبت آنکھوں سے سواگت کیا۔ آزادی ملی اور ذہن چلا اٹھے۔

یہ داغ داغ اجالا' یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

علامتی سازشیں ہم رکاب رہیں۔ بالآخر مارشل لاء نے ادب کے سارے قویٰ مفلوج کر کے

رکھ دیئے۔ بدترین صحافت "ڈائجسٹ" نے دربار شاہی میں ادب کی جگہ لی۔ اسلام کرشلائز ہوا۔ اسلامی ادب کے علم برداروں کو خلعت شاہی سے نوازا گیا۔ اس ساری ناتیقنی اور طویل اندھیری رات کے باوجود بیسویں صدی کے دانشور لوح و قلم کی پرورش کرتے رہے جس کی فہرست طویل ہے۔

ارشاد احمد صدیقی کا کہنا ہے "جدیدیت ناگزیر اور خوش آئند ہے۔ آج یہ تصور تک نہیں کیا جاسکتا کہ اکیسویں صدی کے کارپوریشن، کمپیوٹرز کے بغیر ایک قدم بھی چلیں سکیں گے۔ جس طرح کمپیوٹر روزمرہ کی زندگی میں داخل ہو کر زندگی کا جزو بن چکا ہے۔ اسی طرح جدیدیت کا ادب میں داخل ہونا ناگزیر ہے۔ ہم نے وقت کے سہارے قدم ملا کر چلنا ہے۔ دانشوروں نے جدیدیت کو حسن و خوبی سے ادب سے آشنا کیا ہے اور ادب کو نئے معانی اور نئے مفہوم بخشے ہیں۔"

ولی دکنی نے کہا ہے۔

عافیت کیا ہووے گا معلوم نہیں
دل ہوا ہے مبتلا دیدار کا

فیض احمد فیض کا کہنا ہے۔

ہر رگ خوں میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے

میر نے کہا تھا۔

برقعہ اٹھتے ہی چاند سا نکلا
داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

احمد فراز کہتے ہیں۔

تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

جہاں تک اردو ادب میں ناول کی افادیت کا تعلق ہے، یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ ناول، اردو ادب کے مزاج کو نہ سمجھ سکا۔ یا یہ کہ ناول اردو ادب کے لئے ہمیشہ بدیسی رہا۔ "توبتہ النصوح" سے لے کر جدید ناول تک کے سفر پر غور کریں تو صرف چند ہی نام آتے ہیں۔ ٹیڑھی لکیر (عصمت چغتائی) ایسی بلندی ایسی پستی (عزیز احمد) اداس نسلیں (عبداللہ حسن) اور آگ کا دریا (قرۃالعین حیدر) طبع ہو کر آیا تو اردو دان طبقہ چونک اٹھا۔ اگر اردو ادب میں جدید ناول تلاش کیا جائے تو "آگ کا دریا" بار بار سامنے آئے گا۔ یا یوں کہئے کہ "آگ کا دریا" کے معیار کا ناول کی تخلیق کیوں نہیں ہو رہا؟ اکیسویں صدی میں ادب عالیہ کے معیار پر ناول کی تخلیق کا انتظار کریں۔

ارشاد کہہ رہے تھے معیاری ادب کے پیمانے کل کیا تھے؟ آئندہ کل کیا ہوں گے؟ گزرا ہوا

کل تاریخ ہے آنے والا کل مستقبل۔ آنے والے کل' گزرے ہوئے کل کے معیاری پیمانے باکل مختلف ہوں گے۔ کائنات دن بہ دن سکڑ رہی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے سالوں کی مسافتوں کو سیکنڈز میں سمو کر رکھ دیا ہے۔ معیاری ادب کا پیمانہ 'بین الاقوامی تفکر اور عظمت انساں کی سچائی کا علم بردار رہے گا۔

سجاد ظہیر کی کتاب "روشنائی" سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

"فن برائے فن کو ماننے والے فردوسی کے شاہنامے' مولانا روم کی مثنوی' سعدی کی گلستان' بوستاں' تلسی داس کی رامائن' انیس کے مرثیوں' وارث شاہ کی ہیر' حالی کی مسدس اور اقبال کے کالم کے بیشتر حصوں کو غالبا" فن ہی نہیں سمجھتے اور نہ ہی مانتے ہیں' اس لئے کہ ان ادبی شہ پاروں میں صاف اور کھلے طریقے سے چند اخلاقی اور روحانی اصولوں کو ان شاعروں نے پیش کیا ہے۔ ان کا مقصد اپنے عہد کے انسانوں کو بہتر انسان بنانا مقصود تھا۔"

غالبا" جواب اس اقتباس کے آخری حصے میں پوشیدہ ہے کہ "اپنے عہد کے انسانوں کو بہتر انسان بنانا مقصود ہے۔"

ساتویں سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں.... "وطن سے باہر شاعری زیادہ ہو رہی ہے بجائے اور اس کی وجہ وقت ہے۔ نثر کم لکھی جا رہی ہے اس کی وجہ بھی وقت ہے لیکن وطن سے باہر جو نثر لکھی جا رہی ہے وہ معیاری ہے اور بین الاقوامی شعور کے قریب ہے۔ یعنی یوں کہئے کہ وطن سے باہر لکھا جانے والا فکشن وطن میں لکھے جانے والے فکشن سے بہتر ہے۔ وطن سے باہر نہ تو موضوعات کی کمی ہے اور نہ ہی جرات کی' البتہ اگر کمی ہے تو صرف "وقت" کی۔

سوال آٹھ کے جواب میں کہتے ہیں.... اردو زبان نے دوسری زبانوں کو فراخ دلی سے اپنے دامن میں سمویا' اس کے حسن اور ادائیگی کو نکھارا' سنوارا' جس طرح اردو نے مغلیہ دور میں فارسی کو برتر زبان کا درجہ دیا (کیونکہ وہ حاکم وقت کی زبان تھی) جدید ٹیکنالوجی نے علم طب' علم جراحت' خلائی تسخیر' کمپیوٹرزیشن وغیرہ نے انگریزی زبان کی گود میں جنم لیا اور ترقی کے مدارج طے کئے۔ اردو زبان فارسی اور عربی زبانوں کے مقابلے میں انگریزی زبان سے قریب تر ہے۔ اردو دان طبقے کے لئے انگریزی زبان سے گریز خود کشی کے مترادف سمجھا جائے گا۔ موجودہ ملکی حالات اور ملاؤں کی بالادستی' اسلام کی کمرشلائزیشن' خمینی اور طالبان نما انقلاب کے باوجود زبان کی ترویج نہیں رک سکے گی۔ وہی غالب والی بات۔

پھر تیرے کوچہ کو جاتا ہے خیال
حال گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

آگے فرماتے ہیں.... تنقید کی کمی کی وجہ بھی وقت کی کمی ہے' مطالعہ کی کمی ہے اور جو تنقید گاہے گاہے نظر آتی ہے' اس میں اعلیٰ ادبی معیار اور بے لاگ تبصرے کا فقدان کھٹکتا ہے۔ اگر اجازت دیں تو عرض کریں کہ تنقید نے وہی نقاب اوڑھ لی ہے جو کتاب پر فلیپ لکھنے والے اوڑھتے ہیں۔

سوال کا دوسرا حصہ تراجم ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے تراجم کو لمحہ فکریہ نہیں کردانا جانا چاہئے۔ تعلیم' سفر' صحافت اور جدید ٹیکنالوجی کی بھرمار نے دنیا کے انسانوں کو قریب تر کردیا ہے۔ پسماندہ علاقوں میں اس کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے لیکن پسماندہ علاقوں میں ادب کی طرف توجہ ہی کون دیتا ہے؟ اس المیہ کا ذمہ دار موجودہ ملکی نظام ہے۔ تعلیمی اداروں کی بے حسی' خود غرضی' زر پرستی نامخلصی اگرچہ آج کی پیداوار نہیں لیکن آج کے ملکی نظام میں خوب پھل پھول رہی ہے۔ یہ نہ سمجھیں کہ ادیب اور دانشور ذہنی طور پر مفلوج ہوچکا ہے۔ بجائے اس کے مالکان' پریس' پبلشرز اور مالکان صحافت ہوس گیری کا شکار ہوچکے ہیں۔ اگر دانشور اپنا قیمتی وقت نکال کر ادب کی تخلیق کرتا ہے تو اسے اس کا صلہ کیا ملتا ہے؟ اگر صلہ نہ ملے تو تخلیق کی رفتار میں کمی آنا لازم ہے۔ اس کا ذمہ دار دانشور نہیں۔ "دوسرا طبقہ" ہے جسے ناشر کہتے ہیں.... اس سے زبان و ادب کو ضرور نقصان پہنچے گا' جس کی ذمہ داری ادیب و شاعر پر عائد نہیں ہوتی۔ دانشور خلعت شاہی کے طلب گار نہ تھے نہ ہوں گے۔ سچے دانشوروں نے "حق بہ حق دار رسید" کا علم ہمیشہ بلند رکھا۔ آخر میں ایک قدیم امریکن انڈین نظم کا ترجمہ (جو ہمارے آنے والے ناول کا حصہ ہوگی) پیش کرتا ہوں۔

اے زمین ہماری ماں' اے آسمان ہمارے باپ
ہم تمہاری اولاد' تھکی کمروں کے ساتھ
تمہارے لئے تحائف لے کر آئے ہیں
ہمارے لئے روشنی کا لباس بنیئے' جس میں طلوع سحر کی سپیدی ہو
جس میں غروب آفتاب کی سرخی ہو
جس کی جھالریں برستی بارش کا نشان دیتی ہوں
جس کے کنارے کھڑے قوس و قزاح کی طرح منور ہوں
ہمارے لئے روشنی کا لباس بنیئے گا کہ ہم
ثابت قدمی سے وہاں جاسکیں
جہاں طیور نغمہ زن ہیں' جہاں گھاس مخملیں ہے
اے زمین ہماری ماں' اے آسمان ہمارے باپ!

MR. IRSHAD A.SIDDIQUI
801 IVY WOOD DRIVE
OXNARD CA 93030
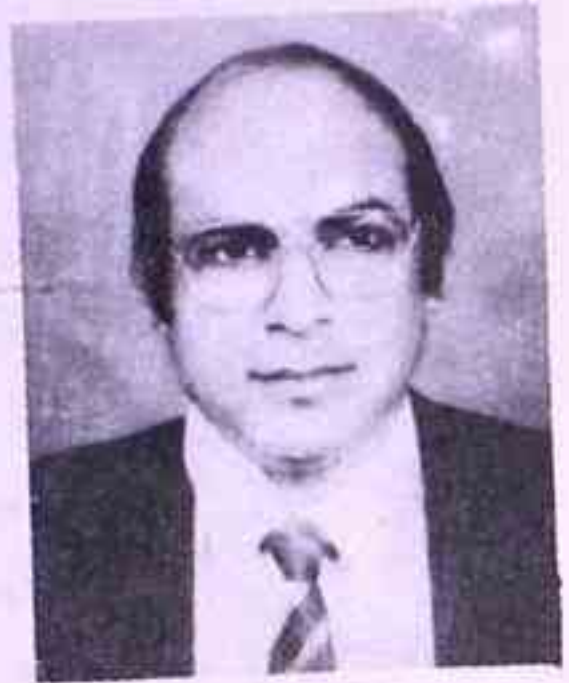
ارمان شمسی

ارمان شمسی

ڈھاکہ

محمد ارمان جو اب اردو ادب کی دنیا میں ارمان شمسی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں ۲۱ اگست ۱۹۳۵ء کو قصبہ آنولہ ضلع بریلی یوپی میں پیدا ہوئے۔ ہجرتوں کے دکھ انہیں نوجوانی سے ہی سہنا پڑے۔ ایک نہیں دو دو ہجرتیں جو جبری تھیں' سیاسی تھیں۔ ان ہجرتوں نے ان کی تعلیم کو ہی متاثر نہیں کیا انہیں ذہنی اور جسمانی عذاب بھی دیئے۔ اور جب ایک احساس ادیب ان عذابوں کو سہتا ہے تو اس کے اثرات اس کی زندگی پر کچھ اس طرح مسلط ہوتے ہیں کہ اس کی صلاحیتوں کو بھی زنگ لگا دیتے ہیں۔

مگر ارمان شمسی نے اپنے اعصاب شکستہ نہیں ہونے دیئے۔ انہوں نے ناسازگار حالات میں افسانوں کی دنیا میں پناہ لی اور لکھنا شروع کیا۔ ان کی کہانیاں مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔ یہاں مجھے جیلانی بانو کی کہی چند باتیں یاد آ رہی ہیں جو انہوں نے اپنے انٹرویو کے دوران کہی تھیں۔

ان سے پوچھا گیا تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کے اردو افسانے اور شاعری میں آزادی کے

بعد بہت بڑا فرق آیا جب کہ مسائل تقریباً ایک سے ہی تھے۔ ہجرت کا مسئلہ 'مہاجرین کا مسئلہ' فسادات اور اس میں لٹنے والوں اور ان سے متاثر ہونے والوں کی کہانیاں۔ لیکن بعد میں ہندوستان اور پاکستان کے موضوع اور مسائل میں نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ جب کہ تیکنیک اسلوب اور ہیئت میں کوئی خاص فرق نمایاں نہیں ہوا۔ جیلانی بانو نے جواب میں کہا "اس کا حاصل یہ ہے کہ لکھنے والا اپنے گرد و پیش کے مسائل پر بھی لکھتا ہے جیسے میں زیادہ تر حیدر آباد آندھرا پردیش میں رہی ہوں یہی میری کہانیوں کا موضوع بنا۔"

یہ انٹرویو ۱۹۹۱ء میں ہوا تھا۔ حیرت ہے کہ سابق مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بننے کے باوجود اس کا ادب زیر بحث نہیں آیا۔ اور میرے خیال میں اس کی وجہ بنگلہ ادب کی بجائے اردو ادب زیر بحث تھا اور اردو افسانہ لکھنے والے ہندوستان میں ہوں' پاکستان میں' بنگلہ دیش میں یا مشرق وسطیٰ اور سعودی عرب میں ہوں ان کی جڑیں بہرحال ایک ہی کلچر ایک ہی تہذیب سے جا ملتی ہیں۔ انہیں ملکوں کے مسائل بہرحال موضوع بنتے ہیں جیسے اب اگر بنگلہ دیش میں اردو لکھنے والے افسانہ نگاروں کے افسانے پڑھیں تو بنگلہ کلچر اور وہاں کے مسائل نمایاں نظر آئیں گے۔ مگر شاعری کا ماحول تقریباً ایک سا ہی ہے۔

یہاں ارمان شمسی کا لکھا ایک افسانہ "بھوک کا شکنجہ" کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"جب فاطمہ بی بی کے سامنے ٹرے میں گرم گرم بھات' شوربہ' دال اور کدو کی بھاجی آئی تو ان کی تو باچھیں ہی کھل گئیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دو روز کی فاقہ کشی کے بعد اچانک عین دوپہر کو کھانے کے وقت روزہ کشائی گرماگرم کھانے سے ہوگی۔ انہوں نے اپنی ملگجی آنکھوں سے اسٹول پر رکھی ہوئی ٹرے کو جھک کر اچھی طرح سے دیکھنا چاہا تو چاولوں سے اٹھتی ہوئی گرم بھاپ تیر کی طرح ان کے نتھنوں میں گھستی چلی گئی اور بے اختیارانہ ان کے منہ سے خوشی کی ایک قلقاری نکل گئی۔ مگر اچانک کسی خیال سے ان کے دماغ پر یاسیت چھا گئی اور وہ بڑی حسرت سے اپنی کھوئی کھوئی آنکھوں سے اس کھانے کو تکنے لگیں غیر شعوری طور پر ان کی گرفت کھانے کی ٹرے پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی اور وہ سحر زدہ سی اپنی کانپتی ہوئی ٹانگوں کو لرزنے سے روکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھیں کہ ایک نرس کا ادھر سے گزر ہوا اور اس نے ڈپٹ کر کہا۔

"اے بڑھیا کیا کر رہی ہے کھانا کیوں نہیں کھا لیتی۔ یوں ہی ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

فاطمہ بی بی نے بے اختیاری میں نرس کا ہاتھ تھام لیا اور بولیں۔

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

نرس نے بڑی نخوت سے ان کی طرف دیکھا اور کرخت لہجے میں بولی۔

"تجھ سے پیسے دینے کو کون بولتا ہے خواہ مخواہ بدنام کرتی ہے۔ یہ کھانا تو مفت ہے۔" اور

"کھانا مفت ہے' کھانا مفت ہے' کھانا مفت ہے..." کی بازگشت فاطمہ بی بی کے کانوں کے گرد طواف کرتی رہی دراصل انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ قسمت اس طرح بھی مہربان ہو سکتی ہے۔ انہوں نے گھبرا کر نرس سے پوچھا۔ "تو کیا میں کھانا کھالوں۔"

نرس نے جھنجلا کر کہا۔ "ہاں' ہاں کھاؤ نا۔ روکا کس نے ہے تمہیں۔" نرس کی آواز سنتے ہی فاطمہ بی بی کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی اور ان کے کمزور فاقہ زدہ ہاتھ باز کے مضبوط پنجوں کی طرح کھانے کی طرف لپکے مگر وہاں کسی قسم کی مزاحمت تو تھی نہیں کہ کھانے میں دشواری ہوتی وہاں تو سیدھے سادے ابلے ہوئے چاول اور ترکاری تھی۔ ایک بار وہ ملغوبہ مٹھی کے شکنجے میں پھنستا تو سیدھا حلق کی راہ پیٹ کے اندھے کنوئیں میں دھنستا چلا جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا تھال خالی ہو گیا۔ تھال سے منہ لگا کر فاطمہ بی بی نے بچی کھچی دال بھی غٹ سے چڑھالی اور پھر پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ہسپتال کی پوری گیلری میں بیڈ ہی بیڈ تھے اور ان کے پاس اسٹول رکھے تھے جن پر کچھ عورتیں بیٹھی اب بھی کھانا کھا رہی تھیں۔ پاس سے گزرتی ہوئی نرس کو روک کر انہوں نے پوچھا۔

"کیا پانی مل سکتا ہے؟ نرس نے قہر آلود نگاہوں سے انہیں دیکھا اور ان سے بولی۔ "ہم کیا تمہارے نوکر ہیں جو پانی بھی لا کر دیں باہر نل لگا ہوا ہے خود جا کر پانی پی لو۔"

ہندوستان اور پاکستان کے معاشی حالات کی ایک سی تصویر کشی ہے۔ اب چاہے اس میں بنگلہ دیش کا اضافہ کر لیا جائے۔ بیشتر نرسوں کا رویہ بھی ایک سا ہے اور وجہ وہی معاشی حالات۔ تنخواہیں کم اور کام کا بار زیادہ۔ ناہموار مستقبل اور مرے پر سو درے یہ کہ نرسنگ کے پیشے کو برصغیر میں وہ احترام ہی نہیں دیا گیا جس کا وہ متقاضی ہے۔

تو آیئے اب ارمان شمسی سے ملتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آنولہ یوپی سے چل کر وہ ڈھاکہ بنگلہ دیش کیسے آن بسے اور اب ہماری پیاری اردو زبان کا وہاں کیا حال ہے؟

ارمان کہہ رہے تھے۔ "میری پیدائش ایک تجارت پیشہ خاندان میں ہوئی' تجارت پیشہ ہونے کے باوجود اس خاندان میں تعلیم کا شوق ہمیشہ سے رہا۔ میرے چاچا مرحوم جو عنفوان شباب میں رحلت کر گئے دیو بند کے عالم اور دستار بند تھے' دادا بھی قصبہ کے مشہور عالم مانے جاتے تھے۔ میری پیدائش کے تین سال بعد ہی میرے والد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ نہایت کسمپرسی میں سبھاش انٹر کالج آنولہ سے انٹر پاس کیا۔ اب آگے پڑھنے کے لیے شہر بریلی جانا پڑتا لہٰذا بجائے بریلی کے کلکتے پہنچا دیا گیا اور ایک دکان میں سیلز مین مقرر ہو گیا۔ تعلیم حاصل کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا لہٰذا اس درمیان جامعہ اردو علی گڑھ سے پرائیوٹ پڑھ کر ادیب' ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات فرسٹ اور سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیے۔ بی اے کی ڈگری کے لیے پرائیوٹ طور پر پڑھ رہا تھا کہ ۶۴ء میں ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے

ہجرت کرنا پڑی اور میں ڈھاکہ مشرقی پاکستان پہنچ گیا' اب از سرنو روزی روٹی کی فکر سے مزید تعلیمی سلسلہ بند ہو گیا' نو عمری سے ہی لکھنے لکھانے کا شوق تھا۔ بچوں کے رسالوں میں کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھا کرتا تھا پھر آہستہ آہستہ افسانہ نگاری کی جانب مائل ہوا تو پالا پڑا بنگلہ دیش سے جہاں اردو زبان معتوب ہے اور ہند پاک کے اردو مسائل کہ جھلک بھی معدوم! کوئی بتلائے ہماری زبان میں جلا آئے تو کہاں سے آئے؟

سوال ۲ کے جواب میں یہ نام ذہن میں آتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی' جناب جمیل الدین عالی' قرۃ العین حیدر اور جیلانی بانو۔

سوال نمبر ۳ کا جواب ہے "جدیدیت نے فکشن کو مجروح کیا ہے۔"

میرے نکتہ نظر سے وقت کی کمی اور اس مشینی دور کی بھاگم بھاگ میں آدمی کے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ وہ ہفتوں بیٹھا ایک ہی کہانی پڑھتا رہے۔ وہ اپنی دلچسپی اختصار میں تلاش کرتا ہے۔ اس لیے ناول لکھنے اور پڑھنے کا رجحان کم ہو رہا ہے۔

"بہتر زندگی سے آپ کی مراد اگر مادی ترقی ہے تو اس کے لیے موجودہ نظام کیا برا ہے' ویسے میرا خیال ہے آج کا ادیب سکون کا متلاشی ہے اور سکون قناعت سے منسلک ہے جس کے ڈانڈے مذہبیات سے جا ملتے ہیں۔

سوال نمبر ۶ کا جواب ہے تھکے ہوئے ذہن کو کچھ لمحے سکون کے دینا' انسانی زندگی کے مسائل اور ان کے حل کی نشان دہی کرنا۔

سوال نمبر ۷ کے سلسلے میں عرض ہے وقت کی کمی۔ کیوں کہ نثر کا پھیلاؤ زیادہ وقت کا متقاضی ہوتا ہے۔"

میرے خیال میں اردو زبان کی ترقی کے لیے اگر اردو کے رواں الفاظ اور روزمرہ میں انگریزی کے الفاظ کی شمولیت کی جائے تو سراسر نادانی ہے البتہ سائنسی اصطلاحات یا ایسے الفاظ جو اردو میں موجود نہیں انگریزی سے لیے جائیں تو یقیناً" زبان کی ترقی ہوگی۔"

"میری زندگی کا اہم واقعہ تو میرا عشق تھا جس میں مجھے ناکامی ہوئی اس واقعہ میں دلچسپی یہ ہے کہ اس ناکام کہانی سے میرے ذہن نے جلا پا کر بہت سی کہانیوں کو جنم دیا۔

سوال نمبر ۱۰ کے جواب میں کہتا ہے۔ "دراصل اب اردو ادب بھی سمٹ کر رہ گیا ہے۔ کیا اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ صدی کے اس آخر دور میں جب کہ ہماری آبادی کئی گنا بڑھی ہے ہماری ادب کا پھیلاؤ اتنا ہی سمٹا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو الکٹرونک میڈیا ہے' دوسری اردو والوں کی بے حسی ہے۔ وہ اپنی زبان کی اتنی قدر نہیں کرتے جتنی اور دوسری قومیں اپنی زبانوں کی کیا کرتی ہیں۔ بنگلہ دیش کو ہی لیجیے جہاں سرکاری و نیم سرکاری تمام ادارے اپنا کام بنگلہ زبان میں کرتے ہیں حتیٰ کہ بنکنگ اور اکاؤنٹنگ کا کام بھی

بنگلہ میں ہی ہوتا ہے' ایک اور بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ سرزمین ہند جو کہ اردو کا سرچشمہ تھی وہاں اب اردو کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ اردو زبان وہاں دم توڑ رہی ہے۔ رسائل کی اشاعت روز بروز گھٹتی جا رہی ہے ایسے حالات میں جہاں دائرہ کار ہی سمٹتا جا رہا ہو وہاں ادبی ماحول میں کمی واقع ہونا تو لازمی ہے۔"

MR. ARMAN SHAMSI
K/112 LAL BAGH ROAD
DHACA (BANGLA DESH)

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غالب

طارق
۹۹ء

آصف الرحمٰن

نیو جرسی

آصف الرحمٰن طارق کو میں تو گوشہ نشین کہوں گی۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "اکیلا آدمی" پڑھ کر مجھے لگا میں طارق کو برسوں سے جانتی ہوں جبکہ ان سے نصف ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ حیرت اور افسوس دونوں احساسات سے مغلوب تھی۔ اب میں حمیرا رحمٰن کی شکر گزار ہوں۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ مجھے چند افسانہ نگاروں اور شاعروں (شاعرات بھی) کے پتے دیں۔ حمیرا کا تعارف "سخن ور" (حصہ دوم) میں موجود ہے مگر حمیرا کو میں اس سے بھی بہت پہلے سے جانتی ہوں اور اب تو وہ اپنی شاعری کے حوالے سے شاعرات کی صف اول کی قطار میں ہیں۔

حمیرا نے مجھے آصف الرحمٰن طارق کا پتہ لکھا تھا۔ اب ان کے مجموعے کا افسانہ "اکیلا آدمی" پڑھا تو محسوس ہوا کہ اس کردار سے میری بڑی ذہنی ہم آہنگی ہے۔ پھر طارق سے کیوں نہ ہوتی۔ یہ افسانہ بلاشبہ ایسا ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد قاری نہ افسانے کو بھولتا ہے (اگر نسیان کا مرض نہ ہو تو) نہ افسانہ نگار کو۔ چاہے اس کی کوئی قدر مشترک اس افسانے کے کسی بھی کردار سے نہ ہو مگر طارق کے دیگر افسانوں میں قاری کو کہیں نہ کہیں کوئی ایک گوشہ یا کوئی ایک کردار ایسا مل جاتا ہے

جس میں وہ اپنی جھلک دیکھتا ہے یا اس گوشے میں ایک تماشائی کی حیثیت سے موجود رہتا ہے۔
آصف کے افسانے بہت طویل نہیں ہیں اور ان میں کہیں جھول بھی نہیں۔ کم وقت میں کم الفاظ میں کہانی کہہ دینے کا وصف طارق کو معلوم ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں جہاں کلاسیکی افسانوں کا تاثر قائم رکھتے ہیں وہاں جدید تقاضوں کو بھی ہم آہنگ کرنے کا گر جانتے ہیں۔ طارق کا افسانوں کے متعلق مطالعہ جتنا گہرا ہے اتنی ہی مضبوط گرفت بھی ان کی اپنے افسانوں پر ہے۔

اردو افسانے نے پچھلے پچاس سالوں میں خاصی ترقی کی ہے۔ بہت عرصہ زندہ رہنے والے افسانے بھی وجود میں آگئے ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ جتنی تعداد میں پچھلے پچاس سالوں میں معتبر ادبی جرائد شائع ہوتے تھے اب وہ نہیں رہے۔ ان کی جگہ ڈائجسٹوں نے لے لی ہے۔ گو ڈائجسٹوں میں "ادبی حصہ" مضبوط اور توانا ہوتا ہے مگر اب اس کا کیا کیا جائے کہ اسے ادب میں اب تک وہ مقام حاصل نہیں ہوا جو ادبی جرائد کو ہے۔ ادبی جرائد اب بھی شائع ہوتے ہیں مگر مالی وسائل خاطر خواہ نہ ہونے کے سبب وہ رک رک کر سانس لے رہے ہیں۔ ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہونے والے جرائد چاہے وہ فنون ہو تخلیق ہو انشا ہو یا الفاظ۔ ہند و پاک دونوں جگہ ان کے مدیران ایک سے مسائل کا شکار ہیں۔ پھر اس ماحول سے دور بسنے والے ادیب اور شعراء جن کو یہاں اپنے غم روزگار کے پیچ و خم سے فرصت نہیں ملتی وہ اول تو لکھنے کا وقت کم نکال پاتے ہیں دوسرے اس ادبی ماحول کو ترستے ہیں جو شعر کہلوانے اور کہانی کی تخلیق کے لئے محرک بنتا ہے۔ وہ باقاعدگی سے اپنی تخلیقات کی اشاعت کے وسائل سے محروم رہ جاتے ہیں۔ میرا اشارہ ان لوگوں کی طرف "خصوصاً" ہے جو اپنے مزاج کے اعتبار سے ان جرائد تک رسائی حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ طارق کا شمار بھی انہی لوگوں میں کیا جاسکتا ہے۔ ہجرتوں کے موسم سے طارق باہر نکلے تو اب نیوجرسی میں آن بسے ہیں جہاں شعری محفلیں تو ہوتی ہیں نثری محفلیں نہیں ہورہی ہیں کہ مہمیز لگے۔ میں اپنی کتاب "سخن ور" (دوم سوم) کی تقریب میں نیویارک گئی تو آصف الرحمن طارق سے میری ملاقات وہیں ہوئی۔ بہت محبت کرنے والے انسان ہیں مگر پی آر بڑھانے والا ان کا مزاج نہیں اسی لئے گوشہ نشین ہیں۔

گفتگو کے دوران میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اب وہ نثری نشستوں کا آغاز بھی کریں جس کی شدید ضرورت ہے۔ ماہانہ ہو یا دو ماہی مگر اب افسانے اور مضامین بھی پڑھے جائیں ان پر تنقید بھی ہو۔ یوں اردو ادب کی اس صنف کو بھی محفلوں میں شعر کی طرح نمایاں ہونے کا موقع ملے۔

اردو ادب سے طارق کو بچپن سے لگاؤ تھا، مگر طالب علمی کا زمانہ سائنس پڑھتے ہوئے گزارا، کئی سال تک یہی مضمون ذریعہ معاش رہا، پھر تجارت کی اور رہی سہی کسر تجارت کے پیشے نے نکال دی، کہاں کی اردو اور کہاں کا ادب اور پھر سونے پہ سہاگہ ملک سے مستقل طور پر دور ہی رہے۔ ۱۹۸۱ء سے وطن میں رہنا نصیب نہیں ہوا، ایسے میں اردو کہاں سے پڑھتے بس گاہے گاہے جب بھی

وقت ملا ادھر ادھر منہ مار لیا۔ اور جو بھی لکھا پہلی کتاب کی صورت میں یکجا کر دیا۔

آصف بڑے یقین سے کہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے اردو ادب میں فیض احمد فیض' پریم چند' کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی' سعادت حسن منٹو' احمد ندیم قاسمی' مرزا رسوا 1858ء تا 1931ء) انتظار حسین' عبداللہ حسین' بانو قدسیہ' پطرس اور مشتاق احمد یوسفی زندہ رہنے والے نام ہیں۔ ان کے علاوہ بھی سینکڑوں اور ہیں' مگر مندرجہ بالا شاعر' افسانہ و ناول نگار اور طنز و مزاح نگار کے متعلق قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔

فکشن کے لطیف آرٹ کو جدیدیت نے نکھارا سنوارا یا مجروح کیا اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اگر جدیدیت سے مراد علامتی اور تجریدی تحریریں ہیں تو میرا خیال ہے کہ اس نے فکشن کے آرٹ کی لطافت اور اس کے حسن کو نہ نکھارا ہے' نہ سنوارا' بس گزارا کیا ہے۔ جس چیز میں بھی ابلاغ نہ ہی ہو وہ قاری کی سمجھ میں نہیں آئے گی' علامتی تحریروں میں ابلاغ نہیں ہوتا۔ مفہوم نیم گم ہو جاتا ہے' ایسی تحریروں سے فائدہ؟ خارجی حقیقت نگاری' سماجی واقعیت نگاری' اور مقصدیت کے فقدان سے جاندار تحریریں نہیں لکھی جا سکتیں۔

اور اگر جدیدیت سے مراد پریم چند کے الفاظ میں یہ ہے "ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو' آزادی ہو' حسن کا جوہر ہو' تعمیر کی روح ہو' زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو' جو ہم میں حرکت' ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے' سلائے نہیں' کیوں کہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔" تو اس نے بلاشبہ اردو افسانے کا قد' دنیا کی دوسری زبانوں کے بہت اچھے افسانوں کے قد کے برابر کر دیا ہے۔"

موجودہ صدی میں اردو ادب میں ناول کم لکھے جانے کا جواز ان کے نزدیک یہ ہے کہ ناول کا کینوس بے حد وسیع ہوتا ہے' اور یہ وسعت زندگی کے وسیع تر مطالعہ اور فنی ریاضت سے پیدا ہوتی ہے۔ ناول نگار کو اپنے زمانہ کا شاہد ہونا چاہئے۔ اس کے پاس بقول غالب وہ دیدہ بینا ہونی چاہئے جو قطرے میں بھی دجلہ دیکھ لیتی ہے۔ یہ اردو کا المیہ ہے کہ ماسوا چند ہمارے بیشتر ناول نگاروں کے پاس وہ دیدہ بینا نہیں اور نتیجہ اس صورت میں نکلا جس سے اردو ناول دوچار ہے۔

بہتر زندگی بسر کرنے کے لئے ہمارے ادیب کو جس نظام فکر کی تلاش ہے اس کی رہنمائی کے لئے طارق کی تجویز ہے کہ ہمارے ادیب کی فکری اور ادبی تربیت عوامی جمہوری تحریک اور جدید حقیقت پسندی کے سماجی اور ادبی ماحول میں ہونی چاہئے۔

شاعری ہو یا نثر معیاری ادب کے پیمانے کیا ہوں؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا "ادب میں حرکت' اجتماعی مقصدیت اور فنی جمالیات لازمیت کے زمرے میں آتے ہیں' اس کے علاوہ ادب میں فرد اور انفرادیت کی نفی نہیں ہونی چاہئے۔"

بیرون پاک و ہند میں شاعری کے مقابلے میں نثر کم لکھے جانے کا جواز ان کے نزدیک نہ تو وقت نہ

موضوعات اور نہ ہی جرات کی کمی ہے۔ ان کا کہنا ہے "کمی ہے تو اس جذبے کی جو نثر لکھواتا ہے۔ زیادہ تر لوگ شاعری کو "بہتر ادب کا اور نثر کو کم درجہ کا ادب سمجھتے ہیں' یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔"

طارق کی رائے میں اردو زبان میں انگریزی کے الفاظ کی عدم شمولیت سے اس کی ترقی رکنے کے امکانات قطعی نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے اردو کا دامن بے حد وسیع ہے' وہ اب بھی انگریزی زبان کے کچھ الفاظ کو گلے لگا لیتی ہے اور اپنا جامہ پہنا دیتی ہے۔ اس بات سے گریز کا مطلب یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ اردو انگریزی کے کئی الفاظ کو اپنے میں ضم کرنے سے محروم رہے۔ اس کی ترقی بہرحال نہیں رکے گی۔

طارق سے میں نے پوچھا "اپنی زندگی کا کوئی اہم اور دلچسپ واقعہ تو سنائیں۔" ہنستے ہوئے بولے "میری زندگی کا سب سے اہم واقعہ تو میری پیدائش ہے' رہا دلچسپ واقعہ تو وہ اس وقت ہوگا جب "گفتنی" میں میرے متعلق کچھ شائع ہوگا۔" (لو کر لو بات)

آخری سوال کے جواب میں طارق نے کہا "یہ بات صحیح ہے کہ اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے' اس بات سے اردو کو بے شک نقصان پہنچ رہا ہے' جب تک صحیح اور غلط کی تمیز نہ کی جائے' تقابلی مقابلہ نہ کیا جائے منفی بخیے نہ ادھیڑے جائیں' جو اچھی اور صحت مند تنقید کا خاصہ ہیں اس وقت تک گاڑی آگے نہیں بڑھے گی۔"

MR.ASIF R. TARIQUE
3405- WILD WOOD CT,
MONMOUTH 1CT, N.J. 00852 U.S.A

اُس درخواست پر جو میں نے کہا تھا اُنھوں نے سرپرست بننے کی منظوری دی۔ اور گفتگو کے دوران کہا۔ یاد رکھو۔

"جس تحریک میں لڑکیاں شامل ہوں گی وہ تحریک کامیابی سے ضرور ہمکنار ہوگی"

امراؤ طارق

کراچی

محبت نہ کرتے بڑا کام کرتے
محبت سے لیکن بڑا کام کیا ہے

فنی اعتبار سے یہ شعر اعلیٰ درجے کا نہ سہی لیکن امراؤ طارق کی شخصیت کے ساتھ وابستہ ہو کر اس شعر کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ امراؤ طارق نے اپنے دوستوں کے ساتھ ایسے ہی ٹوٹ کر محبت کی ہے کہ وہ "بڑا کام" ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے ان کی محبت کا جادو تو سر چڑھ کر بولا ہے۔ ڈاکٹر فرمان تو بلاشبہ اس کے مستحق تھے کہ ان کی حیات و خدمات پر جو کام ہوا ہے اسے دوام بخشا جائے اور صفحہ قرطاس پر لا کر عوام سے بھی متعارف کرایا جائے۔ مگر یہ بھاری پتھر جسے امراؤ طارق نے صرف چوم کر نہیں چھوڑا' اسے گٹھڑی میں باندھ کر چاروں کونے بھی کسی کو نہیں پکڑائے' خود کاندھے پر لاد کر چلا اور اسے اس کے مقام پر نصب کر دیا۔ یوں ایک نہیں تین جلدوں میں ڈاکٹر فرمان نظر آ رہے ہیں۔ چار

جلدوں میں تقریباً" 186دباء و شعراء نے انہیں تحریری خراج محبت سے نوازا ہے۔ یہ ڈاکٹر فرمان کی شخصیت کی مقناطیسی کشش تو ہے مگر امراؤ طارق کی کوششوں کے چراغ بھی جابجا روشن نظر آتے ہیں اور یوں امراؤ طارق کی شخصیت بھی اس پلڑے میں آجاتی ہے۔ جہاں "محبت کا وزن" معلوم کرنے کے لئے باٹ بھی کم پڑ جاتے ہیں۔

اسی امراؤ طارق کو آج ہم "گفتنی" کی محفل میں لے آئے ہیں تاکہ ان سے ان کے بارے میں کچھ سنا جائے، کچھ پڑھا جائے اور امراؤ کو جانا بھی جائے اور پرکھا بھی جائے۔

سید امراؤ علی نے جب اپنی مرضی سے ادبی دنیا کے دروازے پر دستک دی تو خود کو امراؤ طارق کے پیکر میں ڈھال کر لائے مگر اس دنیا میں تو وہ اپنی مرضی سے نہیں آئے چنانچہ 15 مارچ 1932ء کو موضع شاہ پور، ضلع فتح پور، ہسوہ (یوپی۔ انڈیا) کے مقام پر بھیجے گئے۔ ان کے مقدر میں ایک نامور ادیب بننا لکھا تھا چنانچہ انہیں آزمائشوں کی بھٹی میں تپایا گیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں اور پھر الہ آباد میں حاصل کی۔ مسلم ہائی اسکول فتح پور سے 1949ء میں میٹرک کیا۔ ملازمتوں کے ساتھ تعلیم کا حصول بھی جاری رہا۔ ایک دفتر میں ٹائپسٹ کی نوکری ملی تو شارٹ ہینڈ بھی سیکھ لیا۔

1949ء میں مشرقی پاکستان آئے اور 1952ء میں کراچی۔ 1954ء میں اردو کالج کراچی سے فرسٹ ایئر کیا اور 1959ء میں بی۔ اے۔ 1961ء میں اردو لاء کالج سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ 1987ء میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے شریعت لاء میں ڈپلوما لیا۔ 1995ء میں جامعہ کراچی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم۔ اے کیا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ گولڈ میڈل سے نوازے گئے۔ عمرہ اور حج کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ 1993ء میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس حکومت سندھ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

1994ء میں کراچی بار اور سندھ بار سے بحیثیت ایڈووکیٹ منسلک ہوئے مگر جناب جمیل الدین عالی (معتمد اعزازی) اور جناب مشفق خواجہ (خازن اعزازی) کی خواہش پر بحیثیت شریک معتمد انجمن ترقی اردو کراچی دفتر سے وابستہ ہوئے اور اب نائب معتمد ہیں۔

1980ء میں امراؤ کو ان کے پہلے افسانوی مجموعے "بدن کا طواف" پر آدم جی ادبی انعام مل چکا ہے۔ علامہ نیاز فتح پوری کے رسالہ "نگار" کے مدیر ہیں۔ اردو لاء کالج میں اعزازی لیکچرر ہیں، قانون پڑھاتے ہیں۔ ماضی میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے کراچی میں صوبائی سیکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ اردو کالج میگزین "برگ گل" کے مدیر رہے اور دو خاص نمبر شائع کئے۔ چنانچہ صحافت کا تجربہ بھی دامن میں سمیٹ لیا۔

"گفتنی" کے سوال نمبر 2 کے جواب میں انہوں نے کہا۔ بیسویں صدی میں اردو ادب کی تاریخ میں موجود رہ جانے والے چند افسانہ نویس اور ناول نگاروں کے نام ہیں۔ منشی پریم چند، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، غلام عباس، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، ابوالفضل صدیقی، قرۃ العین

حیدر، واجدہ تبسم، شوکت صدیقی، انتظار حسین، خدیجہ مستور، ممتاز شیریں، احمد ندیم قاسمی، جوگندر پال، جیلانی بانو، میرزا ادیب، مشتاق یوسفی، ممتاز مفتی جبکہ شعراء میں جوش ملیح آبادی، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی، مجاز لکھنوی، علامہ اقبال، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ادا جعفری، ن۔م۔ راشد، ابن انشاء، ناصر کاظمی، عزیز حامد مدنی، سلیم احمد، مصطفیٰ زیدی، منیر نیازی، احمد فراز، پروین شاکر، تابش دہلوی، پیرزادہ قاسم، ساقی فاروقی، حمیرا رحمان اور ناقد و محققین میں نیاز فتح پوری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر ابن فرید، شمس الرحمٰن فاروقی، ممتاز شیریں، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جناب مشفق خواجہ، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر شان الحق حقی، ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر معین الدین عقیل۔

3۔ وہ کہہ رہے تھے۔ جدیدیت دراصل ترقی پسندی سے گریز تھی۔ ترقی پسندوں نے افسانے کو مزاحمتی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور افسانہ اردو کی مقبول ترین صنف بن گیا۔ ہندوستان میں کہانی کی بڑی قدیم روایت ہے۔ اس روایت میں طوطا مینا کی کہانیوں سے لے کر مہابھارت اور رامائن تک شامل ہیں۔ مائیں بچوں کو لوری کے گیتوں میں اور یوں بھی سلانے کے لئے کہانی کا سہارا لیتی تھیں۔ کہانی افسانہ بنی پھر طویل مختصر افسانہ ہوئی اور پھر مختصر کہانی بنی یوں اس نے ناول اور افسانے کو ایک نام فکشن کا دیا۔ فکشن میں تاریخ اور فلسفہ بھی در آیا۔ اس طرح فکشن کی افادیت میں اضافہ ہوا۔ اردو افسانے میں جدیدیت قبل از وقت در آئی۔ ایک pre-matured بچے کی طرح جسے زندہ رکھنا بڑی توجہ چاہتا ہے۔ ہمارے ملک میں تعلیم یافتہ افراد کی تعداد جس میں دستخط کر سکنے کی حد تک پڑھے لکھے لوگ بھی شامل ہیں۔ شرمناک حد تک کم ہے اور ادب و شعر سے استفادہ کرنے والے بمشکل ڈیڑھ فیصد ہوں گے۔ ایسی صورت میں جدیدیت جس نے افسانے میں علامت، رمزیت اور فکشن میں کہانی کو زیریں سطح پر رکھ کر اپنی بات کہنے کی بنیاد ڈالی۔ ناپختہ کہانی کاروں کے ہاتھوں معمہ بن گئی اور فکشن ایک ایسا آسان ذریعہ اظہار بن گیا جس میں جو کچھ جس طرح چاہو کہہ دو اور کچھ نہ کہو اور اصرار کرو کہ پڑھنے والا خود نتائج اخذ کرے چنانچہ کہانی فکشن سے یکسر غائب ہوگئی اور جدید افسانہ نگاروں نے قاری سے ہوم ورک کرنے کا مطالبہ شروع کیا چنانچہ فکشن کا قاری سے رشتہ ٹوٹ گیا اور فکشن چیستان بن گیا اور اردو ادب کی یہ صنف ایسے تجربے سے گزری جس نے اسے مقبول بنانے کی بجائے غیر مقبول بنا دیا۔

میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ 1979ء میں (بدن کا طواف) آیا۔ یہ وہ دور تھا جب فکشن میں علامت نگاری اس قدر آئی تھی کہ روایتی افسانہ نگار ''گوشہ نشین ہوگئے تھے چنانچہ بدن کا طواف کی تقریب رونمائی میں زاہدہ حنا نے اپنے مضمون میں کہا۔ امراؤ طارق کہانیاں لکھتے ہیں۔ کہانیوں کے ساتھ برا کام نہیں کرتے۔'' اور یہ میں نہیں کہتا لوگ کہتے ہیں کہ ''علامتی افسانے کے اس دور میں امراؤ طارق کی سمجھ میں آنے والی کہانیاں ہوا کے خوشگوار جھونکوں کی طرح ہیں۔ ان کہانیوں سے

جس کی کیفیت ختم ہو گئی۔'' اس کے بعد فکشن میں کہانی واپس آنا شروع ہوئی۔

4- یہ خیال صحیح نہیں۔ اس صدی میں ایسے بڑے ناول آئے جو اس سے قبل نہ آئے تھے۔ آ بھی نہ سکتے تھے کہ اردو فکشن ہے ہی اس صدی کی ایجاد۔ اس صدی کے اہم اور مقبول ناول جو ہندوستان میں لکھے گئے۔ فردوس بریں (عبدالحلیم شرر) امراؤ جان ادا (مرزا رسوا) میدان عمل... چوگان ہستی... بیوہ (پریم چند) ماہ عجم (راشد الخیری) شکست... ان داتا... طوفان کی کلیاں (کرشن چندر) ایک چادر میلی سی (راجندر سنگھ بیدی) رات چور اور چاند... کالے کوس (بلونت سنگھ) اور انسان مرگیا (رامانند ساگر) آگ کا دریا... آخر شب کے ہمسفر... ہاؤسنگ سوسائٹی (قرۃالعین حیدر) شہاب کی سرگزشت (نیاز فتح پوری) نیلی چھتری (ظفر عمر) ایسی بلندی ایسی پستی... گریز... آگ (عزیز احمد) معصومہ... ایک قطرہ خوں (عصمت چغتائی) لہو کے پھول (حیات اللہ انصاری) نادید (جوگندر پال) ایوان غزل (جیلانی بانو) آتش خاموش (صالحہ عابد حسین)۔

پاکستان میں لکھے جانے والے اہم ناول یہ ہیں۔ خدا کی بستی... جانگلوس (شوکت صدیقی) بستی... آگے سمندر ہے (انتظار حسین) گرگ شب (اکرام اللہ) آشوب سرا... جمع تفریق تقسیم (اکرام بریلوی) گوندنی والا.... تکیہ (غلام عباس) علی پور کا ایلی... الکھ نگری (ممتاز مفتی) اداس نسلیں (عبداللہ حسین) بہاؤ (مستنصر حسین تارڑ) دیوار کے پیچھے (انیس ناگی) خوشبوں کا باغ (انور سجاد) تلاش بہاراں... دشت سوس (جمیلہ ہاشمی) صلیبوں کی زنجیر (رضیہ فصیح احمد) آنگن (خدیجہ مستور) دستک نہ دو (الطاف فاطمہ خون جگر ہونے تک (فضل احمد کریم فضلی) چاکیواڑہ میں وصال (محمد خالد اختر) راجہ گدھ (بانو قدسیہ) ترنگ (ابوالفضل صدیقی) معتوب (امراؤ طارق) جنم کنڈلی (ڈاکٹر فہیم اعظمی)۔

سوال نمبر 5 کے سلسلے میں پوچھنا ہے کہ آج کا ادیب کس نظام فکر کی تلاش میں ہے۔ ادیب کیا ہے' ادیب کیوں ہے؟

اگر ہم ان دو سوالوں پر غور کرنے بیٹھیں تو بات یوں آگے بڑھائی جا سکتی ہے کہ کیا ادب کوئی پیشہ ہے۔ اس کا جواب ہمیں نفی میں ملے گا۔ ادیب ہمارے ملک میں ابھی پیشے کے مرتبے پر فائز نہیں ہوا ہے بلاشبہ ادیبوں کی خاصی تعداد صحافت کے ذریعے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے اپنی روزی کمانے لگی ہے مگر ادیب کوئی معتبر یا مستقل پیشہ نہیں ہے' اس لئے ادیب بنائے نہیں جاتے اس کی کوئی تربیت نہیں ہوتی' انہیں بحیثیت ادیب کسی یونیورسٹی سے کوئی ڈگری نہیں ملتی۔ ادیب ایک خود ساختہ پیشہ ہے۔ کچھ لوگ اس پیشے میں اگر داخل بھی ہوئے تو زیادہ دیر رہ نہیں سکے اور معاش کے لئے انہیں کوئی باقاعدہ ادب سے بالکل مختلف پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ اس طرح پاکستان اور ہندوستان میں جز وقتی ادیب پیدا ہوئے۔ یوں بعض ادیب جب ادب کے علاوہ کسی اور پیشے سے منسلک ہوئے تو ان کا ادب سے رشتہ ختم ہو گیا۔

کوئی شخص ادیب بنے گا یا نہیں اگر اس میں وہ شعلہ ہے تو اس کا فیصلہ دوسرے نہیں کرتے وہ شخص خود اپنے اندر کے وجود کے اظہار کے لئے ادیب بننے کا فیصلہ کرتا ہے' اس لئے اصولاً معاشرے کی طرف سے اس پر یا اس کی طرف سے معاشرے پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی وہ اپنی فکر کے اظہار میں ہر طرح آزاد ہوتا ہے لیکن اس آزادی کے بدلے میں وہ معاشرے کا ایک ایسا جز بن جاتا ہے جس سے معاشرہ کوئی استفادہ اپنی مرضی کے مطابق نہیں کرسکتا کیونکہ ادیب معاشرے کا دباؤ قبول نہیں کرتا اسی کو قلم کی آزادی کا نام دیا جاتا ہے۔

ادیب اس حقیقت کے باوجود یہ توقع رکھتا ہے کہ معاشرہ اسے وہی مقام دے جو کسی ڈاکٹر' انجینئر' وکیل یا جج یا کسی معتزز پیشے کے فرد کو دیتا ہے بلکہ اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ کا مستحق سمجھتا ہے چنانچہ بیشتر اہل قلم کے انتقال کے بعد ان کے ورثاء کے سروں پر چھت اور گزران کے لئے حکومت اور اہل ثروت سے مدد کی اپیل کرنی پڑی۔ ضعیف اور معذور اہل قلم اس کے علاوہ ہیں۔ ادیب معاشرتی ذمہ داریاں اگر معاشرے پر ڈال کر ادب تخلیق کرے تو وہ نہ صرف اپنے اوپر بلکہ اپنے اہل خاندان پر ظلم کرتا ہے۔ معاشرے نے ہرگز اس سے ادب تخلیق کرنے کا مطالبہ نہ کیا تھا تو پھر معاشرے سے ایسی توقع کیوں؟

آگے چلئے تو معلوم ہوگا کہ پاکستان کا ادیب انفرادی زندگی جیتا ہے نظام فکر کی تلاش اجتماعی سوچ سے جنم لیتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے بعد ادیب کسی پلیٹ فارم پر متحد نہیں ہوسکا۔ روس کی مملکت کا شیرازہ بکھرا تو ترقی پسند تحریک بھی کمزور ہوگئی۔ پاکستان کے قیام کے بعد پاکستان رائٹرز گلڈ قائم ہوئی مگر گلڈ بھی زیادہ دنوں نہ چل سکی اور اب اس کا وجود صرف کاغذات پر ہی رہ گیا ہے۔ اکادمی ادبیات حکومتی ادارہ ہے اور حکومتی اداروں کی طرح قائم ہے۔ گلڈ کا یہ دور سندھ کی قیادت کا دور ہے۔ جناب نسیم درانی مدیر "سیپ" گلڈ کے سیکریٹری اور جناب سرشار صدیقی گلڈ کے سندھ کے صوبائی سیکریٹری ہیں (یہ ذمہ داری انہیں میرے گلڈ کے صوبائی سیکریٹری کے عہدے سے مستعفی ہونے کے بعد سونپی گئی)

بہتر زندگی بسر کرنے کے لئے نظام فکر کی تلاش قطعی سیاسی اور عملی مسئلہ ہے' اس لئے اگر بعض ادیب کسی تحریک سے جڑے ہوئے بھی ہیں تو وہ صرف تحریروں کی حد تک اس لئے یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ پاکستان کا ادیب بہتر زندگی کے لئے کسی نظام فکر کی تلاش میں ہے لیکن یہ درست ہے کہ پاکستان کا ادیب مادی بلکہ ذہنی نفسیاتی اور روحانی بحران میں مبتلا ہے۔ ادیب کا ذہنی اور نفسیاتی دباؤ بے سبب بھی نہیں ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد نقل مکانی کرنے والے اور اپنے گھروں میں رہنے والے دونوں گروہ معاشرتی اور معاشی تصادم سے دوچار ہوئے۔ ابھی اس تصادم کا کوئی حل نہ ملا تھا کہ پاکستان دولخت ہوا اور مشرقی پاکستان' بنگلہ دیش بنا۔ اس طرح پاکستان کے لوگ اور اہل قلم دونوں ایک اور معاشرتی اور معاشی تصادم سے دوچار ہوئے۔ نیا پاکستان سیاست

دانوں کی بازی گری' ذاتی مفادات اور کشید زر کی نذر ہو گیا۔ دولت کی ایسی ریل پیل ہوئی کہ جائز و ناجائز کا تصور ختم ہو گیا۔ رشوت حق کی طرح وصول کی جانے لگی اور تحفوں کی طرح بن مانگے پیش کی جانے لگی۔ عدالتوں کا تقدس پامال ہو گیا۔ مجسٹریٹوں کی عدالتیں دوکان بن گئیں۔ وکلاء کے دل سے عدالتوں کا احترام جاتا رہا۔ ادھر حکومت مملکت کے اس اہم ستون کو ڈھا دینے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔ پھر ایٹمی دھماکہ ہو گیا۔ کشمیر کے تنازعے کے باعث پاک بھارت جنگ کے بادل پاکستان پر منڈلانے لگے۔ کراچی شہر میں ماورائے عدالت قتل کا رجحان طوفان کی طرح سب کچھ بہا لے گیا۔ مذہبی فرقہ پرستی نے قتال و جدال کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا۔ ڈاکو سڑکوں پر گھروں میں' دوکانوں میں اور بازاروں میں دن دیہاڑے شہریوں کو لوٹنے لگے۔ ہر شعبے میں بھتہ خوری عام ہو گئی۔ سارا ملک طوائف الملوکی کی لپیٹ میں آ گیا۔ سب خوف کی دھند میں لپیٹ دیے گئے ظاہر ہے ادیب بھی خوف زدہ ہو کر نفسیاتی اور رومانی بحران میں مبتلا ہو گیا۔

اردو زبان کے حوالے سے گفتگو آگے بڑھی تو امراؤ طارق نے کہا اردو زبان بلاشبہ بنیادی طور پر عربی' فارسی' ہندی اور جنوبی ایشیا کی متعدد بولیوں کا مجموعہ ہے اور آج بھی دنیا کی تمام زبانوں سے استفادہ کر رہی ہے اور مختلف زبانوں اور بولیوں کے الفاظ برابر اردو زبان میں شامل ہو رہے ہیں اور الفاظ کی یہ شمولیت ہرگز شعوری یا اختیاری نہیں۔ غیر زبانوں کے الفاظ اردو میں از خود اپنی جگہ بڑی خوبصورتی سے بنا رہے ہیں۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ فارسی اور عربی زبانیں نئے علوم سے محروم زبانیں ہیں۔ ہندوستان پاکستان میں جو فارسی پڑھائی جاتی رہی ہے وہ فارسی زبان اب ایران میں اگر بولی جائے تو ایرانی اسے سمجھنے سے قاصر ہوں گے۔ جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے دنیا میں عربی ہی وہ واحد زبان جس کی فصاحت و بلاغت کا یہ عالم ہے کہ اس زبان میں بعض اشیاء کے پچاس پچاس نام ہیں اور ایسی اشیاء ایک دو نہیں ہیں جبکہ دنیا کی کسی اور زبان میں کسی ایک شے کے ایک یا دو سے زیادہ نام نہیں ہیں۔ عربی زبان کی ساخت اور الفاظ کے معنی کبھی تبدیل نہ ہوں گے۔ دنیا کی کئی زبانیں اب ناقابل فہم ہو گئی ہیں۔ عربی کبھی ناقابل فہم یا مردہ زبان نہ ہو گی۔ یہ ہمیشہ یوں ہی زندہ رہے گی جس طرح آج ہے۔ اس زبان میں یہ صلاحیت بھی ہے کہ دوسری زبان کی اشیاء کے ناموں کو اپنے ناموں میں تبدیل کر لیتی ہے خود تبدیل نہیں ہوتی۔

جہاں تک اردو زبان میں انگریزی زبان کے الفاظ کی شمولیت سے گریز کا تعلق ہے' اردو بولنے اور لکھنے والے باشعور افراد انگریزی زبان کے ان الفاظ کی شمولیت پر اعتراض کرتے ہیں جن کے متبادل الفاظ اردو زبان میں موجود ہیں یا اردو اور انگریزی کا ملغوبہ بنا کر جملہ تیار کیا جائے۔ مثلاً" فاصلہ (distance) پڑوسی (neighbour) شکریہ (thanks) خط (letter) وغیرہ وغیرہ۔ میرے خیال میں یہ پرابلم یوں سالو (solve) نہ ہو گی (اسے اردوش کا نام دیا گیا ہے۔)

امراؤ بتا رہے تھے۔ میری زندگی کے اہم واقعات میں سے ایک یہ بھی ہے۔

میٹرک کا امتحان دے کر 1948ء میں حیدر آباد دکن چلا گیا۔ اپنے گاؤں شاہ پور ضلع فتح پور یوپی سے یہ پہلی ہجرت تھی۔ سقوط حیدر آباد کے فوراً بعد بلدہ حیدر آباد سے واپس اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہوا۔ سکندر آباد (حیدر آباد دکن) سے میں اپنی خالہ' ماموں زاد بہنوں اور ماموں زاد بھائی سید ناصر علی کے ساتھ جس ٹرین کے تیسرے درجے کے کمپارٹمنٹ میں ہندوستان واپسی کے لئے روانہ ہوا وہ ایک بڑا درجے کا کمپارٹمنٹ تھا جس کے چار دروازے (دو ایک طرف اور دو دوسری طرف تھے) یہ پورا ڈبہ تین حصوں میں اس طرح تقسیم تھا کہ ایک حصہ میں ایک طرف وہ مسلمان مسافر مرد اور عورتیں تھیں جو حیدر آباد دکن ہجرت کر کے آئے تھے اور اب سقوط حیدر آباد کے بعد واپس ہندوستان جارہے تھے اور باقی دو حصوں میں ہندو اور سکھ فوجی' سپاہی' نائک اور حولدار وردیوں میں ملبوس سوار تھے۔ بعد کو جب ٹرین چل پڑی تو معلوم ہوا کہ یہ فوجی تھے جو حیدر آباد میں پولیس ایکشن کے نام پر داخل ہوئے تھے اور اب واپس ہندوستان جارہے تھے۔ کمپارٹمنٹ کے تیسرے حصے میں جو مسلمان مرد اور عورتیں سوار تھے وہ سب کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ سامان سے اٹے ہوئے اس حصے کے دونوں دروازوں کے سامنے سامان اس طرح جما ہوا تھا کہ نہ دروازے کھل سکتے تھے اور نہ باتھ روم جانے کے لئے راستہ تھا۔ میں اور میرا ماموں زاد بھائی ایک دروازے کے ساتھ لگے ہوئے بکس اور بستر پر دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے باتھ روم اس طرف جانا پڑا جدھر سکھ اور ہندو فوجی بیٹھے ہوئے تھے اس لئے کہ ہماری طرف کا باتھ روم عورتوں' بچوں اور سامان کی وجہ سے اس طرح اٹا ہوا تھا کہ راستہ نہ تھا۔ جب میں باتھ روم سے باہر نکلا تو باتھ روم کے قریب بیٹھے ہوئے ایک سکھ فوجی نے کہا۔ "کہاں جاؤ گے؟"

"کانپور" میں نے کہا۔ اس لئے کہ فتح پور میرے خیال کے مطابق اتنا مشہور نہ تھا۔

"کیا کانپور میں اب تک مسلمان ہیں؟" سکھ فوجی نے دریافت کیا اور میں خوفزدہ ہو کر چپ چاپ چلا آیا۔

"بلارشا" حیدر آباد ریاست کے بعد ہندوستان کی سرحد کا پہلا اسٹیشن تھا۔ رات کے وقت حیدر آباد دکن کے کسی اسٹیشن پر گاڑی رکی اور پھر چلی تو ہمارے ڈبے کے اندر بیٹھے ہوئے مسلمان مسافروں میں یہ سرگوشی شروع ہوئی کہ "بلارشا" اسٹیشن پر مسلمانوں کو ٹرین سے اتار کر سامان لوٹ لیا جاتا ہے اور مسلمان مردوں' عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔

ہم دروازے کے قریب بکس اور بستر پر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ دروازہ' ڈبے کے اندر آنے کے لئے بغیر بکس اور بستر ہٹائے کھل نہ سکتا تھا اور بکس بستر ہٹانے کے لئے ڈبے میں کہیں جگہ نہ تھی۔ ہمارے قریب سیٹ پر ایک ہندو سپاہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہم سے پوچھا "کہاں جارہے ہو؟" یہ سوال دوسری بار پھر ایک ہندو فوجی نے کیا تھا۔ سکھ فوجی کے جواب میں 'میں نے کانپور کا نام لیا تھا۔ اب کے میں نے کہا "فتح پور"

فتح پور ہسوہ؟ (ہسوہ فتح پور شہر سے ملا ہوا ایک قصبہ ہے۔ فتح پور ہسوہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ فتح پور سیکری سے الگ پہچان لیا جائے) اس ہندو سپاہی نے پوچھا۔

"ہاں" میں نے حیران ہو کر جواب دیا۔

فتح پور اسٹیشن پر اترو گے؟ نہیں! کھاگا اسٹیشن پر۔ کھاگا سے کہاں جاؤ گے؟ شاہ پور۔ شاہ پور میں کس کے یہاں جاؤ گے؟ سید احمد علی میرے ماموں ہیں ان کے یہاں۔ اس نے میری ماں کا نام لے کر کہا تم ان بی بی کے لڑکے ہو؟

پھر اس نے بتایا کہ میں شاہ پور کا "مورائی" ہوں (مورائی ہندوؤں کی ایک ذات کا مقامی نام)۔

چنانچہ جب بلا رشا اسٹیشن آیا اور میری خالہ اور بہنیں سجدے میں گر گر رونے اور آیت کریمہ کا زور زور سے ورد کرنے لگیں تو اس سپاہی نے دریافت کیا کہ یہ کیوں رو رہی ہیں۔ میں نے بتایا کہ بلا رشا پر ہم کو ٹرین سے اتار کر قتل کر دیا جائے گا۔

بلا رشا پر جب نیلی وردی میں ملبوس پولیس نے آ کر تلاشی کے لئے ہم سب کو اتارنا چاہا تو وہ ہندو سپاہی دروازے پر کھڑا ہو گیا اور اس نے دیر تک مزاحمت کی اور کہا کہ اگر تلاشی لینی ہے تو ٹرین کے اندر لو یہ لوگ نہ اتریں گے۔ دیر تک بحث ہوتی رہی۔ دوسرے فوجیوں نے اس سے کہا بھی کہ تم سے کیا مطلب مگر وہ دروازے کے سامنے اڑا کھڑا رہا اور بالآخر ٹرین چل دی۔ اس طرح ہم سب کی جان بچ گئی۔

میں نے امراؤ سے ایک اضافی سوال پوچھا کہ پاکستان میں خواتین ادب میں قابل ذکر کردار کیوں نہیں ادا کر سکیں؟ ان کا جواب ہے۔

پاکستانی معاشرہ ہمیشہ سے تضادات کا شکار رہا ہے۔ روٹی' کپڑا اور مکان کا نعرہ دینے والے سوشلسٹ عالی شان مکانوں میں رہتے رہے۔ شوفر ڈریون کاروں میں گھومتے رہے۔ ترقی پسندوں نے ترقی پسندوں کو اپنی صفوں سے نکالا۔ ادیبوں نے ادیبوں کو دل سے قبول نہ کیا۔ پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگانے والے پاکستان کو لوٹتے رہے۔ نظام اسلام کو رائج کرنے کے دعویدار خود گروہوں اور جماعتوں میں تقسیم رہے اور ایک دوسرے کی نفی کرتے رہے۔ صوبے صوبوں کے مفادات کی نفی کرتے رہے' مرکز صوبوں کی حق تلفی کرتا رہا۔ مرکز گریز سیاسی جماعتیں طرح طرح کے منفی نعرے لگاتی رہیں۔ پاکستانیوں نے پاکستان کی شکست و ریخت کو قبول کیا۔ بڑے شہروں سے قطع نظر چھوٹے شہروں اور قصبوں میں کھولے جانے والے اسکولوں میں وڈیروں اور جاگیرداروں نے اوطاق بنا لئے۔ تعلیم کا دوہرا نظام اور مشنری اسکولوں نے ایسے طلباء پیدا کئے جو قوم کے تصور سے بیزار رہے۔ اردو کا قومی زبان کا درجہ صرف دستور کی حد تک تسلیم کیا گیا۔ کوٹہ سسٹم رائج کر کے مقابلے کے رجحان کو ختم کیا گیا جس کے نتیجے میں لائق افراد پر نالائقوں کو ترجیح دی گئی۔ پوری قوم لسانی بنیاد پر' طبقاتی بنیاد پر اور مذہب کی بنیاد پر تقسیم ہوئی اور طوائف الملوکی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ فوجی

حکمراں مارشل لالاتے رہے۔ سیاسی نظام مستحکم نہ ہو سکا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد آزادی حاصل کرنے والی اقوام ترقی کی منزلیں طے کرتی ہوئی اقوام عالم کی ہمسری کرنے لگیں اور پاکستان قرض کے بوجھ تلے دبتا چلا گیا۔ ایسے معاشرے میں خواتین جو پہلے ہی مردانہ معاشرے کے دباؤ کا شکار تھیں پاکستان میں زندگی کے کسی شعبے میں بھی وہ کردار ادا نہ کر سکیں جو انہیں کرنا چاہئے تھا۔ پاکستان میں تعلیم کا تناسب بڑھنے کے بجائے کم ہوتا چلا گیا۔ ادب میں کردار ادا کرنے کے لئے قلم و قرطاس سے تعلق بنیادی شرط ہے۔ جس معاشرے میں ادب سے رابطہ رکھنے والوں کا تناسب صرف دو فیصد ہو اور کتب کے ایڈیشن کی تعداد اشاعت ایک ہزار سے گر کر پانچ سو اور پھر ڈھائی سو تک آجائے۔ ادب کی صورتحال کلیتاً مایوس کن ہو وہاں عورتوں کا ادب میں کردار بھی ظاہر ہے مایوس کن ہی ہوگا۔

"بدن کا طواف" کے بعد امراؤ طارق کی دیگر تصانیف یہ ہیں--- خشکی پر جزیرے (افسانے-1986) فوجداری قوانین کے بنیادی اصول (1995ء) معتوب (ناول-1995ء) تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے (افسانے-1998ء) دھنک کے باقی ماندہ رنگ (خاکے)-

MR. UMRAO TARIQ
A-14 BLOCK 13D,
GULSHAN-E-IQBAL, KARACHI, (PAKISTAN).

مناجات

خدایا ترا شکر تو نے
میرے چہرے کو آنکھوں سے روشن کیا
ان آنکھوں کو نور بصارت سے اجلا کیا
اجلے جلووں سے ان کو منور کیا
انہیں اعتبار چشم بینا دیا
مگر اب وہی میری آنکھیں
وہ سب دیکھتی ہیں
جو نہیں دیکھنا چاہتی ہیں

خدایا تیرا شکر تو نے
مجھ کو سننے کی طاقت عطا کی
مجھے کان بخشے
گوش بر آواز رہنے کا ان کو سلیقہ دیا
مگر آوازوں کے جنگل میں اے میرے مالک
میرا دم گھٹ رہا ہے

خدایا ترا شکر تو نے
زبان گویا کی دولت سے مجھ کو نوازا
حوصلہ اس کو حق بات کہنے کا بخشا
(تکلم پہ پھولوں کی خوشبو کو صدقے کیا)
مگر اب وہی کلمہ حق کی خوگر زبان
مصلحت کا عذاب سہتی ہے

اے خدا میری بصارت کے مالک
اے خدا میری سماعت کے مالک
خداوند قدوس میری زباں کے
مجھے اس بصارت سے محروم کردے
مجھے اس سماعت سے محروم کردے
مجھے اس طاقت سے محروم کردے
جسے وہ سب دیکھنے، سننے اور کہنے پہ
آمادہ کرنے کی کوشش ہے جاری
جو میں دیکھنا نہیں چاہتا ہوں
جو میں سننا چاہتا ہوں
جو میں کہنا نہیں چاہتا ہوں

اگر یہ نہیں ہے پھر
مجھ کو وہ طاقت گفتار دے
وہ گوش بر آواز دے
وہ چشم بینا عطا کر
جو مصلحت کے سارے پہرے ہٹا کر
زمانے کے رخ کو بدل دے

آفاق احمد بتا رہے تھے کہ ان کا تعلق فوجی گھرانے سے ہے ان کے والد ریاستی فوج میں کیپٹن تھے۔ ننھیال کا تعلق عالموں کے گھرانے سے تھا۔ سگے نانا مولانا عباس، غالب کے شاگرد تھے اور

بہادر شاہ ظفر نے انہیں "ابوالفضل دوراں" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔

آفاق احمد 30 جولائی 1932ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ پوری تعلیم اور ملازمت بھوپال میں رہی۔ حمیدیہ کالج سے اردو ادب میں انہوں نے ایم اے کیا۔ اس کے فوراً بعد محکمہ اعلیٰ تعلیم مدھیہ پردیش حکومت نے اسی کالج میں 1959ء میں لیکچرار بنا دیا۔ 1972ء میں پروفیسر ہوئے اور 1992ء میں اس خدمت سے سبکدوش ہونے تک اس عہدے پر ایم ایل بی (پی جی) گرلز کالج بھوپال یونیورسٹی میں ان کا تقرر رہا۔ زمانہ تعلیم سے طلبا کی تحریکات اور ادبی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا۔

1960ء میں ان کی شادی ہوئی۔ بیوی بلقیس جہاں ہم مذاق ملیں کیا خوب کہ وہ بیک وقت انگریزی ادب اور اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی ہیں۔ وہ بھی محکمہ اعلیٰ تعلیم میں پروفیسر ہیں ان لوگوں کے اساتذہ میں صفیہ اختر، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر ابو محمد سحر، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی جیسے نامی گرامی اردو ادیب شامل تھے۔

ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ ایک ٹورانٹو میں اور دوسری نیویارک میں ہیں اور دونوں میاں بیوی زندگی کو حسن بخشنے کے لئے اپنے "گل کدے" میں مگن ہیں۔ پروفیسر آفاق احمد کہہ رہے تھے بیسویں صدی میں اردو ادب و شعر کا جو سدا بہار چمن کھلا، اس میں جوش، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، احمد ندیم قاسمی، فیض، قرۃ العین حیدر، جذبی اور شفیق الرحمٰن کے کارناموں کو سدا یاد رکھا جائے گا۔

ان کا کہنا ہے جدیدیت کی نام نہاد تحریک نے اردو فکشن کی لطافت کو مجروح کرنے کی حسب توفیق کوشش کی لیکن مقام شکر ہے کہ جس تیزی سے اسے عروج ہوا تھا اس سے زیادہ تیزی سے اس کا زوال آیا۔ ان کا خیال ہے کہ زمانے کی تیز رفتاری کی وجہ سے موجود صدی میں اردو ادب میں کم ناول لکھے گئے۔

وہ کہہ رہے تھے "موجودہ دور کو شکست و ریخت کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ ترقی پسندوں نے ایک مخصوص نظام فکر کی روشنی میں اپنا ادب تخلیق کیا تھا لیکن سویت یونین کے بکھراؤ کے بعد بہت سے خواب چکنا چور ہوئے لیکن ایک خوش حال زندگی پر ان کا اعتماد بھی بحال ہے اور اپنا یہ فرض یاد ہے کہ ادب کا کام تزکیہ نفس ہے اور تخلیق ادب ایک شریفانہ عمل ہے۔ مایوسی کو کفر سمجھیں۔ منزلیں خود بخود آسان ہو جائیں گی۔

6- روح عصر اور زندگی کی ہمہ جہت پیشکش۔ مکمل ادبی خلوص کے ساتھ معیاری ادب کے پیمانے ہیں۔"

7- نثر لکھنے میں کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ مطالعہ ناگزیر ہے۔ وقت کی کمی ہی سمجھئے اور بڑی حد تک تن آسانی۔

8- اردو نے ہمیشہ دوسری زبانوں سے الفاظ کی خوشہ چینی کی ہے۔ یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ دراصل انگریزی الفاظ کی شمولیت میں کمی سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہماری علاقائی زبانیں اس کمی کو پورا کر رہی ہیں۔ اردو کے ذخیرہ الفاظ میں اضافے کا عمل جاری ہے۔ دنیا کی کوئی دو زبانیں مشکل سے ایک دوسرے سے اتنی قریب ہوں گی جتنی اردو اور ہندی اور ان دونوں زبانوں کے ادیبوں نے یہ نکتہ سمجھ لیا ہے اور مقبول اور قابل قبول الفاظ کو وہ شامل کر رہے ہیں۔ میں اس یقین میں آپ کو شریک کرنا چاہتا ہوں کہ اردو ترقی کرے گی۔ پائندہ رہے گی۔ اپنے موجودہ رسم الخط کے ساتھ وہ بغیر کسی احساس کمتری کے عروج پائے گی۔ اب تو اس کی جہانگیری کی یہ کیفیت ہے کہ برصغیر کے باہر اردو کے اہل نظر نے جو تازہ بستیاں آباد کر رکھی ہیں ان میں سے بعض اپنی طرف دار ہیں کہ وہ ہمارے اس یقین کو مزید پختہ کرتی ہیں کہ اردو نے نامساعد حالات میں بھی جینے کا فن اور سلیقہ سیکھ لیا ہے۔

9- زندگی بڑی خود سر ہے یہ۔ والد چاہتے تھے فوج میں بھرتی ہوں یا ڈاکٹر بنوں۔ ہم بن گئے مدرس۔ بہرحال چینی حملے کے وقت فوج کی تربیت لے کر کمیشن پایا اور نیشنل کیڈٹ کور میں سیکنڈ ان کمانڈر ہو کر انہیں خوش کیا۔

زندگی کا اہم ترین واقعہ وہ بھی تھا جب ہم 1989ء میں انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کے متفقہ طور پر صدر منتخب ہوئے۔ اس سے قبل عبدالقادر سروری، نورالحسن ہاشمی، آل احمد سرور اور محمد حسن جیسے لوگ اس عہدے پر سرفراز رہے تھے۔ کیا یہ فخر کی بات نہیں تھی؟ جب انٹرنیشنل ہاکی میچ میں سری لنکا کے خلاف بھوپال کی ٹیم کی سربراہی کی تو بہت اچھا لگا۔ 20 سال تک لڑکیوں کے کالج میں پڑھاتے رہے۔ ایک ہی کالج یہ خود میں ایک ہی کالج یہ خود میں ایک دلچسپ اتفاق تھا۔

10- ہندوستان اور پاکستان کو تخلیق ادب کے معاملے میں دو الگ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ دونوں ملکوں میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے اس کا پورا علم نہیں ہو پاتا۔ ہندوستان میں علاقائی ادب کے اردو میں ترجمے کا عمل جاری ہے۔ اکثر ادبی رسالوں میں خاص طور پر ہر شمارے میں ایک کہانی یا کئی نظموں کے تراجم ہوتے ہیں۔ خود میں نے راج گوپال اچاری کی تامل کہانیوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ علاقائی زبانوں پر نہ صرف کام ہو رہا ہے بلکہ ان کے سبک اور عام استعمال کے الفاظ تیزی کے ساتھ اردو زبان کا حصہ بن رہے ہیں۔

میں یہاں پھر دہرانے کی اجازت چاہوں گا کہ یہ ٹھیک ہے کہ نئی نسل تنقید کی طرف اس طرح مائل نہیں ہے جیسے ہمارے پرانے نامور نقاد تھے لیکن اس سے اتفاق نہیں ہے کہ تنقید برائے نام ہے۔

PROF.AFAQ AHMAD "GUL KADA"

8-IDGAH HILLS, BHOPAL, 462001- INDIA

اکرام بریلوی

کینیڈا

اکرام بریلوی کے مضامین کا مجموعہ "تازہ آئینہ" (مطبوعہ دسمبر1998ء کے صفحہ 12 پر انہوں نے لکھا ہے کہ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1938ء میں کیا۔ یوں 1999ء تک تقریباً 61 برس پر یہ عرصہ محیط ہے اور نصف صدی سے اوپر کا یہ عرصہ اس لحاظ سے بھی قابل تحسین ہے کہ اکرام صاحب اب بھی یعنی نصف صدی کے بعد بھی ایسے ہی چاق و چوبند ہیں ہر کام میں۔ چاہے وہ باورچی خانے میں مرغی بھون رہے ہوں۔ دوستوں کی محفل میں گپ لگا رہے ہوں' سنجیدہ موضوعات پر گفتگو کر رہے ہوں یا اپنی شریک سفر محترمہ عسکری بیگم سے چھلیس کر رہے ہوں۔ قابل رشک سرگرمیاں ہیں ان کی۔

اگست 1999ء میں میرا ایک مشاعرے کے سلسلے میں ٹورانٹو کینیڈا جانا ہوا۔ احمد فراز کی شام کے حوالے سے کینیڈا کے ہمارے نامور شاعر و ادیب اشفاق احمد نے یہ محفل سجائی تھی۔ اس موقع پر اکرام صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پھر ستمبر کے تیسرے ہفتے میں رائٹرز فورم کے منیر پرویز اور غالب اکیڈمی کے اطہر رضوی کی جانب سے جشن جون ایلیا اور میر تقی میر سیمینار کی تقریب میں شرکت کے

باعث دوبارہ مجھے محترم اکرام بریلوی اور بیگم عسکری اکرام کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔) یہ دونوں میاں بیوی مہمانوں کے تو گویا منتظر رہتے ہیں اور غلط نہ ہو گا اگر میں کہوں کہ اکرام صاحب کو چاق و چوبند رکھنے میں عسکری بیگم کا بڑا حصہ ہے۔ وہ رشتے میں غالب کے بھانجے عاشور بیگ کی پر پوتی ہیں۔ مغلی خون ہے اور جیسے ملکہ نور جہاں شہنشاہ جہانگیر کی پشت پر ہاتھ رکھ کر بڑے بڑے مراحل طے کرالیتی تھیں اس طرح عسکری بیگم بھی گھریلو امور سے لے کر اکرام صاحب کی کتابوں کی اشاعت کے مراحل بھی بڑی خوبی سے نمٹادیتی ہیں۔

اکرام بریلوی صاحب کہتے ہیں۔ نام ہمارا اکرام حسین ہے۔ 30 جون 1918ء کو جھجلیٹ (ڈسٹرکٹ مراد آباد) ہندوستان میں پیدا ہوا۔ ہمارے ہاں حصول تعلیم کا جو نظام رائج ہے اس کا تعلق اکرام حسین سے تو بہر طور ہے مگر اکرام بریلوی سے اس کا کوئی رشتہ نہیں کہ تخلیقی ذہن انجمن آرا و نگہبان خود ہے۔ چنانچہ اپنی اسی انجمن آرائی کی بدولت ارتقا پذیر ہے اور اپنی نگہبانی سے کسی مرحلے پر کسی تصادم کے بعد کسی فتح یا کسی ہار کے بعد غافل نہیں رہتا۔ یونیورسٹی گریجویشن نے ملازمت دلوادی جس کی بدولت میں سول سرونٹ ہوا اور گریڈ انیس میں ریٹائرمنٹ لی۔ میں نے ایک خوش حال اور کھاتے پیتے گھرانے میں تخلیقی ذہن کے ساتھ آنکھ کھولی۔ چونکہ آبائی مسکن بریلی تھا اس لئے آبائی مسکن کی مناسبت سے بریلوی لکھتا ہوں۔ گنانے کو تو اپنی چھ پشتوں کا سلسلہ زبانی گنا سکتا ہوں مگر طول کلام سے بچتے ہوئے صرف اتنے پر ہی اکتفا کروں گا کہ میرے دادا ابا سید اکبر حسین اکبر وکیل اور والد ماجد سید اقبال حسین پولیس آفیسر تھے۔ تفنن طبع کے لئے شاعری بھی کر لیتے تھے۔ اس طرح دونوں ہی شاعر تھے۔ دادا ابا تو حضرت داغ دہلوی کے شاگرد تھے اور شہر اور بیرون شہر کے مشاعروں میں شریک بھی ہوتے تھے۔ والد ماجد کبھی کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے۔ شاعری محض شوق کی حد تک رہی شاید اس میں پولیس کی ملازمت کا عمل دخل ہو۔ متخیلہ کی دولت فراواں مجھے والدہ ماجدہ محمودی بیگم سے ملی جو قصہ گوئی میں مہارت رکھتی تھیں۔ اس تمہید کا مدعا یہ ہے کہ گھر کا ماحول ادبی ضرور تھا۔ ہاں میرے ایک چچا' محبوب حسین محبوب بریلوی بلا کے ذہین و طباع تھے۔ شاعری بھی کرتے تھے۔ ادب کا چسکا انہوں نے ہی لگایا۔ ہوا یوں کہ جب ہم کالج میں پہنچے تو موصوف نے ہمارے برادر اکبر سید کرار حسین' جنہوں نے نئی نئی وکالت شروع کی تھی۔ اسی زمانے میں ان کی شادی ہوئی اور ان کی بیوی کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر ان کے ہم عصر اور دوست چچا محبوب حسین محبوب نے ایک مزاحیہ مضمون لکھ مارا اور یہ کہتے ہوئے ہمارے سپرد کردیا کہ ہم اسے اپنے نام سے کالج میگزین میں شائع کرا سکتے ہیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا' مگر جب ہمارے اردو کے پروفیسر تسنیم صدیقی صاحب نے اس مزاحیہ مضمون کی ہماری کلاس میں تعریف و تحسین کی تو ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ہم اس مخمصے میں پھنس گئے کہ اگر پروفیسر صاحب نے کبھی مضمون لکھنے کا تقاضا کر دیا تو کیا بنے گا۔ انٹر فرسٹ ایئر کی بات تھی۔ ہم نے پڑھنے لکھنے کی مشق شروع

کردی۔ یہ لگ بھگ 1936ء کی بات ہے۔ 1938ء میں ہماری پہلی ادبی کاوش 'ایک ڈرامہ بعنوان خوفناک محبت' اختر شیرانی مرحوم نے ادبی جریدہ ماہنامہ ''رومان'' میں شائع کی۔ پھر کیا تھا۔ لکھنا پڑھنا ہمارا اوڑھنا بچھونا ہو گیا۔ اس کی اشاعت کے بعد سے برصغیر کا کوئی ادبی رسالہ ایسا نہ تھا جس میں ہمارا نام (جو اس زمانے میں ا۔ح پروانہ تھا) اور نگارش نہ آنے پائے۔ رومان' نیرنگ خیال' ادب لطیف' ادبی دنیا' ساقی' زمانہ' ایشیاء' عالمگیر' آج کل اور خیام (پندرہ روزہ) میں چھپنے لگا۔ 1949ء میں آل انڈیا ریڈیو سے تقاریر اور ڈراموں کے سلسلے کی ابتدا ہوئی اور قیام پاکستان کے وقت تک جاری رہی۔

تقسیم برصغیر کے زمانے میں کشت و خون اور انسانیت سوز' پیمانہ پر غارت گری کا خونی ڈراما دیکھ کر ایسا جمود طاری ہوا کہ کم و بیش پانچ سال تک لکھنے لکھانے کا سلسلہ بند رہا۔ اللہ بھلا کرے انتظار حسین کا جس کے اصرار پر جمود ٹوٹا اور از سر نو یہ سویا ہوا شوق بیدار ہوا۔ تقسیم ہند سے پہلے 1946ء کے ہی پر آشوب زمانے میں 'میرا پہلا ناول ''نیا افق'' شائع ہو چکا تھا۔ تقسیم کے بعد' میرا سب سے پہلا ڈراما ''اور شیطان ناچتا رہا'' (یہ میرے ڈراموں کے انتخاب ''شرار سنگ'' میں شامل ہے) جمود ٹوٹا تو ڈراموں کے کئی انتخاب اور ناولیں کتابی صورت میں منظر عام پر آئے۔ اجمالاً'' کچھ اس طرح کی فہرست بن جاتی ہے۔

1- گردش۔ نیا افق کے بعد دوسرا ناول راولپنڈی کے قیام کے دوران لکھا گیا۔

2- شرار سنگ۔ قیام پاکستان کے بعد کے مختصر ڈرامے۔ تقسیم سے قبل کی ساری تحریریں دہلی میں لٹ چکی تھیں۔ 3- سوداگر۔ طویل ڈرامہ۔ 4- زلف کے سر ہونے تک۔ شیکسپیئر کے ڈرامے Taming of the Shrew سے ماخوذ طویل ڈراما جو ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے جشن تمثیل کے موقع پر نشر کیا گیا۔

5- لاوا۔ تیسرا ناول راولپنڈی میں لکھا گیا اور کراچی سے شائع ہوا۔

6- پل صرا۔ چوتھا ناول۔ ابتدا لاس اینجلس (سانتا مونیکا) میں ہوئی۔ نظر ثانی اڈمنٹن (کینیڈا) اور تکمیل ہی ویو' کراچی میں اور اشاعت 1988ء میں کراچی ہی سے ہوئی۔

7- آشوب سرا۔ میرا پانچواں ناول۔ کینیڈا (مسی ساگا) میں لکھا گیا۔

8- ''جمع تفریق تقسیم'' میرا چھٹا ناول کینیڈا (کنگسٹن) میں لکھا گیا۔

اس اجمالی خاکے سے قطع نظر' ادبی رسائل اور جرائد میں جو تنقیدی مضامین اور اشاریے شائع ہوتے رہے ان کی تفصیل تو بہت طویل ہو جائے گی اور یہاں اس کے بیان کرنے کی گنجائش اور ضرورت بھی نہیں۔ ڈراموں کا انتخاب ''برف کی دیوار'' ''تنقیدی تحریریں'' اور انگریزی زبان میں اردو ادب و شاعری پر لکھے گئے مضامین (جو ڈان (DAWN) میگ (MAG) مارننگ نیوز (MORNING NEWS) (PERSPECTIVE) کرنٹ ویکلی میں شائع ہوئے ان کا

انتخاب REFLE CTIONS انگریزی میں اور "جوش ملیح آبادی شخص اور شاعر" اور "تازہ آئینہ" حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ کینیڈا، امریکہ کے ماحول کے پس منظر اور ہجرتوں کے کرب پر لکھے گئے افسانوں کے دو مجموعے "تیز ہوا میں پتے" اور تیسری نسل اور ایک انگریزی کا ناول "میوزک ان دی سول" (MUSIC IN THE SOUL) زیر طبع ہے۔

یوں تو زندگی بڑے عیش و آرام میں کٹی مگر 1938ء سے لے کر 1942ء تک سیاست (پہلے کانگریس اور پھر کمیونسٹ پارٹی میں کامریڈ احمد کے ساتھ) میں حصہ لینے کے باعث گھر والوں خصوصاً والد گرامی سے اختلافات، جس کو کبھی جرات اظہار نہ مل سکی کے پیش نظر تکالیف اور مادی ناآسودگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ علمی اور تخلیقی زندگی کی دشواریاں اور کئی نشیب و فراز مقدر رہے۔ بارہا ان نامساعد حالات اور نجی پریشانیوں سے گھبرا کر، گھر سے بھاگا۔ کبھی اجمیر، کبھی کلکتہ اور کبھی راجپوتانہ کے معروف و غیر معروف علاقوں کے علاوہ پونا، مہابلیشور اور بمبئی میں مارا مارا پھرا۔ شادی خانہ آبادی کے لئے جواز پیدا ہو گیا تھا کہ حکومت ہند کی وزارت دفاع میں ملازمت مل گئی تھی (1942ء) کے وہ دن ہوا ہو گئے تھے جب کہا کرتے تھے کہ نوکر نہیں ہوں میں!

1942ء کے وسط میں، بنت عم، عسکری بیگم سے شادی ہوئی۔ دو اولادیں ہیں: بیٹی انجم حسین اور بیٹا ذوالجلال کاظمی۔ 1976ء میں ریٹائر ہوا اور بیٹی کے اصرار پر کینیڈا چلا آیا جب سے یہیں کا ہو گیا ہوں۔ بیٹی یہاں اور بیٹا اٹھارہ سال امریکہ رہنے کے بعد وہاں پاکستان میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سکونت پذیر ہے اور میں؟ بحر اوقیانوس پہ معلق ہو کر رہ گیا ہوں۔ یہاں سے دل گھبرا جاتا ہے تو وہاں چلا جاتا ہوں اور وہاں سے دل اکتانے لگتا ہے تو یہاں آجاتا ہوں۔ بقول اقبال۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

سوال نمبر 2 کے جواب میں عرض ہے کہ جس تیزی کے ساتھ اردو زبان و ادب کا چرچا اور ادبی ذوق کا گراف نیچے گرتا جا رہا ہے اس کے پیش نظر تو صورتحال مایوس کن ہی نظر آرہی ہے۔ امکان ہے کہ پریم چند، قرۃ العین حیدر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور عزیز احمد کے نام باقی رہ جائیں بشرطیکہ انہیں باضابطہ درسیات اردو میں شامل کر لیا جائے۔

سوال نمبر 3 کا جواب ہے کہ "جدیدیت یا کوئی اور جدت اگر ترتیب و توازن کے ساتھ اپنائی جائے تو ادب اور آرٹ کے حسن میں اضافہ ہی ہو گا۔ اور سوال نمبر 4 سے مجھے اختلاف ہے۔ کیوں کہ بیسویں صدی تو میری ناقص رائے میں 'ناول کے عروج کا زمانہ ہے۔ 1906ء میں شرر نے "فتح اندلس" سے ابتدا کی جو تاہنوز جاری ہے۔ آزادی ہند و پاک کے بعد تو کم و بیش پچاس سال میں 41-42 ناول لکھے گئے ہیں البتہ اچھے ناول اور بڑے ناول کم لکھے گئے ملاحظہ ہو:

اردو ناول آزادی کے بعد ہیئت، اسالیب اور رجحانات (ڈاکٹر ممتاز احمد خان)

آج کا ادیب جو بھی حالات کا شکار ہو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ادیبوں کی اکثریت زندگی کے مختلف

ادوار میں اس صورت حال سے دوچار رہی ہے۔ بہتر زندگی کی تلاش و جستجو کسی نظام فکر سے نہیں‘ سماج کی از سر نو تشکیل ہی سے ہو سکتی ویسے بقول اقبال

پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

بہر کیف ترقی وارتقا کے لئے سعی و تلاش بہت ضروری ہے جسے مارکس اور اینگلز کی مادی جدلیات کے مطابق سیاسی واقعات‘ معاشرتی قوتوں کے تصادمات کے نتیجے اور بنی نوع انسانی کی مادی ضرورتوں سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کے حصول کے لئے محبت‘ محنت اور سچی لگن کی ضرورت ہے۔

میرے خیال میں مختصرا" تخلیقی نفس کی ہمہ گیری‘ اثر و تاثیر کی ہمہ گیری‘ معنویت کائناتی اور آفاقی بصیرت ہی اعلیٰ ادب کے پیمانے ہیں۔

سوال نمبر 7 کے جواب میں کہوں گا کہ مطالعہ‘ مشاہدہ اور محنت یا ریاضت کی کمی اور سستی شہرت کا ہوکا اور ہوس۔

سوال نمبر 8 کے سلسلے میں جواب ہے ”جی ہاں بالکل‘ لیکن یہ خالص لسانیات کا مسئلہ ہے۔ میں ایک تخلیق کار کی حیثیت سے صرف اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ زبان کی ترقی و ترویج فطری (NATURH) اور بے ساختہ (UN-PREMEDITATED) کے نتیجے میں رونما ہوتی ہے۔ اس کے لئے کسی شعوری یا ساختہ پرداختہ فارمولے یا تحریک کی ضرورت نہیں۔ مثال کے طور پر جب میں جوش ملیح آبادی شخص و شاعر کے عنوان سے کتاب لکھ رہا تھا تو لفظ نہیں ملا اور پورا انگریزی کا جملہ Transmutive Virtue of Aesthetics لکھ گیا جو میرا بے ساختہ انفرادی عمل تھا۔

تقسیم ہند (جس کے حق میں‘ میں کبھی نہیں رہا) کے بعد جو کچھ سرحد کے اس پار یا اس پار ہو رہا ہے اہم اور دلچسپ واقعات کی گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے کہ اب تو ہجرتوں کا موسم بہار ہے جسے بقول غالب۔۔ حنائے پائے خزاں‘ ہی کہا جا سکتا ہے۔

سوال نمبر 10 کے جواب میں عرض ہے کہ اس کا سبب مطالعہ‘ علمی شغف اور زبان و ادب سے غیر جذباتی وابستگی کا فقدان ہی ہو سکتا ہے۔ انفرادی کوششوں کے علاوہ یہ ذمہ داری ادارہ ادبیات اردو اور حکومت کے مختلف ادبی اور لسانی اداروں کے سر جاتی ہے۔ دعوے تو بہت ہیں مگر کام کی رفتار بے انتہا سست بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو ویسے قومی ترقی میں ہم نے کون سے تیر مار لئے ہیں کہ اردو زبان و ادب کے سود و زیاں کا خیال آئے۔

وائے نادانی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

آخر میں اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ سناتا چلوں۔ یہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ بعض وقت

زندگی میں ایسے موڑ آتے ہیں کہ انسان کچھ کا کچھ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس موڑ پر' ان حالات میں کبھی کسی دوست کا مشورہ یا دل داری کے دو بول انسان کی زندگی میں وہ اہم کردار ادا کر جاتے ہیں کہ ساری زندگی اس ایک سائبان تلے بھی گزر جاتی ہے۔

ہوا یوں کہ دلی کے سرکاری بنگلے 18 دل کشا اسکوائر میں' میں اور میرے تین دوست' پاکستان جانے کے لئے کمر باندھے بیٹھے تھے۔ شہر میں ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ خون ناحق کی ارزانی تھی۔ دہشت و ہراس پھیلی ہوئی تھی۔

صبح سویرے' طلوع آفتاب سے کچھ قبل' ہمارے مکان پر "ہر ہر مہادیو" کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ حملہ ہوا۔ ہم سب جان بچا کر افتاں و خیزاں پچھلے دروازے سے بھاگے۔ نفسا نفسی اور افراتفری میں پتہ نہ چل سکا' کون کہاں گیا۔ کون کدھر گیا' کون بچا اور کون مارا گیا۔ بارے راولپنڈی پہنچ کر پتہ چلا کہ میں ہی زندہ بچ نکلا ہوں۔ باقی تینوں اللہ کو پیارے ہوئے۔

اس سانحہ اور دلی کے کشت و خون کا مجھ پر اتنا شدید اثر ہوا کہ میں نے پنڈی پہنچ کر تہیہ کر لیا کہ اب لکھنا پڑھنا چھوڑ چھاڑ کر تنہائی کی زندگی گزار دوں گا۔

طبیعت قدرے بحال ہوئی تو قاضی ابرار حسن صدیقی (سینئر صحافی) اور انتظار حسین سے ملنے ملانے کے لئے لاہور جانا ہوا۔ ابرار صدیقی میرے کالج کے دوست تھے۔ انتظار حسین سے دلی کے اچھے دنوں کی یاد اللہ تھی۔ انتظار حسین ان دنوں غالباً" ہفت روزہ "منزل" کی ادارت کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے جریدہ کے لئے کچھ لکھنے کے لئے کہا میں نے دل گرفتہ ہو کر کہا میں اب کبھی نہیں لکھ سکوں گا۔

"کیوں؟" ابرار اور انتظار دونوں یک زبان ہو کر بولے "ساری کتابیں اور لکھا پڑھا خاک میں مل جانے کے بعد حوصلہ نہیں رہا۔ اب کیا بچا ہے" میں نے افسردگی سے کہا۔

"تخلیقی ذہن"۔ انتظار حسین بولے۔ میں منع کرتا رہا وہ دونوں بضد رہے اور میں کوئی وعدہ کئے بغیر چپ رہا مگر کچھ عرصے بعد جیسے کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر ایک ڈراما "اور شیطان ناچتا رہا" لکھوا لیا۔ یہ ڈراما میں نے انتظار حسین کو بھیج دیا۔

جب سے اب تک نہ جانے کتنا لکھ چکا ہوں اور انتظار حسین کو دعائیں دے رہا ہوں کہ وہی میری ان تمام تخلیقات کے محرک ہیں۔

MR.IKRAM BRELVI
5700 PRAIREE CIRCLE,
MISSISSAUGA, ONT, L5N 6B6 CANADA

کسی کا ہم سا بھروسہ نہیں ذرا ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

انور خواجہ
۱۷ اگست 99

انور خواجہ
کیلیفورنیا

میں پہلی بار جب انور بھائی سے ملی تو تھوڑی دیر کی ہی گفتگو میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص "انتہائی حد تک سچا" ہے۔ پھر جب انہوں نے مجھے اپنا افسانوی مجموعہ "ناشناس" دیا تو تاج سعید کے مقالے میں جناب فارغ بخاری کی اس تحریر سے میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ لکھتے ہیں۔ "وہ سچ کہتا ہے! سچ چوراہے کے کہتا ہے قانون سے نہیں ڈرتا، سماج سے نہیں ڈرتا اور..."

مرزا ادیب کی بھی ان کے بارے میں یہی رائے ہے۔ ملاحظہ ہو "انور خواجہ اردو کے ان چند افسانہ نگاروں کے گروہ میں شامل ہے جو مشاہدہ کرنے میں باریک ہے، سوچنے میں بہت حساس اور فنی اظہار میں بڑا بے باک ہے۔ اس نے ایک لمحے کے لئے منافقت نہیں برتی۔ جو کچھ کہنا چاہا ہے بے باکانہ کہہ دیا ہے۔ اس کی جرات مندی ایک ایسے انسان کی جرات مندی ہے جسے ہر حالت میں سچائی عزیز ہے اور جو ہر حالت میں سچائی کے اظہار پر قادر رہتا ہے۔"

مگر انور خواجہ کو اس سچ کی بہت بڑی قیمت بھی ادا کرنی پڑی ہے۔ انہیں اس سچ بولنے کی سزا

میں وطن چھوڑنا پڑا۔ اپنا وطن جس کے گلی کوچوں کی مٹی کی خوشبو آج بھی ان کو بے چین رکھتی ہے اور اپنی طرف بلاتی ہے مگر جب زندگی کا پودا نئی مٹی میں جڑ پکڑنے لگتا ہے تو اسے اکھاڑ کر دوبارہ پرانی مٹی میں آباد کرنا آسان نہیں۔ دل مسوس کر رہ جانا پڑتا ہے۔

صوبہ سرحد کے ایک شہر ایبٹ آباد میں ماہ جون ۱۹۴۰ء میں پیدا ہونے والے خواجہ محمد انور جو ادبی دنیا میں انور خواجہ کے نام سے مشہور ہیں اپنے شہر ایبٹ آباد کی تعریف میں کہتے ہیں کہ یہ معتدل موسم کی وجہ سے مشہور ہے چناں چہ جس طرح شہر کا موسم معتدل ہے اسی طرح لوگوں کے مزاج بھی معتدل ہیں اور ان میں صوبہ سرحد کے دوسرے علاقوں کی نسبت بردباری زیادہ ہے۔

انور خواجہ اپنے بارے میں بتا رہے تھے کہ "ہائی اسکول کے بعد ایبٹ آباد کالج میں دو سال تک تعلیم پائی لیکن اس سے قبل میں نے افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے۔ چند افسانے شائع ہو چکے تھے۔ ان دنوں محسن احسان ایبٹ آباد میں موجود تھے۔ ان کے توسط سے میرا پہلا افسانہ پشاور کے کسی رسالے میں شائع ہوا۔ خوش قسمتی سے ایبٹ آباد کالج میں تاریخ کے ایک پروفیسر شوکت واسطی تھے جنھوں نے میرا بڑا حوصلہ بڑھایا۔ انہوں نے اس زمانہ میں بزم علم کی بنیاد ڈالی جو اب ایک بین الاقوامی ادارہ ہے اور اردو کی ترقی میں کوشاں ہے۔ اسی انجمن کے ذریعے پہلی دفعہ جسٹس کیانی کو دنیا سے متعارف کرایا گیا۔ جن کی تقریروں نے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی۔ وہ ایسا مرد مجاہد تھا جو ایوب خان جیسے آمر کے سامنے حق بات کہنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اسی زمانے میں احمد فراز ابھی بہت نوجوان تھے کبھی کبھی مشاعروں کے لیے ایبٹ آباد بھی آتے تھے تو ان سے تعارف ہوا جو ایک مضبوط دوستی میں بدل گیا اور آج بھی قائم ہے۔ ایک سال کالج کے ادبی رسالے "کاغان" کا بھی مدیر رہا جس میں میرا پہلا رومانی ناولٹ "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا اس ناولٹ میں پہلی دفعہ ایبٹ آباد کے بارے میں کچھ لکھا گیا اور اس کی خوبصورتی کو پوری طرح اجاگر کیا گیا۔

والد صاحب سے اختلاف کی وجہ سے میں نے گھر چھوڑ دیا اور لاہور چلا گیا۔ لاہور میں کافی مشکل وقت گزرا۔ کوئی نوکری نہ ملی اور اخباروں میں کام کرنے لگا اخبار والے وقت پر تنخواہ نہیں دیتے تھے۔ لاہور میں مرزا ادیب صاحب سے ملاقات ہوئی وہ اس زمانے میں "ادب لطیف" کے ایڈیٹر تھے انہوں نے میرا ایک بڑا معرکہ مضمون ٹالسٹائی کے ناول "جنگ اور امن" پر شائع کیا اور جب مجھ سے ملاقات ہوئی تو حیران ہوئے کہ میں اتنی کم عمر کا آدمی ہوں اور میں نے ایسا سنجیدہ مضمون لکھا میں نے انہیں بتایا کہ میں روسی ادیب ٹالسٹائی کا بہت مداح ہوں اور اسکول کے زمانے سے اس کا مطالعہ کر رہا ہوں اور میرا ٹالسٹائی پر کتاب لکھنے کا پروگرام ہے۔ میرے نزدیک وہ دنیا کا سب سے بڑا ناول نگار ہے۔ مرزا ادیب سے یہ میری لمبی

دوستی کا آغاز تھا۔ "نقوش" کا شخصیت نمبر شائع ہوا تو محمد طفیل نے مرزا ادیب کا خاکہ شامل نہیں کیا اور بہانہ بنایا کہ کوئی شخص ان کے بارے میں خاکہ نہیں لکھتا۔ میں نے ایک زبردست خاکہ "صحرا نورد" کے نام سے لکھا لیکن محمد طفیل نے نقوش کے شخصیات نمبر دوئم میں بھی شائع نہیں کیا۔ اس لیے کہ میں کوئی مشہور ادیب نہیں تھا۔ لیکن بعد میں وہ مضمون اور تین جگہ شائع ہوا۔ اور اب مرزا ادیب کے بارے میں ڈاکٹر رشید احمد نے جو کتاب مرتب کی ہے اس میں بھی شامل ہے۔

لاہور میں ایک سال اورینٹ کالج میں گزرا اور مجھے اردو کے چند بڑے ادیبوں کی شاگردی کا موقع ملا کالج کے پرنسپل مشہور نقاد اور ادیب اور محقق ڈاکٹر عبداللہ تھے اور پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی وقار عظیم اور ڈاکٹر وحید قریشی تھے مجھے ڈاکٹر عبادت بریلوی پسند نہیں تھے ان کی تنقید بہت بور ہوتی تھی۔ لاہور میں جب کوئی نوکری نہ ملی تو پشاور آ گیا وہاں وارسک بند کے منصوبے میں نوکری ملی اور پھر میں انشورنس کمپنی اور پھر ٹی وی میں آ گیا۔ میری زندی کا بہترین زمانہ پشاور میں گزرا اسی دوران پشاور یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا پشاور میں فارغ بخاری اور تاج سعید سے دوستی ہوئی جو فارغ بخاری کی وفات تک قائم رہی اور تاج سعید سے آج بھی بہت گہرے مراسم ہیں۔ تاج سعید نے پریمیر شوگر مل مردان کے ایک رسالے "قند" کی ادارت سنبھالی اور بڑے معرکہ کے نمبر نکالے افسانہ نمبر ناولٹ نمبر۔ ڈرامہ نمبر موسیقی نمبر۔۔ اس رسالے میں کئی مقالے میں نے ادب میں گروہ بندی اور پارٹی بازی کے خلاف لکھے۔ اس دوران میں نے بہت سے افسانے لکھے۔

جو افسانے پاکستان میں اپنے موضوع کی شدت کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکتے تھے وہ بھارت کے اردو رسالوں میں شائع ہوتے یوں بہت سے افسانے ضائع بھی ہو گئے۔ کلاسیکی ادب کے بارے میں ایک زبردست مضمون ڈاکٹر محی الدین زور مرحوم کے رسالے "سب رس" میں شائع ہوا اور اس کے بعد لوگوں نے مجھے بھارت میں لکھنے کی دعوت دی لیکن بھارت سے تعلقات خراب ہونے کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ "قند" کے ناولٹ نمبر میں میرا ناولٹ "مرگ بہار" بھارت اور پاکستان دونوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ اس دوران کراچی کے رسالوں "نگارش" اور "ساقی" میں کافی افسانے شائع ہوئے اور پھر "سب رنگ" میں جانوروں کی کہانیوں کا سلسلہ شروع ہوا جو بعد میں "بوزنے بندر" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔ ایک ناولٹ "بچہ سقہ" کے بارے میں بھی لکھا جو کتابی صورت میں شائع ہوا جسے شورش کاشمیری کے رسالے "چٹان" نے قسط وار شائع کیا اور وہ کتاب بھی اس رسالے کے توسط سے فروخت ہوئی۔

ٹیلی ویژن میں ایک پروڈیوسر کے طور پر ایک سال کی تربیت کے بعد نوکری شروع کی۔ کچھ

مدت بعد مجھے پشتو پروگرام دیے گئے جو میں پشاور سے فن کاروں کو لا کر اسلام آباد اسٹوڈیو میں ریکارڈ کر کے پیش کرتا تھا۔ کچھ لوگوں نے جن میں پریشان خٹک کا نام خاص طور پر نمایاں ہے مجھ سے پشتو ادب کے نام پر پروگرام حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ان لوگوں کو کچھ پروگرام دیے لیکن پروگرام کا معیار گرانے کی صورت میں کوئی سمجھوتا نہ کیا۔ ان لوگوں نے میرے خلاف تحریک چلائی کہ میں غیر پختون ہوں اور پشتو زبان اور ادب کو تباہ کر رہا ہوں۔ میں نے اس زمانے میں چند ایسے فنکار متعارف کرائے جن کو آگے چل کر پاکستان گیر شہرت حاصل ہوئی۔ ان میں مہ جبین قزلباش، فردوس جمال اور پرویز اختر کے نام شامل ہیں۔ ٹیلی ویژن والوں نے مجھے کراچی ٹیلی ویژن میں بھیج دیا۔ وہاں سارے لوگ مجھ سے خوف زدہ تھے کہ میں کوئی خطرناک آدمی ہوں جس نے ٹیلی ویژن کارپوریشن کے آمر اسلم اظہر سے مقابلہ کیا۔ وہاں اتفاق سے ایک زبردست آدمی عبدالکریم بلوچ پروگرام منیجر تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ بھی نسلی تعصب کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس لیے مجھے غصہ تھوک کر نئے سرے سے کام شروع کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا ابھی ٹیلی ویژن کے ارباب بست و کشاد تم سے ناراض ہیں اس لیے تمہیں اردو کا پروگرام پیش کرنے کا موقعہ نہیں ملے گا۔ اس طرح میں نے سندھی میں بچوں کے لیے "روشن تارا" کے نام سے پروگرام شروع کیا اور اس میں مہتاب چنا کو میزبان کے طور پر بلوچ صاحب کے مشورے سے رکھا۔ پروگرام بہت کامیاب رہا اور مہتاب چنا اردو میزبان کے طور پر بہت مشہور ہوئیں۔

اسلم اظہر کی چھٹی ہوئی تو بہت سے لوگوں کے دن پھر گئے۔ مجھے اردو ڈرامے اور پھر "کسوٹی" پروگرام کو پیش کرنے کا موقعہ ملا۔ کراچی میں ہم لوگ بہت خوش تھے کہ پتہ چلا کوئی ضیا جالندھری جنرل ضیا سے جالندھر کا قارورہ ملا کر ٹیلی ویژن کا مینجنگ ڈائرکٹر بن گیا ہے۔ اس نے آتے ہی اپنے دوستوں کو نوازا اور اپنے دشمنوں سے انتقام لینا شروع کیا۔ جانے اس سے میری کیا دشمنی تھی۔ شاید میں احمد فراز کا دوست تھا اس نے اور فتح محمد ملک نے فراز کے خلاف مضامین لکھے تھے اور میں نے ان کے جواب میں مضمون لکھا اور یہ بحث کافی دیر "فنون" میں چلی۔ ضیا جالندھری نے میرا تبادلہ پشاور کر دیا وہاں پہنچا تو دو چار لوگ جو مجھ سے ملازمت میں کم مدت رکھتے تھے نئے افسر بنے ہوئے تھے انہوں نے آہستہ آہستہ میرے خلاف وہی نسلی تعصب کا نعرہ بلند کیا گم نام خطوط اور اخباروں میں بیانات سے ایک مصیبت بن گئی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ وہاں کی مقامی زبان ہندکو میں "کاریگر" کے نام سے ڈراموں کا سلسلہ شروع کیا جو پشتو پروگراموں سے بہتر تھا۔ ضیا جالندھری کو موقع مل گیا اور میرے خلاف تحقیقات شروع ہوئیں۔ میں نے اس مصیبت سے بچنے کے لیے استعفیٰ دیا اور امریکہ آگیا۔ یہ بھی غلطی تھی۔ یہاں آکر پھر مجھے نئے سرے سے کام شروع کرنا پڑا۔ میں یہاں خوش نہیں مگر

ایک فائدہ یہ ہوا کہ وسعت نظر بڑھ گئی اور مطالعہ خاصا وسیع ہو گیا۔ ٹیلی ویژن کی نوکری کے دوران بہت کم وقت ملتا تھا اس لیے لکھنا کم کر دیا تھا اب یہاں پھر لکھنا شروع کیا ہے۔ افسانوں کا ایک دوسرا مجموعہ "ناشناش" کے نام سے شائع ہوا اور دو کتابیں "پیکار اور شرح" کے نام سے زیر ترتیب ہیں۔ ایک کتاب "خانہ بدوش" کے نام سے بھی مرتب کر رہا ہوں جس میں وہ افسانے ہوں گے جو بیرونی ممالک کے بارے میں لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ "جریدہ" کے کشمیر نمبر کے لیے ایک ناولٹ "شب چراغ" کے نام سے لکھا ہے جو عنقریب شائع ہو گا۔ ایک ناولٹ گلگت اور شمالی علاقوں کے بارے میں نانگا پربت کے باسی کے نام سے حال ہی میں لکھا ہے۔ قریباً چھ سات کہانیاں انگریزی میں لکھی ہیں جو عنقریب شائع ہوں گی یہ کہانیاں بھی شمالی علاقوں کے بارے میں ہیں۔ ایک کتاب اپنے مرحوم دوست اور مربی "فارغ بخاری" کے بارے میں زیر ترتیب ہے۔ ایک کتاب تنقیدی مضامین کے بارے میں بھی شائع ہو گی جس میں زیادہ مقالے افسانوی ادب کے بارے میں ہیں۔ ایک ناول آسٹریلیا کے بارے میں لکھنا شروع کیا ہے "بریدہ بدن" جس کے چند ابواب عنقریب کسی رسالے میں شائع ہوں گے۔ یہ میری مہم جوئی کی داستان ہے اس میں پختونوں کا بھی ذکر ہے جن کو انگریز سو سال پہلے آسٹریلیا لے گئے تھے جنہوں نے کاروان چلائے اور آسٹریلیا کی اون اور بھیڑوں کو سمندر تک پہنچایا جہاں سے وہ انگلستان لے گئے۔ اس طرح آسٹریلیا کی خوش حالی میں ان کا برابر حصہ ہے۔"

انور خواجہ کا خیال ہے اکیسویں صدی میں جن اردو ادیبوں اور شعراء کو لوگ یاد رکھیں گے ان میں احمد فراز، فیض احمد فیض، قرۃالعین حیدر، عزیز احمد، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے نام سرفہرست ہیں۔"

کہتے ہیں "فکشن ایک لطیف آرٹ ہے مجھے اس بات سے اتفاق ہے اور یہ بھی درست کہ تجریدی ادب کی تحریک نے افسانے میں کہانی کے فن کو تباہ کر دیا اس لیے اردو افسانہ زوال کی طرف مائل ہے۔ تجریدی افسانے ان لوگوں نے لکھے جن کو بہت جلد مشہور ہو جانے کا شوق تھا اور جذباتی افسانے عورتوں نے لکھے جنہوں نے بنیادی جذبات کو استعمال کیا۔ لیکن سوائے قرۃالعین اور جمیلہ ہاشمی کے سب کے افسانے محض جذباتی تراشے تھے۔"

انور خواجہ کے بقول شاعری یا نثر اسی صورت میں بڑا ادب کہلائی جا سکتی ہے جب وہ انسانی بنیادی سچائیوں کا پرچار کرے بلا تخصیص مذہب اور نسل کے۔"

اردو میں اچھے اور معیاری ناول کم لکھے گئے ہیں اس کی بنیادی وجہ ان کے خیال میں یہ ہے کہ ناول لکھنے میں کافی وقت صرف ہوتا ہے اور اردو کے اکثر ادیب صرف فرصت کے وقت لکھتے ہیں باقی وقت ان کا غم روزگار میں صرف ہوتا ہے۔ اردو ادب ان کے اخراجات کا کفیل

نہیں ہو سکتا ہے اور بیرون ملک اردو میں شاعری زیادہ اس لئے ہو رہی ہے کہ اس میں کم وقت صرف ہوتا ہے۔ نثر لکھنے کے لیے دماغی کاوش کے علاوہ جسمانی محنت بھی کرنی پڑتی ہے۔"

سوال نمبر ۲ کے جواب میں کہتے ہیں "اردو کئی زبانوں کا مجموعہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں اردو کو جتنے انگریزی الفاظ کی ضرورت ہے اتنے وہ جذب کر رہی ہے۔ میں اتفاق نہیں کرتا کہ عربی اور فارسی زبانیں جدید علوم سے ناآشنا ہیں۔ دونوں زبانوں میں تمام جدید سائنسی مضامین پڑھانے کی صلاحیت موجود ہے۔ جب کہ اردو میں یہ صلاحیت کم ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اردو زبان اپنے ادیبوں کی اقتصادی حالت سدھارنے میں ناکام ہے۔ اردو ادب میں تنقید موجود ہے لیکن تنقید صرف ستائش باہمی کا نام ہو کر رہ گئی ہے۔ چند ادیبوں نے گروہ بندی کر لی ہے ان کے پاس پیشہ ور نقاد موجود ہیں۔ وہ ذرائع ابلاغ پر بھی چھائے ہوئے ہیں کئی اخبار نویسوں نے شاعروں اور ادیبوں کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور وہ اپنے پیشے کے ذریعے انعامات عہدے اور نوکریاں حاصل کر رہے ہیں۔ اردو میں سنجیدہ تنقید کا زوال شروع ہو چکا ہے۔ اردو میں اب بڑے ادب کے تراجم بند ہو گئے ہیں اس لیے کہ کوئی ان کتابوں کو نہیں پڑھتا۔ سارے لوگ صرف ڈائجسٹ پڑھ کر گذارا کرتے ہیں اس لیے کسی ادیب کو کیا ضرورت ہے کہ دنیا کے بڑے ادبی شاہکاروں کو اردو میں شائع کرے۔ پہلے تو ان تراجم کو کوئی شائع ہی نہیں کرے گا۔ علاقائی زبانوں کا بہت سا ادب اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ مجھے آپ کی بات سے اتفاق ہے کہ اردو میں علاقائی زبانوں کے تراجم نہ ہونے سے نیا خون نہیں آرہا۔ اس طرح اردو کے خزانے میں اضافہ نہیں ہوگا۔"

MR.ANWER KHUWAJA
4337 SILVR DOLLAR, APT, 2
LASVEGAS, NV.89102, U.S.A

تو محورِ جاں جب سے ہے ہر دید ہے مصروفِ تلاطف
پہلے تو میں دنیا ہی سے برہم نہ تھا خود سے بھی خفا تھا۔

محمد انور سلیمی

۶/۳/۹۹

انور سلیمی

کیلی فورنیا

خلیل جبران نے کہا ہے۔ زندگی دو بڑی سعادتیں ہیں۔ حسن اور صداقت۔ حسن کو میں نے محبت کرنے والے دل میں پایا اور صداقت کو ایک مزدور کے ہاتھوں میں۔

انور سلیمی کہتے ہیں مجھے یہ دونوں سعادتیں نصیب ہیں۔ میں نے جب اپنے باطن میں جھانکا مجھے وہاں محبت ملی۔ اپنے آپ سے بھی اور خالق کائنات کی ہر تخلیق سے۔ اور صداقت بھی کہ میں پیشے کے اعتبار سے وکیل ہوں لیکن مزدور پہلے ہوں۔ زندگی کے شب و روز قلم کی مزدوری میں گزرے ہیں۔ آیئے میں اپنے بارے میں آپ کو تفصیل سے بتاؤں۔

10 نومبر 1933ء میری تاریخ پیدائش ریکارڈ میں درج ہے۔ فرید کوٹ ضلع فیروز پور مشرقی پنجاب، بھارت میری جائے پیدائش ہے۔ وہیں میٹرک تک زیر تعلیم رہا۔ البتہ میٹرک کا امتحان پاکستان میں 1948ء میں میاں چنوں ضلع ملتان سے دیا۔ 5 جنوری 1950ء کو تقریباً "17 سال کی عمر میں رشتہ ازدواج میں جوتا گیا۔ 20 جولائی 1950ء کو بلدیہ ملتان میں 18 سال سے کم عمر میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا جو مختلف محکمہ جات، مختلف مقامات اور مختلف اوقات میں قدم قدم

چلتا ہوا نومبر 1955ء میں شاہدرہ ضلع شیخوپورہ میں نائب تحصیل دار کی حیثیت سے اختتام پذیر ہوا۔ یوں میری ملازمت سے ریٹائرمنٹ 25 سال سے بھی کم عمری میں ہو گئی۔

مالی وسائل اور دیگر مواقع روایتی تعلیم کے حصول میں حارج اور مانع رہے مگر مالک کائنات نے میری راہیں روشن اور میری ہمت بلند رکھی اور میں نے 1952ء تک منشی فاضل کے بعد ایل ایل بی اور کافی عرصہ بعد غالباً" 1977ء یا 1978ء میں ایم اے کیا۔ یہ ایام کچھ ایسے سہل، پر سکون اور خوش گوار نہ تھے شب و روز، دفتری کام، پرائیویٹ تعلیم، بیوی اور بچوں کا ساتھ اور اخراجات اور زمانہ کی ہمہ قسم ناہمواریاں اور کیا کیا نہ ہو ادل کے ساتھ۔ مگر ہم نے کتاب اور تعلیم کا دامن اپنے اللہ کے فضل سے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

اگست 1957ء میں ساہیوال (جو اس وقت منٹگمری تھا) میں وکالت شروع کی اور اپریل 1958ء میں چوہدری الطاف حسین صاحب کی دعوت پر رحیم یار خان منتقل ہو گیا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں رحیم یار خان میں بہت نامور وکیل تھا مگر یہ ضرور دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اگر وہاں کے وکلا کو شمار کریں تو میرا نام اولیں 4 یا 5 ناموں میں آجائے گا۔

اور اب میں ہوں اور کرونا شہر ہے دوستو
دیکھیں رہتا کب تک یہ قہر ہے دوستو

میرے خیال میں یہ نام اردو ادب میں تابندہ رہیں گے۔ احمد ندیم قاسمی، امجد اسلام امجد، جمیل الدین عالی، جمیل جالبی، گیان چند، گوپی چند نارنگ، نذیر ناجی (معہ اپنے تین بھائیوں کے) خالد احمد، ڈاکٹر محمد یونس، طاہر صدیقی، آصفہ نشاط اور "حرف معتبر" کی خالق سلطانہ مہر جو تذکرہ نویس کی حیثیت سے تاریخی کام کر رہی ہیں۔

3- لفظ فکشن لغوی طور پر تو دلالت کرتا ہے۔ ہر اس تحریر پر جس کا تعلق انسانی واردات جسمی، قلبی اور حسی وغیرہ سے نہ ہو مگر وہ صرف تخیلاتی تانا بانا ہو۔ جو کو تخیل میں خیال اور تصور نے اپنے فن کارانہ ہنر سے بنا ہو اور میرے خیال میں اور غالباً" آپ نے بھی اس لفظ کو nonfiction کے مقابلے میں استعمال کیا ہے جس میں تخیل، تصور، احساسات، جذبات، قلبی اور فزیکل واردات کے ساتھ ساتھ مشاہدات وغیرہ سب شامل ہیں۔ یہ ایک طویل بحث ہے۔ اسے مختصر طور پر یوں کہنا چاہئے کہ جدیدیت باعث وسعت زبان و بیان ہوتی ہے۔ اس سے اسلوب بیان میں تکلف اور تواتر ختم ہوتا ہے۔ ابلاغ میں آسانی ہوتی ہے۔ مگر xrated فلموں کی طرح کوئی بات کرنا نہ جدیدیت ہے نہ تنقید بلکہ سراسر پھکڑپن ہے۔

4- اس سوال میں ایک امر کو آپ نے اپنے طور پر طے شدہ تصور کر لیا ہے کہ موجودہ صدی میں اردو ادب میں بہت کم ناول لکھے گئے ہیں۔ اگر آپ ایسا سمجھتی ہیں یا محسوس کرتی ہیں تو میں آپ پر کوئی قدغن لگانے کا حق نہیں رکھتا مگر امر واقعہ یہ ہے کہ قطع نظر کمیت و کیفیت کے سارا اردو ناول

یا ڈرامے یا افسانے ایک طرف اور بیسویں صدی کی نگارشات ایک طرف پھر بھی بیسویں صدی کا پلہ بھاری ہوگا۔ اس کو promote کرنے اور وسعت دینے میں مکتب سے مدرسہ یا اسکول یا کالج یا یونیورسٹی یا بیروں ملک تعلیم کے سفر اور چھاپہ خانہ ٹائپ رائٹر اور کمپیوٹر نے بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔ یہ تو حال ہے تعداد کا یا کمیت کا۔ جب آپ کمیت سے کیفیت کی طرف آتے ہیں تو یہ معاملہ دگر گوں ہے اور آپ کا سوال اس کا احاطہ بھی نہیں کر رہا۔ تو بات ختم ہوئی۔ مجھے آپ سے اتفاق نہیں ہے کہ بیسویں صدی میں ناول نویسی نسبتاً" کم ہوتی ہے۔ اگر آپ اس کا تقابل انگریزی ادب ناول نویسی سے کریں تو آپ حق بجانب ہیں۔ اپنے اس مفروضہ پر میں پھر کوئی دلیل لانے کو تیار نہیں ہوں کیونکہ آپ کے سوال کا انداز اور زاویہ ادھر کو اشارہ نہیں کر رہا۔

5- اس سوال کا تعلق بہ یک وقت اقتصادیات' نفسیات' روحانیات اور شعور سے ہے۔ عام حالات میں اقتصادیات باقی تینوں حصوں کو بہ جملہ انسانی رویہ کو متاثر کرتی ہیں۔ اقتصادی طور پر آسودہ ادیب اگر نفسیاتی' ذہنی یا روحانی کرب میں یا انتشار میں مبتلا ہے تو یہ ابتلا اس ادیب سے مختلف ہوگا جو نا آسودہ ادیب کو ہے۔ بہتر زندگی بسر کرنے کے سلسلے میں کسی "نظام فکر" کی نہیں نظام اقتصاد یا ترتیب و تدوین اقتصاد کی ضرورت ہے۔ آسودگی یا بہتر (مادی طرز پر) زندگی کے لئے مالی وسائل کی ضرورت ناگزیر ہے۔ یہ کس طرح عمل میں آئے تو اقتصاد کا بنیادی اصول طلب اور رسد (Demand & Supply) ہے۔ اگر مانگ سے زیادہ مال منڈی میں آجائے تو اس کی قیمت ارزاں ہو جاتی ہے اور بعض اوقات مال بکتا ہی نہیں' ضائع ہو جاتا ہے۔ اردو ادب کی مارکیٹ میں مانگ دیکھیں اگر مانگ سے زیادہ ہم مال منڈی میں لا رہے ہیں تو آسودگی یا بہتر زندگی میسر نہ آسکے گی۔ اس میں آپ کے سابقہ سوال کا جواب بھی ہے کہ بیسویں صدی میں مانگ سے زیادہ اردو ناول نویسی ہوئی اور ادیب بہتر زندگی گزارنے سے محروم رہا۔ میں اس بات کا پرچارک نہیں ہوں کہ اردو ادب یا ناول نویسی وغیرہ میں کمی کی جائے بلکہ میں نے صرف ایک اصول بیان کیا ہے۔ علاج اس کا یہ ہے کہ اردو ادب کے سلسلے میں ذوق مطالعہ کی وسعت میں سعی کی جائے۔ جب قارئین زیادہ میسر آئیں گے تو آپ کی پیداوار کی نکاسی ہوگی۔ ادباء کو تخلیق معیاری کرنا چاہئے اور پبلشر کی آمریت کو کنٹرول کرنے کا کوئی بندوبست ہونا چاہئے۔

6- خیال و افکار میں ندرت' الفاظ و محاورہ کی چست بندش اور برمحل استعمال اختصار و ابلاغ۔

7- مجھے آپ سے اتفاق نہیں ہے کہ شاعری زیادہ ہو رہی ہے۔ اگر آپ ان تمام تحریروں کو جو اخباروں میں نظم' شعر' غزل' قطعہ' رباعی یا کسی دیگر نام سے چھپتی ہیں۔ شاعری کہتی ہیں اور ان تمام تقاریر کو جو مشاعرہ میں پڑھی جاتی ہیں' شاعری کہنے پر بضد ہیں تو درست ہے۔ وہ یہ جملہ تحریر اور تقریر شعر کے نام سے لکھی اور پڑھی جاتی ہیں مگر ان کا تعلق صنف شعر سے کلیتاً" نہیں ہوتا۔ اکثر فن عروض' بحر وزن' قافیہ و ردیف سے عاری ہوتی ہیں جبکہ شعر نظم کا نام ہے۔ نظم کے نام پر

بد نظمی اور انتشار کو شعر کہنا نامناسب سی بات ہے۔

پھر نظم ہو یا نثر اس کے لئے قاری درکار ہیں۔ بیرون پاکستان یا ہندوستان اردو خواں آبادی میں نصف سے زیادہ لوگ حس ادب سے محروم ہیں اور اچھی خاصی تعداد معاش کے چکر میں سرگرداں ہے۔ انہیں فرصت (بصورت وقت اور بصورت رقم) ہی نہیں کہ ادب یا ادیب سے تعلق رکھ سکیں جو مختصر سی تعداد باقی بچتی ہے وہ ہی ادیب ہیں، وہی قاری اور پھر ان پر معاش کا بوجھ موجود ہے۔

یہ امر درست ہے کہ اردو زبان کی ترقی اور over halling یقیناً" متاثر ہوگی۔ اگر اس میں انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کا استعمال نہ کیا گیا۔ مگر یہ امر میرے خیال میں صرف non opotimistic انداز ہے جو ہم سوچتے ہیں کہ انگریزی الفاظ اردو میں جذب نہیں ہو رہے ہیں۔ ہم اپنے روزمرہ کی گفتگو اور اردو تحریر کا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ یہ جذب و انجذاب کا پراسس اپنے قدرتی انداز میں جاری و ساری ہے۔

9- آئندہ و گذشتہ تمنا و حسرت است
یک کاش کہ بود بصد جا نوشتہ ایم
(زندگی کی حسرتیں، آرزوئیں، ناکامیاں، کاش کہ میں انہیں یکجا کر سکتا)

10- جب بھی کوئی جہت توجہ سے محروم ہوگی تو اصل زبان کو نقصان تو یقینی ہے۔ 1- تنقید کا فقدان 2- تراجم کی طرف عدم توجہ 3- علاقائی زبانوں سے عدم توجہ۔

یہ سب قارئین کی عدم ذوق مطالعہ کی وجہ سے ہیں اور ذوق مطالعہ میں بنیادی وجہ جہالت اور غربت ہیں۔ اولاً" اردو زبان کے بنیادی علاقے ہند و پاک ہیں جہاں خواندگی کی تعداد 15 فیصد سے زائد نہیں ہے۔ اور یہ 15 فیصد میں بھی کتنے ہی ہیں جو دو وقت کی روٹی اور ضروریات زندگی کے لئے سرتا سر ڈوبے ہوتے ہیں اور کتنے فیصد ہیں جو سائنسی علوم کی وجہ سے یہ سنس یہ ہی ڈیولپ نہیں کر سکے۔

MR.ANWER SALEEMI
2158 HARWARD CIRCLE
CORONA CA 91719 U.S.A

انور شیخ

کارڈف۔ برطانیہ

کسی نے مجھ سے منہ بنا کر اور ہنکارا بھر کر پوچھا۔ "انور شیخ ہیں کیا آخر۔؟"

میرا جواب تھا۔۔ انور شیخ کیا نہیں ہیں؟ شاعر وہ ہیں' افسانہ نگار اور صحافی وہ ہیں (اپنا سہ ماہی جریدہ "لبرٹی" شائع کرتے ہیں۔) محقق اور مضمون نگار ہیں' خطیب بھی ہوں گے۔ بس میں نے ان کی خطابت سنی نہیں۔

ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "نبض جہاں" ہے جس میں ان کے افسانے بھی ہیں اور ان کا پیش لفظ بھی 1977ء میں شائع ہونے والے "سوز و ساز" میں پہلے مجموعے پر لکھی آراء ہیں۔ ان کا کلام ہے' افسانے ہیں اور پیش لفظ جو شاعری کے موضوع پر بحث کرتا ہے۔ اس میں تمثیلیے بھی شامل ہیں۔ 1998ء میں "آگ اور پانی" کے عنوان سے ان کا تیسرا شعری و افسانوی مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے "تکونی" کے عنوان سے ایک تیسری صنف شعری (تروینی اور ترائیلے کے بعد) کو متعارف کرایا ہے۔ بقول انور شیخ "تکونی" میں کسی بحر کی قید نہیں۔ اس کے برعکس موضوع کی مناسبت سے بحر کا انتخاب کار احسن ہے۔ تکونی تین بندوں پر مشتمل ہے جس کا ہر بند چار

اشعار تک محدود ہے۔ اس بندش کا سبب یہ ہے کہ نہ صرف مدعی اور مدعا علیہ کو اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کا یکساں موقع دیا جائے بلکہ مبصر بھی اس حد میں رہ کر اپنی رائے کا اظہار کرے تاکہ تکونی لفاظی کا شکار ہونے کی بجائے اپنی جامعیت اور نکتہ سنجی کو قائم رکھ سکے۔

ایک تکونی نمونے کے طور پر ملاحظہ کیجئے۔

شاعر اور بیوی

شاعر (بیوی سے)

خالق ہستی نے مجھ کو دولت جذبات دی
جو لٹاتا ہوں میں تجھ پہ روز و شب اے جان من
تیرے چہرے کی ہیں جھریاں' جس طرح ناگن کے بل
میں انہیں باندھوں مگر ایسے کہ ہوں رشک چمن
میں تری آواز کو کہتا ہوں "شہنائی ہے یہ"
سن کے اس کو بھاگتے ہیں گرچہ سب زاغ و زغن
پھر بھی کیوں ہوتی نہیں تو مائل بوس و کنار؟
آہ' اے بد ذوق' تجھ سے شاعری ہے شرمسار

بیوی (شاعر سے)

شاعری کچھ بھی نہیں' یہ تو ہے اک دیوانگی
ایک شیخی' دل لگی' بیماری قلب و ذہن
مسلک شاعر تو ہے الفاظ کی جادوگری
نازنینوں کو فقط الو بنانے کا یہ فن
ہے وہ پاگل جو کرے اخلاص شاعر پر یقیں
انتہائے شاعری کہنا گدھے کو گلبدن
گدگداتے ہو مجھے تو جانتی ہوں جان من
دل تمہارا تو کسی مہ وش کی یادوں میں مگن

مبصر

ہاں یہ مانا شاعری' الفاظ کی جادوگری
پھر بھی اس میں دل کی دھڑکن کا نہاں پیغام ہے
دل ہی کیا' ہے گونجتی اس میں ندائے ذوالجلال
گر کوئی الہام تو اک شاعری الہام ہے
ذکر خوباں' میکشی' تعریف اصنام خیال
اصل میں یہ شاعری کا چہرہ گل فام ہے
زندگی شاعر کی ہائے حسرتوں سے چور ہے
خواب رنگیں کے سہاروں پہ بہت مجبور ہے

اس تکونی میں شاعر اور بیوی کی نوک جھونک مزاحیہ انداز میں ہے لیکن شاعر کی باطنی زندگی حسرتوں کا مجموعہ ہونے کے سبب اس کی حیات ظاہری سے الگ ہے۔ اس کا ذکر خوباں' مے کشی کی ڈینگیں اور خیالی محبوبوں کی مدحت سرائی ایسے ہی ہے جیسے لوہے کے زیور کی بدنمائی کو چھپانے کے لئے اس پر سونے کا ملمع ہو۔ مبصر کا فیصلہ یہ ہے کہ شاعر اپنی بدنصیبی کے باعث رنگین خوابوں کا سہارا لینے پر مجبور ہے۔ اس کا مذاق اڑانا جائز نہیں۔

انور شیخ 1928ء میں گجرات (پاکستان) کے ایک قریبی گاؤں میں بروز حج پیدا ہوئے لیکن ان کی پرورش لالہ موسیٰ میں ہوئی جہاں انہوں نے میٹرک اسلامیہ ہائی اسکول سے کیا۔ انور شیخ نے بی۔ اے اور بی۔ ٹی پشاور یونیورسٹی سے کی جس سے ان کی محبت بھری یادیں وابستہ ہیں۔ پشاور میں انہوں نے انجمن تدریس القرآن کی بنیاد رکھی اور اس کے سیکریٹری رہے اسی دور میں انہوں نے مختلف اسلامی موضوعات پر کئی کتابیں اردو میں لکھیں۔ پشاور اور راولپنڈی میں چند سال ٹیچر کے طور پر گزارے اور پھر ایک ڈسٹرکٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے لیکن حالات کی ناسازگاری کے

باعث 1954ء میں برطانیہ چلے آئے۔ یہاں انہوں نے انسٹی ٹیوٹ آف ٹرانسپورٹ لندن سے گریجویٹ کیا۔ اس ملک میں ابتدائی تین سال کڑے ثابت ہوئے لیکن بعد میں پراپرٹی کی خرید و فروخت اور تعمیر کو اپنا کاروبار بنالیا جس میں وہ کامیاب رہے۔ ان کی اہلیہ ویلز سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کے باپ ہیں۔

انور شیخ کو بچپن میں پنجابی شاعری کے ساتھ لگاؤ تھا۔ ہیر رانجھا' سوہنی مہینوال' سیف الملوک اور محمد بوٹا کی کافیوں کا ان کے مزاج پر اثر ہوا۔ انہیں اردو شاعری سے رغبت اس وقت ہوئی جب وہ 1946ء میں وہاں ریلوے کلرک تھے۔ اگرچہ انہیں عمر بھر شاعری کا شوق رہا اور کبھی کبھی تفریح طبع کے لئے شعر کہہ لیتے تھے لیکن انہوں نے اس بنا پر شاعری کو سیاست نہ بننے دیا کہ یہ شاعر کو بے عمل بنادیتی ہے لیکن 1993ء میں شعر گوئی کا غلبہ اس شدت سے بڑھا کہ وہ طوہاً" کرہاً" اس کی لپیٹ میں آگئے۔ وہ اس میدان میں تلمیذ الرحمٰن ہیں اس لئے انہیں کسی شاگردی کا فخر حاصل نہیں۔ انہوں نے فن شاعری مختلف کتابوں سے اپنی کاوش سے حاصل کیا۔

انور شیخ کے مزاج میں طنز و مزاح بدرجہ اتم موجود ہے۔ متعدد انگریزی کتابوں کے مصنف ہونے کی وجہ سے انہوں نے انگریزی زبان کو اس کا ذریعہ اظہار بنانا چاہا لیکن پھر برصغیر کی سماجی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے اردو کو انگریزی پر ترجیح دی۔ اکثر لوگ انور شیخ کو فلسفی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انہیں افسانہ نگار کے روپ میں دیکھنا خود باعث تبسم ثابت ہو۔

انور شیخ نے شاعری کی ہر صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ افسانے بھی لکھے ہیں اور عملی مذہبی و فلسفیانہ امور پر مقالہ نگاری بھی ان کا میدان ہے۔ اپنا کلام بغرض اشاعت کسی کو نہیں بھیجا۔ کہتے ہیں "کسی نے جو بھی چھاپا میری کتابوں سے خود ہی اخذ کیا۔"

انہیں مذہب' فلسفہ' عمرانیات اور تاریخی کتابوں کے مطالعے سے دلچسپی ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ ان کے لئے اہم اور یادگار واقعے کی طرح ہے۔ ان کے بقول میری زندگی ہمیشہ ہی ایک مسلسل جدوجہد رہی ہے۔ نہ صرف خود آموختہ ہوں بلکہ خود ساختہ بھی ہوں۔

نثری نظم اور غزل کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ یہ نثر کا جزو ہیں شاعری کا نہیں۔ مشاعرے خود نمائی کا ذریعہ ہیں ادب کا نہیں۔

اردو کے مستقبل کے بارے میں ان کا کہنا ہے خدا اس زبان کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ یہ صرف اسلامی ثقافت کی ترجمان بن کر رہ گئی ہے لیکن مسلم ممالک میں اسے کوئی نہیں جانتا۔ اس کی بقا کا راز اس کے ہندوستانی اور پاکستانی بننے میں ہے۔

ہم نے پوچھا۔ اس ضمن میں تھوڑی سی وضاحت کر سکتے ہیں؟

انور شیخ کا جواب تھا "کیوں نہیں!" پھر انہوں نے مدلل انداز میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "اکثر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اردو اسلامی ثقافت کی علمبردار ہے۔ اگر اس دعوے کو بہ نظر غائر دیکھا جائے

تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو نے ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کے اذہان کو اس طرح زنجیر غلامی میں جکڑ رکھا ہے کہ ان کی قومی حمیت مصلوب ہو چکی ہے۔ دنیا میں اور بھی کئی مسلمان قومیں ہیں لیکن ہر ایک کو اپنے کلچر پر ناز ہے اور ان کا ادب قومی روایات کا ترجمان ہے لیکن بھارتی اور پاکستانی مسلمانوں کو یہ سعادت نصیب نہیں۔ اردو شاعری اس حقیقت کی ایک زندہ مثال ہے۔ جس کی تمام اصناف سخن غیر ممالک سے مستعار ہیں۔ غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، قطعہ وغیرہ سب اس زمرے میں آتے ہیں۔ غالباً" صرف ماہیا ہی ایک دیسی تخلیق ہے۔ جس کا رواج صدیوں سے پنجاب میں چلا آرہا ہے لیکن اسے بھی یار لوگوں نے ہائیکو سے منسوب کردیا ہے۔ جس کا تعلق جاپان سے بیان کیا جاتا ہے۔ اگر ماہیے کو جاپان میں ہائیکو کہتے ہوں تو یہ اور بات ہے لیکن جو پنجاب کی دیہاتی زندگی سے آشنا ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ اس خطہ ارض میں لوک گیت کی حیثیت رکھتا ہے جسے کسی شاعر کی ضرورت نہیں۔

یقیناً" دنیا کا ہر ادب غیر ملکی روایات سے متاثر ہوتا ہے لیکن وہ مقامی ادب۔ جس میں اپنی قومی اقدار کی ترجمانی نہ ہو ادب کہلانے کا نہ مستحق ہے اور نہ ہی وہ کبھی نقطہ عروج پر پہنچ سکتا ہے۔ ایسا ادب محض نقالی ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے بندر کے چہرے کی ظاہری خوش کن کیفیت کو کسی گل رو کی مسکراہٹ سے تشبیہہ دی جائے۔ جو کبھی دل چرانے کی سازش ہوتی ہے تو کبھی اظہار مروت کی۔ لیکن حقیقتاً" بندر کی خندہ نما صورت اس کے چڑچڑے پن کی نمائندگی کرتی ہے جسے غلطی سے تبسم سمجھا جاتا ہے۔

اردو شاعری میں رسم نقالی کو کم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں دجلہ و فرات کی جگہ سندھ اور گنگا کو اہمیت دی جائے اور شعری رومانیت کو لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور غیر ملکی حملہ آوروں کی داستانوں سے آراستہ کرنے کے بجائے سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا، سسی پنوں اور ایسی تلمیحات سے سنوارا جائے۔ جس سے مقامی اور ملکی عظمت ٹپکتی ہو اس سے بھی کہیں اہم بات یہ ہے کہ اردو زبان میں ایک ایسی صنف سخن رائج کی جائے۔ جو نہ صرف نقالی کی بوباس سے آزاد بلکہ مقامی روایات کی علمبردار ہو۔

کیا کوئی ایسی صورت ہے کہ اردو شاعری کے مزاج کو برصغیر ہند کی قدیم ادبی روایات سے متاثر کیا جاسکے؟ اس سوال کے جواب میں ان کا کہنا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جس کا حل تلاش کرنے کے لئے میں نے طویل ذہنی کاوش سے کام لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈرامہ ہی فنون لطیفہ کی وہ شاخ ہے جسے ہندی الاصل کہا جاسکتا ہے۔ اس پر عرب و عجم کو کوئی دعویٰ نہیں ہوسکتا کیوں کہ ڈرامے کا منبع بت پرستی ہے۔ جس کی وجہ سے اہل عقیدت اپنے دیو مالائی کرداروں کو اداکاری کے ذریعے اسٹیج پر پیش کرتے ہیں اور اسے کار خیر سمجھتے ہیں۔ عرب بھی صدیوں تک بت پرستی میں مبتلا رہے لیکن اس سلسلے میں ان کی تمام روایات ہندوستان سے مستعار تھیں۔ ایرانی آتش پرست تھے اور ان کی

دوئی پسندی کا رجحان توحید کی طرف تھا کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ خیر و شر کی جنگ میں آخری فتح یزدان کی ہوگی اس لئے ان کے کلچر میں ڈرامہ نگاری کی کوئی ایسی مثالیں نہیں ملتیں جس کی بنا پر اس فن کو ایران سے منسوب کیا جا سکے۔

بت پرستی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مظہر فطرت مثلاً" آگ' پانی ہوا' سورج' چاند وغیرہ کے پیچھے ایک شکتی یعنی طاقت کارفرما ہے جسے دیوی یا دیوتا کا نام دیا جاتا۔ اس دیوی یا دیوتا کو سمجھنے کے لئے اس کے مفروضہ اوصاف کی نسبت سے اس کا بت تیار کرتے ہیں جسے اس کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے ڈرامہ بھی بالکل اسی طرح کسی فرض یا حقیقی کردار و داستان کی ترجمانی ہے۔ ناٹک کی ابتدا ہندوستان میں ہوئی لیکن اس سلسلے میں یونان کو پیش روی کا دعوی ہے اور اکثر لوگ اسے درست تسلیم کرتے ہیں البتہ میری تحقیق کے مطابق یہ رائے غلط ہے کیوں کہ یونانی دیو مالائیں ہندی دیوتاؤں کے کردار و اعمال سے اس قدر مماثلت رکھتی ہیں کہ یونانی دیوتا ہندی نژاد نظر آتے ہیں۔

چوں کہ یہ مسئلہ تقدیم خاص اہمیت کا حامل ہے اس کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ڈرامے کی جان مکالمہ ہے جس سے مراد دو یا زائد افراد کی وہ گفتگو ہے جو قلمبند کی گئی ہو اور اس میں ڈرامائی عنصر موجود ہو۔ البتہ ڈائیلاگ فنی یا ادبی مقام اسی وقت حاصل کرتا ہے جب کاوش سے اس میں کچھ عقلی' جمالیاتی اور فلسفیانہ زیب و زینت پیدا کی جائے۔ اس کی ابتدائی صورت کو MIME (مائم) یعنی "بھانتوں کی نقل" کہتے ہیں اور اس کی ادائیگی خاموشی سے محض حرکات و اشارات سے کی جاتی تھی۔ یونان و روم میں اس کا بڑا رواج تھا۔ قدیم ترین مکالمات وہ ہیں جو پانچویں قبل مسیح سسلی میں لکھے گئے۔ ان کی طرز تحریر مقفی عبارت تھی۔ افلاطون نے چوتھی صدی قبل مسیح اس فن کو اپنی فلسفیانہ جدت طرازیوں سے حد کمال تک پہنچا دیا۔

یونانی ڈرامہ نگاری میں ٹریجڈی کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس کا آغاز چھٹی صدی قبل مسیح کے دوران ہوا۔ اس زمانے میں ڈی آنے سس دیوتا بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا تھا۔ اس ڈرامہ نگاری کا آغاز ان روایتی بھجنوں سے ہوا جو اس کے پیروکار اس کی تعظیم کے لئے مستی کی حالت میں جوش و خروش کے ساتھ گاتے تھے۔ ڈی آنے سس کی چند خصوصیات یہ تھیں کہ وہ شراب و شہوت کا دیوتا تھا۔ اس کے متعلق یقین تھا کہ وہ دوبارہ پیدا ہوا۔ وہ صورت میں بیل (BULL-FACED) کی طرح تھا۔ اس کی نمائندگی ایستادہ عضو تناسل سے کی جاتی تھی جسے پوجا پاٹ میں خاص دخل حاصل تھا۔ علاوہ ازیں وہ حیوانات کا نگہبان سمجھا جاتا تھا۔

چوں کہ ڈرامے کی مقبول ترین صنف' ٹریجڈی کا تعلق "ڈی آنے سس" سے ہے۔ ہندی ناٹک کے تقدم کی حمایت میں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ ڈی آنے سس" ہندوستانی دیوتا شیواجی کا ہی ایک عکس ہے۔ بالفاظ دیگر وہ شیواجی کا یونانی نام ہے۔ مماثلت ملاحظہ ہو۔ شیواجی یعنی مہادیو کی سب سے بڑی پہچان شولنگ (عضو تناسل) ہے۔ اگرچہ انہیں بیل نما نہیں دکھایا جاتا بلکہ (بیل)

تندی کا باپ قرار دیا جاتا ہے۔ انہیں پاسوپتی کا خطاب اسی لئے دیا گیا ہے کہ وہ حیوانات کے محافظ سمجھے جاتے ہیں۔ ہندوؤں کے بعض فرقے ان کی پوجا اسی انداز میں کرتے ہیں جس طرح ڈی آنے سس کے پیروکار۔ شہوانی ماحول میں اس کی پرستش کرتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یونانی روایات کے مطابق اس نے شراب سازی کا فن ہندوستان میں سیکھا تھا۔ اس کے دوبارہ پیدا ہونے کی حکایت ہندوؤں کی رسم دوبارہ جنم شدہ کے بہت قریب ہے جو آج بھی رواں دواں ہے۔

رگ وید کی قدامت چھ سات ہزار سال بتائی جاتی ہے۔ اس تناظر میں یونانی ڈرامہ ہندی ناٹک کے مقابلے میں طفل مکتب نظر آتا ہے۔ رگ وید کی تیسری کتاب کا بھجن نمبر33 تین رشیوں کے درمیان ایک ڈائیلاگ ہے۔ کتاب اول کا بھجن نمبر165 اندر اور ماروت کے درمیان ایک مکالمہ ہے۔ اسی طرح رگ وید کی دسویں کتاب کا بھجن نمبر95 ارواسی اور پورورواس کا ایک ڈائیلاگ ہے۔ مائم (MIME) کی ایک خاصیت طنز تھی۔ رگ وید کی ساتویں کتاب کا بھجن نمبر103 (مینڈک) برہمنوں پر ایک طنز ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یونان کے قدیم طنز نگاروں نے مینڈک ہی کو مشاہیر کے لئے طنز کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ محض اتفاقی امر نہیں بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یونانی ڈرامہ نگار ہندی روایات کے مقلد تھے۔ اتنا ہی نہیں رگ وید کے کئی شلوکوں میں تین دیویوں کا ذکر ملتا ہے جو فنون لطیفہ کی مربی ہیں۔

"آئیلا۔ سرسوتی اور ماحی (تین دیویاں ہیں) جو خوشی بکھیرتی ہیں۔"

یونان نے یہی تصور ہندوستان سے مستعار لیا ہے۔ وہاں بھی تین دیویاں ہیں جو فنون لطیفہ کے مختلف شعبوں کی ہرنی ہیں ایک کا نام الگایا (ALGAIA) یعنی تنویر ہے۔ دوسری کو یفروسین (EUPHROSYNE) یعنی مسرت کہتے ہیں اور تیسری تھلیاں (THALIA) یعنی شگوفے کے لقب سے مشہور ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ رقص ہندی کلچر کا ایک اہم جزو رہا ہے۔ بالخصوص مذہب میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے جس کا اظہار دیوداسیوں نے مندروں میں کیا ہے۔ رامائن اور مہابھارت کی کتھائیں بھی بہت اونچا مقام رکھتی ہیں جنہیں ناٹک کی صورت میں پیش کرنا نہ صرف کار ثواب سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ ایک تعلیم و تعلم کا ذریعہ بھی ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر مجھے یہ قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ڈرامہ متحدہ ہندوستان کی پیداوار ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس دیس کے عظیم حکمران ڈرامہ نگاری کے فن میں طاق تھے۔ اس سلسلے میں راجہ کشک اور راجہ شدراک کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہ بات افسوس ناک ہے کہ اہل ہند نے فن تاریخ نویسی سے غفلت برتی اور اپنی کارگزاریوں کا ریکارڈ محفوظ نہ رکھا۔ دراصل ڈرامہ نگاری کے آغاز کا سہرا پاکستان بالخصوص پنجاب کے سر ہے جہاں ان مذکور راجاؤں کی حکومت تھی۔ غضب تو یہ ہے کہ اہل پاکستان کو محض مذہبی تعصبات کی بنا

پر اپنے خون، نسل اور باپ دادا کے نام سے بھی نفرت ہے اور وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ "تخلیق پاکستان سے پہلے جو کچھ ہوا اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔" کوئی یہ کیسے انکار کر سکتا ہے کہ "میرا باپ نہیں اور میرے دادا سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔" یہ فخر نہیں۔ ڈھٹائی اور حماقت کی انتہا ہے۔

یہ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ اردو ادب اہل پاکستان کی قومی اور ملکی روایات کا ترجمان نہیں۔ وہ مذہبی جنون سے اس قدر ماؤف الدماغ ہو چکے ہیں کہ "قومی غیرت و آزادی" کا نام سنتے ہی انہیں جھٹکے لگنے شروع ہو جاتے ہیں اور وہ عرب و ایران کے قدموں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

ان حقائق کے پیش نظر میں نے "تکونی" کے عنوان سے ایک نئی صنف سخن پیش کرنے کی جسارت کی ہے جو اپنی ڈرامائی نوعیت کے سبب ہندی النسل یعنی بھارتی بھی ہے اور پاکستانی بھی۔ علاوہ ازیں اس کا دائرہ بیان اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ہر ایک موضوع پر خیال آرائی کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اس میں طنز و مزاح کی بھی گنجائش ہے تکونی کی اساس منطق اور سنجیدگی پر ہے۔

میں "ترویني" اور "ترائیلے" کے تصورات سے آگاہ ہوں۔ دونوں ہی قابل قدر ہیں لیکن صنف سخن ہونے کے اعتبار سے تکونی ان دونوں سے مختلف ہے۔ یہ ایسا انداز بیان ہے جو ایک عدالتی ڈرامے سے مشابہ ہے جس میں مدعی، مدعا علیہ اور مصنف اپنا کردار کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ تینوں رول شاعر ہی نبھاتا ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے شاعرانہ مقام کو برقرار رکھتے ہوئے ایک پیشہ ور جج نظر نہ آئے اسی لئے اسے تکونی میں "مبصر" کہا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی عدالت میں مخالفین جیسی شہادت پیش کرنا چاہیں اس کے مستحق ہیں۔ خواہ وہ عاقلانہ ہو یا احمقانہ لیکن اس کے باوجود اسے ایک ڈھونگ (FARCE) کا رنگ نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ تکونی کا بنیادی مقصد سنجیدہ مسائل پر پر مغز بحث کرنا ہے اور شاعر آخری بند میں اپنی متانت اور منطقی قوت سے یہ فریضہ ادا کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تکونی۔ شاعر کی اپنی قوت فکر اور گہرائی نظر کی کسوٹی ہے اور وہ اس صنف سخن میں محض عروض و قافیہ اور لفاظی کے زور سے اپنی شاعری کا جادو جگا سکتا۔

سوال 7 کے جواب میں انہوں نے کہا کتابوں کی اہمیت کبھی ختم نہ ہوگی اگر کتابوں کے موضوعات، مواد اور خوبصورت طباعت ہوں تو ان کی مانگ بڑھ جائے گی۔

تنقید کے حوالے سے ان کی رائے ہے کہ یہ ایک فن ہے جو ہر کس و ناکس کی استعداد میں نہیں۔ ویسے بھی اکثر لوگ سچی تنقید سے دشمن بن جاتے ہیں اسی وجہ سے تنقید کا معیار گر گیا ہے۔

MR. ANWER SHAIKH

P.O.BOX 918, CARDIFEI CE5 2NL, U.K

انور نزہت

دہلی' ہندوستان

انور نزہت میری دوست ہیں۔ مخلص' پیار کرنے والی مرنجان مرنج۔ ٹکسالی زبان بولتی ہیں اور اس وقت بہت خوبصورت بولتی ہیں جب انہیں غصہ آتا ہے۔

ہاں میں نے انہیں غصے میں بھی دیکھا ہے۔ ان کی خوبصورت آنکھوں میں شبنمی موتی بھی دیکھے ہیں اور حسین خوابوں کی کرچیاں بھی۔ ان کے ہونٹوں پر دوستانہ خلوص سے جگمگاتی مسکراہٹ بھی دیکھی ہے اور ممتا کے بولوں کا شہد بھی اور اس کے اندر کی ایک بے بس عورت کو بھی۔ مگر انور میری دوست ہے اس لئے میں چاہوں گی کہ اس کے فن پر تبصرہ میں نہ کروں۔ میں نقاد بھی نہیں مگر جنہوں نے نزہت کے افسانوں میں فن پایا ہے ان کی رائے ضرور لکھنا چاہوں گی۔ ان میں ایک جو گند رپال بھی ہیں اور جو گند رپال کو کون نہیں جانتا؟ پال کہتے ہیں۔

"انور نزہت ایک طویل مدت سے کہانیاں لکھ رہی ہیں۔ اتنی مشاقی کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ اب وہ زندگی کی چھیتی قدروں کو بے آزار اپنی کہانیوں میں جمالیتی ہیں اور کھٹنا انہی کے تناظر میں اپنا کوئی تناسب اختیار کر کے گھٹنے لگتی ہے اور قاری بے جھنکا کہانی کے منطقی اختتام پر آن پہنچتا ہے یا پھر

جب اسے جھٹکنے کا احساس ہوتا ہے تو کہانی کے آخر میں جیسے ان کی "بے بی سٹر" کی سازشی کھلواڑ ساری کہانی کے عین متوقع ہونے کے باوصف آخر آخر میں جھنک سی دیتی ہے۔

انور نزہت کے بے بوجھ زبان و بیان کے اہتمام کی بدولت ان کی کہانیوں میں ایک سرعت سی بھر آتی ہے، جس کے باعث قاری انہیں اول تا آخر فرفر پڑھتا چلا جاتا ہے۔ میں نے بھی نزہت کو ایسے ہی استعجاب و دلچسپی سے پڑھا اور مطالعہ کے ان سرگرم موقعوں کی فراہمی کے لئے ان کا شکر گزار ہوں۔"

ڈاکٹر محمد علی صدیقی بھی ان کے فن کے مداح ہیں۔ وہ کہتے ہیں "انور نزہت کے افسانوں میں اکثر و بیشتر بہت ہی پیش افتادہ واقعات پر رد عمل ملتا ہے۔ وہ ان واقعات کی بنت یا ان کی ترسیل میں کسی مشاق فنکارہ کی طرح تجرباتی یا اسلوبیاتی کمالات سے کام لیتی نظر نہیں آتیں۔ جیسا کہ اکثر و بیشتر زیادہ نامور افسانہ نگاروں کا خاصہ ہے بلکہ وہ "جیسا میں نے پایا ویسا ہی میں نے رقم کیا" کے اصول کے مطابق قلم برداشتہ لکھتی چلی جاتی ہیں۔ آپ ان کے افسانہ کی ڈور پکڑلیں تو وہ آپ کو اپنے تجربہ کی "شدت" اور "ضرورت" سے ہمکنار کرتی چلی جائیں گی۔ یہ وہ کام ہے جس کے لئے انہیں چنداں محنت نہیں کرنی پڑتی غالباً وہ افسانہ لکھنے کے بعد خستہ حال نہیں ہوتیں جیسا کہ بہت سے افسانہ نگار اپنے بارے میں بیان کرتے ہیں بلکہ وہ مزید تازہ دم ہو جاتی ہیں اور اس طرح بظاہر غیر پختہ کہانیوں میں بھی ایک نوع کا حقیقی کہانی پن مل جاتا ہے۔ انسانی کتھا کی ایسی تمیں جو مشاق افسانہ نگاروں کی "استادی" کی نذر ہو جاتی ہیں۔ او ہنری نے کہا تھا کہ "میں کبھی کبھی ڈرتا ہوں کہ میرا کرافٹ اس عظیم سچ کو بھی مصنوعی نہ بنا دے جو اپنی سیدھی سچی صورت میں لاکھوں اندھیروں میں بھی کوہ نور ہیرے کی طرح جگمگاتا رہتا ہے۔"

تاشقند میں مقیم پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں "انور نزہت کو زبان اور اس کے تخلیقی استعمال پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ انہوں نے پرانی دہلی کی گلیوں اور شرفاء کی حویلیوں میں زبان سیکھی ہے۔ ان کی کہانیوں میں ایک مثبت اور تعمیری نقطہ نگاہ قاری کو متاثر کرتا ہے۔ واقعات اور کردار ان کے یہاں یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ اپنی کئی کہانیوں میں انہوں نے تخلیقی تعبیر اور اظہار کے تجربے اور کامیاب تجربے بھی کئے ہیں۔ ان کی بعض کہانیوں میں تانیثت (feminism) دردمندی، اور نازک نسوانی حسیت ملتی ہے۔"

اور یہ ہیں پروفیسر صغریٰ مہدی "انور نزہت سیدھے سادے انداز سے زندگی کے واقعات اور تجربات کو کہانی بنا کر پیش کر دیتی ہیں اور ان کہانیوں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ سب تو ہمیں بھی معلوم ہے یا ہماری نظر سے بھی گزرا ہے مگر ہم اس کو اس طرح بیان نہیں کر سکتے۔ "دہشت گرد کون" اور "عورت کھلونا نہیں" سے میں بہت متاثر ہوئی۔ "عورت کھلونا نہیں" میں مردوں کے سماج میں عورت کو جس طرح کھلونا سمجھ کر اس سے کھیلا جاتا ہے، انور نزہت نے بڑی خوبصورتی

سے اسے پیش کیا ہے۔"

اب آیئے انور نزہت سے ملتے ہیں انور نزہت 1938ء میں آگرہ میں پیدا ہوئیں۔ والدین نے انوری بیگم نام رکھا۔ ادبی دنیا میں انور نزہت کے نام سے مشہور ہیں۔ دو بیٹے ایک بیٹی ہیں جو امریکہ میں مقیم ہیں۔ نزہت نے افسانے' خاکے' ڈرامے' ناول اور ریڈیو کے لئے بھی لکھا ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ نئی روشنی پر یوپی اکیڈمی سے انعام بھی مل چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ "سفید سناٹا" اور تیسرا "قربتوں کے فاصلے" ہے۔ چوتھا "تنہائی کا زہر" زیر طبع ہے۔

کہانیاں لکھنا اور پڑھنا ان کا بچپن کا شوق تھا جو شادی کے بعد پورا ہوا۔ ان کے گھر میں پردے کا رواج تھا جہاں لڑکیوں کے باہر نکلنے اور ناول' افسانے وغیرہ پڑھنے پر بھی پابندی تھی کہانی لکھنا تو بہت بڑی بات تھی باہر کی دنیا کے بارے میں سوچنا بھی گناہ تھا۔ ان کا یہ شوق شادی کے بعد پورا ہوا کیونکہ ان کے شوہر نے پردہ نہیں کرایا اور انہیں باہر کی دنیا دیکھنے کے مواقع ملے۔ اس کے بعد سے آج تک متعدد کہانیاں لکھ چکی ہیں اور لکھ رہی ہیں۔

نزہت کہتی ہیں بیسویں صدی میں ادب کی تاریخ میں زندہ رہنے والے چند جگمگاتے نام یہ ہیں۔ کرشن چندر' عصمت چغتائی' جوگندرپال' منشی پریم چند' قاضی عبدالستار' سعادت حسن منٹو' جیلانی بانو' ممتاز مفتی اور احمد ندیم قاسمی۔

ان کا کہنا ہے فکشن ایک آرٹ ہے۔ جدیدیت میں ستر سے اسی کی دہائی تک کچھ اس طرح مبہم لکھا گیا کہ کہانی کا وجود خطرے میں پڑ گیا لیکن آج کل جو جدیدیت کے حوالے سے لکھا جا رہا ہے نئے نئے موضوعات اس میں شامل ہو رہے ہیں چنانچہ اس سے اس کا حسن نکھرا ہے مسخ نہیں ہوا۔

نزہت کے خیال میں موجودہ دور میں ناول کم لکھنے کی وجہ قارئین کی عدم دلچسپی ہے الیکٹرونک میڈیا اور ڈش کا عمل دخل بڑھ رہا ہے۔ ناول کی جگہ ٹی وی نے لے لی ہے زیادہ تر لوگ ٹی وی دیکھتے ہیں اس سے کم وقت میں ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ جبکہ ناول لکھنے اور پڑھنے کے لئے وقت اور یکسوئی چاہئے۔

نزہت کہتی ہیں ادیب تو ہر دور میں ذہنی معاشی اور نفسیاتی بحران میں رہا ہے۔ ہندوستان پاکستان میں ہی نہیں ہر جگہ کے ادیبوں کو ذہنی معاشی پریشانیاں رہی ہیں۔ ہمارے ہاں تو اب بھی مردہ پرستی کا دور باقی ہے۔ ادیب کو تو اس کی موت کے بعد ہی اعزاز اور شہرت ملتی ہے۔ چند دولت مند ادیبوں کو چھوڑ کر۔

سوال نمبر چھ کے جواب میں ان کا کہنا ہے اچھا ادب وہ ہے جو دل کو چھو لے اور انسانیت کا درس دے یہی اس کے معیار کی پہچان ہے۔

شاعری زیادہ اور نثر کم لکھے جانے کی وجہ ان کے نزدیک لوگوں کے پاس وقت کی کمی ہے۔ نثر لکھنے اور پڑھنے کے لئے ایک جگہ جم کر سکون سے بیٹھنا ضروری ہوتا ہے۔ ناول کم لکھنے کی ایک وجہ

یہ بھی ہے۔
اردو میں انگریزی کی شمولیت کے حوالے سے کہتی ہیں یہ غلط ہے کہ انگریزی لفظ اردو میں نہیں شامل ہو رہے ہیں۔ اب تو انگریزی کے بہت سے الفاظ اردو میں رائج ہو چکے ہیں۔ اردو کا حسن ہی ملی جلی زبان سے ہی ہے۔
آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا تنقید برائے نام رہ جانے کی وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ سچائی سے ڈرتے ہیں اور سچائی سے تنقید کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ جس کی کتاب پر تنقید کرنی ہے وہ کسی ایسے شخص کی ہے جس سے انہیں بہت سارے فائدے پہنچ سکتے ہیں تو وہ تنقید کر کے اپنی ترقی کیوں رکوائیں گے۔ دوسرے نظریاتی اختلافات بھی بہت ہیں اور جہاں تک علاقائی زبان کا تعلق ہے تو وہ لوگ زیادہ تر شہروں کی طرف بھاگ رہے ہیں اس لئے ان کی زبان ان کا کلچر بھی کافی بدل رہا ہے۔ اگر کسی علاقے کی کوئی فلم یا ٹی وی ڈرامہ ٹی وی پر دکھایا جاتا ہے تو چند لوگوں کے علاوہ باقیوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ اس علاقائی زبان کو ہر کوئی نہیں جانتا۔ پھر بھی آج کل ہمارے یہاں علاقائی زبانوں پر کام ہو رہا ہے فلمیں بھی بن رہی ہیں اور علاقائی پروگرام کے لئے ٹی وی چینل میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو اردو میڈیم میں نہیں پڑھاتے وہ اردو کے بارے میں کیا سوچیں؟

ANWER NUZHAT
H-1 MURADI ROAD, BATLA HOUSE,
NEWDELHI 25 INDIA

اے محبت زندہ باد —
ہو سکے تو آدمی سے محبت کیجیے کیوں کہ آج کا آدمی محبت کا متلاشی ہو کر رہ گیا ہے
ایوب جوہر ڈھاکہ

ایوب جوہر
ڈھاکا۔

ماہنامہ "شاعر" بمبئی میں محترم ایوب جوہر کا افسانہ پڑھا تو ان سے گفتگو کرنے کی خواہش شدید تر ہو گئی۔ "شاعر" مجھے اس لیے پسند ہے کہ یہ ایک مکمل ادبی پرچہ ہے اور اس لیے اور بھی پسند ہے کہ اس میں ادیبوں اور شعراء کے پتے شائع ہوتے ہیں جن سے رابطہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

یہ سطور لکھتے ہوئے مجھے اپنی نو عمری کا ایک شوق یاد آتا ہے۔ میں 'جسے ۴ روپے ماہانہ خرچ ملتا تھا ایک آنہ لائبریری سے روزانہ کتابیں منگواتی تھی۔ رہنمائی کرنے والا کوئی تھا نہیں خود میری علمی استعداد زیادہ نہ تھی۔ چوتھی جماعت کی تعلیم بھی پوری نہ ہوئی تھی کیوں کہ والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ چناں چہ اس ماہانہ خرچ سے اپنے مطالعہ کا شوق پورا کرتی تھی۔ دکان دار خود ایم اسلم' رئیس احمد جعفری' رشید اختر ندوی' عبدالحلیم شرر' عادل رشید اور صادق سردھنوی کی کتابیں بھیج دیتا تھا کہ وہی لائبریری میں چلتی ہوں گی۔ کچی عمر کی سہیلیوں سے ان کے بھائی اور ابا کے رسائل مانگ لیتی تھی اور ادیبوں کی تصویریں دیکھ دیکھ کر حسرت سے سوچا کرتی تھی

کاش میں بھی اتنی بڑی ادیب بنوں اور ان سب سے گفتگو کر سکوں۔ اللہ تعالیٰ شکر خورے کو شکر دے ہی دیتا ہے سو اس نے میری بھی یہ دعا سن لی اور مجھے موقع دیا کہ میں بھی علم کے سمندر میں غوطہ لگاؤں اور جن جوہر شناس ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات ہو ان سے گفتگو کروں۔

چناں چہ میں نے ایوب جوہر سے نصف ملاقات کی۔ انہوں نے اپنا افسانوی مجموعہ "سادہ کاغذ" عنایت کیا۔ میں نے ان کے افسانے پڑھے کہ افسانہ نگاری میرا پہلا میدان ہے جہاں سے میں نے لکھنے کی ابتدا کی تھی۔ ایوب جوہر کے افسانوں کی زبان اور لہجے کی کاٹ، شیرینی اور شگفتگی تو کچھ انہیں پڑھ کر ہی محسوس کی جا سکتی ہے اور اس وقت اتنے صفحات نہیں کہ میں ان کا کوئی افسانہ شامل کروں لیکن آپ کو ایوب جوہر کی گفتگو میں شریک کر سکتی ہوں۔ ایوب بہت سچ بولتے ہیں۔ کھرا بولتے ہیں اور جو سچ کو پسند نہیں کرتا انہیں ان کی زبان نشتر کا سا زخم دیتی ہے۔ اور سچ بولنا اگر برا ہے تو ایوب جوہر برے آدمی ہیں۔ مگر اس برے آدمی سے کبھی نہ مل کر بھی مجھے اس سے پیار ہے۔ اپنائیت کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔

میں نے سوالنامہ ان کے سامنے رکھا۔ اور کہا "بھائی ایوب میں درمیان میں ٹوکوں گی نہیں۔ آپ سوالات پر نظر ڈالیے اور بولتے جائیے۔ میں آپ کی گفتگو اپنے قلم سے ریکارڈ کر رہی ہو۔" "ہاں تو آپ اپنے بارے میں کہہ رہے تھے کہ آپ کا نام محمد ایوب صدیقی ہے اور قلمی نام ایوب جوہر۔ تاریخ پیدائش ستمبر ۱۹۳۶ء ہے۔ مقام موضع ہریر گنج تھانہ ناصری گنج ضلع آگرہ شاہ آباد اور تعلیم میٹرک تک ڈھاکہ میں حاصل کی۔ پھر...؟"

"پھر میں نے واپڈا میں آرٹسٹ کی حیثیت سے ملازمت کی اور ۱۹۹۱ء سے (سات سال پہلے) ریٹائرمنٹ لے چکا ہوں۔ کئی بیماریوں کا شکار ہوں میری بیماریوں میں زیادہ تر دوستوں کی کرم فرمائیاں شامل ہیں۔ قیام بنگلہ دیش کے بعد ڈھاکا سے سب سے پہلا اردو جریدہ رفتار شائع کیا۔ پھر سہ ماہی "محاذ، انکشاف اور اخبار بنگلہ دیش" (ماہنامہ) شائع کرتا رہا۔ اردو کے سلسلہ میں یہ سب کام میرے "دوستوں" کو نہیں بھایا اور گذشتہ گیارہ سال پہلے اس خاکسار کے خلاف پوری اردو دنیا میں وہ غیر ادبی مظاہرہ کیا گیا جس پر کراچی والے شرما کر رہ گئے اور انہوں باقاعدہ ایک ریزولیوشن لے کر اس غیر ادبی ہنگامے کو روکنے کی اپیل کی۔ گذشتہ گیارہ سالہ خاموشی کے بعد اب نئے سرے سے "انکشاف" کی اشاعت کے لیے کوشاں ہوں۔ مگر میرے "دوستوں" کا منہ بنا ہوا ہے۔ چھ بچیوں اور دو بچوں کا باپ ہوں۔ چار بچیوں کو رخصت کر چکا ہوں دو بچیاں اور صاحبزادے ابھی زیر تعلیم ہیں۔ بڑے صاحبزادے جو اپنی تین بہنوں کے بعد ہیں ملیشیا میں بر سر ملازمت ہیں ان کی عنایت یا سعادت مندی پر ٹکا ہوا ہوں۔

بیسویں صدی ختم ہو رہی ہے ہر صدی اپنی اپنی پہچان رکھتی ہے۔ گلابوں کا کام کھلنا ہے یہ

کھلتے رہیں گے البتہ ان کی خوشبو کتنی دور تک پہنچتی ہے اور دل کی کتنی گہرائی تک اتر سکتی ہے، یہ اپنی اپنی سوچ کی ان بلندیوں اور پستیوں پر منحصر ہے۔ لہٰذا چند ادیبوں کے نام گنوانا، دراصل قبل از وقت کی بات ہے اور معاف کیجئے میں نہ تو علم آگہی سے واقفیت رکھتا ہوں اور نہ ہی نجوم سے کوئی رشتہ داری ہے۔

فکشن ایک لطیف نہیں بلکہ میرے خیال میں ایک کثیف آرٹ ہے اور جب تک ایک فکشن لکھنے والا اس کے کشٹ کے زیر اثر نہیں جاتا وہ علامتی کیا غیر علامتی افسانہ بھی لکھ نہیں پاتا۔ مگر آپ کے سوال نے لفظ جدیدیت کہا ہے میں نے علامتی افسانے کا ذکر کیا ہے سو اس لیے کہ علامتی افسانہ جدیدیت کی پہلی سیڑھی ہے، جدیدیت نے فکشن کے حسن کو صرف سنوارا ہے، مجروح کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن آدمی کا جب ذہن مجروح ہو تو اسے ہر چیز مجروح اور توڑ پھوڑ کی شکل میں نظر آتی ہے۔

آپ کا یہ کہنا درست ہے کہ موجودہ صدی میں اردو ادب میں ناول بہت کم لکھے جا رہے ہیں اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ خود ہمارے ناول نگاروں کے پاس اتنا وقت نہیں اور نہ ہی قاری کے پاس اتنا وقت ہے۔ الیکٹرونک میڈیا نے تخلیق کار اور قاری دونوں کو متاثر کیا ہے۔ اردو میں لکھے جانے والے فکشن زیادہ سے زیادہ ایک ہزار کی تعداد میں چھپتے ہیں اس طرح ادبی ناولوں کا بھی حال ہے۔ سرکاری طور پر ادب تخلیق کرنے والوں کی کوئی سرپرتی نہیں ہے بھارت میں کچھ اردو اکیڈمیاں ادیبوں کی کتابوں کی اشاعت میں تھوڑی سی مالی امداد کرتی ہیں مگر وہ بھی ان ادیبوں کے سلسلے میں ان کی مہربانیاں حاضر رہتی ہیں جن کا کچھ نام وام ہو گیا ہوتا ہے۔ باقیوں کا معاملہ یوں ہے کہ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔۔ ایسے میں آدمی ادب کیوں لکھے؟ کس کے لیے لکھے؟ آپ کو یہ جان کر حیرت نہیں ہوگی کہ مجھ جیسے فقیر سے بھی کوئی چیز شائع ہو جانے کے بعد پرچے کے کچھ مدیر حضرات اسٹامپ کے پیسے مانگتے ہیں یا پھر سالانہ خریدار بنا کر میری تخلیقات چھاپنے کی رشوت لینا چاہتے ہیں۔ تو محترمہ جو لوگ ادب لکھ رہے ہیں وہ میرے جیسے پاگل لوگ ہی ہیں جو اس امید پر لکھتے ہیں کہ شاید کہیں نہ کہیں پیسوں کے بغیر ہی ان کی تخلیق چھپ جائے۔ ہاں کمرشل ناول لکھئے تو آپ بھی خوش آپ کے پبلشر بھی خوش۔

آپ کے سوال نمبر ۵ کے اندر ہی جواب پوشیدہ ہے۔ جب آدمی کا پیٹ خالی ہو تو ذہن و دل و دماغ کیا، ہاتھ پاؤں بھی چلنے سے بغاوت پر تل جاتے ہیں۔ ایسے ادیبوں کی رہنمائی صرف ان کی مالی حالت بہتر بنانے پر ہی موقوف ہے مگر ہم اردو والوں کی ریت ہی نرالی ہے ہم تو اس کی تخلیق پر واہ واہ کرنے کا بھی ظرف نہیں رکھتے۔

سوال نمبر ۶ کے سلسلے میں عرض کروں گا کہ شاعری ہو یا نثر۔۔ اس کے معیار کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی ہر سطر چیخ چیخ کر خود اعلان کرے کہ میں ادب ہوں، میں قوالی نہیں

ہوں۔ میں کسی فلمی گیت کا روپ نہیں ہوں۔ اسی طرح نثر کے ہر جملے پر خود کہے کہ میں ابن صفی یا محی الدین نواب کے قلم سے نکلا ہوا وہ لفظی ہتھیار نہیں ہوں جس پر قاری خود بخود جان بحق ہو جاتا ہے۔ میں نے شعوری طور پر دو نثر نگاروں کے نام اس لئے لیے کہ یہ حضرات کمرشل ادب کے ذریعہ لاکھوں اور کروڑوں میں کھیل رہے ہیں۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ کیوں نہیں پھر کمرشل ادب ہی لکھا جائے؟ مگر قوال 'قوال ہیں' کمرشل لکھنے والوں کی پہچان خود ان کی پہچان ہے مگر ادیب اور شاعروں کی پہچان وہ ہے جو کمرشل لکھنے والوں کے حصے میں کبھی آیا ہے اور نہ آئے گا۔

محترمہ! ساتویں سوال میں مجھے آپ نے پھنسا دیا ہے اب سچ کہوں یا جھوٹ؟ پاکستان اور ہندوستان میں شاعری کم نہیں ہو رہی ہے البتہ ہر شاعر پرچے کا سالانہ خریدار نہیں بن سکتا اور نہ بینک ڈرافٹ بھیج کر کسی اردو پرچے کی مدد کر سکتا ہے۔ رہا معاملہ نثر نگاری کا تو ملک سے جو لوگ باہر ہیں وہ گنگنا کر دو مصرعہ تو جوڑ لیتے ہیں مگر نثر لکھنے کے لیے وقت چاہیے سو یہ گرانمایہ سرمایہ ان کے پاس بہت کم ہے۔

سوال نمبر۸ بھی مجھ جیسے ان پڑھ قسم کے آدمی کے لیے بہت بھاری ہے یہ تو آپ کو لیکچرار' پروفیسر یا اسی قسم کے پروفیسرز سے پوچھنا چاہئے' مجھ جیسا بے بضاعت آدمی اگر کچھ کہے گا تو یہ عام سی بات ہوگی یا پھر جذباتی بن جائے گی۔ ہندوستان سے ہونے والے ڈش پر پروگرام میں آپ یقیناً" دیکھتی ہوں گی مجھے تو یہ بھارتی پروگرام ہالی وڈ کا کوئی پروگرام لگتا ہے۔ مجھے تو ان میں اردو کے ٹانگ ہاتھ توڑتے دکھائی دیتے ہیں اور انگریزی ایسی لگتی ہے جیسے امریکہ اور لندن گھ جوڑ کی طرح یہ زبان بھی بھارت دوڑ پڑی ہو اور یہاں آکر بالکل وہاں کی تہذیب کی طرح ننگی بچی ہو گئی ہو۔ رہا معاملہ کہ انگریزی کے مقابلے میں فارسی اور عربی زبانیں نئے علوم سے محروم زبانیں ہیں یہ قطعی صحیح کہا ہے آپ نے' اس لیے کہ ہمارے دیش کے ملا حضرات دھڑا دھڑ فارسی اور عربی کتابوں کو بنگلہ میں ترجمہ کر رہے ہیں اور ان میں اردو بھی شامل ہے۔

اپنی زندگی کے چند نہیں بلکہ اس سے زیادہ کہیے کہ واقعات سناتے سناتے رات ختم ہو جائے اور سننے والا سنتے سنتے بور ہو کر سو جائے۔ بہرحال آج سے پچاس سال پہلے کا واقعہ ہے کہ میں نواب پور سے تقریباً" سات میل کا راستہ پوستوگولہ جا رہا تھا۔ میں پیدل ہی جا رہا تھا کیوں کہ جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا اچانک خیال آیا بلکہ دل ہی دل میں' میں نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ اے اللہ اگر میرے پاس ابھی ایک روپیہ ہوتا تو میں ناشتہ بھی کرتا اور سگریٹ بھی خریدتا۔ میری یہ سوچ ختم ہوئی تھی اور میری نظر اپنے پاؤں کی جانب پڑی تو دیکھتا ہوں کہ ایک روپے کا کڑکڑاتا نوٹ میرے پاؤں کے سامنے پڑا ہے۔ میں اپنے آس پاس دیکھنے لگتا ہوں بالکل خالی۔ میں نے وہ کڑکڑیا نوٹ اٹھا لیا مگر جب سے آج تک میں یہی سوچتا ہوں کہ اس وقت صرف ایک

روپیہ کیوں مانگا تھا' لاکھوں مانگتا' کروڑوں مانگتا! (ایوب بھائی مقدر میں ایک ہی لکھا تھا۔ ہائے مقدر' وائے مقدر)

اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تنقید نام کی کوئی چیز ہی موجود نہیں ہے۔ گذشتہ گیارہ سال پہلے میں نے کچھ لوگوں پر تنقید کی تھی اس کی سزا اب تک بھگت رہا ہوں۔ لہٰذا اب صرف واہ واہ ہے۔ جب کہ تنقید ادب کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ مریض کے لیے ایک ڈاکٹر۔ رہی بات عملی اور نظریاتی ترقی کی تو محترمہ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ نظریاتی یا عملی ترقی صرف آپ کے امریکہ میں نہیں ہو رہی ہے بلکہ عنقریب ڈھاکا بھی نیویارک بننے جا رہا ہے۔ اونچی اور بلند ترین عمارتیں اب ہماری گلیوں میں بھی اٹھنے لگی ہیں لہٰذا اردو شاعری میں جو بام کی ضرورت تھی وہ ختم ہو گئی پھر نظریاتی یا عملی ترقیوں کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کو شکایت ہے کہ ان دنوں کسی زبان سے کسی زبان میں ترجمے کا کام بھی نہیں ہو رہا ہے۔ یہ شکایت بھی درست نہیں اس لیے کہ ترجموں سے اونچی بلند ترین عمارتیں تو نہیں کھڑی ہو جائیں گی؟ ایک واقعہ بھی سن لیجئے۔ ایک تنقیدی نشست میں جس کی صدارت میں کر رہا تھا کہ ایک کہنہ مشق افسانہ نگار مرحوم واحد نظامی اپنا افسانہ سنا رہے تھے۔ افسانہ ختم ہوا تو اس پر شاہد کامرانی (افسانہ نگار و صحافی) نے تنقید شروع کی (میری نظر میں شاہد کامرانی کی تنقید جائز تھی) بہرحال مرحوم واحد نظامی قطعی غصے میں آگئے اور اپنی کہانی کا مسودہ چاک کرتے ہوئے یہ کہہ کر محفل سے رخصت ہوئے کہ تمام جاہل کے جاہل ہیں۔ میں "ساقی" میں چھپنے والا افسانہ نگار ہوں اور یہ جاہل لوگ میرے افسانے پر تنقید کرنے چلے ہیں۔"

لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اسی دن سے تنقید مر گئی ہے۔

MR. AYOOB JOHAR
26 LALCHAND MUQEEM LANE,
RUTH KHOLA 26, 4TH FLOOR DHACA 1100
BANGLADASH

خزاں کی شکایت تو کرتی ہے دنیا
مگر ہم بہاروں کے مارے ہوئے ہیں
بانو ارشد لندن
۹ اگست ۹۶ء

بانو ارشد
لندن

۱۹۹۵ء میں شائع ہونے والے بانو کے افسانوں کے مجموعے بعنوان "بانو کے افسانے" کی چند کہانیاں میں نے پڑھیں۔ اس کے فلیپ پر ادیبوں کے تاثرات بھی پڑھے اور افسانوں سے پہلے بانو کی اپنی لکھی روداد، حمایت علی شاعر کی رائے اور قیصر تمکین کا مضمون بھی پڑھا۔ بانو کے افسانوں کے بارے میں اتنا ہی کہنا چاہوں گی کہ بانو جو ایک لمبی مدت سے برطانیہ میں آباد ہے اگر چاہتی تو اپنی کہانیوں کی بنیاد مغربی جدیدیت کی ریت پر بھی رکھ سکتی تھی اور اپنی انفرادیت کا محل کھڑا کرنے کی سعی لاحاصل میں مصروف رہ سکتی تھی مگر بانو نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اس نے وہی لکھا جو اس کی ذات اس سے لکھوا رہی تھی، اور اسی اسلوب میں لکھا جس کی جڑیں اس کے ذہن و روح میں پیوست ہیں۔ جیسے کہ افسانہ "انار کلی" جس میں زرینہ اپنی ازدواجی زندگی اور اپنی ذات کی بقا کے لئے ایک طویل جدوجہد اور کھینچ تان میں زندگی گزار دیتی ہے۔ زرینہ ایسی عورتیں صرف ہند و پاک میں ہی نہیں ہیں وہ برطانیہ میں بھی بستی ہیں، پورے یورپ میں موجود ہیں اور امریکہ میں بھی چلتی پھرتی نظر آتی ہیں اس کے باوجود کہ وہ خود کفیل

ہیں۔ اپنی روزی آپ کمالیتی ہیں لیکن وہ جو صدیوں کا ایک معاشرتی دباؤ ہے اس سے آج بھی ہماری عورت کا ذہن آزاد نہیں۔ اپنے مجازی خدا کا مزاج بھی سہہ رہی ہے اور کولہو کے بیل کی طرح جتی ہوئی ہے۔ اس شکنجے سے آزاد نہیں ہو پاتی کہ لوگ کیا کہیں گے؟" اور پھر ایسی خواتین میں وہ بھی ہیں جو قلم کا منصب سنبھالے ہوئے ہیں تو وہ بلاشبہ زیادہ داد و تحسین کی مستحق ہیں۔ جیسا کہ "بانو کے افسانے" میں قیصر تمکین لکھتے ہیں۔

"جو خواتین یہاں خدمت ادب میں مصروف ہیں وہ تقریباً" سبھی ملازمتیں کرتی ہیں۔ گھر آ کر خانہ داری بھی سنبھالتی ہیں اور وقت نکال کر لکھتی پڑھتی بھی ہیں۔ ان معنوں میں ان کا درجہ ان کی لگن اور ان کی ادب دوستی انگلستان اور یورپ کے لکھنے والوں کے مقابلے ہی میں نہیں بلکہ برصغیر ہند و پاک کی لکھنے والیوں سے بھی حد رجہ بلند ہے۔ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر جیسی عظیم اور ماہر ادیب خواتین بھی کبھی اتنے گوناگوں مسائل سے دوچار نہیں رہیں جو یہاں کی لکھنے والیوں کو جھیلنا ہوتے ہیں۔ عصمت پر جب تخلیق فن کے دورے پڑتے تھے تو ان کے گھر میں کھانا پکانے کے لئے ملازم' اخراجات کے لئے شوہر کی آمدنی اور دوسرے امور کی دیکھ بھال کے لئے ان کے دوست اقارب رہتے تھے۔ قرۃ العین تو شادی بیاہ کے جھگڑوں سے ہی بے نیاز رہیں اور اب بھی ہمہ وقت لکھنے پڑھنے ہی میں مصروف رہتی ہیں۔ اب اگر اس یکسوئی کے بعد ان کے فن میں کمال نہ ہو تو تعجب کی بات ہو گی۔"

میں نے بانو کو سوالنامہ بھیجا۔ جواب میں انہوں نے جو لکھا خود ان کے قلم سے ملاحظہ ہو۔

اہم نوٹ:۔ "توقع ہم سے بس اتنی ہی رکھیں۔"

عزیزہ سلطانہ مہر۔ تسلیمات۔ آپ کا ۲۶ فروری کا تحریر شدہ خط معہ سوالنامے کے موصول ہوا۔ کوشش کروں گی کہ آپ کے تمام سوالوں کا جواب دے سکوں۔ عطیہ خان کو آپ کا خط نہیں ملا۔ صفیہ صدیقی کو آپ کا پیغام دے دیا ہے ان کو خط معہ سوالنامے کے مل چکا ہے۔ میرا تعارف میری کتاب "بانو کے افسانے" میں کافی تفصیلی ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو کیا بنیں اور پھر کوئی ایسی بات بھی قابل نمائش نہیں جس کو اجاگر کیا جائے۔ نہ ہی شوق اور نہ ہی شہرت کی بھوک ہے نہلے پہ دہلا یہ کہ تساہلی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایک چھوٹا سنسار ہے۔ بس یہی میری جنت ہے۔ یعنی تینوں بچے ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں بڑے چارٹرڈ اکاؤ سٹ ہیں۔ ان کی بیوی وکیل ہیں بیٹی میری B.B.C میں جرنلسٹ ہے چھوٹا بیٹا لاء کالج میں لیکچرر ہے۔ اور میں ایک ہائی اسکول میں ٹیچر ہوں۔ یوں یہ میری چھوٹی سی دنیا ہے۔ لندن میں 1965ء میں آگئی تھی اور جغرافیہ کی ہائی اسکول میں ٹیچر رہی پھر 1974ء نائیجیریا چلی گئی۔ وہاں کالج ہی سینیئر لیکچرار رہی۔ سات سال زندگی کے وہاں آرام سے گذارے۔ پھر آئی انگلستان۔ یہاں ایک ڈپلوما کرلیا اس کے بعد پھر یہی نہر کی پن چکی۔ اسکول میں ملازمت کرلی اب یہاں ہائی اسکول میں

گھر کے قریب پڑھاتی ہوں۔ رہی ادب کے تخلیق کی بات تو وہ ایک مشغلہ ہے۔ شائع شدہ افسانوں کی دو کتابیں ترتیب دی ہیں کتاب 1995ء میں "بانو کے افسانے" کے نام سے شائع ہو چکی ہے دوسری بھی "بانو کی کہانیاں" بہت جلد منظر عام پر آنے والی ہے شاعری بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ بس موڈ اور فرصت پر ہے۔ کافی غزلیں شائع ہو چکی مجموعہ کلام چھپوانے کا خیال اس لئے نہیں آیا کہ اتنا کلام ہی نہیں۔ نظامت بھی اکثر بیشتر لوگوں کی فرمائش پر کرلیتی ہوں اور مشاعرہ میں کبھی ترنم سے کبھی تحت میں کلام سنا دیتی ہوں۔ تو یہ تھی ہماری چھوٹی سی کہانی ساری زندگی تو پڑھنے اور پڑھانے ہی میں گذر گئی جو باقی وقت بچا اسے اپنے بچوں کی پرورش پر لگا دیا۔

میری پیدائش بھوپال (ہندوستان) کی ہے۔ ارشد تھانوی کی بیٹی ہوں۔ شوکت تھانوی کی حقیقی بھانجی اور عادل رشید کی بیوی کی چھوٹی بہن۔ محمد احمد سبزواری کی حقیقی ماموں زاد بہن ہوں۔ سلمان ارشد۔ ادیب اور مدیر تھے وہ میرے سب سے بڑے بھائی تھے... یہ رہا میرا شجرہ۔

والدہ میری ایک رسالہ "بانو" بھوپال سے نکالا کرتی تھیں اور میرا نام "بانو" بھی اس رسالہ کی وجہ سے بانو رکھا گیا وہ بھی ان کی تخلیق تھا میں بھی ان کی تخلیق۔ میری والدہ کا نام خاتون ارشد تھا۔ وہ بھی شاعری کرتی تھیں۔

شاعرہ کے علاوہ میں نثر نگار بھی ہوں۔ افسانے ہندو پاک 'یورپ' امریکہ کے مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً "راوی' اردو ادب' صدا' جنگ' نیشن' آواز' شفق' وغیرہ پاکستان لنک امریکہ میں بھی شائع ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے افکار' دنیائے ادب' ادب لطیف' منشور' سفیر اردو' سخن ور' سہیل یہ پاکستان کے رسائل اور اخبارات ہیں ان میں بھی اکثر میری غزل یا افسانہ کبھی نہ کبھی شائع ہو جاتا ہے۔

مجھے مطالعہ کا بے حد شوق ہے۔ موسیقی' چائے اور مطالعہ میرے فالتو اوقات کے مشاغل ہیں۔ مجھے تنقید نگاری' مزاح نگاری' انشائیے سب سے دلچسپی ہے اور اس پر طبع آزمائی بھی کی ہے۔ سیاسی شعور اور آگہی صرف معلومات تک محدود ہے لیکن سیاست میں کبھی ذاتی طور پر عملی دلچسپی نہیں لی ہے۔ اور تمام تنظیموں سے ہمیشہ علیحدہ رہی ہوں۔ سیاحت کا شوق تھا اب بھی ہے لیکن جیب اجازت نہیں دیتی۔ بے شمار ملک دیکھے ہیں جس کے تجربات میری سوانح عمری (اگر لکھی تو) میں آئینگے اس لئے زندگی کے دلچسپ اور اہم واقعات لکھنے سے گریز کر رہی ہوں۔

رہا اردو کے باقی رہنے کا سوال! فی الحال تو کوئی ایسی صورت نظر نہیں آتی سوائے لائبریری کی زینت بننے کے۔ ہجرت اور الیکٹرانک میڈیا' اس کی ترقی میں حائل ہو گئے ہیں۔ انگریزی کی بین الاقوامی ترویج اور ترقی تمام زبانوں پر حاوی ہو گئی ہے۔ ہمارے اپنے بچے لکھ پڑھ نہیں

سکتے البتہ روانی سے سمجھ لیتے ہیں اور بول لیتے ہیں بیرونی ممالک میں اس کی چونکہ ضرورت نہیں یہ تو ہمارا ورثہ ہے لیکن اس کی حفاظت بچوں کے بس کی بات نہیں۔ اس میں اس نسل کا قصور بھی نہیں۔ غلامی اور ہجرت کی بناء پر ہماری زبانیں متاثر ہوتی ہیں ان کی بقا کے لئے مجھے نہیں معلوم کہ کیا ترکیب نکالی جا سکتی ہے۔ میرے پاس تو کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہے۔ لہٰذا جب تک ہماری نسل ہے اردو سانس لے رہی ہے۔

مشاعرے اردو کو فی الحال زندہ کیے ہوئے ہیں جیسے فلموں نے زبان کو زندہ رکھا ہے۔ اسی طرح مشاعرے اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ نثر چونکہ تنہائی میں پڑھ کر لطف دیتی ہے یعنی افسانہ سننے سے زیادہ پڑھنے میں مزہ آتا ہے کیونکہ وہ انہماک اور توجہ چاہتا ہے۔

جی ہاں ادبی نشست بھی ضروری ہے اگر نثر مختصر اور دلچسپ ہو اور بھرپور اس کا جائزہ لیا جائے۔ ذاتی کدورت تضحیک، تنقیص بے جا قصیدہ خوانی اور تعریف سے محفوظ ہو۔ چونکہ ناقدانہ بحث نہیں ہوتی بلکہ ایک دوسرے پر طنزیہ جملے اور کیچڑ اچھالی جاتی ہے یا پھر جانبدارانہ گفتگو ہوتی ہے یعنی ذاتی تعلقات کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے ادب میں ملاوٹ آجاتی ہے۔ تنقید بھی ہو رہی ہے بس اگر اس میں سے تجارتی مفاد کو نکال دیا جائے اور جیسا کہ میں نے کہا کہ ذاتی رابطہ کو علیحدہ کر کے ادب پر بات ہو اور ادیب یا شاعر کی ذاتی زندگی کے عکس سے بالا تر ہو کر اس پر لکھا جائے تو یقیناً" تنقید منصفانہ ہو گی۔ ورنہ ادب پنپ نہیں سکتا ہے۔

میری تحریر میں آپ کو جھول نظر آئے تو ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیں اس کا بھی تو پیٹ بھرنا ہو گا امید ہے کہ آپ کی خفگی دور ہو چکی ہو گی۔ البتہ اس خط سے آپ کو مایوسی ضرور ہو گی میں خط یہ کہہ کر ختم کرتی ہوں۔

ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنر میں یکتا ہیں

بانو افسانہ نگاری کے ساتھ شاعری بھی کرتی ہیں۔ (منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے) چلتے چلتے بانو کی ایک غزل سے دو اشعار بھی ملاحظہ کر لیں۔

زندگانی نے ہمیں ایسا تو تڑپایا نہ تھا
حادثوں میں رہ کے بھی یہ دل تو گھبرایا نہ تھا
جھلملاتی چاندنی تھی، ہم سخن تھے آبشار
غم کا آنچل زیست نے چہرے سے سرکایا نہ تھا

BANO ARSHD

CAMROSE EVE EDGWARE, MIDDLESEX,HAB 6EG, U.K.

کون ہے تو اے بشریٰ بی بی
انگ بھبھوت رمائی تو نے
کس موہن کی خاطر ارے پیئے؟
چتیا میں سیج سجائی تو نے!

احمد فراز
۲۵ اکتوبر ۱۹۹۹ء
وطن دوست

بشریٰ رحمٰن

لاہور

یاد رکھا جانے والا اور بڑا افسانہ وہی ہوتا ہے جس میں اپنے عہد کے دکھ درد کا ذکر بھی ہو۔ جس میں احساس کی شدت ہو اور جس میں ادبی ہنرمندی بھی پائی جاتی ہو۔

اگر افسانے کی یہ تعریف کلیہ نہ بھی ہو پھر بھی ایک اچھے افسانے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ بشریٰ رحمٰن کے افسانوں میں احساس کی شدت کے ساتھ اپنے معاشرے کے دکھ درد کی تفسیر بھی ہوتی ہے۔ بشریٰ رحمٰن کے افسانوں میں رومانویت کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی بھی اپنے بھرپور وجود کے ساتھ چلتی ہے۔ بشریٰ کے احساس کی شدت سے اس کی کہانیاں معاشرے کا آئینہ بن جاتی ہیں اور کردار جامد نہیں رہتے کیونکہ وہ خارجی کردار نہیں ہوتے ہم میں سے اور آپ میں سے ہی منتخب کیے جاتے ہیں۔

بشریٰ رحمٰن نے اپنا پہلا افسانہ 12 سال کی عمر میں لکھا۔ اس ڈگر پر قدم رکھنے کے بعد اس نے مڑ کر نہیں دیکھا اور آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ چنانچہ اب تک وہ 5 ناول --- چارہ گر' پیاسی' لگن' لازوال اور خوبصورت تصنیف کر چکی ہے۔ بشریٰ نے ناولٹ بھی لکھے ہیں --- اللہ میاں جی'

لالہ صحرائی' بہشت' بت شکن' ایک آوارہ کی خاطر' شرمیلی اور چاند سے نہ کھیلو۔
ان کے تین افسانوی مجموعے ہیں--- قلم کہانیاں' افسانہ آدمی ہے اور جھروکے میں چاند۔ بشریٰ نے سفرنامے بھی تحریر کئے ہیں--- براہ راست' ٹک ٹک دیدم ٹوکیو' دور دیس' رپورتاژ' باؤلی بھکارن' اور حج کا سفرنامہ۔ ان کے کالموں کا مجموعہ "چار دیواری اور چاندنی" دو حصوں میں شائع ہوئے ہیں اور اب شاعری کا مجموعہ "صندل میں سانسیں چلتی ہیں" منظر عام پر آیا ہے۔ گویا بشریٰ نے ہر میدان میں بھرپور طریقے سے طبع آزمائی کی ہے۔
بشریٰ دوستوں کی دوست اور دشمن کی بھی دوست ہے۔ دوستوں کے لئے اس کی چاہتوں کی انتہا نہیں رہتی۔ ایک سلیقہ مند بیوی اور ایک ذمہ دار ماں بھی ہے۔ میں بشریٰ سے کہتی ہوں اپنا تعارف "گفتنی" کے قارئین سے آپ کراؤ۔ اور بشریٰ میری درخواست کو بھی میرا حکم مانتے ہوئے کہتی ہے۔
شادی سے پہلے میں بشریٰ رشید کے نام سے لکھتی تھی۔ شادی کے بعد بشریٰ رحمٰن کے نام سے لکھ رہی ہوں۔ 29/ اگست 1945ء کو بہاول پور میں پیدا ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی سے جرنلزم میں ایم اے کیا اور بیچلر آف ایجوکیشن کی ڈگری بھی لی۔ ملازمت کبھی نہیں کی۔ 12 سال کی عمر میں پہلا افسانہ لکھا۔ تب سے اب تک لکھ رہی ہوں۔ شادی کے بعد مستقل طور پر لاہور میں رہائش اختیار کی۔ 1983ء میں مجھے صوبائی اسمبلی پنجاب کی صوبائی کونسل کا رکن منتخب کیا گیا اور 1985ء کے انتخابات میں مجھے باقاعدہ صوبائی اسمبلی پنجاب کا ٹکٹ ملا اور خواتین کی نشستوں پر الیکشن میں کامیاب ہو کر میں اسمبلی میں آگئی۔ 1988ء میں اسمبلی کے اندر میری بہترین کارکردگی پر مجھے (Best Parliamentarian) کا گولڈ میڈل مرحوم وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے دیا۔
1988ء میں دوبارہ انتخابات ہوئے۔ مجھے اسمبلی کا ٹکٹ ملا اور میں تیسری مرتبہ صوبائی اسمبلی میں آگئی۔ 20 جون 1990ء کو اسمبلی کے اندر دونوں پارٹیوں اپوزیشن اور حکومت نے میری بہترین تقاریر کے لئے مجھے "قادر الکلام' شیریں بیان' بلبل پاکستان" کا خطاب دیا۔
اب میں آپ کے سوالوں کے جواب بالترتیب دے رہی ہوں۔ میری رائے میں حقیقتاً" بیسویں صدی اردو ادب کی ایک بھرپور صدی گزر رہی ہے۔ صنف ادب میں بے شمار اور کامیاب تجربے کئے گئے۔ اس لحاظ سے سینکڑوں ادیبوں کے نام اردو ادب کی تاریخ میں رہیں گے۔ چند ایک نام یہ ہیں۔
قدرت اللہ شہاب' ممتاز مفتی' کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی' منشی پریم چند' سعادت حسن منٹو' قرۃ العین حیدر' خواجہ احمد عباس' اشفاق احمد' مشتاق احمد یوسفی' سید ضمیر جعفری' کرنل محمد خان' بانو قدسیہ' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور' الطاف فاطمہ' مشفق خواجہ' شان الحق حقی' ڈاکٹر حنیف فوق' ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی۔

سوال 3 کا جواب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فکشن ایک لطیف آرٹ ہے۔ جدیدیت نے ایک لحاظ سے اس آرٹ کو نکھارا ہے۔ جب تک لطیف آرٹ کے اندر مقصدیت رہتی ہے اس کی روح مجروح نہیں ہوتی۔ کسی بھی صنف میں سے مقصدیت نکل جائے اور صرف جدیدیت رہ جائے تو وہ مجروح ہو جاتی ہے۔ درمیان میں ایسے تجربات بھی ہوتے رہے ہیں اور تجربات کا ہوتے رہنا زندگی کی علامت ہے۔ تاہم مجموعی طور پر ادب کی ہیئت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

سوال نمبر4 کے سلسلے میں عرض ہے کہ نصف صدی کے بعد کم ناول لکھے گئے اور اس کی وجوہ یہ ہیں پاکستان بن گیا' تقسیم کا سانحہ گزرا۔ اس سانحے پر اتنے ناول لکھے گئے کہ کوئی پلاٹ اس سے بڑا نہ لگا پھر روزگار کے مسائل ادیب کے سامنے آئے۔ وقت کی کمی تھی۔ ادیب کو معاشرے میں وہ مقام نہ ملا جو بیوروکریٹ کا تھا۔ چنانچہ وہ ادب کے ذریعے نہیں بلکہ معاش کے ذریعے وہ مقام حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ گیا اور سوال نمبر5 کی وجہ بھی یہی ہے جو میں کہہ چکی ہوں۔ آج بھی ہمارے ادیب کو باقاعدہ رائلٹی نہیں ملتی۔ حکومت کی طرف سے اچھے ادیبوں کے لئے وظائف مقرر نہیں ہیں جبکہ ترقی یافتہ ملکوں میں ایک ناول یا ایک کتاب کی رائلٹی اس قدر مل جاتی ہے کہ اپنے گھر کا خرچہ نکال کر ادیب کسی گوشہ عافیت میں جا بیٹھتا ہے اور تسلی سے اگلے ناول پر کام کرتا ہے۔ بہتر زندگی بسر کرنے کے لئے کسی نظام فکر کی تلاش نہیں ہوتی۔ کسی بہتر نظام معاش کی ضرورت ہوتی ہے۔ ادیب بھی اسی معاشرے اور اسی نظام معاش کا حصہ ہے۔ جب تک اسے معاشرے سے الگ کر کے نہیں رکھا جائے گا اسے لکھنے کے لئے بہتر زندگی میسر نہیں آسکتی۔

سوال 8 کے جواب میں عرض ہے انگریزی زبان کے الفاظ کی عدم شمولیت سے اردو زبان خود کفالت کی طرف بڑھ رہی ہے۔ بشریٰ اپنی زندگی کے اہم واقعات سناتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ میرے افسانے اور کہانیاں بہت چھوٹی عمر میں شائع ہونے لگی تھیں۔ بچپن ہی سے مجھے اللہ کی طرف سے مشاہدے کی قوت عطا کی گئی تھی۔ گھر میں اور ماحول میں ہونے والے ہر واقعہ کا نوٹس لیتی اور غور کرتی کہ اس کی نفسیاتی وجہ کیا ہے اور دوسری وجوہات کیا ہیں۔ جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی لکھنے والی خواتین کی نجی زندگی پر غور کرنے لگی۔ مجھے ایک بات کا احساس ہوا کہ وہ تمام ادیب اور شاعر خواتین جو شادی کے بعد بھی اپنے نام کے ساتھ اپنے باپ کی کنیت برقرار رکھتی ہیں ان کی ازدواجی زندگی میں تلخیاں سی گھل جاتی ہیں۔ ایسی باتوں سے بظاہر شوہر لا تعلق سے نظر آتے ہیں مگر دل میں کڑواہٹ اور سوز رکھتے ہیں۔

میں نے اپنا پہلا ناول "چارہ گر" دوران تعلیم ہی لکھ لیا تھا۔ اس وقت میرے افسانے پاکستان اور ہندوستان کے رسائل میں بشریٰ رشید کے نام سے چھپ رہے تھے۔ جب میں ایم اے میں پہنچی تو بعض پبلشرز مصر ہوئے کہ میں اپنا ناول ان سے چھپواؤں۔ مگر میں نے مسلسل انکار کیا۔ جب میری شادی ہوئی تو میں نے رحمٰن صاحب سے اپنے ناول کا ذکر کیا۔ انہوں نے مجھ سے مسودہ مانگ کر

پڑھا' انہیں بہت پسند آیا۔ کہنے لگے بہت دلچسپ ناول ہے مگر اب تک اس کو چھپوایا کیوں نہیں تھا؟

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اگر میں بشریٰ رشید کے نام سے چھپوا دیتی تو پھر یہی نام مستند ہو جاتا' اس لئے میں نے سوچا کہ شادی کے بعد اپنے نام کے ساتھ اپنے شوہر کا نام لگا کر ہی اسے چھپواؤں گی اور اجازت نہ ملی تو۔۔۔؟ انہوں نے پوچھا۔ میں نے سکون سے کہا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اجازت نہ ملی تو لکھنا چھوڑ دوں گی کیونکہ مجھے گھر میں تلخی اچھی نہیں لگتی۔ میرے شوہر خاموش ہو گئے۔ میں سارا دن دل میں ڈرتی رہی۔ اگلے دن انہوں نے گھر سے نکلنے سے پیشتر مجھے کہا۔ اپنا مسودہ مجھے دے دو اور پھر ایک دن وہ ایک خوبصورت کتاب لائے اور میرے آگے رکھ دی۔ وہ ناول "چارہ گر" تھا۔ سوچئے میری کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ وہ کہنے لگے تم نے اتنی چھوٹی عمر میں بہت ذہانت اور سمجھ داری کی بات کی تھی اس لئے میں نے سوچا تمہیں اس طرح شاباش دی جائے۔ اس کے بعد میں نے بشریٰ رحمٰن کے نام سے لکھنا شروع کر دیا۔ اسی سال میرا ناول "چارہ گر" آدم جی انعام کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ پہلے ناول کی پذیرائی اور دس ہزار روپے کا انعام تھا۔ یہ میرے لئے دوہری خوشی تھی مگر رحمٰن صاحب نے میرا ناول مقابلے سے نکلوا لیا اور کہنے لگے پہلے ناول پر انعام لینا ٹھیک نہیں۔ میں نے بہتیرا زور مارا' قائل نہ کر سکی لیکن ایسا ہوا کہ خوب سے خوب تر لکھنے کی طرف مائل رہی۔ آج جب لوگ قومی سطح کے انعامات کے لئے سفارشیں تلاش کرتے ہیں اور خود میرے پاس سفارش کے لئے آتے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ جب تک ادیب' صحافی اور شاعر ایوارڈ سے بے نیاز ہو کر نہیں لکھتا۔ اس کی تحریر عصری اور تاریخی تقاضے پورے نہیں کر سکتی۔

میری زندگی کا ایک اور واقعہ میرے لئے بڑا اہم ہے۔ میں نے ایک ادیبانہ اور شاعرانہ ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ امی جان سخن ور تھیں تو ابا جی سخن پرور تھے۔ ابا جی کی ایک بہت بڑی لائبریری تھی۔ اس میں دنیا جہان کی کتابیں اور رسائل ہوتے۔ مہینے میں ایک دن وہاں سارے بچوں کو جمع کر کے شعری یا ادبی نشست لگاتے۔ جس بچے کو جو بھی سنانا ہوتا اسے سنتے۔ مقصد بچوں کے اندر زندگی کا شعور اور ادب کا ذوق پیدا کرنا ہوتا۔ ان ادبی نشستوں میں سب سے بڑھ کر میں حصہ لیتی اور ابا جی سے انعام بھی لیا کرتی۔ کبھی کبھی وہ کوئی موضوع دے کر تقریر کرنے کو کہتے۔ بچپن ہی سے میں گھر کے اندر تقریری مقابلہ جیت لیتی۔ میری عمر کوئی بارہ تیرہ سال کی ہوگی جب سے ابا جی نے مجھے سروجنی نائیڈو کی خطابت کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ وہ کہا کرتے۔

میں دلی کے طیبہ کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ اس وقت ہندوستان میں ایک بنگالی خاتون ہوتی تھی جو شاعرہ بھی تھی۔ جس کی تقریروں کا سارے ہندوستان میں شہرہ تھا۔ اور اسے (Night engale of India) بلبل ہند کا خطاب ملا ہوا تھا۔ جب کبھی وہ دہلی کی کسی تقریب میں تقریر کے لئے آتی ہم تمام طلباء ذوق و شوق سے اس محفل میں جا پہنچتے۔ وہ ساری ساری رات تقریر کرتی رہتی اور لوگ محویت سے سنتے رہتے۔ وہ خاتون قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی ہم عصر تھیں۔ قائد اعظم سے متاثر ہو کر

ان کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی۔ پھر اباجی مجھ سے مخاطب ہو کر کہتے۔ بشریٰ میرا جی چاہتا ہے تم خطابت میں نام پیدا کرو اور کوئی وقت آئے کہ تمہیں بلبل پاکستان (Night engale of Pakistan) کا خطاب دیا جائے۔ میں بڑی حیرت سے اباجی کی باتیں سنا کرتی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ سروجنی نائیڈو کون تھی اور اباجی اکثر اس کی خطابت کی تعریف کیوں کرتے رہتے ہیں اور سارا وقت مجھے اچھی تقریروں کی ٹریننگ کیوں دیتے رہتے ہیں۔ چھوٹی عمر میں ایسی باتیں پلے نہیں پڑا کرتیں۔

جب میں سیکنڈ ایئر میں پہنچی تو اپنے کالج کے مباحثوں میں مشہور ہو چکی تھی۔ اسی زمانے میں شہر سے باہر دوسرے کالج میں جا کر مباحثے میں حصہ لیا۔ موضوع تھا "زندگی صرف زر و سیم کا پیمانہ نہیں" اس مباحثے میں پاکستان بھر سے طالبات نے حصہ لیا تھا۔ میں نے پہلا انعام جیت لیا اور کالج کے لئے ٹرافی بھی لائی۔ اس روز اباجی نے مجھے شاباش دی اور سروجنی نائیڈو کی خطابت کا بطور خاص حوالہ دیا۔ بعد ازاں ایم اے تک میں مباحثوں میں حصہ لیتی رہی اور انعام جیت کے لاتی رہی۔ ملتان ڈگری کالج سے میں نے (Best Debater of the year) کی ٹرافی بھی حاصل کی۔ میں ایم اے میں پہنچی تب اباجی فوت ہو گئے۔ ایم اے کرنے کے بعد امی نے میری شادی کر دی۔ شادی کے بعد تو ماحول ہی نہیں سوچ کا دھارا بھی بدل جاتا ہے۔ گھرداری میں مگن ہو گئی۔ البتہ ایک اچھا کام کیا کہ لکھنا نہیں چھوڑا۔

یہ غالباً 1978ء کا ذکر ہے۔ میرے بچوں کے اسکول میں جلسہ تقسیم انعامات تھا۔ مجھے ماں کی حیثیت سے بلایا گیا تھا اور پرنسپل صاحب نے درخواست کی تھی کہ میں اسکول کے مسائل پر ایک تقریر کروں اور گورنر صاحب جو صدارت فرما رہے ہیں۔ ان کو مسائل حل کرنے کی ترغیب دوں۔ گورنر صاحب کے ساتھ اسٹیج پر اس وقت جناب حفیظ جالندھری اور بہت سے دیگر زعمائے شہر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اسٹیج پر جا کر فی البدیہہ تقریر کر دی اور اسکول کے مسائل کو اتنے رقت آمیز مگر دلچسپ پیرائے میں پیش کیا کہ مدعوئین کی طرف سے جو تقریباً ایک ہزار کے قریب تھے چندے کی پیشکش ہونے لگی اور اسٹیج پر ڈیڑھ لاکھ کے قریب رقم جمع ہو گئی۔ پرنسپل صاحب حیران کہ یہ کیا ہوا۔ خود میں ششدر تھی۔ اتنے میں حفیظ جالندھری صاحب کھڑے ہوئے۔ پہلے تو انہوں نے میری تقریر کی تعریف کی بعد میں بولے۔ میں نہیں جانتا بشریٰ رحمٰن کون ہیں۔ کہاں سے آئی ہیں مگر میں حاضرین محفل کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں یہ دوسری خوبصورت تقریر سنی ہے۔ پہلی تقریر میں نے غیر منقسم ہندوستان میں سروجنی نائیڈو سے سنی تھی جسے بلبل ہند کا خطاب ملا ہوا تھا۔ بشریٰ رحمٰن اور سروجنی نائیڈو کی تقریر میں فرق یہ تھا کہ بشریٰ رحمٰن کی زبان بڑی شائستہ اور دل میں اتر جانے والی تھی۔ بعض دفعہ یوں محسوس ہوا ان کے منہ میں الفاظ سیدھے آسمان سے ہٹ کر آ رہے ہیں۔

اباجی کے فوت ہونے کے بعد ایک طویل عرصے کے بعد میں نے سروجنی نائیڈو کا نام سنا تو

چونک گئی اور اباجی کی سنائی ہوئی ساری کہانیاں یاد آنے لگیں۔ اسے محض ایک حسن اتفاق سمجھ کر میں پھر روز و شب کے معمولات میں مشغول ہو گئی۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ قسمت مجھے سیاست میں لے گئی۔ مجھے اسمبلی کے اندر بولنا کچھ مشکل بھی نہ لگا۔ یہ غالباً" 1986ء کا کوئی مہینہ تھا۔ اسلام آباد میں کسی کتاب کی تقریب پذیرائی ہو رہی تھی۔ اس محفل میں جناب سید ضمیر جعفری بھی موجود تھے۔ میں نے اس کتاب پر فی البدیہ تقریر کر ڈالی۔ جب میں اسٹیج سے اتری تو جناب سید ضمیر جعفری نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

آج تو تم نے کمال کر دیا۔ ایسی تقریر میں نے کسی زمانے میں سروجنی نائیڈو سے سنی تھی یا پھر تم سے سنی ہے۔ اس روز میں باقاعدہ روئی اور انہیں اباجی والا واقعہ سنا دیا۔ اس دن کے بعد وہ جب بھی مجھے خط لکھتے۔ ہمیشہ ان کا القاب ہوتا۔۔۔ پاکستان کی سروجن بی بی!

وقت کا سلسلہ بھی آگے کو ہی چلتا رہتا ہے۔ اسمبلی کے اندر میری تقریروں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ 1990ء کی اسمبلی کا ذکر ہے جب اپوزیشن میں پیپلز پارٹی کے تقریباً" سو ارکین تھے۔ میں مسلم لیگ کی طرف سے سرکاری بینچوں پر بیٹھتی تھی۔ نواز شریف وزیر اعلیٰ تھے اور اپوزیشن کی ہر تلخ و ترش تقریر کا جواب دینا میرے ذمہ تھا۔ 2 جون 1990ء کے سیشن میں اپوزیشن کی طرف سے یہ تحریک آئی کہ وہ بشریٰ رحمٰن کی عمدہ تقریروں پر اسے خطاب دینا چاہتے ہیں۔ وہ قادر الکلام بھی ہیں' شیریں بیان بھی ہیں اور بلبل پاکستان بھی۔ حکومتی بنچ نے کہا کہ اس تحریک میں ہم بھی شامل ہونا چاہتے ہیں۔ یہ خطاب دونوں پارٹیوں کی طرف سے پیش ہو گا۔ دونوں پارٹیوں نے متفقہ طور پر یہ خطاب اس طرح سے بنایا "قادر الکلام' شیریں بیان' بلبل پاکستان" اور پرائیویٹ ممبرز ڈے پر اسمبلی میں پیش کر کے ہاؤس سے ووٹنگ کروالی۔

اس روز اسمبلی کے در و دیوار پر مجھے چاروں طرف باباجی کی شبیہہ مسکراتی ہوئی نظر آئی۔ اس خواہش کا بیج انہوں نے بویا تھا۔ یہ ان کے خواب کی تعبیر تھی۔ میں تو زندگی کی کڑی دھوپ میں خوابوں کی گٹھڑی کہیں رکھ کر بھول گئی تھی۔

آخری سوال کے جواب میں بشریٰ نے کہا۔ یہ درست ہے کہ اردو ادب میں تنقید نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی۔ جب سے جمہوریت بی بی نے اپنی جھلک دکھائی ہر شعبہ اور ہر محکمہ میں سیاست در آئی۔ سیاست کا مطلب ہی یہ ہے۔ دل میں جو کچھ بھی محسوس کرو' زبان سے اس کا اعتراف نہ کرو۔ پھر جب ادب میں دعوت نوازی اور اقربا پروری کی رسم آگئی تو بے لاگ تبصرے ہونے بند ہو گئے۔ گروہ بندی کا رواج آیا۔ تنقید نے تنقیص کا لبادہ اوڑھا۔ تنقید صرف مخالف گروہ کے حصے میں آئی اور تحسین و ستائش اپنے گروہ کی ہوئی۔ ادب کو سب سے زیادہ نقصان "درباریت" نے پہنچایا۔ یہ رسم ایوب خان کے دور سے شروع ہوئی تھی۔ چن چن کے ادیبوں کو دربار میں لایا گیا۔ کرسی پر بٹھایا گیا۔ کرسی والے ادیب نے جو بھی لکھا اس کو سراہا گیا۔ تنقید کرنے کی جرات کسی نقاد کو بھی نہ

ہوئی۔ کبھی کبھی نقاد کو بھی اعلیٰ عہدے کی کرسی دی گئی اور پھر مصلحتیں ہی مصلحتیں ادیب کی زندگی میں گھس آئیں۔ اتنی مصلحتوں میں بے لاگ تنقید کیسے ہو سکتی ہے بھلا۔ رفتہ رفتہ ادیبوں میں بھی سچ سننے کا حوصلہ نہ رہا۔

تراجم کرنے میں بھی زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ اتنی محنت لوگ روٹی کمانے میں کر لیتے ہیں۔ علاقائی زبانوں پر بھی جذبوں سے کام ہوتا ہے۔ کچھ کام کرنے والے ہیں تو ان کی حوصلہ افزائی نہیں ہو رہی اور اس طرح اگر علاقائی زبانوں میں کام نہیں ہو گا تو اردو زبان کو یہ نقصان بھی بھگتنا ہو گا۔

MRS. BUSHRA RAHEMAN

WATAN DOST 8-C AHMED PARK

NEW GARDEN TOWN, LAHORE, (PAKISTAN).

بشیر مالیر کوٹلوی
مالیر کوٹلہ

بشیر مالیر کوٹلوی کا نام نیا نہیں پچھلے پچیس (۲۵) برسوں سے افسانہ لکھ رہے ہیں اور اتنی مہارت حاصل کرلی کہ اب مختصر افسانہ نگاری تک آن پہنچے ہیں اور اس میں کمال حاصل کر کے اہل ہنر سے سند بھی لے چکے ہیں اب وہ اپنے مختصر افسانوں کے مجموعے کی اشاعتی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

مختصر افسانہ کی بھی اپنی ایک تکنیک ہے۔ مختصر افسانہ لفظوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا اور افسانہ نگار پر دہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان الفاظ کا انتخاب کرے جو موثر بھی ہوں اور کہانی کو ساتھ لے کر چلیں۔ مختصر افسانے کا فن افسانہ نگار کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس چھوٹی سی کہانی پر کتنے الفاظ کا بوجھ لادا جا سکتا ہے۔ ایچ ای بیٹس (H.E.Beets) نے اپنی کتاب "دی ماڈرن شارٹ اسٹوری" میں دوبار یہ بات کی ہے کہ "کہانی لکھنا گویا دیا سلائی کے تنکوں سے عمارت بنانا ہے اور اس عمل میں ایک لمحہ ایسا بھی آسکتا ہے جب ایک مزید تنکا اژ دہم کر کے ساری عمارت گرا سکتا ہے"

لہٰذا اس قول کی روشنی میں مختصر افسانہ تو اور بھی عرق ریزی مانگتا ہے۔ بشیر کے مختصر افسانوں کی خوبی یہی ہے کہ شارٹ اسٹوری میں شارٹ کٹ اس خوبی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے کہ قاری کہانی کے اختتام پر تشنگی کا شاکی نہیں پایا جاتا۔

آیئے آپ کو بشیر سے متعارف کراؤں۔ ۱۰ جون ۱۹۵۰ء کے دن بشیر نے مالیر کوٹلہ پنجاب (ہندوستان) میں جنم لیا۔ تعلیم کے بارے میں انکساری سے فرماتے ہیں۔ "اساتذہ کی محبت سے جو کچھ میسر ہو سکا حاصل کیا۔ اندنوں انبالہ پنجاب وقف بورڈ میں اسٹیٹ افسر ہوں۔"

اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں انہوں نے بتایا۔

"مارچ ۱۹۷۴ء میں میری پہلی کاوش بعنوان بھوک جو رومان سے عاری تھی، ایک مقامی اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ پہلی اشاعت کی وہ سحر انگیز کیفیت مجھے آج بھی یاد ہے۔ اس کے بعد میں بچی پکی کہانیاں لکھتا رہا، چھپتا رہا۔ ۱۹۸۳ء میں بسلسلہ ملازمت میرا تبادلہ فرید آباد ہوا تو مقامی ادباء محترمی ستیش بترہ مرحوم، جناب اوم کرشن راحت اور ہیرانند سوز صاحب نے میری راہ نمائی کی اور میرے فن کو نکھارا۔ فرید آباد کی ادبی فضاؤں نے مجھے جناب فکر تونسوی مرحوم، جناب جوگندر پال، جناب ظفر پیامی مرحوم، مجتبیٰ حسین صاحب اور دلیپ سنگھ صاحب جیسے کہنہ مشق قلم کاروں کے قریب ہونے کا شرف بخشا۔ اس طرح میں ادب کا ایک ادنیٰ سا طالب علم بنا، اور ہندوستان کے فلمی و ادبی رسائل میں چھپنے لگا۔ انتہائی غیر رومانی قسم کا آدمی ہوں۔ ذہن ہمیشہ احتجاج کی جانب راغب رہتا ہے۔ مجھے سماج کے رستے ناسوروں اور دلخراش واقعات کی تلاش رہی ہے، جنہیں قلم بند کر کے راحت ملتی ہے۔ میرے دو افسانوی مجموعے "قدم قدم دوزخ" اور "سلگتے لمحے" شائع ہو چکے ہیں۔ منی کہانی میری پسندیدہ صنف ہے تیسرا مجموعہ "چنگاریاں" زیر ترتیب ہے جس میں صرف نئی کہانیاں ہی شامل ہیں۔ اردو اور صرف اردو میں لکھتا ہوں۔ میری کہانیوں کے تراجم ہندی، پنجابی، اور تیلگو میں ہو چکے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی میری شناخت بطور افسانہ نگار ہے ادب برائے زندگی کا قائل ہوں۔ ایوارڈز اور انعامات کی خواہش نہیں ہے۔ مجھ ایسے مونہہ پھٹ ادیب کو ایوارڈ کوئی دے بھی کیوں؟ فکر معاش اور گھریلو مسائل کے باوجود تخلیقی عمل کافی مشکل تجربہ ہے۔

میری رائے میں بیسویں صدی کے اردو ادب میں باقی رہ جانے والا سب سے پہلا نام محترمہ قرۃالعین حیدر کا ہے۔ ساتھ میں جناب جوگندر پال، بلراج منرا، بلراج کومل، جیلانی بانو، رتن سنگھ، شرون کمار ورما۔ پاکستان سے احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین اور اشفاق احمد کے نام شامل ہیں۔

بشیر کہتے ہیں "بلاشک جدیدیت نے فکشن کے حسن کو نکھارا ہے۔ کہانی داستانوں سے نکلی اور طویل کہانیوں کے میدان سے گزرتی ہوئی افسانوں سے ہو کر جدیدیت کی حدود میں داخل

ہوئی۔ اس لمبے سفر نے اس صنف کی بلا ضرورت لفاظی، بے جا منظر نگاری اور طوالت کو ختم کر دیا جس کی وجہ سے اس پر نکھار آنا قدرتی بات تھی۔ دور جدیدیت سے پہلے مصنف صرف واقعات بیان کرتا تھا۔ اور ایک خاص فاصلے پر تماش بین کی طرح کھڑا رہتا تھا۔ جدیدیت نے تخلیق کار کو واقعات میں شامل کر لیا۔ وہ اب صرف ماضی کو بیان کرنے کی بجائے حال میں بھی جینے لگا اور انسان کی اندرونی کیفیت اور ذہنی انتشار کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی۔

تجرید جدیدیت کی ہی دین تھی۔ تجریدی رجحان نے فکشن کو کسی حد تک مجروح بھی کیا۔ تجرید نے کہانی کو اس قدر الجھا دیا کہ قاری بوکھلا گیا۔ جیسے ماڈرن آرٹ نے فائن آرٹ کو پریشان کیا بالکل اسی طرح تجریدی رجحان نے کہانی کے ساتھ کیا۔ یہ رجحان پاکستان میں مقبول ہوا۔ ڈکٹیٹر شپ کے نظام میں بہت سے بے خوف قلم کاروں کو ملک بدر ہونا پڑا۔ براہ راست اظہار کا راستہ چھوڑ کر تخلیق کار اشاروں اور کنائیوں میں بات کہنے لگے۔ ہرچند کہ یہ وہاں کی ضرورت رہی ہوگی مگر بھارت میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ نہ ہے اور شاید نہ ہوگا۔ یہاں تخلیق کار جمہوریت کی فضاؤں میں سانس لیتا ہے۔ جمہوریت کے تقاضوں کو سمجھتا ہے۔ یہاں کے چند ادباء نے محض فیشن کے طور پر تجریدی رجحان اپنایا۔ دور حاضر میں پھر سے بیانیہ افسانوں کو تخلیق کیا جانے لگا۔

بشیر کا خیال ہے بڑھتی ہوئی آبادی، منگائی، کم یابی اور گرانی نے آج کے انسان کو بے حد مصروف کر دیا ہے۔ اس کے پاس وقت کی قلت ہو گئی۔ وہ ہر کام میں عجلت پسندی کو ترجیح دینے لگا ہے۔ فنون لطیفہ روح کی غذا ہیں آج کا انسان کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ محظوظ ہونا پسند کرتا ہے۔ طویل کہانیوں اور ناولوں کے مطالعہ کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں۔ جس کے نتیجہ میں ناول کی تخلیق بہت کم ہو چلی ہے۔ دور حاضر میں ایک ہی ناول "آگ کا دریا" کی گونج ادبی ایوانوں میں پھیلی ہوئی ہے جو برسوں تک سنائی دیتی رہے گی۔"

سوال نمبر ۵ کے جواب میں انہوں نے کہا۔ "میں نے بہت سے ادیبوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی زندگی میں جھانکا ہے۔ بیشتر ادباء ادب کو روٹی روزی کا ذریعہ نہیں بنا سکے۔ وہ لوگ معاشی طور پر زندگی کے کسی نہ کسی شعبے سے جڑے ہوئے پائے گئے۔ ادب کو گویا پارٹ ٹائم جاب کے طور پر لے رہے ہیں۔ اس طرح کی دوہری زندگی جینا ادیب کی مجبوری ہے۔ فلم اور ٹی۔وی سے جڑے ادیب بہتر نہیں بلکہ بہترین زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے لیے ادب ہی روٹی روزی کا ذریعہ بنتا ہے۔ وہ فل ٹائم جاب کرتے ہیں۔ لیکن ان کے سامنے بہت بڑا المیہ درپیش ہوتا ہے۔ اس میدان میں سستے ذوق والے ناظرین بھی ہوتے ہیں جن کی پسند ناپسند کا خیال رکھتے رکھتے ادیب معیاری ادب سے ہٹ جاتا ہے۔ تیسری قسم کے ادیب جو نہ کسی دوسرے شعبے سے جڑے ہیں نہ فلم ٹی وی سے جیبیں بھرتے ہیں اور معیاری ادب کے خالق ہوتے ہیں

ذہنی بحران میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ ذہنی بحران منشی پریم چند سے ہی چلا آرہا ہے۔ کرشن چندر گو اپنی حیات میں فلم سے جڑ گئے تھے۔ ان کی کہانی "کاغذ کا کفن" اسی ذہنی اور نفسیاتی بحران کا نتیجہ تھی۔ جب زبان ہی زوال پذیر ہو' تو تخلیق کار کیسے اپنی قیمت وصول کرے اور کہاں سے۔ معاوضہ کے طور پر مالی امداد صرف سرکاری جریدے دیتے ہیں۔ یہ سماج بدلے سارا سسٹم درست ہو فنکار کی قدر و قیمت ہونے لگے تب جا کر ادیب مالی آسودگی پائے۔ میرے نزدیک پارٹ ٹائم ہی بہتر ہے۔ یہ وقت کی ضرورت ہے۔ شاعری ہو یا نثر' معیاری ادب کی شرط ہے کہ وہ زندگی سے قریب ہو اور میں کہوں گا کہ نثر نظم سے زیادہ سنجیدہ صنف ہے۔ جس کو تخلیق کرنے میں وقت اور کڑی محنت درکار ہے۔ نظم میں رنگینی اور شگفتگی ہے اسی لیے یہ نثر سے کہیں زیادہ مقبول ہے۔ شاعری موسیقی سے بے حد قریب ہے۔ دھنوں کو الفاظ شاعری ہی دیتی ہے ورنہ گونگی دھنوں کو مشرق میں کہاں تک کوئی برداشت کر سکتا ہے۔ شاعری کی مقبولیت نے شاعری کی قیمت میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ مشاعروں میں پڑھنا غیر ملکی دورے اور شہرت نے شاعری کو پرکشش بنا دیا ہے دوسری طرف ادیب صرف چھپنے کی چیز ہے۔ جسے چھاپ کر مدیر اسے معاوضہ دینے کے بجائے اردو کے نام پر اس سے سالانہ چندہ طلب کرلیتا ہے۔ جان بوجھ کر کوئی نیم کے پتے کیوں چبائے۔ شاعری آسان ہے کہیں بھی بیٹھ کر آپ نے دس مصرعے کہہ دیئے بس غزل مارلی۔

ہندوستان پاکستان کے اندر شاعری کی کشش قلم کار کے لیے شاید یہی ہے کہ وہ مالی آسودگی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ باقی رہی جرات کی بات تو شاعر جو احتجاج پسند ہے دو مصرعوں میں انقلاب کی جرات رکھتا ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کی مثال سامنے ہے۔

فکشن میں جہاں انگریزی الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً" افسانہ میں اگر کوئی کردار ماڈرن اور مغرب زدہ ہے یا این آر آئی ہے تو ہم اس کے منہ سے اردو اور انگریزی میں ملے جلے مکالمے ادا کروائیں گے۔ اگر ہم نے اس کے مونہہ میں خالص اردو زبان رکھ دی تو وہ ہمیں کوستا ہوا مر جائے گا۔ ویسے بھی انگریزی کی اہمیت ہمارے یہاں بہت ہے۔ اردو ادب میں جتنی بھی اہم تبدیلیاں اور فیشن رونما ہوتے ہیں وہ سب کے سب مغرب کی دین ہیں اور مغرب کی زبان بہرحال انگریزی ہے۔ یہ کہنا کہ انگریزی کی آمیزش کے بغیر اردو زبان پر زوال آسکتا ہے غلط ہے بلکہ دل آزاری ہے۔ اردو کے اندر ایک مکمل تہذیب ہے۔ اس کا اپنا رنگ اپنی خوشبو اور اپنی ایک خوب صورت دنیا ہے۔ اسے کسی زبان کے سہارے کی ضرورت نہ تھی اور نہ اب ہے وہ اپنی جگہ مکمل ہے اور ترقی پذیر بھی۔

میں ایک دلچسپ واقعہ ضرور لکھنا چاہوں گا۔ ۲۸ اپریل ۱۹۸۵ء کے دن پنجاب (بھارت) کی سرزمین پر شاید تقسیم وطن کے بعد پہلی بار ایک اعلےٰ پیمانے کی شام افسانہ منعقد ہوئی جو میرے

دوست پروفیسر محمود عالم صاحب اور میری کوششوں کا نتیجہ تھی۔ تقریب میں قبلہ فکر تونسوی مرحوم، محترمی جوگندر پال، محترمہ رفیعہ منظور الامین اور ان کے شوہر قبلہ منظور الامین صاحب، جناب ستیش بترا مرحوم کے علاوہ اوم کرشن راحت صاحب اور ہیرانند سوز صاحب نے بھی شرکت فرمائی۔ تقریب کے آخر میں فکر صاحب نے زبانی طور پر اپنے فن پارے سنا کر حاضرین کو محظوظ کیا۔ آخر میں جب فکر صاحب گاڑی میں سوار ہو کر جائے قیام کی جانب جانے لگے تو انہوں نے ڈرائیور سے پوچھا جو انتہائی ڈرائیور قسم کا ہی آدمی تھا۔

"کیوں ڈرائیور ساب! سی دی فنکشن سنیا...!؟ ڈرائیور بے دلی سے بولا۔ "ناں باؤ جی... اسیں تے گڈی وچ ہی بیٹھے رہے...!" فکر صاحب برجستہ بول اٹھے "فیر تے یار توں بچ گیا...!" ہم سب ہنستے رہے۔ ڈرائیور خاموش تھا۔

میرے نزدیک اردو ادب میں پچھلی دو دہائیوں سے تنقید مکمل آرام فرما رہی ہے۔ لگتا ہے نقاد گورو ہو گئے اور سادھی لگا کر خاموش بیٹھ گئے۔ ان کے گرد و نواح کیا ہو رہا ہے ان کو چنداں پرواہ نہیں۔ لگتا ہے انہوں نے اپنا کام نپٹا لیا۔ آپ تنقید کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجئے نقاد حضرات منشی پریم چند سے لے کر منٹو اور بیدی سے ہوتے ہوئے انتظار حسین کی گاتھاؤں سے نکل کر رتن سنگھ، شرون کمار، سلام بن رزاق اور عابد سہیل تک آکر اپنی تان توڑ دیتے ہیں۔ لگتا ہے ماضی میں جینا ہی ان کو پسند ہے۔ تنقید کی کتابوں کا یہ حال ہے کہ ہندوستانی فلموں کی طرح دس کتابیں سامنے رکھ کر ایک ضخیم کتاب تیار کر لیجئے اور بس۔

وقت کے ساتھ ساتھ تنقید میں تبدیلی بھی ضروری تھی۔ نقاد حضرات بھی بہرحال اس سماج کا ایک حصہ ہیں۔ یہ بھی مصروف ہیں کیوں کہ انہیں ٹی وی پروگرام حاصل کرنے ہیں۔ یونیورسٹیوں سے پراجیکٹ ہتھیانے ہیں۔ موٹی رقوم والے بھاری انعامات کے لیے دست درازی ضروری ہے۔ کتابوں کو فروخت کرنا ہے۔ ایک بزرگ قلمکار نے ہمیں قصہ سنایا۔ کہ ایک انعامی مقابلہ میں دو کتابیں شامل ہوئیں جو اتفاقاً" تنقید پر تھیں۔ کمیٹی جس کو آخری فیصلہ کرنا تھا اس میں تین جج تھے جن میں سے ایک وہ بزرگ قلم کار بھی تھے۔ ایک کتاب ایک قومی سطح کے نقاد بلکہ مہارتھی کی تھی۔ مہارتھی صاحب نے بزرگ قلم کار کو فون پر مکھن لگایا اور نظر عنایت طلب کی۔ پھر ذاتی طور پر گذارش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مہارتھی نے جب دیکھا کہ بازی دوسرا فریق لے جائے گا تو اس نے باقی دو ججوں پر آدھی رقم خرچ کر کے انعام جیت لیا۔

وہ گئے وقت کی باتیں ہیں کہ تخلیق کار ادب تخلیق کرنے کے بعد فارغ ہو جاتا تھا۔ اور باقی ذمہ داریاں قاری اور نقاد پہ چھوڑ دیتا تھا۔ اس دور میں تخلیق کار کا کام بہت بڑھ گیا ہے اسے اچھی پارٹی کا اہتمام کرنا ہوتا ہے تحائف خریدنے ہوتے ہیں۔ نقاد کی ضروریات کو سمجھنا ہوتا

ہے۔ ایک بڑے نقاد صاحب کے بچوں کو ایک خلیجی ملک میں مقیم بڑے ٹھیکیدار نے نوکریاں دیں۔ اور ہر طرح سے نوازا۔ نقاد صاحب نے ان کو بلند پایہ کا شاعر' افسانہ نگار اور ناول نگار تک بنا دیا۔ اکادمیوں سے انعامات دلوا دیے۔ اسی طرح ایک انتہائی بزرگ افسانہ نگار کو میں جانتا ہوں وہ ساری زندگی گھٹیا رومانس پر قلم گھساتے رہے۔ مگر ادب میں ان کا کوئی مقام نہ بنا۔ عمر کے آخری حصہ میں وہ ایک صوبائی اردو اکادمی کے آقا بنا دیئے گئے۔ بس صاحب پھر کیا تھا نقاد حضرات اور مضمون نگار حضرات ٹوٹ پڑے۔ ادھر ان کے فن پر ایک رسالے کا نمبر نکلا تو دوسرے میگزین میں گوشہ۔ تیسری طرف ان کے فن اور شخصیت پر سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ جگہ جگہ ان کی صدارت میں تقریبات ہونے لگیں۔ آخری عمر میں ان کی لاٹری لگ گئی۔ فروغ اردو کے نام پر ملنے والی رقم کو دونوں ہاتھوں سے لٹایا گیا۔ اردو کو تو فروغ نہ ملنا تھا نہ ملا بزرگ قلمکار ادب کی دنیا میں چمک اٹھے۔

جب نقاد متذکرہ بالا امور میں مشغول ہوں تو تنقید کا برائے نام رہنا قدرتی ہے۔ عملی نظریاتی ترقی ہو تو کیسے یہ اس دور کا اردو ادب کو نقصان نہیں بلکہ المیہ ہے۔"

MOHD.. BASHIR MALER KOTALVI
ESTATE OFFICER, PUNJAB WAKF BORD
INSIDE DHLHI GATE MALER KOTLA (P6.)148023 INDIA

تالاب میں پتھر گرتا ہے تو لہریں اٹھتی ہیں۔ پانی میں ہلچل مچ جاتی ہے
پتہ گرتا ہے تو لہریں اٹھتی ہیں۔ نا شور ہوتا ہے۔
دنیا میں وہی ہلچل مچاتے ہیں جو اپنے اندر وزن رکھتے ہیں۔

پروین۔
۱۷/جولائی ۹۹ء

پروین کمال
جرمنی

۲۸ جولائی ۱۹۵۲ء کو حیدر آباد دکن (ہندوستان) میں پروین سلطانہ نے جنم لیا۔ شادی کے بعد پروین کمال کہلانے لگیں۔ جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولیں وہ خالص علمی و ادبی گھرانہ تھا۔ خود کو ہمیشہ کتابوں کے درمیان ہی پایا۔ والد محترم (Dp. Director of Animal Husbandry Ratd) جو پیشے کے لحاظ سے تو بیطار (مویشیوں کے معالج) کہلائے جاتے ہیں لیکن ادبی ذوق اور درک رکھنے والی ظریف الطبع شخصیت بھی ہیں جب کہ والدہ محترمہ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ ادب سے والہانہ عشق ہر دو کے خمیر میں تھا۔ انہوں نے اپنے جگر گوشوں کو تعلیمی زیور سے سنوارنے میں کوئی کوتاہی کی اور نہ ہی ادبی ذوق پیدا کرنے میں کوئی کمی کی۔ آج بھی وہ دونوں اسی کے لیے کوشاں ہیں۔

تعلیمی سفر ختم ہونے کے بعد جب پروین رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئیں تو یہاں قدرت نے انہیں ایک بار پھر اپنے نصیب پر نازاں ہونے کا موقع دیا۔ درحقیقت ان کے شوہر مصطفیٰ کمال

کی سعی بیکراں نے انہیں ادبی دنیا میں قدم رکھنے کا حوصلہ بخشا۔ یوں تو یہ شوق طالب علمی کے دور ہی سے دل کے کسی کونے میں پنہاں تھا مگر پرواز کی ہمت نہ تھی والدین کی مناسب حوصلہ افزائی اور مسلسل توجہ سے ان کے حوصلوں کو جلا ملی۔ سب سے پہلی اڑان انھوں نے "روزنامہ سیاست حیدر آباد" سے لی۔ کہتی ہیں "اس ضمن میں اگر میں اعتراف نہ کروں تو زیادتی ہوتی کہ میری بڑی بھابھی صاحبہ (محترمہ غوثیہ سلطانہ ادیبہ و شاعرہ مقیم شکاگو) نے مجھے اپنے پر خلوص عقید مشوروں سے نوازا اور ہمیشہ پذیرائی کرتی رہیں۔ اس سے میرے حوصلے بلند ہوئے۔ یوں میں گذشتہ ایک عشرے سے ادبی کہکشاں کے جگمگاتے ستاروں کی درمیان ایک ٹمٹماتے ستارے کی طرح ادبی افق پر نمودار ہوں۔ اس مختصر سی مدت میں جو کچھ بھی تحریری کام کیا وہ میری ادبی دنیا سے والہانہ وارفتگی و وابستگی کا کھلا ثبوت ہے۔ جرمنی کے بیس سالہ قیام میں جرمن زبان سیکھنے کے بعد میں نے (Interpreting Course) بھی کیا۔ پھر مختلف وہ کورس کیے جن کی اہمیت یہاں کی زندگی میں تھی لیکن اردو زبان کے لیے جو تڑپ تھی وہ کم نہ ہوئی۔ اس کا واحد حل تھا اس زبان کو تحریری پیرہن دے کر اپنی تشنگی کو تسکین پہنچاؤں۔ آج کے اس پر آشوب دور میں اہل قلم کی نگارشات بھی معاشرے میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو سکتی ہیں۔ مدار زیست پر جب تک میرے قدم چلتے رہیں گے ادبی دنیا سے رابطہ قائم رکھنے کا میں نے عزم کیا ہے۔"

پروین لکھتی ہیں۔ "آفریں ہے محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ پر کہ جنھوں نے اہل قلم کے لیے ایک زریں موقع فراہم کیا۔ یہ تصنیف جو رنگ برنگے پھولوں سے آراستہ کی جا رہی ہے ہوا میں تازہ جھونکے کی طرح ظاہر ہوگی اور نئی نسل کے لیے سنگ میل کا کام کرے گی۔

۲۔ میرے خیال میں اردو ادب میں (بیسویں صدی کے) زندہ رہ جانے والے نام یہ ہیں۔ قرۃ العین حیدر، بشریٰ رحمٰن، جیلانی بانو، مسرور جہاں، احمد ندیم قاسمی، قیصر تمکین، نجم الحسن رضوی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔

۳۔ میرے خیال میں فکشن ایک بہترین فن ہے جو اہل قلم کی جدوجہد اور دشت نوردی سے طلسماتی حسن پا کر قاری کے مشام جاں کو مسحور کرنے کے علاوہ شعور و آگہی کے بے شمار دریچے وا کرتا ہے۔ عہد عتیق میں جن موضوعات کے پیش نظر افسانے، کہانیاں اور ناولیں لکھی جاتی تھیں وہ عام طور پر گھریلو مسائل یا رومان انگریز تناظر میں ہوتی تھیں جسے پڑھ کر اقدار کی بلندیوں کا احساس ہوتا اور عرصے تک قاری اپنے وجود کو ان ایوانوں میں محسوس کرتا تھا۔ ان کرداروں اور اس ماحول کا احساس اس کے دماغ پر اس حد تک مسلط رہتا تھا کہ عرصے تک وہ اس ماحول سے باہر آنے پر آمادہ نہ ہوتا لیکن وقت کی گردش نے جہاں دنیا کے ہر نظام پر اپنے اثرات ثبت کیے ہیں وہاں اس صنف نے بھی گھریلو تبدیلیوں کے راستے سے گزر کر کچھ نیا پن

اختیار کر لیا ہے۔ معاشرے میں چھپی کمزوریوں کو بے باکی سے منظر عام پر لاتا ہے۔ خواہ وہ مرد و زن کے تعلقات ہوں' خواتین پر تشدد' نئی نسل کے مغرب زدہ رویے اور عریانیت کا موضوع ہوں یا پھر کشمکش حیات کی بات ہو۔ گرد و پیش کے ماحول میں پیدا ہونے والے مسائل انسانی نقطہ نظر سے دیکھ کر اس کو تحریر میں لانے کی جرات اور حوصلہ آج کے مصنف میں شدت سے موجود ہے۔ اس جدید رویے سے سماج میں چھپی برائیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں تھوڑی سی پردہ داری بھی ضروری امر ہے کیوں کہ مشرقی ماحول میں حقیقتوں کو برہنہ دیکھنے کا یارا جدیدیت پسند طبقے میں بھی کم ہے۔

۴۔ ایک بڑی وجہ جو میرے خیال میں ناول نگاری پر اثر انداز ہوئی ہے وہ ہے فلم میڈیا۔ آج کل ہر مسئلے اور ہر موضوع پر تھوک کے بھاؤ سے فلمیں بن رہی ہیں۔ جب ہر سین پردۂ سیمیں پر متحرک دیکھنے کو مل جائے تو طویل ترین تصنیفات پڑھنے کی زحمت کون گوارا کرے۔ دوسرے ہند و پاک کے ادیب کے معاشی حالات بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔

۵۔ ترقی پذیر ممالک کے ادیبوں کو ذہنی' نفسیاتی و معاشی بحران سے نکالنے کے لئے انہیں بہتر سے بہتر وسائل مہیا کیئے جائیں۔ سرکار کی طرف سے مالی تعاون ملے' کتابوں کی فروخت زیادہ سے زیادہ ہو۔ جس سے ایک طرف تو لکھنے والے کو مالی تحفظ حاصل ہو اور دوسری طرف قارئین کی پذیرائی سے اس کی حوصلہ افزائی بھی ہو۔ یہی سہولتیں اس سے ادب پارے لکھوائیں گی۔

۶۔ ایک ادب پارہ اگر حقیقت پر مبنی ہے' فنی مہارت لیے ہوئے ہے اور انداز بیان دل نشین ہے تو وہ معیاری ادب کا حصہ کہلائے گا۔

۷۔ نثر کم لکھے جانے کی وجہ وقت کی کمی ہے۔ دیار غیر میں رہ کر آدمی جتنا وقت کا محتاج ہو جاتا ہے اتنا تو شاید اپنے ملک میں رہ کر معاشی طور پر بھی نہیں ہوتا۔ نثر نگاری کا صیغہ یوں بھی تفصیل طلب ہے۔ معاشرتی قدروں اور ناہمواریوں کو ایک ایک پل سے کھوج کر نکالنا اور کاغذی پیرہن دے کر اسے منظر عام پر لانے کے لیے وقت کا کافی سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ بدقت تمام وقت مہیا کر کے خامہ نگاری کی کوشش کی بھی جائے تو نگارشات میں کوئی اچھوتا پن' کوئی تاثر پیدا کرنے میں ادیب پھر بھی ناکام رہ جاتا ہے۔ کیوں کہ جدوجہد سے نپٹنے کی جستجو میں پھنسا تخلیق کار اس صنف کی جانب سنجیدگی اور دیانت داری سے اپنی توجہ مرتکز نہیں کر پاتا۔

۸۔ زبانیں تو ارتقا پذیر ہوتی ہیں۔ مگر اب جو اس کا موقف ہے وہ ایک مضبوط و مستحکم مقام پر ہے۔ انگریزی کے بغیر بھی اس نے اپنی طویل حیات طمطراق سے گزاری ہے اور آج بھی اس کا وجود جمالیات ذوق سے لبریز ہے۔ منطق کے نازک اور نفیس نکات کو فراخ دلی اور شفاف طریقے سے بیان کرنے کے لیے اس زبان میں جتنا ذخیرۂ الفاظ ہے' وہ کسی اور زبان میں نہیں

ملتا۔ اس پشتینی ورثہ کو نئی نسل میں منتقل کرنے کے لیے ہمیں پیش قدمی کرنی چاہیے تاکہ اس کا نسب باقی رہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ انگریزی ذریعہ تعلیم نئی نسل کو اردو سے مبرا کر رہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انگریزی تعلیم ذریعہ معاش بن سکتی ہے جب کہ اردو نہیں۔ اگر کوئی زیرک و ذی فہم طالب علم جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہے تعلیمی میدان میں حد درجہ آگے نکل جائے، تب بھی ملازمت کا موقع نہیں دیا جاتا۔ غیر ممالک میں کہاں اس کی داد رسی ہوگی! یہی وجہ ہے کہ فارسی کی طرح اردو کو بھی ہر جگہ سے آہستہ آہستہ خارج کیا جا رہا ہے۔ اردو کو حیات دوام دینے کا ایک ہی واحد طریقہ ہے کہ نئی نسل میں یہ احساس بیدار کیا جائے کہ اردو اپنی ثقافت کا ایک تہذیبی ورثہ ہے تبھی یہ زبان نسل در نسل منتقل ہو کر قرنوں کا سفر طے کرے گی اور اپنی شناخت برقرار رکھے گی۔

۹۔ آج کل تنقید کا دوسرا نام مطلب پرستی ہے۔ جو صورت حال سامنے ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ آج کل کسی کتاب کو سیاق و سباق کے لحاظ سے جانچنے کے بجائے مصنف کی شخصی وقعت، عہدے، رتبے اور رشتے کو پیش نظر رکھتے ہوئے مثبت تنقید پیش کر کے تخلیقات تسلیم کر لی جاتی ہیں، جو تنقید کے اصول کے عین منافی ہے۔ کسی زبان کو ترقی دینے کا سب سے بڑا ذریعہ تنقید ہی ہے۔ اگر وہی ناپید ہو جائے تو زبان کا سرمایہ چھن جاتا ہے اور ترقی کی راہیں مسدود ہو جانا کوئی غیر یقینی امر نہیں ہے۔ یوں کہنا بہتر ہو گا کہ اس کے منفی اثرات ادب پر شدت سے رونما ہو رہے ہیں۔

۱۰۔ آخر میں، میں اپنی زندگی کے ایک اہم واقعے کا ذکر کرنا چاہوں گی۔ یہ اس شام کا ذکر ہے جو رنگ و نور کے اس شہر (فرینکفرٹ) میں ہر شام سے بالکل مختلف نہیں تھی۔ اپنے میاں کو کمپیوٹر میں مصروف دیکھ کر میں اکیلی ہی چہل قدمی کے لیے نکل پڑی۔ اس وقت سارا ماحول برف میں نہایا ہوا تھا۔ ہر طرف سناٹا۔ ایک عجیب سی ویرانی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی سڑک سے گزر جاتی تو ماحول میں تھوڑا سا ارتعاش پیدا ہو جاتا اور پھر وہی نہ ختم ہونے والی خاموشی۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور سڑک عبور کر کے دوسری طرف چلی گئی۔ ابھی دو چار ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ دیکھا ایک بڑی سی گاڑی فٹ پاتھ پر کھڑی ہے جس کا ایک دروازہ ادھ کھلا سا ہے۔ اور ڈرائیور ایک پیر باہر نکالے اپنی نشست پر نیم دراز ہے۔ سخت تعجب ہوا کہ یہاں کے اصول اور منظم لوگ جو قاعدے قانون کے احترام کو سب سے اولین فرض سمجھتے ہیں اتنی لاپروائی کیسے برت سکتے ہیں کہ عین سڑک کی طرف کھلنے والا دروازہ کھلا چھوڑ دیا جائے۔ میں نے سوچا اس شخص کو غلطی کا احساس دلا ہی دوں۔ چناں چہ گاڑی کے شیشے پر انگلیوں کی پوروں سے کھٹکھٹاتے ہوئے میں نے کہا۔

Bitte machen Sie die Tur Zu.Dos ist haupt Strasse

Kann passieren.

(مہربانی فرما کر دروازہ بند کرلیں' یہ بیچ سڑک ہے' حادثہ ہو سکتا ہے) یہ کہتے ہوئے میں تیزی سے آگے بڑھی اور سامنے واقع ایک ویڈیو لائبریری میں داخل ہو گئی تاکہ سردی سے بچ سکوں۔ تقریباً" پندرہ منٹ کیسوں کی نظر گردانی کرنے کے بعد باہر نکلنے کی غرض سے دروازے کا رخ کیا کہ اتنے میں پولیس کے دو جوان اندر داخل ہوئے۔ میں انہیں راستہ دینے کے لیے ایک طرف کو ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ تب ہی پولیس مین نے اپنا شناختی کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں کچھ تحقیقات کرنی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے آپ تمام یہیں رک جائیں۔" اچانک میری چھٹی حس نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ میرا دھیان فوراً" اس آدمی کی طرف چلا گیا جسے ابھی ابھی میں نے گاڑی کا دروازہ بند کرنے کی ہدایت کی تھی۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ پولیس والوں نے بلند آواز میں جو کچھ کہا وہ سن کر مجھے تو جھرجھری سی آگئی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "یہاں فٹ پاتھ پر سیاہ گاڑی میں ایک آدمی کا قتل ہو گیا ہے۔ آپ میں سے کسی نے پستول کی آواز سنی ہے۔؟ وہاں کھڑے تمام لوگوں کے منہ سے ہائے وائے کی آوازیں نکلنے لگیں لیکن میری آواز تو خوف کے مارے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ یہ سوچ کر کہ جس شخص کو میں نے دروازہ بند کرنے کے لیے کہا تھا وہ دراصل ایک لاش تھی!!!

PARVEEN KAMAL C/O MUSTAFA KAMAL

POST FACH. 101208

60012, FRANK FURT, MAIN

GERMANY

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں!
(علامہ اقبال)

۱۲ ستمبر ۱۹۹۹ء تسنیم ثنا خان

تسنیم ثنا خان
کیلیفورنیا

تسنیم ثنا خان کا پیدائشی نام بھی یہی ہے اور قلمی بھی۔ ۲۷ جولائی ۱۹۶۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے بتایا "انٹر سائنس" کے بعد چھٹیوں میں معذور بچوں کے ادارے جو کہ آج بھی کراچی میں کلفٹن پر واقع ہے جانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت اس ادارے کے تحت جرمنی سے آیا ہوا ایک وفد ٹریننگ دے رہا تھا میں نے بھی اس ادارے میں شمولیت اختیار کر لی چنانچہ چھٹیاں اس طرح ٹریننگ میں گذریں اور ایک نئی دنیا کا پتہ چلا۔ لہٰذا تدریس کے شعبے میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ نفسیات خصوصاً" تعلیمی نفسیات پسندیدہ مضمون ہے۔ بی اے کے بعد ایم اے میں داخلہ لیا لیکن کراچی کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے (آج تک یہی حالات ہیں) اس کا سب سے خراب اثر درسگاہوں پر پڑ رہا تھا لہٰذا تین ماہ بعد ہی یونی ورسٹی چھوڑ دی۔ اس کے بعد ہی شادی ہو گئی اور کیلیفورنیا آ گئی۔ یہاں دوبارہ کالج میں داخلہ لیا۔ دو ننھے بچے تیمور اور نتاشہ ہیں ان کی پرورش ہے۔ گھرداری کے علاوہ مقامی اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ شوہر وسیم الرحمٰن نے کیلیفورنیا یونی ورسٹی سے بیچلرز کیا ہے بزنس کرتے ہیں اور ماسٹرز

بھی کر رہے ہیں۔"

تسنیم بتا رہی تھیں "مجھے لکھنے کا شوق اپنے گھر سے ملا۔ نانی ام سلمٰی عربی اور فارسی میں اشعار کہتی تھیں۔ والدہ محمودہ مہربانو بھی شاعرہ اور کالم نگار تھیں پاکستان کے مشہور اخبارات اور رسائل میں ان کی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ والدہ تدریس کے شعبے سے وابستہ تھیں جب کہ والد وکالت کرتے تھے۔ والد انگریزی کے بہترین مقرر تھے فلاسفی منطق اور انگریزی ادب پر انہیں عبور تھا جب کہ والدہ سے اردو کے بارے میں گفتگو ہوتی۔ ابو کی حوصلہ افزائی کے باعث اسکول کے زمانے سے اردو اور انگریزی مباحثوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ کالج میں مسلسل چار برس تک بہترین مقررہ کا ایوارڈ حاصل کیا اور اختتامی تقریب میں سال کی بہترین طالبہ کا گولڈ میڈل حاصل کیا۔ افسانہ نگاری اور کمپیئرنگ میں بھی گولڈ میڈل اور سلور میڈل لیے۔ ریڈیو میں "بزم طلبہ" کا مجھ جیسے طلبہ اور طالبات کی تربیت میں بہت ہاتھ ہے۔ قرآن فہمی اور حدیث فہمی "فرام دی کیمپس" جیسے بہترین پروگرامز کے باعث صحیح تلفظ اور اسکرپٹ لکھنا سیکھا۔ اس زمانے میں کراچی ٹی وی نے نوجوان طلبہ و طالبات کے لیے پروگرام "درخشاں" شروع کیا تھا جس میں کراچی ٹی وی نے بھی شرکت کی دعوت دی اور انٹرویو ٹیلی کاسٹ کیا۔

کالج کی زندگی میں سوشل ورک بھی کیا۔ اسٹوڈنٹس ویلفیئر آرگنائزیشن (پاکستان کی سب سے پرانی سماجی تنظیم) کے زیر اہتمام پاکستان کی تمام سماجی تنظیموں کی ورکشاپ کروائی جو کہ ٹیم ورک تھا۔ گورنر سندھ کو مدعو کیا اور طالب علموں کے لیے عملی مدد کرنے کی راہ ہموار کی۔ کالج میں Book bank قائم کیا جس میں اساتذہ اور پرنسپل محترمہ کوکب باقر حسین نے بہت مدد کی اور میرا یہ پروگرام بہت کامیاب رہا۔ اس کے تحت مستحق طالبات کی مدد کی جاتی تھی۔

امریکہ میں ۱۹۹۱ء میں "پاکستان لنک" کے نوجوانوں کے سیکشن میں انگریزی صفحات پر مجھے متعارف کرایا گیا۔ اس کے بعد "لنک" میں کبھی کبھار لکھتی رہی آج کالم "دریچہ" ہفتے وار "پاکستان لنک" کے لیے لکھتی ہوں۔ امریکہ سے شائع ہونے والے تمام اخبارات لائق تحسین ہیں کہ وہ لکھنے والے کو پلیٹ فارم مہیا کر رہے ہیں۔ افسانہ نگاری بھی کر لیتی ہوں لیکن طنز و مزاح میری پسندیدہ صنف ہے شائستہ انداز میں طنز و مزاح لکھنا میری رائے میں بہت بڑا آرٹ ہے اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی میں نظمیں بھی لکھتی ہوں۔

سوال نمبر ۲ کے جواب میں عرض ہے کہ بیسویں صدی کو میں دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہوں گی بیسویں صدی کے ادب پر بات کرنے سے پہلے انیسویں صدی کے آخر کے زمانے پر سرسری نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے اس زمانے میں انگریزی ادب سے بھی خاصا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

خصوصاً" ادب کی مختلف اصناف ' ناول ' تاریخ ' تبصرہ ' تنقید ' افسانہ ' طنزو مزاح ' ادب کے علاوہ فلسفہ اور نفسیات پر بھی کام ہوا ہے البتہ ہمارے ملک میں سائنس اور ٹکنالوجی پر خاص کام نہیں ہوا ہے۔ سوائے بم اور میزائل بنانے کے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے انشا پرداز نے "علمی نثر" تخلیق کی۔ رشید احمد صدیقی نے مزاح کے رنگ میں بات کی۔ مولانا ظفر علی خاں کا اخبار "زمیندار" صحافت اور ادارت کا اعلیٰ نمونہ ٹھرا۔ اس کے اگلے دور میں افسانہ خاصا مالا مال نظر آتا ہے۔ غلام عباس ' راجندر سنگھ بیدی جیسے نام نظر آتے ہیں۔ میری رائے میں خاصے نام ہیں جو اس صدی میں زندہ رہ جائیں گے۔

فکشن حقیقتاً" لطیف آرٹ ہے لیکن موجودہ ٹکنالوجی نے انسان کے فکشن سے محفوظ ہونے کا حق چھین لیا ہے۔ چاند کی حقیقت بتا کر فیض کے مصرعے کی خوبصورتی کم کر دی۔

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ

لیکن دوسری جانب نئی ٹکنالوجی نے نبی نوع انسان پر احسانات کیے ہیں۔ مصوری کے شعبے میں کلرز پرنٹنگ ' فوٹو کاپی خصوصاً" "لیتھو گرافی" میں نئی نئی دریافتیں سامنے آ رہی ہیں اس طرح انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا مختصر سی ہو گئی ہے اور شعرا اور ادیبوں کے لیے ایک دوسرے سے گفتگو کا موقع فراہم ہو گیا ہے خواہ آپ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوں لیکن ایک نقصان یہ ہوا کہ بچپن کی کہانیوں والی کوہ قاف کی پریوں کا تصور ختم ہو گیا۔

آپ جانتی ہیں کہ ادیب بڑا حساس ہوتا ہے اگر آپ یہ کہتی ہیں کہ وہ مادی اور نفسیاتی بحران میں مبتلا ہے تو دراصل اسے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ وہ ایک ناانصاف دنیا کا باشندہ ہے۔ وہ انسانوں سے پیار کرتا ہے لیکن دنیا میں انسانوں سے تفریق برتی جا رہی ہیں۔ نہتے انسانوں پر بمباری کی جا رہی ہے حالیہ کوسوو کے حالات ہمارے سامنے ہیں۔ آس پاس ہونے والے ان حالات سے سب سے زیادہ ادیب اور شاعر ہی متاثر ہو رہے ہیں۔ میرے یا آپ کے بنانے سے کوئی بھی نظام فکر تشکیل نہیں پائے گا جس وقت معاشرے کے پاس متوازن نظام فکر ہو گا ' امیر غریب کالے گورے ہندو عیسائی یہود و مسلمان سب کو یکساں انصاف ملے گا اس وقت ادیب خود بخود اس نفسیاتی بحران سے باہر نکل آئے گا انشاء اللہ۔

شاعری ہو یا نثر اس کے معیار کو جانچنے کے لیے ہمارے پاس کوئی مادی آلہ تو ہے نہیں ' جس طرح بیرومیٹر سے ہوا کا دباؤ یا بخار کے لیے تھرمامیٹر جانچ کا آلہ ہے۔ ادب کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ ایک عام آدمی کا ذہن یہ سوچتا ہے کہ ادب کی زندگی میں کیا ضرورت ہے۔ انسانی زندگی اور معاشرے میں ادب کی کیا اہمیت ہے ادب کی تعریف مجھ جیسے طفل مکتب کے بس کی بات نہیں ہے لیکن میری رائے میں معیاری ادب کائنات کے کل کی بات کرتا ہے۔ ادیب کی آنکھ دل اور قلم کسی سانحے یا واقعے کو الفاظ کے ذریعے قاری تک

پہنچاتے ہیں۔ ادیب بہترین عکاس کی طرح اور بہترین نباض کی طرح کائنات کی بات کرتا ہے۔ دراصل وہ معیاری ادب تخلیق کر رہا ہے۔ فرض کریں جیسے آج میں نے انٹرنیٹ پر یہ خبر پڑھی کی بھارت نے اگنی میزائل کا تجربہ کیا ہے۔ پھر پتہ چلا کہ پاکستان نے بھی غوری II کا کامیاب تجربہ کر لیا۔ جب یہ اگنی میزائل اور غوری II تخلیق ہوا یہ سراسر سائنس کا موضوع تھا لیکن خدا نہ کرے اگر ان سے کسی انسان کی زندگی کو نقصان پہنچا تو یہ سائنس کا نہیں ادب کا موضوع ہوگا۔ جب کبھی بھی انسانی جان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے ادیب وہاں خاموش نہیں رہتا وہ اپنے قلم سے جہاد کرتا ہے چنانچہ انسانیت سے بلا تفریق محبت کا درس دینے والا میری رائے میں معیاری ادب ہے۔"

تسنیم نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "نثر میں ہندوپاک میں تو خاصا کام ہو رہا ہے بد قسمتی سے ہمیں یہاں کتابیں دستیاب نہیں۔ آج کل خصوصاً" کینیڈا میں نثر پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ البتہ شعراء کی خاصی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اور تنظیمیں آئے دن بڑے بڑے مشاعرے منعقد کروا رہی ہیں جب کہ نثری محفلیں منعقد کروانے کا کہیں ذکر تک نظر نہیں آتا۔ نثر کے ساتھ خود اس کے اپنے مسائل ہیں مثلاً" ایک مشاعرے میں یا شعری نشست میں دس شعراء تو کلام پڑھ سکتے ہیں مگر دس نثر نگاروں کی تحریریں نہیں سنی جا سکتیں۔ کوشش ہو تو رہی ہے کہ نثری محفلیں قائم ہوں اور مختصر نثر لکھی جائے۔

آپ نے ٹی وی پر ایک پرانا پروگرام I Dreamed for Jenny ضرور دیکھا ہوگا اس پروگرام کے مصنف اور مقبول ناول نگار سڈنی شیلڈن نے اپنی ادیبانہ زندگی کا آغاز ٹی وی کے اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے کیا تھا۔ ساری دنیا میں صرف ایک ماہ کے اندر اس کے ناول کی ایک کروڑ کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ کسی نے اس سے سوال کیا۔ "بعض ادیب کہانی کی شروعات تو اچھی کرتے ہیں لیکن تھوڑی دیر میں ہی کہانی اپنا تاثر دلچسپی کم کر دیتی ہے تمہارے ناولز کیوں اتنے دلچسپ ہوتے ہیں؟" اس نے جواب دیا۔ "میرے لیے بہت ضروری ہے کہ میرا قاری میرے ساتھ سفر کرے۔ کہانی میں Momentom مومینٹم کہیں بھی ضائع نہ ہو۔ ہر باب کے آخری صفحے پر ایسی بات ضرور ہو کہ قاری تجسس سے صفحہ پلٹنے پر مجبور ہو جائے۔"

زبان ابلاغ کا بہترین ذریعہ ہے اردو میں انگریزی کے الفاظ اس لیے بھی آسانی سے شامل ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ بیشتر پاکستانی ترک وطن کر کے یورپ و امریکہ میں آباد ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارا ادیب مغربی ادب پر اگر عبور نہ رکھے تو کم از کم مغربی ادب سے واقف ضرور ہو۔ انگریزی زبان کا جاننا ضروری ہے یہ میں اس وقت کہتی تھی جب پاکستان میں طالبہ تھی یہاں انگریزی اوڑھنا بچھونا ہے۔ انگریزی کی حیثیت یوں بھی اہم ہے کیوں کہ

علوم کا بیش بہا خزانہ انگریزی میں محفوظ ہے۔ اردو کا علم اپنی جگہ جب کہ انگریزی کا علم اپنی جگہ ہے۔ دونوں زبانوں کو جاننا ضروری ہے۔ مگر اردو کی بقا کے لیے کچھ اور ہی اقدامات کی ضرورت ہے۔ بچوں کو گھر میں اردو سکھائیں اردو کی تعلیم عام کی جائے۔ اسکولوں میں اختیاری زبان کے طور پر اسے رائج کرنے میں محنت کی جائے۔

امی کا انتقال میری زندگی کا سب سے تلخ واقعہ ہے۔

اردو ادب میں تنقید کا آغاز ۱۸۹۳ء میں "مقدمہ شعرو شاعری" سے ہوا۔ یہ اردو کی پہلی تنقیدی کتاب مانی جاتی ہے۔ پروفیسر ممتاز حسین کہتے ہیں "میری تنقید زیادہ تر ترقی پسند نقادوں پر ہوتی ہے۔" لیکن سچ یہ ہے کہ انہوں نے تنقید کے نئے نئے پہلو نکالے۔ تنقید دراصل کسی حد تک تخلیق بھی ہے۔ مغربی ادب میں تنقید کو تخلیق مانا جاتا ہے جب کہ ہمارے یہاں برصغیر پاک و ہند میں لوگ تنقید کو فکر سے مامور کرتے ہیں۔ سارتر کہتا ہے "لکھنے والا تخلیق کرتا ہے دکھائی نہیں دیتا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی مضامین ادب میں اہمیت رکھتے ہیں لیکن آج ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ تنقید کے اصول بدلتے جا رہے ہیں۔ تراجم کا بھی یہی حال ہے۔ ماضی مین علوم و فنون کے بیش بہار تراجم کیے گئے لیکن اب اس کی رفتار کم ہے۔
علاقائی ادب پر خصوصاً" پشتو ادب پر اتنا کام نہیں ہو رہا ہے اور بلوچی ادب بھی ہماری توجہ کا طالب ہے۔ سندھی ادب اور پنجابی ادب پر کام ہو رہا ہے۔ لیکن اس کی رفتار اور تعداد میں اضافہ ہونا چاہئے۔ خوش حال خان خٹک پشتو کے عظیم شاعر ہیں۔ اسی طرح میں نے اسکول میں سندھی پڑھی جس کے باعث کالج میں جا کر اپنی شفیق سندھی ٹیچر کی مدد کے باعث "شاہ جو رسالو" سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ شاہ عبداللطیف کی شاعری آفاقی شاعری ہے خدا کی وحدانیت اور عظمت سے بھرپور۔ خصوصاً" وہ کہتے ہیں۔

"سائیم سدائیں کریں متھی سندھ سوکار دوست مٹھا دلدار عالم سب آباد کریں۔"

پنجاب میں عظیم شعراء گزرے ہیں خاص طور پر پیٹوں اور ماہیوں کا اپنا حسن ہے۔

پنجابی میں بھی ادیبوں اور شعرا کی خاصی تعداد نظر آتی ہے پنجابی کا بڑا خوبصورت ایک مصرعہ ہے۔

میں عاشق سورج چن دا کرناں دا رشنائی دا

ہم سب کو خصوصاً" پاکستان کے تمام طالب علموں کو یہ زبانیں سکھائی جائیں تاکہ یہ احساس ہمیشہ غالب رہے کہ "ہم سب پہلے پاکستانی ہیں بعد میں بھی پاکستانی ہیں اور ہمیشہ پاکستانی ہیں۔"

انشاء اللہ

TASNEEM SANA KHAN P.O.BOX 1225

RANCHO CUCAMANGA CA 91729, U.S.A

تمھیں میں نے خط کے جواب میں لکھا "اب میرے اور قبرستان کے درمیان صرف دس گز کا فاصلہ رہ گیا ہے۔"

تصدق سہیل

تصدق سہیل

لندن

وہ ایک بہت خوبصورت دوپہر تھی۔ باہر دھوپ نکلی تھی۔ اس کی کھڑکیوں کے سامنے چار پانچ سو سال پرانے قبرستاں کے درختوں میں دور دراز ملکوں سے آئے ہوئے رنگ برنگے پرندے چہچہا رہے تھے۔ جب اس کی نظر کھڑکی کے شیشے کے باہر بیٹھی ہوئی مکھی پر پڑی۔ ارے... "اس نے حیرت سے کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے کہا تم... یہاں کہاں... اس منحوس سرد جزیرے میں تم کیوں چلی آئیں..." اس نے درد بھری لرزتی آواز میں کہا۔ "پاکستان سے آئی ہو... پی آئی اے میں بیٹھ کر آگئی ہو گی... تت تت تت... تمہیں یہاں کیا ملے گا؟... یہ کمبخت لوگ تو اپنی گندگی کو بھی سنبھال کر نت نئے تھیلوں میں ڈال کر بڑے بڑے گند کے ڈبوں میں رکھتے ہیں۔ وہ سڑکوں کے آر پار گندگی کے ڈھیر... تمہیں یہاں کہاں ملیں گے؟... مچھروں کی اڑتی ہوئی ٹولیوں کی آواز اور مکھیوں کے بھنبھنانے کی آوازیں... تم ان کو سننے کو ترس جاؤ گی۔ آہ وہاں آدمی تنہا ہوتے ہوئے بھی کبھی تنہا نہیں ہوتا تھا۔ کھٹمل کاٹتے تھے مگر آدمی اکیلا تو نہیں سوتا تھا۔

اور پھر اس نے آہستہ سے کھڑکی کھول دی تاکہ مکھی اندر آجائے۔

"آؤ اندر، آجاؤ... باہر سردی لگ جائے گی تمہیں۔"

مکھی کمرے کے اندر آ کر ادھر ادھر اڑنے لگی۔ لال میاں نے جلدی سے شہد روئی پر لگا کر ایک طرف رکھ دیا۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ حلوے انڈے میں رچی لتھڑی ڈاڑھیاں یہاں کہاں ملیں گی" وہ اپنی دھن میں بولتا گیا۔ جب وہ شہد پر نہ بیٹھی تو اس نے دوسری چیزیں ادھر ادھر رکھنی شروع کر دیں۔ ہفتے کے اندر اندر کمرے سے سڑی چیزوں کی بدبو آنے لگی تھی۔ مگر وہ خوش تھا کہ مکھی کو اب وہ ماحول مل گیا تھا جس میں وہ رہنے کی عادی تھی۔

ایک دن ایک شام دروازے پر دستک ہوئی۔ لال میاں نے دروازہ کھولا تو باہر وارڈن کونسل کی انسپکٹر لڑکی کو Sue کو ساتھ کھڑے پایا۔ وہ سال میں دو ایک مرتبہ فلیٹوں کو چیک کرنے آیا کرتی تھی۔

"ہیلو تم کیسے ہو..." اس نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ وہ جواب دے۔ اپنے چہرے کو اوپر اور ناک چڑھا کر جیسے سونگھنے لگی۔

یہ بدبو... کہاں سے آ رہی ہے...؟ وہ اسے ہاتھ سے پرے کرتی ہوئی وارڈن سمیت اندر تک چلی آئی۔

"کون سی بدبو...؟ وہ بولا "مجھے تو کوئی بدبو نہیں آ رہی"

اب وہ اندر آ کر تیوریاں چڑھا کر ادھر ادھر نفرت سے دیکھ رہی تھی کہ وارڈن نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار سے الماری پر بیٹھی ہوئی مکھی کو مار گرایا۔

تمہیں اس پر وہ پاگلوں کی طرح روتے ہوئے، وارڈن سے گتھم گتھا ہو گیا۔

"وہ میری مکھی تھی۔" وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔

انسپکٹر نے سر ہلاتے ہوئے وارڈن کی طرف ایسے دیکھا: جیسے کہہ رہی ہو اب یہ یہاں رہنے کی حد سے گزر چکا ہے۔ دوسری صبح اس کے چیخنے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پاگل خانے کے آدمیوں نے اسے اس کے فلیٹ سے لا کر ایک بڑی بڑی مضبوط سلاخوں والے کمرے میں بند کر دیا۔

ایک مکھی کو کمرے میں رکھنے کی اتنی بڑی سزا! اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ مگر لوگ خود تو اتنے اتنے بڑے کتے کمروں میں رکھتے ہیں۔ اگر میں نے ذرا سی مکھی رکھ لی تو کیا ہوا۔ اور پھر وہ زور زور سے اپنا سر سلاخوں سے ٹکرانے لگا۔"

یہ اقتباس تصدق سہیل کے افسانے "مکھی" سے ہے۔ تصدق حسین بھی اسی بے گھری اور غریب الوطنی کا شکار رہے ہیں اور ان مشاہدات سے گزر رہے ہیں جس نے بیرون وطن بسنے والوں سے تاثر سے بھرپور کہانیاں لکھوائیں۔

میرے سوال پر سہیل اپنے بارے میں بتا رہے تھے "میرا نام تصدق رسول ہے اور قلمی نام، تصدق سہیل۔ پیدائش جالندھر بھارت کی ہے۔ اصلی تاریخ پیدائش ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء ہے اور باپ کی دو سال بڑھا کر لکھائی ہوئی عمر کے مطابق ۱۹۳۵ء ہے جو آرٹ کی کتابوں اور پاسپورٹ پر درج ہے۔

میں بنیادی طور پر آرٹسٹ اور افسانہ نگار ہوں۔ بی اے کے تیسرے سال تک تعلیم حاصل کی پھر لندن کے مختلف مصوری کے کالجوں میں پندرہ سال تک شام کو مصوری کی تعلیم حاصل کی۔ نو برس کی عمر میں بچوں کی کہانیوں سے لکھنے کی ابتداء کی۔ دلی کے نونہال اور دوسرے رسالوں میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھیں۔ پھر فلمی رسالوں میں بے شمار رومانٹک اور بھوت پریتوں کی ڈراؤنی اوٹ پٹانگ کہانیاں لکھیں۔ غلطی سے ایک دفعہ "انجمن ترقی پسند مصنّفین" کی میٹنگ میں کہانی پڑھنے جا بیٹھا تو انہوں نے میری کہانی کے پرخچے اڑا دیے۔ میں جوان اور سیدھا سیدھا بے وقوف لڑکا تھا غصے میں بھرا وہاں سے گھر آیا اور پھر سوچنے لگا کیا وہ سچ کہتے ہیں؟

دو دن کے بعد احساس ہوا کہ وہ ٹھیک تھے میری کہانیاں بالکل بیکار تھیں۔ میں نے لکھنا چھوڑ دیا اور ان کی بزم میں باقاعدگی سے جانے لگا۔ ان سے سیکھنے لگا کہ ادبی کہانیاں کیسے لکھی جاتی ہیں ان کے ساتھ چائے خانوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا۔ ایک دو سال کے بعد میری نئی کہانیاں ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ یہ کہانیاں ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۶۰ء میں حلقہ ارباب ذوق کا جوائنٹ سیکرٹری اور رائٹرز گلڈ کا بانی ممبر بنا۔ ۱۹۶۱ء کے آغاز میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر انگلستان بھاگ آیا۔ انگلستان آنے کی دو تین وجوہ تھیں۔

ایک تو یہ پتہ چلانا کہ انگریزوں میں ایسی کون سی خوبی تھی جو وہ ہندوستان جیسے ملک پر حکومت کر گئے۔ اور پھر اگر وہ میرے ملک میں رہے ہیں تو میرا فرض تھا کہ میں بھی ان کے ملک میں جا کر رہوں۔

دوسری وجہ باہر کے ملک کے ماحول کے مطالعہ سے نئی نئی کہانیاں لکھنے کا خیال تھا اور تیسری وجہ (جو میرے دشمنوں کے خیال میں سب سے اہم وجہ تھی) یورپ میں نت نئی لڑکیوں سے ملنے کا شوق۔

ان دنوں یہاں بہت تعصب پایا جاتا تھا اس لیے مجھے مزدوری کرنا پڑی۔ ہوٹلوں میں برتن صاف کرنے پڑے۔ سپر مارکیٹ میں شیلف بھرنے اور بسوں میں ٹکٹ بانٹنے پڑے۔ پوسٹ آفس میں کام کرنا پڑا اور نہ جانے کیا کیا... پاکستان میں اچھی خاصی آرام کی زندگی گزارتے گزارتے میں یہاں آ کر ایک دم مزدور بن گیا تھا۔ یہ سارے کام مجھے اس قدر تھکا دیتے کہ گھر آ کر افسانے تو کیا خط لکھنے تک کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ یوں میں اردو زبان سے اردو بولنے والوں سے اور اپنے ماحول سے کٹ گیا۔ پھر پینتیس سال تک میں نے اردو کی کوئی کتاب پڑھی نہ کچھ

لکھا۔ لوگ مجھے بھول گئے۔ اب مجھے مصور کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔
سات سال قبل جب لندن سے معین الدین شاہ صاحب نے "اردو ادیب" نامی رسالہ نکالا تو میں اس کا سرورق بنانے لگا۔ پڑھنے والوں کو میری یاد آگئی۔
شاہ صاحب کے پاس خط آنے لگے۔ شاہ صاحب نے کہا "اور نہیں تو ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ایک افسانہ تو لکھ ہی دو۔" مقصد یہ تھا کہ نیا افسانہ لوگوں کو پسند نہیں آئے گا اور بات رفع دفع ہو جائے گی۔ اب چوں کہ مجھے زبان پر بھی عبور نہ تھا چناں چہ میں نے سیدھی سادھی زبان میں ایک چھوٹی سی کہانی لکھ دی اور مجھے بے حد حیرت ہوئی کہ لوگوں نے اسے پہلے سے بھی زیادہ پسند کیا۔ چناں چہ میں پھر کہانیاں لکھنے لگا ایک کتاب "تنہائی کا سفر" شائع ہو چکی ہے ایک اور اگلے سال کے درمیان شائع ہو گی اس کے بعد میرا زندگی سے متعلق ناول "جلاوطن" شائع ہوگا۔ چوں کہ مجھے آج کل مصوری کی وجہ سے لکھنے کی بہت کم فرصت ملتی ہے اس لیے اس کے بعد میں لکھ سکوں گا یا نہیں مجھے کچھ معلوم نہیں۔
اب میں آپ کے سوال نمبر ۲ کے جواب میں کہوں گا کہ وہ کہانیاں جن میں لوگوں کا درد، دکھ سکھ اور خوشی پائی جاتی ہے یاد رہے گی اور جنھوں نے سچے دل سے ان کے درد کو محسوس کر کے لکھا ہے۔ جن کی کہانیاں پڑھتے ہوئے ہماری آنکھیں بھر آتی ہیں یا ہم خوشی سے کھلکھلا اٹھتے ہیں۔ ان کا ادب میں نام رہ جائے گا۔ لیکن جنھوں نے اپنی شہرت اور پیسے کے لیے لکھا ہے ان کا ادب انہی کے ساتھ جائے گا۔ بلکہ ان کے جیتے جی لوگ بھول جائیں گے۔ نام گنوانا مناسب نہیں میں چند نام لکھ کر بیشمار لوگوں کو رد نہیں کر سکتا۔ اور پھر اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔ میں کیا اور میری پسند کیا۔
میرے خیال میں اردو ادب میں ہی کم ناول لکھے گئے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ لوگوں کے پاس وقت کی کمی اور اپنے سیٹھ پبلشروں کا ادیبوں کو ان کے لکھنے کا معاوضہ نہ دینا ہے۔ یہ نہیں کہ اب ہمارے پبلشرز حضرات غریب ہیں یا کتابیں فروخت نہیں ہو رہی ہیں۔ آج کل یہ کتابیں دنیا بھر میں جا رہی ہیں مگر جاہل لوگ جو یہ دھندا کر رہے ہیں ادیب کو آج دو کاپیاں دے کر ٹرخا دیتے ہیں۔ بلکہ نناوے فی صد سے تو الٹے پیسے لے کر کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ لندن، امریکہ اور دوسرے ملکوں میں جو بے شمار شاعری کی کتابیں چھپ رہی ہیں وہ اسی طرح سے شائع ہو رہی ہیں۔
اچھا ادب ایسے ہی حالات میں پیدا ہوتا ہے جب ادیب بحران کا شکار ہوگا۔ ادیب کو کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اپنی راہیں آپ بناتا ہے اور میرے خیال میں معیاری ادب کا پیمانہ ہے۔ "ادب برائے ادب"
خاتون! عرض ہے کہ نثر اس لیے کم لکھی جا رہی ہے کہ اسے لکھنے کے لیے باقاعدہ ایک جگہ

بیٹھنا پڑتا ہے۔ اسے لکھنے کے لیے وقت کی ضرورت ہے۔ Imagination کی ضرورت ہے اور شاعری زیادہ اس لیے ہو رہی ہے کہ یہ مرد اور زیادہ تر عورتیں جو تک بندی کر رہی ہیں وہ ہنڈیا پکاتے پکاتے گنگناتی رہتی ہیں اور پھر ہر چپاتی کے ساتھ ایک ایک شعر بھی کہتی رہتی ہیں۔ پیسے خاوند دے دیتا ہے کتاب ان کی چھپ جاتی ہے۔ بھلا پاکستان کے کسی پبلشر کا ہو جاتا ہے۔ ہر کوئی خوش۔۔ رونمائی کرائی اور کتابیں مفت بانٹ دیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

میری رائے میں انگریزی زبان کے بڑے ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انہیں جو نیا لفظ جہاں کہیں سے ملتا ہے اپنا لیتے ہیں سموسہ، چکن، قورمہ، ونڈالو وغیرہ۔ وہ سموسے کو ویجی ٹیبل پیٹیز (Vegetable Patties) بھی کہہ سکتے تھے۔

انگریزی کے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کا اردو میں ترجمہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ان کے لیے خاص الفاظ ہیں جو ہم استعمال کر سکیں۔ میں ایک کہانی "One night stand" پر لکھنا چاہتا ہوں بے شمار درخت اور پودے جو وہاں نہیں ہوتے ان کے نام انگریزی میں ہی لکھے جائیں گے لیکن جہاں ترجمہ ہو سکتا ہے ہم بڑی خوشی محسوس کریں گے۔ جیسے Nudist Beach کا ترجمہ میں نے "ساحل عریانیت" کیا۔ جہاں نہیں ہو سکے گا مجھے افسوس ہے میں انگریزی لفظ لکھتا رہوں گا چاہے کوئی پسند کرے یا نہ کرے۔ ویسے بھی اب پنجاب کے اردو لکھنے والوں کی کہانیوں میں آدھے سے زیادہ پنجابی کے الفاظ گھس آئے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کی اردو میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار دیکھنے میں آئی ہے اور یہی حال یہاں ہے کہ انگلستان کے لکھنے والوں کی کہانیوں میں انگریزی کے الفاظ ضرور ہی در آتے ہیں۔

ایک صحت مند زبان کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب سے استفادہ کرتی ہوئی آگے بڑھے۔ اور ان چند "طالبان" کی باتوں پر توجہ دی تو اردو زبان کا وہی حال ہوگا جو افغانستان کا ہوا۔ خدارا اردو زبان کو برقعہ نہ پہنائیں اس میں اس کا دم گھٹ جائے گا زبان کو پھلنے پھولنے کے لیے کھلی ہوا اور آزادی کی ضرورت ہے اسے آزاد ہی رہنے دیں۔

آئیے اب آپ کو اپنی زندگی کے مزیدار واقعات سناؤں۔ چند سالوں کی بات ہے۔ ایک ڈاک خانے میں خط علیحدہ کرنے کا کام کر رہا تھا مصوری کا کام ابھی چلا نہیں تھا اس لیے میں اونے پونے اپنے دوست یاروں کے ہاتھ تصویریں بیچ دیتا اور جو مل جاتا خوشی سے لے لیتا۔ ایک سکھ سردار (مجھے سکھوں سے بہت محبت ہے اس لیے اسے اس واقعے پر برا نہیں منانا چاہیے میں امرتسر میں پلا ہوں) جو میرے ساتھ Sorting کا کام کرتا تھا اسے ایک تصویر پسند آگئی میں نے کہا بیس پونڈ کی ہے مگر وہ مجھے گھٹا کر دس پونڈ تک لے آیا۔ مجھے پیسوں کی سخت ضرورت تھی میں مان گیا۔ مگر تصویر پر اس نے میرے دستخط دیکھے تو یکدم ناراضگی سے اچھل

پڑا۔ یہ کیا ہے بھئی۔ اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم نے اپنا نام کیوں لکھ دیا۔ تمہیں پیسے دے دیے اب تصویر میری ہے یا تمہاری۔ اگر لکھنا ہی تھا تو میرا نام لکھتے مٹا کر لاؤ اس کو۔" میں نے سوچا بحث بیکار ہوگی اسے گھر لے گیا اور اپنا نام مٹا کر اس کا نام لکھ دیا ایک بار یوں ہوا کہ میرے ایک رشتے دار جو یکدم بزنس کرتے ہوئے امیر ہو گئے تھے اور جنھوں نے اب چھوٹا مکان چھوڑ کر لاہور میں ایک بہت بڑا بنگلہ بنا لیا تھا دنیا بھر کی سیر کرتے کراتے مجھے ملنے آ پہنچے تو جاتے وقت میں نے انہیں خوش کرنے کے لیے ایک تصویر پیش کر دی سوچا تھا وہ خوش ہوں گے مگر جب ان کے چہرے پر خوشی کے آثار نظر نہ آئے تو میں نے پوچھا "آپ کو پسند نہیں آئی؟"

نہیں یہ بات نہیں" وہ منمنا کر بولے۔ تصویر تو بہت خوبصورت ہے اگر آپ اس پر اپنے نام کے بجائے Made in England لکھ دیں تو بات بن جائے۔" (لوگو کیا میں اپنا سر نہ پیٹ لیتا)

آخری سوال کے جواب میں تصدق سہیل نے کہا "اردو ادب اور آرٹ میں تنقید کرنا۔ دوسروں سے خواہ مخواہ دشمنی مول لینے کے مترادف ہے۔ بڑے سے بڑے لکھنے والے اور آرٹسٹ جان کے دشمن ہو جاتے ہیں اس لیے وہ تعریفی تنقید جو ہوتی ہے وہ بیکار ہوتی ہے۔ جس سے کسی کو فائدہ نہیں ہوتا۔ میرے ایک دوست تنقید نگار ڈاکٹر نقوی نے اپنی کتاب میں جب چند آرٹسٹوں پر کھل کر تنقید کی تو ان پر مقدمے چلانے کی دھمکیاں دی گئیں۔ بہت سوں نے ان سے ملنا ملانا بند کر دیا ہے حالاں کہ وہی باتیں جو انھوں نے اپنی کتاب میں لکھی ہیں سب لوگ وہی باتیں ان آرٹسٹوں کے بارے میں برسوں سے ان کے پیٹھ پیچھے کہتے آئے ہیں۔ تو ایسے ماحول میں کوئی شریف آدمی کیسے نقاد بننے کی کوشش کرے گا؟

انگریزی اور باہر سے آئی ہوئی کتابوں کی قیمتیں اس قدر زیادہ ہیں کہ ادبی لوگ وہ قیمتیں ادا ہی نہیں کر سکتے۔ یہاں یورپ میں ہم دو ڈھائی پونڈ کا رسالہ ٹیوب میں پڑھ کر پھینک دیتے ہیں مگر وہی رسالہ اگر پاکستان سے خریدا جائے تو اس کی قیمت چوگنی ادا کرنی پڑتی ہے۔

ترجمے ہو رہے ہیں اتنے نہیں جتنے ہونا چاہیں۔ علاقائی زبانوں کے بارے میں تو اچھا خاصا کام ہو رہا ہے اس کے بارے میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔"

MR.TASSADUQ SHOAIL

12 RECTORY CLOSE LONDON N3 ITS, U.K

نہیں اقبال نا امید اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

تقی عابدی
کینیڈا

تحقیق و تنقید بڑی پتہ ماری کا کام ہے اور اس کی کسوٹی پر چند ہی لوگ پورے اترتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی بات کی سند حاصل کرنے کے لئے بعض اوقات بہت وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ یہ "کاتا اور لے دوڑی" والا کام نہیں۔ ایک محقق کا کام اور منصب لکھتے رہنا ہے۔ وہ اگر دنیا داری اور پی آر (P.R) کے چکر میں پڑ جائے تو اس کا تحقیقی کام یقیناً متاثر ہوگا۔ تصویریں چھپوانے اور تقریبات منعقد کروانے والے لوگ تعلقات عامہ کے چکر میں خود کو ضائع کر دیتے ہیں۔ مگر وہ جو خاموشی سے اپنے گوشے میں تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے ہیں وہ بلاشبہ قابل تحسین ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا شمار بھی انہی لوگوں میں کیا جا سکتا ہے۔ وہ محفل آرائی کے قائل نہیں۔ اب تک انہوں نے ڈھیروں مضامین لکھے ہیں جو اخبارات کے ادبی صفحات اور جریدوں میں شائع ہوتے ہیں اور وہیں ڈاکٹر تقی عابدی سے ملاقات ہو جاتی ہے محفلوں میں انہیں کم کم ہی دیکھا گیا ہے۔

مصروف بست ہیں۔ طب کے پیشے سے وابستہ ہیں مگر نہایت سلیقے سے زندگی گذارنے کے قائل ہیں اور ہر کام وقت پر کرنے کے اصول پر گامزن...

میرا سوالنامہ ملتے ہی ایک ہی وقت میں تمام مطلوبہ مواد انہوں نے فراہم کر دیا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی پیدائش تو دہلی کی ہے لیکن والد مرحوم حیدر آباد دکن ہائیکورٹ میں جج تھے اس لئے ان کا قیام ۲۴ سال تک حیدر آباد میں رہا۔ مارچ ۱۹۵۲ء ان کا سن پیدائش ہے۔ والدین نے نام سید تقی حسن عابدی رکھا انہوں نے قلمی نام سید تقی عابدی اختیار کیا۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لی۔ گلاسگو انگلینڈ سے ایم ایس کیا اور نیویارک امریکہ سے ایف سی اے پی کی سند حاصل کی۔ ملازمت کے سلسلے میں ایران، انگلستان، امریکہ میں رہے اور اب کینیڈا میں پاتھالوجی ڈپارٹمنٹ میں بحیثیت ایسو سی ایٹیڈ پروفیسر مشغول کار ہیں۔

ان کی تالیفات میں کتاب شہید (۱۹۸۴ء) کتاب علوم شاعری (۱۹۹۸ء) نقد سخن (۱۹۹۹ء) جوش مودت (نعت و منقبت کا شعری مجموعہ) اور گلشن رویا (مجموعہ کلام) شامل ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی کو شاعری کے علاوہ ادبی تحقیق، تنقید اور تاریخ سے خاص لگاؤ رہا۔ فارسی ادب و شعران کی طبع فکر کا موضوع خاص ہے۔ علامہ اقبال کے فارسی کلام پر ریویو اور ان کے اردو کلام سے تسلسل ان کا عملی پروجیکٹ ہے۔ "سلام" ایک مستقل صنف شاعری پر چند سال سے تحقیقی کام کر رہے ہیں چنانچہ کئی ہزار سلاموں کی جمع آوری ہو چکی ہے جسے انشاء اللہ جمع بندی کر کے تالیف کریں گے۔

کہتے ہیں "شاعری اور نثر نگاری میرے تخلیقی افکار ہیں جو میرے ذہن کی پیداوار ہیں اور یہی پیداوار میری شناخت تصور کی جا سکتی ہے۔ تنقید اور تحقیق میری محنت اور کوشش کے میدان ہیں چنانچہ اس میدان کو میں کبھی رزم بناتا ہوں اور اس میں کبھی بزم سجاتا ہوں۔ منقبت اور نظمیں میری طبع کی جولان گاہ تصور کی جا سکتی ہیں۔ امریکہ میں اردو کی بقا کے لیے اطمینان بخش کام نہیں ہو رہا ہے۔ آج کل شاعری ادب برائے ادب کے لیے نہیں ادب برائے ہدف کے لئے ہوتی ہے۔ آج کل شاعری میں سادہ زبان اچھوتے خیالات اور غربی افکار کی چھاپ نمایاں ہے۔ موجودہ جدت فکر میں اگر معنی آفرینی اور بلند خیالی ہو تو قبول اور لائق تحسین ہے۔

مشاعرے ادب و شاعری کا مدرسہ ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ لیکن مشاعروں سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ان کا معیار دن بدن گرتا جا رہا ہے۔ ان کی ایک غزل سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جو فرق ہے ملا سے مجاہد کی اذاں کا
اس فرق کی تقدیس زمانے کو دکھا دو

بھٹکے ہوئے منزل پہ پہنچ جائیں گے خود ہی
رستوں سے اگر راہنماؤں کو ہٹا دو
دھندلانے لگی انجمن حرف و حکایت
پھر علم کے خاموش چراغوں کو جلا دو
لوگوں میں فقط عیب نظر آتے ہیں جس کو
اس کو بھی کبھی آئینہ خانے میں بٹھا دو

ڈاکٹر تقی عابدی کہتے ہیں جس طرح سے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے شعرا اور ادیبوں کی خوشبو سے چمنستان اردو ابھی تک مہک رہا ہے اسی طرح بیسویں صدی کے ادیبوں سے گلشن اردو کی رونق باقی رہے گی۔ اردو ادب کے دامن میں ایسے نامور ادیب' محقق اور نقاد موجود ہیں جن کو نظرانداز کرنا اردو کے ساتھ ناانصافی تصور کی جائے گی' زمانے کی سیاست نے بعض کو جلی اور بعض کو خفی کر دیا ہے لیکن ادبیات کا طالب علم ان دونوں گروہوں سے واقف ہے۔ یہ ادیب صرف نثر کے خانوں میں جاگزین نہ تھے بلکہ میدان سخن کے شہسوار اور بحر تنقید کے شناور بھی تھے۔ الطاف حسین حالی' شبلی نعمانی' امجد علی اشہری' احسن لکھنوی' امیر احمد علوی' شاد عظیم آبادی' مولوی عبدالحق' پروفیسر مسعود حسن ادیب' مولانا حامد حسن قادری' نیاز فتح پوری' جوش ملیح آبادی' حسرت موہانی' ڈاکٹر گیان چند' ڈاکٹر فرمان فتح پوری' ڈاکٹر ممتاز حسین' ڈاکٹر وزیر آغا' پروفیسر آل احمد سرور' جناب مشفق خواجہ' خواجہ احمد عباس' جناب ضمیر جعفری' ڈاکٹر اکبر حیدری' جناب گوپی چند نارنگ' جناب جگن ناتھ آزاد' جناب ڈاکٹر جمیل جالبی' امجد اسلام امجد' احمد ندیم قاسمی' شان الحق حقی اور کئی دیگر مشہور و معروف اور گوشہ گیر ادیب اردو اب کے گیسوئے پریشان کو سنوارنے میں ساری عمر گذار چکے ہیں۔"

کہتے ہیں "فکشن اگرچہ کہنہ شراب ہے لیکن گذشتہ چار پانچ دہائیوں میں نئے ساغروں میں پیش کی گئی ہے چنانچہ لوگوں کی نظریں صرف ساغر پر جمی رہیں لیکن جس کسی نے بھی اس کو پیا اس کو وہی قدیم مستی یاد آ گئی۔ لہٰذا جدیدیت نے صرف فکشن کے جامے کو بدلا لیکن اس کا پیکر وہی رہا اس لیے مجروح ہونے کا سوال شاید پیدا ہی نہ ہو۔"

ان کی رائے میں گذشتہ سو سال میں انیسویں اور اٹھارویں صدی کی نسبت اردو ادب میں زیادہ ناول لکھے گئے اگر بہ تحقیق جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو زبان میں دوسری مشہور زبانوں کے مقابل ناول بہت کم ہیں جس کی خاص وجہ اردو ماحول کے ذہن کی پرورش اور اردو ادب پر شاعری کا غلبہ ہے۔ تیسری وجہ' اردو ادب کے عظیم نثر نگاروں نے ناول کو اپنے قلم کا میدان بنانا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ عوام کا ذوق اور شوق برصغیر کی سیاسی' سماجی' اقتصادی اور مذہبی پابندیوں کا شکار ہو چکا تھا۔

انہیں اتفاق ہے کہ ادیب انسان ہونے کے ناتے مادی' روحانی' نفسیاتی اور ذہنی کشمکشوں میں گھرا رہتا ہے یونانی ادبیات سے لے کر آج تک ہر زبان اور ہر دور اور ہر مقام کے ادیب کو ان طوفانوں سے گذرنا پڑا چنانچہ اردو ادب کا ادیب بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ ادب کے متنوع معنی بہتر زندگی گذارنے کے بھی ہیں اور ادیب اسی نمونہ زندگی کی عکاسی کرتا ہے چنانچہ وہ کھتری کی داستانیں ہوں کہ انشا کی "دریائے لطافت" یا جوش کی "یادوں کی برات" سب ایک ہی راہ پر گامزن ہیں' فرق اتنا ہے کہ سواریاں جدا ہیں' سوار بدلے ہوئے ہیں اگرچہ راستہ اور منزل وہی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کے خیال میں نثر بھی شعر کی طرح تخلیقی ادب ہے۔ اردو ادب میں نثر حدوداً" ستائیس (۲۷) قسم کی ہے۔ کسی زمانے میں نثر مرصع اور رنگین شاعرانہ لکھی جاتی تھی لیکن آج کل عموماً" سلیس دقیق اور منشیانہ نثر کا رواج ہے۔ نثر بھی شعر کی طرح ادبی پیمانے رکھتی ہے۔ جس کو "علم بیان" کہتے ہیں اور علم بیان کا بیان اس مقام پر ممکن نہیں ہے۔

کہتے ہیں "یہ درست ہے کہ ہمارا ذوق و شوق شعری' شاعری بن گیا ہے۔ شعر تک بندی مہمل اور بغیر مطالعے اور علم کے بھی کیے جا سکتے ہیں۔ جسے شاعری کے فنکاروں سے مرمت کروا کر ٹھیک کر لیا جاتا ہے اور انہیں کتاب کی شکل دے کر اس کی رونمائی اور جلوہ نمائی کی جاتی ہے لیکن یہ سہولت نثر میں میسر نہیں ہے۔ نثر میں' اگر صحیح ادب پر قدرت حاصل ہو تب ہی سطر آگے بڑھے گی ورنہ یہ وہ میدان نہیں جس میں ہر شخص اپنا گھوڑا دوڑا دے۔ علامہ اقبال نے خواجہ حسن نظامی کی نثر کے بارے میں کہا تھا "اگر میں خواجہ حسن نظامی کی طرح نثر لکھ سکتا تو کبھی ذریعہ شعرو شاعری کو اپنے خیالات کے ظاہر کرنے کے لیے استعمال نہ کرتا" نثر لکھنے کے لیے وقت سے زیادہ علم اور ادبیات کے فنون سے واقفیت ضروری ہے۔ قصہ مختصر نثر کی دکان پر کھوٹا سکہ نہیں چل سکتا اگرچہ شاعری کی دکانیں (مشاعرے) چونکہ رات میں کھلی ہوتی ہیں بعض منچلے کھوٹا سکہ چلا دیتے ہیں۔"

اردو زبان میں دیگر الفاظ کی آمیزش کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔ "اردو' ترکی' عربی' فارسی' انگریزی' پرتگالی' چینی' ملائی' یونانی' ہندی' سنسکرت' جرمنی' اسکنڈ نیوی اور اطالوی زبان کے الفاظ سے بنی ہے اگرچہ بعض زبان کے الفاظ اس میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں لیکن بہر حال اردو کے ذائقہ میں شریک ہیں۔ ایک تحقیق کے بموجب آج کل تقریباً" ۸-۱۰ فیصد الفاظ ادبی اردو میں انگریزی یا لاتن (LATIN) زبان کے شامل ہیں اور اردو بازاری یا تجارتی زبان میں ان الفاظ کی تعداد (۲۰) بیس فیصد سے متجاوز ہے چنانچہ انگریزی زبان کے الفاظ سے گریز ممکن نہیں۔ زبان پر کسی ادیب یا ناقد کی اجارہ داری نہیں الفاظ کی بابت نہ شیخ ناسخ کی مہم کامیاب ہوئی نہ سیماب اکبر آبادی کی کوششیں۔ اردو زبان نے جو لفظ جس کسی بھی

زبان کا پسند کیا اپنایا اور پھر اسے کوئی باہر نہ کر سکا اس لیے نہ یہ مہم کامیاب ہو سکی ہے اور نہ اردو ادب کی ترقی رک سکتی ہے۔"

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا "اردو ادب میں تنقید کا رواج بہت زیادہ ہے لیکن صحیح تنقید بہت کم ہے جس کے سبب عملی اور نظریاتی ترقی نہیں ہو رہی ہے۔ تنقید خار کی نوک سے گل کو پر پر کرنے کا نام نہیں' تنقید کسی شاعر اور ادیب کی درجہ بندی کا پیانہ نہیں۔ تنقید عدالت عالیہ کا اٹل فیصلہ نہیں' تنقید جزو سے کل پر حکم لگانے کا نام نہیں بلکہ تنقید ایک عالی ترین فن ادراک ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے اچھی قدروں کا شعور لازم ہے۔ بقول مشہور نقاد رچرڈس "جو کام ایک ڈاکٹر جسم کے لیے کرتا ہے وہی کام تنقید ادب کے لیے کرتی ہے' وہ ادبی صحت کا معیار قائم کرتی ہے۔"

گذشتہ پچاس برسوں میں تراجم بہت کم ہوئے جس کی اصل وجہ مدارس' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو ذریعہ تعلیم کی کمی ہے۔ ہر جنس کی طرح اردو زبان کی قیمت اس کے مطالب کی تجارت پر منحصر ہے کیونکہ گاہک روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں اس لیے اردو بازار سکڑتا جا رہا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ابتدائی مراحل میں اردو کی صحیح خدمت کریں یعنی اس وقت اردو کے پی ایچ ڈی کے کورس سے زیادہ اردو ادب کی تحتانوی تعلیم کی سخت ضرورت ہے اگر بنیاد ہی کمزور ہو جائے تو آسمان خراش منازل کا کیا حال ہو گا۔ لیکن بہرحال میں مایوس نہیں ہوں اور بقول علامہ اقبالؒ

نہیں اقبال نا امید اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

DR.SYED TAGHI ABEDI
9 CANADA PLACE GRANDFALLS-
WINDSOR NF A2A 1V6 CANADA

سارے جگ سے پیاری ہے
مجھ کو اپنے دیس کی دھول

ثریا شہاب
9/4/99

ثریا شہاب

جرمنی

اسلام آباد کی ادبی انجمن "دائرہ" کے تحت اپریل 1997ء میں نیوز براڈ کاسٹر محترمہ ثریا شہاب کے افسانوں کے مجموعے "سرخ لباس" کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی تھی جس میں افسانہ نگار محمد منشا یاد، افتخار عارف اور دیگر مقررین نے اظہار خیال کرتے ہوئے ثریا کی تخلیقی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ثریا نے جرمن میں مقیم ہو کر اپنی خاک وطن سے رابطہ رکھا ہے۔

تقریب کے ایک میزبان انجم خلیق نے بڑی پتے کی بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ بعض اوقات تخلیق کار اپنی تخلیق کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے مگر بعض اوقات کتابیں ان کے خالق کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں اور "سرخ لباس" ایسی کتاب ہے جس کی پہچان ثریا شہاب خود ہیں۔

ثریا کا یہ کارنامہ ہے کہ بیرون ملک انہوں نے اپنے ادبی سفر کو جاری رکھا ہے اس لئے کہ روٹی روزی کے حصول کی تگ و دو کے بعد انسان ذہنی اور جسمانی طور پر اتنا تھک جاتا ہے کہ جز وقتی ادبی سرگرمیاں بھی بعض وقت جاری نہیں رہتیں مگر ثریا نے اپنے حوصلے بلند رکھے ہیں۔

میں نے انہیں سوالنامہ بھیجا تو اندازہ ہوا کہ وہ سست رو نہیں۔ یوں لگا جیسے سوالنامے کے ساتھ

وہ میرے پاس بیٹھی ہیں اور ہم دونوں مدتوں کے بچھڑے آپس میں ملے ہیں۔ ثریا شعر بھی کہتی ہیں۔ آیئے پہلے ان سے چند ماہیئے سن لیں۔

اک قوس قزح سی تھی
بالی عمریا میں
اور پینگ ہوا کی تھی

لکھ لکھ کے مٹاتے تھے
نام تمہارا ہم
خود سے بھی چھپاتے تھے

اک بیر بہوٹی تھی
میری ہتھیلی پر
دم سادھ کے بیٹھی تھی

میرے پوچھنے پر ثریا نے بتایا۔

"میری پیدائش اور ابتدائی تعلیم کراچی میں ہی ہوئی۔ بعد میں پرائیویٹ طور پر بی اے کیا اور صحافت میں ایم اے کی سند لی۔ مگر فارسی، انگریزی اور سیاسیات کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں ریڈیو پاکستان کراچی سے ڈراموں اور اسکول براڈکاسٹ کے پروگراموں میں حصہ لیا۔ پھر ریڈیو ایران اور زاہدان کی اردو سروس میں دس سال کام کرنے کے بعد 1973ء میں پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے وابستہ ہوئیں۔ 1985ء تک خبرنامہ اور خبریں پڑھتی رہیں۔ افغانستان پر روسی حملے کے زمانے میں دری زبان کی نشریات کا آغاز کیا گیا۔ اسی زمانے میں پاکستان میں نوجوانوں کی پہلی تنظیم پاکستان یوتھ لیگ کی بنیاد رکھی۔ 1985ء میں بی بی سی لندن کی اردو سروس سے وابستہ ہوئیں۔ 1990ء میں جرمن آ گئی۔ کچھ عرصہ وائس آف جرمن کے لئے بطور "فری لانس" کام کیا۔ جرمن میں روزنامہ "جنگ" لندن کی نمائندہ بھی رہیں اور معاشرتی اور سیاسی کالم لکھے اور رپورٹنگ بھی کی۔"

ثریا بتا رہی تھیں انہیں لکھنے لکھانے کا شوق بچپن سے تھا۔ مگر کوئی چیز محفوظ نہیں رکھی تھی۔ اب پچھلے چند برسوں میں تین کتابیں سامنے آئی ہیں--- سفر جاری ہے (ناول) سرخ لباس (افسانہ) خود سے ایک سوال (شعری مجموعہ) شائع ہوا ہے۔

ثریا درمیان میں اپنی زندگی کے کچھ دلچسپ واقعے سنانے لگیں۔

"میں ریڈیو ایران زاہدان میں کام کرتی تھی تو تسنیم کوثر چیمہ سے میری دوستی ہو گئی۔ وہ اس طرح کہ وہ ریڈیو پروگرام سن کر خط لکھتی رہتی تھی۔ پھر میں پاکستان واپس آ گئی۔ تسنیم کا خط جب

میرے جانے کے بعد ریڈیو ایران زاہدان پہنچا تو انہوں نے خط پر یہ الفاظ لکھ کر واپس بھیج دیئے۔ " انتقال یافت" فارسی میں اس کا مطلب ہوا چلی گئیں منتقل ہو گئیں۔ نسیم سمجھیں میرا انتقال ہو گیا۔ رو دھو کر صبر کر لیا ہو گا کہ ایک دن مجھے ٹی وی کے خبرنامے میں دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ ارے ان کا انتقال ہو گیا تھا وہ چیخ پڑیں پھر ٹی وی پر رابطہ کیا اور سارا واقعہ سنایا۔ ہم آج بھی جب ملتے ہیں تو اس واقعہ کا ذکر کر کے ہنستے ہیں۔"

ثریا کی رائے میں بیسویں صدی کے خاتمے پر اردو ادب کی تاریخ میں رہ جانے والے چند ادیبوں میں پریم چند' کرشن چندر' عصمت چغتائی' منٹو' راجندر سنگھ بیدی' غلام عباس' قرۃ العین حیدر' عبداللہ حسین' فیض احمد فیض' احمد ندیم قاسمی' ڈاکٹر وزیر آغا' ممتاز مفتی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

سوال نمبر 3 کے جواب میں انہوں نے کہا۔ "آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ انتہا پسند جدیدیت نے آرٹ کی لطافت کو مجروح کیا ہے۔ خود جدیدیت بری شے نہیں ہے۔ اگر نئے تجربات نہ کئے جائیں اور نئے خیالات متعارف نہ کرائے جائیں تو زبان و ادب تعطل کا شکار ہو جائیں مگر جدت پسندی کے نام پر کنفیوژن اور ابہام پھیلانے کی وجہ سے قاری ادب سے کٹ گیا ہے۔ بعض افسانے پڑھ کر انسان یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ اس میں بات کیا کہی گئی۔ بعض لکھنے والوں نے فلسفے اور ادب کو "کافکا" کی طرح یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ہر شخص کافکا نہیں بن سکتا۔ بہتر ہو گا کہ اگر فلسفہ لکھنا ہے تو پھر فلسفہ ہی لکھیں ورنہ پڑھنے والا اکتاہٹ کا شکار ہو جائے گا اور ادب سے الگ ہو جائے گا۔"

وہ کہہ رہی تھیں "موجودہ صدی میں اردو ادب میں ناول کم نہیں لکھے گئے صرف اس صدی کے آخری برسوں میں یہ فضا بنی ہے ورنہ جن بڑے ادیبوں کے نام لئے ہیں ان کا تعلق اس صدی سے ہے۔ البتہ اس صدی کے آخری برسوں میں اردو ادب میں ناول نویسی کا رجحان کم نظر آتا ہے۔ اور اس کی وجہ لکھنے اور پڑھنے والوں کی عدم دلچسپی ہے۔ دونوں کی عادتوں میں تبدیلی آتی ہے۔ اب شاید لوگوں کے پاس "اداس نسلیں" یا پھر ہمارے پاس "امن اور جنگ" پڑھنے کا وقت نہیں۔ ٹیلی ویژن زیادہ وقت لے لیتا ہے اور مادی ضروریات کی تکمیل کے لئے زیادہ وقت دینا پڑتا ہے جبکہ مغرب میں اس کے برعکس آج بھی بہت ناول لکھے جا رہے ہیں اور لوگ پڑھتے بھی ہیں کیونکہ وہ مطالعے کے شوقین ہیں۔"

ثریا نے کہا شاعری ہو یا نثر' میرے نزدیک معیاری ادب وہی ہے جو دل پر اثر کرے ورنہ اچھے یا برے ادب کا کوئی معیار مقرر کرنا بہت دشوار کام ہے۔ پڑھنے والے مختلف ذوق کے مالک ہوتے ہیں اور ہر شخص اپنی پسند کی چیز کو معیاری قرار دے سکتا ہے۔ یہاں مغرب میں تکنیکی اعتبار سے کچھ معیار مقرر کئے گئے ہیں جو ابھی ہمارے ہاں نہیں۔ یہاں تو لکھنے والوں کی رہنمائی کے لئے

بھی کتابیں ' ورک شاپ اور سیمینار ہوتے ہیں جن کا ہمارے ہاں رواج نہیں۔ تو ان حالات میں جو چیز دل میں اتر جائے اور بڑے پیانے پر لوگ یہی کہیں کہ یہ تو میرے دل کی بات ہے وہی معیاری ہوگی۔

ثریا نے بتایا ''اردو کئی زبانوں کا مجموعہ ہونے کے باوجود اب خود ایک مکمل زبان اور بڑی توانا زبان ہے اور نئی زبانوں کے الفاظ اس میں مسلسل شامل ہوتے رہتے ہیں تاہم اس وقت یہ زبان اس حد تک بالغ ہو چکی ہے کہ اسے غیر ضروری الفاظ کی ضرورت نہیں اور یہ بات بہت تکلیف دہ ہے کہ اردو زبان میں جن الفاظ کے متبادل موجود ہیں بعض پڑھے لکھے حضرات بھی اس کی جگہ انگریزی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں انگریزی یا دوسری زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے رہنے چاہئیں مگر اردو کا اپنا مزاج اور انفرادیت بھی برقرار رہنی چاہئے تاکہ اس کا حسن برقرار رہے۔

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ جانے کا جائزہ اگر عوامی رویوں میں لیا جائے تو مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں عام زندگی میں ہم صرف تحسین و ستائش سننے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اسی طرح ادیب بھی واہ واہ کا طلبگار ہوتا ہے۔ دوسری بات تنقید کے نام پر بعض دفعہ ذاتی مخالفتیں بھی چکائی جاتی ہیں۔ جہاں تک معیاری تنقید نگار ہیں وہ تو اپنا کام کر رہے ہیں۔ جتنا ادب لکھا جا رہا ہے اتنی تنقید بھی آجاتی ہے۔ اردو زبان میں تراجم تو ہو رہے ہیں مگر ان کا وہ تاثر قائم نہیں ہو رہا جو ہونا چاہئے۔ علاقائی زبانوں پر کام نہ ہونے کی وجہ بھی سیاست ہے۔ علاقائی زبانیں ' ثقافتیں سب اسی عمل کا شکار ہیں۔

SURRAYA SHAHAB
WESTEND 6A 67578
GIM BSHIM GERMANY

کہیں ارزاں نہ کر دے خوشبوؤں کو
ہوا کے خوف سے ڈرنے لگا ہوں

Javed Akhtar
4/10/99.

جاوید اختر چودھری

برمنگھم

آپ نے جاوید اختر چودھری کے اشعار ان کے عکس تحریر میں پڑھ لئے ہونگے۔ یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

مجھے حروف کی حرمت کا پاسباں کر دے
وگرنہ جذبہ دل نا تمام رہتا ہے

میں نے پوچھا۔ "جاوید آپ تو افسانہ نگار ہیں۔ یہ شاعری درمیان میں کہاں سے آ گئی؟"
(ان کے افسانوں کا مجموعہ "اک فرصت گناہ" نومبر ۹۹ کے اواخر تک طبع ہو کر آ رہا ہے)
جاوید نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کے سامنے ہوں۔ اب فیصلہ آپ کریں کہ تحریر میری افسانے میں آپ کو اچھی لگی یا میرا اسلوب آپ کو شاعری میں زیادہ پسند آیا ہے...؟
میں نے جاوید کا مجموعہ "کلام حصار ذات" پڑھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ جاوید لکھنے میں شاعر ہے کیونکہ اس کے افسانوں میں بھی شاعرانہ لہجے کی کشش ہے اور بولنے میں وہ داستان گو ہے۔

چنانچہ میں نے پوچھا "آپ نے لکھنا کب کیسے شروع کیا اور یہ شاعری آپ پر کب وارد ہوئی۔ ساتھ ہی اپنی افسانہ نگاری کے سلسلے میں بھی بتاتے چلیں۔" جاوید اختر چودھری کہنے لگے۔ "میں 11 نومبر 1940ء جاکھل منڈی ضلع حصار (انڈیا) میں پیدا ہوا تھا۔ تقسیم ہند کے دوران میں خاندان کے چند افراد اپنے آبائی قصبہ پہنچے تھے۔ میری ابتدائی تعلیم اپنے قصبہ سوہاوا ضلع جہلم سے شروع ہوئی اور پھر گوجر خان کالج سے فارغ التحصیل ہوا۔ میں نے سات سال تک منگلا ڈیم میں ملازمت کی کچھ عرصہ تربیلا ڈیم میں کام کیا۔ دو سال کوپن ہیگن ڈنمارک میں گذارے۔ اپریل 1972ء سے تادم تحریر انگلینڈ میں ہوں۔ الیکٹرانکس کی تعلیم انگلینڈ میں مکمل کی۔ 1979ء سے لوکس ایروا سپیس انجن مینجمنٹ ڈویژن

Lucas Aerospace Engine Management Division. میں بطور "الیکٹرانکس ٹیسٹ انسپکٹر" کام کر رہا ہوں۔

قصہ کچھ یوں ہوا کہ پچھلے چند برسوں سے "جنگ لندن" کے ادبی ایڈیشن "جہان ادب" میں بہت سے شاعروں کے انٹرویوز چھپ رہے ہیں جنہوں نے بچپن میں چھ سات سال کی عمر میں ہی شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔ انگلستان اور یورپ میں مقیم دانشور اور اکثر شعراء حضرات ساٹھ سال سے اوپر کے ہو چکے ہیں آپس کی بات چیت میں یہ نامور شعراء کچھ اس طرح کا تاثر دیتے ہیں کہ وہ ایسے شاعر ہیں جن کا اس دنیا کی کھلی ہوا میں آتے ہی فطری رونا بھی شعر میں تھا۔ جب کہ میں نے اپنے بچپنے میں کوئی شعر نہیں کہے۔ اس لئے میرے شعروں میں نہ تو لوریوں کی ہمک ہے اور نہ ہی دودھ کی مہک۔ اچھے شعر یاد کرنے کا بہت خبط تھا۔ پھر جب ۱۹۵۹ء میں میں گورنمنٹ کالج گوجر خان سے تعلیم "نامکمل" کر کے جہلم کی ایک گلاس فیکٹری میں ملازم ہوا تو وہاں مجھے ایک انتہائی مخلص اور صاحب ذوق شخص کی رفاقت میسر آئی۔ یہ میرے دوست مختار احمد منہاس ہیں۔ جو ادبی حلقوں میں مختار جاوید کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ مختار جاوید نے اچھا شعری ذوق پایا ہے۔ ان کے جہلم شہر کے شعراء سے بہت قریبی مراسم تھے۔ ان میں ایک صفدر شفق تھے۔ اور دونوں وہ بی۔ اے کے آخری سال میں تھے۔ مصطفیٰ زیدی جہلم میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کے دم قدم سے جہلم میں شعر و شاعری کے چرچے تھے۔ صفدر شفق نے اسی دور میں کالج کے مشاعرے میں اپنی نظم "برسات" پر احمد ندیم قاسمی سے پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ صفدر شفق سے بہت ساری خوشگوار ملاقاتیں رہیں۔ یہ غالباً ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ میں ان دنوں منگلا ڈیم میں ملازم تھا۔ میرے ارد گرد ایک سحر پھیلنے لگا تھا۔ خوبصورت آوازیں کانوں میں رس گھولنے لگی تھیں۔ دل و دماغ میں ایک عجیب سا نشہ چھایا رہنے لگا تھا۔ پھر ایک دن یوں لگا جیسے جو دیکھا تھا' جو سنا تھا' جو پایا تھا' سب خواب تھا' سب واہمہ تھا۔ ایک حرکت سی ہوئی۔ میرے اندر درد کا "ڈیری ناگ" چھوٹا جو دیکھتے دیکھتے دریا بن گیا "دریائے جہلم"

کی طرح دریاؤں کے آگے بند باندھے جا سکتے ہیں۔ ان کے رخ موڑے جا سکتے ہیں۔ آنسوؤں کے دریاؤں کے آگے بند نہیں باندھے جا سکتے۔ آنسو جب درد کے تار کی صورت اختیار کرتے ہیں تو نغمہ بن جاتے ہیں۔ اور آنسوؤں کا معاملہ الگ ہے۔ آنسو جب آنکھ سے ٹپکتے ہیں تو یہ مضراب بن کر دل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں۔ اور پھر وہ نغمہ پھوٹتا ہے جس کے سُر شعر کا روپ اختیار کرتے ہیں۔

منگلا ڈیم کی ویلڈنگ شاپ میں میرے ساتھ سلطان محمد خان ویلڈنگ فورمین تھے۔ سلطان صاحب ۱۹۴۷ء کی اتھل پتھل کے دوران کانپور سے جان بچا کر راولپنڈی آن بسے تھے۔ جب ان سے روابط بڑھے تو معلوم ہوا کہ انہیں شعر و ادب سے بھی شغف ہے۔ انہیں سینکڑوں اشعار زبانی یاد تھے۔ گاہے گاہے خود بھی طبع آزمائی کر لیتے تھے۔ رات کی شفٹ میں دو اور چار بجے کے درمیان ان کے ساتھ محفل جمتی۔ شعر سنتے اور سناتے۔ ایک رات ایک مصرعہ طرح پر ہم دونوں طبع آزمائی کر رہے تھے... مصرعہ تھا:

ع پیکرِ ہستی کو جب مشکوک سا پاتا ہوں میں

میں نے مصرعہ پر اس طرح گرہ لگائی:

عظمتِ یزداں مجھے دیتی ہے پھر سے حوصلہ
"پیکرِ ہستی کو جب مشکوک سا پاتا ہوں میں"

سلطان صاحب نے خوب داد دی' ہوتے ہوتے ہم دونوں کی شاعری کے چرچے ہونے لگے۔ میں نے اپنی کچھ مکمل اور کچھ غیر مکمل غزلیں اپنے ایک کرم فرما اور رفیق کار سید اعجاز الحسن گیلانی کو دکھائیں۔ انہوں نے بیماری کی تشخیص کی اور فرمایا... "جاوید! سخن گو ہونے سے سخن فہم ہونا کہیں زیادہ بہتر ہے" مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ پھر کچھ مدت بعد قبلہ والد صاحب کو وہ کلام دکھایا۔ تو انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے "بیٹا اگر مطالعہ اور ریاضت جاری رکھی تو کسی دن اچھے شاعر بن جاؤ گے۔" والد صاحب نے بہت اچھا شعری ذوق پایا تھا۔ غالب اور اقبال سے بہت متاثر تھے۔ گھر میں ادبی فضا تھی۔ جس سے متاثر ہونا فطری تھا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک میرے پاس کافی کلام جمع ہو چکا تھا جس پر نظر ثانی کی ضرورت تھی۔

میں نے ۱۹۷۰ء میں براستہ خشکی ڈنمارک کی راہ لی۔ اس وقت میرے ساتھ ماں کی دعائیں' ماں کی پکائی ہوئی میٹھی روٹیاں اور دو ہزار روپے تھے۔ افغانستان سے نکلتے وقت میں نے طے کیا تھا کہ اپنے حالات اور واقعات اپنی ڈائری میں لکھوں گا۔ افغانستان کے بعد میں نے اپنا سفر بسوں اور ٹرینوں میں جاری رکھا۔ اور آخر میں سالزبرگ (آسٹریا) سے کوپن ہیگن تک ہوائی جہاز میں پہلی بار سفر کیا۔ کوپن ہیگن تک ڈائری میرے ساتھ رہی۔ اور پھر ایک رات جب میں چند احباب کے اصرار پر انہیں اس سے اقتباسات سنانے کے بعد اسے اپنے سرہانے کے نیچے

رکھ کر سویا تو اگلی صبح یہ ڈائری غائب تھی۔ اس میں میرا کلام بھی درج تھا۔ جس کے کھو جانے کا بہت افسوس ہوا۔ اور آج تک ہے۔ پھر ڈنمارک کی رنگینیوں نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ ڈائری کے ساتھ شعر گوئی کا عمل بھی خفتہ ہو گیا۔

میں ۱۹۷۲ء میں ولایت چلا آیا۔ کچھ اپنے امیگریشن کے مسائل اور کچھ یہاں کی مشینی زندگی نے مجھے حواس باختہ کئے رکھا۔ ولایت میں قیام کے ابتدائی چند سالوں میں بھی کچھ نہیں لکھا۔ ۱۹۸۹ء کے اواخر، سردیوں کی رات میں اپنے ایک نئے شناسا صوفی صابر حسین قادری کے ہاں بیٹھا ہوا تھا کہ محمد اقبال بھٹی آئے۔ مجھے بھٹی صاحب کے متعلق علم تھا کہ وہ شعر کہتے ہیں لیکن سننے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ صوفی صاحب کے اصرار پر بھٹی صاحب نے اپنی غزلیں سنائیں۔ پھر صوفی صاحب نے اپنا کلام عنایت کیا۔ دفعتاً" میرے اندر دبی ہوئی چنگاری سلگ اٹھی۔ اٹھتے اٹھتے میں نے انہیں بتایا کہ میں بھی سخن ور ہوں اور شعر گوئی کی مشق کرتا ہوں۔ دونوں نے مجھے حیرت سے دیکھا اور پھر معنی خیز مسکراہٹ ان کے چہروں پر پھیل گئی۔ اگلی اتوار میں ان کی محفل میں جا نکلا۔ اپنی ایک غزل سنائی۔ دونوں نے میری غزل کو پسند کیا۔ بھٹی صاحب نے غالباً" ضرورت سے زیادہ تعریف کی۔ اور مشورہ دیا کہ میں تواتر اور سنجیدگی سے شعر کہنے شروع کروں۔ پھر غم روزگار، غم ہجرت، سیاسی اور سماجی ناہمواریوں کے مضامین شعروں میں ڈھلنے لگے۔

میں نے ایک دن بھٹی صاحب سے کہا کہ مجھے شدت سے احساس ہے کہ میرا کلام اصلاح طلب ہے اور یہ کہ مجھے کسی معتبر اور کہنہ مشق شاعر کا دامن پکڑنا چاہئے۔ یوں بھٹی صاحب مجھے سید عطا جالندھری کے ہاں لے گئے۔ عطا صاحب بڑے خلوص اور تپاک سے ملے۔ عطا صاحب دیار غیر میں کلاسیکی غزل کے ایک معتبر شاعر ہیں۔ تین شعری مجموعوں "چراغ جلنے دو، شب زدہ تنہائیاں اور رتجگوں کا عذاب" کے خالق ہیں۔ میں ان کی وفات تک ان کو اپنا کلام دکھاتا رہا۔

جب میں نے اپنی شعری کاوشوں کو کتاب کی صورت دے کر شائع کرنے کے بارے میں سوچا تو کتاب کے دیباچہ کی فکر لاحق ہوئی۔ چنانچہ میں نے عطا صاحب سے درخواست کی کہ وہ چند سطریں میری شاعری پر لکھ دیں۔ تو ان کا جواب سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ ان کی پہلی کتاب پر احمد ندیم قاسمی، عطا الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد نے لکھا۔ "شب زدہ تنہائیاں" کا دیباچہ قتیل شفائی نے تحریر کیا تھا۔ عطا صاحب کو روکھی پھیکی کتابیں اچھی نہیں لگتیں۔

عطا صاحب میرا کلام دیکھ کر اصلاح دیتے رہے۔ اور کتاب کے دیباچہ کا سن کر صلاح دی کہ میں برطانیہ میں سب سے پہلے اخبار ہفت روزہ "مشرق" لندن کے بانی ایڈیٹر اور مشہور کتاب "دکشمیر اداس ہے" کے مصنف نامور ادیب اور نقاد محمود ہاشمی صاحب سے چند سطریں

لکھوالوں۔ اب ہاشمی صاحب کی سنئے۔ میری ان سے پہچان کا عرصہ صرف چند ماہ پر محیط ہے۔ ہاشمی صاحب بہت نفیس انسان ہیں۔ بولتے کم اور سنتے زیادہ ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے پڑھتے رہتے ہیں۔ جب مطالعہ سے جی بھر جاتا ہے تو لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور جب لکھنے سے اکتا جاتے ہیں تو اپنے ہی لکھے کی کاٹ چھانٹ میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ان سے اس بارے میں بات کی تو معلوم ہوا کہ وہ دوسروں سے دیباچہ لکھوانے کے اتنے حق میں نہیں ہیں۔ ان کا مشورہ تھا کہ میں اپنا دیباچہ خود لکھوں۔ ان کا کہنا تھا کہ اچھی کتاب کو بیساکھی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دیباچہ' پیش لفظ یا فلیپ لکھنے والوں کے متعلق بھی ان کے خیالات "نیک" نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر "ایرا غیرا" ہر "نتھو خیرے" پر دیباچہ یا فلیپ لکھ دیتا ہے بلکہ نوبت اس حد تک آ پہنچی ہے کہ ہند و پاک کے بزعم خود صف اول کے شاعر ادیب اور نقاد بھی اپنی اپنی مصلحتوں کے تحت کسی کے آگے انکار نہیں کرتے۔ شاعر اور کتاب کا نام بدل کر وہی گھسے پٹے تعریفی فقرے اور کلمات لکھ کر سرخرو ہو جاتے ہیں۔ اور میں سوچنے لگا کہ "کشمیر اداس ہے" کے خالق شہرت اور فن کی بلندیوں پر بیٹھے اور کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔

اور جب وہ یہ کہہ رہے تھے تو مجھے وہ دیباچے یاد آ رہے تھے۔ جو محمود ہاشمی صاحب نے برطانیہ کے مختلف ادیبوں کی کتابوں پر لکھے تھے۔ چنانچہ یہ ماننے کو جی نہ چاہا کہ وہ بھی اسی طرح ایرا غیرا ہیں جو ہر نتھو خیرے پر دیباچہ لکھ دیتے ہیں مزید غور کیا تو احساس ہوا کہ جن کتابوں پر انہوں نے دیباچے لکھے تھے وہ سب کی سب نثر کی کتابیں ہیں اور میری کتاب شعر و شاعری کی ہے۔ شاید اس لئے ہچکچا رہے ہیں۔ اب میں نے ان کے کہے سے یہ مطلب نکالنا ہی بہتر سمجھا کہ وہ شاعری کی بات کر رہے ہیں۔ ایرا غیرا اور نتھو خیرا والی بات نہ ان پر عائد ہوتی ہے اور نہ ہی ان ادیبوں پر جن کی کتابوں پر انہوں نے اب تک دیباچے لکھے ہیں۔ عطا صاحب دیباچہ لکھنے سے معذور تھے۔ ہاشمی صاحب اس رسم کے سرے سے ہی خلاف ہیں۔ البتہ ہاشمی صاحب نے ایک مشورہ بھی دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں کہ اپنی شاعری کو کتابی صورت دینے سے پہلے اپنی شاعری پر نظر ثانی کر لوں۔ رطب و یابس نکال دوں۔ اور بجائے سارا کلام چھاپنے کے اس کا انتخاب چھپواؤں۔

ان کی اس بات پر مجھے پنجابی کی ایک کہاوت یاد آئی کہ "ڈھائی بوٹیاں تے بہتو باغبان" اگر میں اس کا انتخاب کرنے بیٹھ گیا اور معیار اور اعلیٰ معیار پیش نظر رکھا تو پھر رہ کیا جائے گا؟ مجھے اپنا ہر شعر عزیز ہے۔ کون جانے میں شعر کہتے وقت کیسے کیسے کرب سے گزرا ہوں۔ یہی کرب میرا سرمایہ شاعری ہے۔ یہی بات میں اپنے افسانوں کے بارے میں کہہ سکتا ہوں۔ اب میں کیوں اپنے آپ کو جھوٹ موٹ کی "کسر نفسی" کے عذاب میں مبتلا رکھوں؟ دیباچہ یا فلیپ نہ سہی۔ میرا کلام تو ہے۔ کچھ لوگ اسے اشاعت خودنمائی (Vanity

(Publication) کمیں گے بہرحال چھپ گئی ہے اور اب آپ کے سامنے ہے اور کوئی نہ سہی میرے بیوی بچے تو ہیں جو اس کا فخر سے تذکرہ کیا کریں گے۔ کیا یہ میرے لئے کافی نہیں؟ اور کون جانے کسی تبصرہ نگار یا نقاد کو بھی اس میں کوئی ایسی بات نظر آجائے جو اس کے دل کو چھو سکے۔

جاوید نے یہ بھی بتایا کہ "جون ۱۹۹۶ء کے اواخر میں جب میری پریشانیاں انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں تو کوپن ہیگن ڈنمارک سے میرے ایک دیرینہ کرم فرما جناب خواجہ آصف صاحب کا (جو کہ ماہانہ "شاہین انٹرنیشنل" کے مدیر اور "بزم فکرنو" کے صدر ہیں) فون آیا کہ "اس سال کے سالانہ مشاعرے کے لئے کوپن ہیگن ڈنمارک اور سٹاک ہام سویڈن سے دعوت نامے بھجوا رہا ہوں۔ انکار نہیں ہونا چاہئے۔" خواجہ صاحب کو ٹالنا میرے بس کی بات نہیں۔ ان کی زندگی محبتوں اور پیار و خلوص سے عبارت ہے۔ دیار غیر میں اردو کی ترقی و ترویج کے لئے شب و روز انتھک محنت کرتے ہیں۔ چنانچہ میں ایک ہفتہ کے لئے کوپن ہیگن گیا۔ خواجہ صاحب نے بڑی پذیرائی کی۔ مجھے اونچی ہواؤں میں اڑاتے رہے۔ جب انہوں نے میری بیاض کو دیکھا اور پڑھا تو کہنے لگے۔ "جاوید تم کتاب کو منظر عام پر کیوں نہیں لاتے" میں نے ان کو اپنی مجبوریوں اور مشکلات سے آگاہ کیا۔ تو کوپن ہیگن کے اس خواجہ جاوید نے کمال پیار سے "شاہین کمپوزنگ سسٹم" پر کمپوزنگ کردی اگر وہ ایسا نہ کرتے تو نجانے مجھے کتنے برسوں اذیت میں مبتلا رہنا پڑتا۔" جاوید چپ ہو گئے مگر صاحب کتاب ہونے کی جگمگاہٹ سے چہرہ روشن تھا۔ اب انہوں نے بڑے سلیقے سے سوالوں کے جواب بھی دینا شروع کئے۔ کہنے لگے۔

دوسرے سوال کے جواب میں، میں تو یہی کہوں گا کہ تاریخ۔ فاتح مفتوح، ظالم و مظلوم، محب وطن اور غداروں سمیت سبھی کو یاد رکھتی ہے۔ ادبی تاریخ میں بھی یہی فارمولا کام کرتا نظر آتا ہے۔ جہاں ادبی تاریخ میر، سودا، غالب، اقبال اور فیض کو یاد رکھے گی۔ وہاں کسی نہ کسی جگہ استاد امام دین اور چرکین کا نام بھی نظر آجائیگا۔ کہ جب تک ان کی کتابیں دستیاب ہونگی، ان کے چاہنے والے بھی ہر زمانے میں موجود ہوں گے۔ اگر اب اردو ادب کی تاریخ کو کھنگالا جائے۔ تو وجیہہ الدین وجدی پہلے اردو شاعر کی حیثیت میں جلوہ افروز ملیں گے۔ جنہوں نے لکھا ہے: ع

محبت آئینہ روشن دلاں ہے
محبت زیب و زینت عاقلاں ہے
محبت مال دھن ہے مفلساں کا
محبت ہے وسیلہ بے کساں کا

اسی طرح اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ لطف النساء امتیاز زوجہ اسد علی تمنا اور پہلے ناول

نگار نذیر احمد کی "مراۃ العروس" کا نام نامی تاریخ میں درج ملے گا۔ ماضی میں محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں ماضی کے شعراء کرام کا تذکرہ اور اس عہد کا منظرنامہ پیش کیا تھا۔ خشت اول مضبوطی سے رکھی گئی تھی۔ اس لیے بعد میں آنے والوں نے اس ادبی تاریخ کی تعمیر اور آرائش میں حسب حال اضافہ کیا۔ اب جس کام کو آپ وطن عزیز سے ہزاروں میل دور بیٹھی سرانجام دے رہی ہیں۔ اسی کام کو یہاں برطانیہ میں پہلے ہفت روزہ اخبار "مشرق" کے بانی ایڈیٹر مشہور کتاب "کشمیر اداس ہے" اور بچوں کے قاعدوں کے مصنف محمود ہاشمی سرانجام دے رہے ہیں۔ یوں اردو ادب کا ادبی منظرنامہ اور تاریخ دھیرے دھیرے اپنی ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ محمد حسین آزاد، محمود ہاشمی، سلطانہ مہر اور اسی قبیل کے دیگر افراد اگر میر، غالب، اقبال، فیض اور قاسمی کا تذکرہ کریں گے۔ تو سوہاوا قصبہ کے ایک معمولی شاعر و ادیب کا ذکر بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔ رہی بات مشہور ہونے کی... تو شہرت دوام صرف ان ہی لوگوں کو ملتی ہے جو غیر معمولی ہوں۔ یہ فیروزمندی، اقبال مندی گنتی کے لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔

جواب نمبر ۳: اسے میری کم علمی جانیے کہ جدیدیت کا فلسفہ سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ جتنی بار جدیدیت کے بارے میں پڑھا۔ مزید گھمن گھیریوں میں کھویا۔ جب بھی کسی تحریک نے جنم لیا ہے بحث مباحثے نے سر اٹھایا۔ یوں جو پہلی تحریک کے گوشے گوشہ تاریکی میں تھے۔ ان پر بھی روشنی پڑی۔ اگر کوئی لطیف آرٹ کی بات کرتا ہے تو اس لطیف صنف کو لطیف پیرائے میں بیان کیا کرے۔ نہ کہ خواہ مخواہ کا ابہام پیدا کیا جائے۔ میرے نزدیک ہر نئی تحریک نے آرٹ کو کچھ نہ کچھ دیا ہی ہے۔

جواب نمبر ۴: افسانے کی مثال ایک چھوٹے سے پودے کی ہے۔ جب کہ ناول ایک تناور درخت ہے۔ تناور درخت کی دیکھ بھال کے لیے جو محنت درکار ہوتی ہے۔ وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ جن لوگوں نے ماضی میں ناول لکھے۔ ان کے پاس وافر وقت کے علاوہ علم روزگار کی فکر دامن گیر نہ تھی۔ سو بعض لوگوں نے محنت کی اور زندہ رہنے والے ناول لکھے۔ اب بھی لوگوں کے پاس ذاتی اور حکومتی وسائل بہت زیادہ ہیں۔ لیکن ان کے پاس وقت کی کمی اور محنت کا فقدان ہے۔ مغرب میں دوسری زبانوں میں افسانے کی نسبت ناول زیادہ لکھا گیا ہے اور قارئین کی تعداد میں بھی برابر اضافہ ہوا ہے۔ ناول لکھنے والوں نے شہرت کے علاوہ پیسہ بھی کافی کمایا ہے۔ لیکن ہمارے ملکوں میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ گو نسیم حجازی نے اپنے ناولوں سے معقول معاوضہ وصول کیا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ پاکستان کی فوج میں نسیم حجازی کے ناول بہت مشہور ہوئے تھے۔ مغربی ممالک میں سیکنڈری اسکولوں کے طلباء کو نصاب کے علاوہ دوسری کتابیں پڑھنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ جب کہ پاکستان میں میٹرک تک

والدین کی یہ خواہش ہوتی ہے۔ کہ بچہ زیادہ سے زیادہ توجہ نصاب کی کتابوں تک رکھے۔ یہ مفروضہ عام ہے کہ اسکول کے بچوں کا ناول پڑھنا وقت اور رقم کے ضیاع کے علاوہ بد معاشی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس مفروضے میں کچھ عمل دخل غربت کا بھی ہے کہ والدین میں خرید استطاعت نہیں ہوتی۔

جواب نمبر:۵ آج کا ادیب ہی نہیں بلکہ معاشرے کا ہر فرد کسی نہ کسی بحران میں مبتلا ہے۔ اس بحرانی کیفیت سے اس کرہ ارض کا طاقتور ترین فرد بھی محفوظ نہیں ہے۔ ادیب اور شاعر معاشرے کا ایک حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی کرب کے علاوہ دوسروں کے دکھوں سے جب آگاہ ہوتا ہے' مشاہدہ کرتا ہے تو وہ نہ صرف کئی گنا خود بحرانی کیفیات سے گذرتا ہے بلکہ دوسروں کے دکھ کو بھی شدومد سے اجاگر کرتا ہے۔ نہ تو ماضی کے کسی نظام فکر نے دکھوں سے نجات دلائی ہے اور نہ ہی مستقبل میں کبھی ایسا ہو سکے گا۔

اردو زبان میں انگریزی کی آمیزش کے سلسلے میں عرض ہے کہ بات صرف فارسی اور عربی کی نہیں ہونی چاہئے۔ اگر پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کو اپنی سائنسی ترقی عزیز ہے تو ان ممالک کے تعلیمی پالیسی میکرز کو ایسے حالات اور وسائل مہیا کرنے ہوں گے جن کی بدولت عوام ترقی کی دوڑ میں حصہ لے سکیں۔ انگریزی بلاشبہ دنیا کی ایک بڑی زبان ہے۔ لیکن جو زبانیں انگریزی جتنی بڑی نہیں ہیں۔ انہوں نے بھی ترقی کی ہے۔ جرمنی' فرنچ' جاپانی' چینی کے علاوہ کوریائی زبان کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ جس طرح پانی اپنا راستہ بنا لیتا ہے اسی طرح زبانیں بھی اپنا راستہ بنا لیتی ہیں۔ پاکستان میں اردو زبان کا یہ المیہ رہا ہے کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو۔ قومی زبان ہونے کے باوجود دفتری زبان نہیں بن سکی ہے۔ حکمران طبقہ اردو میں بات کرنا کسر شان سمجھتا ہے۔ یہ طبقہ صرف اپنے ڈرائیوروں۔ خانساموں اور مالیوں سے اردو میں بات کرتا ہے۔ پچھلی حکومت کے دور میں بڑے شہروں میں انگلش پرائمری اسکولوں میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور یہ قومی زبان کے لیے کوئی نیک شگون نہیں ہے۔

آخر میں عرض کروں گا کہ اردو ادب میں تنقید واقعی برائے نام رہ گئی ہے۔ کھرے اور سچے نقادوں پر انگلیوں کی بجائے ہاتھ اٹھنے لگے ہیں کہ یہ دور کم خصال ہے۔ لیکن پھر بھی چند لوگ کہیں نہ کہیں خاموشی سے کام کر رہے ہیں۔

MR. JAWED CHAUDHRI

2 BIRCHTREES CROFT

SOUTH YARDLEY BIRMINGHAM, B26 IEF .U.K

جب لطیفوں کی پیداوار تیز ہو جاتی ہے تو قوم سے سنجیدگی
اور ناول سے کردار غائب ہو جاتے ہیں اور معاشرہ و قوم انتشار،
عجمیت اور نفرت و ہ کا شکار ہو جاتی ہے۔

جمیل جالبی
۱۷ مارچ ۲۰۰۰ء

ڈاکٹر جمیل جالبی

کراچی

میں نے جب سراج الدولہ کالج کراچی میں بی۔ اے کے لئے داخلہ لیا تو میری پہلی ملاقات اس کالج کے پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب سے ہوئی تھی۔ میں نے ہمیشہ اپنے استادوں کا بے حد ادب کیا ہے کہ ہمیں یہی سکھایا گیا ہے اور اس ادب کے ناتے میں ان سے بہت کم گفتگو کرتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ مجتبیٰ صاحب نے کچھ ایسی شفقت کا مظاہرہ کیا کہ میں ان سے اپنے افسانوں پر بھی گفتگو کر لیتی تھی۔ میرے پاس اضافی مضمون اردو تھا۔ مجتبیٰ صاحب جب کلاس میں اردو زبان و ادب پر گفتگو کرتے تو محسوس ہوتا لفظ شیرو شکر بن کر میرے اندر اتر رہے ہوں۔ علم کا نور اور الفاظ کا آبشار مل جل کر سکون و ٹھنڈک کی ایک آسودہ دنیا کی سیر کرا دیتے۔

پھر میں نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو سنا' ڈاکٹر جمیل جالبی کو سنا' ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو بھی سننے کا موقع ملا۔ اور جب جب ان لوگوں کو سنا' ان سے گفتگو کا موقع ملا تو شاعری جنم لیتی گئی۔ ایسی ہی شاعری سے چند سطریں میں محترم ڈاکٹر جمیل جالبی کی خدمت میں پیش کر کے ان کے تعارف کی ابتدا کرتی ہوں۔

اے کہ تو ہے، علم کا اک گہرا سمندر
ویسے تو ساکن اور خاموش بظاہر
لیکن حرف کی موجیں، جب تجھ میں کروٹ لیں
اک جھرنا پھوٹے، اور علم کے موتی یوں برسیں
جیسے لڑیاں ٹوٹیں
میں اپنے حصے کے موتی چن کر ان سے
اپنی بے بصری کا سرمہ چاہوں

''گفتنی'' کے لئے ان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے ڈاکٹر جمیل جالبی سے پوچھا کہ بیسویں صدی میں اردو ادب میں باقی رہ جانے والے ناموں کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ وہ کہنے لگے۔ ''جناب یہ فال اور جنتری کی بات ہوجائے گی کہ کون رہے گا اور کون نہیں رہے گا۔ اس کا فیصلہ وقت کرسکتا ہے اور اس کے بارے میں پہلے سے پیش گوئی کرنا مناسب نہیں۔ ویسے ہم نے پچھلوں کے تماشے بھی دیکھے ہیں جو کہ اپنے دور میں اتنے مشہور تھے کہ سینکڑوں کی تعداد میں تو ان کے شاگرد تھے۔ لیکن آج آپ ان کا کلام پڑھیے کوئی ایک شعر بھی ڈھنگ کا نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر ناسخ کو لیجئے۔ اردو ادب میں اپنے دور میں معنی آفرینی کے لحاظ سے اس سے بڑا شاعر نہیں تھا۔ ناسخ کی وفات 1254ھ میں ہوئی تھی۔ ناسخ وہ شخص ہے کہ جس کا اثر غالب پر بھی پڑا اور مومن پر بھی۔ لیکن آج ان کا ایک شعر بھی میر کے شعر کی طرح ہمیں متاثر نہیں کرتا۔ مظفر علی اسیر بھی تھے۔ ان کے آٹھ ضخیم دیوان، چھ مثنویاں اور قصائد کا ایک دیوان بھی ہے لیکن آج ان کا کلام کون شوق سے پڑھتا ہے؟ لوگ تو ان کے نام کو بھی بھول چکے ہیں۔ اب رہ گیا ہمارا دور تو اس میں جناب قرۃ العین حیدر ہیں اور قوی امکان ہے کہ ان کا نام تاریخ کا حصہ بن جائے۔ پھر عصمت چغتائی ہیں۔ بیدی، منٹو، انتظار حسین ہیں۔ اس میں ایک نکتہ اور بتادوں کہ جو ادیب نثر یا نظم میں اپنا منفرد اسلوب بنانے میں کامیاب ہوجاتا ہے وہ اپنے اسی منفرد اسلوب کے حوالے سے باقی رہتا ہے۔ مثلاً ''محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' ایک معرکہ الآرا کتاب ہے۔ اگر تحقیق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس میں سینکڑوں ایسی غلطیاں ہیں کہ ہنسی آتی ہے۔ اس کے باوجود یہ کتاب آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ اس کا اسلوب بیان اتنا منفرد، اتنا اچھوتا اور اتنا مختلف ہے کہ ہم اور تاریخ اسے نظرانداز نہیں کرسکتے۔ تو اب دو چیزیں ہیں۔ ایک منفرد اسلوب اور دوسرے یہ کہ اپنے زمانے کی اس طرح ترجمانی کرنا کہ وہ آنے والے زمانے سے مل جائے اور جب تک وہ ادب پارہ آنے والے زمانوں سے ملتا رہے گا تو اس کے اندر زندگی کی رمق باقی رہے گی اور تخلیق کا دل دھڑکتا رہے گا۔ لیکن جب کوئی تحریر یا ادب آنے والے زمانے سے کٹنا شروع ہوجائے تو اسی حساب سے اس کے دل کا دھڑکنا بھی کم ہوتے ہوتے بند ہوجائے گا۔ کوئی سو سال زندہ رہتا ہے، کوئی دو سو سال، کوئی پانچ

سو سال اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو آج بھی زندہ ہیں مثلاً" ارسطو' افلاطون اور ابن سینا آج بھی زندہ ہیں۔ مولانا روم ہیں' حافظ شیرازی اور سعدی آج بھی زندہ ہیں۔ یہ تو چند نام ہیں رہا ہمارا دور' شاعری میں میرا جی کا نام تاریخ میں آئے گا ن' م راشد آئیں گے' فیض احمد فیض بھی شاید آئیں گے' حالانکہ ان کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔"

سوال۔ ڈاکٹر صاحب اس سوال سے میرے ذہن میں ایک اور سوال پیدا ہوا ہے اور کیونکہ ہمیں دوبدو گفتگو کا موقع ملا ہے تو میں اس سے فائدہ اٹھا کر پوچھنا چاہونگی کہ اردو ادب میں خواتین برائے نام ہی سامنے آئی ہیں۔ ایسا کیوں؟

جواب۔ "وجہ یہ ہے کہ.... انہوں نے کھل کر بات کی' کہ یہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ رہا ہے۔ عورتوں کی تعلیم کا انتظام ویسا نہیں ہوا جس طرح مردوں کے لئے ہوتا ہے۔ پھر عورتوں کو ہم نے چار دیواری میں بند رکھا اس کی وجہ سے یہ اثرات مرتب ہوئے' اسی کے مطابق قدریں وجود میں آئیں' ہماری روایتیں بنیں۔ عورت کا کام' جو اس کے سپرد کیا گیا وہ یہ کہ اپنے بچوں کی تربیت ایسی کرے کہ وہ زندگی میں کامیاب رہیں اور نیک اور صالح ہوں۔ بحیثیت ماں یہ اس کا بنیادی کردار رہا' اب ماں کے علاوہ بھی عورت کے اور کردار ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ماں کا کردار باقی رکھتے ہوئے کیا عورت کے لئے یہ ممکن ہے کہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی طرف وہ بھرپور توجہ دے سکے؟ تو ایسی مثالیں ہیں لیکن خال خال' کم کم۔ کیونکہ انسان اتنا ہی بوجھ اٹھا سکتا ہے جتنا ممکن ہے۔ اب جہاں تک صلاحیت کا تعلق ہے تو صلاحیت میں عورت کسی طرح مرد سے کم نہیں ہوتی۔ میں ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ یہ جو ہماری کائنات ہے۔ کائنات سے مراد ہماری زمین ہے' جہاں انسان موجود ہے' عورت پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے زندگی کو آگے بڑھانے کا کام اور مرد کو اس کے قریب لاکر اس کی حفاظت اور اس کی ضروریات پوری کرنے کا کام لیا تاکہ عورت محفوظ رہ کر زندگی کو آگے بڑھانے کا کام کرے۔ زندگی کو آگے بڑھانے کا کام بچوں کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ جن کی وہ ماممتا سے پرورش کرتی اور انہیں تربیت کے ساتھ پالتی ہے۔ یہ عورت کا بنیادی کام ہے۔ بظاہر کوئی اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بڑے بڑے نامعقول اور جابر مرد' جن کے یہاں زندگی میں کوئی منطق نہیں ہوتی' بس غصہ ہوتا ہے تو عورت اسے بھی بڑے ٹھنڈے دل سے برداشت کرتے ہوئے نبھاتی ہے یہ صلاحیت عورت میں ہے مرد میں نہیں۔ اس عمل کو سمجھنے کے لئے آپ پرکار سے ایک دائرہ بنائیے۔ جب شادی ہوتی ہے تو دولھا صاحب اس دائرے کے مرکز میں بیٹھے ہوتے ہیں اور دلہن دائرے کے باہر اس کے آخری سرے پر ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب دونوں کا سفر شروع ہوتا ہے تو دولھا کا سفر مرکز سے باہر کی طرف ہوتا ہے اور عورت کا سفر باہر سے اندر کی طرف ہوتا ہے اور کچھ ہی عرصے میں عورت خاندان کی اکائی کا مرکز بن جاتی ہے خاندان کی ساری زندگی مرد کے نہیں عورت کے چاروں طرف گھومتی ہے۔ اب عورت خاندان

کے نظام شمسی کا سورج بن جاتی ہے اور سارے افراد خاندان اس کے چاروں طرف گردش کرتے ہیں۔ یہی زندگی کا اصل مرکز ہے مرد کچھ کر لے۔ عورت کی اس حیثیت کو ختم نہیں کر سکتا۔ یہ نظام فطرت ہے۔ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا میں عورتوں کی طرف داری نہیں کر رہا ہوں صرف ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔"

بات کا رخ اب سوال نمبر3 کی جانب تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ "بی بی بات یہ ہے کہ فکشن ایک لطیف آرٹ ہے ٹھیک ہے۔ شاعری میں بھی جدیدیت کی تحریک چلی، فکشن میں بھی جدیدیت کی تحریک چلی تو کسی تحریک کا چلنا یا کسی نئے تجربے کا ہونا فکشن یا شاعری میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے بلکہ تخلیق اپنے نئے نئے تیور، نئے نئے لہجوں اور نئی نئی طرزوں کے ساتھ وجود میں آتی ہے۔ انسان جب کسی ایک ڈگر پر چلنے سے تھک جاتا ہے تو نئے راستوں کی تلاش شروع کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک ڈھب کے ناول لکھے گئے جیسے کہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ایک ڈگر پر لکھے گئے۔ عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول بھی ایک ہی ڈگر پر ہیں۔ منشی پریم چند کو لیجئے انہوں نے بھی جو ناول لکھے تو وہی حقیقت پسندانہ، زندگی سے قریب۔ اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے اور اپنے معاشرے کے نچلے متوسط طبقے کے مسائل کا مطالعہ کر کے یہ کہانیاں لکھی گئیں۔ جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی اور حقیقت نگاری کو اہمیت دی گئی چنانچہ پریم چند ان سے قریب ترین نظر آئے اسی لئے وہ اس کے پیش رو ہیں لیکن جب قاری حقیقت نگاری سے تھک گیا تو ردعمل کے طور پر جدیدیت کی تحریک شروع ہوئی۔ ایک تو باہر کی حقیقت نگاری ہوتی ہے، خارجی جدیدیت نے انسان کے باطن میں جھانکنا شروع کیا انسان کس طرح سوچتا ہے؟ کس طرح الجھا ہوا ہے؟ تنہا ہے کیونکہ تنہائی صنعتی دور کے فرد کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ جدیدیت شروع ہوئی تو اس نے حقیقت نگاری کو رد کر دیا۔ حقیقت نگاری کو مسترد تو کیا لیکن کچھ چیزیں تخلیقی سطح پر اس طرح مسترد نہیں ہوتیں بلکہ کچھ اجزا اس کے بھی جدیدیت میں در آئے۔ اب بات اندر کی بیان کرنی ہے، باطن کے متعلق کچھ کہنا ہے تو اس کی ایک صورت باہر کی دنیا سے ملتی جلتی ہوگی۔ جب اس کو بیان کریں گے تو خارج کو آپ باطن سے اس طرح الگ نہیں کر سکتے کہ کوئی چیز کہلاتا" خارجی کہلائے اور کوئی چیز کہلاتا" باطنی کہلائے۔ خارج و باطن دونوں گڈمڈ ہو کر، مل جل کر چلیں گے۔ میرا کہنا یہ تھا کہ جدیدیت نے فکشن کو ایک نئی وسعت دی اور جو یکسانیت حقیقت نگاری کی تحریک کے زیر اثر فکشن میں پیدا ہو گئی تھی اس کو دور کر کے ہمارے دل کی آواز کو فکشن میں شامل کیا۔"

یہاں میں نے ان سے پوچھا کہ اس طرح فکشن میں ابہام پیدا نہیں ہوا؟ جالبی صاحب نے بڑی نکتہ رس بات کہی کہ "ابہام تو فن کا حصہ ہے۔ حقیقت نگاری میں ابہام نہیں ہوتا۔ لیکن اگر آپ اس کا تجزیہ کریں تو ابہام کا ہلکا سا پہلو اس میں بھی آپ کو ملے گا اس لئے کہ فن کوئی بھی ہو، ابہام سے پاک نہیں ہو سکتا بلکہ جتنا خوبصورت ابہام پیدا ہوگا اتنا ہی اس کا فن جاندار ہوگا۔ مثلاً "کسی

نے ایک واقعے سے متاثر ہو کر ناول لکھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس واقعہ کا تاثر ختم ہو گیا مگر ایک اچھا اور بڑا ناول' وقت کے ساتھ' اپنے اندر نئے معنی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ معنی جو پہلے ہمیں نظر نہیں آرہے تھے اب اس فن پارے میں نظر آنے لگتے ہیں۔"

"لیکن اس میں بھی تو ابلاغ کا مسئلہ ہے جو بنیادی عنصر ہے وہ نہ ہو تب؟" میں نے پوچھا۔ وہ دھیمے لہجے میں بولے "ابلاغ کی **سطحیں** مختلف ہوتی ہیں۔ ایک ابلاغ ہوتا ہے اخبار کا' ایک ابلاغ ہوتا ہے اوسط درجے کی تحریر کا اور ایک ابلاغ ہوتا ہے ادبی شہہ پارے۔ کا۔ ادبی شہہ پارے والا ابلاغ انہی لوگوں کے لئے ہے جو ادبی ذوق رکھتے ہیں' جن کی ذہنی طور پر تربیت ہوئی ہے ان سے تو وہ مکالمہ کرے گا۔ مثال کے طور پر نسیم حجازی کے ناول ہیں۔ ایک ناول پڑھ کر ممکن ہے آپ سے دوسرا ناول نہ پڑھا جائے پہلی دفعہ پڑھ کر قاری اس سے بہت لطف اندوز ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" یا "کار جہاں دراز ہے" پڑھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک تربیت یافتہ قاری کے مطالعے کے لئے ہے۔ مطلب یہ کہ جب کوئی بڑا فن پارہ تخلیق ہوتا ہے تو اس کے سارے پہلو کھل کر ایک دم سامنے نہیں آتے۔ معانی اس کے اندر کی تہوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ کبھی ذہن ایک تہ تک پہنچتا ہے اور کبھی دوسری تہ تک۔"

"پھر عام آدمی کس طرح مستفید ہو؟ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے کہا۔ "عام آدمی کو اپنی ذہنی و فکری تربیت کرنی پڑے گی۔ **مثلاً**" جب ہم نے لکھنا پڑھنا شروع کیا تو علامہ راشد الخیری کے ناول پڑھے یا ڈپٹی نذیر احمد کے ناول پڑھے تو یہ ناول ان قدروں کے مطابق تھے جو ہمارے زمانے میں مروج تھیں لیکن اس کے بعد جب ذہن میں تبدیلیاں آئیں تو پسند اور مطالعے میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ ایک ناول یا افسانے کو پڑھ کر انسان کے ذوق کی تربیت نہیں ہوتی مسلسل مطالعے سے ذہنی تربیت ہوتی ہے۔ ادب کا کام ہی یہ ہے کہ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اس خوبصورتی سے اپنے اندر سمیٹے کہ وہ بات آپ کو بھلی لگے اور آپ کے کانوں میں رس گھولنے لگے۔

میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں میر تقی میر اپنے زمانے کے سب سے بڑے شاعر تھے سب سے بڑے ہی نہیں مقبول ترین شاعر تھے۔ جس مشاعرے یا جس محفل میں میر صاحب جاتے تھے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ میر کی انگلیاں اٹھارویں صدی کے معاشرے کی نبض پر رکھی ہوئی تھی۔ معاشرے میں کے باطن میں جو کچھ ہو رہا تھا میر صاحب نے اس کی ترجمانی اسی غم ناک اور درد بھرے لہجے میں کی وہ اس معاشرے کے واقعات اور حادثات کو اپنے لہجے اور اپنی شاعری میں بیان کر رہے تھے چنانچہ وہ یہ شعر پڑھتے تھے۔

شہاں' کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

تو سننے والے کا ذہن فوراً "شاہ عالم ثانی کی آنکھوں تک پہنچتا تھا جس کے سینے پر چڑھ کر غلام قادر

روہیلہ نے خنجر سے دونوں آنکھیں نکال لی تھیں۔ جب بھی یہ شعر معاشرے میں پڑھا جاتا تو اس کے ساتھ ایک الم ناک کرب کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ لیکن اب نسلیں گزر جانے کے بعد وہ شعر اس طرح متاثر نہیں کرتا جس طرح اس واقعہ کے تعلق سے کرتا تھا مگر بڑے ادب کی یہی پہچان ہے کہ وقت کے ساتھ اس میں معنویت کے نئے پہلو جگمگانے لگیں۔ چنانچہ میر صاحب کا یہ شعر آج بھی جب آپ سنتے ہیں تو بغیر کسی حوالے کے جو شاہ عالم ثانی سے متعلق ہے' وہ ہمیں متاثر کرتا ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ادب کو اپنے دور کا بھی ترجمان ہونا چاہئے اور ساتھ ساتھ آنے والے دور کو بھی اپنے اندر سمیٹنے کی قدرت و صلاحیت رکھنی چاہئے۔ مثال کے طور پر قمر جلالوی ہمارے دور کے مشہور شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے دور کی عکاسی کی مگر اب نہیں جانے جاتے۔ صرف زبان و بیان کا چٹخارہ ہے اس لیے ہم انہیں غالب یا مومن کے درجے پر لا کر کھڑا نہیں کر سکتے۔ اب اگر آپ پوچھے کہ میر' سودا' غالب اور مومن اور قمر جلالوی میں کیا فرق ہے تو اس کا جواب آسانی سے دیا جا سکتا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب بات سے بات اور جواب سے سوال پیدا ہو رہا ہے کہ ادب کو سمجھنے اور اس سے مستفید ہونے کے لیے مطالعہ کرنا اور پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ پاکستان کو بنے ہوئے باون سال ہو چکے ہیں۔ اور ان باون سالوں میں ہمارے یہاں خواندگی کی شرح کچھ اتنی نہیں بڑھی کہ ہماری نئی نسل ادب سے فیض یاب ہو تو کیا یہ ادیبوں کا فرض نہیں کہ اس ملک میں خواندگی کی شرح بڑھانے کے لیے کوششیں کریں؟"

"جناب ادیب کا کام خواندگی کی شرح بڑھانا نہیں ہے' اس کا کام ادب تخلیق کرنا ہے خواندگی کی شرح بڑھانا معاشرے کی ذمہ داری ہے۔ خصوصاً" جدید حکومت کی ذمہ داری ہے خواندگی کی شرح پاکستان میں کبھی نہیں بڑھ سکتی۔ آپ دنیا کا نقشہ سامنے رکھیں۔ دنیا میں ایسے کسی ایک ملک کا نام بتائیے جہاں شرح خواندگی سو فی صد ہو لیکن جہاں ذریعہ تعلیم کوئی بیرونی زبان ہو۔ میں یہ بات بار بار کہتا ہوں لیکن کوئی سمجھنا نہیں چاہتا۔ پاکستان بنا تھا تو خواندگی کی شرح 34 فی صد تھی۔ اب آبادی بڑھ گئی ہے تو خواندگی کی شرح 26 فی صد ہے یا 32 فی صد۔ جس معاشرے میں اپنی زبان میں تعلیم دی جائے گی اس معاشرے میں شرح خواندگی سو فی صد بڑھنے کے امکانات ہوتے ہیں۔ چین کی مثال لیجیے کہ جب 1949ء میں انقلاب آیا تو شرح خواندگی کیا تھی؟ اور آج شرح خواندگی تقریباً" سو فی صد تک پہنچ گئی ہے۔ وہ کوئی دس یا بیس لاکھ کی آبادی کا ملک نہیں ہے بلکہ سوا کروڑ کی آبادی کا ملک ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں ساری تعلیم اپنی زبان میں دی جاتی ہے۔ اس وقت چین کی زبان اس قدر ترقی یافتہ نہیں تھی کہ سارے علوم کی تعلیم اس زبان میں دی جاتی لیکن اب اس زبان میں سارے علوم کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ جاپان' فرانس' امریکہ' برطانیہ' میں شرح خواندگی سو فی صد ہے کیونکہ یہاں اپنی اپنی زبانوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں شرح خواندگی سو فی صد

اس وقت ہوگی جب بچوں کو تعلیم ان کی مادری زبان میں یا قومی زبان میں دی جائے گی۔ اس کے بغیر ہم یوں ہی جاہل اور ناخواندہ رہیں گے۔ اللہ ہمیں عقل دے کہ ہم اس راز کو سمجھ سکیں۔"

"لوگوں کو مطالعے کا شوق کیسے دلایا جائے؟" میرا سوال تھا

انہوں نے کہا "دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جن کے اندر مطالعے کا شوق ہے اور دوسرے وہ جن میں مطالعے کا ذوق پیدا کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں ہر لائبریری کے اندر بچوں کے لئے الگ انتظام ہوتا ہے۔ مائیں بچوں کو لے کر "ہاتھ گاڑی" میں لائبریری آتی ہیں۔ وہ لائبریری کے اندر بھاگتے دوڑتے ہیں اور اپنی پسند کی کتابیں لے لیتے ہیں اور پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں یا پڑھتے ہیں۔ چھٹیوں میں کتابیں پڑھنے کا مقابلہ ہوتا ہے' اسکولوں میں لائبریری سے کتابیں لینا اور پڑھنا اور ان پر تبادلہ خیالات کرنا ہوتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ پڑھنے کا شوق بچپن سے' پرائمری کلاس سے ڈالا جاتا ہے تو پھر مطالعہ عادت بن جاتا ہے۔ لیکن بڈھے طوطوں میں مطالعے کی عادت پیدا نہیں کی جاسکتی۔ ہمارے ہاں وہ اسکول جہاں پانچ پانچ ہزار فیس لی جاتی ہے۔ پرائیوٹ اسکول جہاں انگلش میڈیم میں پڑھایا جاتا ہے وہاں بھی آپ دیکھیں کہ کتاب پڑھنے کا ذوق پیدا کرنے کیلئے کچھ نہیں کیا جاتا۔ گورنمنٹ اسکولوں کا بھی یہی حال ہے۔ جب یہ صورتحال ہوگی تو آپ بتائیے کہ مطالعے کا ذوق وشوق کیسے پیدا ہوگا؟ دوسری وجہ یہ ہے کہ اساتذہ میں خود مطالعے کا کوئی شوق نہیں ہے لیکن نوکریاں کررہے ہیں ادب پڑھانے کی۔ ایسے اساتذہ کثرت سے ہیں جو نقل کرکے پاس ہوئے اور سفارش کراکے نوکر ہوئے۔ ان کے پاس خود دینے کیلئے کچھ نہیں ہوتا۔ جب ان میں خود ذوق مطالعہ نہیں ہے تو یہ بچوں میں کس طرح مطالعے کا ذوق منتقل کرسکیں گے۔ یہ ساری صورتحال ہے جس نے مل جل کر یہ نقشہ پیدا کیا ہے۔"

"اس میں تبدیلی لانے کے کچھ امکانات ہیں؟

"جی ہاں۔ تبدیلی کے امکانات بالکل موجود ہیں۔" وہ کہہ رہے تھے "یہ پورا معاشرہ جاگیردارانہ نظام کی گرفت میں ہے 1947ء میں یہ نظام اتنا مضبوط نہیں تھا جتنا آج ہے۔ پہلے جاگیردار یا نواب شاعروں' ادیبوں اور دوسرے اہل فن حضرات کو اپنے سے وابستہ رکھتے تھے اب یہ صورت بھی بند ہوگئی ہے۔ اب ان کے پاس پانچ' دس گاڑیاں کھڑی ہیں۔ گھومنے پھرنے جارہے ہیں علاج کیلئے باہر جارہے ہیں۔ لیکن علم کے حوالے سے ان کی اپنی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ ان کو اپنے فرائض یاد نہیں رہے صرف حقوق یاد رہ گئے ہیں۔ لہٰذا عوام کو استعمال کررہے ہیں۔ ہماری تاریخ سچائی کی تاریخ نہیں ہے بلکہ جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی تاریخ ہے۔ ہمارے مسائل اس لئے ہیں کہ ہم اپنے آپ سے سچے نہیں ہیں۔ اپنے معاشرے سے سچے نہیں ہیں۔ اپنی قوم سے سچے نہیں' صرف اپنی ذات سے سچے ہیں اور اسی میں محصور ہوگئے ہیں۔ اس بحران کا شکار آج کا ہمارا ادیب بھی ہے۔ مثال کے طور کسی نے ایک ناول لکھا' بھاگ دوڑ کرکے اسے چھپوا بھی دیا تو کیا اس کو اپنی محنت

کا یہ صلہ بھی نہ ملے کہ وہ سال بھر اپنے کنبے کو دو وقت کی روٹی فراہم کر سکے؟ اب جب وہ لکھنے کے عمل سے روٹی فراہم نہیں کر سکتا تو لکھنے کا عمل ذیلی ہو جائے گا چنانچہ وہ ادب تو تخلیق کر ہی نہیں سکتا۔ اس طرح سارا معاملہ چوپٹ ہو گیا۔ ہمارے یہاں 90 فیصد لوگ براہ راست یا بالواسطہ سرکاری ملازمتوں سے وابستہ ہیں۔ سرکاری نوکری سے وابستگی کے باعث سرکار کی کچھ پابندیاں بھی ان پر عائد ہوتی ہیں۔ اب یہ سرکاری نوکریاں کیوں کرتے ہیں اس لئے کہ لکھنے پڑھنے کے کاموں سے انہیں زیادہ آمدنی نہیں ہوتی تو وہ کیا کریں؟"

"ڈاکٹر صاحب ایک سوال تنقید سے متعلق ہے۔ آپ خود بھی نقاد ہیں۔ یہ بتائیے آج کل جو تنقید ہو رہی ہے کیا وہ صحیح مفہوم میں ہو رہی ہے کیونکہ تنقید تو ادیب کی رہنمائی کرتی ہے۔"

"دیکھیے دو باتیں ہیں۔ تنقید زیادہ تر ان لوگوں کے بارے میں لکھی جا رہی ہے جو اس دنیا سے گزر چکے ہیں میر سودا' غالب' مومن' یا مثال کے طور پر وہ جو حال ہی میں مرے ہیں جیسے ہمارے فیض احمد فیض' ن م راشد وغیرہ۔ ان پر تنقید ہو رہی ہے' اچھی اور کھل کر ہو رہی ہے پڑھی بھی جا رہی ہے مگر کم پڑھی جا رہی ہے کیونکہ ادیب و شاعر تو اس فکر میں ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں بات کی جائے چنانچہ کتابوں کی رونمائی کی راہیں کھولی گئیں۔ ان تقریبات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو کام مرزا رفیع سودا نے آصف الدولہ کے حضور قصیدہ پڑھ کر کیا وہی کام نقاد ان کیلئے بھی انجام دے۔ یعنی ایک خوبصورت سا قصیدہ لکھ کر رونمائی کے موقع پر ان کی شان میں پڑھ دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاصر ادب پر تنقید' مدحیہ' تعریفی اور قصیدہ خوانی کی سطح پر آجاتی ہے سامنے کی بات یہ ہے: آپ کے سامنے بیٹھا ہوں اور کہتا ہوں کہ یہ دیکھئے یہ کتاب میں نے لکھی ہے تو آپ اخلاقاً" ورق گردانی کر کے کہیں گی کہ جالبی صاحب آپ نے بہت اچھی کتاب لکھی ہے' کتنی محنت کی ہے۔ کس قدر ضخیم کتاب لکھی ہے مجھے بتایئے کہ آج سے 25' 30 سال پہلے کتابوں کی رونمائی ہوتی تھی؟ میری 36 کتابیں ہیں۔ کسی کی بھی رونمائی نہیں کی گئی۔

کیونکہ اس وقت تنقید ادب کی زندگی میں لکھی جاتی تھی لیکن جانبداری تو اس زمانے میں بھی برتی جاتی تھی جیسے "آب حیات" میں محمد حسین آزاد نے اپنے استاد ذوق کو زیادہ سراہا۔ وہ ان کے استاد تھے ان کے باپ تھے۔ انہوں نے باپ کی تعریف کی' اس سے ہٹ کر تنقید لکھنے کی جو آزادی تھی وہ اب نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جس کے بارے میں تنقید لکھی جا رہی ہے ان میں اب تحمل اور برداشت نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ میں نے لکھ دیا وہ کلام خداوند ہے۔ جب اسے بتایا جاتا ہے کہ یہ چیز یوں ہے' اسے ایسا ہونا چاہیے تو وہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ اسی لئے جو معاصرین پر لکھا جا رہا ہے وہ یا تو مدح ہے یا ہجو ہے یا تقریظ ہے لیکن وہ تنقید نہیں ہے۔ اگر اس حصے کو آپ نکال دیں جو تبصروں کی شکل میں یا زندہ معاصر کے سلسلے میں اس کے کسی دوست کی تحریر ہے تو وہ تنقید کے ذیل میں نہیں آتی۔ میں اپنی مثال دوں کہ میرے خلاف لوگوں نے لکھا۔ میں نے ان کی

بات بڑے تحمل سے سنی۔ آج تک میں نے کبھی برا نہیں مانا اگر کسی نے کہا کہ ان سے غلطی ہوئی ہے یا ان کا نظریہ غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک زاویہ نظر وہ بھی ہے وہ بھی قابل احترام ہے ادب میں لین اور دین، تحمل اور برداشت ہونا چاہیے اس لئے کہ کوئی بھی عقل کل نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب آخری سوال ہے کہ اردو میں انگریزی الفاظ کی شمولیت کس حد تک ہونی چاہیے کہ اردو کا حلیہ خراب نہ ہونے پائے۔"

ڈاکٹر جالبی نے کہا۔ "آپ نے کبھی سوچا کہ الفاظ کیوں آتے ہیں یہ الفاظ اس لئے آتے ہیں کہ جب کوئی نیا تصور آئے گا تو وہ لفظ کے ساتھ آئے گا۔ وہ لفظ اس تصور کا Carrier ہے۔ ایسے بہت سے الفاظ آپ کو خطوط غالب میں ملیں گے۔ جیسے نمبر، پلٹن، ڈاک وغیرہ وغیرہ۔ بہت سے انگریزی الفاظ انشاء اللہ خاں کے یہاں بھی آپ کو ملیں گے۔ وہ الفاظ یا تو چیزوں کی شکل میں آئے ہیں یا تصور کی شکل میں آئے ہیں اب اگر وہ تصور ہی بالکل نیا ہے تو بہتر ہے کہ اس لفظ کو آپ اپنی زبان کے صوتی نظام میں ڈھال کر جوں کا توں قبول کر لیجئے جیسے ٹکٹ، انجن، پلیٹ فارم اور ٹیلی ویژن کو ہم نے قبول کر لیا۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو اس شکل میں ہمیں قبول نہیں کرنے چاہئیں جس شکل میں آج ہمارے اخبارات قبول کر رہے ہیں۔ یہ بڑی سہل پسندی ہے، کم علمی کہہ لیجئے کہ ان کو معلوم نہیں ہے یا ان میں لفظوں کو وضع کرنے کی قوت نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ کچھ عرصہ پہلے ایک نیا تصور آیا پرائیوٹائزیشن (PRIVATIZATION) کا۔ ٹیلی ویژن پر بھی یہ لفظ آیا۔ اس لفظ کو لکھنے میں بھی دقت ہوئی کیونکہ یہ لفظ ہمارے صوتی نظام سے مماثلت نہیں رکھتا۔ میں نے ٹیلی ویژن کے ارباب حل وعقد کو لکھا کہ یہ لفظ ادائیگی کے وقت گلے میں اٹکتا ہے۔ پھر ان کے کہنے پر ایک لفظ میں نے وضع کیا۔ "نج کاری" میں نے کہا چار دن اسے استعمال کریں تو یہ لفظ چل پڑے گا لوگ مانوس ہو جائیں گے اور وہی ہوا کہ یہ لفظ چل پڑا۔ پھر اخبارات کو بتایا گیا۔ سب نے استعمال کیا تو اخبارات میں بھی چل پڑا تو اب یہ لفظ بھی اور الفاظ کے ساتھ محفوظ ہو گیا۔ یہی کام پہلے کے اخبارات اور اخبار نویسوں نے کیا ہے جیسے مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد اسماعیل، مولانا ابوالکلام آزاد، جالب دہلوی اور دوسرے لوگوں نے۔ انہوں نے بعض الفظ کو جوں کا توں لے لیا کہ وہ تصور ہی نیا تھا مثلاً" ریڈیو پورا لفظ لے لیا۔ لیکن جو اجنبی الفاظ تھے انہیں زبان کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے وضع کر لیا۔ اخبارات میں وہ استعمال ہوئے اور اردو زبان کا حصہ بن گئے۔ چنانچہ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم الفاظ وضع بھی کریں۔ انہیں اختیار کریں تو اپنے صوتی نظام میں ڈھال کر۔ نئے لفظ تو ہمیشہ آتے رہیں گے۔ وہ آتے ہیں زیادہ تر "اسم" کی صورت میں یعنی چیزوں کے نام اور صوتی نظام پر ڈھالے جاتے ہیں۔ جیسے عربی میں نیشنل کو نیشنال، جنرل کو جنرال بنا کر اپنے صوتی نظام کے مطابق ڈھال لیا گیا۔ یہی ہمیں بھی کرنا چاہیے۔ اخبارات اس کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ یعنی زبان کو سدھارنے کا اسے معیار دینے کا اور زبان میں نئے الفاظ وضع کر کے

انہیں شامل کرنے کا۔"

ڈاکٹر صاحب سے گفتگو ختم ہوئی۔ اب ان کا تعارف درج ذیل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی یکم جولائی 1929ء کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام محمد جمیل خان ہے۔ ایم اے' ایل ایل بی' پی ایچ ڈی' ڈی لٹ ہیں اور ڈی ایس سی کی اعزازی ڈگری بھی انہیں حاصل ہے۔ جامعہ کراچی کے وائس چانسلر رہے ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان اور اردو لغت بورڈ کے صدر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ ان کی ادبی خدمات کے طور پر انہیں درج ذیل ادبی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

(1) داؤ ادبی انعام' 1964ء' 1973ء' 1974ء' 1975ء (2) یونیورسٹی گولڈ میڈل 1987ء (3) محمد طفیل ادبی ایوارڈ 1989ء (4) ستارہ امتیاز حکومت پاکستان' 1990ء (5) ہلال امتیاز' حکومت پاکستان 1994ء۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تصانیف و تالیفات یہ ہیں۔ (ہر کتاب کے سامنے صرف پہلے ایڈیشن کا سن اشاعت دیا گیا ہے)۔

تنقید۔

(1) تنقید اور تجربہ (24 تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 1967ء (2) نئی تنقید (32 تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 1985ء (3) ادب کلچر اور مسائل (56 تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 1986ء (4) محمد تقی میر۔ ایک مطالعہ (بابائے اردو میموریل لیکچر) 1981ء (5) معاصر ادب (نانوے تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 1991ء (6) قومی زبان یکجہتی' نفاذ اور مسائل 1989ء (7) قلندر بخش جرات لکھنؤی تہذیب کا نمائندہ شاعر 1990ء۔

تحقیق۔

(1) مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (اردو زبان کی پہلی معلوم تصنیف) 1972ء (2) دیوان حسن شوقی۔ 1971ء (3) دیوان نصرتی (1972ء)۔

لغات۔

(1) قدیم اردو کی لغت 1973ء (2) فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ جلد اول 1991ء (3) قومی انگریزی اردو لغت (دو لاکھ الفاظ و اندراجات پر مشتمل جامع لغت 1992ء (4) فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ جلد دوم 1993ء

کلچر۔

(1) پاکستانی کلچر قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ 1964ء (2) The Identity of Culture
(3)The Changing World of Islam,1986 (4)1986 Pakistani Culture 1986

تاریخ ادب۔

(1) تاریخ ادب اردو جلد اول 1975ء (2) تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول 1982ء (3) تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم 1982ء

تراجم۔

(1) جانورستان (جارج آرول کے ناول "اینیمل فارم" کا اردو ترجمہ) 1958ء (2) ایلیٹ کے مضامین 1960ء (3) "ارسطو سے ایلیٹ تک" (ڈھائی ہزار سالہ مغربی فکر کے منتخب، عہد آفرین شاہکار کا اردو ترجمہ مع تعارف) 1975ء (4) برصغیر میں اسلامی جدیدیت (پروفیسر عزیز احمد کی شہرہ آفاق تصنیف "اسلامک ماڈرن ازم" کا اردو ترجمہ) 1989ء (5) برصغیر میں اسلامی کلچر (پروفیسر عزیز احمد کی عالمی شہرت یافتہ تصنیف "اسلامک کلچر" کا اردو ترجمہ) 1990ء (6) بوطیقا از ارسطو 1998ء

دیگر کتابیں:۔

(1) حاجی بغلول۔ منشی سجاد حسین 1960ء (2) بزم خوش نفساں (شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کا مجموعہ) 1985ء (3) ن۔م۔ راشد... ایک مطالعہ 1986ء (4) کلیات میرا جی 1989ء (5) میرا جی۔ ایک مطالعہ 1990ء

بچوں کے لئے۔

(1) حیرت ناک کہانیاں 1983ء (2) خوجی 1993ء (3) بارہ کہانیاں (1993ء)

سندھی میں ترجمہ شدہ کتابیں

(1) پاکستانی کلچر (سندھی) 1987ء (2) حیرت ناک کہانیاں (سندھی) 1985ء

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحریروں کے بارے میں کتابیں۔

(1) ڈاکٹر جمیل جالبی سوانحی کتابیات، مرتبہ: نسیم فاطمہ 1988ء (2) ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ایک مطالعہ، مرتبہ: ڈاکٹر گوہر نوشاہی 1993ء (3) ڈاکٹر جمیل جالبی۔ سوانحی کتابیات، مرتبہ: نسیم فاطمہ وسعید احمد 1994ء۔

سعید احمد کے ساتھ مل کر نسیم فاطمہ ان دنوں اس میں چند اضافے کرکے دوسرا ایڈیشن مرتب کررہی ہیں۔"

Dr. Jamil Jalebi,

D-26,Block-B,North Nazimabad,

Karachi-74700(Pakistan)

"میرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ بے تاب ٹکڑے جس خوبصورتی سے قطرے کے
بچے وقت میں حسن کی جاں نواز زندگی نے میری ہر لغزش کو افسانہ
بنا دیا"
جمیل زبیری
یکم فروری سنہ ۹۹ء

جمیل زبیری
کراچی

بہت کم چہروں پر ہر وقت مسکراہٹ کی چمک سجی رہتی ہے۔ جناب جمیل زبیری کو جب بھی میں نے دیکھا مسکراتے دیکھا اور مسکراہٹ بھی ایسی کہ دل کے نہاں خانوں سے ابھری ہوئی۔

ریڈیو پاکستان میں میری جب بھی جمیل زبیری صاحب سے ملاقات ہوئی انہوں نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا۔ شگفتگی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ ان کا شعری ذوق بھی بڑا عمدہ ہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ افسانے کے آدمی ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایک انسان کے ذاتی کرب کے ساتھ سماجی و معاشی عدل سے محرومیت کی کہانی بھی ملتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں پاکستان کے سماجی مسائل کا عکس ہے اور ان کے افسانوں کے آئینے میں ہماری سماجی' سیاسی و معاشرتی تاریخ کی بھرپور تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس طرح افسانے کا تاثر بھی دیرپا ہو جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری کا رجحان بھی موجود ہے۔ سماجی مطالعہ میں حقیقت نگاری کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ تحریر کوئی ہو نثر یا نظم' اگر اس میں زندگی کا احساس' زندگی کا خیال یا زندگی کا کوئی تجربہ موجود نہ ہو وہ تحریر

بہت جلد اپنی موت آپ مرجاتی ہے۔

جمیل زبیری کے نہ صرف افسانے بلکہ ان کے سفرناموں اور ان کے ناول "رینی" میں بھی زندگی دھڑکنیں لیتی نظر آتی ہے۔ وہ بات کہنے کا انداز اور خوبصورت فقروں کا استعمال جانتے ہیں اور تحریر اور قاری کی فکر کو ہم آہنگ کرنے کا فن بھی۔ اردو زبان و ادب سے جمیل زبیری کو قلبی لگاؤ ہے۔ انہوں نے "ہم عصر" کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی اور ہر ماہ اپنے گھر پر تنقیدی نشست منعقد کرتے ہیں جس میں شہر کراچی کے جونیئرز اور سینئرز اپنی شرکت کو باعث فخر سمجھتے تھے۔

آج کل جمیل زبیری بینائی کے عارضے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ امریکہ سے آنے کے بعد بھی میرا ان سے خطوط کے ذریعے رابطہ قائم ہے۔ وہ بہت پابندی سے خطوط کے جواب دینے والوں میں سے ہیں اور اپنے خطوط میں آج بھی ویسے ہی شگفتہ اور اپنے چہرے پر ملکوتی مسکراہٹ سجائے نظر آتے ہیں۔

خط تو نصف ملاقات ہے کیوں نہ آپ بھی اس نصف ملاقات میں شریک ہوں۔ میں جمیل زبیری صاحب سے پوچھتی ہوں۔

"زبیری صاحب! کیا یہی آپ کا قلمی نام بھی ہے؟ وہ فرماتے ہیں۔ "جی! میرا قلمی نام بھی یہی ہے۔ تاریخ پیدائش بتائیں گے؟ مسکرا کر بولے "کیوں نہیں۔ تاریخ پیدائش تو عورتیں چھپاتی ہیں۔ ان کا لہجہ مدھم تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے کہتے ہیں۔ "میں ۱۵ ستمبر ۱۹۲۸ء کو مارہرہ یوپی' انڈیا میں پیدا ہوا۔ سینٹ جانز کالج آگرہ سے بی اے کیا۔ شروع میں پاکستان آکر مختلف ملازمتیں کیں اور بعد میں پبلک سروس کمیشن نے مجھے ریڈیو پاکستان میں سینیئر پروڈیوسر کے لئے منتخب کیا۔ جہاں میں نے ۲۵ سال سروس کی اور اب پنشن پر ہوں۔"

ہمارے دوسرے سوال کے جواب میں کیا فرمائیں گے آپ؟

انہوں نے کہا۔ "میری ناقص رائے میں بیسویں صدی میں جو نام زندہ رہ جائیں گے ان میں فیض' اقبال' مشتاق احمد یوسفی' منٹو' کرشن چندر' عصمت چغتائی اور ممتاز مفتی کے نام لئے جاسکتے ہیں۔"

یہ ہے سوال نمبر ۳۔ "زبیری صاحب نے سوال پڑھ کر کہا۔ "جدیدیت جو بے معنی ہو اور ابلاغ نہ رکھتی ہو ادب کے حسن کو بگاڑنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتی اسی لئے وہ اپنی موت مر رہی ہے۔"

سوال نمبر ۴ کے جواب میں وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھر بھی رقص کر رہی تھی اور وہ کہہ رہے تھے۔

"ناول لکھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ آج کل زندگی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ لوگوں کو طویل ناول لکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے ملک میں ابھی ناول نویسی نے جڑیں نہیں پکڑی ہیں مگر آئندہ کے لئے امید کی جاسکتی ہے۔"

سوال نمبر ۵ کے جواب میں اپنے وسیع مشاہدے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "ان سب چیزوں کا تعلق سیاست سے ہے۔ جب تک ملک کی سیاست بہتر راستے پر نہیں آئے گی اور ملک میں امن و امان قائم نہیں ہوگا اور تعلیم عام نہیں ہوگی یہ ساری مصیبتیں نازل رہیں گی اور ہم بحرانی کیفیت کا شکار رہیں گے۔ "سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔" معیاری ادب کا پیمانہ میرے خیال میں یہی ہے جسے عوام دلچسپی سے پڑھیں اور اس میں پورا پورا ابلاغ بھی ہو۔ آج وہی کتابیں فروخت ہوتی ہیں جن سے لوگ متاثر ہوتے ہیں اور انہیں دلچسپی سے پڑھتے اور خریدتے ہیں۔ جب کہ بیرونی ممالک میں وقت کی کمی اور ماحول ہے۔ جب تک یہ دونوں چیزیں میسر نہ ہوں نثر لکھنا بہت مشکل ہے۔

اور جناب "انگریزی زبان کی شمولیت سے گریز نہیں ہو رہا۔ الفاظ بھی برابر اردو میں شامل ہو رہے ہیں اور ترجمے بھی کافی ہو رہے ہیں۔ اردو ترجمے تو حال ہی میں میں نے بھی کئے ہیں اردو کی ترقی رکنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ البتہ ہماری نئی نسل جس طرح تعلیم حاصل کر رہی ہے وہ اردو کے لئے بڑا خطرہ ہے کیونکہ وہ لوگ اردو سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا ہمارے ملک میں تعلیم نام کی کوئی چیز باقی ہی نہیں رہی ہے۔ اگر حکومت نے اس طرف توجہ نہیں کی تو کچھ عرصہ بعد ہمارا ملک تعلیم کے گراف میں دنیا میں سب سے نیچے آجائے گا۔ اس سے نہ صرف اردو زبان کو بلکہ عام تعلیم کو بھی بہت نقصان ہو رہا ہے۔ ہماری نئی نسلیں بھیڑ بکریاں بن رہی ہیں۔"

جمیل زبیری کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

☆ ریتی۔ (معاشرتی ناول) زرد پتے۔ (افسانوں کا مجموعہ) ☆ دھوپ کنارا۔ (انگلستان' امریکہ اور کینیڈا کا سفرنامہ)۔ ☆ موسموں کا عکس۔ (ہندوستان کا سفرنامہ) ☆ بلوچی لوک کہانیاں۔ ☆ مکران۔ (سفر اور منظرنامہ۔) ☆ مشاہیر کے خطوط جمیل زبیری کے نام۔ ☆ لمحوں کی دہلیز۔ (افسانوں کا دوسرا مجموعہ) ☆ دائمی مسرت کا حصول۔ برٹرینڈرسل کی کتاب Conquest of Happiness کا اردو ترجمہ۔ ☆ گورنر جنرل ہاؤس سے آرمی ہاؤس تک۔ ☆ یاد خزانہ۔ ریڈیو پاکستان میں پچیس سال۔

MR. JAMIL ZUBERI, A-3/1 MAYMAR APT, BLOCK 13 B,
GULSHAN-E- IQBAL, KARACHI (75300) (PAKISTAN).

دعا

وہ کئی سال سے ذہنی طور پر بہت پریشان
تھا اور نہایت مضمحل، اور اب لمبی تان کر سو
جانا چاہتا تھا، اتنا گہرا، کہ اُس کی آنکھ
کھلنے میں نہ آئے۔

بالآخر خدا نے اُس کی سن لی،
وہ بڑی گہری نیند سو گیا اور یوں ہی
سوئے سوئے بھی پڑا رہا اور اِس طرح گھور سپنوں
سے اپنی ہی قبر پر پھول پھول برآمد ہونے لگا۔

جوگندر پال
۱۱ نومبر ۹۹ء

جوگندر پال

دہلی

میں جب کبھی دہلی جاتی ہوں تو مسرت کے اس احساس کے ساتھ جیسے میرا میکہ وہاں آباد ہے اور حقیقتاً میری پیاری دوست انور نزہت کا گھر میرا میکہ ہی ہے۔ انور کی چہیتی اکلوتی بیٹی ریحانہ اٹلانٹا (امریکا) میں رہتی ہیں۔ جب انور نزہت، ریحانہ کے پاس آتی ہیں مجھے فون ضرور کرتی ہیں اور بے قراری سے کہتی ہیں۔

"سلطانہ یہاں میرے پاس آجاؤ۔" نیویارک اپنے بیٹوں اقبال اور انوار کے پاس جاتی ہیں تو فون آتا ہے۔ "کسی طرح یہاں آجاؤ۔ ملاقات ہو جائے۔ کچھ وقت اچھا گزرے گا۔"

نومبر ۹۹ء میں، میں انور نزہت کے گھر میں مقیم تھی۔ شمع افروز زیدی ملنے آئیں تو جوگندر پال جی کے گھر جانے کا پروگرام بنا۔ انور ان دنوں نیویارک سے واپسی میں اپنی پیاری امی کے گھر کراچی میں تھیں۔ نزہت کی محبتوں کی گفتگو کرتے ہوئے ہم پال جی کے گھر گئے اور ان کے حضور یوں بیٹھے جیسے شاگرد اپنے استاد کی محفل میں بیٹھتا ہے۔ جب وہ مجھ سے گفتگو کر رہے تھے تو ان کا جوش اور ولولہ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ آتش جب جوان ہوگا تب بھی اس کی بانی میں

ایسی ہی روانی، طاقت اور سرشاری ہوگی۔ اس سے زیادہ نہ ہوگی کیونکہ پال جی کا عزم آج بھی ویسا ہی جوان ہے اور خود پر وشواس اتنا ہی پائیدار ہے جتنا پہلے ہوتا ہوگا۔

پال جی نے مجھے کتاب کا تحفہ دیا۔ انتہائی قیمتی کتاب۔ جسے ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کی کاوشوں، محبتوں اور پال جی سے ان کی عقیدت نے جنم دیا۔ اس میں جوگندر پال کی زندگی کے ہر گوشے کا احاطہ کرکے انہوں نے اسے "جوگندر پال ذکر، فکر، فن" کا نام دیا ہے۔ ۵۴۴ صفحے کی اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جسے پڑھ کر جوگندر پال کے قاری کی ان کے بارے میں جانکاری کی تشنگی باقی نہیں رہتی۔

اس میں پال جی کی شریک سفر کرشنا پال کا ایک مضمون "میں ہی جانوں" کے عنوان سے ہے جس میں انہوں نے یہ بتانے میں قطعی جھجک محسوس نہیں کی کہ شادی سے پہلے جوگندر پال دودھ بیچتے تھے۔ ان کے پاس کار نہ تھی اور وہ سائیکل پر کار کی جگہ سواری کرتے تھے۔ وہ نیروبی سے آئی تھیں اور سوچتی تھیں کہ پیر میں ربڑ کا سلیپر اٹکائے رکھنے والا، ماں لکڑی کے چولہے پر روٹی پکاتی اور بیٹا دال اور بازاری پکوڑوں کے ساتھ روٹی کھانے والا ان کے ساتھ شادی کے بعد نیروبی جیسی مہذب دنیا میں کیسے رہے گا۔ مگر پھر وہی کرشنا یہ بھی جان گئیں کہ آج جو کچھ پال میں ہے وہ ایک وشواس اور فیصلے پر قائم رہنے والے مزاج ہی کی وجہ سے ہے۔

مگر میرے نزدیک پال جی کی کامیابی میں بڑا ہاتھ ان کی اپنی ماں سے محبت کا ہے۔ جوگندر پال نے قدم قدم پر ماں کی دعائیں لی ہوں گی۔ میں ماں ہوں اور جانتی ہوں کہ اولاد کی ذرا سی توجہ سے دعائیں ماں کی محبت کے سمندر سے ایک متلاطم موجوں کی شکل میں امنڈتی ہیں اور پھر درِ کعبہ سے لپٹ کر قبولیت کے درجے کو جا پہنچتی ہیں۔

کرشنا جی اپنے اسی مضمون میں لکھتی ہیں۔ "صبح ناشتے کے لیے سیڑھی اترتے ہوئے خوب اونچی آواز میں اللہ اللہ کرتے پال مجھے اپنا "کھودو بابا" دکھائی دیتے ہیں۔ اورنگ آباد کے گھر کے سامنے قبرستان میں، میں نے پال کو اکثر قبروں کے بیچوں بیچ چلتے دیکھا اور باتیں کرتے محسوس کیا تھا۔ گرین ہاؤس کے مولوی کی طرح میں نے کئی بار پال کو چاند سے اپنی ماں کی باتیں کرتے پایا ہے۔ ماں سے پال کو بے انتہا پیار تھا۔ بڑے لاڈ سے پالا تھا ماں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو۔ مجھے یاد ہے نیروبی میں جب کبھی بھابھو جی (ماں) اپنے بیٹے سے ناراض ہو کر بات نہ کرتی تو پال ہاتھ جوڑے تب تک ایک ٹانگ پر کھڑے رہتے جب تک ماں مسکرا نہ دیتی۔" اللہ اللہ۔

پال جی کے چہرے پر اب بھی ویسی ہی معصومیت ہے جیسی ماں کو منانے کے وقت ہوا کرتی ہوگی۔

ارتضیٰ کریم نے اپنے مضمون میں پال جی کی شخصیت کے ساتھ ان کی افسانہ نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "پال جی کے مختصر افسانوں بلکہ افسانچوں میں بظاہر جتنا اختصار نظر آتا

ہے دراصل ان میں اتنی ہی تہہ داری اور معنویت ہے اور ہر قاری اپنے مکالمے، مشاہدے اور مقدور بھر اس سے حظ اٹھا سکتا ہے۔ ناول اور افسانے جیسی بھرپور صنف کی موجودگی کے باوجود آخر جوگندر پال کو "افسانچہ" لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ اظہار کا ایسا کون سا اضطراب ہے جو انہیں اس صنف کی جانب متوجہ کرتا ہے؟ آخر اظہار ایسا کون سا اضطراب ہے جو انہیں اس صنف کی جناب متوجہ کرتا ہے؟ پال جی کے الفاظ میں دیکھئے۔

"کہانی اگر اپنے اصل تناسب سے باہر نہ ہو تو ایک سطری ہو کر بھی پوری ہوتی ہے۔ ورنہ اپنی تمام تر طوالت کے باوصف ادھوری کی ادھوری۔۔۔"

ملاحظہ ہو پال جی کی یہ دو مختصر کہانیاں یا افسانچے۔

"میرا جینا ابھی شروع بھی نہیں ہوا پھر بھی میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔"

"مجھے اپنے آپ پر شک ہونے لگا ہے۔ میں کوئی اور ہو گیا ہوں۔"

ہمارے اور آپ کے یہ جوگندر پال ۵ ستمبر ۱۹۲۵ء کو سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم گنڈا سنگھ ہائی اسکول سیال کوٹ میں اور اعلیٰ تعلیم بھی مرے کالج سیالکوٹ میں پائی۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد دہلی گئے۔ ۱۹۴۹ء تا ۱۹۶۴ء نیروبی میں انگریزی کے استاد رہے اور بحیثیت ایجوکیشن آفیسر ملازمت سے اختیاری طور پر سبکدوش ہوئے۔ اورنگ آباد دکن کے سرسوتی بھون پوسٹ گریجویٹ کالج میں پرنسپل رہے اور اب اولاد کو پال پوس کر بے فکری کی زندگی یوں گزار رہے ہیں کہ خود کو ادب کی تخلیق کے لیے وقف کر دیا ہے۔

"گفتنی" کے لیے ہم نے ان سے پوچھا کہ بیسویں صدی میں اردو ادب میں زندہ رہ جانے والے نام کیا ہو سکتے ہیں؟

"ناموں کی نشاندہی کرنا اس لیے مشکل ہے کہ اس سوال میں اس کے دو جواب ہیں دراصل آپ پوچھ رہی ہیں کہ کن لوگوں میں ایسے امکانات ہیں جنہیں ہم کلاسک قرار دے سکیں تو کلاسک جو ہے وہ از خود کلاسک نہیں ہوتا۔ کوئی بھی کتاب اس وقت کلاسیک ہو پاتی ہے جب اور لوگ نسل بعد نسل اس میں شامل ہوتے رہیں۔ جیسے پریم چند کا ناول گئودان ہے۔ اسے لکھے ہوئے پچاس سال ہو چکے ہیں پریم چند نے یہ ناول لکھا تھا تو اس وقت یہ اس طرح ہمارے سامنے آیا تھا جس طرح پریم چند چاہتا تھا۔ یعنی سارے مفاہیم ویسے ہی سامنے آئے جیسے اس وقت تخلیق کار کے تھے لیکن اس دوران ان پچاس سالوں میں ان پر اتنی تنقید ہوئی اتنی بحثیں ہوئیں کہ ان مفاہیم میں ترمیم واقع ہوتی چلی گئی چنانچہ آج وہ ناول سب کا ہو گیا ہے تو جب کوئی چیز کوئی شعر یا کوئی کہانی یا کوئی ناول جب اس میں سب لوگ شامل ہو جاتے ہیں تو ہم اسے کلاسک قرار دیتے ہیں اس لیے اس کے تعلق سے یہ کہنا کون زندہ رہے گا۔ میرے خیال میں بہت پہلے سے طے کر لینے والی بات ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ہاں مشرقی تنقید میں جسے میں

ایک عیب قرار دیتا ہوں کہ ہم اپنے طور پر یہ فیصلے کرلیں کہ یہ آدمی بڑا ہوگا، عظیم ہوگا اور یہ آدمی اس سے چھوٹا ہوگا۔ ادب میں آدمی یا تو واقعتاً" ادیب ہوتا ہے یا غیرادیب ہوتا ہے اس لیے جب ہم ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے لگتے ہیں تو ادب کی تاریخ میں بہت سی غلط قسم کی بحثیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ مثلاً ٹنی سن کو لیجئے۔ ٹنی سن کو ایک سو سال تک انگریز بار بار چلا چلا کر یقین دلاتا رہا کہ وہ بے حد بڑا شاعر ہے لیکن آج سب کہہ رہے ہیں کہ وہ تو اتنی ہی دور تک دیکھ سکتا تھا جتنی اس کی آنکھیں تھیں۔ اس سے آگے تو اسے نظر ہی نہیں آتا تھا۔ تو یہ محاسبہ وقت پر چھوڑ دینا چاہئے اس کے تعلق سے، عجلت سے ہم ادب میں ایک بہت بڑا کنفیوژن پیدا کردیتے ہیں۔

وہ کہہ رہے تھے۔ اب ہم سوال نمبر ۳ کو لیں تو اس کا بھی جواب اس طرح ہوگا کہ آپ جدیدیت سے کیا مفاہیم اخذ کرتے ہیں۔ دیکھئے پہلے پہل ایک کلاسیکی دور تھا جب لوگوں کا مسئلہ تھا کہ اردو میں وہ صرف اردو بولیں کوئی بات نہ کریں یعنی ہم نے بہت سے سال صرف زبان پر حاوی ہونے میں ضائع کیے۔ یہ بھی ایک طرح کی کج فہمی تھی۔ اس کے بعد پھر ہم نے یہ قرار دیا کہ کلاسیکی قدریں ہمیشہ رہ جانے والی ہیں اور اس کو ہم خیالی دنیا سے تعبیر کرنے لگے، وہ بھی غلط تھا پھر ترقی پسند آئے ترقی پسندوں نے اسے زندگی سے جوڑا اور ایک اعتبار سے ٹھیک طریقے سے جوڑا لیکن ہوتے ہوتے انہوں نے اس کی اہمیت کو سلوگن اور نعروں میں گھٹا دیا۔ ادب یقیناً نعرہ نہیں ہے ادب وارادت ہے ادب تلقین بھی نہیں ہے۔ ادب دراصل ارتقا ہے۔ یعنی آپ جو کچھ کررہے ہوتے ہیں جو کچھ لکھ رہے ہوتے ہیں وہ سچ مچ ہورہا ہوتا ہے اسی لیے اس کو وارد کہتے ہیں۔ ترقی پسندوں نے بہت اہم اور اچھی چیزیں لکھیں لیکن جب یہ نعروں میں گھٹنے لگیں تو جدیدیت آئی اور ہم بہت خوش ہوئے کہ اب ایک طرح سے نئی کھڑکیاں کھلیں گی آزادیاں میسر آئیں گی مگر ہوا یوں کہ جدیدیت بھی ہوتے ہوتے چند ایک موضوعات میں گھٹن کے ماحول میں محدود ہو کر رہ گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی نظم یا کہانی ترقی پسند یا جدید نہیں ہوتی بلکہ صرف کہانی یا نظم ہوتی ہے اگر وہ ہے تو ہے یعنی آپ کسی کو اس وجہ سے پسند نہیں کریں گی کہ وہ ترقی پسند ہے یا جدید ہے تو ایسا ہونے لگا تھا جو غلط ہے۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ماحول صاف ہورہا ہے اور نئی نسل جسے میں عام طور پر اگرچہ یہ نئے لوگ جوان ہیں اور انہیں نئے کہتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ انسان کی طویل تر عمر کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس لیے یہ بوڑھے لوگ ہیں اگر یہ ذمہ داری سے کام لیں اور اس لحاظ سے انہوں نے جو اس نشاندہی پر اصرار کیا ہے کہ ادب یا تو ادب ہوتا ہے یا غیرادب۔ یہ صحیح اصرار ہے۔

میں نے ان سے پوچھا "درست ہے کہ ادب یا تو ادب ہوتا ہے یا غیرادب لیکن کیا آپ ادب اسے کہیں گے جس سے ابلاغ قطعی نہ ہو؟

ان کا جواب تھا "اب ابلاغ کا بھی کیا مطلب ہے کہ وہ دوسرے کی بھی سمجھ میں آجائے۔ سمجھ میں آجائے اور اس میں تاثر نہ ہو اور اس میں ادبیت نہ ہو تو اس کا بھی کیا فائدہ ہے؟ یعنی ہم قاری کو بھی مہم تخلیق کار کے زمرے میں کیوں شامل کرتے ہیں اس لیے کہ میں نے اپنے تلازموں سے کوئی کہانی لکھی آپ نے قاری کی حیثیت سے اپنے تلازموں میں اس کے کوئی مطلب نکالے اس لیے آپ تخلیق کار ہوئے لیکن اگر میں اصرار کروں کہ اس کہانی کا یا کسی نظم کا وہی مطلب ہے جو میں نے اخذ کیا ہے تو وہ غلط ہے۔ اچھے ادب کا ایک ہی مفہوم نہیں ہوتا اچھا ادب آپ کے تلازموں میں رچ بس جاتا ہے وہ مفاہیم پیش کرتا ہے جو آپ کو ایک مخصوص (SPECIFIC) قاری کی حیثیت سے مفاہیم سوجھتے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ آپ کے کچھ ہوں میرے کچھ لیکن اگر میں نے حتمی طور پر کچھ کہا اور وہ اسی طرح آپ کی سمجھ میں آگیا تو میں سوشیالوجی کیوں نہ لکھوں مجھے ادب لکھنے کی کیا ضرورت ہے بھلا! ہم نے مغرب سے غلط طور پر یہ بات سمجھی ہے اور ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث میں تقریباً پچاس ساٹھ سال ضائع کردیے۔ ادب جو ہے جیسے میں نے پہلے عرض کیا ارتقاق سے عبارت ہے جو کچھ آپ سوچتی ہیں لکھتی ہیں وہ واقعی ہو رہا ہوتا ہے یعنی ادب میں جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ ایک (PARALLAL LIFE) یعنی متوازی زندگی مجھے کھڑی کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً آپ ایک شخص ہیں۔ ایک نظم ہیں تو آپ کوئی مطلب نکالنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ آپ کا جو بھی مطلب میں نکال لوں وہ میرا کام ہے۔ اسی طرح کوئی نظم جو ہے اس کی شخصیت اس میں ہوتی ہے کہ جو کوئی بھی اس کا مطلب اپنے طور پر نکال لے۔ ایلیٹ نے شیکسپیئر کے بارے میں کہا تھا:

"HE DOESNOT CONVEY ANY MEANING BUT
WE WILL BE STUPID TO SAY THAT
HE HAS NO MEANING."

چنانچہ ابلاغ کو تو اندر سے پھوٹنا چاہئے جتنی جس کو توفیق ہو یعنی اللہ تعالیٰ اس لیے عظیم ہے کہ ہر ایک کو اس کی بساط کے مطابق سمجھ میں آتا ہے۔ آپ کو آپ کی توفیق کا خدا ملتا ہے۔ تو خدا تو ہے اپنی جگہ۔ اس کا اصرار ہے کہ چیزوں کو اتنا مکمل کردو کہ وہ خود نظر آئیں اور اسی طرح کسی رائٹر کا یہ معجزہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنی تخلیق سے یکسر غائب لگے یہ اس کی موجودگی کی دلیل ہوگی۔ جیسے اللہ میاں غائب ہے یہ اس کی موجودگی کی دلیل ہے تو اسی ہدایت کو اگر ہم اپنا ایک سبق مان کر چلیں تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

غالب کو ہم اس لیے پیار کرتے ہیں کہ اس کے مفاہیم ہمیں اپنے طور پر نکالنے پڑتے ہیں۔ عام آدمی تو دو ٹوک کہہ دیتا ہے کہ یہ یہ ہے مگر یہاں یہ ہے کہ اپنے طور پر واردات بنا کر اپنے

احساسات، مشاہدات اور تجربات سے سفر پر چلنا ہے اور جہاں تک توفیق ہے چلتے جایئے۔"
ہمارا اگلا سوال موجودہ صدی میں ناول کم لکھے جانے سے متعلق تھا۔ انہوں نے کہا "اس کی بظاہر وجوہ تو یہ ہیں کہ فرصتیں ہی کہاں ہیں ادب میں ہمارا پیشہ ورانہ Status قبول نہیں کیا گیا۔ مجھے کالجوں میں پڑھانا پڑا۔ یونیورسٹیوں میں پڑھانا پڑا اس لیے کہ مجھے اپنے خاندان کا سہارا بننا تھا۔ ایک عام آدمی کی طرح جینا تھا۔ جبکہ ناول لکھنے کے لیے تو ایک طویل انہماک درکار ہوتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ مہینوں اور سالوں میں پھیلتا چلا جاتا ہے۔ ناول لکھنے کے لیے وقت، پوری توجہ اور بھرپور انہماک چاہیئے۔"
میں نے کہا آپ اپنی زندگی کا کوئی اہم واقعہ سنایئے۔ کہنے لگے "اب زندگی میں کوئی بات اہم نہیں رہی۔" "میں اب جس دور میں ہوں مجھے ہر بات بہت ہی غیر معمولی لگتی ہے یعنی اگر میں اس میں شریک ہوجاتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ وہ بے حد اہم ہے خواہ وہ بظاہر کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔ اب میری شناخت دوسروں کے ساتھ ہوگئی ہے تو یوں لگتا ہے کہ جو کچھ بھی دوسروں کے ساتھ پیش آرہا ہے وہ میرے ساتھ ہی پیش آرہا ہے۔ میری ایک چھوٹی سی کہانی تھی اس پر بڑی لمبی چوڑی بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ لکھنؤ سے عابد سہیل ایک پرچہ نکالتا تھا اس میں شائع ہوئی تھی۔ دوسطری کہانی تھی وہ۔ میں نے کہا تھا دراصل اپنے دور کے بارے میں کہ آج کے انسان کے ساتھ کچھ پیش کیوں نہیں آتا۔
"آج بھی میرے ساتھ یہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ آج بھی میرے ساتھ کچھ نہیں ہوا۔"
ایک طویل کہانی اس کا نام تھا۔ "ماڈرن مین" (Modern Man) آج کا انسان چاہتا ہے کہ کوئی مہم ہو۔ جیسے مجھے کوئی سانپ ڈس گیا ہے۔ کوئی قتل کر کے چلا گیا ہے تو آج سب کچھ غلط ہورہا ہے لیکن قانون کے اندر ہر بات اس طرح بٹھائی گئی ہے کہ کسی کو کچھ پیش نہیں آرہا ہے۔ آدمی عورت سے الگ ہورہا ہے عورت کے ہاں وہ ممتا نہیں رہی جو کسی وقت تھی۔ بھائی بہن کے سامنے کھڑا ہے ہر چیز لین دین میں تقسیم ہوچکی ہے اتنا کچھ بدل چکا ہے لیکن بظاہر لگتا ہے کہ کسی کے ساتھ کچھ بھی پیش نہیں آرہا ہے تو دراصل زندگی کا جو ایکسائٹ منٹ (Excitement) ہے وہ اب نہیں رہا۔ میرا اپنا گھر پاکستان میں تھا۔ وہ محلہ جو تھا ہمارا وہ سارا محلہ اپنے گھر کا آنگن لگتا تھا اگر ماں میری گھر میں نہیں ہے تو میں ساتھ والے کے گھر میں جا کے یا چاچی کے گھر جا کے روٹی کھا کے اسی کے گھر سوجاتا تھا تو وہ اب نہیں رہا۔ اب یہ سارا سلسلہ ہی نہیں ہے۔"
میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ "آج کا ادیب مادی ذہنی اور نفسیاتی قسم کے بحران میں مبتلا ہے۔ زندگی بسر کرنے کے لیے اسے کسی نظام فکر کی ضرورت ہے۔ آپ کس طرح اس کی رہنمائی کریں گے؟ وہ کہنے لگے۔

"میں چاہتا ہوں آپ اس پر غور کریں ذاتی طور پر مجھے اس لیے لطف آرہا ہے کہ آپ جو سوال کر رہی ہیں وہ سارے وہ ہیں جس کے تعلق سے مجھے واقعی آپ کو اور پڑھنے والوں کو سمجھانا ہے کہ آپ اس طرح سوچئے اس طرح نہ سوچئے' سارتر نے یہ کہا تھا کہ آئندہ کا بڑا ادب مغرب کے بجائے مشرق سے پیدا ہوگا کیونکہ یہاں دکھ کی گنجائش زیادہ ہے۔ ہماری زبان بہت بڑی ہے اور مجھے سارے حالات کے باوجود اس کا مستقبل بڑا وسیع نظر آتا ہے کیونکہ ہمارا مستقبل جڑا ہوا ہے ہمارے سوچنے والوں سے۔ آج اگر انگریزی زبان کا اتنا بڑا مرتبہ ہے تو اس کے لکھنے والوں کی وجہ سے ہے۔ یہ کتابیں دراصل اسی لیے لکھی جاتی ہیں کہ انسان ذرا سرک کے وسیع تر ہو جائے اگر کتابیں اسے وسیع تر نہیں کرتیں تو ادب کی تخلیق بے معنی ہو جائے گی۔ اس اعتبار سے ایک مشن سمجھ کر میں یہ بات کر رہا ہوں۔ سارتر نے کہا کہ یہاں مشرق میں اتنا دکھ ہے اور اس دکھ میں اتنا ڈکے ڈینس (Decadence) ہے لہٰذا اس کے اسباب پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر آج آدمی اتنا کمینہ کیوں ہو چکا ہے۔ غریبی آدمی کو کمینہ کرتی ہے۔ میں اگر کمینہ نہیں ہوں تو میں خود پارسائی سے کام لے کر کہوں گا کہ میں تو کبھی جھوٹ نہیں بولتا لیکن مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت ہی کبھی درپیش نہیں رہی اس لیے میں نے جھوٹ نہیں بولا تو کون سا کمال کیا۔ میں نے اگر کبھی کسی کی چوری نہیں کی تو میرے لیے موٹی پینشن آجاتی ہے میں چوری کیوں کروں گا بھلا؟ لیکن ایک ایسا آدمی ہے جس کی بیوی مر رہی ہے اسے سب دھتکار رہے ہیں ہسپتال میں اسے کوئی جگہ نہیں دے رہا تو وہ چوری کرے گا اور اگر میں اس کا مقابلہ اپنے ساتھ کر کے اسے سفلہ قرار دوں تو یہ غلط ہوگا۔ تو اس Decadence کے اسباب پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ گرونانک کی شاعری دیکھئے جو پنجابی میں ہے وہ Decadence کا دور تھا۔ بابر نے بھی Indian decadence کے بارے میں تزک بابری میں ذکر کیا ہے۔ تو اتنی Decadence تھی تو اس میں سے بھگجیت صاحب کی شاعری ابھر کر نکلی تو تخلیقی ادب تو غریبی کی وجہ سے اور دکھ کی وجہ سے جنم لیتا ہے اور اس کا جواز بھی ہے۔ سکون میں جب آپ ٹھنڈے سانس بھرتی ہیں اور غریبی کو یاد کرکے خوش ہوتی ہیں تو اس میں آپ کے ہاں Recedement نہیں ہوتی۔ سانحہ آپ کو درپیش نہیں ہوتا اور آپ سال بسال بڑی نہیں ہوتیں سانحہ بہ سانحہ بڑی ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے کوئی پچیس سال میں انسان سو سال جی لے اور کوئی سو سال میں پچیس سال بھی نہ جئے۔ کیونکہ کوئی سانحہ پیش ہی نہیں آیا۔ ایران کا ایک ناول تھا۔ "کوچہ ملامت" وہ کیا تھا کہ لوگ جب بہت بڑے ہو جاتے تھے اور لوگ ان کی عزت کرنے لگ جاتے تھے تو وہ لوگ سفلے پن سے بچنے کے لیے، اپنے نفس کی سرکشی سے بچنے کے لیے چوراہوں پر کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ دوسرے لوگ انہیں گالیاں بکیں اور انہیں ذلت کا احساس ہو۔ اس تحریک کو کہتے ہیں "کوچہ ملامت" یہ

تاریخی تحریک تھی اور اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جب آپ یہ سارے سکھ تج کے کہتے ہیں کہ میں اب عبادت کروں گا میں صرف اپنے پنڈے کو پہنوں گا لباس بھی نہیں پہنوں گا تو سب ضرورتوں سے اوپر اٹھ کر آدمی دکھ جھیلتا ہے۔ دکھ جھیل جھیل کہ وہ کہتا ہے کہ اب میں عظیم بن جاؤں گا۔ تو عظمت یہ ہے کہ میں اپنا نام تک بھول جاؤں۔ یہ جوہر تو ہر انسان میں ہے۔ ایک آلو میں نے کھا لیا تو وہ مر گیا۔ میرے پیٹ میں چلا گیا لیکن آلو تو ہے۔ آلو کا بیج تو ہے۔ انسان کا بیج تو ہے۔ تو بیج اہم ہوتا ہے اور جسے ہم غیر فانی ہونا کہتے ہیں وہ دراصل یہی بیج ہے۔ جو شخص اس بیج کی حفاظت کرتا ہے بڑا تو وہی ہوتا ہے اور اس میں پھر آپ کا نام نہیں رہتا' آپ کو سب کچھ تج کر اس میں جانا پڑتا ہے۔ ادب مسند کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے۔ چنانچہ جہاں انسان اسے Status کا ذریعہ بنا لیتا ہے تو وہ Status تو بنا لیتا ہے مگر اس کے ادب میں وہ آنچ پیدا نہیں ہوتی جس سے بڑا ادب جنم لیتا ہے۔"

ادب میں تنقید کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے انہوں نے کہا "جب قاری اور مصنف میں فرق نہیں معلوم ہو گا اور نقاد کسی بھی تحریر کو اگر اس نکتہ نظر سے پڑھے گا کہ اسے فیصلہ صادر کرنا ہے تو وہ تنقید گھٹیا ہو گی۔ نقاد کو اس تحریر میں خود کو شامل کرنا پڑتا ہے تب ہی تنقید کے منصب کا حق ادا ہوتا ہے مغرب بھی تنقید کے معاملے میں بہت اتھلا تھا لیکن جیسے جیسے وہ منجھ رہے ہیں ان میں انکساری آ رہی ہے جس کی وجہ سے ان کے ہاں دب کا پڑاؤ چوڑا ہوتا جا رہا ہے۔"

پس نوشت

ایک معتبر اطلاع کے مطابق سال ۲۰۰۰ء میں دوحہ قطر ادبی ایوارڈ کے لیے ہندوستان سے محترم افسانہ نویس جناب **جوگندر پال** کا انتخاب کیا گیا ہے جبکہ پاکستان کے لیے قرعہ فال خاتون دانشور' افسانہ و ناول نگار محترمہ **بانو قدسیہ** کا نام نکلا ہے۔ میں ان دونوں دانشوران ادب کی خدمت میں' دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ سلطانہ مہر

MR.JOGANDER PAL
204, MANDAKANI ENCLAVE
NEW DELHI II 0019 INDIA

"خود سے بھاگنا نہایت مشکل کام ہے۔ یہ امتحان بڑا کڑا ہوتا ہے۔ آدمی کی جان بھی لے لیتا ہے۔"

جتیندر بلو
۱۳؍ اگست ۹۶ء

جتیندر بلو
لندن

برمنگھم کے باسی سید عاشور کاظمی نے مجھے اپنی کتاب "فسانہ کہیں جسے" بھیجی۔ یہ مغرب میں مختصر افسانے کی کہانی' افسانہ نگاروں کا تعارف اور ان کے افسانوں پر مشتمل پڑھنے لائق کاوش ہے۔ اس میں جتیندر بلو کا تعارف بھی ہے۔ مگر جتیندر کا تعارف ان کی کہانیوں کے حوالے سے سریندر پرکاش نے ان کے افسانوں کے مجموعے "نئے دیس میں" کے دیباچے میں جس طرح کرایا ہے وہ پڑھنے لائق ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔

"ایک دن پتہ چلا کہ کسی دوست کو اس نے (جتیندر بلو نے) خط لکھا تھا کہ وہ ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے تک پہنچ گیا ہے۔ لندن کی سڑکوں پر وہ مارا مارا پھرتا ہے مگر لندن کا معاشرہ اس کی طرف دیکھتا تک نہیں' اسے پہچانتا تک نہیں۔ اتنی بڑی دنیا اور اس کے اتنے بڑے شہر میں وہ اجنبی اجنبی سا بھٹکتا پھر رہا ہے۔ کیوں کہ معاشرہ بہت اہم چیز ہے اور اس کی بنیاد جغرافیہ ہے۔ کچھ لوگ اس باریکی کو نہیں سمجھتے۔ بعد میں نچے کھا جاتے ہیں اور باقی ماندہ زندگی روتے ہوئے گذار دیتے ہیں۔ لیکن جتیندر بلو روتا نہیں ہے۔ وہ معاشرے کی شکل و

صورت پہچان گیا ہے اسی لیے وہ لندن میں رہنے والے مسلمانوں کا قریبی دوست ہے (خاص طور پر پنجاب کے مسلمانوں کا) جن میں سے بیشتر مذہب کو معاشرے کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ اس کے افسانوں میں بھی یہی دکھ سکھ نمایاں ہیں۔ اس نے اپنے سامنے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان لگا رکھا ہے جو معاشرے کے خون رنگ آنسوؤں میں بھیگا ہوا ہے۔ بلو کی ہر کہانی کلچرل پرابلم ہوتی ہے۔ انسانی فزیکل پرابلم نہیں جیسی کہ اکثر لوگوں کے ہاں ہوتی ہے۔"

بلو نے مجھ سے بھی اپنے خط میں شکایت کی۔ ان کے ۷ اگست ۱۹۹۱ء کے خط میں لکھا ہے۔

"آپ امریکہ میں مدت سے مقیم ہیں۔ مغربی نظام اور اقدار کے سارے زندگی جیتی ہیں۔ آپ کے تمام سوالات مغربی اور مشرقی تہذیب، تمدن، معاشرے، تاریخی ورثہ اور ان کے تصادم کے متعلق ہوتے تو مجھے خوشی ہوتی۔ کوئی تو ہو جو ان خطوط پر سوچے۔ ہم آج کے دور میں بھی Age of faith میں زندہ ہیں جب کہ مغرب بلاشبہ Age of reason کا دلدادہ ہے اور ہم سے صدیوں نہیں تو کئی دہے یقیناً" آگے ہے۔"

بیتندر بلو! میں نے آپ کو جو سوالنامہ بھیجا ہے بین السطور وہی باتیں پوچھی گئی ہے جن سے ہم سب کا ٹکراؤ ہے۔ آپ ماضی سے پیچھا چھڑا کر بھاگے ہیں اور ماضی ہی پر آنسو بہا رہے ہیں۔ آپ کے اور میرے ملک میں بھی اب آدھا کلچر وہی ہے جو یورپ اور امریکا کا کلچر ہے۔ مجھے میرے شہر میں گزارے ہوئے وہ دن اور لوگ جب بہت شدت سے یاد آتے ہیں تو میں ان سے جا کر مل آتی ہوں۔ مگر کلچر کی دنیا میں نے یہیں بسا لی ہے۔ ادبی ہستیاں یہاں بھی آباد ہو گئی ہیں۔ ہم اب واپس نہیں جا سکتے۔ اس لیے نہیں کہ کشتیاں جل چکی ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ ہم جانا نہیں چاہتے کیوں کہ ہم نے اپنی اگلی نسل کا پودا دوسری زمین میں اگا یا ہے اب اس کی نشوونما ہو رہی ہے سو اب گلہ شکوہ کرنے سے بہتر ہے کہ خود کو ایک نئے معاشرے میں اس طرح ضم کیا جائے گا کہ اپنے معاشرے کا رنگ یہاں بھی چوکھا آئے" کہ یہی کچھ سریندر پرکاش نے آپ کی کتاب کے صفحہ ۱۳ پر لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"یورپ اور امریکہ میں بسے ہوئے ہزاروں لاکھوں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کا کرب یہ ہے کہ وہ اس معاشرے اور اپنے ملک سے دور رہ رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا مقصد اقتصادی تحفظ ہے جو شاید انہیں ان کے ملک نے نہیں بخشا اور سچ بات تو یہ ہے کہ انہوں نے اس کی کوشش بھی نہیں کی کہ ان کی حکومت کے طریق کار میں کچھ تبدیلی ہو۔ وہ تو اس ملک کو جس کے وہ باشندے تھے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہیں ان کی نامردی اور شکست خوردگی دکھائی دیتی ہے۔ وہ نہ اپنے ملک کے ہی خواہ ہیں نہ اس ملک کے جو انہیں روٹی دیتا ہے۔ مگر بلو سارے یورپ میں مجھے وہ واحد ادیب نظر آیا جس نے اعلان کیا کہ وہ ایک انٹرنیشنل شہری ہے۔ اس کا وہی ملک ہے۔ جس کا وہ اناج کھاتا ہے اور اس کے معاشرے میں جو خامیاں وہاں کے صاحب

اقتدار طبقے نے پیدا کر دی ہیں اور ان خامیوں کی روٹی کھا رہے ہیں بلو نے انہیں پن پوائنٹ کیا ہے اور انہیں ٹھیک کرنے پر زور دیا ہے۔"

سریندر پرکاش زندہ باد۔ بس اب ہم یہی کچھ کر سکتے ہیں اور یہی کر رہے ہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے کی بات ہے میں کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں تھی۔ ایک پرانے صحافی ساتھی سے ملاقات ہوئی جو جدہ کے ایک اہم اخبار میں کام کر رہے تھے۔ ان کی بڑی بیٹی نے انٹر ختم کر لیا اور گریجویشن کے لیے کالج میں داخلے کی ضرورت پیش آئی تو ان کے پاس دو اختیارات تھے۔ کراچی پاکستان واپس لوٹ جائیں یا کسی مغربی ملک کا رخ کریں۔ انہوں نے کینیڈا کا رخ کیا۔ کیوں کی عرب اسلامی ملک میں "خارجی" کی اولادوں کو اعلیٰ تعلیمی مراکز میں داخلہ نہیں ملتا۔ کراچی میں اتنا روزگار نہ تھا کہ وہ تنہا کام کر کے اپنی چار بچیوں کو پڑھاتے۔ پھر یہی یسوع مسیح کو ماننے والے رہ گئے تھے جن کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے تو مایوسی نہیں ہوتی۔ ان کے در کسی وجہ سے ہی سہی ہم سب کے لیے بلا تفریق ملت وا ہیں۔ جو درس اسلام نے دیا وہ مسلمان تو بھول گئے مگر ان لوگوں نے گرہ میں باندھ لیا۔ اسی لیے انسان کہلاتے ہیں اور کامیاب ہیں۔ میری ایک نظم "رب کعبہ کے حضور" میں یہی فریاد میں نے اپنے رب سے کی ہے۔ تو اب آیئے جیسندر بلو سے مل لیں اور ان کی جہاد کی کہانی سنیں۔

جیسندر بتاتے ہیں۔ "میرا خاندانی نام جیسندر دیولابند ہے۔ لیکن قلمی نام جیسندر بلو اس غرض سے رکھا گیا کہ بلو میرے بچپن کا نام ہے اور وہ بچہ آج بھی میرے اندر زندہ ہے جو گاہے گاہے کلکاریاں مارتا رہتا ہے۔ پیدائش ۱۸ نومبر ۴۳ء کو پشاور میں ہوئی۔ تقسیم کے بعد تین کپڑوں میں والدین کے ساتھ دہلی پہونچا۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ طرح طرح کی ملازمتیں میرے گلے کا ہار بنی رہیں۔ انجام کار CATERING راس آئی۔ بیس برس اس لائن میں کاٹ کر اب تمام جھنجھٹوں سے آزاد ہو گیا ہوں۔

اردو ادب میں زندہ رہ جانے والے ناموں کے بارے میں عرض ہے کہ بیسویں صدی آخری دموں پہ ہے۔ اردو ادب میں وہ ادباء اور شعراء ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جنہوں نے مجموعی زندگی، زمانے کی ریاکاری، کھوکھلی اقدار اور بنتے بگڑتے رسوم کو اپنے تیز دماغ، سوچ اور غیر معمولی فنی صلاحیتوں کی مدد سے بنی نوع آدم کی بہتری کے لیے قلمبند کیا۔ وہ ہیں منشی پریم چند، منٹو، غلام عباس، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، فکر تونسوی، فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری، میراجی، یگانہ چنگیزی، سریندر پرکاش، ندیم قاسمی، انتظار حسین، وزیر آغا، عزیز احمد اور عظیم شاعر اختر الایمان۔

انہوں نے کہا "میرے خیال میں فکشن بلاشبہ ایک لطیف آرٹ ہے۔ لیکن فکشن اور فیکچول فکشن (FACTUAL FICTION) میں زمین آسمان کا فرق رہا ہے۔ میں

نیچرل فکشن کا آدمی ہوں۔ میری کہانیاں ذہن کی اختراع نہیں ہوا کرتیں' بلکہ وہ مروجہ زندگی کی غیر مرئی قاشیں ہوتی ہیں۔ میں انھیں دھرتی سے اٹھا کر کاغذات پر بکھیرتا ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان میں میرا تخیل اور کچھ جھوٹ بھی شامل ہوتا ہے' بالکل اس کھرے سونے کی طرح جس میں کھوٹ کی آمیزش لازمی ہوتی ہے۔

ہاں میں نے مانا کہ آج کا اردو ادیب مادی بحران میں کم' نفسیاتی اور روحانی بحران میں زیادہ مبتلا ہے۔ دراصل وہ زمانے کا انتشار' بے ثباتی' مصنوعی اقدار' کھوکھلے رسوم' ریاکاری' مذہبی بنیاد پرستی' دوہرے معیار اور جھوٹ فریب کا شکار ہوا ہے۔ کوئی فرشتہ اسے نجات دلانے آسمان سے نہیں آئے گا۔ اسے اپنی طرز زندگی اور اس کا نظام خود طے کرنا ہوگا۔

سوال نمبر۶ کا جواب ہے کہ ٹھوس تخلیق وہی ہوتی ہے جو زندگی' بدلتی ہوئی زندگی اور مجموعی زندگی کا احاطہ کرے اور وہ ان کے غیر مرئی پہلوؤں سے روشناس کرائے۔ داخلی سچائیوں سے متعارف کرائے اور اپنے ساتھ مثبت اقدار' صحت مند' اخلاقیات' غنائیت' فنی صلاحیتیں اور تخلیقی زبان لیے ہوئے ہو۔

میرے خیال میں ہندوستان اور پاکستان سے باہر' شعرا اس لیے زیادہ پیدا ہو گئے ہیں کہ شعر کہنا نثر کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔ ان دنوں بیرون ملک جو ایشیائی عرصہ دراز سے رہائش پذیر ہیں' وہ مالی اعتبار سے اب خاصے آسودہ ہو چکے ہیں۔ وقت گزاری اور زبان کے چٹخارے کی خاطر وہ مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔ بیشتر شعراء کا کلام فرسودہ' دقیانوسی' رومانی خیالات لیے ہوتا ہے۔ ان گنت مصرعے بحر سے خارج ہوتے ہیں اور عروض کی غلطیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔ جب کہ اچھی نثر لکھنے کے لیے ادیب کو اپنے عہد سے وابستہ ہونا پڑتا ہے۔ معاشرے کو کھنگالنا پڑتا ہے' انسانی فطرت کی گہرائیوں میں اترنا پڑتا ہے' نفسیات کا دامن بھی تھامنا پڑتا ہے اور سب سے اہم بات معاشرے کے تضادات کو سمجھنا پڑتا ہے۔ پھر خود سے کئی جنگیں لڑ کر تخلیق اپنی صورت اختیار کرتی ہے۔ یہ عمل جان لیوا ہے' جسے قبول کرنے سے شاعر لوگ بدکتے ہیں۔

اردو زبان میں انگریزی کی آمیزش تو ہوگی۔ کوئی بھی زبان ہو' اس میں وسعت پیدا کرنے کے لیے ذہنی کھڑکیاں کھلی رکھنا لازمی قرار دیا گیا ہے ورنہ وہ تازہ ہوا سے محروم رہے گی۔ اردو داں طبقہ ہمیشہ زبان کی پاکیزگی کے متعلق فکر مند رہا ہے' جب کہ اردو مخلوط زبان ہے۔ انگریزی چوں کہ عالمی زبان ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے' اس کے چند الفاظ اردو زبان کے پھیلاؤ کے لیے اپنا بھی لیے جائیں تو کیا مضائقہ ہے؟ دراصل انگریزی زبان ہماری روز مرہ کی گفتگو اور کاروباری زندگی میں اس قدر رچ بس چکی ہے کہ اس کے بنا ہمارا گزارا نہیں۔ دو سو برسوں کی غلامی کے کچھ تو نتائج ہوں گے' ان سے بھاگ کر ہم کہاں جا سکتے ہیں؟

آخری سوال کے جواب میں کہنا ہے کہ اردو ادب کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ اسے کبھی بھی ذہین، باشعور، روشن خیال، وسیع المطالعہ اور وسیع النظر ناقدین نہیں ملے۔ اگر کوئی نقاد غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا بھی تو وہ کسی خیال پرستی، ازم یا تعصب پن کا شکار ہو گیا۔ موجودہ دور کے ناقدین کا تو چلن ہی نرالا ہے۔ وہ خود کو ادبی فرعون تصور کرتے ہیں۔ جسے چاہیں مٹا دیں، جسے چاہیں قطب مینار پر بٹھا دیں۔ آپ بڑھ چڑھ کر فکر انگیز، سنجیدہ اور بامعنی ادب کیوں نہ تخلیق کریں، اگر آپ کے کسی نقاد کے ساتھ ذاتی مراسم نہیں ہیں تو آپ کی تخلیقات وقت کی گرد میں کھو جائیں گی۔ آج کا نقاد مصنف یا شاعر کو کامیابی کا ویزا عطا کرتا ہے۔

آپ نے ایک سوال یہ بھی پوچھا ہے کہ اردو ادب میں ناول کم کیوں لکھے جا رہے ہیں۔ میرے خیال میں اردو ادب میں زیادہ تر کامیاب ناول اس لیے قلمبند نہیں ہوئے کہ ادیب کے آگے وقت کی کمی، جرات، محنت اور معاشی دشواریاں اکثر رہی ہیں۔"

MR.JETENDER BILLO

1-A, VINCENT ROAD.

WEMBLEY, MIDDX HAO 4HH.U.K

جیلانی بانو

حیدر آباد، دکن

جیلانی بانو حیدر آباد، دکن میں رہتی ہیں اور میں لاس اینجلس میں۔ مگر کچھ دعاؤں کی تاثیر تھی اور کچھ محبت کہ وہ انہی دنوں دہلی آئیں جن دنوں میں بھی دہلی پہنچی ہوئی تھی اور ان کی تلاش میں تھی۔ پھر "بیسویں صدی" دہلی کی مدیرہ شمع افروز نے رہنمائی کی۔ ہم نے جیلانی بانو سے فون پر وقت طے کیا اور یوں جیلانی بانو سے سیر حاصل گفتگو ہوئی۔

جیلانی بانو اب صرف ہندوستان کی معروف افسانہ نگار نہیں بلکہ بین الاقوامی طور پر وہ اردو افسانے کا ایک معتبر حوالہ بن چکی ہیں۔ عام طور پر لکھنے والے کو سب سے پہلے اس کا ماحول متاثر کرتا ہے اور وہ اسی کو موضوع بناتا ہے۔ جیلانی بانو آندھرا پردیش میں رہتی ہیں اور وہ وہاں کے کلچر کو زیادہ جانتی ہیں۔ اس کو زیادہ محسوس کرتی ہیں چنانچہ اس کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر لکھ سکتی ہیں اور وہاں کے مسائل کو اپنے افسانے اور ناولوں کا موضوع بناتی ہیں۔ ان کی کئی کہانیوں کا تلگو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کا ناول "بارش سنگ" تلگو اوپن یونیورسٹی کے کورس میں شامل ہے۔

اردو افسانے کے حوالے سے گفتگو ہوئی تو جیلانی بانو نے بتایا کہ ساری زبانوں کے ادیب اردو

افسانہ نگاروں سے واقف ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے بلکہ پاکستان سے بھی جو اچھے افسانے' کتابوں' رسالوں اور اخباروں کے ذریعے وہاں پہنچتے ہیں دوسری زبانوں کے ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ لوگ اس پر گفتگو کرتے ہیں اور اس پر رائے بھی دیتے ہیں۔

وہ کہہ رہی تھیں کہ پاکستان ہو یا ہندوستان۔ زندگی کی سچائیاں' تلخیاں اور حقیقتیں لوگوں کو لکھنے کی طرف متوجہ کرتی ہیں اور ادیب کو لکھنے کی جرات بھی دیتی ہیں۔ دراصل یہ ترقی پسند تحریک کی بہت بڑی دین ہے اور ترقی پسند تحریک کو مضبوط بنانے' اسے نمایاں اور اہم کرنے میں اہم کردار افسانہ نگاروں کا ہی رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا ہی یہ بہت بڑا کام ہے کہ احمد ندیم قاسمی' منٹو' کرشن چندر' عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی جیسے افسانہ نگار اردو ادب کو دیئے اور ان سے متاثر ہو کر یا ان کی راہ پر یا ان سے سیکھ کر جو لوگ آگے بڑھے تو اس سے افسانے میں نئی وسعتیں پیدا ہوئیں اور ادب کو زندگی سے بہت قریب ہونے کا موقع ملا۔

اس مرحلے پر میں جیلانی بانو کی ایک قلمی تصویر بھی پیش کردوں اور انہیں آپ سے متعارف کرادوں تو کیا حرج ہے۔

یہ معروف ناول اور افسانہ نگار 1936ء میں بدایوں کے قدامت اور روایت پسند متوسط طبقے کے مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد حیرت بدایونی اردو اور فارسی کے ممتاز عالم اور شاعر تھے۔ اپنے والد کی رہنمائی میں انہوں نے دس برس کی عمر سے ہی افسانے لکھنا شروع کئے۔ گھر کے ادبی ماحول سے ان کے فن کو جلا ملی۔ اس دور کے معتبر شعراء اور ادباء کی نشستیں اکثر ان کے گھر رہتی تھیں جن میں کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی' منٹو اور عصمت چغتائی شریک ہوتے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے فنی طور پر ترقی پسند لکھنے والوں کے زیر اثر لکھنا شروع کیا لیکن نظریاتی طور پر انہوں نے ترقی پسندوں کی صف سے اپنے آپ کو الگ رکھا۔

ان کا افسانوں کا پہلا مجموعہ "روشنی کا مینار" (1958ء) میں سامنے آیا اور دوسرا مجموعہ "نروان" (1963ء) میں شائع ہوا۔ ان کے علاوہ دیگر مجموعے --- روز کا قصہ' یہ کون ہنسا' تریاق' سچ کے سوا اور چار ناول --- جگنو اور ستارے' نغمے کا سفر' ایوان غزل' اور بارش سنگ بھی دہلی' حیدر آباد اور کراچی سے شائع ہوئے۔ زندگی کے بارے میں ان کے زاویہ نظر کی تشکیل ان کے ذہنی رویوں اور زندگی کے سنگین حقائق کے درمیان ٹکراؤ سے ہوئی۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں ہندوستانی عورت کی قلبی واردات اور اس کے بارے میں معاشرے کے رویوں کو موضوع بنایا۔ جیلانی بانو نے اپنے ناولوں میں خصوصاً" ہندوستانی دیہات کی عورت کے مسائل اور اس کے دکھوں پر قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے ہندوستانی عورت کے خلاف طبقاتی اور سماجی تعصبات اور اس کے استحصال کے مقابلے میں ہونے والی جدوجہد میں اپنا بھرپور حصہ ادا کیا ہے۔ ان کے دو ناول ان انقلابی تبدیلیوں کی عکاسی کرتے ہیں جو آزادی کی تحریک کے دوران نظام کی ریاست حیدر آباد میں سماجی' ثقافتی اور انسانی

تعلقات کے درمیان پیدا ہوئیں۔ کسی ادبی تحریک یا نعرہ سے متعلق ہوئے بغیر ان زیادتیوں کے خلاف انہوں نے قلم اٹھایا ہے جن کا تعلق عورت کی سماجی' جذباتی اور نفسیاتی' ناانصافیوں سے ہے۔ کچلی ہوئی اور ناانصافی کا شکار عورت ان کی کہانیوں کے صفحات پر اکثر نظر آتی ہے۔

ایک اور موضوع جو ان کی کہانیوں میں نظر آتا ہے۔ وہ ہے تنہائی کا احساس نہ صرف تنہائی بلکہ اس بے چارگی کا احساس بھی کہ دوسری کی تنہائی دور نہیں کی جا سکتی۔ ان کی بیشتر کہانیاں ہندی' تلگو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے علاوہ انگریزی' جرمن' ناروجیئن اور روسی زبانوں میں بھی ترجمہ کی گئی ہیں۔ انہوں نے ٹیلی ویژن کے لئے بھی خوب لکھا ہے اور ایک وسیع حلقے میں اپنے آپ کو روشناس کروایا ہے۔ انہوں نے ایسے بہت سے خاکے اور ڈرامے لکھے ہیں جن سے مذہبی اور ثقافتی ہم آہنگی میں اضافہ ہوا۔ ٹی وی پر ان کا ایک موضوع ہندوستان کی نئی عورت بھی ہے' حیدر آباد کی ثقافت کے بارے میں ایک ٹیلی فلم کے علاوہ انہوں نے متعدد ریڈیائی ڈرامے بھی تحریر کئے ہیں۔

جیلانی بانو مذہبی' فرقہ واریت اور ہندوستانی عورت کے استحصالی پر مبنی رویوں کے خلاف جدوجہد میں بھرپور حصہ لے رہی ہیں۔ وہ ایک غیر سرکاری تنظیم کی سربراہ بھی ہیں جو آندھرا پردیش کے ضلع محبوب نگر کی دیہاتی عورتوں کی سماجی' تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے لئے کام کر رہی ہے۔

جیلانی بانو سے گفتگو میرے مرتب کردہ سوالات سے ہٹ کر بھی ہوئی اور بات سے بات نکلتی چلی گئی جو "گفتنی" کے قارئین کی معلومات میں یقیناً" اضافے کا باعث ہوگی۔

گفتگو میں جدیدیت پر بھی بات ہوئی اور علامتی افسانے پر بھی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ علامت کے بغیر تو افسانہ لکھا ہی نہیں جاتا اور نہ ہی شاعری علامت کے بغیر ممکن ہے۔ علامت تو ایک ضروری چیز تھی لیکن کچھ لوگوں نے بڑا مبہم انداز اختیار کیا یا اتنے الجھ گئے کہ جسے ہم اظہار ترسیل کہتے ہیں۔ وہ بے شک نہ ہو سکا۔ اب رہی جدیدیت تو سلطانہ! میں اس لفظ کو کوئی تحریک نہیں سمجھتی۔ کچھ لوگوں نے کچھ چیزوں کو جدید بنا دیا تھا تو پہلے میں یہ کہوں گی کہ جدیدیت کیا ہے۔ ہر نئی کہانی جدید ہوتی ہے۔ اگر وہ اچھی ہے تو اچھی ہے اور بری ہے تو بری ہے۔ البتہ آپ ترقی پسند تحریک کو تحریک کہہ سکتے ہیں' اس میں ایک خاص رجحان تھا' ایک خاص ضابطہ تھا' ایک خاص آئیڈیالوجی تھی جس کو وہ اپنے افسانوں میں' اپنی تنقید میں' اپنی تحریروں میں لاتے تھے۔ جدیدیت میں تو ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔

ا۔ جدیدیت سے مراد یہ بھی لی جاتی ہے کہ اتنا ابہام کہانیوں میں آگیا تھا کہ ابلاغ نہیں ہوتا تھا جیسا کہ ابھی علامتی کہانیوں کے حوالے سے آپ نے کہا کہ ابلاغ نہیں ہوا۔

سب کی بات مت کیجئے جدیدیت سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی کہانی سمجھ میں نہیں آتی تو یہ جدید ہے اور اگر سمجھ میں آگئی تو اچھی ہے یہ ایک عام بات ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ کوئی کہانی اگر کسی تک نہیں پہنچی اور سمجھ میں نہیں آئی تو یہ بھی ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ جدیدیت کے لئے ہم کیوں

اسے محدود کردیں۔ اس کے علاوہ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی کہ نقادوں نے کہا کہ کہانی' کہانی نگار کے پاس سے چلی گئی تھی یا قاری تک نہیں پہنچی اور اب واپس آگئی ہے۔ یہ گئی کب اور واپس کب آئی؟ میں ان دونوں چیزوں کو نہیں مانتی۔ کسی افسانہ نگار کے پاس سے کہانی چلی گئی تو پورے ادب پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ہر دور میں اچھی کہانی اور افسانے لکھے گئے ہیں۔ اب نئے دور میں بھی اچھے افسانے لکھے گئے۔ اس کو ہم اس طرح کیوں کہیں کہ یہ جدید کہانی تو اس لئے خراب تھی یا جدید افسانہ نگار تھے اس لئے برے ہیں یا کوئی کہانی اس لئے اچھی ہے کہ جدید ہے یا مابعد جدید ہے۔

2- کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ موجودہ صدی میں اردو ادب میں بہت کم ناول لکھے گئے۔

کم لکھے گئے مگر اتنے بھی کم نہیں لکھے گئے۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں تو بہت ناول لکھے گئے ہیں۔ ایک "فائر ایریا" ہے' الیاس احمد گدی کا ہے۔ ابھی محمد اشرف کا ناول آیا ہے۔ بہرحال بہت اچھے ناول لکھے جا رہے ہیں اور پاکستان میں بھی اچھے ناول لکھے جا رہے ہیں۔ بانو قدسیہ کا "راجہ گدھ" ہے۔ (مارچ 2000ء میں اس ناول کی مصنفہ محترمہ بانو قدسیہ کو اس ناول کے حوالے سے "پرائڈ آف پرفارمنس" کا اعزاز ملا ہے۔) انور سجاد کا "خوشیوں کا باغ" ہے' انتظار حسین کا "بستی" ہے۔ ویسے ناول ہر دور میں کم ہی لکھے گئے لیکن ایک چیز یہ بھی ہے کہ ناول بہت وقت لیتا ہے۔ جس طرح ایک تھیسس لکھا جاتا ہے۔ اس کے لئے بہت وقت دینا پڑتا ہے' توجہ دینی پڑتی ہے۔ ہو سکتا ہے آج کل لکھنے والوں کے پاس اتنا وقت نہ ہو' اتنی توجہ نہ دے پاتے ہوں جو ناول لکھنے کے لئے ضروری ہے۔

3- اچھا! ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے لکھنے والے ایک مادی اور معاشی بحران کا شکار ہیں' آپ کیا محسوس کرتی ہیں؟

بلاشبہ یہ تو آج ہر انسان کا مسئلہ ہو گیا ہے۔ آپ یورپ کو چھوڑیئے باقی دنیا کو چھوڑیئے' صرف ہندوستان کو دیکھئے' یہاں سیاسی انتشار' سماجی پسماندگی' معیشت کی خرابی اور غریب' غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں اور امیر' امیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔ پھر یہ کہ ان سب کی وجہ سے بے روزگاری اور ذہنی پریشانیاں بڑھی ہیں۔ اس کی وجہ سے جرائم بڑھ رہے ہیں۔ تعلیم لی گئی ہو رہی ہے۔ ہماری سیاسی اقدار ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں۔ ہمارے سماجی رشتے ٹوٹ رہے ہیں تو اس سب کا اثر لکھنے والے پر تو پڑے گا ہی۔

4- تو اس سارے نظام فکر ہی کو بدلنا پڑے گا۔

بالکل بدلنا پڑے گا اور اس کا عکس آپ کو آج کی شاعری میں اور آج کے افسانے میں نظر آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو ادب میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اردو فکشن اس وقت ساری علاقائی زبانوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ ویسے مراٹھی میں بہت اچھا افسانہ لکھا جا رہا ہے۔ تلگو میں'

ہندی میں تو خیر ہے ہی۔ سب لکھنے والے اپنے مسائل کو سمیٹ رہے ہیں۔

5- ویسے تو اردو کئی زبانوں کا مجموعہ ہے مگر اب انگریزی زبان کے الفاظ بہت زیادہ استعمال کئے جا رہے ہیں، آپ کی کیا رائے ہے؟

اردو تو بنی ہی دوسری زبانوں سے مل کر ہے۔ اردو خود کون سی زبان ہے۔ اردو کو نہ تو مسلمان اپنے ساتھ لے کر آئے تھے نہ سنسکرت والے اور نہ ہی بدھ مت کے ماننے والے۔ یہ زبان تو ہندوستان میں سب زبانوں سے مل کر ایک زبان بنی ہے۔ اردو پہلے فوج کے رسالے ہوتے تھے۔ ان کا نام تھا، اس کا مطلب ہے ہر طرح کے سپاہی اس میں شامل تھے تو آج لکھنؤ کی اردو الگ ہے۔ حیدر آباد کی اردو الگ ہے۔ پنجاب کی اردو الگ ہے کیونکہ اس پر وہاں کی مقامی زبان کا بھی اثر ہے۔ آپ نے یاد دلایا تو میں کہوں کہ لکھنؤ کی زبان کا خاص انداز ختم ہو رہا ہے۔ پنجاب کا مخصوص انداز ختم ہو رہا ہے۔ حیدر آباد کی ایک مخصوص زبان تھی مگر اب حیدر آباد میں دہلی کے لوگ بھی آگئے ہیں، مدارس کے بھی آگئے اور آندھرا کے بھی آگئے تو وہ جو حیدر آباد کی خاص زبان تھی وہ ختم ہو رہی تھی چنانچہ میں نے ایک کام یہ کیا کہ چودہ آڈیو کیسٹس میں حیدر آباد کی خاص زبان کو محفوظ کیا ہے۔ اس میں چھوٹے بچے جس طرح باتیں کرتے ہیں، کالج کے لڑکوں کی گفتگو کا انداز، نیوز ریڈر کا لہجہ، شہزادوں کی زبان، سو سالہ بوڑھی عورت کی زبان، سبزی فروخت کرنے والی عورت کی زبان، ساس بہو کی گفتگو، انگریزی زدہ حیدر آبادی زبان بولنے والوں کا لہجہ، زندہ دلان حیدر آباد کے پروگرام، دکنی شاعری سے انتخاب وغیرہ کو شامل کیا ہے۔ یہ کیسٹ ہندوستان کی لائبریریوں میں محفوظ کیا جا رہا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ پاکستان میں بہادر یار جنگ اکیڈمی اور نظام ٹرسٹ لائبریری میں بھی محفوظ کر لیا گیا ہے۔

6- اپنی زندگی کا کوئی واقعہ سنایئے جس سے آپ نے بہت اثر قبول کیا ہو؟

ایک بار ہمارے ماموں کہیں تھے۔ ان سے ملنے کے لئے ہم بس میں جا رہے تھے تو ایک لڑکی تھی گاؤں والی تلگو میں باتیں کر رہی تھی، وہ کہہ رہی تھی۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی ہوں۔ میں اپنے شوہر سے بھی نہیں ڈرتی ہوں۔ بھگوان کو بھی دیکھ لیا مجھے جو کرنا ہے وہ کروں گی۔ اس کی ساتھی نے کہا تو لڑکی ہے تو کیا کرے گی۔ وہ بولی تو لڑکی ہونا کوئی جرم ہے کیا؟ میں کر کے دکھاؤں گی۔ میں سب کام کر سکتی ہوں۔ اتنے حوصلے ہیں۔ وہ لڑکی بات کر رہی تھی۔ تب مجھے خیال آیا کہ لڑکی یا عورت ہے مگر یہ غلط ہے کہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اس لڑکی میں دیکھو کتنی ہمت ہے۔ تو اس وقت میں نے سوچا کہ کچھ عورتوں کے بارے میں لکھنا چاہئے مگر اس وقت ہمارے گھر میں بڑی پابندی تھی۔ اسکول تک نہیں جا سکتے تھے جو یوپی کے عام گھروں میں رواج تھا وہی ہمارے ہاں بھی تھا لیکن جب ہم نے لکھنا شروع کیا تو رول ماڈل وہ لڑکی میرے لئے ایک تحریک تھی وہ۔

7- آپ نے لکھنے کی ابتدا کس طرح کی؟

برسوں ساہتیہ اکادمی میں ایک پروگرام میں بہت دیر تک میں نے اس پر گفتگو کی ہے۔ میرے ابا حیرت بدایونی فارسی، عربی، سنسکرت کے بڑے عالم تھے۔ موسیقی اور مذاہب عالم کے بارے میں بھی ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ہمارے ہاں پاکستان اور ہندوستان کے سارے ہی بڑے ادیب اور شاعر آتے تھے۔ ہمیں شاعری کا کوئی شوق نہیں تھا بلکہ مصوری کا شوق تھا۔ میری چھوٹی بہن مہر رحیم امریکہ میں بہت مشہور آرٹسٹ ہیں۔ ان کی تصاویر کی نمائش بھی ہوتی ہیں۔ تو ہمیں بھی مصوری کا شوق تھا۔ ابھی ہم نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا کہ ایک کہانی لکھی "موم کی مریم" اور لاہور میں میرزا ادیب کے رسالے میں بھیج دی۔ وہ کہانی چھپی سالنامے میں اور اگلے ماہ بڑے بڑے ادیبوں نے ایڈیٹر کے نام خطوط میں اس کہانی کی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اب تو بڑے ادیب ایسا نہیں کرتے مگر اس وقت کرشن چندر، عصمت چغتائی، ابراہیم جلیس، ظہیر کاشمیری، احمد ندیم قاسمی اور خدیجہ مستور نے کہانی کی تعریف میں لکھا۔ (بڑے ادیب اس آئینے میں چہرہ دیکھنا پسند کریں گے؟) ایڈیٹر نے اپنے خط میں ہمیں لکھا کہ دیکھئے ان ادیبوں نے آپ کی کہانی کے بارے میں یہ لکھا ہے۔ یہ کہانی لکھ کر ہم بھول بھال گئے تھے مگر جب اتنے لوگوں نے ہمت افزائی کی تو پھر ہم نے اور کہانیاں لکھیں۔

8- آپ کے والد نے مطالعے کے سلسلے میں آپ کی رہنمائی کی تو آپ نے کن مذاہب کا مطالعہ کیا؟

انہوں نے ہمیں بائبل کا نسخہ لا کر دیا اور کہا کہ اسے سمجھ کر پڑھو۔ رامائن وغیرہ بھی پڑھیں۔ ہمارے ابا ہمیں سمجھاتے تھے۔ وہ کہتے تھے اگر تمہیں لکھنا ہے تو سارے مذاہب کے بارے میں پڑھو اور کسی مذہب سے تعصب یا نفرت مت رکھو۔

9- اتنے مذاہب کے مطالعے سے آپ نے ایک ہی بات پائی ہوگی کہ سارے مذاہب اچھے ہیں اور سب بھلائی کی تعلیم دیتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت نہیں سکھاتے۔

جی ہاں! یہ سب تو ہم انسانوں نے دوسرے مذاہب سے نفرت اور دشمنی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہم مسلمان ہیں، ہمیں اپنے مذہب سے پیار ہے۔ دوسرے مذہب والوں کو بھی اپنے مذہب سے اتنا ہی پیار ہے۔ اگر ہم اسے برا بھلا کہیں گے تو انہیں بھی اتنی ہی تکلیف ہوگی جتنی ہمیں ہوتی ہے۔ یہ تو بالکل غلط رویہ ہے کہ ہم کسی مذہب کی برائی کریں۔

10- ایک سوال میں آپ سے کرنا چاہتی ہوں کہ یہ ساختیات اور پس ساختیات کیا ہیں، کچھ اس پر روشنی ڈالیں گی؟

میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی جیسے آپ پوچھ رہی ہیں، ایسے ہی میں بھی ان لوگوں سے اس بارے میں پوچھتی ہوں۔ بہرحال یہ ایک علم ہے اور کچھ لوگ یقیناً اس کے بارے میں بہت اچھا علم رکھتے ہوں گے۔

11- یہ بتایئے کہ اب نہ عملی تنقید پر کوئی کام ہو رہا ہے نہ اور نظری تنقید پر۔ جو کچھ لکھا جارہا ہے وہ اپنے لوگوں کو نوازنے کے لئے کچھ لکھ دیا جاتا ہے' کیا یہ رویہ صحت مند ہے؟

یہ درست ہے کہ تنقید بہت کم لکھی جارہی ہے۔ تاہم ہمارے ہاں کچھ لوگ ہیں گوپی چند نارنگ ہیں' شمس الرحمن فاروقی ہیں' شمیم حنفی صاحب ہیں' وارث علوی صاحب ہیں۔ یہ سب بہت اچھا لکھ رہے ہیں لیکن یہ بات درست کہ بہت کم لکھا جارہا ہے۔

12- تراجم آپ کے ہاں ہو رہے ہیں؟

اردو سے ہندی میں بہت ترجمے ہو رہے ہیں۔ پاکستان کا سارا ادب ہندی میں ترجمہ ہو جاتا ہے۔ میری ساری کہانیاں ہندی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ تلگو میں بھی بیشتر تحریریں ترجمہ ہوئی ہیں۔ ساؤتھ کی ساری زبانوں میں میری تحریروں کا ترجمہ ہوا ہے اور یہ چیز پاکستان میں نہیں ہے۔ وہاں علاقائی زبانوں اور اردو میں اب بھی فاصلہ ہے۔ ہم اپنی علاقائی زبانوں سے بہت قریب ہیں اور ایک دوسرے سے شناسائی رکھتے ہیں۔

جیلانی بانو کو سویت لینڈ نہرو ایوارڈ 1985ء میں ملا تھا۔ اس سے پہلے اردو میں یہ ایوارڈ عصمت چغتائی مرحومہ اور فیض احمد فیض مرحوم کو ملا تھا۔ یہ ایوارڈ دنیا کی ہر زبان کے ادیب کو ہر سال دیا جاتا ہے۔ انہیں 1978ء میں غالب ایوارڈ 1983ء میں دوشیزہ ایوارڈ (پاکستان سے) 1988ء میں مہاراشٹر اکادمی ایوارڈ 1989ء میں آل انڈیا قومی حالی ایوارڈ ہریانہ اردو اکادمی سے اور 1991ء میں نقوش ایوارڈ عطا کیا گیا۔ 1997ء میں جیلانی بانو کو دوحہ قطر میں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔ ان کی ساری کتابوں کو ہندوستان کی مختلف اکادمیوں نے ایوارڈوں سے نوازا ہے۔

ہندوستان کے اردو ادیبوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ "اردو" بھارت سرکار کی قومی زبان نہ ہوتے ہوئے بھی ہر صوبے کی اکادمیاں اردو میں شائع ہونے والی کتابوں کو نہ صرف "اعزازات" سے نوازتی ہیں بلکہ ان کی اشاعت کے لئے حتی المقدور مالی امداد بھی فراہم کرتی ہیں۔ ہم جن کی قومی زبان اردو ہے اس پر تھوڑا سا شرمسار ہو لیں تو.....!

MRS.JILANI BANO 71 HUDA HEIGHTS
HOUSE NO.~~8-2-268/1/16 B-ROAD~~ NO.8
Road No.12 BANJARA HINS, HYDERABAD,500034, INDIA

خیالات کی تھکن ایک نئے ستارے کی
تلاش بھی تو ہو سکتی ہے۔

چاند

چاند کرن شرما

لندن

آج 2/ اکتوبر 1999ء بدھ کا دن ہے۔ میں چاند کرن شرما کا تعارف لکھ رہی ہوں۔ تھوڑی سی کمک عاشور کاظمی کی کتاب "فسانہ کہیں جسے" (جو 1993ء میں عاشور نے طبع کرائی تھی) نے بھی پہنچائی۔ مجھے دو ہفتے بعد دہلی ہندوستان کے لئے روانہ ہونا ہے اور اس مختصر عرصے میں کئی کتابیں بھی پڑھنی ہیں جو مصنفین نے اپنے تعارف کے ساتھ بھجوائی ہیں۔

چاند کرن شرما کے بارے میں عاشور لکھتے ہیں "یہ چاند کوئٹہ بلوچستان کے افق پر طلوع ہوا" کرن نے مجھے لکھا "میں 19 دسمبر 1950ء کو کوئٹہ پاکستان میں پیدا ہوئی۔ ان دنوں میرے ابو وہاں سول سرجن تھے۔ میری ابتدائی تعلیم وہیں اردو میں ہوئی چنانچہ اس زبان سے عمر بھر کا ایک قلبی رشتہ قائم ہو گیا۔ مجھے بچپن سے ہی کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ ایک بار کلاس روم میں اپنی کاپی کے نیچے کہانی کی کتاب رکھ کر پڑھ رہی تھی کہ استانی نے دیکھ لیا۔ تب ہاتھ پر دو فٹ رول پڑے۔ میں اس وقت ساتھ آٹھ سال کی تھی۔ پھر جب میں سیکنڈری اسکول پہنچی تو بیدی منٹو، عصمت آپا اور کرشن چندر کو پڑھا۔

اس کے بعد رام لعل' انتظار حسین' وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کو بھی پڑھا۔ مغربی ادیبوں میں تھامسن ہارڈی' کافکا' آسکر وائلڈ لارنس کو پڑھا۔ شیکسپئر کے چند ڈرامے اور او ہنری کو بھی پڑھا ہے۔

ان دنوں میری کہانیاں چاند کرن اور چاند گل کے نام سے چھپتی تھیں۔ شرما ہمارا پشتینی فیملی نام ہے جو میں نے بعد میں استعمال کرنا شروع کیا۔ چاند کرن نے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا ہے وہ کہتی ہیں۔ "جب زندگی میں فرسٹریشن کا سامنا ہو' جب زندگی میں کٹھن مرحلے آجائیں تو قلم سے کاغذ کا سینہ تو چھلنی کیا جاسکتا ہے جو ہمارے نشتر زیادتی (violence) کا شکار تو ہوتا ہے لیکن احتجاج نہیں کرتا۔

چاند کرن انگریزی میں بھی لکھتی ہیں۔ برطانیہ کی عدالتوں اور پولیس کے محکموں میں ترجمان کا کام کرتی ہیں۔ فلم اسکرپٹ کے ترجمے کرتی ہیں۔ سوشل ورک کرتی ہیں۔ کہانیاں لکھتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ترجمان' یا سوشل ورکر کی حیثیت سے جب وہ مختلف کرداروں سے ملتی ہیں تو انہیں بہت سے ایسے واقعات ایسے ملتے ہیں جن پر لکھنے کی کوئی ہمت نہیں کرتا لیکن وہ کرداروں کے نام بدل کر انہیں قلم بند کر دیتی ہیں۔

عاشور کی کتاب میں ان کا افسانہ "نگینہ" بھی موجود ہے۔ کہانی کا موضوع عام ہے لیکن کہانی میں بڑی روانی ہے۔ خوبصورت جملے ہیں مگر اب چاند نے اردو میں لکھنا تقریباً" چھوڑ دیا ہے۔ انہوں نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ جس زبان سے "رزق" حاصل نہ ہو اسے استعمال کر کے کیا کروں۔ خط انہوں نے مجھے انگریزی میں لکھا ہے اور اپنے تعارف میں جگہ جگہ انگریزی کے پیراگراف استعمال کئے ہیں۔ کیونکہ بقول چاند ان کا واسطہ شب و روز انگریزی سے ہے۔ وہ نہ صرف قلم اسکرپٹ لکھتی ہیں بلکہ فلموں اور ڈراموں میں ایکٹنگ بھی کرتی ہیں۔ چاند کی کہانیوں کا مجموعہ 1995ء میں شائع ہوا۔ چاند نظمیں بھی لکھتی ہیں چنانچہ کئی انتخابات میں ان کی کہانیوں اور شاعری کے حوالے سے ان کا ذکر موجود ہے۔ 1992ء میں انہوں نے نورنگ تھیٹر کے نام سے ایک کمپنی کی بنیاد رکھی ہے۔ جس نے ان کے تین ڈرامے پیش کئے ہیں۔ چاند ایک ناول بھی لکھ رہی ہیں ان کی خواہش ہے کہ یہ ناول جلد مکمل ہو تاکہ اس کی فلم بندی بھی ہو سکے۔

چاند کہتی ہیں براڈ کاسٹنگ اور رائٹنگ سے اپنے روزمرہ کے اخراجات پورے کرتی ہوں اور گورمکھی ہندی اور اردو زبان کے ترجمان کی حیثیت سے جو آمدنی ہوتی ہے اس سے میں اپنے بلوں کی ادائیگی کرتی ہوں۔ گویا چاند بہ یک وقت کئی محاذوں پر سرگرداں ہیں اور لگن سچی ہے اس لئے کامیاب بھی ہیں۔

اب آیئے چاند کرن سے چند سوال پوچھتے ہیں۔

چاند نے کہا "بیسویں صدی میں زندہ رہ جانے والے ناموں میں قرۃ العین حیدر' کرشن چندر'

سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، رام لعل، جیلانی بانو، ممتاز مفتی اور عبداللہ حسین کے نام ذہن میں آتے ہیں۔ مگر سب سے اہم نام جو میرے نزدیک مشعل راہ بھی ہے وہ ہے عصمت چغتائی۔ اردو کے تمام مرد اور خواتین ادیبوں میں ان کا نام روشن ہے۔"

چاند کرن لکھتی ہیں کسی بھی فکشن کو جامد (static) نہیں ہونا چاہئے۔ کئی تبدیلیاں جو نئے فکشن میں آئی ہیں وہ قابل قبول بھی ہیں۔ جیسے کہ عورت صرف چکی پیستی چپاتیاں سینکتی اور پکوڑے ہی نہیں تلتی وہ ڈاکٹر، ٹیچر، سیاست داں اور IAS افسر بھی ہے۔ ترقی پسند تحریک کی انفرادیت ختم ہوتی نظر آرہی تھی۔ نیا ادیب predictability کا شکار ہوتا نظر آتا تھا۔ ادب میں نئے معاہدہ (challanges) کا سامنا بھی کرنا ضروری ہے۔ نئے تجربات ادب کے لئے اہم ہیں۔ اس نے ادب کو جو حسن بھی دیا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مبہم علامتوں اور بے معنی جدتوں نے جو فیشن کے طور پر استعمال کی جاتی تھیں ادب کو نقصان بھی پہنچایا ہے۔

ناول ایک اردو صنف نہیں ہے۔ ہمارے یہاں کے مروجہ ادب میں (Literary Genre) رزمیہ شاعری (Epics) اور داستانیں (Oral Tales) ہیں ناول ایک مغربی روایت (tradition) اور طریقہ کار ہے جسے ہم نے اپنایا ہے۔ عبداللہ حسین کا اداس نسلیں عینی کا آگ کا دریا اور کرشن چندر و عصمت آپا نے اچھے ناول لکھے ہیں۔ میرے خیال میں سب سے بڑی مشکل بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ناول کے لئے جو وقت نظم و ضبط اور منصوبہ بندی اور desciplineدرکار ہے وہ ہمارے معاشرے کی معاشی مشکلات کی وجہ سے شاید اکثر ادیبوں کے لئے ایک luxury ہو۔

We dont have the luxury of time and during that period

we that one has to spend time in writing. How is a writer to be supported?

کسی بھی دور کا مصنف ذہنی بحران سے دوچار ہوتا ہے وہ غیر فعال (passive recepient) نہیں۔ اس کی رہنما اس کی اپنی سوچ ہے کوئی بھی ادیب کیا لکھتا ہے یہ اس کا ذاتی فیصلہ ہے۔

شاعری اور نثر اچھی بھی لکھی جارہی ہے بری بھی۔ کیا شائع ہوپاتا ہے کیا نہیں اور کیا قاری کے ہاتھ میں پہنچتا ہے۔ یہ تحریر کے معیار پر مبنی نہیں بلکہ پرنٹنگ مافیا (Printing Mafia) کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ کسی بھی ترقی پسند ملک، معاشرے اور ادیب کے حق میں نہیں۔ جن کے پاس اپنے پیسے ہوں وہ کچھ بھی چھپوالیں یا جن کی پی آر (PR) مشین اچھی ہو جیسے کشمیری لعل ذاکر کیا لکھتے ہیں اس کی نہ کوئی نفسیاتی گہرائی و گیرائی ہے نہ ہی گہرا مشاہدہ ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کے باہر زیادہ شاعری اس لئے ہو رہی ہے کہ نثر کی بہ نسبت شاعری کرنا کہیں زیادہ آسان ہے اور وقت کم لگتا ہے۔ میرے خیال میں شاعری بلا تحریک غیر (spontanious) بھی ہے نثر کے لئے وقت نکال کر سوچ کر ایک عمارت کا خاکہ (structure) تیار کرنا ہوتا ہے۔ ایک پلاٹ ہے، کردار ہیں، نفسیاتی مطالعہ ہے ان سب کے لئے وقت درکار ہے جو

بیرونی ممالک میں بسنے والے لوگوں کے پاس ہے نہیں۔ کچھ لوگ واہ واہ کے لئے بھی شاعری کرتے ہیں یہ ایک ذہنی تفریح ہے۔ (It is an entertainment.) میں بذات خود entertain کرنے کے لئے نہیں، لوگوں کا شعور بیدار کرنے کے لئے لکھتی ہوں۔

تحریر میں انگریزی کے الفاظ لانا کبھی کبھی مشکل اس لئے ہوتا ہے کیونکہ ادبیات میں عام الفاظ نہیں تفکر اور sensibility کا عکس تحریر میں جھلکنا چاہئے ہم کوئی بھی لفظ اٹھا کر استعمال نہیں کر سکتے لیکن مغرب میں لکھی جانے والی تحریروں میں انگریزی الفاظ کی آمیزش ہے۔ کسی کردار کو portray کرنے کے لئے اس کی زبان ویسی ہی استعمال کی جاسکتی ہے جو روزمرہ زندگی کی زبان ہے اس میں انگریزی کی شمولیت لازمی ہے۔

اپنی زندگی کا یہ اہم واقعہ نہیں بھلا پائی۔ یہ 1971ء کی بات ہے۔ میں تب بیس اکیس برس کی رہی ہوں گی۔ 26 جنوری ہندوستان کے قومی دن (Republic Day) کی پریڈ کے بعد رات کو لال قلعہ میں مشاعرہ ہوتا ہے۔ مجھے پنجابی کے ممتاز شاعر شیو کمار بٹالوی نے رات کے مشاعرے پر مدعو کیا وہ پنجابی کی مشہور ادیب امرتا پریتم کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ مشاعرے کے بعد وہ مجھے حفاظت سے گھر پہنچادیں گے۔ مشاعرہ رات کے ایک بجے کے بعد ختم ہوا۔ شیو کمار بٹالوی جنہیں ہندوستان کے اعلیٰ ترین اعزاز (Gian Peth Award) گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا تھا وہ امرتا پریم اور امروز آرٹسٹ جو امرتا کے ساتھ رہتے ہیں سبھی کار کی طرف بڑھے۔ میں بھی ان کے پیچھے چلی۔ وہ تینوں کار میں سوار ہو گئے لیکن مجھے انہوں نے کار میں بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔ کار اسٹارٹ ہوئی اور چل دی۔ کسی نے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ چاندنی چوک کے علاقے میں رات کے اس وقت مجھے اکیلا چھوڑنا کیسی احمقانہ اور مجرمانہ بات تھی۔ قتل و ریپ کے امکانات واضح تھے۔ لیکن اتنے بڑے پہنچے ہوئے اور امرتا پریتم جیسی ناول نگار جو اپنے ناولوں میں عورتوں کو Responsible aminist ہونے کی تنبیہ کرتی ہیں خود انہوں نے کیسا غیر ذمہ دارانہ رویہ برتا۔ اور شو کمار جو ایوارڈ کے نشے میں اپنی ذمہ داری بھول گئے۔

دوسرا واقعہ 1978ء کا ہے میں بمبئی میں خواجہ احمد عباس کے ہاں ٹھہری تھی۔ ان دنوں ان کی بڑی آپا بھی ان کے ہاں مقیم تھیں۔ میں ان کے پاس بیٹھی تھی۔ کہنے لگیں "تمہاری پیدائش پاکستان کی ہے۔ تمہارا نام ماشاء اللہ چاند ہے اور تمہارا چہرہ بالکل مسلم لگتا ہے۔" مجھے یہ سن اچھا بھی لگا۔ ان کی انسیت سے میں بھیگ بھیگ گئی پھر میری کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ میں برہمن لڑکی ہوں سب سے بڑا رشتہ اور ایمان پیار ہی ہوتا ہے۔"

سوال نمبر 10 کے جواب میں کہوں گی کہ مجھے اس بات سے پوری طرح اتفاق نہ بھی ہو تو یہ کہنے میں مجھے عذر نہیں کہ تنقید بدقسمتی سے personalities کو سامنے رکھ کر کی جانے لگی ہے بجائے اس کے کہ ادیب کی تخلیق ہی قابل ذکر ہونی چاہئے۔ عملی اور نظریاتی ترقی تب ہی ممکن ہے جبکہ

ادیب اپنی سوچ اور اپنے ذہن کی کھڑکیاں کھولی رکھے۔ کھلے دریچوں سے آنے والے نئے خیالات نئے آئیڈیا کو اپنائے سوچے تجزیہ کرے۔ اور کسی نتیجے پر پہنچے پھر اپنے تجربات کی بنا پر اسے منطبق (apply) کرے۔ کہیں سے بھی استفادہ کرنے کے قطعی یہ معنی نہیں کہ ہم کسی ازم کی تعلیم کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں کیسی بھی ازم کو سامنے رکھ کر تخلیقی انداز میں لکھا ہی نہیں جاسکتا۔ آئیڈیالوجی بھی ہماری پرورش ہماری تربیت اور ہمارے ماحول کی دین ہے۔ ہم اپنے دانشوروں سے' اپنی تاریخ سے' اپنے گردوپیش سے اور اپنے خود کے مطالعے کی بنا پر اپنے تفکر کو ایک رنگ اور شکل دیتے ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ایک آزادانہ سوچ کسی ازم کی محتاج ہو یا اس کی نشاندہی کرے۔

ایک اہم بات مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ خواتین کے سلسلے میں ہمیں اپنا ذہنی رویہ بدلنا ہوگا۔ وہ فی زمانہ مردانہ میدان میں ہر جگہ یہ ثابت کرتی چلی آرہی ہیں کہ محنت کے مقام میں اور ذہنی رویوں میں وہ مرد سے کم فہم نہیں۔ جنس نازک اپنی جگہ لیکن اسے ٹخنوں میں عقل رکھنے والی کہنا خود اپنی مردانگی کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ اب زندگی کے ہر شعبے میں آگے بڑھنے کے لئے اس کی راہیں مسدود کرنا ترقی کو روکنا ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں کہیں بھی معیاری ترجمے نہیں ہو رہے۔ نہ ہی شاعری کے' نہ نثری ادب کے۔ مغرب میں حضرت امیر خسرو' حالی' ذوق' غالب' ساحر' کیفی' کرشن چندر یا عصمت چغتائی کی تخلیقات کے ترجمے دستیاب نہیں اور ان پر کوئی قابل ذکر کام بھی نہیں ہوا۔

میری خواہش ہے کہ میں عصمت چغتائی کی تخلیقات کے تراجم کر کے مغرب کو اس ادیبہ سے روشناس کراؤں۔

CHAND KIRAN SHARMA

45, KIRTON CLOSE, CHISWICK,

LONDON W4 2RY, U.K

سپنا کے لیے دانشوری کی
حیثیت نہیں رکھتا۔

حسن ہاشمی
۲۵ مارچ ۲۰۰۰

حسن ہاشمی

کراچی

کہانی ہو، افسانہ ہو، ناول یا مضمون۔ اگر فکر کی ترسیل اور ابلاغ نہ ہو تو اسے قبولیت کا درجہ نہیں ملتا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی تک ہمارے ہاں جو کچھ لکھا گیا وہ پسندیدہ اور مقبول افسانوی ادب تھا۔ اس کے بعد مغرب سے درآمدہ جدیدیت کے رجحان نے افسانوی ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ افسانے کا ارتقائی عمل رک گیا اور یہی وہ زمانہ تھا جب خصوصی طور پر پاکستان میں ڈائجسٹوں کو فروغ ملا۔ قاری نے جاسوسی اور تحیر خیز کہانیوں کا خیر مقدم کیا۔ اچھے افسانوں کی کمی نے جاسوسی ادب کو خوب پنپایا اور پاکستان میں ڈائجسٹوں کا تقابلی دور شروع ہوا۔

ہماری دوسری کم نصیبی پاکستان میں جمہوریت کے فقدان کی تھی۔ زیادہ تر مارشل لائی دور رہا۔ علامتی اور مزاحمتی ادب تخلیق ہو رہا تھا جو عام قاری کے سر سے گزر جاتا تھا اور عام قاری کو بہرحال پڑھنا تھا۔ سو ان کی ذہنی تربیت ڈائجسٹی ادب سے ہو رہی تھی۔

یہ جنوری ۱۹۷۰ء کا مہینہ تھا جب کراچی سے سب رنگ ڈائجسٹ کا آغاز ہوا۔ حسن ہاشمی اس کے پہلے شمارے ہی سے ادارتی شعبے سے وابستہ ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ماہنامہ

"سب رنگ" پاکستان کا مقبول ترین ڈائجسٹ بن گیا اور اس لئے بھی کہ اس میں ابتدا ہی سے منتخب اور خالصتاً "ادبی افسانے شامل کئے جانے لگے۔

جاسوسی کہانیوں کا انتخاب بھی بڑا کڑا ہوتا تھا۔ حسن ہاشمی کے قلم کو یہیں سے جلا ملی۔ ان کے رہ نما شکیل عادل زادہ تھے جو خود اپنی ذات میں اک ادارہ ہیں۔ حسن ہاشمی نے "سب رنگ" کے لئے مختلف ناموں سے بے شمار کہانیاں ترجمہ کیں جن میں بنگالی، مراٹھی اور ہندی ادب سے لی گئی کہانیاں بھی تھیں۔ یوں ان کے مطالعے کی وسعت بڑھی اور قلم کی جولانیوں میں بھی اضافہ ہوا اور آج حسن ہاشمی کا نام نہ صرف بطور مترجم مستند ہے بلکہ اردو زبان کے پائے کے ادیبوں میں بھی ان کا شمار ہے۔

سید محمد حسن ۱۲ ستمبر ۱۹۴۲ء کو گیا (بہار ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ جامعہ کراچی سے کامرس میں گریجویٹ ہیں۔ سرمایہ کاری اور بینکنگ سے مدتوں سے وابستہ رہے۔ باقاعدگی سے لکھنے کا سلسلہ ۱۹۶۳ء سے شروع ہوا۔ جنوری ۱۹۷۰ء سے "سب رنگ" سے وابستہ ہوئے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے لئے ۷۲ء سے ۷۴ء تک لندن میں رہے۔ اس دوران بی بی سی اردو سروس سے (جزوقتی) بطور قلم کار و صداکار وابستہ رہے۔ شوبز سے متعلق ہانگ کانگ سے شائع ہونے والے ایک ماہنامے کی ادارت بھی سنبھالی اور اپنے ذاتی خواتین کے ماہنامے "چاندنی" کے مدیر بھی رہے۔

حسن ہاشمی نے جان فشانی سے زندگی بسر کی ہے۔ ایک نہایت معزز، آسودہ حال خاندان سے ان کا تعلق ہے۔ علم و ادب آبائی ورثہ ہے۔ ان کے والد گو ادیب و شاعر نہیں تھے لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ، علم و ادب سے گہرا شغف رکھنے والے شخص تھے۔ ان کے پھوپھا سید عبدالقدوس ہاشمی ایک نامی گرامی عالم اور دانش ور تھے۔ دین، فقہ، مذاہب عالم اور ایسے ہی موضوعات پر ان کی بے شمار کتابیں دستاویزات کا درجہ رکھتی ہیں۔ حسن ہاشمی کی نوعمری میں والد کا انتقال ہو گیا۔ گھر کے بڑے بیٹے کی حیثیت سے دو چھوٹے بھائیوں، تین چھوٹی؟ بیوہ والدہ اور ایک بڑی بہن کی ذمہ داری ان کے ناتواں کاندھوں پر آپڑی تھی۔ حسن ہاشمی نے نامساعد حالات کے باوجود تعلیمی سلسلہ بھی جاری رکھا اور کمال استقامت سے اپنے گھریلو فرائض سے عہد برآ ہوتے رہے۔ انہیں اپنے عالم و فاضل، نادر روزگار پھوپھا حضرت قبلہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی سے کسب فیض کا موقع بھی ملا۔ اپنے پھوپھا سے وہ بڑی محبت کرتے تھے۔ ہاشمی صاحب قبلہ کی شفقتیں بھی اپنے ذہین و فطین، متجسس اور مضطرب بھتیجے پر ارزاں تھیں۔ دونوں میں باقاعدہ استادی شاگردی کا باقاعدہ کوئی معاملہ اور سلسلہ نہ تھا لیکن دونوں کے درمیان سائل و مسئول کا ایک خاموش معاہدہ تھا۔ جب سوال حسن ہاشمی کو پریشان کرتے تھے تو وہ اپنے پھوپھا کے گھر کا رخ کرتے تھے اور وہاں سے شاد کام واپس آتے تھے۔ مولانا مرحوم کے آخری دنوں میں حسن

ہاشمی نے ان کی مطبوعہ کتابوں کی از سرنو ترتیب و تدوین اور غیر مطبوعہ مسودوں کی طباعت و اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن مولانا کو جلدی تھی۔ یہ کام ادھورا رہ گیا۔ ایک عرصے کے توقف کے بعد اب پھر حسن ہاشمی اپنے پھوپی زاد بھائی' دنیائے اشتہار کی سرکردہ اور مشہور سماجی شخصیت جناب حسین ہاشمی کی اعانت سے مولانا مرحوم کے علمی' تحقیقی' تاریخی اور دینی کام کو مجتمع کرنے میں مصروف ہیں۔ حسن ہاشمی کے لیے مولانا عبدالقدوس کی ناگہانی وفات ایک ذاتی نقصان کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں "وہ میرا آئیڈیل تھے۔ میری بدقسمتی ہے کہ میں ان سے اتنا کچھ حاصل نہ کرسکا علم و فضل میں جتنے وہ مالا مال تھے۔"

حسن ہاشمی کے پاس اب نسبتاً" فراغت ہے۔ وہ کثرت سے مطالعہ کرتے ہیں' ترجمے کے ساتھ اپنی طبع زاد کہانیوں پر بھی توجہ دے رہے ہیں۔ اتوار کی دوپہر سردی ہو یا گرمی' صدر کراچی میں نایاب و نادر کتابوں کی جستجو میں جانا ان کا معمول ہے۔ غالباً" گیا سے پیدائش نسبت کا اثر ہے کہ گوتم بدھ کی شخصیت سے وہ بہت متاثر ہیں۔ مہاتما بدھ پر ان کے پاس کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ "بدھ ازم ایک تحریک" کے عنوان سے وہ ایک تحقیقی کتاب بھی ترتیب دے رہے ہیں۔ وہ ایک مرنجان مرنج آدمی ہیں۔ مجلسی زندگی میں ان کا جی بہت لگتا ہے لیکن بالطبع وہ ایک گوشہ نشین آدمی ہیں۔ بچے انہیں بہت پسند ہیں اپنے ہوں یا کسی دوست عزیز کے وہ انہیں خوش رکھنے کی ترکیبیں' تدبیریں سوچتے بلکہ بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ بچوں کو نو بہ نو تحائف پیش کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ مجموعی طور پر حسن ہاشمی کا شمار ان صاحبان دل اور صاحبان عقل میں ہوتا ہے جو زندگی کے ہر مرحلے میں ایک توازن و تناسب برقرار رکھتے ہیں۔ ادب سے ان کا تعلق پرانا ہے لیکن وہ ادب کے قلندرانہ مشاغل اور زندگی کے عام مسائل اور معاملات میں بیچ کا ایک راستہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ شاید اس لیے انہیں ایک کامیاب آدمی کہا جاسکتا ہے۔

میں نے حسن ہاشمی سے جب "گفتنی" کے لئے سوال نمبر ۲ کا جواب چاہا تو اپنی زیر لب مسکراہٹ سے یوں گویا ہوئے۔

"بیسویں صدی میں اردو ادب میں زندہ رہ جانے والے ایسے بہت سارے نام ہیں جیسے منشی پریم چند' کرشن چندر' منٹو' بیدی' شوکت صدیقی' قرۃ العین حیدر' عصمت' اشفاق احمد' احمد ندیم قاسمی' مشتاق احمد یوسفی وغیرہ ان کی تحریریں یقیناً" زندہ رہیں گی۔" تب میں نے پوچھا۔

"اور آپ کا نام؟" ان کا جواب تھا۔

"اس کا فیصلہ آنے والی نسل کرے گی۔"

فکشن کے بارے میں انہوں نے کہا۔ "اس کے لغوی معنی ہیں' داستان' کہانی' حکایت' اسٹوری اگر جدیدیت کو اپناتے ہوئے کوئی تحریر قاری کو اپنی جانب متوجہ رکھتی ہے' تحریر میں

کہانی اپنی تمام تر دلچسپی کے ساتھ موجود ہے تو پھر یہ تحریر فکشن کا حسن نکھارنے کا سبب بنتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے۔ کہانی قاری کو اپنی گرفت میں نہیں رکھتی تو ایسی تحریر یقیناً" فکشن کو مجروح کرتی ہے اور جدیدیت میں عام طور پر یہی کچھ ہو رہا ہے۔"

سوال نمبر ۴ کے جواب میں انہوں نے کہا۔ "ایسا نہیں ہے۔ ناول تو بے حساب لکھے گئے ہیں' جاسوسی ناول' رومانی ناول' سماجی ناول۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اچھے ناول نہیں لکھے گئے۔ اس کی وجہ ایک ہی ہو سکتی ہے کہ ہمارے یہاں اچھے ناول نگار نہیں ہیں اور بس۔"

سوال نمبر ۵ کے ضمن میں حسن ہاشمی کہہ رہے تھے "یہ مسئلہ صرف ادیب کا نہیں ہے۔ انسان کی فکر سماج کے حصار میں ہوتی ہے۔ اس وقت تمام دنیا اس کرب سے گزر رہی ہے۔ یہ مقابلے کی سوسائٹی ہے۔ پہلے کی نسبت ترغیبات بھی زیادہ ہیں۔ میرے خیال میں اگر کوئی نظام انسان کو سکون بخش سکتا ہے تو وہ قناعت کا نظام ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے کے لئے کوئی بھی آمادہ نہیں۔

جہاں تک معیاری ادب کا سوال ہے' معیاری ادب میرے نزدیک وہی ہے جو دیرپا ہو' جو تحریر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اپنا اثر برقرار رکھے اور جو تحریر بار بار پڑھنے کے باوجود پھر پڑھنے پر اکسائے' وہی معیاری ادب ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ جو تحریر Repeat Value رکھتی ہے۔ وہی معیار کی کسوٹی ہے۔"

"نثر لکھنا شعر کہنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔" حسن ہاشمی کہہ رہے تھے۔ "پاکستان اور ہندوستان سے باہر شاعری تو ضرور ہو رہی ہے۔ لیکن تاریخ میں رقم ہونے والی شاعری شاید نہیں ہو رہی ہے۔ شعر خوب خوب کہے جا رہے ہیں' شاعری سنائی اور دہرائی جا رہی ہے نشستوں میں' مشاعروں میں لیکن نثر کا کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا۔ غزل پانچ دس منٹ میں ختم ہو جاتی ہے اور داد یا ہوٹ سے کسی طور معاملہ نمٹ جاتا ہے لیکن نثر میں یہ ممکن نہیں۔ چھ شعر لکھ کر آپ شاعر تو بن سکتے ہیں لیکن چھ سطری نثر لکھ کر ظاہر ہے آپ افسانہ نگار نہیں بن سکتے۔ اس کا سبب نہ تو وقت اور موضوعات کی کمی ہے اور نہ ہی جرات کی۔ اس کی وجہ شاعری کی نسبت نثر کا مشکل ہونا ہے۔"

حسن کہتے ہیں۔ "اردو میں انگریزی کے الفاظ کا استعمال پہلے کی نسبت زیادہ ہو رہا ہے۔ متبادل الفاظ ضرورتاً" شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اردو فارسی عربی زبان کا بغل بچہ ہے۔ اس کی تراکیب فارسی اور عربی کے زیر اثر ہیں۔ ایک اور بات بھی ذہن نشین رہے۔ ہر زبان کا اپنا تشخص ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ساری دنیا کی صرف ایک ہی زبان ہوتی۔ لفظ وضع ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ آپ اپنا مافی الضمیر دوسرے تک پہنچا سکیں۔ اگر آپ اردو میں کہے' لکھے گئے الفاظ سے اپنی بات دوسرے کو منتقل کر رہے ہیں تو پھر بلاوجہ انگریزی کے لفظ کیوں

شامل کئے جائیں۔"

وہ کہہ رہے تھے۔ "بات وہیں آکر رکتی ہے۔ اگر اچھی تنقید نہیں ہو رہی ہے تو اس کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ اچھے ناقدوں کی کم یابی ہے۔ کسی بھی صنف پر تنقید کرنے کے لئے اس کے اسرار و رموز۔ - واقف ہونا ہی کافی نہیں عبور بھی لازم ہے۔ تنقید کو جتنا آسان سمجھ لیا گیا ہے یہ اتنا ہی مشکل فن ہے۔ کچھ یوں بھی ہے کہ ہم شارٹ کٹ کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ عملی اور نظریاتی ترقی بھی یوں نہیں ہو رہی کہ ہم صرف ڈگریاں حاصل کرتے ہیں علم نہیں۔ اور بلاشبہ علاقائی زبان کا ادب اردو میں منتقل ہونا چاہیے دیگر زبانوں کا ادب بھی اردو میں منتقل ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے لئے حیدر آباد دکن اور ندوہ کی طرح کوئی بڑا دارالترجمہ جیسے ادارے کا قیام از بس ضروری ہے۔ سرکاری سطح پر جو کام ہو رہا ہے وہ ویسا ہی ہی جیسے اور دوسرے سرکاری کام ہوتے ہیں۔ تراجم سے یقیناً" اردو ادب مالا مال ہو سکتا ہے۔"

MR. HASAN HASHMI

602-B SEABREEZE CENTER,

BOATING BASON, CLIFTON KARACHI, (PAKISTAN)

ڈاکٹر شان الحق حقی

مانٹریال، کینیڈا

ڈاکٹر شان الحق حقی اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان کی زندگی میں ہی ان کے مداحوں نے ان کی ادبی و علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی 75 سالہ سالگرہ کے موقع پر پلاٹینیم جوبلی کے حوالے سے ایک جشن منایا۔ اس جشن کے شرکاء میں ادارہ یادگار غالب' ارباب قلم پاکستان' اردو لغت بورڈ' انجمن ترقی اردو' ایوان اردو' آرٹس کونسل آف پاکستان' آرٹ کلکٹرز گیلری' پاکستان کونسل آف کلچر اینڈ آرٹس' پاکستان نیشنل اکادمی' علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن' مہران رائٹرز گلڈ اور ہمدرد فاؤنڈیشن کے نام شامل ہیں۔ تقریب کی صدارت معروف ادیب دانشور اور محقق جناب حکیم محمد سعید (مرحوم) نے فرمائی تھی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر ادیب و محقق جناب ڈاکٹر وحید قریشی نے شرکت کی تھی۔ کراچی کے تمام دانشوروں اور ادیبوں نے محفل میں خوش دلی سے شرکت کرکے رونق دوبالا کردی اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ محترم عطیہ خلیل عرب نے ڈاکٹر حقی کی خدمت میں ان اشعار کا نذرانہ پیش کیا تھا۔

علم و دانش کا باغ ہیں حقی
ایک ایسا چراغ ہیں حقی
آپ اپنا جواب ہیں حقی
ہر طرح کامیاب ہیں حقی

اس موقع پر ایک نہایت خوبصورت مجلہ بھی "گلدستہ نگارش" کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ حقی صاحب کے احباب نے اس موقع پر ان کی خدمت میں محبتوں اور تحسین کا خراج پیش کیا۔ تقریب کے اختتام سے قبل حقی صاحب نے اپنے تمام احباب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی غزل کے یہ اشعار ان کی نذر کئے☐۔

لگتی ہے یہ جنم کی گھڑی سوگوار سی
سینے میں درد فرقت یاراں ہے آج بھی
جو حسرتیں تھیں سب کہیں راہوں میں رہ گئیں
عبرت ہی اپنا کل سر و ساماں ہے آج بھی
یارب اسے تو موت مرے جیتے جی نہ آئے
مجھ میں جو ایک طفلک ناداں ہے آج بھی

اسی طفلک ناداں کی بدولت حقی صاحب پر ساتوں خون پہلے ہی معاف کئے جا چکے ہیں اور معاف کرنے والی ہیں 'ان کی شریک سفر سلمیٰ حقی'، سلمیٰ آپا کو حقی صاحب کا یہ شعر یاد ہے۔

شکوہ رنج نہ کر شرط محبت یہ ہے
حوصلہ ہو تو اٹھا ناز بھی احساس کی طرح

چنانچہ وہ ان کی ہر بھول کو ان کا احسان سمجھ کر حساب دوستاں کی طرح دل کے کنوئیں میں اتار دیتی ہیں۔ مجال ہے جو کبھی جھنجھلا جائیں۔ سلمیٰ آپا بتا رہی تھیں کہ ایک بار مجھے گھر پہنچا کر اردو بورڈ گئے۔ دوسرے دن بتایا کہ تم کو اتار کر میں تم سے باتیں کرتا رہا اور جب بہت دیر تک جواب نہ پایا تو گردن موڑ کر دیکھا اور حیرت ہوئی کہ تم تو تھی ہی نہیں۔ تو یہ حال ہے ان کی معصومیت کا۔

حقی صاحب نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ لکھنے پڑھنے میں گزارا ہے۔ حقی صاحب کا پہلا انٹرویو میں نے 1967ء میں "سخن ور" (اول) کے لئے کیا تھا جو اس وقت "آج کا شاعر" کے عنوان کے تحت روزنامہ "جنگ" کے صفحہ خواتین پر شائع ہوا تھا۔ اس بات کو تیس سے اوپر چند سال ہو گئے ہیں لیکن حقی صاحب آج بھی ویسے ہی پر خلوص اور وضع دار ہیں۔ اپنے احباب کے لئے تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ خوش رہتے ہیں اور خوش باش رہنا سکھاتے ہیں۔

اگست یا ستمبر 1999ء میں کینیڈا میں میری ان سے ملاقات ہوئی تو حقی صاحب بالوں اور بڑھی ہوئی ریش کے مطابق ٹیگور لگ رہے تھے۔ ٹورانٹو سے مانٹریال تک سفر میں احمد فراز اور شان صاحب کی گفتگو اور قصے کہانیوں سے میں خوب خوب محظوظ ہوتی رہی۔ اب کراچی میں شبنم رومانی صاحب نے اپنے دولت کدے پر مجھے اور حقی صاحب کو مدعو کیا تو حقی صاحب کچھ بدلے سے نظر آئے۔ بال کچھ ترش گئے تھے اور داڑھی غائب تھی۔ مگر چہرہ اسی بھولپن اور سچائی کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ میں نے "گفتنی" کے حوالے سے ان کے انٹرویو کی خواہش ظاہر کی تو 15 / اپریل کی تاریخ طے ہوئی اور ہم کراچی جم خانہ کلب میں اکٹھے ہوئے۔

میرا پہلا سوال تھا کہ آپ نے چانکیہ کی "ارتھ شاستر" کا اردو ترجمہ کیا مگر جب بھی اس کتاب کا ذکر آتا ہے آپ سے زیادہ اسماعیل ذبیح صاحب کا نام سامنے آتا ہے' ایسا کیوں؟

حقی صاحب کا جواب تھا۔ ترجمہ میں نے کیا تھا جو 500 صفحات پر محیط ہے۔ اسماعیل ذبیح صاحب نے اپنا 150 صفحے کا مقدمہ اس کے ساتھ شامل کردیا اور انگریزی متن بھی ---چونکہ وہ ناشر تھے اس لئے انہوں نے میرے لکھے ہوئے حواشی بھی کاٹ دیئے۔ اب ہندوستان سے اس کا جو نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے' اس میں' میں نے وہ حواشی شامل کردیئے ہیں۔

حقی صاحب نے بتایا ذبیح صاحب پرانے سیاسی آدمی ہیں۔ اسلام آباد میں رہتے ہیں۔ کتاب بھی سیاسیات سے متعلق ہے۔ انہوں نے کتاب کے حوالے سے کچھ جلسے بھی کئے ہیں چنانچہ انہوں نے لکھا ہوگا ان کے نام کے حوالے سے لکھا ہوگا تو ان کا ذکر کردیا ہوگا۔ کاروبار حکومت کے سلسلے میں یہ کتاب خاصی اہمیت رکھتی ہے میں نے کہا۔ اس سلسلے میں کچھ روشنی ڈالیں گے۔

حقی صاحب نے بتایا یقیناً " یہ بہت ہی عجیب و غریب کتاب ہے۔ تقریباً تین سو سال قبل مسیح لکھی گئی ہے۔ اس زمانے میں ایسے موضوع پر اتنی بالغ نظری سے کتاب لکھنا ایک کارنامہ تھا۔ اس میں حکومت کرنے کے گر بتائے گئے ہیں اور یہ بھی کہ حکومت کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ کار جہاں بانی کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے بادشاہ کو ایک خاص اعتدال حاصل کرنا پڑے گا اور ایک خاص قسم کی تربیت حاصل کرنا پڑے گی تب ہی وہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ پھر اس سلسلے میں کئی باتیں آجاتی ہیں۔ اس زمانے کی معاشرت اس زمانے کی معاشیات' بازار کے بھاؤ' فوج کی تربیت اور شعبہ جات' حکومت' شاہی محفل کے بہت سے مختلف کارخانے اور شعبے اور ہاتھیوں کی تربیت مثلاً" اس سلسلے میں بہت سارے دلچسپ انکشافات ہوئے جیسے ہمارے یہاں "شہدا" کہتے ہیں۔ شہدا کہتے ہیں شریر آدمی کو یا آوارہ اور اوباش آدمی کو۔ میں حیران تھا کہ شہدا جیسا لفظ جو احترام اور مقدس کے معنی میں تھا بد معاش کے معنی میں کیسے آگیا کیونکہ میں اسے شہید کی جمع شہدا سمجھتا تھا لیکن مجھے پتا چلا کہ ایک باب ہے ہاتھیوں کی تربیت کے بارے میں کہ ہاتھیوں کی کتنی اقسام ہوتی ہیں۔ ان کی تربیت کے کیا کیا طریقے ہیں اور ان کو پکڑنے

کے طریقے۔ ان کی خوراک' ان کی بیماریاں وغیرہ بہت سی چیزوں کی تفصیلات ہیں اور ہاتھیوں کی اقسام بھی ہیں۔ ان میں ایک ہاتھی کا ذکر آیا ہے جس کا نام ہے "شدھا" وہ بہت شریر ہوتا ہے۔ قابو میں نہیں آتا اور بڑی مشکل سے تربیت پاتا ہے' اسے کہتے ہیں "شدھا"۔ تو مجھے پتا چلا کہ ہمارے یہاں جو لفظ ہے شہدا۔ شریر کے معنی میں تو وہ اس ہاتھی کی نسبت سے بنا ہے۔

میں نے پوچھا چانکیہ نے جو کتاب لکھی تھی' وہ کس زبان میں لکھی تھی؟ وہ سنسکرت میں تھی۔ حقی صاحب نے بتایا۔ مصنف کا نام وشنو گپتا چانکیہ تھا۔ میں نے اس کو ترجمہ کرتے وقت اس کے انگریزی ترجمے بھی سامنے رکھے اور سنسکرت کے علاوہ ایک ہندی ترجمہ بھی سامنے رکھا اور پھر اردو میں ترجمہ کیا۔ میری اجازت سے ہندوستان والوں نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے اس میں کتنے صفحات ہیں؟ 350 صفحات انہوں نے جواب دیا۔

اب میں نے ان سے ان کی کتاب "بھگوت گیتا" کے بارے میں پوچھا۔ اس کا ترجمہ بھی حقی صاحب نے کیا ہے اور یقیناً" یہ بھی ایک بہت بڑا کام ہے۔ حقی صاحب نے بتایا کہ انہوں نے اس کا اصل متن' انگریزی کے پانچ چھ ترجمے اور ہندی کا ایک ترجمہ اپنے سامنے رکھا لیکن اردو ترجمہ کوئی سامنے نہیں رکھا۔ ترجمہ کرنے کے بعد انہوں نے دیکھا تو انہیں طمانیت ہوئی کہ انہوں نے جو ترجمہ کیا ہے وہ اصل سے قریب بھی ہے اور قابل مطالعہ بھی۔ انہوں نے کہا میں نے جو دوسرے ترجمے دیکھے ہیں وہ معاف کیجئے گا غیر دلچسپ بھی ہیں اور اچھے ترجموں میں ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے پوچھا آپ کو "بھگوت گیتا" کے ترجمے کا خیال کیسے آیا؟ کہنے لگے مجھے دلچسپی تھی اور یہ کتاب عالمی ادب میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ اصل میں تو یہ مہابھارت کا ایک باب ہے۔ شری کرشن سے متعلق۔ اس میں ہندو فلسفہ بھی ہے۔

اس حوالے سے میں نے ایک اور سوال ان سے پوچھا کہ بہت سے ہندو شعراء نے نعتیں لکھی ہیں اور کئی سو برس سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ علامہ اقبال کے بعد ہندو اوتاروں کے احترام میں کسی نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ نور احمد میرٹھی کی نعتوں کے حوالے سے ایک کتاب ابھی آئی ہے "بہر زماں' بہر زباں"۔ اس میں 365 ہندو شعراء کا نعتیہ کلام جمع کیا گیا ہے۔ قمر ہاشمی کی بھی ایک کتاب شائع ہوئی تھی مہاتما بدھ پر۔ مگر کسی اور شاعر نے یہ کام نہیں کیا ہے۔ آپ کے خیال میں کیا وجہ ہے؟

مسلمانوں میں عصبیت ذرا زیادہ ہے۔ وہ اپنے دین کے علاوہ کسی اور دین میں دلچسپی نہیں رکھتے' بس یہ ہے۔ حقی صاحب مدھم لہجے میں بولے۔

میں نے پوچھا کیا ہمیں دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرنا چاہئے؟ میرے نزدیک تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ انہوں نے کہا ضرور کرنا چاہئے۔ ایک ادیب کے لئے بہت ضروری ہے' ایک اسکالر کے لئے بہت ضروری ہے۔ مغلوں کے عہد میں جہانگیر اور اکبر کے زمانے میں دیگر مذاہب کی کتب کے

بہت سے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے اور مہابھارت کا ترجمہ بھی فارسی میں ہوا ہے۔

میں آپ کی معلومات سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں۔ اسلام کی رو سے قرآن کے مطالعے کے ساتھ ساتھ ہم بائبل اور توریت بھی پڑھ سکتے ہیں اور دیگر مذاہب کی کتب بھی۔

وہ کہنے لگے یہ بحث مت چھیڑیئے۔ میرے خیال میں مسلمانوں کا ایک خاص کردار ہے۔ ان کو دلچسپی نہیں ہے۔ ایک تو ہمارے ہاں اسکالرشپ ہی ایک عرصہ سے بہت کم رہ گیا ہے۔ یہ تو scholarship کی چیزیں ہیں اور علمی دلچسپی کی چیزیں ہیں مگر ہمارے ہاں تو علمی دلچسپی بھی کم ہو گئی ہے۔ مسلمان تو اپنے ہی ماضی کے بارے میں نہیں جانتے ہیں۔ ہمیں تو بتایا ہے یورپین اقوام نے۔ ان اسکالرز نے ہمیں بتایا ہے کہ مسلمان اسکالرز نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ہماری بدنصیبی تو یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں تو وہ کتابیں ہی نہیں پائی جاتی ہیں جن کا ہم بڑے فخر کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

"کیا یہ کتابیں اب بھی نہیں پائی جاتیں اور اس کوتاہی کی وجہ کیا ہے؟" بڑے دکھ سے انہوں نے کہا۔ "نہیں یہ کتابیں اب بھی نہیں پائی جاتیں۔ دو ڈھائی صدی قبل تو ہمارے ہاں کچھ توجہ تھی۔ بعض یونانی ادب کی کتابوں کے تراجم کئے گئے تھے مگر وہ بھی مسلمانوں نے نہیں کئے۔ یہودیوں نے کروائے۔ مسلمانوں نے تراجم کی طرف توجہ نہیں دی۔ انہوں نے یہودیوں سے کروائے اور ان سے استفادہ کیا۔ تو وہ ایک دور تھا اس کے ساتھ ساتھ کام کرنے والوں کی اور اسکالرز کی حوصلہ شکنی بھی ہوتی رہی۔ اسکالرز کو قتل بھی کروایا گیا۔ یہ قرون وسطیٰ کی بات ہے۔

"مغل دور میں تبدیلی تو آئی تھی" میں نے پوچھا۔ "ہاں! وہ جہانگیر کا دور تھا جس میں بے تعصبی تھی۔ اکبر کے دور میں مسلمانوں نے ہندوستان کے قدیم ادب پر توجہ کی۔ پھر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمارے اسلاف کو بے خوف ہو کر اس طرف توجہ دینی چاہئے تھی۔"

"دینی چاہئے تھی مگر نہیں دی۔" حقی صاحب نے دکھ سے کہا۔ "ایک یہی تو نہیں۔ یہ بھی سوچئے کہ اتنے عرصے ہم غلام کیوں رہے تھے۔ ہمارے ہاتھ سے قوت کیوں چھن گئی تھی۔ ہمارے ہاں طویل عرصے سے ذہنی پستی کا دور دورہ کیوں ہے۔ اب یہ بھی ہو رہا ہے جو کبھی نہیں ہوا تھا۔ مسجدوں میں نمازیوں کی جماعت پر باڑھ مارنا' امام باڑوں پر بم پھینکنا' یہ سب پہلے کب ہوا تھا جو اب ہو رہا ہے اور ہماری اسلامی سلطنت میں!"

"حقی صاحب! ہم بحیثیت اسکالر اگر اس موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں تو اس کے اسباب پر....

"حقی صاحب نے میری بات کاٹ دی اور کہا "ان اسباب کا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ مجھ سے میری ادبی حیثیت کے بارے میں پوچھیں۔"

"لیکن حقی صاحب! بحیثیت اس ملک کے ایک پڑھے لکھے شہری کی حیثیت سے ہمیں ان امور

پر ضرور گفتگو کرنی چاہئے تاکہ بہتری کی کوئی صورت سامنے آئے۔" میں نے اصرار کیا تو وہ بولے۔

"بی بی! تعلیم عام ہو تو پھر ٹیلنٹ بھی ابھر کر آئے گا۔ اسکالرز بھی پیدا ہوں گے۔ اب تو یہ ہے کہ ہمارا نوے فیصد ٹیلنٹ تو بے کار جاتا ہے۔ اسے سامنے آنے کا اور ابھرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

تعلیم عام کرنے کے لئے کچھ ایسے اقدامات کرنے ہوں گے اور ادیبوں کی رائے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس کو اب آپ چھیڑیں گی تو..." حقی صاحب نے مجھے ٹوکا مگر میں سچ ہی تو بول رہی تھی اور سچ سننا چاہتی تھی چنانچہ میں نے کہا کہ اس ضمن میں ادیبوں پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ سیمینار کرائیں' کانفرنس بلائیں اور رپورٹ ارباب اقتدار تک پہنچائیں۔

"بھئی! ادیب تو بہت کچھ لکھ بھی چکے کر بھی چکے ہیں۔ بہت کچھ آواز اٹھا چکے ہیں۔ لیکن کس نے سنا؟ بنیادی بات یہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں اور حکمران طبقہ بدلنا چاہئے جو حکمران طبقہ ہے اس کو آپ نے 50، 52، 53 سال آزما کر دیکھ لیا۔ وہ آپ کی ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ وہ آپ کو پڑھنے نہیں دے گا جب تک وہ حاوی رہے گا۔" حقی صاحب چپ ہوگئے تو میں نے پھر پوچھا۔

یہ کیسے بدلے؟

"یہ آپ مجھ سے نہ پوچھئے۔ میں سیاسی آدمی تو ہوں نہیں آپ جانتی ہیں۔ مجھ سے ادب کی بات کریں' میری شاعری کی بات کریں' میری نظم و نثر کی بات کریں۔ یہ بڑے مسئلے ہیں، بہت گھمبیر مسئلے ہیں۔"

میں نے بھی موضوع بدل دیا اور ان سے ان کی مرتب کردہ "قاموس اردو با تلفظ" کے بارے میں پوچھا کہ اس کی ترسیل بہت ست طریقے سے کیوں ہو رہی ہے؟ انہوں نے کہا "یہ مقتدرہ قومی زبان نے چھاپی ہے جو آپ جانتی ہیں کہ اسلام آباد میں واقع ایک سرکاری ادارہ ہے اور سرکاری اداروں میں کارروائی ذرا ست ہوتی ہے۔ سیلزمین شپ ایک مہارت طلب اور محنت طلب کام ہے۔ ہمارا کام تو لکھنا ہے سو ہم نے کر دیا۔

میرا جی چاہا کہ مقتدرہ قومی زبان والوں کو لکھوں کہ ان کی اس ست روی سے قوم کا نقصان ہو رہا ہے مگر مقتدرہ بھی تو سرکار کی ہے اور سرکار کے کارخانے میں یہی تو ہوگا۔

اب میں حقی صاحب سے پوچھ رہی تھی کہ آپ نے افسانے بھی تو لکھتے تھے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ بعنوان "شاخسانے" شائع ہوا تھا۔ اب وہ افسانے کیوں نہیں لکھتے؟ انہوں نے کہا میرے افسانوں کے مجموعے کے دوسرے ایڈیشن میں' میں نے کئی نئے افسانوں کا اضافہ کیا تھا۔ میں چونکہ دوسرے کام کرتا رہا' اس لئے زیادہ افسانے نہیں لکھ پایا۔

آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟ حقی صاحب نے کہا آکسفورڈ یونیورسٹی کے لئے جو اردو انگلش

ڈکشنری مکمل کی ہے' اس کے پروف دیکھ رہا ہوں۔ وہ چھپ رہی ہے' اس پر بہت عرق ریزی کرنی پڑتی ہے۔

میں نے پوچھا ہمارے ہاں کتابوں کی اشاعت اور نکاسی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ کیا دنیا کے اور ممالک میں بھی یہی صورتحال ہے؟ وہ بولے جی نہیں! دنیا میں تو یہ صورتحال نہیں ہے۔ کتابیں خوب بک رہی ہیں حالانکہ وہاں mass میڈیا بھی بہت پاپولر ہے مگر اس کے باوجود کتابیں بک رہی ہیں اور کتابیں چھپ رہی ہیں بلکہ ہندوستان میں صورتحال ہمارے ہاں سے بہتر ہے۔ وہاں کاغذ پر اتنا زیادہ محصول نہیں جتنا ہمارے ہاں ہے۔ وہاں اخبارات بھی سستے ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا وہاں کا بڑا اخبار ہے اور دو ڈھائی روپے قیمت ہے جبکہ ہمارے ہاں اخبار چودہ روپے کا ہے۔ کاغذ سستا ہو تو کتابوں کا مطالعہ بھی بڑھے گا اور کتابیں فروخت ہوں گی۔ دراصل ہمارے ہاں جو حکومتیں آئیں ان میں مخلص کم اور خودغرض لوگ زیادہ تھے۔ انہوں نے اپنا اور اپنوں کا بھلا کیا اور ملک کے مفاد کا خیال نہیں رکھا۔ قرضے لیتے رہے حالانکہ قرضے اس بنا پر لئے جاتے ہیں کہ اس سے معاشی ترقی ہو' روزگار کے مواقع ملیں اور ہم قرضے واپس بھی کر سکیں مگر صورتحال اس کے برعکس رہی۔ قرض لینے والی حکومتوں نے صرف یہی سوچا کہ اگلی آنے والی حکومت کے سر قرض اتارنے کا بار ہو گا۔ ان سے پوچھا بھی گیا کہ ان قرضوں کی ادائیگی کیسے ہو گی تو انہوں نے بڑے آرام سے کہہ دیا کہ یہ اگلی حکومتوں کا درد سر ہے لیکن اب یہ درد سر قوم کا بن گیا ہے۔

حقی صاحب نے مجھے یاد دلایا۔ اسی ماہ میں وہ خبر میں نے بھی پڑھی تھی اور انہوں نے بھی کہ ملتان کے کسی گاؤں میں دو اسکول بند کر دیئے گئے کیونکہ وہاں کے زمینداروں نے اسکول کے اساتذہ کے پیچھے کتے چھوڑ دیئے تھے۔

ماحول بہت افسردہ اور بوجھل ہو چکا تھا۔ میں نے موضوع بدلا اور پوچھا کہ آپ نے پچھلے دنوں افسانے یا تنقید کی کوئی اچھی کتاب پڑھی تو اس پر گفتگو کرتے ہیں۔

انہوں نے کہا ہاں! بہت اچھی اچھی کتابیں آئی ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب "میر کی شرح" پڑھی ہے۔ انہوں نے میر کے اشعار پر کتاب لکھی ہے۔ ان کا وسیع مطالعہ ہے جس کی اس کتاب میں جھلک ہے۔ انہوں نے کئی نئے نکتے اٹھائے ہیں۔ ایسا کام پہلے ہوا نہیں ہے یا تو میں نے غالب پر جو کام کیا ہے وہ بالکل نیا کام ہے جو اس سے پہلے نہیں ہوا ہے۔ غالب کی تمام vocablury کہ اپنے اشعار میں انہوں نے کتنے الفاظ برتے ہیں۔ کتنی نئی تراکیب جو انہوں نے اردو اور فارسی میں نکالی ہیں۔ میں نے ان کے کلام کا بڑی تفصیل سے مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے۔ اس وقت میری کتاب کی کمپوزنگ ہو رہی ہے۔ نام ہے "آئینہ افکار غالب" ادارہ یادگار غالب والے اسے چھاپ رہے ہیں۔ امید ہے کہ جلد ہی شائع کر دیں گے۔ جناب شان الحق حقی کو جامعہ کراچی کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی ہے۔ حکومت پاکستان نے انہیں ان کی ادبی خدمات کے اعتراف

ے طور پر 1986ء میں "ستارہ امتیاز" عطا کیا تھا۔ ڈاکٹر شان الحق حقی کی کتب کی فہرست درج ذیل ہے:

1۔ انتخاب ظفر (مع مقدمہ۔ تالیف' 1945ء) 2۔ صور اسرافیل (مع مقدمہ۔ تالیف' 1953ء) 3۔ نشید حریت (مع مقدمہ۔ تالیف' 1957ء) 4۔ خیابان پاک (مع مقدمہ۔ تالیف' 1958ء) 5۔ انجان راہی (ناول۔ ترجمہ' 1958ء) 6۔ تار پیراہن (مع مقدمہ۔ منظومات' 1958ء) 7۔ نکتہ راز (مقالات۔ 1972ء) 8۔ تیسری دنیا (مضامین۔ ترجمہ از انگریزی' 1979ء) 9۔ سہانے ترانے (بچوں کے لئے نظمیں۔ 1979ء) 10۔ حرف دل رس (غزلیات۔ 1981ء) 11۔ نذر خسرو (پہیلیاں' کہہ مکرنیاں وغیرہ' 1983ء) 12۔ قہر عشق (منظوم ترجمہ اینٹونی کلیوپڑا۔ شیکسپیئر' 1984ء) 13۔ نقد و نگارش (مقالات۔ 1985ء) 14۔ درپن درپن (منظوم تراجم۔ 1985ء) 15۔ یادش بخیر (قطعات تاریخی۔ 1986ء) 16۔ شاخسانے (افسانے۔ 1991ء) 17۔ ارتھ شاستر (ترجمہ۔ 1991ء) 18۔ بھگوت گیتا اردو منظوم (ترجمہ۔ 1994ء) 19۔ لغات تلفظ (1996ء) 20۔ لسانی مسائل و لطائف (مضامین) 1996ء 21۔ مضامین ممتاز (تالیف۔ 1997ء) 22۔ نگار خانہ (شخصیات پر مضامین) 23۔ افسانہ در افسانہ (خودنوشت سوانح) 24۔ شرح نکات غالب (زیر ترتیب) 25۔ کلام غالب کا لسانی تجزیہ (مع فرہنگ کلام غالب) 26۔ آوارہ لمحے (مزاحیہ مضامین) 27۔ A Blossom out of Season (مرتب) اپنے منتخب کلام انگریزی نظم میں خود کردہ تراجم۔

DR. SHANUAL- HAQ- HAQEE
341 FRONTENAC DRIVE DDO
QUE, H9G1 1R4 CANADA.

سیدہ حنا
نوشہرہ

افسانہ نگار ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا نوے فیصد مرد اور خواتین افسانہ نگار بالواسطہ یا بلا واسطہ ترقی پسند تحریک سے ضرور متاثر رہے ہیں۔ اس میں ان کے عہد کا بھی ہاتھ تھا اور زندگی کے حقائق بھی مجبور کرتے تھے کہ فن کار ان کی طرف توجہ دے۔ پھر برصغیر کی تقسیم نے ایسے سیاسی اور معاشرتی مسائل پیش کیے جن کے اثرات آج بھی افسانوی ادب پر چھائے ہوئے ہیں۔

ماضی میں خواتین افسانہ نگاروں میں کئی نام ایسے ہیں جو آج بھی اردو ادب کے حوالے سے زندہ ہیں اور اردو ادب کی تاریخ کا ایک زندہ باب بھی ہے۔ نوشہرہ کی ناول اور افسانہ نگار سیدہ حنا کا نام بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ مگر انھوں نے خود کو صرف نثر لکھنے تک محدود نہیں رکھا۔ شاعری میں بھی طبع آزمائی کی... نہ صرف خوب صورت نعتیں لکھیں، تراشیدہ غزلیں بھی کہیں اور ماہیے بھی۔

چنانچہ ایک مجموعہ بنام "سیدہ حنا کے ماہیے" طبع ہوا ہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ "عشق

سے طبیعت نے" کے عنوان سے موجود ہے۔ پہلے ان کی نظم "ایک سوال" پڑھ لیجئے۔

مرے خدا تری تقدیس میں کلام نہیں
تو بے جہت ہے کہیں بھی تیرا مقام نہیں
تری شناخت نہیں کوئی تیرا نام نہیں

تو روشنی کا خدا' رنگ و نور کا خالق
تو انس و جن کا خدا' خلد و حور کا خالق
تو انبیا کا خدا' کوہ طور کا خالق

تری صفات کا یارب کوئی حساب نہیں
تو لا شریک ہے تیرا کہیں جواب نہیں
کہ تجھ سی قادر و عادل کوئی جناب نہیں

مگر یہ ایک کجی سی جو میری ذات میں ہے
یہ خیر و شر کا تصادم جو کائنات میں ہے
نہیں ہی پھر بھی کمی سی کہیں حیات میں ہے

جہاں بھی معرکہ خیر و شر نظر آیا
یہی سوال مرے ذہن میں ابھر آیا
یہ اہرمن تری دنیا میں کیسے در آیا!

وہ ناولٹ بھی لکھے "تنہا اداس لڑکی" اور "شہزاد" جب کہ "وہ دن وہ راتیں" کے عنوان سے ایک ناول بھی لکھا ہے۔ افسانوں کے دو مجموعے پتھر کی نسل اور جھوٹی کہانیاں اور تحقیقی مقالہ شاہ ولی اللہ کے صوفیانہ افکار ان کے علاوہ ہیں۔

سیدہ حنا صحافی بھی ہیں اور مدرس بھی۔ تیرہ سال سے ایک مرد مجاہد کی طرح یہ خاتون "ابلاغ" جیسا دلنشیں سہ ماہی ادبی جریدہ شائع کر رہی ہیں۔ ویسے ان کی زندگی کا بڑا حصہ درس و تدریس میں گذرا ہے۔ تو آیئے آج سیدہ حنا سے تفصیلی ملاقات کریں۔

ان کا پورا نام: سیدہ سکینہ اختر ہے اور قلمی نام سیدہ حنا۔ جائے پیدائش: بھوپال اسٹیٹ (انڈیا) اور تاریخ پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۹۳۵ء ہے۔ ایم اے اردو۔ ایم اے اسلامیات

اور بی ایڈ تک تعلیم حاصل کی اور ملازمت پی اے ایف ڈگری کالج پشاور میں کی۔

ہم نے ان سے بیسویں صدی میں اردو ادب میں موجود رہ جانے والے ادیبوں کے نام پوچھے تو کہنے لگیں۔ "موجود رہ جانے والے ادیبوں سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کیا وہ ادیب جو اس صدی میں ابھی تک زندہ ہیں یا وہ ادیب جنہوں نے آفاقی ادب لکھا۔ ابھی تک زندہ ادیبوں کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے ہے اور ابھی اس صدی کے ختم ہونے میں سات مہینے ہیں۔ وہ ادیب جنہوں نے آفاقی ادب لکھا تو ان کا فیصلہ اگلی صدی میں ہوگا فی الحال تیز رفتار وقت' ادب اور ادیب دونوں کو بڑی بے رحمی سے پامال کرتا ہوا گذرتا چلا جا رہا ہے لہٰذا فی الوقت دونوں صورتوں میں نام گنانا بے سود ہوگا۔"

فکشن کو جدیدیت نے کس طرح متاثر کیا اس سوال کا جواب سیدہ حنا نے بڑے خوب صورت انداز میں دیا ان کا کہنا ہے کہ "ہر دور کی اپنی جدیدیت رہی ہے جس نے فکشن کو سنوارنے اور نکھارنے میں نمایاں کردار انجام دیا۔ پوری دنیا کے ادب میں جدیدیت کے زیر اثر مثبت تبدیلیاں آئیں' زاویہ نظر میں وسعت پیدا ہوئی' لیکن جب جدیدیت مداری کا پٹارا بنی تو وہ اپنا حسن کھو بیٹھی۔ اردو میں ۶۰ء کے بعد جو ادب لکھا گیا اس پر واہ واہ تو بہت ہوئی لیکن قاری نے اسے یکسر مسترد کر دیا۔ اس لیے کہ پہیلیوں کو بوجھنے کے لئے جتنا وقت درکار تھا قاری وہ وقت اسے نہیں دے سکتا تھا لیکن جلد ہی ادب اور ادیب کو قاری سے رشتہ جوڑنا پڑا لیکن اس دوران قاری نے ڈائجسٹوں میں پناہ ڈھونڈ لی تھی یہی وجہ ہے کہ ڈائجسٹ کے مقابلے میں ادبی رسالے بہت پیچھے رہ گئے۔ لیکن ۸۰ کے بعد جو ادب (نظم و نثر) سامنے آیا اس میں بے حد یکسانیت تھی اس لئے کسی کی تخلیق پر کسی کا نام بھی لکھ دیا جائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس سے بھی قاری کی ادب میں دلچسپی کم ہوئی۔ اس صورت حال میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایک طرف جدیدیت نے ادب کو نئی جہتوں سے ہمکنار کیا تو دوسری طرف مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر ادب کے حسن کو مجروح بھی کیا۔

موجودہ صدی میں اردو ادب میں ناول کم کیوں لکھے گئے؟ اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے سیدہ کہتی ہیں۔ "دراصل ناول اس لئے نہیں لکھے گئے کہ ان کے پڑھنے کے لئے کسی کے پاس وقت نہیں تھا قاری حصول معاش میں سرگرداں اپنی ضروریات قلیل آمدنی سے پوری نہ ہونے کے باعث اوور ٹائم پر مجبور... پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ "آخر شب کے ہم سفر" ' "آگ کا دریا" اور "خدا کی بستی" کے بعد کتنے ناول لکھے گئے جو قاری کو اپنے اندر جذب کر سکتے۔ پی آر نے دوسرے تیسرے درجے کے ناولوں کو آفاقی قرار دیا۔ لیکن وقت بڑا بے رحم ہے۔ وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرتا چلا گیا۔ ناول اور ناول نگار کو زندہ رکھنے کے لئے آدم جی انعام بھی بے کار ثابت ہوئے۔"

حنا کے خیال میں نظام فکر سے معاشی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ اور نہ ادیب کو مادی اور روحانی بحران سے نجات ملتی ہے یہ ایک غیر جانبدارانہ اور مساویانہ معاشی نظام سے پوری ہو سکتی ہیں لیکن معاشی نظام سرمایہ داروں کی گرفت میں ہے جس سے باوجود کوششوں کے ابھی تک تو نجات ملی نہیں۔

سیدہ حنا کے نزدیک شاعری میں فیض اور نثر میں قرۃ العین حیدر... معیاری ادب کے یہی دو بڑے پیمانے ہیں۔ حنا نے بڑے دکھ سے کہا "جو شاعری ہو رہی ہے خواہ ہندو پاکستان سے باہر ہی کیوں نہ ہو اس میں جرات کی اس لئے ضرورت نہیں کہ اس میں زیادہ تر دل کے معاملات ہوتے ہیں اور اس شاعری کی نوعیت بھی چبائے ہوئے لقموں سے زیادہ نہیں ہے اسی لئے شاعری آسان ذریعہ اظہار نظر آتی ہے۔ جب کہ نثر لکھنے کے لئے مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے اور مطالعے کے لئے کسی کے پاس وقت نہیں ہے اور مطالعے کا شوق بھی نہیں ہے۔"

سیدہ حنا کا کہنا ہے "اردو وہی الفاظ دوسری زبانوں سے لیتی ہے جنہیں وہ اپنے اندر ایڈجسٹ کر سکتی ہے اگر بعینہٖ نہیں تو زیر زبر کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ۔ اگر ہم اس پر پابندی لگاتے ہیں تو یہ اس کو قتل کرنے کے مترادف ہوگا۔"

ہم نے ان سے پوچھا۔ کوئی اہم واقعہ جو زندگی میں پیش آیا ہو اور یادگار ہو؟ شاعرہ نے جواب میں یہ شعر گنگنا دیا۔

سرسری ہم جہان سے گذرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

تنقید کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ "اردو ادب میں تنقید پر کام ضرور ہو رہا ہے یہ عمل ست ضرور ہے مگر کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے۔ تنقید کی عدم مقبولیت کی ایک وجہ اس کے قاری کا نہ ہونا ہے۔ گذشتہ دنوں "ابلاغ" میں ایک خط چھپا تھا جس میں ایک قاری نے جو خود بھی اچھے شاعر ہیں لکھا تھا کہ آپ نے "ابلاغ" کے تیرہ صفحوں پر تنقیدی مضمون دے کر ظلم کیا ہے انہوں نے صرف صفحے گنے تھے مضمون کی افادیت کا اندازہ نہیں لگایا تھا۔ رہ گئے تراجم تو چاہے وہ علاقائی زبانوں کے ہوں یا غیر ملکی زبانوں کے مسئلہ وہی محنت کا ہے اصل مضمون پڑھنا پھر اس کا ترجمہ کرنا ایک محنت طلب کام ہے اس لئے اس سے صرف نظر کیا گیا ہے۔"

PROF.SYEDA HINA, AL-HINA, 69-B ASC COLONY,
NOWSHERA (PAKISTAN)

دھوپ میں سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا
خاک پر سنگِ درِ یار نے سونے نہ دیا

حیدر طباطبائی
۲۷ رمئی ۱۹۹۹ء

حیدر طباطبائی

لندن

ماہنامہ "شاعر" ممبئی کے ایک شمارے میں جناب حیدر طباطبائی کا مضمون "داستان روایت اور ہم" پڑھا۔ مضمون خاصا وقیع اور معلوماتی تھا۔ ویسے ان کی تحریریں گاہے بگاہے ادبی جریدوں میں پڑھی تھیں چناں چہ ان سے رابطہ قائم کیا۔ حیدر صاحب نے ہماری معلومات میں اضافے کے لیے اپنے چند مطبوعہ مضامین بھیجے جن میں "دبستان لکھنؤ کی محافل شعرو سخن" "یار مہربان جنون یاس یگانہ چنگیزی" "موت اور حسن موت" "ادب کا ایک چھتنا درخت اثر لکھنوی" "لکھنؤ کا محرم اور ساقی بزم کی تمکنت دیکھ کر" اور "منشی شمشاد بی ساقی فاروقی کی شاعری" شامل ہیں۔ ان مضامین میں معلوماتی مواد بھی ہے اور کلاسیکی ادب کی چاشنی بھی۔ عام قاری کی رسائی ان مضامین تک ان جرائد کے ذریعے ہو سکتی ہے جن میں یہ مضامین چھپے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ مضامین کتابی صورت میں بھی دستیاب ہوتے۔

حیدر طباطبائی ایک عرصہ دراز تک ایران میں رہے ہیں۔ انہوں نے فارسی میں بھی بہت

لکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں یہ اثرات نمایاں ہیں۔ ویسے بھی زبان کے معاملے میں ان کا مزاج جوش ملیح آبادی سے ہم آہنگ ہے۔

جناب حسین مشیر علوی نے پندرہ روزہ جریدے "سہیل" میں طبع ہونے والے ان کے تعارف میں لکھا ہے کہ طباطبائی صاحب پر ان کے بعض کرم فرماؤں نے وانستہ دقت پسندی اور عالمانہ رعونت کا الزام عائد کیا ہے جب کہ ان کی تحریروں میں تصنع و آورد کا کوئی دخل نہیں۔ چناں چہ اس پہلو سے ہمیں بھی گریز کر کے آگے بڑھنا چاہیے کہ مبادا ہم پر بھی اسی کرم فرمائی کا الزام عائد ہو جائے۔ ویسے گفتگو میں حیدر طباطبائی کی زبان شستہ اور آسان ہے۔ یہ سارے مضامین جن کا ذکر اوپر آچکا ہے انتہائی موثر اور دل نشیں ہیں۔ سوائے ساقی فاروقی کے مضمون کے، اس میں ہمارے نکتہ نظر سے کہیں کہیں "زیادتی" بھی ہوئی ہے جب کہ لاہور کے جانے پہچانے ادیب ساجد فاروقی کے سفرنامے پر مبنی کتاب بعنوان "اجنبی ترے شہر میں" کے ایک باب میں انہوں نے حیدر طباطبائی کے پسندیدہ مصنفین اور شعرا میں بخش لائل پوری، حسین مشیر علوی، اکبر حیدر آبادی، جان سلیم قریشی اور نور جہاں نوری کے ناموں کے ساتھ ساقی فاروقی کا نام بھی شامل کیا ہے۔ سو اس طرح حیدر طباطبائی کو ساقی فاروقی سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں مگر ان کی "حاجی بھائی پانی والا" کا آپریشن بھی انہوں نے خوب کیا ہے۔ ویسے ساقی فاروقی کو بھی لوگوں سے لڑنے میں لطف آتا ہے تو پھر انہیں بھی کیوں بخشا جائے آخر؟

بہر حال یہ ذکر تو ضمناً تھا کہ ساقی ہمارا بھی پسندیدہ شاعر ہے اور اس پر تنقید و تبصروں میں کئی احباب نے اس کی ذاتیات کو بھی خراب کیا ہے لیکن... ہم ذکر کر رہے ہیں حیدر طباطبائی کا کہ ان کی تحریریں کلاسک ہیں اور بلاشبہ ہمارے ادب کا سرمایہ ہیں۔ انہوں نے بے شمار لکھا ہے اتنا کہ جمع کیا جائے تو کئی جلدوں میں یہ مضامین محفوظ ہو سکتے ہیں۔

دوران گفتگو ہم نے ان سے کہا بھی اور ان کا جواب تھا کہ "ہاں زندگی میں تھوڑی ترتیب آجائے تو..." لیکن ترتیب بھی خود لانا پڑتی ہے اور خدا کرے کہ حیدر طباطبائی اس مسئلے پر سنجیدہ ہو جائیں۔

ہم نے نثر نگاروں کے تذکرے "گفتنی" کے لیے انہیں سوالنامہ تھمایا تو مسکرا کر بولے "میرا پورا نام سید محمد ہادی، عرفیت حیدر آغا اور قلمی نام حیدر طباطبائی ہے۔ میں ہندوستان کے شہر لکھنؤ میں ۲۴ نومبر ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوا۔ لکھنؤ یونی ورسٹی سے بی اے کیا۔ پھر تہران چلا گیا اور دانش گاہ تہران سے فارسی ادب میں ایم۔اے کرنے کے بعد ایرانی ریڈیو اور ٹیلیویژن سے پندرہ برس وابستہ رہا، ایک ایرانی خاتون ملاحت فیروزی سے شادی کر لی جو خود بھی ایرانی ٹی وی سے وابستہ ہیں۔ دو بچے ہیں جو متاسفانہ اردو سے نابلد ہیں۔ فقط فارسی جانتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں لندن چلا آیا۔ یہاں ٹی وی ایشیا میں چیف نیوز ایڈیٹر کے طور پر کام کیا لیکن کچھ عرصے بعد

ملازمت ترک کر کے آزاد صحافی و ہندی اردو انگریزی اور فارسی کے مترجم کی حیثیت سے اپنی اقتصادی ناؤ چلا رہا ہوں۔

انہوں نے مزید تفصیلات بتاتے ہوئے فرمایا کہ میرے والد ماجد احسن طباطبائی شاعر تھے۔ چچا سروش طباطبائی' باقر طباطبائی اور بریگیڈیئر (ر) علی طباطبائی راز لکھنوی بھی (مقیم لاس اینجلس۔ امریکہ) شاعر ہیں۔ دادی محترمہ مصطفیٰ بیگم نگار لکھنوی شاعرہ تھیں۔ والد کے ماموں نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی شاعر تھے۔ پر دادا علامہ نظم طباطبائی شاعر تھے پھر اجداد میں میر غلام حسن طباطبائی شاعر نواب سید رضا جوش طباطبائی شاعر' جد امجد میر ناصر طباطبائی شاعر تھے۔ اس لیے میں قصداً" فکر سخن سے دور ہی رہتا ہوں لیکن نثر نگاری مجھے مرغوب رہی۔ پہلے فارسی میں مقالہ نگاری کرتا رہا ہوں۔ لندن میں میری ملاقات شہر لکھنؤ کے ہونہار سپوت جناب قیصر تمکین صاحب سے ہوئی جن سے لکھنؤ سے واقف تھا بلکہ خاندانی مراسم تھے۔ میں نے قیصر تمکین صاحب کو بتایا کہ گاہ بگاہ فارسی زبان میں مقالات لکھا کرتا ہوں۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ اپنی مادری زبان اردو میں لکھیے اور دوسرے ہی دن ان کے جد حضرت محسن کاکوروی پر ایک مضمون لکھ کر قیصر تمکین صاحب کے پاس لے گیا' وہ ان دنوں روزنامہ "آواز" کے چیف ایڈیٹر تھے' اس طرح اردو کی بزم ادب میں قدم رکھا۔ اب جہاں پر دشواری ہوتی ہے قیصر تمکین صاحب سے ہی راہنمائی طلب کرلیتا ہوں۔ تہران کے طویل قیام میں اردو ادب سے دور ہو گیا تھا۔ لندن میں خوش قسمتی سے جناب حسین مشیر علوی صاحب کی صحبت نصیب ہوئی جو اردو ادب کے نابغہ روزگار ادیب اور اعلیٰ پایہ کے دانشور ہیں۔ علوی صاحب نے میرے طرز فکر کی تشکیل میں نمایاں راہنمائی کی اور اب برابر تنقیدی و تحقیقی مقالات لکھا کرتا ہوں۔

ہم نے اگلے سوال کی جانب توجہ دلائی تو فرمایا میری نظر میں بیسویں صدی کے یادگار اردو ادیب عبدالرحمٰن بجنوری' مولانا ابوالکلام آزاد' علامہ نظم طباطبائی' امیر احمد علوی کاکوروی' عبدالحلیم شرر' مولانا ظفر علی خاں' منشی سجاد حسین' سجاد حیدر یلدرم' نادر علی خاں نادر کاکوروی' نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی' جوش ملیح آبادی' ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری' سید سجاد ظہیر' علی سردار جعفری' سید احتشام حسین' آل احمد سرور' سعادت حسین منٹو' ڈاکٹر وحید اختر' قرۃالعین حیدر اور قیصر تمکین وغیرہ ہیں۔

ہم نے پوچھا فکشن کو جدیدیت نے متاثر کیا' نکھارا سنوارا یا مجروح کیا ہے انہوں نے ہمارا سوال پالیا۔ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد کہنے لگے۔ فکشن بہت پیارا' لطیف اور سبق آموز فن ہے۔ طلسم ہوش ربا کے بعد منشی پریم چند اور غلام عباس نے اسے بام عروج تک پہنچا دیا۔ فکشن کا اصل مقصد کسی واقعے کا اظہار نہیں بلکہ کہانی میں زندگی کا اصل رنگ روپ بھر کر پیش کرنا ہوتا ہے' جس میں فلسفیانہ' جذباتی حقیقت کا اظہار بھی ہو' جس کو پڑھ کر قارئین کو

ایسا لگے کہ یہ واقعہ ان کی زندگی یا آس پاس کے افراد کی کہانی ہے۔ یہ بھی تصور کہ ہر اچھے کام کی انتہا اچھائی پر اور بری بات کا انجام برا ہوتا ہے غلط ہے۔ ایسی کہانیاں ہونا چاہییں جن میں اظہار واقعہ کے ساتھ ساتھ انجام بھی بڑا چونکا دینے والا ہو' وہی کامیاب کہانی ہوتی ہے۔ جدیدیت نے چند روز اپنی تذلیل کروائی' لیکن اپنی موت آپ مر گئی۔ جدیدیت کی تحریک کا جنم ہی اردو ادب کے قابل اعتبار سرمائے کو سبوتاژ کرنے کے لیے ہوا تھا اور اس تحریک کی ناکامی کا واضح ثبوت یہ ہے کہ تیس چالیس سال کے عرصے میں ایک بھی قابل ذکر ادیب و شاعر پیدا نہ کر سکی۔

سوال نمبر ۴ کے ضمن میں ان کا جواب خاصا مدلل ہے۔ کہنے لگے "یہ مشینی زندگی اور برق رفتاری کا عہد ہے۔ مختصر افسانے کی مقبولیت کی وجہ سے طویل اور اکتا دینے والے ناولوں اور داستانوں کے لیے وقت ہی نہیں رہ گیا ہے۔ اب افسانوں کا دور ہے۔ بات وہی بھلی جو مختصر الفاظ میں نفس مضمون ادا کر دے۔ افسانہ بھی ناول کا خلاصہ ہی ہوتا ہے۔ پہلے روایتی ناول لکھے جاتے تھے' جن میں ہر کردار کو چین و آرام کی زندگی عطا کر کے مصنف دم لیتا تھا لیکن افسانوی کیفیت میں جو تڑپ ہوتی ہے وہی اس کا حسن ہوتا ہے۔ اس لیے ناول کا چلن اندک (یہ لفظ فارسی کا ہے' بمعنی تھوڑا کم) رہ گیا ہے لیکن بنیادی طور پر افسانے کی جڑیں ناول سے ملی ہوئی ہیں۔ افسانوں میں کرداروں کے خاندانی شجرے اور ماحول کی اکتا دینے والی عکاسی نہیں ہوتی۔ افسانوی کردار خود بولتا ہے۔ افسانے کی کامیابی یہی ہے کہ وہ ناول کی جزئیات نگاری کو ختم کر کے اختصار کی دہلیز پر سجا کر بٹھا دیتا ہے۔ ناول کے کردار الگ الگ شکل کے ہوتے ہیں۔ افسانے کے کردار اپنی مرکزیت سے جلا پاتے ہیں' یہی افسانوی فسوں ہے جو کبھی ٹوٹتا نہیں۔"

حیدر طباطبائی علم نفسیات سے بھی واقف ہیں۔ قلم اٹھاتے وقت انسانی ذہن کی نبض پر ان کا ہاتھ رہتا ہے۔ چناں چہ سوال نمبر ۵ کے جواب میں فرمایا۔ "ادیب کسی نظام فکر کی تلاش میں سرگرداں نہیں رہتا ہے بلکہ تخلیقی ادب اپنا نظام فکر خود پیدا کرتا ہے۔ ادیب کا ذہنی اور نفسیاتی انتشار اس کی تخلیق کا ضامن اور بیان گر ہوتا ہے۔ مادی سہولتوں' تن آسانیوں کی فکر میں مبتلا حضرات ادیب نہیں بلکہ گندم نما جو فروش ہوتے ہیں۔"

انہوں نے کہا شاعری کا معیار مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ شعر میں ہیئت اور موضوع کا توازن ایسا ہو کہ صنعت مبالغہ بھی ماند پڑ جائے جذبے اور فکر کے لطیف آہنگ پر صداقت کی نغمہ سرائی کا نام شاعری ہے۔ شاعری کو مہذب سماج کے احساس اور جذبات کا بولتا ہوا ساز ہونا چاہیے۔

نثر نگار کے قلم کا ہدف پورا معاشرہ اور سماج ہوتا ہے۔ وہ شاعر کی طرح جنوں کا نام خرد اور خرد کا جنوں نہیں رکھتا۔ وہ ہر چیز کی مناسب اور جائز قیمت متعین کرتا ہے۔ ادیب کی فکر

فلسفیانہ روش کو جنم دیتی ہے۔ ادیب غیرذمے دارانہ فقروں سے اجتناب کرتا ہے۔ اصل میں پختہ کاری ہی نثر کی کامیابی ہوتی ہے۔

وہ فرمارہے تھے موضوعات میں تو نت نئے اضافے ہو رہے ہیں جو اچھی بات ہے۔ حقیقی فن کاروں کو وقت کی کمی کا شکوہ کبھی نہیں ہوتا۔ اگر کسی میں جرات تفکر نہیں ہے تو وہ ادیب یا شاعر ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کا وہ مہاجر طبقہ جو برصغیر سے نکل کر خلیجی ریاستوں حجاز یا یورپ و امریکہ میں جا بسا ہے اس نے دولت اپنے خواب و خیال سے زیادہ کمالی اور جو آسائش کبھی رویا تھی اب صداقت بن چکی ہے۔ لیکن دولت کبھی ذریعہ عزت یا نام آوری کا باعث نہیں ہوتی۔ آج بیشتر حضرات شاعری کو ذریعہ عزت سمجھ کر محض حرص و پر فریب شوق میں شاعر بن گئے ہیں ورنہ حقیقی شعرا تو پاکستان و ہندوستان کے باہر محض دو چار ہی ہیں۔

سوال نمبر۸ کے جواب میں ان کا کہنا تھا کہ یہ خیال غلط ہے کہ "انگریزی دنیا کی بڑی علمی زبان ہے" تو کیا علوم جرمنی، روسی، فرانسیسی، ہسپانوی، اطالوی، چینی، عربی اور فارسی زبانوں میں فروغ پذیر نہیں ہیں؟ انگریزی زبان کو زیادہ سے زیادہ بین الاقوامی رابطے کی زبان مان لیں۔ عرب ممالک روس چین جاپان کوریا وغیرہ اور خود ایران میں میڈیسن "طب" اور مہندسی (یعنی انجنیئرنگ) کی تعلیم قومی زبانوں میں ہوتی ہے۔ فرانس کے ڈاکٹر تو انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے نہ ہی جرمنی نہ اٹلی وغیرہ میں۔ ایران میں تمام علوم اور مندرجہ بالا ممالک میں بھی ہر علم و فن کی تربیت و تعلیم اپنی زبانوں میں ہوتی ہے۔ انگریزی سے ہماری (اردو والوں کی) الفت یقین مانیے ایک غلامانہ ذہنیت اور ابتذال فکر کی دلیل ہے۔ انگریزی کی بیساکھی کے بغیر فرانس و جرمن و اسپین وغیرہ کا ادب انگریزی ادب سے جدید تر ہے۔ انگریزی ادب علم و فن والے ان زبانوں کے تراجم کروا کے استفادہ کرتے ہیں یہاں لندن کے اسکولوں سے سب سے زیادہ غیر ملکی زبان فرانسیسی پڑھی جاتی ہے۔ سعادت حسن منٹو اور قرۃ العین حیدر جیسے افسانہ نگار دنیا کے کسی ادب سے کیا کم تر ہیں؟ اقبال اور جوش ملیح آبادی جیسے نادرۂ ضمن شاعری میں دنیا بھر سے آگے ہیں۔ فارسی اور عربی کو نئے علوم کے روبرو مجروح زبانیں شمار کرنا ذہنی زخم خوردگی کے مترادف ہے۔

اردو میں گاہ انگریزی کے الفاظ لے آنا خود خواجہ الطاف حسین حالی سے شروع ہوا۔ دودھ میں پانی ملانا گوارہ ہے لیکن موجودہ ادب میں نظم یا مضمون کا عنوان ہی انگریزی سے ہوتا ہے اس کو دودھ میں پیشاب ملانے کے مترادف کہا جائے گا۔ اردو اگر اردو رہے گی تو باقی رہے گی ورنہ وہ کوئی اور شے بن جائے گی۔ جن حضرات کے مطالعے تربیت اور بنیاد میں کمی ہے وہ نا سمجھی میں گاہ تساہلی میں انگریزی کے پوچ اور مضحکہ خیز الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں انگریزی لکھنا ایسا ہے، جیسے ایک اوباش باپ اپنے حرامی اور حلالی بچوں کو ایک چھت کے نیچے

تربیت دے۔

آخری سوال کے جواب میں ان کا کہنا ہے کہ اگر قدرت نے کسی ایک شخص کو اچھا شعر کہنے یا اچھا ادب تخلیق کرنے کا ملکہ عطا کیا ہے تو کسی دوسرے فرد کو اچھے شعروادب سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے اور اسے پرکھنے کی صلاحیت بھی ودیعت فرمائی ہے۔ ادب اور شعر کو پرکھنے اور اس کی باریکیوں تک پہنچنے کے لیے اصول مقرر کرنا ہی تنقید ہوتی ہے۔ اس میں کسی "ازم" کی ملاوٹ وہی لوگ کرتے ہیں جو خود کسی سیاسی جماعت کے مامور کردہ ہوتے ہیں یا ان کے ذہن غیر ملکی ادب سے خوف زدہ ہوتے ہیں جیسے محمد حسن عسکری اور سلیم احمد تھے۔ تراجم کی رفتار میں کمی اس لیے آئی کہ مترجم کو وہ نام آوری نصیب نہیں ہوتی جو ایک شاعر یا غزل چی کو ہوتی ہے اور وہ دوبئی کا مشاعرہ پڑھ کر یا فلموں میں گانے لکھ کر اتراتا پھرتا ہے۔ ترجمے کا فن بھی اب کسی کی بکری کون ڈالے گھانس والی بات ہو کر رہ گیا ہے۔

علاقائی زبانوں میں اگر تخلیق و تحقیق کا کام مدھم پڑ جائے تو مرکزی زبان میں کساد بازاری تقریباً" ناگریز ہو جاتی ہے۔"

MR. HAIDER TABATABAI

10-B, BRITANIA ROAD, ILFORD,ESSEX IGI 2EQ, U.K

حیدر قریشی
جرمنی

حیدر قریشی کے افسانوں کا مجموعہ "روشنی کی بشارت" ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا اس میں ڈاکٹر ذکاء الدین شایان لکھتے ہیں "روشنی کی بشارت" آج کے نئے افسانے پر ان تمام الزامات کو رد کرتا ہے جن کے تحت جدید افسانے میں بے ربط، منتشر اور مبہم احساسات کو ایسی شاعرانہ زبان میں پیش کرنے کا چلن ہو گیا ہے جو ہذیان گوئی سے قریب ہے۔ ہمیں ان افسانوں میں مصنف نے اس حقیقی روشنی کی بشارت دی ہے جو ہر عہد میں انسان کو سچا راستہ دکھاتی رہی ہے اور جو آج بھی انسان کے ضمیر کا اجالا بن کر روشن ہے۔"

اسی مجموعے کی پشت پر سعید شباب کی رائے میں "..کافکا کی تقلید، تجریدیت اور بے معنویت کے مختلف تجربات سے گزرنے کے بعد آج جدید افسانے نے اپنی راہیں متعین کر لی ہیں جو افسانوی مجموعے جدید افسانے کی آبرو اور شناخت سمجھے جا سکے ہیں ان میں "روشنی کی بشارت" بے حد اہم ہے اور مجھے یقین ہے کہ حیدر قریشی کے افسانے اپنے عصر کو عبور کرنے کے بعد زیادہ بامعنی اور معتبر قرار پائیں گے۔"

حیدر قریشی کے دیگر افسانوی مجموعوں کے نام ہیں "قصے کہانیاں" اور افسانوں کا ہندی ایڈیشن "میں انتظار کرتا ہوں" حیدر شاعر بھی ہیں چار شعری مجموعے "سلگتے خواب"، "عمر گریزاں"، "محبت کے پھول"، "دعاء دل" اور ان چاروں کی یکجائی "غزلیں، نظمیں، ماہیے" کے عنوان سے ہو چکی ہے۔

ماہیے حیدر قریشی کی خاص پہچان ہے۔ یہ دو ماہیے ملاحظہ ہوں۔

کیسے اترائے تھے۔
پہلے پہل دل پر.... جب زخم سجائے تھے

اس درد خزانے کے
چل دو نفل ہی پڑھ.... رب کے شکرانے کے

حیدر نے میری محبتیں کے عنوان سے خاکے بھی لکھے ہیں۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین "اردو میں ماہیا نگار اور اردو ماہیے کی تحریک" کے عنوان سے ہوئے ہیں۔ زیر اشاعت میں سوئے حجاز (سفرنامے) فاصلے قربتیں (انشائیے) ماہیا، علمی بحث سے غوغائے رقیباں تک، عہد ساز شخصیتیں، اور حاصل مکالمہ (مضامین) شامل ہیں۔

غرض یہ کہ حیدر قریشی کی ادبی حیثیت کے کئی پہلو ہیں۔ اتنی رنگا رنگی کم ہی شخصیتوں میں پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری، تنقید، افسانے اور خاکے پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ خاکہ نگاری میں انہیں کمال حاصل ہے۔ اس دلنشین انداز میں انہوں نے شخصیات کے، واقعات کے، ماحول کے اور قصوں کے قلمی نقشے تراشے ہیں کہ قاری ان کے سحر میں گم ہو جاتا ہے۔

یوں تو ان کا پورا نام قریشی غلام حیدر ارشد ہے مگر ادبی حلقوں میں حیدر قریشی کے نام سے جانتے جاتے ہیں۔ یکم ستمبر ۱۹۵۳ء کو یا خاندانی روایت کے مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۵۲ء کو ربوہ ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۸ء میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کرتے ہی جی سنز شوگر ملز میں کام شروع کر دیا یہ ۸۷ روپے ماہانہ کی سیزنل ملازمت تھی۔ اسی دوران پرائیوٹ طور پر ۱۹۷۰ء میں ایف اے، ۱۹۷۲ء میں بی اے اور ۱۹۷۴ء کے ایم اے (اردو) کے امتحانات میں شرکت کی اور کامیابیاں حاصل کیں۔ مناسب ملازمت کے حصول کے لیے کوشاں رہے لیکن نہیں ملی۔ انیس (۱۹) سال تک شوگر مل کی نوکری کرنے کے بعد انہوں نے اس ملازمت کو چھوڑ دیا۔ تین سال بے روزگاری میں گزارے اور "تماشائے اہل کرم" دیکھا۔ ۱۹۹۰ء میں انہیں ایبٹ آباد میں درس و تدریس کی ایسی ملازمت مل گئی جس کے لیے بقول ان کے یہ ہمیشہ خواب دیکھا کرتے تھے۔ ۱۹۹۲ء میں انہیں بوجوہ ارض وطن کو خیرباد کہنا پڑا اور اب جرمنی میں مقیم ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں ان کی شادی ہو گئی تھی۔ ۵ بچے ہیں۔ تین بیٹے، دو بیٹیاں۔ بیوی بچے سب جرمنی میں

ہیں۔

سوال نمبر۲ کے جواب میں حیدر قریشی کہنے لگے "غالب پچھلی صدی کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر بھی غالب ہے۔ غالب کے بعد اقبال اور فیض تو لازماً" اردو ادب کی تاریخ میں موجود رہیں گے۔ احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا دونوں اہم ترین ادیب ہیں۔ کچھ گروہ بندیوں، اور کچھ بعض لوگوں کے ذاتی تعصبات کے باعث دونوں حلقوں کی طرف سے قاسمی صاحب اور آغا صاحب کے ادبی انہدام کی کوشش کی گئی ہیں۔ اس کے باوجود احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا دونوں مقتدر ادیب بیسویں صدی میں اردو ادب کی تاریخ کا روشن حصہ رہیں گے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، جوگندر پال، انتظار حسین، ممتاز مفتی کے نام بھی جگمگاتے رہیں گے۔

جدیدیت نے فکشن کے حسن کو نکھارا یا مجروح کیا۔ اس بارے میں انہوں نے کہا جدیدیت کے زیر اثر افسانہ نگاری کی دو بڑی لہریں چلی تھیں۔ ایک لہر نامور نقادوں کی سرپرستی میں لایعنی تجریدی افسانہ نگاری کی تھی اور دوسری لہر جدیدیت کے مثبت اثرات والی افسانہ نگاری کی تھی جس میں افسانہ نگاروں نے افسانے کو اکہرے بیانیہ کے مقابلے میں زیادہ بامعنی بنا دیا تھا۔ لایعنی تجریدیت والا جدید افسانہ اپنی موت آپ مرگیا ہے جب کہ مثبت اثرات والا افسانہ اب اردو افسانے کی شناخت ہے۔"

اگلے سوال کے جواب میں کہتے ہیں۔ "اردو میں کمرشل رائٹرز نے تو بے شمار ناول لکھے ہیں لیکن ادبی ناول بے شک کم ہی لکھے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ہاں داستان کی اپنی مضبوط روایت موجود تھی۔ داستان بظاہر ایک طویل قصہ ہوتا تھا لیکن حقیقتاً" کئی قصوں کا مجموعہ ہوتا تھا۔ یعنی اس میں بیان کیے گئے قصے اپنی اپنی الگ اور مکمل کہانی بھی سناتے تھے اور اپنی مجموعی صورت میں ایک بڑی کہانی کو بھی مکمل کرتے تھے۔ غور کریں تو غزل کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل مضمون بیان کرتا ہے لیکن پوری غزل پھر ایک مجموعی تاثر کو ابھارتی ہے۔ داستان اور غزل کا یہ مزاج دراصل مشرقی مزاج ہے۔ جز میں کل کو دیکھنے والا انداز۔ شاید اسی مشرقی مزاج کے باعث ہمارے ہاں افسانہ نگاری زیادہ مقبول ہوئی اور ناول نگاری کی طرف بہت کم رجحان ہوا۔

آپ نے ایک ادیب کے بحرانوں کی نشاندہی کی ہے ان میں تو ساری دنیا مبتلا ہے۔ یہ مسئلہ صرف ادیبوں کا نہیں، کرہ ارض کے سارے انسانوں کا ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ ہم قناعت کو بھول کر حرص و ہوس کی دوڑ میں شامل ہو گئے ہیں۔ جہاں تک کسی نظامِ فکر کی تلاش کا سوال ہی، آپ کسی مذہب کسی مسلک اور کسی نظریے کے مبلغین سے بات کریں تو وہ یہی بتائیں گے کہ ہمارے مذہب، ہمارے مسلک یا ہمارے نظریے کو دنیا پر لاگو کردیں تو ہمارے بحران ختم ہو

جائیں گے، حالانکہ اپنے نظریات پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے باوجود وہ لوگ بھی اسی طرح ذہنی، نفسیاتی اور روحانی بحران میں گھرے ہوئے ہیں جیسے باقی دنیا ہے۔ میرے خیال میں اگر انسان زندگی کے ہر شعبہ میں حرص و ہوس کو چھوڑ دے (ترقی کرنے کی خواہش اور حرص و ہوس میں واضح فرق ہے) اور ارباب اختیار عدل کو اپنا شعار بنالیں تو سارے بحران آہستہ آہستہ ختم ہو سکتے ہیں۔

معیاری ادب کے پیمانے کیا ہو سکتے ہیں جب کہ ہمارے بعض سرکردہ ناقدین کرام نے ادب میں جس طرح کرپشن پھیلائی ہے اس کے بعد لگتا ہے جیسے معیاری ادب کا کوئی پیمانہ سلامت ہی نہیں رہا۔ ذاتی طور پر یہ خیال ہے کہ جو تخلیق پڑھتے ہوئے دل کو چھو لے یا پھر ذہن کو بیدار کر کے سوچ کر متحرک کر دے اسے عمدہ ادب میں شمار کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قاری کند ذہن نہ ہو۔ ذہین بھی ہو اور صاحب دل بھی۔

سوال نمبر ۷ کے جواب میں کہوں گا کہ "برصغیر سے باہر رہنے والے اردو کے ادبائے کرام کے پاس نہ موضوعات کی کمی ہے نہ جرات کی۔ وقت کی کمی بھی زیادہ بڑا مسئلہ نہیں ہے کیوں کہ جب اندر سے لکھنے کی تحریک ہوتی ہے تو لکھنے والا وقت خود ہی نکال لیتا ہے۔ شاعری ہو یا نثر لکھنے والے کے ذاتی رجحان اور اندر سے ملنے والی توفیق پر ہی لکھنا ممکن ہے۔ سو ہر کوئی اپنے رجحان اور توفیق کے مطابق لکھ رہا ہے"

سوال نمبر ۸ کے جواب میں اردو بے شک کئی زبانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں الفاظ کی شمولیت فطری انداز میں ہوتی رہی ہے۔ مختلف زبانوں کے جو الفاظ اسے راس آجاتے ہیں یہ انہیں جذب کر کے اپنا حصہ بنالیتی ہے۔ انگریزی الفاظ کو شعوری طور پر اردو کا حصہ بنانا ویسے کوئی مستحسن عمل نہیں ہوگا۔ انگریزی بے شک دنیا کی بڑی علمی زبان ہے۔ جو حیثیت اردو کی برصغیر میں ہے وہی حیثیت انگریزی کی پوری دنیا میں ہو گئی ہے۔ یہ رابطے کی زبان بن چکی ہے۔ تاہم انگلینڈ کو چھوڑ کر باقی سارے یورپ میں انگریزی کی حیثیت ثانوی ہے۔ چین میں یہ حیثیت ثانوی بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود پورے یورپ اور چین کی ترقی سب کے سامنے ہے۔ فارسی اور عربی بے حد امیر اور زرخیز زبانیں ہیں۔ نئے علوم کی اصطلاحوں کے متبادل الفاظ اگر ان زبانوں میں زیادہ نہیں ہیں تو یہ سائنسی میدان میں پیچھے رہ جانے کی نشانی ہے لیکن اس سے ان دونوں زبانوں کی زرخیزی کی نفی نہیں ہو جاتی۔ زبانوں کی نشوونما میں ان کی داخلی قوت نمو اور خارجی حالات کا برابر کا اثر ہوتا ہے۔ تاریخی تسلسل میں جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہنا ہے۔

اردو ادب میں تنقید کے سلسلے میں اصل معاملہ یہ ہے کہ بعض مصلحت پسند اور مفاد پرست قسم کے نقادوں نے اتنی غلط بخشیاں کی ہیں کہ عام قاری یہی محسوس کرنے لگتا ہے کہ اردو ادب

میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے جب کہ عملی اور نظری تنقید میں خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ اس پیش رفت میں بعض منفی رویے بھی در آئے ہیں۔ اسے سوچ کا فرق بھی کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً" ساختیات کو مغرب سے ترجمہ کر کے اپنا لینے والوں نے مصنف کی موت کا اعلان کیا' ادب پارے کے متن کو غیر اہم قرار دیا اور ساری اہمیت قاری کو عطا کر دی۔ پڑھنے والا فن پارے کا مطالعہ کرتے ہوئے جو چاہے معنی اخذ کرے' اسی کو اہمیت حاصل رہے گی۔ یہ حقیقتاً" قاری کی آڑ لے کر نقادوں کی تخلیق کاروں پر بالادستی حاصل کرنے کا ڈرامہ ہے۔ اس کرپشن کے برعکس ہمارے ایسے ناقدین جو خود اچھے تخلیق کار بھی ہیں انہوں نے قاری کی اہمیت کو ماننے کے باوجود مصنف اور متن کی نفی کرنے کو غلط قرار دیا اور واضح کیا کہ اگر مصنف نہیں ہو گا تو فن پارہ کہاں سے آئے گا۔ فن پارہ نہیں ہو گا تو قاری (دراصل نقاد) پڑھے گا کیا؟ یہ سامنے کی مثال ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں تنقید برائے نام نہیں ہے۔ جہاں تک تراجم کی بات ہے میرا خیال ہے اردو میں دوسری زبانوں کا ادب ترجمہ ہو کر سامنے آتا رہتا ہے اور اب تو اردو ڈراموں کی تخلیقات بھی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونے لگی ہیں لہٰذا یہ شکوہ بجا نہیں ہے۔ پاکستان میں علاقائی زبانوں پر کافی کام ہوا ہے اور یہ کام علاقائی زبانوں کے ادب سے متعلق افراد نے ہی کیا ہے۔ علاقائی زبانوں نے اردو زبان پر گہرا اثر مرتب کیا ہے۔ انڈیا میں وہاں کی علاقائی زبانوں کا اور پاکستان میں یہاں کی علاقائی زبانوں کا واضح اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ بعض منفی اثرات کے باوجود مجموعی طور پر اردو زبان کو اس سے فائدہ ہی ہوا ہے۔ اردو کو نقصان اگر پہنچا ہے تو انڈیا اور پاکستان کی حکومتوں سے پہنچا ہے۔ انڈیا میں ہندی اسکرپٹ کے چکر میں اردو رسم الخط کو ایک بڑی سطح سے ہٹا دیا گیا ہے۔ پورے برصغیر کے رابطہ کی زبان کو علاقائی زبانوں میں شمار کیا جانے لگا ہے جب کہ پاکستان میں اردو کو سرکاری زبان ماننے کے باوجود عملاً" انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ "اشرافیہ" طبقہ کے لوگ انگریزی میڈیم تعلیمی اداروں سے پڑھ کر آتے ہیں اور بیورو کریسی' فوج اور حکومت پر مسلط ہیں۔ اردو میڈیم تعلیمی اداروں کی شناخت "ٹاٹ اسکول" والی ہے اور یہی پاکستانی عوام کی بڑی اکثریت کا مقدر ہے۔"

MR. HAIDER QURESHI
AUF DER ROOS 7
65795, HATTERSHEIM I, GERMANY

From the desk of
DR. M. KHAWER JAMEEL
Commissioner Sindh Employees Social Security Institution

اللہ تعالیٰ ہم سب پر اپنا رحم و کرم فرمائے۔ آمین

خاور جمیل

۲۰/۴/۲۰۰۰

ڈاکٹر خاور جمیل

کراچی

وہ دور میرے نزدیک تو یقیناً "اچھا تھا جب چائے خانوں میں ادبی جنگیں ہوتی تھیں۔ رسائل میں بحث مباحثے ہوتے تھے۔ شعرا اور ادیبوں کے مابین تعلقات سرد اور سرد ترین بھی ہوتے تھے۔ پھر بھی ایک گہما گہمی تھی مگر اب....؟ اب سارا زور پی آر یعنی تعلقات اور تشہیر تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور یہ ادیب اور ادب کے لئے سم قاتل سے کم نہیں۔ چنانچہ آج جو ادب ظہور میں آتا ہے وہ عام قاری تک پہنچ نہیں پاتا۔ عام قاری سارے رسائل پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اخبارات کے ادبی ایڈیشن بھی اس ضمن میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کر رہے اور نہ قاری آج کے دن کوئی ادبی معرکہ پڑھ کر دوسرے دن اسے یاد رکھنے کی زحمت اٹھاتا ہے۔ رسائل کی بات ہی اور ہے۔ اخبارات' رسائل کی طرح ذہنی تربیت کر ہی نہیں سکتے۔

اب رہا ریڈیو اور ٹی وی۔ میرے خیال میں ٹی وی زیادہ موثر ذریعہ ہے عوام تک اپنی بات پہنچانے کا مگر سب ہی جانتے ہیں کہ پاکستانی ٹی وی نے پچھلے باون سالوں میں ادب میں کیا کردار ادا کیا ہے اور اب بھی اس کا کتنا حصہ ہے! ایک ہفتہ وار پروگرام "ادبی منظر" جمعرات کی رات گیارہ بجے

وارد ہوتا ہے۔ اتوار کی صبح اس پروگرام کے لئے زیادہ موثر رہتی مگر اتوار کو فلمیں دکھائی جاسکتی ہیں اور دوسری خرافات بھی پیش کی جاسکتی ہیں مگر ادب کے نام پر "باسی کھرچن" بھی ادب کے شائقین کو نصیب نہیں ہوتی۔ لہٰذا بات گھوم پھر کر پھر آجاتی ہے پی آر پر اور جو پی آر کا گر جانتے ہوئے بھی تشہیر سے دور رہتے ہیں وہ اپنے ہی بل بوتے پر ادب میں زندگی کرتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر خاور جمیل بھی ہیں۔ کم سخن اور نرم گو خاور جمیل جو اگر ڈاکٹر جمیل جالبی کے صاحبزادے نہ ہوتے تو بھی ادب کی دنیا میں کم وقت میں اتنے ہی قد آور ہوتے جتنے آج ہیں۔

ان کی تصنیف اور تالیف "شاہ عالم ثانی آفتاب" (1997ء) میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی دی گئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ عالم آفتاب کی زندگی کن مسائل کا شکار رہی اور گوناگوں حالات سے گزرنے کے باوجود شاہ عالم آفتاب نے ادب کی کتنی خدمت کی اور اس خزانے میں کتنے بے بہا در نایاب شامل کئے۔ شاہ عالم جو نثر نگار بھی تھے اور شاعر بھی۔ اس کتاب میں ان کی اردو' فارسی اور پنجابی شاعری کا ذکر اور نمونہ بھی موجود ہے۔ شاہ عالم کی اردو نثر کا مطالعہ بھی اس کتاب کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر خاور اگر شاہ عالم آفتاب کو متعارف نہ کراتے تو مغل تاریخ کا ایک باب اپنے سیاق و سباق کے ساتھ سامنے نہ آپاتا۔ چنانچہ ڈاکٹر خاور جمیل بلاشبہ اپنے پڑھنے والوں کی تحسین کے مستحق ہیں۔

ہونا تو یہ چاہئے کہ اس قسم کی کتابوں سے اخبارات و جرائد استفادہ کریں اور اس کے چیدہ چیدہ حصے شائع کرکے اپنے قارئین تک یہ معلومات پہنچائیں جو ڈاکٹر خاور نے کتابوں' لائبریریوں اور دیگر ذرائع سے حاصل کی ہیں۔ یہ سارے ذرائع گھر بیٹھے میسر نہیں ہوجاتے ان کے لئے دامے درمے' قدمے اور سخنے سارے وسائل اختیار کرنے پڑتے ہیں مگر ہم ہیں ناقدر شناس قوم کے افراد چنانچہ ہم کسی اچھے کام کی تحسین بھی "غیبت" کے انداز میں کرتے ہیں۔ مگر اس میں "ہمارا" بھی کیا قصور....! ہم بیچارے اپنے دل کے داغوں کے ہاتھوں مجبور ہیں چنانچہ یہی کردار انجام دے سکتے ہیں جو دے رہے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

چلئے یوں ہی سہی۔ اگر ہمارا یہی وطیرہ ہے مگر زندہ قوموں کا یہ وطیرہ نہیں ہوتا چنانچہ اپنی "اصلاح" کی امید کے ساتھ ہم ڈاکٹر خاور جمیل سے ملتے ہیں۔

ان کا نام محمد خاور جمیل ہے اور یہی قلمی نام بھی ہے۔ 23 ستمبر 1956ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ کراچی یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا۔ پھر ایل بی اور ایل ایم کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایم بی اے کیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی کراچی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ بحیثیت ملازم سرکار میں "سیکریٹریٹ گروپ" سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک خاور کمشنر سیسی تھے۔ آج کل سندھ

اسمال انڈسٹریز کارپوریشن کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ شادی شدہ ہیں اور لکھنا پڑھنا ان کا مشغلہ ہے۔ ساتھ ہی اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا انھیں خوب لگتا ہے۔ تنقید، تحقیق اور تاریخ سے انھیں دلچسپی ہے۔ خاص طور پر تحقیق سے۔

ہمارے سوال نمبر2 کے جواب میں ڈاکٹر خاور کہتے ہیں۔ تاریخ میں زندہ رہ جانے والے ادیبوں کے نام گنوانا مشکل ہے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعری میں جوش ملیح آبادی، میراجی، ن م راشد، فیض احمد فیض، اختر الایمان، احمد ندیم قاسمی اور فکشن میں سعادت حسین منٹو، عصمت چغتائی، غلام عباس، قرۃ العین حیدر اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کے نام تاریخ کی زینت بنیں گے۔

سوال نمبر3 پر نظر ڈالنے کے بعد انہوں نے کہا۔ ساری دنیا کے ادب میں فکشن ادب کی مقبول ترین صنف ہے۔ یہ کسی "اثر" سے بگڑتی یا مسخ نہیں ہوتی بلکہ "اثر" کو خود اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ جدیدیت فرد کی ذات اور اس کی محرومیوں اور تنہائیوں کے اظہار کو اہمیت دیتی ہے۔ یہ ترقی پسند تحریک کی حقیقت پسندی اور خارجیت کا ردعمل تھی۔ فکشن نے اس پہلو کو بھی اپنے اندر اتار لیا اور ترقی پسندی کی خارجیت اور حقیقت پسندی، جدیدیت کی داخلیت میں مل گئی۔ میرا خیال ہے کہ جدیدیت نے بھی بہت سے اچھی کہانیاں اردو ادب کو دی ہیں۔ ادب میں نئے نئے تجربے ہوتے رہنے چاہئیں۔

اچھا سوال نمبر4 کے بارے میں کیا خیال ہے؟ انہوں نے سوچ کر کہا۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اردو میں بیسویں صدی میں کم ناول لکھے گئے ہیں بلکہ ناول نویسی نے اس صدی میں زیادہ زور پکڑا۔ مرزا رسوا اور ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے بعد ناول نویسی ایک بڑی صنف ادب کے طور پر مقبول ہوئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ناولوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔ وہ لوگ بھی جو صرف افسانے لکھتے تھے، اب ناول کی طرف آگئے ہیں یا آرہے ہیں۔

سوال نمبر5 کے لئے ان کا جواب تھا۔ سچا ادیب ہمیشہ کسی نہ کسی بحران میں مبتلا رہتا ہے۔ یہ بحران ان کے تخلیقی عمل کا حصہ ہے۔ نظام فکر بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔ معاشرے کے سارے سیاسی، سماجی، تہذیبی مسائل اسے پریشان رکھتے ہیں اور وہ ان کا اظہار، جیسا وہ دیکھ رہا ہے یا محسوس کررہا ہے، اپنی تخلیق میں کرتا ہے۔ جب ادیب اس راستے سے ہٹ کر کیریئر سازی اور معیار زندگی کو بلند کرنے میں لگ جاتا ہے تو اس کا تخلیقی کام اپنی منزل سے ہٹ جاتا ہے۔ ادیب خلوص دل سے اپنی راہ نمائی خود کرتا ہے اور اپنی سوچ اور اپنے نقطہ نظر کو اپنی تحریروں سے سامنے لاتا ہے یہی اصل کام ہے۔

سوال نمبر6 کے ضمن میں کہتے ہیں۔ معیاری ادب کا پیمانہ یہ ہے کہ ادبی تحریر، صحافتی تحریر سے مختلف ہوتی ہے۔ صحافتی تحریر کی عمر کم ہوتی ہے۔ ادبی تحریر کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ ادب میں آنے والے دور کی بصیرت موجود ہوتی ہے۔ جب زمانہ بدلتا ہے تو ادبی تحریر میں نئے معنی کی روشنی پیدا

ہو جاتی ہے۔ میر اور غالب اس لئے عظیم ہیں۔ حافظ اور مولانا روم عظیم ہیں۔ اقبال عظیم ہیں۔ بڑے ادب میں اظہار اور معنی کی کئی تہیں ہوتی ہیں جن سے ادبی تحریر میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ یہی گہرائی ادب کا مزاج ہے۔

سوال نمبر 7 سن کر کہنے لگے۔ شاعری مشکل کام ہے لیکن روایتی شاعری آسان ہے۔ اس کے بنے بنائے سانچے ہیں۔ گھسے پٹے موضوعات ہیں۔ اس طرح شاعری کرنے میں وقت بھی کم لگتا ہے اور شاعر چلتے پھرتے شعر کہہ لیتا ہے۔ وقت بھی کم لگتا ہے۔ چلتے پھرتے یہ کام ہو جاتا ہے۔ لیکن اچھی اور بڑی شاعری مشکل کام ہے۔ نثر کے لئے نئے موضوعات تلاش کرنے پڑتے ہیں اور وقت درکار ہوتا ہے۔ اس لئے بیرون ملک جو شاعری ہو رہی ہے وہ عام طور پر فرسودہ موضوعات اور بنے بنائے سانچوں کو دہرانے کا کام کر رہی ہے لیکن یہ کام بھی ہوتا رہنا چاہئے۔ اس سے فضا بنتی ہے۔ نثر کے تقاضے اور ہیں اور شاعری کے اور۔

سوال نمبر 8 کے سلسلے میں ان کی رائے ہے کہ نئے خیالات اور نئی اشیاء کے ساتھ الفاظ آتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو نئے الفاظ آ رہے ہیں وہ انہیں نئے تصورات اور چیزوں کے ساتھ آ رہے ہیں۔ ان الفاظ کو اردو زبان کے مزاج کے مطابق قبول کرنا چاہئے۔ اردو نے ہمیشہ مختلف زبانوں کے نئے الفاظ قبول کئے ہیں۔ بہت سے نئے تصورات کے انگریزی الفاظ کو اردو میں نئے الفاظ کی صورت میں وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام خصوصاً اخبارات کی سطح پر مسلسل ہوتا رہنا چاہئے۔

تنقید کے سلسلے میں کہتے ہیں۔ تنقید کسی زبان کے ادب کو رنگ اور معیار دینے کے لئے ضروری اور بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ترجموں سے ایک نئی روح پیدا ہوتی ہے۔ ادب کا معیار بڑھتا ہے لیکن ترجمے حقیقی معنی میں ترجمے ہونے چاہئیں۔

تنقید ہمارے ہاں ہو رہی ہے لیکن چونکہ ہمارے ادیب اسے پڑھ نہیں رہے ہیں، اس لئے یہ شکایت پیدا ہو رہی ہے کہ تنقید لکھی نہیں جا رہی ہے۔ ادب کی ترویج و ترقی تنقید سے ہوتی ہے۔

علاقائی زبانوں کے ادب کے جتنے ترجمے گذشتہ پچاس سال میں اردو میں ہوئے ہیں اتنے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے۔

DR. KHAWER JAMIL

D,26- BLOCK B NORTH NAZIMABAD

KRACHI 74700 (PAKISTAN)

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد ز باد صبح

در کار زندگی صفت سنگ خارا ایم

خلیق انجم
۲۸/۱۲/۹۹

ڈاکٹر خلیق انجم

دہلی

اردو گھر کتنا پیارا نام ہے۔ دسمبر 1999ء کی ایک خنک شام میں ڈاکٹر خلیق انجم نے دہلی کے اردو گھر میں ہم قلم کاروں کا مدعو کیا تھا۔ اس محفل میں اردو زبان کے لعل و گہر جگمگا رہے تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر طاہر تونسوی بھی ان دنوں دہلی میں تھے اور ڈاکٹر خلیق انجم کی محبتوں نے ہم سب کو اکٹھا کر لیا تھا۔ انور نزہت، نگار عظیم، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر ظل ہما، ڈاکٹر شاہد، مجتبٰی حسین، شاہد ماہلی، نجمہ خان، عبدالمغنی، ابو الفیض سحر، رحمٰن نیر اور شمع افروز زیدی (مدیر ماہنامہ بیسویں صدی) کے علاوہ بھی کئی لوگ تھے۔

افطار سے پہلے اور افطار کے بعد دانشوران ادب اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ پھر ڈاکٹر خلیق انجم نے گلدستے کے ساتھ ڈھیر ساری کتابوں کے تحائف سے بھی نوازا اور یہی نہیں انہوں نے ان کتب کو دہلی سے کراچی تک بھجوانے کا انتظام بھی خود اپنے ذمہ لے کر مہمان نوازی کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔

وہ خلیق انجم جو ہوئے۔ اسم بامسمٰی ڈاکٹر خلیق انجم کا سب سے بڑا کارنامہ "اردو گھر" کی

تعمیر ہے۔ یہ ایک کثیرالمنزلہ عمارت ہے۔ وہ 1974ء میں انجمن ترقی اردو ہند سے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے وابستہ ہوئے اور اب تک اسی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انجمن کی مالی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لئے انھوں نے بے حد محنت کی اور نہ صرف انجمن کو خود کفیل بنادیا بلکہ "اردو گھر" بھی تعمیر کرادیا۔ ان کے بے شمار دوست ہیں مگر کچھ چھپے دشمن بھی ہوں گے لیکن خلیق انجم کے دامن کو کوئی داغ دار نہ کرسکا۔

ان کے دوست بشیر احمد انہیں "معمار اردو" کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔ خلیق صاحب پر ان کے نام کا بھی اثر ہے۔ سرور کائنات حضرت محمد صلعم نے فرمایا ہے۔ اچھے نام رکھا کرو ناموں کا اثر ہوتا ہے۔ خلیق صاحب غالباً" اپنے نام کی رعایت سے بہت خلیق اور ملنسار ہیں لیکن چونکہ خان بھی ہیں، اس لئے ایک زمانے میں منہ پھٹ اور اکھڑ بھی ہوا کرتے تھے لیکن یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا۔ جوان خون گرم ہوتا ہے اور خواہ مخواہ بھی چھیڑ چھاڑ کرنے کو جی چاہتا ہے اور دشمن بنانے میں مزہ آتا ہے۔ اب تو عمر کی سہ پہر میں داخل ہوچکے ہیں اور مخالفوں کو بھی دوست بنانے کی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب اپنے بھی خوش ہیں اور بیگانے بھی راضی۔ خلیق صاحب کی پیدائش 22 دسمبر 1935ء کو دلی میں ہوئی۔ اسی رعایت سے وہ اپنے کو اہل زبان کہتے ہیں اور بیرون دلی کے اردو والوں کے بارے میں ان کا بھی یہی خیال ہے۔

"دلی نہیں دیکھی ہے زبان دان یہ کہاں ہیں"

خاص طور پر بہار والوں کے بارے میں وہ بڑے بے تکلف انداز میں کہتے ہیں۔ آپ لوگوں نے لغت سے اردو سیکھی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بہار والوں کو لغت دیکھنے کی ضرورت ہے نہ عادت خود میں نے ایم اے کرنے کے بعد لغت کی ضرورت محسوس کی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جس نے بچپن میں اردو کا کلاسیکی ادب اور خاص طور پر داستان ادب پڑھ لیا ہے اسے لغت کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ ضرور ہے کہ ہم لوگوں کی زبان پر مگدھی، اودھی بھوجپوری اور دیگر قبائلی زبانوں کا اثر ہے۔ اور ہماری اردو بھی دہلی کی اردو سے مختلف ہے اور غیر جانبداری سے دیکھئے تو دہلوی اردو سے زیادہ توانا، ثروت مند اور شیریں ہے کہ ہم لوگ "ڑ" اور ڈھ" وغیرہ ثقیل الفاظ کم سے کم استعمال کرتے ہیں۔ اور "میں" کی غیر جمالیاتی آواز پر "ہم" کو ترجیح دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہماری اردو کا ارتقا دہلوی اردو کے متوازی ہوا ہے، لہٰذا ہمارے لئے یہ قطعی ضروری نہیں کہ دہلی کی ہم پیروی کریں جہاں کی اپنی نہ تو کوئی پرانی تاریخ ہے اور نہ ہی اپنا کوئی کلچر یا جغرافیہ۔"

اردو گھر میں ملنے سے قبل 25 دسمبر 1999ء کی صبح میری ملاقات ڈاکٹر خلیق انجم سے ان کے گھر ہوئی تھی۔ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی کا کوئی اہم اور یادگار واقعہ سنایئے۔

کہنے لگے واقعات تو بہت ہیں مگر ایک واقعہ سناتا ہوں جس نے میری زندگی میں بڑا اہم کردار ادا

کیا۔ ہوا یوں کہ میرے ماموں ڈاکٹر ذاکر حسین کے P.A کے بہت اچھے دوست تھے مرید حسین ان کا نام تھا۔ جب میں علی گڑھ تعلیم کے لئے جانے لگا تو ماموں نے ایک خط ان کے نام دے دیا۔ ہمیں اپنے آپ پر کچھ زیادہ ہی اعتماد تھا۔ اس کی وجہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی بچے کے والد کا بچپن میں انتقال ہو جائے تو دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو بچے کی شخصیت بالکل دب جاتی ہے یا پھر وہ بہت بااعتماد ہو جاتا ہے چنانچہ میں دوسری طرف چلا گیا۔ میں بہت assertive تھا اور بہت زیادہ agressive بھی تھا اور آج تک ہوں۔ غالباً" میں سمجھتا تھا کہ سماج نے میرے ساتھ وہ انصاف نہیں کیا جو کرنا چاہئے تھا۔ تو خیر ہم خط لے کر ذاکر صاحب کی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ میں آج تک نہیں بھولا۔ وہ ذاکر صاحب کی عظمت کی بات تھی۔ میں نے کمرے سے باہر پوچھا کہ وہ کہاں ہیں۔ معلوم ہوا کمرے میں ہیں۔ ہم نے کمرے کی چق اٹھائی اور کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہاں دیکھا کہ پانچ چھ آدمی ایک میز کے گرد بیٹھے ہیں۔ میں سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ آپ میں سے کون صاحب ذاکر صاحب ہیں۔ یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ ذاکر صاحب کھڑے ہو گئے اور میرے پاس آ گئے۔ میری کمر پر ہاتھ رکھ کر مجھے باہر لے آئے اور کہا "کہیئے کیا بات ہے میں ہوں ذاکر حسین۔" میں نے کہا کہ یہ خط ہے آپ کے پی اے مرید صاحب کے نام۔ وہ مجھے مرید صاحب کے کمرے میں لے گئے اور مرید صاحب سے کہا کہ یہ حبیب صاحب نے بھیجا ہے (میرے ماموں کے نام لے کر) اور جو کام ان کا ہے وہ کر دیجئے داخلے کی بات تھی وہ تو خیر بعد میں ہو گیا۔ اس بات کا مجھ پر ایسا اثر ہوا اور ہے کہ جب بھی کوئی چھوٹے سے چھوٹے درجے کا ملازم میرے دفتر میں آ جاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ مجھے فلاں صاحب سے کام ہے تو میں اسے ان کے کمرے تک پہنچا کر آتا ہوں۔ بڑے آدمی کی بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ وہ زبانی کچھ نہ کہے اپنے عمل سے راہ دکھائے۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا کہ تم نے مجھ سے اتنی بڑی بدتمیزی کی ہے لیکن وہاں لے جا کر انہوں نے مجھے یہ بتا دیا کہ اس طرح بھی کیا جا سکتا ہے۔

دیکھئے بیسویں صدی میں جو شاعر' ادیب نقاد' انشاء پرداز خاکہ نگار زندہ رہ جائیں گے۔ ان کی تعداد انیسویں صدی سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انیسویں صدی میں شبلی اور حالی جیسے لوگ پیدا ہوئے جو بیسویں صدی میں بھی زندہ ہیں۔ لیکن اس کے بعد تو ہمارے ہاں بہت بڑی قطار ہے۔ پاکستان کے ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ہیں۔ ہندوستان کے مالک رام صاحب ہیں' امتیاز علی خاں عرشی ہیں' مسعود حسین خاں رضوی ادیب ہیں جنھوں نے بڑے کارنامے انجام دیئے پھر فکشن میں ہمارے ہاں اتنی بڑی لائن ہے۔ "فسانہ آزاد" کے رتن ناتھ سرشار "امراؤ جان ادا" کے مصنف مرزا ہادی رسوا۔ پریم چند' کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی یہ سارے کے سارے لوگ ہیں جو زندہ رہیں گے۔ شعراء میں علامہ اقبال تو ہیں ہی جو کئی صدیوں پر حاوی ہیں۔ ان کے بعد جوش ملیح آبادی ہیں' فیض احمد فیض' مجاز لکھنوی' علی سردار جعفری' اختر الایمان' مجروح ہیں تو میرے خیال

میں ان کی فہرست بنائیں تو یہ بہت بڑی فہرست ہوگی اور یہ انیسویں صدی سے زیادہ ہوگی۔ اصل میں اس صدی میں اردو زبان کا پھیلاؤ زیادہ ہوا۔ اس کے بولنے اور پڑھنے والوں کی تعداد بڑھی اسی حساب سے شاعروں اور ادیبوں کی تعداد بڑھی ہے۔

اب سوال نمبر 3 آپ کے سامنے ہے 'کیا کہئے گا؟ میں نے پوچھا۔ وہ کہنے لگے۔ جدیدیت نے ہمارے فکشن کو مجروح کرنے کی کوشش تو بہت کی تھی لیکن وہ ہوا نہیں۔ ہمارے ادب کو اگر کسی تحریک نے متاثر کیا یا نکھارا تو وہ ترقی پسند تحریک تھی حالانکہ ترقی پسند تحریک کی بعض چیزوں سے مجھے اختلاف ہے لیکن اس نے ادب کو نکھارا ہے اور عام آدمی کو اس سے قریب لایا ہے۔ باقی جو ادبی تحریکیں شروع ہوئی ہیں۔ یہ سب مغربی ادب کی نقل ہیں۔ یا جان بوجھ کر تیسری دنیا کے ملکوں کو تباہ کرنے کے طریقے ہیں۔ جدیدیت بھی اور مابعد جدیدیت بھی ان ہی میں سے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ مختلف ممالک نے ہمارے ادب کو متاثر کرنے کی بہت کوششیں کیں مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ آج کی دنیا کی مناسبت سے ہمارا ادب زندہ ہے اور وہ خرابیاں نہیں پیدا ہوئیں جو لوگ پیدا کرنا چاہتے تھے۔

میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ معیاری ادب کے پیمانے کیا ہیں۔ آپ کس طرح ان کی تعریف کریں گے؟ انہوں نے کہا۔ میں ایک بات بتاؤں سلطانہ مہر صاحبہ۔ یہ ایک عجیب و غریب اسرار ہے کہ کیا چیز ہے جو معیاری بناتی ہے۔ کیا چیز مقبول کرتی ہے اور کیا چیز غیر مقبول کرتی ہے۔ اس بارے میں کوئی کچھ نہیں بتا سکتا۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے یہ جو غزل کہی ہے میری غزلوں میں سب سے بہتر ہے مگر ثابت یہ ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہیں ہے۔ شاعر اپنے کسی کلام سے غیر مطمئن ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو سب سے اچھا ہوگیا ہے۔ ایسے ہی نثر کا عالم ہے تو یہ سب کچھ اتنا پراسرار ہے 'اتنا عجیب ہے کہ مقبولیت کیا چیز ہے یہ بتانا بڑا مشکل ہے۔

اب میں نے سوال نامے سے ہٹ کر پوچھا کہ آپ نثر کے آدمی ہیں لیکن شاعری پر بھی آپ کی بھرپور نظر ہے۔ غزل کی مخالفت بہت ہو رہی ہے اور نظم کے حامی اس کے سخت خلاف ہیں 'کیا آپ کے خیال میں غزل میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ مختلف مضامین اور موضوعات کو اپنے اندر سمیٹ سکے؟

انہوں نے بڑا بھرپور جواب دیا۔ کہنے لگے دیکھئے میں ہندوستان کے لئے بہتر طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اردو ادب اور اردو زبان کو اگر عام آدمی تک کسی صنف سخن نے پہنچایا ہے تو وہ اردو غزل ہے۔ میں نظم کا مخالف نہیں ہوں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ غزل کو فوقیت حاصل ہے۔ آپ دیکھئے سڑکوں پر رکشہ والے جو اشعار گاتے پھرتے ہیں وہ غالب کے اشعار ہیں 'نظمیں نہیں ہیں۔ نظموں کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن یہ جو غزلیں ہیں یہ دل کو لگتی ہیں۔ آپ دیکھئے کہ جس شخص نے اردو کا ایک لفظ نہیں پڑھا' وہ اردو کا عاشق ہے اور وہ صرف غزل کے ناتے سے ہے۔ غزل کی تو ہمارے ہاں غیر

معمولی اہمیت ہے۔ ہندوستان میں اب تک اردو کو زندہ رکھنے میں جن چیزوں کا ہاتھ ہے ان میں سب سے توانا اور طاقت ور ذریعہ غزل کا ہے۔

اس جواب سے جو سوال میرے ذہن میں ابھرا وہ یہ تھا۔ دیکھا گیا ہے کہ انگریزی یا دوسری یورپی زبانوں کے ادیب تو بہت خوشحال ہیں مگر ہمارے اردو کے ادیب اور لکھنے والے کسمپرسی کے عالم میں مبتلا ہیں کیوں.....؟

ڈاکٹر خلیق انجم گہری سانس لے کر کہنے لگے۔ بھئی بات یہ ہے کہ اردو والوں کی حالت خراب ہے تو ہم سمجھتے ہیں سب کی خراب ہے حالانکہ اوروں کی نہیں ہے۔ صاحب ہندی والوں کی نہیں ہے وہ تو عیش کرتے ہیں۔ ہمارے مرتبے کے آدمی تو ان میں ہوتے بھی کم ہیں۔ ان کے کم درجے کی ملازمت والے لوگ بھی ہر وقت جہاز میں گھومتے پھرتے ہیں بلکہ ہندی میں تو یہ ہے کہ جس کی جتنی خراب زبان ہوگی ٹی وی پر اور میڈیا پر اس کو اتنی ہی زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے اور ہم لوگ جو زبان سے اچھی طرح واقف ہیں مگر اردو والے ہیں اس لئے ہمیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ یورپی ملکوں اور ہمارے ملکوں کی زبانوں کا موازنہ آپ اس لئے نہ کیجئے کہ یہ سماجی زندگی پر depend کرتا ہے۔ آپ کے ملک کی جو عام اقتصادی حالت ہے وہی ادیبوں کی بھی حالت ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے پہلے جرنلسٹ ہونا کوئی اچھی بات نہیں مانی جاتی تھی۔ لوگ جانتے تھے کہ پیسہ نہیں ملے گا مگر اب دیکھئے جرنلزم بہت ہے۔ پہلے لوگ جرنلسٹ کے طور ملازم ہونا بڑا پسند کرتے تھے۔ اب فری لانسر ہونا پسند کرتے ہیں۔ اس میں پیسے بہت ملتے ہیں۔ اب تو پاکستان میں اردو ادیبوں کی بھی حالت بہت اچھی ہے۔ جاکر دیکھئے کیا ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ میں تو پاکستان جاتا رہتا ہوں ایک بار ایک صاحب کے پاس اقبال پر معمولی سی کتاب لکھنے کا 60 ہزار کا چیک آیا تھا۔ ہمارے ہاں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان میں ہم سے بہتر حالات ہیں۔ اس لئے کہ وہاں اردو زبان کی سرپرستی حکومت کر رہی ہے۔

میں نے کہا ڈاکٹر صاحب ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے گیان پیٹھ ایوارڈ اور اس کے ساتھ بڑی رقمیں یہاں ملتی ہیں یا ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ جو اردو کے ادیبوں کو ملتے ہیں وہاں اتنے ایوارڈ تو نہیں ہیں۔

ڈاکٹر انجم نے بڑی تلخی سے کہا۔ دیکھئے ایوارڈ کی بات نہ کیجئے یہ ہمارا بڑا تلخ پہلو ہے۔ ایوارڈ ہمارے آدمی کے کام پر اس کی محنت پر اور صلاحیتوں پر نہیں ملتے یہ تو دوسری صلاحیتوں پر ملتے ہیں۔ آپ ہندوستان کے کسی بھی انعام کی بات کیجئے' میں آپ سے کہوں گا کہ اتنے پیسے لگا دیجئے۔ فلاں کو دیجئے' یہ دعوتیں کیجئے' یہ شرابیں پلوایئے' یہ انعام آپ کو مل جائے گا۔ ہمارے ہاں انعام اسی طرح ملتے ہیں۔ مجھے بھی انعام ملے ہیں اور میں ہمیشہ یہی کہتا ہوں۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ جناب ایک انعام مغربی بنگال کا تو آپ کو بھی ملا۔ یہ آپ نے کیسے حاصل کر لیا؟ میں نے کہا بھئی ایمان کی

بات یہ ہے کہ میرے دوست سالک لکھنوی اس میں بیٹھے تھے' لہٰذا مجھے انعام مل گیا ورنہ یہاں آپ کی صلاحیتوں کا کون قدردان ہے؟ کوئی نہیں ہے اور اکادمیز نے اور ساہتیہ اکادمی نے تو تباہ کر دیا ہے۔ انعام اس طرح دیتے ہیں کہ ساکھ بالکل خراب کر کے رکھ دی ہے چنانچہ اب انعاموں کی کوئی قدر باقی نہیں رہی۔ پہلے ایک چھوٹا سا انعام ملتا تھا لوگ بڑی عزت سے دیکھتے تھے۔ اب اگر کسی کو انعام ملتا ہے تو لوگ کہتے ہیں یار تم نے کیا داؤ لگایا ہے؟ اب لوگ حساب لگاتے ہیں کس کس کے تعلقات ہیں اس کمیٹی میں۔ تو اب کیا وقعت اور اہمیت ہے ان انعامات کی۔ سجالو یہ سب اپنے نام کے ساتھ اور بس۔

میرا اگلا سوال تھا اردو ادب میں تنقید تو اب برائے نام ہی رہ گئی ہے۔ آپ کے خیال میں ایسا کیوں ہے؟ ڈاکٹر خلیق نے بڑے اطمینان سے کہا۔ دیکھئے وجہ یہ ہے کہ تنقید اب پیسہ کمانے کا ذریعہ نہیں رہی۔ تنقید جب سے یونیورسٹیوں کے احاطے میں آئی ہے' تباہ ہو گئی ہے۔ ہمارے ہاں تنقید لکھنے والے وہ لوگ ہیں جن کی انگریزی ادب پر الٹی سیدھی نظر ہے۔ بہت اچھی اور گہری نظر نہیں ہے وہاں سے تھوڑا بہت پڑھ کر وہ اسے اردو میں ڈھال دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے تو وہ کچھ اصول انگریزی ادب سے لے کر آتے ہیں اور طے کر لیتے ہیں۔ پھر وہ آدمی ڈھونڈتے ہیں کہ کس پر لکھنا ہے۔ فراق پر ہوا' جوش پر ہوا' فیض پر ہوا جس پر ہوا فٹ کر دیا۔ تنقید ہمارے ہاں بس ایسے ہی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں کوئی چیز اگر اپنے پیروں پر کھڑی ہے تو وہ تحقیق ہے۔ تحقیق میں یہ نہیں ہو سکتا جو تنقید میں ہو سکتا ہے۔ یہاں کے نقاد مجھ پر بہت ناراض ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں دیکھو بیشتر نقادوں نے اس کو پیسہ کمانے اور شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور قلم کا جو تقدس ہے وہ ہمارے فکشن میں تو ہے کیونکہ ہمارا فکشن رائٹر خون جگر دیتا ہے۔ شاعری میں ہے تو وہ بے چارہ ساری زندگی ختم کر دیتا ہے۔ تحقیق میں بھی ہے لیکن ہمارے ہاں تنقید میں نہیں ہے۔ ہوتا کیا ہے کہ رائٹر فکشن کا ہو یا شاعری کا نقادوں کے آگے پیچھے پھرتا ہے کہ وہ اس کے لئے کچھ لکھ دیں اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ فلاں صاحب نے کچھ لکھ دیا تو مجھے بڑی شہرت حاصل ہو جائے گی حالانکہ نہیں ہوتی یہ ایک غلط فہمی ہے۔ اس کی وجہ سے نقادوں کی ایک اہمیت خواہ مخواہ کی بن گئی ہے۔ ورنہ یہ سب کچھ ہے نہیں۔ ہاں ایسا ہے جیسے ہمارے ہاں شمس الرحمٰن فاروقی ہیں۔ ایمانداری کی بات ہے کہ فاروقی صاحب سے آپ بہت اختلاف کیجئے۔ اس کا کام genuine ہے۔ اس نے تنقید کے بارے میں مغرب سے انگریزی ادب سے جو کچھ لیا اسے ہضم کیا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔

اب جو ان کا میر پر کام ہے چار جلدوں میں۔ وہ بڑا کام ہے اور یہ کام وہی کر سکتا ہے جس کی مغرب کے ادب پر اور مشرق کے ادب اور تنقید پر گہری نظر ہو۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ہندوستان میں علاقائی زبانوں سے بہت زیادہ تراجم ہو رہے ہیں۔ یہی نہیں فارسی سے بھی' انگریزی سے بھی اور دنیا کی دوسری زبانوں سے بھی بہت اچھے تراجم ہو رہے

ہیں۔

اب گفتگو کو سمیٹتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا کہ اردو کی ترقی کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ زبانوں کا تعصب زبانوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ جس طریقے سے ہم نے فارسی اور عربی کے الفاظ کو گلے لگایا ہے' اسی طرح انگریزی کے سلسلے میں ہمارا رویہ ہونا چاہئے کیونکہ انگریزی اب دنیا کی ایک بڑی زبان ہے اور اگر ہم اپنے اوپر علم کی کھڑکیاں کھولنا چاہتے ہیں تو انگریزی کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ خالی انگریزی پڑھی جائے۔ اپنے بچے کو اردو کے ساتھ بہت اچھی انگریزی بھی پڑھایئے اور دوسری جو زبان سکھا سکیں کیونکہ بچہ جتنی زبانیں پڑھے گا اتنی ہی اس کی ذہنی وسعت بڑھے گی اور جو لفظ آسانی سے آپ اپنی زبان یعنی اردو میں داخل کر سکتے ہیں اس کو کر لیجئے۔ اگر آپ کے ہاں عربی' فارسی کا سیدھا سادا ترجمہ ملتا ہے وہ کر لیجئے ورنہ انگریزی کا سیدھا سادا لفظ لے لیجئے۔ کمپیوٹر پر ہماری انجمن ترقی اردو ایک کتاب تیار کر رہی ہے۔ دو تین کمپیوٹر پر کام کرنے والے بیٹھے ہیں۔ بار بار آکر مجھے کہتے ہیں صاحب disk کا کیا ترجمہ ہے میں نے پوچھا تم بتاؤ کمپیوٹر کا ترجمہ کیا کرو گے؟ جب کمپیوٹر کا ترجمہ کرو گے تو مذاق بن جائے تو کیا تمہیں اچھا لگے گا۔ کمپیوٹر' کمپیوٹر ہے' ڈسک ڈسک ہے۔ جس لفظ کا ترجمہ کر سکتے ہیں جو بچے کی اور دوسروں کی سمجھ میں آسکتا ہے تو کر لیجئے ورنہ جوں کا توں لے لیجئے۔ اردو تو ویسے بھی مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے اور اس میں اتنی لچک ہے کہ نئے الفاظ کو اپنے اندر سمو سکتی ہے۔ ایک صاحب رکشے میں بیٹھے اور کہا۔ سچے والیہ لے چلو۔ اس نے کہا صاحب لکھنؤ میں تو کوئی سچے والیہ ہے نہیں۔ انہوں نے کہا سیکریٹریٹ جو ہے۔ رکشہ والے نے کہا ہاں یوں اردو میں کہو نا۔ صاحب سیکریٹریٹ تو مجھے معلوم ہے۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ جس زبان کا جو لفظ بہتر ترجمانی کرتا ہے اسے لے لینے میں کیا حرج ہے۔ اگر نئے الفاظ کا شمول روک دیا گیا تو زبان کی ترقی رک جائے گی۔

میں ایک مقالے میں سید سلیمان ندوی کے بارے میں پڑھ رہا تھا تو میں نے کہا کہ ان کا اردو زبان کے معاملے میں بہت بڑا یگ دان ہے۔ فوراً" ایک صاحب اچھل کر آگئے اسٹیج پر کہ یہ "یگ دان" کا لفظ کیا ہوتا ہے اور جناب اگر آپ نے ہندی کے لفظ اس طرح استعمال کرنے شروع کر دیئے تو لفظ اچھل اچھل کر اردو کا حلیہ خراب کر دیں گے۔ میں نے کہا "یگ دان" کا ترجمہ انگریزی میں اسے ہم contribution کہیں گے۔ آپ کہیں گے کہ یہ ان کی "دین" ہے مگر وہ مزہ ہی نہیں آتا اب اگر "یگ دان" آگیا ہے تو "دین" بھی ایک لفظ آگیا۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم نے کبھی نہیں کہا کہ چولھے میں آتش جل رہی ہے اور ہم نے کبھی نہیں کہا کہ آگ گل کیجئے۔ " آتش گل" کہتے ہیں۔ "آتش" کے لفظ کا الگ استعمال ہے اور آگ کا الگ استعمال ہے تو دیکھئے کہ ہمارے ہاں لفظ جب اندر داخل ہوتا ہے تو وہ اپنا ایک شیڈ بنا لیتا ہے' اپنا ایک مفہوم بالکل الگ کر لیتا ہے تو ہمیں اس سے نہیں گھبرانا چاہئے۔ انگریزی کے الفاظ آنے دیجئے بس یہ نہیں ہونا چاہئے

کہ زیادتی ہو جائے اور ہم وہ لفظ شامل کر لیں جن کے متبادل بڑے بڑے لفظ ہمارے ہاں موجود ہیں جو لفظ ہمارے ہاں موجود ہیں ہمیں وہ استعمال کرنے چاہئیں، جن لفظوں کا ہندی اور دوسری زبانوں میں بہت آسان اور سہل ترجمہ ہے وہ لے لینے چاہئیں ورنہ پھر انگریزی سے لے لیں۔

رخصت ہونے سے پہلے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اپنا قیمتی وقت دے کر اتنی تفصیل سے باتیں کیں۔ یقیناً ان کے پڑھنے والے اس سے استفادہ کریں گے۔

ڈاکٹر خلیق انجم 22 دسمبر 1935ء کے دن دہلی میں پیدا ہوئے۔ غلام احمد نام رکھا گیا لیکن دوسری یا تیسری کلاس میں نام بدل کر خلیق احمد خاں کر دیا گیا کیونکہ کلاس میں لڑکے "غلام" کہہ کہہ کر چھیڑتے تھے، اس لئے والدین نے نام بدل دیا۔ ان کے دادا اصغر خان رام پور سے دلی کسی کام کے سلسلے میں آئے تھے پھر نہ جانے کن وجوہ سے یہیں سکونت اختیار کر لی۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے دہلی میں حاصل کی۔ بی اے 1955 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اور ایم اے 1957ء میں دلی یونیورسٹی سے کیا۔ ڈپلوما ان لینگوسٹک 1960ء میں ڈپلوما ان لائبریری سائنس 1961ء میں اور پی ایچ ڈی 1962ء میں دلی یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ 1957ء میں کروڑی مل کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے اور اس سے پہلے بہت سی چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کی تھیں۔ 1972ء کے اواخر میں وزارت تعلیم میں ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت سے تقرر ہوا اور کچھ ہی دن بعد ڈائریکٹر بنا دیئے گئے۔ 1974ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے اور ابھی تک اس عہدے پر کام کر رہے ہیں۔ چار سال تک آل انڈیا ریڈیو میں دری (افغانستان فارسی) کے مترجم اور براڈ کاسٹر رہے۔ ادبی تبصرے سیکولر ڈیمو کریسی ہماری زبان اور اردو ادب کے ایڈیٹر رہے۔ آخری دو رسالوں کے ایڈیٹر اب بھی ہیں۔ علی گڑھ کے طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ سے نکلنے والے ایک ماہنامہ "جھلک" کے سب ایڈیٹر بھی رہے تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کو حکومت اتر پردیش، ہندوستان کی مختلف اکادمیوں اور دوسرے ادبی اداروں سے بارہ انعام مل چکے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا انعام پرویز شاہدی قومی انعام ہے جو 1985ء میں ملا تھا۔ 1968ء میں ان کی شادی ہوئی تھی۔ ان کی بیگم ڈاکٹر پروفیسر موہنی انجم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈپارٹمنٹ آف سوشیالوجی میں پروفیسر ہیں۔ بہت بڑی تعداد میں ایسی ادبی اور صحافتی تنظیمیں ہیں جن کے ڈاکٹر خلیق صدر سیکریٹری یا رکن ہیں۔ انہوں نے 50 کے قریب کتابیں تصنیف، تالیف اور ترجمہ کی ہیں۔

DR. KHALIQ ANJUM

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)

URDU GHAR, RONSE AVE, NEW DELHI, INDIA

میری بینائی آڑے آ رہی ہے۔ لکھنا پڑھنا تقریباً موقوف ہے
دو سال پہلے مجھے اسٹروک ہو گیا تھا جس کی وجہ سے بائیں آنکھ کی
بینائی متاثر ہو گئی تھی
آپ کی عنایت ہے جو مجھے یاد کر لیا۔ سلامت

سید خورشید عالم

کینیڈا

محترم سید خورشید عالم کا شمار سینئر اور بزرگ ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی نو عمری کے دوسرے دور میں قلم کو تیشہ بنالیا اور خار زار ادب و صحافت کی راہ پر جب پہلا قدم اٹھایا تو سارے دکھ بھول کر صرف اپنا منصب یاد رکھا۔

خاندان سادات رضویہ سے ان کا تعلق ہے۔ 7 جولائی 1930ء کو لکھنؤ کے گاؤں کاکور (یوپی ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میں عربی اور فارسی بھی شامل تھی۔ 1946ء میں ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈگری کالج لکھنؤ میں بھی نصابی تعلیم کا حصول کیا۔ 1953ء میں پاکستان ہجرت کی۔ 1982ء میں کینیڈا آگئے اور 1984ء میں کینیڈا سے اپیلائڈ بزنس تکنیک میں گریجویشن مکمل کیا۔ 1948ء میں خورشید عالم نے اپنا پہلا افسانہ "ماں بہنوں سے ویشیا تک" انجمن ترقی پسند مصنفین میں پیش کیا۔ اس نشست میں آل احمد سرور اور سید سجاد ظہیر کے ایماء پر ان کے محترم کی حیثیت سے شریک تھے۔ سجاد ظہیر کے ایماء پر انہوں نے اس نشست میں شرکت کی تھی 1948ء سے 1950ء تک کانپور سے اجراء ہونے والے ماہنامہ "شعلہ" کی ادارت کی۔ اس پرچے میں ان کی

ایک کہانی "چار روپیہ دس آنے" ان کی شریک حیات طاہرہ کے نام سے شائع ہوئی کیونکہ خورشید عالم لکھنؤ ڈسٹرکٹ کیمونسٹ پارٹی سے منسلک ہونے کی وجہ سے روپوش تھے۔ 1981ء میں لکھنؤ جیل میں تادیبی قید و بند میں تھے۔ مارچ 1953ء سے 1955ء تک ایک ہفت روزہ "تنویر" پشاور سے منسلک رہے اور پھر پالیسی سے اختلاف کی بناء پر استعفیٰ دے دیا۔ 1957ء میں ادبی انجمن "بزم خواہان ادب" کی بنیاد ڈالی۔ 1961ء سے 1963ء تک ریڈیو پاکستان پشاور سے وابستہ رہے اور ترجمہ فیچرز' تقاریر' ریڈیو ڈرامے لکھتے رہے اور خبریں بھی نشر کیں۔

انہوں نے کئی سیمیناروں میں شرکت کی ہے۔ ان کے مضامین اردو انٹرنیشنل کینیڈا عصری آگہی دہلی' طلوع افکار' افکار' اردو انٹرنیشنل' ارتقاء' منشور اور ارتکاز کراچی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

1958ء میں ان کی تصنیف' تعبیر 1987ء میں تنقید اور ترجیحات' 1990ء میں "گریہ چاہے ہے خرابی" 1995ء میں "عہد ظلمات" اور 1997ء میں "تنقید اور تقریظ" شائع ہوئی ہیں۔

ہم نے ان سے پوچھا بیسویں صدی میں اردو ادب کی تاریخ میں موجود رہ جانے والے چند ادیبوں کے نام آپ گنوا سکتے ہیں؟

سید خورشید عالم نے جواب میں کہا۔

"یہ بات انتہائی دشوار کن ہے کہ تاریخ کے تسلسل میں کسے شامل کیا جاسکے گا۔ متعدد افسانہ نگار ہیں' رپورتاژ تخلیق کرنے والے اصحاب کے علاوہ ایک سے زیادہ تنقیدی صلاحیتوں کے مالک ادیب و دانشور ہیں جن کے بارے میں امید کی جاسکتی ہے کہ ان کے ناموں کی درخشندگی ایسی ہی تاب و توانائی کے ساتھ آنے والے وقتوں میں جاری رہے گی۔"

فکشن ایک لطیف آرٹ ہے جدیدیت نے اس آرٹ کو نکھارا ہے یا اسے مجروح کیا؟ ان کا جواب ہے کہ "فکشن پر ہی موقوف نہیں بلکہ منجملہ دیگر تخلیقی ادب کے لئے یہ کہا جانا بڑی حد تک درست ہوگا کہ جدیدیت یا جو آگے بڑھ کر اب مابعد جدیدیت کی طرف پر تول چکی ہے' اس نے ادب میں بے معنویت' غیر انسانی طرز ادا کی یورش کے علاوہ مہمل گوئی' بے سروپائی کے ساتھ معنی و مطالب سے بیزاری کے رویے میں مزید اضافہ کیا ہے۔

موجودہ صدی میں ناول نویسی میں کمی کی وجوہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔ "داستان گوئی اور افسانہ لکھنے کے علاوہ ناول نویسی میں قدرے کمی کی چند بنیادی وجوہات ہیں۔ پہلی اہم بات تو قاری کے لئے طویل عبارات کا پڑھنا دشوار ہو رہا ہے۔ پھر یہ بھی کہ دنیا میں ہر طرف الیکٹرانک میڈیا کا پھیلاؤ اور کمپیوٹر کے تحت انٹرنیٹ کے استعمال کے ساتھ ایک شدید قسم کا ایسا Informaton Exposion ہو رہا ہے۔ جس میں قرار کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بلکہ آج یہ کہا جارہا ہے کہ اس زمانہ میں اطلاعات اور علم و آگہی جتنی بڑھی ہوئی ہوگی اس قدر ترقی کے امکانات روشن ہوں گے۔

اب نہ تو فتوحات کا زمانہ ہے اور نہ ہی ایک دوسرے کو پسپا کرنے کے لئے طاقت کا استعمال ممکن ہے۔ چنانچہ ان بنیادی وجوہات کے علاوہ آپ دیکھئے کہ پچھلے چند برسوں سے ادب میں تھیوری سازی کا رجحان بڑھ گیا ہے اور اگر یہ کہا جائے 1990ء کے بعد سے اس رجحان میں اضافہ ہوا ہے تو شاید یہ غلط نہیں ہوگا چونکہ ادب و شاعری کو تھیوری گری سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی شاعری اس کے تابع رہی ہے۔"

سید خورشید عالم اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں ادب کے ساتھ ادیب تک شدید بحران میں مبتلا ہیں۔ ان کے خیال میں اس کیفیت سے نکلنے کے لئے ہمارے ادیب و شاعر کچھ تو ہوا میں گرہیں لگا رہے ہیں اور ایک بڑی تعداد میں وہ کسی حکومت وقت کے تابع ہوتے جا رہے ہیں اور اس کے ساتھ ادیبوں کا دوسرا گروہ اپنی آزاد روش پر کاربند ہے۔ اور اس کی فکری صلاحیتیں کسی کار آمد نظریہ یا تفکری لائحہ عمل کو تلاش کر رہا ہے۔

اس سوال کے جواب میں معیاری ادب کے پیمانے کیا ہیں؟ انہوں نے کہا۔

"شاعری یا نثرنگاری کے معیار کو بنانے یا پرکھنے کے لئے کوئی نئے پیمانے تو نہیں بنائے گئے ہیں۔ ہاں اگر اب بھی انحصار ہے تو اپنے روایتی سرمایہ ادب پر، جس کے لئے شروع ہی سے کہا جا رہا ہے کہ ادب و شاعری کو ہمیشہ اپنے وقت سے قریب رہنا چاہئے۔ جس سوسائٹی یا سماج میں ہم زندہ ہیں وہی زندگی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس نظریہ سے جب بھی ہم بھاگیں گے تو پناہ کے لئے خود کلامی، ذاتیات کا اظہار اور اکثر عجیب نظریات کی آڑ لے کر شعر و شاعری کا بازار گرم ہوگا۔ جہاں کسی کو کوئی منفعت نہیں ملے گی۔"

سید خورشید عالم کہتے ہیں "یہ بات حقیقت سے قریب ہے کہ ہندوپاک کے علاوہ بیشتر باہر کی دنیا میں شاعروں اور نثر نگاروں کے اعلیٰ ترین نمونے ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ یہ حقیقت بہرحال درست ہے کہ نثر کم تر لکھی جا رہی ہے۔ خیال یہ ہے کہ ادیبوں اور شاعروں میں ان دنوں شہرت و ترقی کی بے پناہ دھن سوار ہے اور ان کا خیال ہے کہ شاعری کے ذریعہ شہرت مل جانے کی جلد امید ہے۔ حالانکہ یہ بات اتنی آسان نہیں۔ شاعری کرنا بھی خون جگر کا سودا ہے جو آسانی سے حاصل نہیں ہوتا۔"

سوال نمبر 8 کے جواب میں انہوں نے کہا کہ "اردو زبان کی برتری کا راز یہی ہے کہ وہ کئی زبانوں کا مجموعہ ہے۔ اردو زبان کو مالامال رکھنے کے لئے بہت ضروری ہے کہ دوسری زبانوں کے مناسب الفاظ داخل ہوتے رہیں۔ ظاہر ہے جو الفاظ اردو زبان سے مناسبت رکھتے ہیں اور ان کو مناسب حد تک موزویت کا خیال رکھتے ہوئے اردو میں ضم کیا جا سکتا ہے۔ اس سے نہ صرف ہماری لغت میں اضافہ ہوگا بلکہ اظہار کے نئے طریقوں کو ساتھ لے کر معنی آفرینی کا دائرہ وسیع ہوگا۔"

آخری سوال کے جواب میں ان کا کہنا ہے کہ "جیسا میں نے کہیں پہلے عرض کیا ہے کہ ادب،

شاعری اور تنقید میں ان دنوں کئی رکاوٹیں آئی ہیں۔ جن میں پہلے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے ہاں پہلے جدیدیت کی پھیلائی ہوئی افراتفری نے افسانے سے کہانی کو خارج کیا اور اشارے اور سمبل کا استعمال ہونے لگا۔ قاری کو ان عبارتوں کو سمجھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی نظریہ سازی کا ایک بار پھر زور ہوا اور کچھ عرصہ ادب کو اپنی راہوں کی تلاش میں مشکلات پیش آئیں۔ حالانکہ اب آہستہ آہستہ حالات سدھر رہے ہیں اور ان تمام اختراعی تراکیب کو ادب سے خارج کیا جارہا ہے۔"

نومبر 1996ء میں محترم خورشید عالم فالج (stroke) کا شکار ہوئے اور ان کی بائیں آنکھ بری طرح متاثر ہوئی۔ لکھنے پڑھنے کا کام اس وجہ سے اب بھی التوا میں پڑا رہتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ہمارے محترم ادیب جلد صحت مند ہو کر اپنے افکار کے چراغ روشن کریں۔ آمین۔

MR. SAYYED K. ALAM

70 HEATHERSIDE DRIVE

SCARBOROUGH, ONTARIO M1W1T7 CNADA

عقیدہ تھکے ہوئے کمزور ذہن کی پناہ گاہ ہے جہاں تحقیق اور فکر کی توانائی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے

۲۸ مئی سنہ ۱۹۹۹ء

خورشید علی خان

کراچی

خورشید علی خان صاحب سے میرے کئی رشتے استوار ہیں۔ سب سے اہم رشتہ علم و ادب کے ناطے سے۔ مگر اس سے بھی زیادہ اہم رشتہ وہ میرے بھائی محمد صدیق کے پیارے دوست ہیں۔ اور میں بادشاہ بھائی کے ذریعے ہی ان سے متعارف ہوئی۔ جس طرح خان صاحب خورشید علی خان ثقافت کی آبرو اور اردو ادب کے پروانے ہیں اسی طرح ان کے بعد ہمارے بادشاہ بھائی اردو زبان و ادب کے دلدادہ اور والہ و شیدا ہیں۔ اسی شیدائیت کے ناطے وہ اردو ادیبوں سے دامے درمے قدمے سخنے محبت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کتابیں خریدتے ہیں۔ اور اپنے حلقہ احباب کو اور لائبریریوں کو مطالعے کے لئے دیتے ہیں۔

جب میں کراچی میں تھی تو خورشید علی خان صاحب سے گاہے گاہے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں مگر کراچی چھوڑنے کے بعد ان کے نیاز کا حصول ایک خواب ہوگیا۔ محترم کیفی اعظمی جب جب ہندوستان سے آتے تھے خان صاحب سے رشتے کے ناطے انہی کے گھر قیام فرما ہوتے تھے۔ اور کیفی صاحب سے ملاقات کے بہانے ان سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں اور خورشید صاحب 27 دسمبر

1997ء کو جامعہ کراچی میں غالب کی تقریب کے سلسلے میں اکٹھے ہوئے تھے انہوں نے اپنی تازہ تصنیف "فکر غالب" (اشعار کے آئینے میں) عنایت کی۔ سرورق خود اتنا خوبصورت اور دیدہ زیب ہے کہ اسے فریم کرا کر سامنے رکھے رہنے کو جی چاہے پھر نفس مضمون اور کتاب کی طباعت کا کیا کہنا۔

خورشید علی خان خود بہت نفیس آدمی ہیں۔ کتاب کی ظاہری اور معنوی خوبیاں ان کی شخصیت کی عکاس ہیں۔ انہوں نے اپنی فکر کی ساری کارکردگیاں غالب کو سمجھنے اور پھر اس اہم تک پہنچانے میں استعمال کی ہیں۔

"گفتنی" کے سلسلے میں، میں نے بادشاہ بھائی کے توسط سے انہیں سوالنامہ بھجوایا کہ میرے پاس ان کا پتہ نہ تھا۔ بہت دنوں کے انتظار کے بعد میں نے ان کی کتاب ڈھونڈی کہ اب براہ راست رابطہ قائم کروں کہ بہت سے ادیب اس خواہش کا شکار بھی ہوتے ہیں کہ ان سے براہ راست بھی رابطہ کیا جائے۔ بالآخر کتاب تلاش کر کے انہیں خط لکھا۔ پھر خورشید بھائی کا خط آ ہی گیا۔ 7 دسمبر 1999ء کو انہوں نے مجھے لکھا۔

محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ ----- السلام علیکم

آج ایک مدت کے بعد (تقریباً "ایک سال) قلم ہاتھ میں لیا ہے۔ اس دوران میں نہ پوچھئے اس دل ناشاد پر کیا کیا قیامتیں گزر گئیں۔ تھوڑے وقفے سے تین بڑے آپریشن ہوئے۔ آپ کے بادشاہ بھائی واقف ہیں۔ آپ کے دو خط ملے' ایک بادشاہ بھائی کے توسط سے دوسرا براہ راست میرے پتے پر۔ آپ کے خط کا تفصیلی جواب فروری 1999ء کا لکھا رکھا ہے۔ مگر حوالہ ڈاک کرنے کی توفیق نہ ہو سکی کہ داخل ہسپتال ہو گیا تھا۔ اب اللہ اللہ کر کے اس قابل ہوا ہوں کہ لکھنے پڑھنے کے کمرے میں داخل ہو سکوں۔ میز پر دیکھا کہ آپ کے نام خط لکھا ہوا ہے۔ اب اس کو دوبارہ لکھ رہا ہوں مجھے ڈر ہے کہ میرے جوابات ذرا طویل ہو گئے ہیں مگر آپ کو کتر بیونت کا پورا پورا اختیار ہے اگر نفس مضمون متاثر نہ ہو تو۔

خط پڑھ کر جی چاہا خورشید بھائی سے ملاقات کی جائے۔ ہم نے تصور کی محفل سجائی اور ان سے گفتگو کی۔ "خورشید بھائی ذرا تفصیل سے اپنے بارے میں بتایئے۔ وہ کہنے لگے خاکسار کا پورا نام خورشید علی خاں ہے۔ اس کے علاوہ نہ کوئی قلمی نام ہے نہ تخلص ہے۔ مرحوم ریاست' حیدر آباد دکن کے محلہ کاچی گوڑہ میں 12 / اکتوبر 1922ء کو خاکسار اس دنیا میں بھیجا گیا۔ جامعہ عثمانیہ سے 1944ء اور 1946ء میں بی اے' ایل ایل بی کے امتحانات پاس کر کے 1947ء میں حیدر آباد دکن پولیس سروس میں بہ حیثیت اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس (A.S.P) منتخب ہو گیا مگر وہ نوکری 1948ء میں ریاست کے اقتدار اعلیٰ کے ساتھ انقلاب کی نذر ہو گئی۔ اس کے بعد مارچ 1949ء میں پاکستان آگیا اور یکم فروری 1950 کو کراچی میں بحیثیت پریونیٹو آفیسر (Preventive Officer) کی۔ کسٹم

میں ملازم ہو گیا اور 12/ اکتوبر 1982 میں بہ حیثیت سپرنٹنڈنٹ کسٹم انٹیلی جنس (Directorate of Customs Intellegence (Superintendent) وظیفہ پر سبکدوش ہو گیا۔ یہ میری خوش قسمتی رہی کہ حیدر آباد دکن میں مجھے اسکول کالج اور یونیورسٹی میں اپنے اساتذہ کی رہنمائی حاصل رہی جنہوں نے میرے ذہن کو عقائد کے طلسم کدے سے نکال کر معروضی اور سائنٹفک فکر کی طرف راغب کیا۔ یہ زمانہ حیدر آباد کے نوجوانوں میں عام طور پر اور جامعہ عثمانیہ کے طالب علموں میں خاص طور پر ذہنی نشاۃ ثانیہ کا تھا۔ ایک طرف ہندوستان کی آزادی کی تحریک زور و شور سے چل رہی تھی تو دوسری طرف ترقی پسند تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ مخدوم محی الدین کی انقلابی نظمیں نوجوانوں میں انقلابی روح پھونک رہی تھیں۔ میرے بڑے بہنوئی اختر حسن جو پہلے ایک کالج میں پروفیسر تھے بعد میں قاضی عبدالغفار صاحب کے دہلی چلے جانے کے بعد ان کے اخبار "پیام" کے مالک اور ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ یہ حیدر آباد میں ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے۔ انہوں نے اخبار "پیام" کی پہلی کانگریس نواز پالیسی سے ہٹ کر انسانیت نواز پالیسی اختیار کی اور اخبار کے سرورق پر یہ شعر کہا۔

عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے
ان کا پیام اور تھا میرا پیام اور ہے

اور ان کا پیام یہ تھا کہ ہندوستان کو نہ صرف غیر ملکی استعماری طاقتوں سے آزادی دلوائی جائے بلکہ ہندوستان سماج کو داخلی استحصالی طاقتوں کے چنگل سے نجات دلوا کر ایک غیر طبقاتی معاشرہ قائم کیا جائے۔ حیدر آباد دکن میں اختر بھائی کا گھر تمام ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا مرکز بن گیا اور ان ہی کے گھر میں میری ملاقات ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، مولانا حسرت موہانی (جو اختر بھائی کے چچا بھی تھے) سے ہوئی۔

ان کے گھر کی ماہانہ ادبی نشستوں میں مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد، حمایت علی شاعر، نظر حیدر آبادی، مسلم ضیائی (مسلم بھائی تو اختر بھائی کے گھر ہی میں رہتے تھے) ماہر القادری (اس وقت تک ماہر صاحب مولانا نہیں ہوئے تھے) کے علاوہ بہت سے شعراء اور شاعرات جمع ہوا کرتی تھیں۔ اختر بھائی کی بہنیں ڈاکٹر رضیہ اکبر، رابعہ برنی اور ان کی سب سے بڑی بہن جمال النساء جن کو سب باجی کہا کرتے تھے ہماری میزبان ہوا کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ میری بہنیں لیاقت خانم، ریاست خانم اور شوکت خانم جو اختر بھائی کی بہنوں کی دوست تھیں ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ بعد کو ریاست خانم بیگم اختر حسن اور شوکت خانم بیگم کیفی ہو گئیں۔ اس طرح اس علم و ادب پرور ماحول میں میرے ذہن کی نشوونما ہوئی۔ کراچی میں حسن اتفاق سے میری ملاقات حضرت جوش ملیح آبادی سے ہو گئی اور 1970ء سے 25 فروری 1982ء تک یہ ساتھ رہا اس دوران میں مجھے جوش صاحب کی شخصیت اور فکر کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے جوش صاحب کی فکر کے

تقریباً" تمام پہلوؤں کا ایک طالب علم کی حیثیت سے مطالعہ کیا اور یہی مطالعہ ان کے انتقال کے بعد میری کتاب "ہمارے جوش صاحب" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جوش صاحب کے ساتھ رہ کر مجھ میں شعروادب کو سمجھنے کا شوق پیدا ہوا تو میں نے غالب اور اقبال کو ایک طالب علم کی حیثیت سے پڑھا اس دوران میں، میں نے محسوس کیا کہ بڑے ادب کا موضوع ہی انسان، اس کی فطرت، اس کی نفسیاتی پیچیدگیاں ہیں اور یہ دقیق مسائل اس وقت تک کماحقہ، سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک علم نفسیات کا طالب علمانہ مطالعہ نہ کیا جائے اس لئے میں نے جامعہ کراچی کے شعبہ نفسیات میں ایم اے کی کلاس میں داخلہ لے کر اس مضمون کی گہرائی اور گیرائی کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس سے مجھے بڑا ادب سمجھنے میں مدد ملی۔ چنانچہ وظیفے پر سبکدوش ہونے کے بعد میں نے خود کو مطالعہ کے ساتھ ساتھ لکھنے میں بھی مشغول کرلیا۔ اب تک میری تین کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں۔ ایک "کیفی اعظمی" (شخصیت اور فن کے آئینے میں) یہ دراصل ترقی پسند تحریک کے متعلق ہے۔ دوسری "ہمارے جوش صاحب" تیسری "فکر غالب" (اشعار کے آئینے میں)

ابھی دو کتابیں اور لکھ رہا ہوں۔ ایک تو "نفسیات، تربیت اور تعمیر شخصیت" دوسری اپنی ملازمت کے دوران میں اپنے تجربات سے متعلق ہے۔ اگر عمر اور صحت نے ساتھ دیا تو انشاء اللہ یہ دونوں کتابیں بہت جلد نذر قارئین ہوجائیں گی۔

پھر ہم نے پوچھا "ایک ادیب ہونے کے ناطے بیسویں صدی میں اردو ادب میں باقی رہ جانے والے نام کیا ہوں گے؟"

فرمانے لگے "بیسویں صدی تمام دنیا میں زبردست ذہنی انقلاب کی صدی رہی ہے۔ اس میں قدیم قدریں ٹوٹ رہی ہیں اور نئی قدریں تشکیل پارہی ہیں۔ یہ تغیر اقدار Revolution of Values کا دور ہے جس کو قرآن نے لیلۃ القدر کہا ہے یعنی وہ تاریکی یا رات جس میں تخریبی یا منفی اقدار کے بجائے خیر کی حیات بخش تعمیری اقدار جنم لے رہی ہیں یہ ایک رات نہیں بلکہ طویل مدت ہے جس کو قرآن ہزاروں مہینوں پر مشتمل مدت کہتا ہے۔ اس میں قدریں بدلتی رہیں گی اور حیات انسانی کے تمام امور کے متعلق سلامتی اور خوشحالی کے قوانین نافذ ہوں گے یہاں تک کہ رات کی تاریکی ختم ہوجائے گی اور حیات افروز صبح تاباں اپنی تمام روشنیوں اور مسرتوں کے ساتھ طلوع ہوجائے گی۔ اس تغیر اقدار کی رات میں جن جن ادیبوں شاعروں، مفکروں اور دانشوروں نے نئی اقدار کے چراغ روشن کئے وہ خواہ سرسید ہوں یا غالب، حالی ہوں یا علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی ہوں یا فراق گورکھپوری، نیاز فتح پوری ہوں یا مولانا حسرت موہانی ساحر لدھیانوی ہوں یا مخدوم محی الدین علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری ہوں یا احمد ندیم قاسمی یا احمد فراز یا فیض احمد فیض، منشی پریم چند ہوں یا کرشن چندر، عصمت چغتائی ہوں یا قرۃ العین حیدر، غلام رسول مہر ہوں یا سلطانہ مہر، غرض وہ تمام ادیب شاعر دانشور جنہوں نے نئی حیات بخش اقدار کی تشکیل میں

حصہ لیا اور جو اردو ادب کا مایہ ناز سرمایہ ہیں اس وقت تک باقی رہیں گے جب تک اردو زبان باقی رہے گی۔

سوال نمبر3 اور 4 کے جواب میں خورشید صاحب کہتے ہیں کہ فکشن کے متعلق میرا مطالعہ محدود ہے اس لئے میں اس پر کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ منشی پریم چند، کرشن چندر، عظیم بیگ چغتائی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، شفیق الرحمن جیسے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں جدیدیت نے عام فہم ادب کو اس قدر علامتی بنادیا ہے کہ اس میں اکثر و بیشتر اطباع کی خصوصیت غائب ہوگئی ہے اور جب تک وہ علامتیں عام فہم نہیں ہوں گی لوگ یہی کہتے رہیں گے کہ "مگران کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" بہرحال میرا نظریہ یہ ہے کہ افسانہ ہو یا کہانی اس کو زندگی کا حقیقی ترجمان ہونا چاہئے۔ ناول کے متعلق تو میرا مطالعہ اور بھی محدود ہے مگر میں نے آج سے پچاس برس پہلے جو ناولیں پڑھی تھیں ان میں منشی پریم چند، فیاض علی صاحب (انور اور شمیم والے) عصمت چغتائی، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر اور عزیز احمد جن کے ناولوں نے جوانی میں مجھے بے حد متاثر کیا تھا اور میری فکر کو معاشرتی مسائل کی پیچیدگیوں سے آگہی عطا کی تھی۔ میرے خیال میں ناولوں کے زوال کا سبب وہ فلمیں اور ڈرامے ہیں جن کی وجہ سے مطالعہ کی جگہ مشاہدے نے لے لی اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔"

سوال نمبر5 کو میں اپنے ملک اور معاشرے کے تناظر میں دیکھتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے استحصالی معاشرے میں جہاں مملکت کے بیشتر وسائل اور اقتدار اعلیٰ پر چند مراعات یافتہ افراد کا قبضہ ہے وہاں زندگی کی تمام سہولتیں صرف چند لوگوں کو ہی حاصل رہتی ہیں اور آبادی کی اکثریت بھوک، بیماری، جہالت اور بے روزگاری کے اذیت ناک احساس محرومی میں مبتلا رہتی ہے۔ شاعر اور ادیب بھی اسی معاشرے کا فرد ہوتا ہے اور جب اس کا حساس ذہن اپنے چاروں طرف انسانیت کو اس محروم کے کرب میں کراہتا ہوا دیکھتا ہے تو اس کا یہ احساس اس کے فن میں ظاہر ہونے لگتا ہے اور خود اس کی اپنی محرومیاں پورے معاشرے کے غموں کی ترجمان بن جاتی ہیں بقول

نے گل نغمہ ہوں نے پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اور ان ہی احساسات کو آج کا شاعر ساحر لدھیانوی زیادہ وضاحت سے بیان کردیتا ہے جب وہ کہتا ہے

میرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے
کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں مفلسوں کو بیکسوں کو بے سہاروں کو

سسکتی نازنینوں کو تڑپتے نوجوانوں کو
حکومت کے تشدد کو امارت کے تکبر کو
کسی کے چیتھڑوں کو اور شہنشاہی خزانوں کو
تو دل تاب نشاط بزم الفت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا

شعراء اور ادیبوں میں جو عام سطح کے ادیب ہوتے ہیں وہ کچھ تو استحصالی نظام کا شکار ہو کر اور اکثر خود اپنی شخصی کمزوریوں کے باعث بے روزگار رہتے ہیں اور مادی بحران میں مبتلا ہو کر نفسیاتی الجھنوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو زیادہ عالم اور کسی فن سے بھی واقف ہوتے ہیں ان کو بے روزگاری کی شکایت کم ہوتی ہے۔ لیکن جو ادیب اور شاعر بہت زیادہ طاقتور شخصیت کے مالک ہوتے ہیں جیسے جوش، فیض، اقبال وغیرہ۔ وہ اس نظام کی خرابیوں کے خلاف انقلاب کا درس دیتے ہیں اور معاشرے میں غموں کے اسباب کا تجزیہ کر کے ان کے متعلق عام بیداری پیدا کرنے میں مددگار ہوتے ہیں جیسے۔ ہمارے دور میں جوش ملیح آبادی شاعر انقلاب مشہور تھے وہ کہتے ہیں۔

جب حکومت قصر ہائے معزلت ڈھانے لگے
جب غرور اقتدار اقدار پر چھانے لگے
خسروی آئین پر جب آگ برسانے لگے
جب حقوق نوع انسانی پہ آنچ آنے لگے

رن میں در آبا زوئے خیبر شکن سے کام لے
ان مواقع پر حسینی بانکپن سے کام لے

ادیب اور معاشرے کی کشمکش اس وقت تک جاری رہے گی جب تک تمیز بندہ و آقا ختم نہیں ہو جاتی۔ ادیبوں اور دانشوروں کی ایسی انجمن بھی ملک میں ہونی چاہئے جو اچھے اور قابل ادیبوں کی سرپرستی کرے اور ان کی تخلیقات کو عام کرے اور ان میں احساس محرومی نہ پیدا ہونے دے۔

انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "معیاری ادب کے متعلق آپ کا سوال بہت اہم اور بنیادی نوعیت کا ہے۔ گو یہ ہر دور میں بدلتا رہا ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب صرف انداز بیان اور زبان کی صحت ہی اچھے ادب کا معیار تھا۔ بقول ایک شاعر

صرف انداز بیاں رنگ بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

مگر میرے نزدیک اچھے اور معیاری ادب میں دو باتیں بہت ضروری ہیں ایک حسن بیان

دوسرے حسن معنی یعنی ادب' مواد اور ہیئت کا خوبصورت اور پر اثر ملاپ ہونا چاہئے دیکھنا یہ چاہئے کہ کیا بات کہی گئی ہے اور کس طرح کہی گئی ہے۔ اول الذکر میں شعر یا نثر پارے کا مواد (content) آتا ہے تو دوسرے میں شاعر یا ادیب کا فن ظاہر ہوتا ہے۔ اور بڑے فن پارے کے لئے یہ دونوں باتیں ضروری ہیں۔ اب جہاں تک مواد کا تعلق ہے اس میں اہم بات یہ ہے کہ جو بات کہی گئی ہے وہ کس قدر انوکھی اور معلومات آفریں ہے۔ اس میں تخیل کی بلندی' خیال کی وسعت اور گہرائی کس قدر ہے۔ وہ کس حد تک انسانی فطرت یا کائنات کے سربستہ رازوں کا انکشاف کرتی ہے اور کس حد تک پر مسرت زندگی کے حصول میں انسانی فہم اور جذبات کی رہنمائی کرتی ہے۔ وہ مواد کس حد تک انسانی عظمت' اخوت اور بین الانسانی محبت کا آئینہ دار ہے۔ اس میں صداقت' محبت اور حسن کی اقدار کو انسانی حیات کا حصہ بنانے کے لئے کیا لائحہ عمل تجویز کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس شعری یا نثری فن پارے میں ابلاغ کی طاقت کس قدر ہے کیا وہ شاعر یا ادیب کی جذباتی اور فکری کیفیت پوری طرح قاری تک منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور شاعر میں خیال کو محسوس خیال بنانے کی قدرت فکر کو جذبے کی آنچ عطا کرنے کی طاقت اور زبان و بیان کی صحت ہی معیاری ادب کی تخلیق کا باعث بن سکتے ہیں۔

سوال نمبر 7 کے جواب میں عرض کروں گا کہ میں باہر کے ممالک میں بہت کم رہا ہوں۔ وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں کے متعلق میرا علم چند کتابوں' رسالوں اور دوستوں کی رائے کی حد تک محدود ہے اس لئے میری رائے آپ کے اس سوال کے تعلق سے معتبر نہیں ہو سکتی۔

سوال نمبر 8 کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "اردو زبان کے تعلق سے آپ کا یہ سوال بہت بنیادی نوعیت کا ہے۔ میرا تعلق حیدر آباد دکن سے رہا ہے جہاں اردو کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ وہاں اردو نہ صرف بول چال کی زبان تھی بلکہ سرکاری دفاتر عدالتوں اور مدارس و جامعات میں اردو زبان ہی رائج تھی۔ جامعہ عثمانیہ میں شعبہ فنون یعنی آرٹ اور سائنس کے تمام علوم اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹری (M.B.B.S (Medicine اور قانون (Law) بھی L.L.M تک اردو میں تھے۔ اور ان علوم سے متعلق جتنا مواد انگریزی اور دوسری زبانوں میں تھا اس کو اردو میں منتقل کر دیا گیا تھا اس مقصد کے لئے باقاعدہ ایک دار الترجمہ عثمانیہ کے ساتھ ہی قائم کیا گیا تھا۔ جہاں ہندوستان کے چوٹی کے ادیب اور دانشوروں کو خاص مراعات کے ساتھ ترجمے کے کام کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ یہ دانشور انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ عربی' فارسی اور اردو پر بھی عبور رکھتے تھے۔ انہوں نے تمام علوم کی اصطلاحات کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے ہر زبان سے استفادہ کیا اور پھر وہی ترجمہ رفتہ رفتہ ہمارے لئے روزمرہ بن گیا۔ ایک حیدر آبادی کے لئے ایئرپورٹ سے زیادہ آسان لفظ طیران گاہ تھا۔ یونیورسٹی کے مقابلے میں جامعہ زیادہ مقبول تھا۔ Civil Court کے بجائے عدالت دیوانی اور Criminal Court کے بجائے عدالت فوجداری

کی اصطلاحات زیادہ رائج تھیں۔ اسی طرح Judge کے لئے منصف File کے لئے "مثل" لیٹر کے لئے مراسلہ۔ ریڈیو اسٹیشن کے لئے نشرگاہ اور ریڈیو اسٹیشن کے لئے آلہ لاسلکی ہمارے لئے زیادہ مانوس اور آسان اصطلاحات تھیں کیونکہ ہماری زبان میں یہی جھگڑا نہیں تھا اور نہ انگریزی زبان کسی برتری کے احساس کی آئینہ دار تھی۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ انگریزی زبان کے خلاف کوئی تعصب تھا۔ انگریزی کے بہت سے الفاظ رائج تھے۔

دراصل زبان کا مسئلہ ایک اہم نفسیاتی مسئلہ ہے۔ جب کوئی اصطلاح کسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بار بار استعمال ہوتی ہے تو اس مفہوم کے متعلق ہمارے ذہن کے اعصاب حوالہ جاتی سانچے (frame of referance) بنا دیتے ہیں یہ ہمارے ذہن کی وہ صلاحیت ہے جو ہمارے ادراک (cognition) کا حصہ بن کر ہمیں اس اصطلاح کے توسط سے اس کے مفہوم کو سمجھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ اور وہ ہماری زبان کا روزمرہ بن کر ہماری بول چال کا حصہ بن جاتی ہے۔ مگر یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ زبان' زمان و مکان کی نسبت سے اضافی (relative) ہوتی ہے چنانچہ حیدر آباد کی ریاست میں سرکاری دفاتر اور جامعات میں آسانی سے استعمال ہونے والی اصطلاحات ہندوستان کے دوسرے علاقوں اور جامعات میں غالباً رواج نہ پاسکیں اور حیدر آباد کے زوال کے بعد نہ صرف جامعہ عثمانیہ میں ذریعہ تعلیم اردو نہ رہی بلکہ دارالترجمہ اور اس کی تمام تخلیقات تباہ کردی گئیں۔ بدقسمتی سے پاکستان میں اردو کو قومی زبان تسلیم کرنے کے باوجود ابھی تک اس کو سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہوسکی اور انگریزی علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے کوئی مرکزی سرکاری ادارہ قائم نہیں ہوسکا اور ایک "اردو مقتدرہ بورڈ" بنا بھی دیا گیا تو اس کو ہماری بیوروکریسی کی تائید حاصل نہیں ہوسکی اور چونکہ سرکاری دفاتر اور عدالتوں کی زبان ابھی تک انگریزی ہے اس لئے انگریزی اصطلاحات ہی ہمارے لئے روزمرہ بن گئی ہیں اور علمی طبقہ میں بھی یہ رجحان بڑھتا جارہا ہے کہ انگریزی اصطلاحات کو جوں کا توں لے لیا جائے۔ میرے خیال میں اس سے زبان کی انفرادیت اور اس کی شناخت مجروح ہوسکتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی مرکزی سرکاری رہنمائی کے بغیر زبان خود رو پودوں کی طرح مختلف اثرات کے تحت خود بہ خود نشوونما پاتی رہتی ہے۔ ہمارے ہاں آج کل یہی حال اردو کا ہے۔ اس پر انگریزی اصطلاحات کا غلبہ ہوتا جارہا ہے نہ معلوم کسی زبان کے تشخص اور پھیلاؤ کے لئے یہ فال نیک ہے یا نہیں اس کا تعین مستقبل کرے گا۔

سوال نمبر10- آج ہمارے ادب میں صحت مند تنقید بھی بہت اہم موضوع ہے جیسے جیسے زندگی کے متعلق ہمارا علم وسیع ہوتا جائے گا اسی نسبت سے قدیم اقدار بھی بدلتی جائیں گی اور اسی اعتبار سے تنقید نگاروں کی ذمہ داریاں بھی بڑھتی جائیں گی۔ ماضی میں ادب برائے ادب کا نظریہ مروج تھا اسی لئے اس زمانے میں فکری تنوع بھی زیادہ نہیں تھا۔ چنانچہ تنقید کا میدان بھی لسانیات' زبان و بیان کی صحت اور صرف و نحو کے قواعد کے حوالوں تک محدود تھا۔ چنانچہ شاعری میں استاد ہی نقاد بھی

ہوتا تھا۔ اور اس کا منصب زبان و بیان کے متعلق شاگرد کی رہنمائی کرنا ہوتا تھا۔ لیکن جوں جوں علم انسانی نے ترقی کی باشعور انسانوں کو معاشرتی زندگی کی پیچیدگیوں کا علم حاصل ہوتا گیا۔ جدید علوم نے ان کو اپنی محرومیوں کے معاشی، سیاسی، معاشرتی، مذہبی، طبقاتی اور نفسیاتی اسباب سے آگہی عطا کی۔ اسی اعتبار سے ادب اور شاعری کا میدان بھی وسیع اور کثیر الجہات ہوتا گیا۔

تنقید ایک بہت ہی نازک اور مشکل کام ہے۔ نقاد کا علم ادیب کے علم سے بہت زیادہ گہرا اور وسیع ہونا چاہئے اس کو اپنا مفہوم وضاحت سے ادا کرنے کے لئے زبان و بیان پر بھی عبور چاہئے اس لئے ہر شخص نقاد نہیں ہو سکتا۔ بدقسمتی سے ہمارا نقاد عام طور سے قدیم اقدار کے طلسم کدے سے باہر نہیں آسکا، اس لئے میرے خیال میں ہمارے تنقیدی ادب کو علمی حلقوں میں زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہو پا رہی ہے اور غالباً" یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔

حیدر آباد دکن میں مختلف علوم کے ترجمے اس لئے زیادہ ہو رہے تھے کہ وہاں علما کی ایک جماعت سرکاری سرپرستی میں علمی اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کے لئے موجود تھی اور وہاں تمام مدارس اور جامعات میں ذریعہ تعلیم اردو ہونے کی وجہ سے اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ تمام علوم جو انگریزی زبان میں موجود تھے ان کو اردو میں منتقل کرلیا جائے مگر پاکستان میں جامعات کی یہ ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے، اس لئے گو یہاں انفرادی طور پر کچھ ترجمے ضرور ہو رہے ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے اور انگریزی ہی اصطلاحات کے لئے اردو کے متبادل الفاظ کی تشکیل کا کام تو نہ ہونے کے برابر ہے بلکہ ان اصطلاحات کو عام طور سے جوں کا توں انگریزی ہی میں رہنے دیا گیا ہے اور ان کو اسی طرح اردو میں استعمال کیا جارہا ہے۔ اس کام کے لئے دراصل سرکاری سرپرستی میں باقاعدہ ماہرین پر مشتمل اداروں کے قیام کی ضرورت ہے۔ جس کا یہاں بدقسمتی سے شعور بھی ابھی پیدا نہیں ہوا۔

پاکستان میں علاقائی زبانوں پر بھی کوئی خاص کام نہیں ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں ہر صوبے یا علاقے میں اپنی اپنی علاقائی زبانوں میں ادبی کام تو کچھ نہ کچھ ضرور ہو رہا ہے مگر ان زبانوں کا آپس کا میل جول (interaction) بہت کم ہے اور خاص طور سے علاقائی زبانوں کے تراجم اردو میں اور اردو ادب کے ترجمے علاقائی زبانوں میں تو نہ ہونے کے برابر ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری سیاسی مقتدر جماعتوں کا وہ رویہ ہے جس نے علاقائی اتحاد کو روکنے کے لئے زبانوں اور زبان دانوں کے درمیان مختلف طریقوں سے تعصب اور نفرت کے جذبات پیدا کردیئے ہیں تاکہ اہل علم و دانش متحدہ طور پر حکومت کے استحصالی نظام کے خلاف محاذ تشکیل نہ دے سکیں۔

MR. KHURSHEED ALI KHAN, B-87 BLOCK 'A'
N. NAZIMABAD, KARACHI, 74700 PAKISTAN

"حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا"

خیر النساء مہدی

ڈاکٹر خیر النساء مہدی
بمبئی

ماہنامہ "شاعر بمبئی" کے قلم کار خواتین نمبر میں، میں نے خیر النساء مہدی کا پتہ دیکھا تو ان سے رابطہ کیا۔ خیر النساء کا تعلق بھی اسی مٹی سے ہے جس سے میں نے جنم لیا۔

میں نے خیر النساء سے پوچھا۔ میرا شہر بمبئی اب کیسا ہے؟ کہنے لگیں۔ "بمبئی اب وہ بمبئی نہیں ہے" جب کوئی اس طرح کہتا ہے تو میرا دل دکھ جاتا ہے۔ مجھے تو بمبئی ہمیشہ بہت پیارا اور بہت سندر دکھائی دیتا ہے۔ بقول حمایت علی شاعر

جب بھی اسے دیکھوں وہ نیا ہی نظر آئے

"خیر النساء اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔" میں نے پوچھا۔

انہوں نے کہا۔ "میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو بمبئی میں پیدا ہوئی جس ماحول میں پیدا ہوئی وہ نہایت روایتی تھا مگر روایات کا احترام اور ان سے انحراف دونوں ہی شاید آدمی کا مقدر ہیں۔ میں ایک متوسط درجے کے گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ لیکن اپنے محلے کی میں پہلی لڑکی تھی جس کی تعلیم انگریزی زبان سے شروع ہوئی۔ مجھے کانونٹ اسکول میں داخل کرایا گیا تھا۔ مگر پھر جانے

کیا ہوا کہ میٹرک پاس کرنے سے پہلے مجھے ایک مڈل کلاس مسلم اسکول میں داخل کر دیا گیا اس طرح جو شمع جلی تھی وہ روشن ہونے سے پہلے بجھ گئی۔ میں نے جب بی۔ اے کیا تو میرا سب سے پسندیدہ مضمون انگریزی ادبیات تھا اور میری خواہش تھی کہ میں اسی مضمون میں ایم اے کروں لیکن میرے والد کے رفقاء نے نہ جانے کیوں اصرار کیا کہ میں فارسی ادب و زبان میں ایم اے کروں۔ بی اے میں میرے پاس فارسی کا مضمون تھا لہٰذا والد کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا۔

۱۹۵۸ء میں باقر مہدی (مشہور نقاد ادیب) سے میرا عقد ہوا۔ شادی میں جان نثار اختر اور اختر الایمان بھی شریک تھے۔ ۱۲ اکتوبر کو باقر کی طرف سے "گل مہر" ہوٹل میں ولیمہ ہوا۔ یہ ہوٹل اب بمبئی کے مشہور تاج محل ہوٹل کا نمایاں حصہ ہے۔ ولیمے میں بمبئی کے مشہور شعراء وادیب شریک ہوئے تھے۔

یہاں میں کچھ اپنے ماحول کا ذکر بھی کرنا چاہتی ہوں۔ کھانڈیا اسٹریٹ اصل میں ایک محلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں صرف مسلم آبادی ہے۔ آج میں اس ماحول کے بارے میں سوچتی ہوں تو یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ شعر و شاعری کا ذوق تو لوگوں میں بہت تھا مگر نیم خواندگی کا بھی بہت اثر تھا۔ آس پاس کی گھریلو عورتیں صبح سے شام تک اپنے شوہروں اور بچوں کی خدمت کرتی رہتی تھیں اور ہیں مگر میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کچھ سوچنے سمجھنے کی شمعیں جلتی رہتی تھیں۔ یہی روشنی تھی جس نے مجھے اکسایا کہ میں سارے حلقے کو تو تعلیم نہیں دلا سکتی مگر اپنے خاندان کے افراد کو تعلیم یافتہ ضرور کروں گی اور اسی تعلیم دلانے کی خواہش کی وجہ سے میں اپنے چھوٹے بہن بھائی بہنوں کو پڑھنے کی طرف راغب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ افسوس ہے کہ میں ان کوششوں میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ میری دو بہنوں نے میری بار بار کی تاکید پر بی اے اور ایم اے کیا۔ والد صاحب برسوں پہلے بیمار پڑ کر انتقال کر چکے تھے۔ اس واقعہ کو تقریباً" پچاس سال گزر چکے ہیں مگر اس صدمے سے آج تک آزاد نہ ہو پائی ہوں۔ پورے خاندان کی سرپرستی' انسان کو مفاہمتوں اور مجبوریوں کی قید میں ڈال دیتی ہے۔ باقر مہدی میرے بارے میں کہتے ہیں کہ میں نے جس ماحول میں رہ کر تعلیم حاصل کی ہے' اس ماحول میں اگر وہ رہتے تو نیم خواندہ ہوتے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد میں نے اسکالرشپ لے کر اور دوسرے ذرائع کی مدد سے اپنی تعلیم کو مکمل کیا تھا۔

آپ نے میری زندگی کا اہم واقعہ بھی پوچھا ہے۔ تو سنئے کہ مجھے اپنی پہلی خوشی یاد ہے جب مجھے کوین میری اسکول Queen Mary School میں سینئر کیمرج (Senior Cambrige) کی لڑکیوں کو اردو اور فارسی پڑھانے کی ملازمت ملی تھی۔ پہلی تنخواہ پانے کی خوشی میں وہ داغ بھی روشن تھا جو والد کی مفارقت سے ہوا تھا۔ اس مروجہ تعلیم کو حاصل کرنے اور اپنے آپ کو تعلیم یافتہ کہنے کی میں جرات نہیں کر سکتی کیوں کہ باقر مہدی کا خیال ہے کہ وہ

چار کتابیں شائع کرنے سے کوئی ادیب و شاعر نہیں بنتا۔

مجھے یہ نہیں معلوم ہے کہ میں اردو میں ڈاکٹریٹ کیوں کرنا چاہتی تھی۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے زیر نگرانی میں نے ایک مضمون ان کی پسند کا چنا تھا۔ "اردو ادب میں طنز و ظرافت" تقریباً" چار سال تک میں نے بیشتر کتابیں پڑھیں اور سوچتی تھی کہ اس موضوع پر دو تین سو صفحات کے (Notes) کو ایک کتاب کی شکل کیسے دوں؟ باقر مہدی سے میری اتفاقی ملاقات ہو گئی اور میرے خیال تھا کہ وہ میری کچھ مدد کریں گے۔ مگر وہ سرے سے ہی ڈاکٹریٹ کے خلاف تھے اور مثالیں احتشام حسین اور آل احمد سرور کی دیتے تھے اور کہتے تھے کہ خود میرے استاد ڈی پی مکرجی بھی ڈاکٹر نہیں تھے۔

میرا کوئی ارادہ مختصر تقاریر یا مضامین لکھنے کا نہیں تھا۔ مگر بھلا ہو مسز وملا شام لال کا' (وہ آکاش وانی میں تھیں) انہوں نے مجھے ایک مضمون لکھنے کی دعوت دی تھی۔ نہ جانے کون سا سیلاب ذہن میں بند تھا کہ اس کے بعد میں نے ان گنت تقاریر' مضامین فیچر اور کہانیاں لکھیں۔ کچھ آکاش وانی کے لیے کچھ خواتین کی چھوٹی چھوٹی انجمنوں کے لیے اور ان تحریر شدہ کاغذات کو میں نے محفوظ بھی نہیں رکھا۔ لیکن باقر مہدی نے میری ساری تحریریں محفوظ رکھیں۔ اس مجموعے کے لیے ان کا انتخاب میں نے کیا ہے اور خواتین کو پڑھنے کی دعوت دی ہے جو اپنے گھریلو کاموں سے تھوڑی بہت فرصت پاتی ہیں۔ یہ مضامین صحافیانہ انداز میں لکھے گئے ہیں اور ان میں کہیں کہیں ادبی چاشنی بھی آ گئی ہے۔ میں "ادبی مراحل" کے بعد ان مضامین کو شائع نہ کرتی اگر باقر مہدی اصرار نہ کرتے۔ یہ مضامین "مجھے بھی کچھ کہنا ہے" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ محترمی جان نثار اختر کا شعر ایک لفظ کی تبدیلی کے ساتھ لکھ رہی ہوں۔

کیا پتا ہو بھی سکے اس کی تلافی کہ نہیں
" زندگی " تجھ کو گنوایا ہے بہت دن میں نے

بیسویں صدی میں اردو ادب میں زندہ رہ جانے والے ناموں کے بارے میں یہ سوال آپ نے غالباً" مجھ سے نہیں بلکہ "وقت" سے کیا ہے؟ اس لیے کہ اردو' ہندوستان میں تقریباً" نیم جان ہے۔ اگر میں نام گنواؤں گی تو بلاوجہ کا تنازعہ پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے میں آپ کے سوال کا صرف اتنا جواب دیتی ہوں کہ میری ناچیز رائے میں حسرت موہانی نے اپنے مضمون "معیار الادب" میں لکھا ہے کہ اردو میں ان گنت شاعر تھے۔ مگر اب کتنے باقی رہ گئے ہیں؟ میری گزارش ہے کہ آپ خود اس سوال کا جواب دیجیے۔

آپ نے پوچھا ہے کہ فکشن ایک لطیف آرٹ ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ مشہور فرانسیسی ادیب (فکشن) فلابیر نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ بہت جان لیوا آرٹ ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فلابیر' فرانسیسی افسانہ نگار موپاں ساں کا استاد تھا۔ اور آپ کا یہ کہنا کہ جدیدیت نے آرٹ کی

لطافت کو نکھارا' سنوارا یا مجروح کیا ہے؟ حیرت ہے کہ آپ جیسی فاضل خاتون اس طرح کا سوال کرتی ہیں۔ محترمہ! کلاسیکی ادب نے بور ژوا ناول کو بام عروج پر پہنچایا تھا۔ مصنف gore Vidal اور ان کے چند شرکاء نے بیسویں صدی کے عظیم ناول نگار کے نام شائع کیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس فہرست میں کئی مشہور نام رہ گئے ہیں جیسے Ralph Eliso کا عظیم ناول 'Man Invisible' کا نام نہیں ہے اور کتنے ہی نام اس فہرست میں شامل نہیں ہیں جیسے کہ Doris Lessing اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ کوئی تحریک نہ تو کسی آرٹ کو مجروح کرتی ہے اور نہ سنوارتی ہے۔ مثلاً "ابھی حال ہی میں چیخوف کی غیر مطبوعہ کہانیاں چھپی ہیں جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مبصر نے لکھا Hack of genius۔ اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ چاہے ترقی پسند ہوں یا جدیدیے ہوں وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں اگر کامیاب ہوئے ہیں تو اچھی تخلیق سامنے آئی ہے جیسے راجندر سنگھ بیدی اپنی ہر ایک کہانی کو بار بار لکھتے تھے اور پھر بھی تشنگی نہیں ہوتی تھی۔"

خیر النساء کہہ رہی تھیں "آپ کا یہ سوال بھی ادھورا ہے کہ موجودہ صدی میں اردو ادب میں بہت کم ناول لکھے گئے ہیں اس کی وجوہ کیا ہیں؟ اس لیے کہ اردو میں 'افسانہ ہمیشہ ناول پر فوقیت رکھتا ہے'، جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے پاس اتنی فرصت نہیں ہے کہ وہ کئی برس ایک ناول پر صرف کریں۔ یعنی اس دوران ان کے معاشی حالات بھی اچھے نہیں ہوتے ہیں۔ میں نے ایک بار خود یہ سوال راجندر سنگھ بیدی سے کیا تھا۔ (یہ سوال پھر ادھورا کیسے ہوا؟ آپ نے وضاحت نہیں کی اور خود یہ سوال پوچھا بھی...) انھوں نے فرمایا تھا کہ "ناول لکھنے کے لیے معاشی حالات، وقت' ان تھک محنت اور غیر معمولی صلاحیتیں چاہئیں۔ مجھ میں صرف آخری شے موجود ہے۔ اور میرے پاس نہ تو وقت ہے اور نہ معاشی حالات اتنے اچھے ہیں کہ میں کسی دور دراز کے علاقے میں جا کر تنہا بیٹھ کر ایک طویل ناول لکھوں۔ ایک افسانہ لکھنا ہی مجھے عذاب عظیم سے کم نہیں معلوم ہوتا۔ کیسے ایک فنکار اپنے جذبات' پلاٹ اور کردار کی تخلیق کرے؟ کیا آپ نے سنا نہیں کہ ور جینیا ولف جب ناول لکھتی تھی تو نیم پاگل ہو جاتی تھی!

سوال نمبر۵ کے جواب میں عرض ہے کہ انسانی زندگی میں کوئی دور بھی ایسا گزرا ہے کہ جب انسان ذہنی' روحانی اور نفسیاتی بحران سے نہ گزرا ہو سمرسیٹ ماہم نے لکھا ہے کہ جب ان کے حالات اچھے ہو گئے تو ان کے ناول انہیں کثیر رقم دیتے تھے مگر ناول کا معیار خود ان کے لحاظ سے بھی کمتر ہوتا ہی جاتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی کتاب
Great Modern Short Novels

میں لکھا ہے کہ
"میں نے اپنا کوئی ناول شائع نہیں کیا ہے۔" اس میں سب سے پہلا ناول James

Joyce کا ہے۔ جس کا نام ہے The Dead اور آج جو فہرست ناولوں کی شائع ہو رہی ہے اس میں James Ioyce کا نام سرفہرست ہے۔

نثر کم لکھے جانے کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان کی ابتداء شاعری سے ہوئی تھی اس لیے آج بھی شاعری ہی مقبولیت رکھتی ہے اور نثر کو وہ درجہ حاصل نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جستجوی صحافت یعنی Investigative Reporting نے اردو نثر کو اور بھی پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ پھر بھی آج کے دور میں (کم از کم) ہندوستان میں پروفیسر نیر مسعود، رشید حسن خان اور شمس الرحمن فاروقی وغیرہ اردو نثر کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

آپ کا یہ خیال صحیح ہے کہ اردو کئی زبانوں کا مجموعہ ہے۔ آپ کا یہ خیال بھی صحیح ہے کہ اردو کی ترقی رک گئی ہے۔ مجھے خود افسوس ہوتا ہے کہ میں خود بھی لوگوں سے زیادہ تر انگریزی زبان میں گفتگو کرتی ہوں، اردو میں نہیں۔ آپ کو شاید بمبئی کی زبان کا اندازہ ہو گا کہ بمبئی کی زبان الگ ہے اس میں مرہٹی گجراتی ہندی اور فارسی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اب کوئی یہ نہیں کہتا مہمانوں سے کہ "آپ تشریف فرمائیں" بلکہ کہتے ہیں کہ "آپ بیٹھ جائیں" یا "بسا" (مراٹھی میں بیٹھ جائیں) استعمال ہوتا ہے۔

آخری سوال کے جواب میں عرض ہے کہ میں آپ سے متفق ہوں کہ اردو ادب ہی میں نہیں بلکہ ایشیا یعنی تیسری دنیا کی زبانوں میں بھی تنقید برائے نام ہے۔ اس لیے کہ تنقید ہمیشہ جمہوریت کے نظام میں پروان چڑھتی ہے۔ ہندوستان میں اردو اکیڈمیاں قائم ہیں وہ بھی کچھ مدد کرتی ہیں مگر برائے نام۔ یہاں پر ہر رسالہ اپنے چھوٹے گروہ کے ساتھ چند سال فروغ پاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے اور تیسری دنیا میں تعلیم بھی بہت کم ہے۔ ہمارے ملک کے نوبل انعام یافتہ امرتیا سین نے کہا ہے کہ تعلیم کے بغیر، ترقی کے امکانات کم ہیں اور یہ حقیقت بھی آپ پر عیاں ہے کہ ان تمام ممالک میں بنیادی تعلیم بہت کم ہے۔ بے روزگاری غریبی و جہالت کا دور دورہ ہے۔ تراجم ہو رہے ہیں مگر بہت کم۔ میں نے اپنے منتخب تراجم کی کتاب چھاپی تھی "ادبی مراحل" وہ بھی بہت کم فروخت ہوئی۔ آپ نے لکھا ہے کہ کیا اس سے اردو زبان کو نقصان پہنچ رہا ہے تو مجھے عرض کرنا ہے کہ مرزا غالب کا ایک مصرعہ ہماری صورت حال پر ثابت ہوتا ہے۔

"حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا"

KHAIRUNNISA MEHDI

E,1. RAMDARSHAN OFF CARTER ROAD

BANDARA,W BOMBAY 400050 INDIA.

"ہر عہد اپنا افسانہ اپنی ذہنیت اور رجحانات کے ساتھ لاتا ہے"

(انتظار حسین)

ذکیہ مشہدی

۱۲ نومبر ۹۹ء

ذکیہ مشہدی

پٹنہ، ہندوستان

ایک نشست میں پاکستان کے نامور نقاد جناب محمد علی صدیقی نے اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "ادب اور سماج کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ سماج میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا عکس ادیب اور شاعر کی تحریروں میں آنا فطری بات ہے۔ ادیب سوسائٹی کا محسن ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو ختم کرکے زبان، بیان اور دیگر معاملات کو سمجھنے کے لئے اپنی بصارت دے رہا ہے۔ یہ کام معاشرے کا کوئی اور طبقہ انہیں کرسکتا۔

میں نے ذکیہ کے کئی افسانے پڑھے ہیں اور میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ذکیہ کا شمار بھی ان ادیبوں میں کیا جاسکتا ہے جو ہمارے آج کے سماج کے محسن ہیں۔ جن کی تحریریں ہمارے معاشرے اور اس کے افراد کے لئے "آئینہ" ہیں کہ ہم اپنے خدوخال کا جائزہ لیں اور انہیں سنواریں کہ یہ اب بگاڑ کی جانب مائل ہیں۔

آپ نے بھی ذکیہ مشہدی کے افسانے پڑھے ہوں گے۔ اب ذکیہ مشہدی سے مل بھی لیجئے۔

سوال نمبر۱ کے جواب میں ذکیہ کہہ رہی تھیں۔

میرا پورا نام ذکیہ سلطانہ مشہدی ہے۔ قلمی نام مختصر کر کے ذکیہ مشہدی کر دیا۔ جائے پیدائش امروہہ ضلع مراد آباد جو میری ننھیال تھی۔ سن پیدائش آزادی سے دو سال قبل یعنی 1945ء والد اور والدہ دونوں کا تعلق مغربی یوپی کے زوال پذیر زمیندار خاندان سے تھا لیکن خواتین کی تعلیم کافی پہلے آچکی تھی۔ میرے والد نے بیٹیوں اور بیٹوں میں کوئی فرق نہیں کیا۔ لڑکیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ میرے خاندان کی کئی خواتین جن کی عمر آج ساٹھ سے تجاوز کر چکی ہے کالج اور یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں۔ قریبی عزیزوں میں ادیب اور شاعر تو کوئی نہیں گزرا لیکن پڑھنے کے شوقین بہت تھے۔ میرے والد' میرے چچا' آج بھی زیادہ وقت پڑھنے میں گزارتے ہیں۔ یہ شوق ورثے میں ملا۔

زندگی کا بیشتر حصہ لکھنؤ اور لکھنؤ سے متصل ضلع سلطان پور اودھ میں گزرا۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے میں نے نفسیات میں ایم اے کیا۔ لکھنؤ میں ہی لاریٹو کونوٹ کالج میں چھ سال نفسیات کی لیکچرر رہی (اس مدت میں شادی کے بعد کا زمانہ بھی شامل ہے) 1972ء میں شفیع مشہدی سے شادی ہوئی جو سول سروس میں تھے۔ شفیع کو افسانہ نگاری' شاعری' ڈرامہ نویسی تینوں سے گہرا شغف تھا۔ شادی سے پہلے میں نے سنجیدگی کے ساتھ افسانہ نگاری نہیں کی تھی۔ دو ایک افسانے کالج میگزین کے لئے لکھے تھے۔ کالج کے لئے ہی ایک ہلکا پھلکا اسٹیج ڈرامہ لکھا تھا۔ شادی کے بعد ملازمت بہت دن نہ چل سکی۔ شفیع اس زمانے میں دہلی میں پوسٹڈ تھے۔ میں ملازمت چھوڑ کر پکی گرہستن بن گئی لیکن جلد ہی احساس ہوا کہ تعلیم ضائع ہو رہی ہے اور گھرداری کے علاوہ بھی کچھ کرنا چاہئے۔ ان دنوں میں نے "بیورو فار پروموشن آف ریجنل لینگویجز" کے اردو ونگ کے لئے نفسیات کی تین کتابوں کے (انگریزی سے) اردو میں ترجمے کئے۔ کبھی کبھار افسانے بھی لکھے جنہیں کہیں بھیجا نہیں۔ کچھ عرصے بعد ہم لوگ بہار آ گئے۔ یہاں افسانہ نگاری کی طرف زیادہ توجہ کی۔ پٹنہ میں میں نے تعلیم بالغاں کے ریاستی رسورس سینٹر کے لئے کافی کام کیا۔ نوخواندہ افراد کے لئے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں کتابیں تیار کیں۔ مجھے ہندی پر دسترس ہے اور ہندی ادب سے گہرا شغف بھی۔ حال ہی میں ساہتیہ اکیڈمی' دہلی کے لئے دو اہم ادیبوں کی کتابوں کے ترجمے کئے۔ ایک ہندی سے اردو اور دوسرا اردو سے ہندی۔ مصنفین کے نام (علی الترتیب) شوپر شاد سنگھ اور رام لعل ہیں۔

اس میں انکساری کو دخل نہیں۔ میں واقعی محسوس کرتی ہوں کہ نہ تو میں اتنا لکھ سکی جتنا لکھنا چاہئے اور نہ ہی کوئی بڑا مقام حاصل کر سکی۔ باوجود اس احساس کے کہ کچھ کرنا چاہئے۔ میری اولیں ترجیح میرا گھر اور بچے رہے اور میری حدود بھی۔ بہت خاموشی کے ساتھ لکھ رہی ہوں۔ ادبی محفلوں میں بہت کم جاتی ہوں۔ شہرت اور پبلسٹی کے موقع تلاش کرنا تو بڑی بات ہے اکثر ہاتھ آئے موقعے بھی دانستہ چھوڑ دیئے ہیں۔ تفصیلات سے گریز بھی دانستہ ہے۔

سوال نمبر2 کے جواب میں ذکیہ کا کہنا ہے۔

اس صدی سے پہلے نثری ادب تھا کہاں۔ یہ تو پچھلے پچاس سالوں کی دین ہے۔ بڑا سرمایہ اسی

عرصے میں اکٹھا ہوا اس لئے ایسے کئی نام ہیں جو باقی رہیں گے۔ فکشن لکھنے والوں میں پریم چند' منٹو' قرۃ العین حیدر سرفہرست ہیں۔ نقادوں میں شمس الرحمٰن فاروقی' مزاح نگاروں کو بھی شامل کیجئے تو رشید احمد صدیقی اور مشتاق یوسفی۔ ایک دوسری فہرست بھی بن سکتی ہے جو کافی طویل ہو جائے گی۔

سوال نمبر3 اے جواب ہے۔ جدیدیت نے فکشن کو مجروح کیا ہے یا نہیں یہ سوچنا پڑے گا۔ پر اس سوال کا کوئی حتمی جواب نہیں دے سکتی لیکن ایک بات میرے ذہن میں بالکل صاف ہے وہ یہ کہ سنوارا قطعی نہیں ہے۔ مٹھی بھر افراد کو چھوڑ کر جن میں شاید لکھنے والے خود بھی شامل ہوں گے۔ میں نے لوگوں کو اس دور کے افسانوں کو نہ شوق سے پڑھتے دیکھا نہ ان پر گفتگو کرتے سنا الا معدودے چند نشستوں کے جو نہایت خصوصی نوعیت کی تھیں جبکہ نجی محفلوں میں کرشن چندر' عصمت چغتائی' راجندر سنگھ بیدی' منٹو' قرۃ العین حیدر وغیرہ پر گفتگو کرتے پایا اور ان کی تصانیف کو ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتے ہوئے دیکھا۔ میرے والد علمی کتابیں زیادہ پڑھتے ہیں اس کے باوجود کئی شاہکار افسانے ایسے ہیں جن کا انہوں نے تذکرہ کیا اور مجھے تاکید کی کہ پڑھوں (فوری طور پر اشفاق احمد کا افسانہ گڈریا یاد آرہا ہے) اس میں کسی جدیدیے کا لکھا کوئی افسانہ شامل نہیں ہے۔ میں خود افسانہ نگار بعد میں ہوں اور قاری پہلے۔ افسانہ نگار خواہ کیسی بھی ہوں لیکن بحیثیت قاری باذوق ہوں اور ذہین بھی۔ بہت سے افسانوں نے بہت متاثر کیا ہے۔ فہرست بہت طویل ہے۔ چند ایک کا نام لوں تو پریم چند کا سلگتی' منٹو کا کھول دو' بیدی کا گرہن' اشفاق احمد کا گڈریا' قرۃ العین حیدر کا اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو۔ ہندی میں موہن راکیش کا ملبے کا مالک' شو مورتی کا تریا چرتر اور ایک تامل افسانہ بھوک (ترجمہ ہندی میں پڑھا) جس کے مصنف کا نام یاد نہیں۔ بنگلہ کے کئی افسانے.... صفحات بھر جائیں گے اگر سب کے نام گنواؤں۔ ان میں سے کوئی بھی افسانہ مبہم' علامتوں' گنجلک' سپاٹ انداز بیان اور خرافات پر مبنی نہیں ہے۔ بلاشبہ جدیدیت کے سارے علم بردار اس طرح کے افسانے نہیں لکھ رہے تھے بعض نے واضح' صاف اور خوبصورت علامتیں استعمال کیں (حال میں انتظار حسین کا افسانہ مور پڑھا تھا) اور علامت نگاری جدیدیت کے علم برداروں تک محدود بھی نہیں رہی لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ افسانہ نگار قبول عام کی سند حاصل نہیں کر سکے۔ ہندی افسانہ اردو سے بھی پہلے ماجرا نگاری کی طرف لوٹ آیا۔ بہرکیف تجربے کرنے کا حق تو سب کو ہے۔ ادب میں بھی تجربے ضروری ہیں اسی لئے یہ نہیں کہوں گی کہ جدیدیت سے فکشن مجروح ہوا اور تجربہ ٹائیں ٹائیں فش رہا۔

سوال نمبر4 کے جواب میں عرض ہے کہ افسانہ لکھنا نسبتاً" زیادہ آسان ہے۔ زیادہ تر افسانہ نگار ایک یا دو نشستوں میں افسانہ مکمل کر لیتے ہیں۔ ناول کے لئے بہت وقت چاہئے زیادہ علم' زیادہ بڑا کینواس چاہئے اس لئے زیادہ صبر و تحمل بھی۔ ایک بار رضیہ سجاد ظہیر سے کسی نے سوال کیا تھا کہ آپ کے افسانے آپ کے ناولوں سے بہتر کیوں ہیں تو انہوں نے ہنس کر کہا تھا" بی بی بڑی دیگ کے

مقابلے میں ہنڈیا پکانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔"

سوال نمبر 5 کے جواب میں اس لئے میرے خیال میں سبھی ادیبوں پر ایسا کوئی عمومی بیان صادر نہیں کیا جا سکتا۔ یوں دیکھا جائے تو موجودہ دور کی انتہائی تیز رفتار اور مادی ترقی نے ذہنی و روحانی بحران میں سبھی حساس انسانوں کو مبتلا کر رکھا ہے۔ ادیبوں کی راہنمائی کے لئے کوئی "کاؤنسلنگ سینٹر" کھولنا تو شاید ممکن ہی نہیں۔ ایک پڑھا لکھا، حساس، باشعوری انسان (جو کہ ہر ادیب ہوتا ہے اور یہ کہ ہونا چاہئے) اپنی راہنمائی کے وسیلے خود تلاش کرے گا۔ گہرا مطالعہ، خود سے زیادہ تجربہ و علمیت رکھنے والے لوگوں کے خیالات و تجربات سے استفادہ، زندگی کا بغور مشاہدہ اور پیروں کو مضبوطی کے ساتھ دھرتی پر جمائے رکھنا ایسے ہی وسیلے ہیں جو راہنمائی کریں گے۔

سوال نمبر 6 کے جواب میں انہوں نے فرمایا "یہ سوال میں نے خود سے بھی بارہا کیا ہے۔ خاطر خواہ جواب نہیں مل سکا۔ شاید اس لئے کہ ادب میں معروضی کچھ نہیں۔ میں جو کچھ سوچتی ہوں اس کے لئے بھی ٹھوس اور معروضی دلائل مہیا کرنا مشکل ہے۔ بہرکیف میرا خیال ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ خواہ شاعری ہو یا نثر، فکر انگیزی اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔ لیجئے خوبصورتی، بذات خود انتہائی غیر معروضی شئے ہے میں اس کی وضاحت موثر اور سادہ انداز بیاں کے تحت کروں گی۔ فکر انگیز تو مقالہ بھی ہو سکتا ہے اور اخبار کا مضمون بھی۔ تحریر ادب پارہ جب ہی کہلاتی ہے جب وہ حسن بیان کی حامل بھی ہو۔ پر اچھے افسانے یا ناول کی بنیادی شرط یہی سمجھتی ہوں کہ وہ سپاٹ نہ ہو اور اس کا پڑھنا ذہنی سرور کا سبب بنے۔ نہر پر چل رہی ہے پن چکی اور..... تم میرے پاس ہوتے ہو گویا دونوں اشعار یاد کیجئے۔ شاید وہ واضح ہو جائے جو میں کہنا چاہتی ہوں۔"

سوال نمبر 7 کے جواب میرے نزدیک یوں ہو سکتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان سے باہر جو اردو بولنے والے سکونت پذیر ہیں ان کے مسائل سے مجھے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ قیاس آرائی ہی کر سکتی ہوں۔ شاید ان کے پاس وقت کم ہے۔ شاعری بہت آسان ہے اور افسانہ نگاری سے بھی کم وقت لیتی ہے، جہاں تک جرات اور موضوعات کا سوال ہے تو جرات شاعری کے لئے بھی چاہئے اور موضوعات تو قدم قدم پر بکھرے پڑے ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے زیادہ دنیا دیکھی، اپنے مستقر سے نکل گئے ان کے پاس موضوعات کی کیا کمی؟ شاید مادی آسائشوں اور مسئلوں نے وقت چھین لیا ہو دوسرے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نئی جگہ کی نئی زبان، اجنبی تہذیب اپنی جڑوں سے دور کرتی جا رہی ہو اس لئے نثر پر توجہ کم ہو گئی ہے۔ شاعری فوری طور پر کہی ہی نہیں، سنی اور سنائی جا سکتی ہے۔ نثر کا مصرف اس تناظر میں کم ہو جاتا ہے۔

سوال نمبر 8 کے سلسلے میں کہنا ہے۔ کسی زبان میں کسی دوسری زبان کے بہت سے الفاظ دانستہ طور پر شامل کرنا نہ مناسب ہے نہ زیادہ ممکن۔ نئے الفاظ کا شامل کیا جانا ایک سست رفتار اور بیشتر صورتوں میں لاشعوری عمل ہوتا ہے۔ میرا مشاہدہ تو یہ ہے کہ اردو ادیب انگریزی الفاظ کا نہ صرف

غیر ضروری استعمال کر رہے ہیں بلکہ کئی حضرات تو انہیں انگریزی رسم الخط میں ہی لکھ دیتے ہیں۔ اس سے زبان کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ جہاں تک تکنیکی الفاظ کا سوال ہے وہ اردو میں لئے جا رہے ہیں اور لئے جانے چاہئیں' اس لئے مختلف علمی و سائنسی موضوعات سے تعلق رکھنے والے تکنیکی الفاظ اردو میں بہت کم ہیں۔ یہاں دانستہ شمولیت ضروری ہے۔ زبان کو وسعت دینے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو انگریزی ہی کیوں ہندوستان پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی شامل کئے جانے چاہئیں۔ یہ موضوع بحث طلب ہے' اس پر زبان داں حضرات مل کر سیر حاصل گفتگو کریں تو بہتر ہوگا۔

سوال نمبر 9 کے جواب میں اتنا ہی کہوں گی کہ ہر شخص کی زندگی میں اہم واقعات ہوتے ہیں اور دلچسپ بھی۔ آپ کے پچھلے سوالوں کے جواب طویل ہوگئے۔ اب کیا کیا لکھوں۔

سوال نمبر 10 کے جواب ہے۔ اردو زبان کو کئی چیزیں نقصان پہنچا رہی ہیں۔ تراجم کا نہ ہونا ان میں سے ایک ہے۔ بلاشبہ اس سے زبان زرخیز نہیں ہوتی۔ تنقید کے بارے میں مجھ سے زیادہ کچھ مت پوچھئے۔ بہ حیثیت مجموعی اردو ادب رو بہ زوال نظر آرہا ہے۔ کیا ادھر آپ نے کچھ چونکانے والی' ہل چل مچانے والی تخلیقات دیکھیں پھر نقاد بے چارے کیا کریں ویسے بھی اوریجنل سوچ کی کمی ہے۔ مغرب میں جو کچھ آتا ہے ہمارے بیشتر نقاد کچھ عرصے بعد اسے اردو پر لاگو کر دیتے ہیں۔ میں تنقیدی مضامین کبھی کبھی ہی پڑھتی ہوں۔ تنقید پر تو کچھ نہیں پڑھتی ہوں۔ یہ میری دلچسپی کا موضوع نہیں ہے۔

MRS. ZAKIYA MASHHADI
F-1, GRAND PALLAVI COURT
JUDGE'S COURT ROAD PATNA 800004, INDIA.

The translation was made at my request by my friend Khalid Hasan Qadiri. The handwriting is mine.

Ralph Russell

19 October 1999 رالف رسل

پروفیسر رالف رسل

برمنگھم برطانیہ

پروفیسر رالف رسل کا لکھا بابائے اردو یادگاری خطبہ 1994ء بعنوان "اقبال اور ان کا پیغام" میرے سامنے ہے جسے انجمن ترقی اردو پاکستان نے 1996ء میں شائع کیا اور انجمن کے صدر محترم جمیل الدین عالی نے مجھے عنایت کیا۔ اس میں اقبال کے ان اشعار کے حوالے سے پروفیسر رالف رسل نے جو کچھ لکھا ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

"دوسرے لفظوں میں آپ زندہ کہلانے کے مستحق صرف اسی صورت میں ہوں گے جب آپ

ان حالات کو بہتر بنانے کی حتی الامکان جدوجہد کریں جن میں آپ پیدا ہوئے۔ صرف وہی لمحات زندگی کا حصہ شمار ہوں گے جو ان مقاصد کی خاطر مثبت کوشش کرنے کے لئے وقف ہوئے۔ بقیہ لمحے بے شک چوبیس گھنٹوں میں شامل ہوں گے لیکن زندگی کے حقیقی شب و روز میں ان کی گنتی صفر کے برابر ہوگی۔ مزید بر آں اس نوع کی زندگی آپ سے عظیم ترین قربانی کا مطالبہ بھی کر سکتی ہے۔ اس صورت میں آپ کو بلا تامل اس مطالبے کی آواز پر لبیک کہہ کر اپنی موت کو اس بات کا ثبوت جاننا چاہئے کہ آپ صحیح معنوں میں زندہ ہیں۔ سو یہ ہے اقبال کے پیغام کا لب لباب جو ایسی زبان میں ہے جسے ہر مسلمان سمجھتا ہے۔ نیز اس پیغام کو قرآن کی تائید حاصل ہے جسے ہر مسلمان اللہ کا کلام مانتا ہے لیکن اس پیغام کی ترجمانی ایسے پیرائے میں بھی آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ جس سے نہ صرف دوسرے مذاہب کے پیرو بلکہ مجھ جیسے لامذہب انسان بھی متاثر ہو سکتے ہیں۔"

پروفیسر رالف رسل کے بارے میں میں نے تھوڑا بہت پڑھ رکھا تھا اور ان سے دوبدو ملنے کی خواہش برطانیہ جا کر پوری ہو سکتی تھی۔ 1997ء میں برطانیہ جانا بھی ہوا لیکن میری آمد و رفت صرف لندن تک محدود رہی۔ اب نثر نگاروں کا تذکرہ لکھتے وقت مجھے پروفیسر رالف رسل کی یاد آئی تو میں نے انہیں ایک خط لکھا اور سوال نامہ بھیجا۔ ان کا انگریزی میں لکھا جواب آیا کہ انہوں نے اردو زبان میں تو ایسا کوئی خاص کام نہیں کیا ہے چنانچہ وہ اس تذکرے میں کیونکر شامل ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں جانتی تھی کہ پروفیسر رالف رسل انکساری سے کام لے رہے ہیں۔ ورنہ اردو ان کی اپنی زبان نہ ہوتے ہوئے انہوں نے اس زبان کی جتنی خدمت کی ہے اور اس کے سرمائے میں جتنا اضافہ کیا ہے وہ اس قابل ہے کہ ہم ان کا احسان کبھی نہ بھولیں۔ چنانچہ میں نے عاشور کاظمی کا سہارا لیا کہ میرے نزدیک عاشور ہی میری معاونت کر سکتے تھے۔ اور بلاشبہ انہوں نے یہ کام انجام دیا۔ انہوں نے رالف رسل کی تصویر اور عکس تحریر بھی فراہم کیا۔ میں ان کی اور پروفیسر رالف رسل کی شکر گزار ہوں کہ ان کی معاونت سے میرے حوصلے بلند ہوئے اور "گفتنی" کے قارئین کو بڑی کار آمد معلومات ملیں۔ اس ضمن میں، میں محترم جمیل الدین عالی سے بھی ملی کہ وہ جناب رالف رسل کے قریبی ساتھیوں میں سے ہیں۔ عالی صاحب پروفیسر رالف رسل کے بارے میں خاصی معلومات بہم پہنچائیں۔ پہلے تو آپ عاشور کی فراہم کردہ معلومات سے مستفید ہوں۔ وہ لکھتے ہیں۔

6 جولائی 1999ء تیشہ بدست خاتون سلطانہ مہر کے لئے بھائی کی طرف سے دعائیں۔ رالف رسل صاحب سے تصویر، عکس تحریر اور جو معلومات فراہم ہوئیں ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

عاشور

"غالباً" اس صدی کی چھٹی دہائی کی بات ہے کہ حضرت جوش ملیح آبادی نے برطانیہ میں اردو کے ایک سکالر کو خط لکھا جس کی ابتدا کچھ یوں تھی۔

برطانیہ کے رسول اردو رالف رسل کے نام

جوش مرحوم کا سلام

یہ خط ایک ایسے صاحب کو دیا گیا جو لندن آرہے تھے تاکہ وہ دستی رالف رسل کو پہنچادیں۔ لیکن ہوا یوں کہ "بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا" اور اس کا سبب بھی وہی تھا یعنی "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا"۔ "قانون ضرورت" کے تحت اگر اس مصرعے میں تحریف مباح ہوسکے تو مصرعہ یوں بنتا ہے۔ ذکر اس سخن ور کا اور پھر بیاں اپنا۔ مختصر یہ کہ "نامہ بر" صاحب نے اس خط کو "جوش صاحب کی تحریر" ہونے کے "جرم" میں خود رکھ لیا اور رالف رسل کو معلوم بھی نہ ہوسکا کہ الفاظ کو معنی عطا کرنے والے ایک عظیم شاعر نے رالف رسل کو کس القاب سے مخاطب کیا تھا۔

یہ بات 1986ء میں لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کے افتتاحی اجلاس میں اس وقت سامنے آئی جب سے عاشور کاظمی نے رالف رسل کو سٹیج پر بلاتے وقت کہا۔

"اب میں حضرت جوش ملیح آبادی کے الفاظ میں برطانیہ کے رسول اردو رالف رسل کو سب سے پہلے جوش مرحوم کا سلام پہنچاتا ہوں۔ جوش نے جب رالف رسل کے لئے رسول اردو کے الفاظ استعمال کئے تھے اس وقت خود کو مرحوم لکھا تھا۔ یہ الفاظ اور ان کے معنی کی بات تھی۔ آج جوش صاحب مروجہ معنی میں بھی مرحوم ہوچکے ہیں اس لئے میں ان کا سلام رالف رسل کو پہنچا رہا ہوں وہ بھی اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ خط رالف رسل کو نہیں پہنچایا گیا تھا جس میں جوش نے یہ سب کچھ لکھا تھا۔ اس "سلام رسانی" کے بعد میں رالف رسل سے درخواست کروں گا کہ وہ ازرہ کرم سٹیج پر تشریف لائیں....."

اب قارئین بتائیں کہ جوش صاحب نے رالف رسل کے لئے جو کہہ دیا، جس طرح ان کا تعارف کرادیا اس کے بعد ہم کیا کہیں؟ سوائے اس کے کہ ان کی زندگی کے کچھ واقعات بتائے جائیں۔

رالف رسل 1918ء میں پیدا ہوئے۔ سینٹ جان کالج، کیمرج سے 1940ء میں ڈگری حاصل کی اور فوج میں بھرتی ہوکر ہندوستان چلے گئے جہاں برطانیہ کے لئے لڑنے والی ہندوستانی فوج کے ساتھ رہ کر انہوں نے خود کو اردو سے وابستہ کرلیا۔ رالف رسل کا یہ فیصلہ وقت کی ضرورت بھی تھا اور حکومت برطانیہ کی غرض وغایت بھی۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو رالف رسل نے 1949ء میں لندن کے سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹیڈیز School of Oriental & African Studies سے اردو کی ڈگری حاصل کی اور وہیں شعبہ اردو میں ملازم ہوگئے۔ یہاں تک کہ "ریڈر" مقرر ہوئے۔ رالف رسل نے کم وبیش تیس سال تک اس یونیورسٹی میں اردو کا پرچم بلند کئے رکھا اور 1981ء میں قبل از وقت سبکدوشی (Retirement) حاصل کرلی۔

رالف رسل کا نام انسائیکلوپیڈیا برطانیکا Encyclopaedia Britannica میں اردو زبان کے حوالے سے شامل ہے۔ انہوں نے اردو پر بیشمار تحقیقی مقالے لکھے ہیں جو اردو کے معتبر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی ہر کتاب اردو کیلئے اہم کتاب ہے۔ مثلاً" (1) تین مغل شاعر Three Mughal Poets (2) غالب: حیات اور خطوط Ghalib; Life&Letters یہ دونوں کتابیں ہاورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیں۔ سن اشاعت 1968ء اور 1969ء ہے۔ پھر ان کتابوں کو 1991ء اور 1994ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی نے شائع کیا۔ دراصل تحقیقی امور میں رالف رسل اور خورشید الاسلام کی رفاقت (Partnership) اردو زبان وادب کے لئے نیک فال ثابت ہوئی۔ ان کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ غالب پر جلد دوم اشاعت کے لئے تیار ہے جس میں حیات غالب کے ساتھ ساتھ غالب کی غزلوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ رالف رسل نے اردو تدریس کے لئے بھی کتابیں لکھی ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد رالف رسل Teaching Meterial پر تحقیق میں لگے ہیں۔ ان کے بتائے ہوئے طریقہ تدریس اور اردو پڑھانے کے لئے نصاب کی مقبولیت نے رالف رسل کو اردو کے حوالے سے ایک ممتاز مقام دیا ہے۔میں ایک کتاب کا نام بتاؤں The Pursuit of Urdu Literature ایسی کتاب ہے جسے رالف رسل اپنی زندگی بھر کی کمائی کا نچوڑ کہتے ہیں۔ رالف رسل کا دائرہ کار برطانیہ یا برصغیر تک محدود نہیں رہا بلکہ شمالی امریکہ تک پھیلا ہوا ہے۔ دسمبر 1997ء میں غالب کی فارسی غزلوں کا انگریزی ترجمہ رالف رسل نے کیا ہے اور اردو ترجمہ افتخار احمد ایڈوکیٹ کی کاوش ہے۔ مستقبل قریب میں رالف رسل کی تازہ کتاب جو غالب کی اردو اور فارسی غزلوں کے ترجمے پر مشتمل ہے اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچنے والی ہے۔ ان کی تازہ ترین تصنیف جون 1999ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی نے شائع کی ہے جو اردو ادب پر سیر حاصل تبصرے اور دیگر مقالات پر مشتمل ہے۔

ڈی ٹربیون (The Tribune) کی 19 جون 1999ء کی اشاعت میں معروف صحافی خشونت سنگھ نے لکھا ہے کہ "رالف رسل کے علاوہ بھی غیر ملکی لوگ ہوسکتے ہیں اور موجود ہیں جنہوں نے اردو زبان سیکھی ہے، حتیٰ کہ اردو زبان میں اضافہ بھی کیا ہے لیکن رالف رسل نے صرف زبان سیکھنے تک اردو میں دلچسپی نہیں لی بلکہ ان لوگوں سے ربط ضبط بڑھایا ہے جو اہل زبان تھے یا ہیں۔ اس طرح زبان وادب کی اساس تک ان کی رسائی ہوئی اور انہوں نے اردو زبان وادب کے مزاج کو سمجھا ہے، یہی بات انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔"

اب میں عالی صاحب سے کی گئی گفتگو کی روشنی میں پروفیسر رالف رسل کی اردو کیلئے کی گئی خدمات کا ذکر کروں گی۔ محترم جمیل الدین عالی نے اس ضمن میں اپنا خاصا قیمتی وقت عنایت کیا اور بے حد محبت سے وہ رالف رسل کا ذکر کرتے رہے۔ اس ضمن میں انہوں نے حکومت پاکستان کے

ارباب اختیار کی ناقدری کا ذکر بھی بے خوف انداز میں کیا۔ انہوں نے بتایا کہ "رالف رسل یورپ، انگلستان اور شمالی امریکہ کے "بابائے اردو" کہلاتے ہیں۔ کیونکہ مستشرقین میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں گارساں رتاسی تھے جن کے اردو میں خطوط اور مقالے ہم نے یعنی انجمن ترقی اردو نے شائع کئے ہیں۔ ان کے بعد اردو سے اتنا شغف رکھنے والا اور اسے پھیلانے والا رالف رسل سے بڑا کوئی اور آدمی نہیں گزرا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم انکی قدر نہیں کرتے کیونکہ ہمارے ہاں "ناقدری" تو ہماری روایت بنتی چلی جارہی ہے۔ رالف رسل کو آج تک ہماری طرف سے ستارہ امتیاز، تمغہ امتیاز، پرائڈ آف پرفارمینس یعنی تمغہ خدمت کچھ تو ملنا چاہیے تھا۔ لیکن کون دے؟ اس کا کوئی چچا ماموں ارباب اختیار میں بیٹھا ہوتا تو مل جاتا۔ میں نے تین چار بار Recomand کیا۔ اور دو چار بار کے بعد کوئی کر بھی نہیں سکتا۔ رالف رسل خود اس بارے میں بے نیاز ہے۔ فقیر منش آدمی ہے، کبھی کسی کمشنر، کسی وزیر کے پاس نہیں جائے گا۔ اسے کسی جشن اور سیمنار میں بلاؤ تو کہہ دیتا ہے مجھ پر جو رقم خرچ کررہے ہو مجھے دے دو تو میں "اردو" کے لئے کچھ اور کام کرلوں گا۔ کوئی بہت ضروری سیمنار ہو تو آجائے گا۔ جیسے فیض کے سیمنار میں لکھنؤ آیا تھا۔ ہاں میں مرجاؤں تو شاید آجائے۔"

درمیان درمیان میں عالی صاحب کے فون آتے رہے۔ میں متوجہ تھی۔ وہ کہنے لگے۔ "وہ فقیر منش آدمی ہے۔ پکا استاد ہے۔ زندگی تدریس میں گذاری ہے۔ اسی طرح عقیدے سے پکا کمیونسٹ ہے۔ برٹش کمیونسٹ پارٹی کا غیر فعال رکن ہے۔ اس کی کمیونسٹ پارٹی سے بھی نہیں بنتی۔ اپنے بارے میں پچاس صفحات کی 'پورے پچاس سال کے کمیونسٹ ہونے کی یادگار روداد اور حالات لکھے ہیں اس نے لکھا ہے۔ "میں کیوں کمیونسٹ ہوا۔ کیا حالات تھے۔" وہ آپ کو دیگر کمیونسٹوں سے مختلف ملے گا۔ صاف اور سنجیدہ۔

میں نے عالی صاحب سے پوچھا۔ "پروفیسر رالف رسل کو اردو زبان سے لگاؤ کس طرح ہوا؟"
عالی صاحب نے بتایا رالف دوسری جنگ عظیم (1942ء) میں ہندوستانی فوج میں بھرتی ہو کر آیا تھا۔ اس نے "برما وار" (Burma War) میں حصہ لیا۔ وہیں سے اسے اردو سے لگاؤ ہوا جو بڑھتے بڑھتے عشق کی منزل تک پہنچا۔ رالف جب فوج سے علیحدہ ہوا تو سیدھا علی گڑھ پہنچا۔ وہاں اردو پڑھی۔ پھر لاہور اور کراچی آکر بھی اس نے اردو سیکھی۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام ان کے ایسوسی ایٹ رہے۔ پھر رالف لندن یونیورسٹی میں اردو کے لکچرار کی حیثیت سے پڑھانے لگے اور اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے دو کارنامے ہیں۔ ایک علمی اور دوسرا مہماتی۔ جس کی وجہ سے یہ "بابائے اردو" کہلائے جاتے ہیں۔ یہ مہم تھی اردو پڑھانے کی۔ انگلستان میں تعلیم مرکزی حکومت کی ذمہ داری نہیں بلکہ کاؤنٹی کی ذمہ داری ہے۔ جیسے ریاست سے ریاست اور صوبے سے صوبے تک۔ مگر کاؤنٹی اسکولوں میں "اردو" نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ یہ بات

75-76-77ء کی ہے۔ رالف رسل نے اپنے ہم خیال لوگوں کو جمع کیا۔ اردو کے کورسز منتخب کئے۔ ادھر ادھر سے رقم جمع کی۔ اس وقت بی سی سی آئی (بینک آف کامرس) قائم ہوا تھا اس نے کچھ مدد کی۔ مگر انہوں نے کسی ہائی کمیشن (پاکستان سمیت) کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور چار سال پہلے کی میری آخری اطلاعات کے مطابق 27 کاؤنٹیز میں اردو کے اسکول قائم کئے۔ جہاں پانچ سات اردو پڑھنے والے لڑکے جمع ہوئے وہاں انہوں نے اردو پڑھانے کا انتظام کیا۔ اس طرح اردو جاننے والوں کو جو برطانیہ گئے تھے تدریسی ملازمتیں بھی ملیں۔ یہ رالف رسل کی مہم تھی اور یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ بھی ہے۔ اور مزے کی ایک بات اور سنو کہ رالف رسل ابھی بھی اپنی اردو کو up to date کرنے کے لئے اور اسے منقل کرنے کے لئے ہر دو سال بعد علی گڑھ جاتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر کراچی لاہور بھی آجاتے ہیں۔ گو اب 80 سال سے اوپر ان کی عمر ہو گئی ہے مگر ان کی لگن نے ان کو چاق و چوبند رکھا ہوا ہے۔"

اب گفتگو کا رخ رالف رسل صاحب کے کاموں کی جانب ہوا۔ عالی صاحب بتا رہے تھے کہ ہاورڈ میں ایک درانی صاحب تھے یہ چالیس سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ انہوں نے کتنی رقم مختص کی مگر ایک رقم مختص کر کے انہوں نے ہاورڈ یونیورسٹی یا یونیسکو سے کہا کہ آپ اس سے غالب پر کام کرائیے۔ انہوں نے رالف رسل سے رابطہ کیا۔ رالف نے غالب ٹرانسلیشن پروجیکٹ بنایا۔ اس ضمن میں انہوں نے مغل دور کے تین شعرا کی شاعری کے ترجمے کے کام کا پروگرام بھی بنایا اور اسے Three Mughal Poets کا نام دیا۔ یہ مغل دور کے تین شعرا تھے میر تقی میر، میر حسن اور سودا۔ اپنی معاونت کے لئے اور فارسی سے اردو میں ترجمہ کے لئے انہوں نے خورشید الاسلام کو بلا کر لندن رکھا۔ رالف بھی فارسی جانتے تھے مگر خورشید فارسی پر دسترس رکھتے تھے۔ یہ کتاب یونیسکو کی مطبوعات میں سے ہے اور انگریزی میں ہے، شاید ہندوستان میں اس کا اردو ترجمہ ہوا ہو مجھے معلوم نہیں۔

رالف نے اس کے بعد غالب کے فارسی خطوط کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ کئی برس تک وہ اسی کام میں لگے رہے۔ یہ بڑا زبردست کام تھا کہ غالب کے خطوط انگریزی زبان کے ذریعے بین الاقوامی اور عالمی ادب میں شامل ہوئے۔ اس دوران انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے لئے Plattse ڈکشنری جو موجودہ صدی کے آخر میں آئی تھی مرتب کی۔ اس میں ہندی کے الفاظ بھی تھے جو ہمارے ہاں رائج ڈکشنری سے نکال دیئے گئے۔ بڑی جامع اور زبردست ڈکشنری تھی وہ۔ یہ کام انہوں نے خورشید سے کرایا۔ اسے آکسفورڈ میں ملازمت دلائی۔ انہوں نے اس کے لئے خورشید کو لندن میں آباد کرا دیا تھا وہاں خورشید کو گھر دلوایا۔ بعد میں خورشید تو ہندوستان چلے گئے، مگر ان کے بچے وہیں مستقل قیام کر گئے۔ مگر خورشید نے رالف کو دھوکا دیا۔ بڑی تکلیف پہنچائی۔ حالانکہ خورشید بڑے سلجھے ہوئے آدمی ہیں۔ عمر ہو گی کوئی 85 سال۔ اپنے وقت کے بڑے مشہور اور مستند ادیب ہیں۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں جناب ابو الیث قریشی صاحب کے آجانے کے بعد وہی تھے اور ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ تھے۔ اب تو ریٹائرڈ ہوگئے ہیں۔ رالف چونکہ انگریزی پر دسترس رکھتے ہیں اور خورشید فارسی اور اردو پر۔ لہٰذا رالف نے غالب کی فارسی شاعری کا انگریزی میں ترجمہ شروع کیا۔ غالب کے خطوط کے ترجمے کے دوران یہ دونوں ہندوستان بھی آتے جاتے رہے۔ ایک منزل میں 'میں بھی ان کے ساتھ گیا ہوں۔ کئی بار انگلینڈ بھی گیا ہوں۔ ہم نے ان موضوعات پر تبادلۂ خیال بھی کیا ہے۔"

"عالی صاحب" میں نے ان سے پوچھا۔ "خورشید صاحب اور پروفیسر رالف کے درمیان اختلافات کی وجوہ کیا تھیں؟"

"بھئی یونیسکو سے ان کا معاہدہ تھا کہ اس کتاب پر دونوں کا نام آئے گا۔ تو اب خورشید کا کہنا تھا کہ ان کا نام پہلے آئے اور رالف چاہتے تھے کہ ان کا نام پہلے آئے۔ بس اسی بات پر تنازعہ بڑھ گیا۔"

"بس اتنی سی بات پر۔ برسوں کے یارانے گئے" میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"اسے تم اتنی سی بات کہہ رہی ہونا۔ یہ تو اسکالروں کا تنازعہ تھا۔ تخلیقی لوگوں میں تو یہ ہوتا ہے مگر اسکالری میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔" عالی صاحب نے مجھے سمجھایا اور مجھے پھر نظیر اکبر آبادی یاد آگئے کہ۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

رہے نام اللہ کا۔ باقی سب تو میرے نزدیک حرص وہوس ہے جسے بہرحال ایک حد میں رہنا چاہیے کہ یہ بھی جبلت ہے۔ مگر یہ کام میں حارج ہو تو اس جذبے کی بیخ کنی بہت ضروری ہے۔

"پھر کیا ہوا۔" میں نے عالی صاحب سے پوچھا۔ "آپ کس کے حق میں تھے.....؟"

میں نے رالف کا ساتھ دیا۔ یونیسکو سے معاہدہ تھا دونوں کے نام ساتھ آئیں۔ اور یہاں "پہلے اور بعد" کے چکر میں چھ سات برس بیت گئے تو میں نے یہ کام افتخار احمد عدنی کے سپرد کردیا۔ اب وہ اس کا اردو ترجمہ بھی ساتھ ہی کررہے ہیں۔ کتاب کمپوزنگ کے مراحل میں ہے اور انشاء اللہ جون 2000ء تک شائع ہوجانی چاہیے۔

"اب پہلے کس کا نام آئے گا؟ میرا سوال تھا۔

"رالف کا نام پہلے آئے گا۔" عالی صاحب کا جواب تھا۔ "رالف اس کے پروف پڑھ رہے ہیں اور مقدمہ بھی وہی لکھیں گے۔"

"عالی صاحب۔ اب یہ بھی بتاتے چلیئے کہ آپ کی رالف رسل صاحب سے ملاقات کب اور کیسے ہوئی.....؟"

"یہ سن 61ء کی بات ہے۔ میں یونیسکو کی دعوت پر لندن پیرس اور امریکا بھی گیا تھا۔ رالف

میرے نام سے واقف تھے۔ ان سے میری ملاقات لندن کے اورینٹل کالج میں ہوئی۔ خورشید نے بھی ان کا ذکر مجھ سے کیا تھا۔"

"آپ نے اپنے اور ان کے مزاج میں کیا قدر مشترک پائی؟"

"کئی باتوں میں ہم آہنگی تھی" عالی صاحب نے کہا۔ "ان میں سے ایک اچھا کھانا کھانے کی عادت بھی شامل ہے۔ تم نے بھی تو ہمیں کبھی پائے کھلائے تھے۔ یاد ہے نا...." عالی صاحب مسکرائے۔

"یاد ہے۔ کیا آپ اب بھی اچھے کھانے کے شوقین ہیں؟ میں نے پوچھا۔

"ہیں تو۔ مگر اب کھایا نہیں جاتا....."

رالف صاحب سے آپ کے کبھی اختلافات بھی ہوئے؟

"اختلافات تو ہوتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے پر غصہ بھی کرتے ہیں۔ نفیس گالیوں کا تبادلہ بھی ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے فلیٹ کی چابی مجھے دے رکھی ہے۔ میں جب جاتا ہوں وہیں قیام کرتا ہوں۔ رالف کا ایک چھوٹا سا گھر ہے ایک کمرہ' کچن اور باتھ روم پر مشتمل ہے۔ ایک صوفہ رکھا ہے۔ اور ہر طرف کتابیں ہی کتابیں ہیں۔ وہی کتابیں کبھی کبھی بستر بھی بن جاتی ہیں۔ یہی تو ہوتی ہے ایک پڑے لکھے اور عالم شخص کی کائنات....." عالی صاحب چپ ہو گئے۔ اور میں رالف رسل کے تصور میں گم تھی۔ الفاظ کی تلاش میں تھی کہ اس عالم کو خراج تحسین پیش کروں اور اپنی پہلی فرصت میں اسے جا کر سنوں کہ وہ میری پیاری زبان "اردو" کس طرح بولتے ہیں.....!

MR. RALF RUSSEL
33 THEATER STREET,
LONDON SW II 5ND U.K.

محترم رالف رسل

کی اردو تحریر

جملہ اشعار مندرجہ میں مشارٌ الیہ ذاتِ خداوندی ہے۔

سکونِ قلب خدا دے کہ میں قبول کروں

وہ ساری باتیں جنہیں میں بدل نہیں سکتا

بدل سکوں جنہیں بدلوں خدا وہ ہمت دے۔

جو فرق ان میں ہے اس کو بھی میں سمجھ پاؤں

The above is a translation into Urdu verse of the prayer:

> God give me the serenity to bear the things I cannot change, the courage to change the things I can change, and the wisdom to know the difference.

The translation was made at my request by my friend Khalid Hasan Qadiri. The handwriting is mine.

Ralph Russell

19 October 1999 رالف رسل

سب سے بڑا تماشہ تو میں ہی تھا ۔۔ جو کئی بڑی بڑی شخصیتوں اور
ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو دیکھنے کی طرح جانچتا رہتا تھا۔۔۔۔

۱۲ - نومبر ۹۹ء ، ٹورنٹو

رحیم انجان
ٹورانٹو

افسانہ نگار رحیم انجان کے نام سے مجھے جناب حمایت علی شاعر نے متعارف کرایا۔ پتہ محترم پروفیسر عبدالقوی ضیاء نے دیا۔ میں نے انہیں "گفتنی" کا سوالنامہ بھجوایا۔ موصوف کی جانب سے کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر ٹورنٹو میں ایک ملاقات کے دوران انہوں نے اپنی کوتاہی کے لیے معذرت چاہی، میں نے بھی انہیں معاف کر دیا۔ اس لیے کہ اس ایک خرابی کو چھوڑ کر ان میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ ہم دونوں ایشین نیوز کے ایڈیٹر لطافت علی صدیقی اور فوٹو گرافر حسن بوزئی کی دعوت پر ان سے ملنے جا رہے تھے۔ لطافت اور حسن دونوں ہمارے کراچی کے صحافی ساتھی ہیں۔ لطافت کراچی سے جدہ عرب نیوز میں چلے گئے اور حسن بوزئی خلیج ٹائمز دبئی میں۔ پھر دونوں کب کینیڈا آئے پتہ نہ چلا۔ لطافت اور فرزانہ شبیر ہماری صحافی دوست سے تو اشفاق کے گھر عشائیے پر ملاقات ہو گئی اور حسن کا نام ہم نے رحیم انجان کے اخبار "ملاقات" کی ایک تصویر کے نیچے لکھا دیکھا۔ پھر لطافت نے ہمیں کھانے پر مدعو کیا تو رحیم انجان نے طبیعت کی خرابی کے باوجود ہمیں ان کے گھر لے جانے کی ذمہ داری اٹھائی۔ ایک گھنٹے کے سفر میں ان

سے جو گفتگو ہوئی اور ہمارے سوالوں کے جواب جو انہوں نے لکھ کر دیے آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔

ان کا نام عبدالرحیم ہے۔ قلمی نام رحیم انجان۔ ۱۵ نومبر ۱۹۳۸ء کے دن پنجیرہی (آزاد کشمیر) کے ایک ملازمت پیشہ غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ رحیم بتا رہے تھے۔ "والد صاحب کی قبل از وقت وفات کے سبب تعلیم ادھوری چھوڑ کر خود کو غم روزگار کے بھاڑ میں جھونکنا پڑا۔ بہتر سے بہتر اور خوش حال زندگی کی جستجو ۱۹۶۱ء میں بیمہ فروشی (انشورنس سیل) کے کاروبار میں لے آئی۔ ستمبر ۱۹۷۲ء میں کینیڈا آ گیا اور یہاں بھی دسمبر ۱۹۹۱ء تک سن لائف آف کینیڈا میں بیمہ فروشی کا کام کرتا رہا۔ ۱۹۷۶ء میں ٹورنٹو سے ایک فیملی میگزین کا "ملاقات" کے نام سے اجراء کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ٹورنٹو میں شعر و سخن کی محفلیں ادبی ذوق رکھنے والے احباب کو اکٹھا کر کے گھروں میں یا زیادہ سے زیادہ کسی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے پارٹی روم میں سجائی جاتی تھیں۔ اور پاک و ہند میں چھوڑی ہوئی شعر و سخن کی محفلوں کی یاد تازہ کر لی جاتی تھی۔ لیکن شعر و سخن کی محفلوں کو کمیونٹی سطح پر عوامی جلسہ گاہوں میں سجانے کا اہتمام ۱۹۷۶ء کی آخری سہ ماہی میں ماہنامہ "ملاقات" نے "شام ملاقات" کے نام سے شروع کیا۔ جس کا ذکر ٹورانٹو کے قد آور شاعر جناب عابد جعفری نے 'لندن انگلینڈ میں سید عاشور کاظمی صاحب کے ترتیب دیے ہوئے افسانوں کے مجموعے "افسانہ کہیں جسے" میں راقم کے تعارف میں کیا ہے۔

جب "شام ملاقات" کا سلسلہ (چوں کہ میں خود نہ تو شاعر ہوں اور نہ ہی نظامت کا شوق رکھتا ہوں) بے لوث خدمت ادب کے حوالے سے مشہور ہو گیا تو ۲۸ ستمبر ۱۹۷۸ء کے دن جناب فیض احمد فیض کینیڈا میں پہلی بار "ملاقات" ہی کی دعوت پر تشریف لائے... اور راقم کے غریب خانے پر ایک ماہ اور تین دن قیام کے دوران منظم ہو کر کام کرنے کا مشورہ دے کر "اردو انجمن کینیڈا" کی بنیاد رکھ گئے گویا کہ بین الاقوامی مشاعروں کے لیے راستہ کھول گئے۔"

سوال نمبر ۲ کے سلسلے میں عرض ہے کہ میری ذاتی پسند کے مطابق جناب احمد ندیم قاسمی' احمد فراز' علی سردار جعفری' راجندر سنگھ بیدی' ڈاکٹر وزیر آغا' انتظار حسین' منشا یاد' عبداللہ حسین اور کئی ایسے شاعر اور ادیب موجود ہیں جنھوں نے بیسویں صدی کے دامن پر اپنی فکر مندانہ تخلیق کے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

سوال نمبر ۳ کے جواب میں کہوں گا کہ جدیدیت نے بلاشبہ کہانی کو نقصان پہنچایا ہے۔ ادب لطیف کے رموز پر نظر رکھنے والوں کے لیے سنجیدہ کہانی ایک انتہائی لطیف فن ہے۔ لیکن ایک عام قاری اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا عام قاری اپنے تھکے ماندے ذہن کو کوئی رس بھری

کہانی سنا کر دن بھر کی کلفتوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔
میری ذاتی رائے کے مطابق (جس سے آپ کا متفق ہونا ضروری نہیں) روزمرہ کے مسائل میں گھرے ہوئے ایک عام قاری اور دادی یا نانی اماں کی گود میں بیٹھ کر جنوں و پریوں کی کہانیاں سننے والے بچے میں کوئی فرق ہے تو بس یہ کہ ایک کہانی سنتے سنتے سو جاتا ہے اور دوسرا کہانی کے تاثر میں کھو کر دن بھر کی کلفتوں سے چھٹکارا چاہتا ہے۔ لیکن جب اسے اشاروں کنایوں اور علامتوں میں گھری ہوئی کہانی کو تلاش کرنا پڑتا ہے تو کہانی کے ساتھ اس کی دلچسپی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ نتیجے میں وہ کہانی صرف انٹیلیکچول طبقے تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس کا سب سے زیادہ نقصان ادیب کو ہوتا ہے۔ وہ اس لیے کہ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا طبقہ کتاب خرید کر پڑھنے کو اپنی عالمانہ قد و قامت کی نفی قرار دیتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ جدیدیت نے سیدھی سادی کہانی کے دل نشیں اور عام فہم فن کو نہ صرف مجروح کیا ہے بلکہ اس کی ترقی کے راستے میں بھی حائل ہوئی ہے۔ سیدھی سادی کہانی کو علامتوں کی گرفت سے آزاد کرانے اور مطالعے کو تفریح کا سستا ذریعہ بنانے کی اشد ضرورت ہے۔
ناول کم اس لیے لکھے جاتے ہیں کہ ناول لکھنا کہانی کے پھیلاؤ کے سبب زیادہ توجہ کا حامل اور کل وقتی کام ہے۔ اور ہمارے ہاں پڑھنے کا رجحان شروع ہی سے آٹے میں نمک کے برابر رہا ہے اور اب ٹی وی آجانے کے بعد تو آٹے میں نمک کا مستقبل بھی زوال پذیر ہے۔ ایسے میں کوئی ناول کیوں اور کس لیے لکھے؟ آخر لکھنے والے کا پیٹ اپنی برادری کے چند دانشوروں کی تعریف سے تو نہیں بھر سکتا نا... ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ناول اکثر نوجوان طبقے ہی میں پڑھے جاتے رہتے ہیں اور آج کا نوجوان طبقہ، پندرہ بیس سال پہلے کے نوجوان طبقے کی طرح اپنے حال اور مستقبل سے مطمئن نہیں ہے۔ ادیب ہو یا شاعر جب اس کے پاس عزت بھی ہو۔ شہرت بھی ہو لیکن اپنی عزت و شہرت کے مطابق خوش حالی نہ ہو۔ ادبی محفلوں میں اس سے محفل کی صدارت کرائی جائے۔ لیکن جب گھر میں داخل ہو تو بیوی بچوں کے چہروں پر سو سو سوال اس کا استقبال کریں۔ آنکھوں میں مطالبے اور احتجاج اس کے لیے آئینہ بن جائیں تو ایسے حالات میں ادیب کا مادی، ذہنی، نفسیاتی اور روحانی بحران کا شکار ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔
ادبا و شعرائے کرام کی بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے صرف یہی ہو سکتا ہے کہ معاشرے میں پڑھنے کا رجحان عام کیا جائے۔ اور ناشران کتب کے لیے دعا کی جائے کہ اللہ انہیں نیکی اور ادبا و شعرائے کرام سے مخلصانہ ہمدردی کی توفیق عطا فرمائے۔ خرید کر پڑھنے کے حوالے سے آپ کے سوال نمبر ۹ کے جواب میں ایک دلچسپ قصہ عرض کروں گا۔ اور ادبا و شعرائے کرام کے بہتر زندگی بسر کرنے کے حوالے سے چند باتیں اس سوال کے موضوع سے ہٹ کر کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

میں ۵۵ء سے لکھ رہا ہوں۔ شمع لاہور، تہذیب لاہور، مست شباب لاہور اور ساغر کراچی میں کئی افسانے شائع بھی ہوئے جب ۱۹۶۱ء میں انشورنس کا کام شروع کیا تو بہتر زندگی کے پیش نظر لکھنے کے شوق کو ترک کر کے تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز کر دی۔ میں اگر لکھنے کا شوق جاری رکھتا تو صرف مجھے عزت و شہرت ملتی لیکن میں نے جو راستہ چنا اس سے سارے گھر کو خوش حالی ملی۔ سکھ کی نیند ملی۔

یہاں ٹورنٹو میں بھی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ جن لوگوں نے اپنی گرہ سے خرچ کر کے اپنی کتابیں شائع کرائی ہیں۔ وہ صاحب دیوان شاعر اور صاحب کتاب ادیب کہلاتے ہیں۔ ان کی ایک پہچان بن جاتی ہے ان کے ساتھ شامیں منائی جاتی ہیں۔

میں ۸۷ء میں پاکستان گیا۔ اردو ڈائجسٹ والے ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی میرے انتہائی مہربان دوست ہیں انہوں نے کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل کتاب کی پانچ ہزار کاپیوں کے لیے جو قیمت مانگی وہ بہت کم تھی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ اپنے اثر و رسوخ اور ڈائجسٹ میں اشتہار لگا کر کچھ کاپیاں فروخت بھی کرا دیں گے۔ انتہائی دوستانہ پیش کش تھی۔ میں نے رات بھر سوچا۔ میرے دل نے جو فیصلہ دیا وہ یہ تھا کہ میں ان ہی پیسوں سے اپنی بیوی اور بیٹی کے لیے تحائف خرید کر لے آیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں میری بیوی نے میرے اس فیصلے کی بہت مخالفت کی۔

معیاری ادب کے پیمانے ہیں انسان دوستی، امن کا پیغام اور سچائی کی آبیاری، معاشرے کی ڈھکی چھپی برائیوں کو بے نقاب کرنے کی ضرورت کا اہتمام اور درد مندانہ جرات مندی کے ساتھ انسانی مسائل کی نشاندہی۔

گو کہ معاشرے کی ڈھکی چھپی برائیوں کی نشاندہی کا عمل بڑا مشکل اور رسوا کن ہے۔ سعادت حسن منٹو کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ساری عمر رسوائیوں کا شکار ہونے والے منٹو کے خلاف آج چار سو ایک آواز بھی سنائی نہیں دیتی اور وہ افسانے کا باپ کہلاتا ہے۔ ٹورنٹو میں مقیم ڈاکٹر خالد سہیل معاشرتی برائیوں کی دلدل میں کھڑے ہو کر کاغذی تہذیب کا پرچار کر کے منافقت جیسی برائی کا مرتکب نہیں ہوتے۔

برائی کو جڑ سے ختم کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ برائی کو اس کے اصل روپ ہی میں پیش کیا جائے۔ اسلام میں سچ بولنے کی تلقین کر کے مسلمانوں کو اسی عمل کی طرف لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ٹورنٹو ہی میں مقیم اشفاق حسین بھی اسی قبیلے کے انسان ہیں لیکن سچ بولنے اور برائیوں کی نشاندہی کرنے کے حوالے سے ان کا لب و لہجہ ان کے شاعرانہ ذوق کے پیشوا فیض احمد فیض کی طرح دھیما ہے۔

تم سمجھتے ہو

آنکھوں پہ اک سبز عینک لگا کر
یہ بے سبزہ میدان
سر سبز و شاداب بن جائیں گے

اردو زبان میں انگریزی کی آمیزش کے متعلق آپ کا یہ سوال سائنسی علوم کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور کسی حد تک درست بھی ہے۔ لیکن عام اور خصوصاً معاشرتی موضوعات کے لیے اردو خاصی وسیع الدامن زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے لکھنے والوں کے ہاں خصوصاً ادبی مضامین میں انگریزی کے الفاظ بہت کم نظر آتے ہیں لیکن جن انگریزی الفاظ کا اردو میں کوئی عام فہم نعم البدل نہیں ہے وہ اب بھی استعمال ہوتے ہیں مثلاً "کمیونٹی' موڈ اور بور وغیرہ۔ جن تحریروں میں انگریزی کے الفاظ استعمال نہیں ہوتے وہ خالصتاً ادبی زبان دانی کی علمبردار تحریریں ہوتی ہیں جنہیں عام قارئین نہیں پڑھتے۔ عام قارئین کے لیے افسانے اور کہانیاں ہوتی ہیں جن کی زبان ادیب کی زبان نہیں۔ تخلیق کردہ کرداروں کی زبان ہوتی ہے ایک افسانے کا کردار اپنے افسانوی کردار کے مطابق کسی جھجک و حجاب کے بغیر فل ٹائم جاب یا پارٹ ٹائم جاب جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ لیکن یہی الفاظ اگر ہمارا کوئی ادیب اپنے کسی ادبی مضمون میں استعمال کرے گا تو پھر اس کی زبان دانی پر الزام آئے گا۔

اب میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ سنیے۔ اگست ۱۹۹۷ء میں پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر میں نے ایک پاکستانی مصور سے قائداعظم کی ایک تصویر بنوائی اور تصویر کے دائیں و بائیں دونوں اطراف پاکستان کے چاروں صوبوں کی تہذیبی جھلکیاں پیش کیں۔ اور قدرے بہتر کاغذ پر فل کلر میں اگست ۹۷ء کا "ملاقات" شائع کر دیا اور اس کی قیمت ۹۰ سینٹ رکھ دی۔ ایک دن میں یہاں کے انڈیا بازار میں پان کی ایک دوکان پر کھڑا تھا۔ ایک صاحب آئے انہوں نے دوکاندر سے پانچ پان بنانے کے لیے کہا اور ہاتھ بڑھا کر "ملاقات" کی ایک کاپی اٹھائی۔ وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے جی بھر کر "ملاقات" کی تعریف کی جتنی دیر دوکاندار پان بناتا رہا وہ "ملاقات" کو الٹ پلٹ کر دیکھتے اور تعریف کرتے رہے۔ یہاں تک کہا کہ "ملاقات" میں پڑھنے کا مواد تو ہمیشہ ہی معیاری ہوتا ہے لیکن اس بار تو رحیم انجان صاحب نے قائداعظم کی فل کلر میں تصویر لگا کر بڑا خرچ کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہاں پان ایک ڈالر کا ملتا ہے جب پان بن گئے تو انہوں نے "ملاقات" کو بغل میں دباتے ہوئے جیب سے والٹ نکالا اور پانچ ڈالر نکال کر دوکاندار کی طرف بڑھائے۔ دوکاندار نے کہا جناب ایک ڈالر اور دیجئے! کیوں؟ ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے کیا پان کی قیمت بڑھا دی؟ نہیں اس بار "ملاقات" کی قیمت ۹۰ سینٹ رکھی گئی ہے! دوکاندار کا یہ جواب سن کر انہوں نے ایک لمبی سی "او" کے ساتھ "ملاقات" واپس رکھ دیا اور منہ میں پان رکھ کر چلتے بنے۔

ہاں جناب! تنقید ایک مشکل اور اچھے خاصے مطالعے پر مشتمل کام ہے بے لوث اور عالمانہ تنقید مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔ لیکن تنقیدی ادب کا خریدار ہزاروں میں کوئی ایک بھی مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ مالی خسارے کے علاوہ ان ادیبوں اور ان کے مداحوں کی ناراضگی الگ پلے پڑتی ہے جن پر تنقید کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید نہ ہونے کے برابر لکھی جا رہی ہے اور جو لکھی جا رہی ہے وہ بھی گروپ بندیوں کا شکار ہے۔ جس کی تفصیل ناخوش گوار بھی ہے اور طویل بھی۔

پاکستان میں علاقائی زبانوں کے تراجم کے فقدان سے اردو کو یقیناً نقصان ہو رہا ہے۔ سب سے بڑا نقصان تو یہی ہے کہ اردو والوں کو معلوم ہی نہیں کہ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب میں کیا کیا لکھا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہم اردو والوں کو اپنی ناک سے آگے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

اردو پاکستان کی قومی زبان ہے۔ جو چاروں صوبوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی قدر و منزلت چاروں صوبوں میں ہے۔ لیکن کسی صوبائی زبان کے ادیب یا شاعر کی کیا قدر و منزلت ہے؟ ہم اپنی لاعلمی کے سبب نہ صرف اس سے بے نیاز ہیں بلکہ اپنے مقابلے میں اسے کچھ سمجھتے ہی نہیں اور ہماری یہ بے نیازی اردو کے لئے تعصب کی راہیں ہموار کر دیتی ہے جس کے پیش نظر ایک دوسرے کی ادبی کاوشوں سے آگاہی' صرف ادبی ضرورت ہی نہیں قومی یکجہتی و خیر سگالی کے لیے ایک اہم ضرورت بھی ہے۔ کاش ہم اس کی ضرورت کو سنجیدگی سے محسوس کر سکیں۔"

MR. RAHEEM ANJAN
188 CHESTER BLVD. SCARBOUGH.
ONT. MIW 2M9 CANADA

جب دنیاداری کا سلیقہ نہ ہو اور درویشی کا ظرف نہ ہو تو آدمی
سدا بیچ ہی میں ڈولتا رہتا ہے

رشید امجد

۲۲ اکتوبر ۹۹ء

ڈاکٹر رشید امجد
راولپنڈی

ڈاکٹر رشید امجد کو میں نے اب تک دیکھا نہیں ہے۔ ان کا تعارف میرے سامنے ہے۔ اس میں ان کی تصویر منسلک نہیں۔ میں نے کل ہی انہیں ان کے راولپنڈی کے پتے پر خط لکھا ہے۔ ابھی تصویر نہیں آئی مگر میں نے انہیں دیکھ لیا ہے۔ میرے سامنے "مزاحمتی ادب اردو" کی ۵۹۳ صفحات پر مشتمل ضخیم جلد ہے جس کے صفحہ ۱۹۴ پر ڈاکٹر رشید امجد میرے سامنے ہیں۔ "بنجر لہو منظر" کے عنوان سے۔ ان کی تحریر بھی سامنے ہے۔ "رات شہر کے گرداگرد کنڈل مارے بیٹھی ہوئی ہے اور شہر جو کبھی تھا۔ (اب خیال آتا ہے کہ شاید کبھی بھی نہیں تھا) اندھیرے میں بتاشے کی طرح گھل رہا ہے۔ میں اپنے گھر میں 'اپنے کمرے میں 'اپنے بستر پر چادر اوڑھے لیٹا ہوں۔ اس شہر میں اب انسانوں پر دوسرے حکومت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اب اسے ان کا شہر کہنا مناسب ہوگا۔ ان کا خیال ہے انسان شعور سے عاری ہیں۔ اس لئے انہیں شعور سکھانے کے لئے یہ انتظام ضروری ہے۔

وہ چادر کا کونا ہٹا کر سر اندر کرتا ہے۔ "تمہیں معلوم نہیں کہ چادر کے نیچے بھی سوچنا منع

ہے۔" چابک کی سرسراہٹیں سارے کمرے میں گونجنے لگتی ہیں۔ میں میز سے کتاب اٹھاتا ہوں سارے لفظ بے معنی ہو چکے ہیں۔ کتاب میں لکھا ہے انسان نے صدیوں کی مسافت طے کر کے جدید دور میں قدم رکھا ہے غلامی کا دور ختم ہوا...

"شڑاپ... شڑاپ..." ٹکٹکی میرے گھر کی دیواروں پر دستک دیتی ہے۔ میں غلام ابن غلام ابن غلام حاضر ہوں۔ ٹکٹکی مسکراتی ہے۔ کتا میرے لکھنے کی میز پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی لمبی سرخ زبان اس کے جبڑوں کے باہر لٹک رہی ہے۔ کتاب میں لکھا ہے۔ کتاب میں سب بکواس لکھا ہے' جھوٹ ہے میں غلام ابن غلام ابن غلام حاضر ہوں... اور میرے بچے! ان کا قصور صرف یہ ہے کہ میرے گھر پیدا ہوئے ہیں اس شہر میں پیدا ہوئے ہیں۔ شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں کتے تازہ خون کی مہک سونگھتے پھر رہے ہیں۔ کنٹرول روم میں بیٹھا ہوا وہ ایک بٹن آف کرتا ہے... ریڈیو ٹی وی اخباروں اور رسالوں میں گونجتی آوازیں' تصویریں اور خبریں ایک لمحہ میں غائب ہو جاتی ہیں۔ چہرے' شکلیں پلک جھپکنے میں گم ہو جاتی ہیں۔ صرف ایک بٹن آف کرنے کا وقفہ۔ ایک پورے کا پورا دور ختم ہو گیا بس اتنی سی بات۔ وہ دوسرا بٹن آن کرتا ہے۔"

یہ پروفیسر ڈاکٹر رشید امجد کے علامتی افسانے "بنجر لہو منظر" کا پہلا سین ہے جس میں' میں نے ڈاکٹر رشید امجد کی تصویر دیکھ لی۔ ان کی سوچ بھی پڑھ لی اور ان کے چہرے کے تاثرات وہ ساری کہانی کہہ گئے جو اس ضخیم "مزاحمتی ادب اردو" میں موجود ہے۔

۱۹۹۶ء کی بات ہے جب میں کراچی میں "سخن ور دوم" شائع کرنے کے بعد لاس اینجلس واپس آنے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ تب منظر امکانی (جو روزنامہ جنگ کراچی کے ادبی صفحے کے انچارج تھے) نے مجھ سے کہا آپ کا انٹرویو جنگ کے لئے کرنا ہے اور اکادمی ادبیات پاکستان کے کراچی کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر جناب نور محمد مغل آپ کو اکادمی کے دفتر میں مدعو بھی کرنا چاہتے ہیں۔ یوں میری ملاقات جناب نور محمد مغل سے ہوئی۔ انہوں نے خاصی پذیرائی کی اور اکادمی کی جانب سے چند کتابیں عنایت کیں جن میں ایک یہ ضخیم نمبر بھی تھا جسے میں نے جستہ جستہ پڑھا اور مزید پڑھنے کے لئے اپنے کمرے میں کتابوں کی الماری میں رکھ لیا۔

اکادمی ادبیات نے یہ بڑا کام کیا ہے اور ڈاکٹر رشید امجد نے بھی۔ مگر میرے نزدیک پروفیسر ڈاکٹر رشید امجد نے میرے لئے اور "گفتنی" (نثر نگاروں کا زیر تحریر تذکرہ) کے قارئین کے لئے ایک اور بھی بڑا کام کیا کہ اپنا تعارف بھیج کر مجھے عزت بخشی اور قارئین کی معلومات میں اپنے افکار سے بیش بہا اضافہ کیا۔

انہیں "گفتنی" کا سوالنامہ مجھ سے تعاون کرتے ہوئے جرمنی کے معروف ادیب جناب حیدر قریشی نے بھیجا تھا۔ ڈاکٹر رشید امجد نے اسے عزت بخشتے ہوئے فوراً تعارف ارسال کر دیا۔ جھوٹی انا اور رعونت سے کام نہیں لیا کہ میں نے بذات خود انہیں خط کیوں نہیں لکھا۔

گذارش نہیں کی۔ ایسے ہی انسان عظیم ہوتے ہیں جن کی عظمت کے چراغ ہم جیسے کم مایہ لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ روشن رہتے ہیں... شکریہ ڈاکٹر رشید امجد۔

ڈاکٹر رشید امجد کے تفصیلی تعارف سے قبل میں آپ کو یہ بتانا چاہونگی کہ ۱۹۹۵ء میں مرتب کئے گئے اس مزاحمتی ادب میں معروف افسانہ نگاروں کے مزاحمتی افسانے شامل ہیں اور ۱۹۳ شعراء و شاعرات کا کلام نظموں اور غزلوں کی صورت میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اس کا حرف حرف روشنی ہے اور سطر سطر اجالا۔ یہ تحریریں پڑھنے اور بار بار پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس کے صفحہ ۲۱ پر "حرف چند" کے عنوان سے ڈاکٹر رشید نے پاکستان کے مارشل لائی ادوار کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے صرف آٹھ ماہ بعد ہی مزاحمتی ادب کا پہلا مجموعہ "گواہی" شائع ہو گیا تھا جس کے مرتب ڈاکٹر اعجاز راہی تھے جنہیں اس جرم کی پاداش میں کئی برس تک ملازمت سے برطرفی کا زہر پینا پڑا تھا۔

یہ سارے ادیب و شاعر جنہوں نے ظلم و جبر کا زہر گھونٹ گھونٹ اتارا۔ آبلہ پا رہے پھر بھی سچ کی راہ پر چلتے رہے۔ یہ سب جرات مند نہ ہوتے تو ان کی آنے والی نسل انہیں کیونکر یاد رکھتی۔ آج ان سب کی بارگاہ میں عقیدت کے طور پر ہم سب کے سر جھکے ہوئے ہیں۔

آپ کو حیرت ہوگی کہ آج کا پروفیسر ڈاکٹر رشید امجد جو ایف جی سرسید کالج راولپنڈی کا پروفیسر ہے کبھی اس نے اپنی بقاء کے لئے ورکشاپ میں بطور کلرک بھی ملازمت کی ہے اور اس کا اظہار کرتے ہوئے فخر بھی محسوس کرتا ہے کہ اس نے محنت کے آب دار گوہروں سے اپنے علم کے پودے کو بار آور کیا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد ۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کا تاریخی نام اختر رشید امجد قلمی نام رشید امجد۔ تعلیم ایم اے پی ایچ ڈی ہے۔ مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہتے ہیں۔

"ابتدائی تعلیم میں نے ہرن ہال سرینگر میں حاصل کی۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں اہل خانہ کے ساتھ راولپنڈی آیا۔ میٹرک ڈے نیز ہائی اسکول (۱۹۵۵ء) راولپنڈی سے کیا۔ گورنمنٹ کالج اصغر مال میں داخلہ لیا لیکن ایک سال بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور ملازمت کرنا پڑی۔ ابتدائی ملازمت ۵۰۱ ورکشاپ میں بطور کلرک کی۔ اس دوران میری تعلیم کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا۔ ایم۔ اے گورڈن کالج راولپنڈی سے کیا اور ۱۹۹۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۶۷ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ نومبر ۱۹۶۸ء میں لیکچررشپ اختیار کی اب پروفیسر ہوں۔

"میں بیسویں صدی میں باقی رہ جانے والے ادیبوں میں پریم چند' منٹو' غلام عباس' بیدی' مفتی اور بعد والوں میں قرۃ العین حیدر کے نام لے سکتا ہوں جب کہ شاعروں میں اقبال کے علاوہ میراجی' ن م راشد' مجید امجد' فیض اور بعد والوں میں وزیر آغا۔

میری رائے میں جدیدیت نے فکشن کے آرٹ میں ایک تہہ داری اور معنوی دبازت پیدا

کی ہے۔ چند ایک بری مثالوں کو چھوڑ کر مجموعی طور پر جدیدیت نے اردو افسانے کو ہمہ جہت بنایا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے حقیقت نگاری کی جو بیانیہ روایت قائم کی تھی اس نے اردو کہانی کو موضوعاتی وسعت عطا کی اور افسانے کو معاشرے کے مختلف رویوں سے آشنا کیا۔ نفسیاتی اور جنسیاتی موضوعات پر لکھنے والوں نے افسانے میں شعوری اور لاشعوری دنیا کی پرتیں وا کیں۔ جدیدیت نے باطن میں غواصی کر کے ایک نئی دنیا دریافت کی، یوں ان تمام رویوں سے گزر کر اردو افسانے نے زندگی اور انسان کی کلیت کا احاطہ کیا۔ جدیدیت کا تعلق موضوع اور اسلوب دونوں سے ہے۔ جدیدیت اپنے عہد کو اس کے اپنے شعور سے دیکھنے کا رویہ ہے، یوں ہر بڑا ادیب اپنے عہد میں جدید ہوتا ہے۔ میر اپنے عہد میں اور غالب اپنے عہد میں جدید تھے۔ ترقی پسند بھی اپنے زمانے کا ایک جدید رویہ تھی۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ایک عصری رویہ تقلید پرستی کا شکار ہو کر چبایا ہوا نوالہ بن جاتا ہے۔ پھر ایک دور آتا ہے جب اس رویے کے خلاف ایک ردعمل سامنے آتا ہے۔ یہ ردعمل اپنے دور کا جدید رویہ ہوتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں بھی جو ردعمل سامنے آیا وہ ہمارے عہد کی جدیدیت ہے۔ اکیسویں صدی کا رویہ یقیناً ہم سے مختلف ہوگا۔

اپنے عہد کا جدید دور ادب کو عصری رجحانات سے آشنا کرتا ہے۔ اس حوالے سے ۱۹۶۰ء کے جدیدیت رجحانات نے بھی اردو افسانے میں دبازت پیدا کی ہے۔ اسلوب کے حوالے سے بھی استعارے کی جگہ علامت کے استعمال نے اسلوب کے حسن کو نکھارا ہے۔ اگر کہیں کوئی خامی ہے تو وہ جدیدیت کی نہیں لکھنے والے کے عجز بیاں سے پیدا ہوئی ہے مجموعی طور پر جدیدیت نے اردو ادب کو معنوی اور صوری حسن عطا کیا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ اردو میں ناول اور اچھے ناول انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں ناول کے بجائے مختصر افسانے نے مقبولیت حاصل کی۔ ناول نہ لکھے جانے کی ایک بڑی وجہ ہمارے یہاں یہ ہے کہ ہمارا ادیب فل ٹائم نہیں۔ ادب اس کا ذریعہ معاش نہیں اس کا مشغلہ ہے۔ ناول لکھنے کے لئے جس بڑی پلاننگ اور وقت کی ضرورت ہے وہ ہمارے پاس نہیں۔ دوسرے یہ کہ غزل کی روایت سے ایجاز میں اعجاز پیدا کرنا ہمارے یہاں فن کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ مزاجاً" بھی ہم تفصیل کی بجائے اختصار کو پسند کرتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ناول ہمارے یہاں زیادہ مقبول نہیں۔

آپ نے درست فرمایا اور اس میں تو شک نہیں کہ ہمارا عہد کسی بڑی فکر سے خالی ہے لیکن یہ بات شاید کلی طور پر درست نہیں کہ آج کا ادیب مادی بلکہ ذہنی نفسیاتی اور روحانی بحران میں مبتلا ہے۔ فکری خلاء خود ایک بڑا موضوع ہے اور فکری خلاء میں کئی چھوٹی بڑی سمتیں ایسی پیدا ہوتی ہیں جن پر بڑا ادب وجود میں آ سکتا ہے۔ اگر آپ اردو غزل اور نئے افسانے کا بغور

مطالعہ کریں تو آپ کو ایک نئی مابعد الطبیعاتی فکر کی جھلکیاں نظر آئیں گی...

میری فکر کے مطابق شاعری ہو یا نثر... ادب کا معیار اس کا جمالیاتی پہلو ہے۔ تخلیق ایک مرکب عمل ہے۔ ایک کل۔ اسے اجزاء میں تقسیم نہیں کر سکتا۔ ایک اچھا فن پارہ موضوع' بنت' اسلوب و اظہار کی ہم آہنگی سے ہی وجود میں آتا ہے۔ جو فن پارہ اپنی جمالیات سے عاری ہے اس میں کوئی نہ کوئی کمی رہ گئی ہے۔

سوال نمبر ۷ کے جواب میں کہنا چاہوں گا کہ ممکن ہے اس کا سبب وقت کی کمی ہو یا یہ اتفاق کہ شاعر زیادہ تعداد میں باہر گئے ہیں۔ نثر نگار "بستا" کم ہیں۔ موضوعات اور جرات کا تو مسئلہ ہی نہیں۔ شاعری یا نثر تو اظہار کے ذریعے ہیں۔ طبیعتوں اور مزاجوں کی مناسبت سے ان کا انتخاب ہوتا ہے۔

جناب پاکستانی اردو میں اب فارسی عربی کے اثرات کہاں ہیں۔ غزل میں بھی فارسی ترکیب سازی سے گریز کیا جا رہا ہے۔ جہاں تک کسی دوسری زبان کے الفاظ کی شمولیت کی بات ہے۔ تو یہ کوئی شعوری عمل نہیں' جہاں ضرورت ہوتی ہے کوئی لفظ خود بخود اپنی جگہ بنالیتا ہے۔ زبانوں کا عمل شعوری نہیں ہوتا۔"

سوال نمبر ۹ کے جواب میں کہنے لگے "ہمارا عہد تعجب سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ حیران ہونا ایک نعمت ہے لیکن علم کے پھیلاؤ اور بہت زیادہ جان لینے نے ہم سے حیران ہونا چھین لیا ہے۔ اب زندگی میں ایسے واقعات کہاں جنہیں دلچسپ کہا جائے بس ایک معمول ہے اور ہم اس معمول کے اسیر۔ چنانچہ معمول میں نہ کچھ اہم ہوتا ہے نہ دلچسپ۔

اردو ادب کا سب سے کمزور شعبہ تنقید ہے۔ کچھ تو ہمارا مزاج ہی تنقیدی نہیں۔ تنقید کے لئے جس برداشت کی ضرورت ہے وہ ہمارے یہاں بہت کم ہے۔ ادب کیا معاشرے میں بھی تنقید نہیں۔ ہمارے یہاں تنقید کے معنی مخالفت ہیں۔

ادبی تنقید کو تقریباتی مضامین نے برباد کر دیا۔ کتابوں کی رونمائی میں پڑھے جانے والے مضامین میں اتنی تعریف ہوتی ہے کہ جیسے یہ اپنے فن کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ تبصروں اور فلیپوں نے بھی تنقید کے معیار کو بہت گرایا ہے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ ہم مغربی تنقیدی نظریات کی روشنی میں اپنی تخلیقات کا محاکمہ کرتے ہیں۔ ہمارے اکثر نقاد پہلے ایک فریم ورک تیار کرتے ہیں پھر اس میں تخلیق کو فٹ کر دیتے ہیں۔ ہونا چاہئے کہ تخلیق کو پڑھ کر اس کا تنقیدی فریم ورک بنایا جائے۔ تیسری کمی یہ ہے کہ تنقید کے لئے جس وسیع مطالعہ اور ہم عصر تقابلی جائزے کی ضرورت ہے اس سے ہمارے اکثر نقاد محروم ہیں۔ ساختیات سے پس ساختیات اور جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک کی نظریاتی بحثیں تو ہو گئی ہیں لیکن ان نظریاتی بحثوں کے حوالے سے عملی تنقید نہ ہونے کے برابر ہے وجہ یہ کہ یہ ساری بحثیں تو مغربی افکار و

خیالات سے مستعار ہیں اور عملی تنقید تو خود کرنا پڑے گی اور خود کام کرنے کے ہمارے نقاد زیادہ عادی نہیں۔

تراجم کا کام اس دوران خاصا ہوا ہے لیکن یہ یک طرفہ ٹریفک ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو ادب کو بھی انگریزی میں ترجمہ کیا جائے بلکہ اردو ادب کا پاکستان کی دیگر زبانوں میں اور ان پاکستانی زبانوں کے ادب کو اردو میں منتقل کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو ادب سے بیرونی دنیا تو کیا خود ہماری دوسری زبانوں کے ادیب بھی واقف نہیں۔ دو سال پہلے کی بات ہے اکادمی ادبیات پاکستان کی اہل قلم کانفرنس میں مجھے ایک ایسی جگہ بیٹھنے کا اتفاق ہوا جہاں کچھ سندھی ادیب بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو شروع ہوئی تو سندھی ادیبوں ن اس بات کی شکایت کی کہ اردو والوں نے مارشل لاء (۱۹۷۷ء) کے خلاف کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا جب کہ سندھی میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ ۵ جولائی ۷۷ء کے مارشل لاء کے چھ ماہ بعد مزاحمتی افسانوں کا پہلا انتخاب "گواہی" (جنوری ۷۸ء میں) چھپ گیا تھا جس میں چودہ افسانے شامل تھے تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ قومی یک جہتی کے لئے بھی اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں میں اشتراک عمل ضروری ہے۔ ظاہری کہ یہ کام انفرادی سطح پر ممکن نہیں۔ اسے کسی بڑے حکومتی ادارے کو سرانجام دینا چاہئے۔

ڈاکٹر رشید امجد کی تصنیفات و تالیفات یہ ہیں۔

افسانوی مجموعے

۱۔ بے زار آدم کے بیٹے ۲۔ ریت پر گرفت ۳۔ سہ پہر کی خزاں ۴۔ پت جھڑ میں خود کلامی ۵۔ بھاگے ہیں بیاباں مجھ سے ۶۔ دشت نظر سے آگے (کلیات) ۷۔ دشت خواب ۸۔ کاغذ کی فصیل ۹۔ عکس بے خیال ۱۰۔ گمشدہ آواز کی دستک ۱۱۔ ست رنگے پرندے کے تعاقب میں ۱۲۔ رشید امجد کے منتخب افسانے..... تنقید..... ۱۔ نیا ادب ۲۔ رویے اور شناختیں ۳۔ یافت و دریافت ۴۔ شاعری کی سیاسی و فکری روایت ۵۔ میرا جی شخصیت و فن..... ترتیب و تالیف ۱۔ پاکستانی ادب چھ جلدیں ۲۔ اقبال، فکر و فن ۸۴ ۳۔ تعلیم کی نظریاتی اساس ۸۴ ۴۔ مرزا ادیب، شخصیت و فن ۹۱ ۵۔ پاکستانی ادب (نثر) ۹۰ء ۹۱ء۔ پاکستانی ادب (نثر افسانہ) ۹۱ء ۷۔ پاکستانی ادب (نثر افسانہ) ۹۴ء۔ ۸۔ مزاحمتی ادب ۹۵ء

DR. RASHEED AMJAD
52C LANE 7A, GULISTAN COLONY,
RAWALPINDI, (PAKISTAN)

جہاں ہر شاہ کا روضہ ہے جہاں زہرہ کا حجرہ ہے
طواف اس گھر کا کرنے کے لئے یہ دل تڑپتا ہے
رشیدہ مظفر حسین

رشیدہ مظفر حسین
کینیڈا

ایک مفکر رے بریڈ بری' کا کہنا ہے "تمہیں کسی کا کلچر تباہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے صرف لوگوں کو کتابیں پڑھنے سے روک دو ان کا سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔" انگریزوں نے برصغیر میں آزادی سے پہلے اور مغلوں کے زوال کے بعد مسلمانوں کے ساتھ کمال ہوشیاری اور چالاکی سے یہی ترکیب استعمال کی۔ انہوں نے ہمیں کتابیں پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے سے روک دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم ان کے ذہنی غلام ہو گئے جو آج تک ہیں۔ مسلمان مزدور کلاس اور بابو کلاس بن گئے اور انگریز ہمارے آقا اور آفیسر بن بیٹھے۔ یہی امریکیوں نے اپنے غلام کالوں کے ساتھ کیا۔ ان کو بالکل اندھیرے میں رکھا۔ یعنی ان کو تعلیم اور کتابیں پڑھنے سے دور رکھا اور جو بھی کالا کتاب پڑھتا دکھائی دیتا یا اس کے گھر سے کتاب برآمد ہوتی۔ اس کو سخت ترین سزا دی جاتی نیسختا" کالے 200 سال تک امریکیوں کے غلام رہے۔ Frederick پہلا سیاہ فام تھا جس نے چھپ کر کتابیں پڑھنا سیکھیں وہ اپنی کہانی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "میں نے مالک کی بیوی سے درخواست کی کہ وہ مجھے پڑھنا سکھائے اور بہت جلد اس کی مدد

سے مجھے حروف تہجی اور کئی لفظ لکھنے آگئے۔ جب اس کے خاوند کو پتہ چلا تو اس نے اپنی بیوی کو سختی سے منع کیا اور کہا کہ یہ غیر قانونی ہے اور یہ کہ اگر اس کو پڑھنا آگیا تو یہ غلامی کے قابل نہیں رہے گا Rouybs Frederick لکھتے ہیں کہ مالک کے یہ الفاظ سن کر مجھ پر واضح ہو گیا کہ پڑھنے سے انسان غلام نہیں رہتا اور اس دن سے مجھے معلوم ہو گیا کہ غلامی سے آزادی کا راستہ کتابیں پڑھنے سے طے ہوتا ہے۔ اس دن سے میں نے تہیہ کر لیا کہ میں ہر قیمت پر پڑھنا سیکھوں گا۔

ہمارے معاشرے نے بھی عورتوں کے ساتھ کچھ اسی قسم کا سلوک کیا۔ ان کے لئے کتابیں پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے پر پابندی عائد کر دی تاکہ وہ مردوں کی لونڈیوں کی طرح خدمت کریں نتیجہ یہ نکلا کہ عورت جس کے ہاتھوں سے نئی پود پروان چڑھتی ہے جاہل رہ گئی۔ آپ خود ہی سوچیں جو ماں جاہل ہو گی وہ اپنے بچوں کو کیا علم اور عقل دے گی اور باہر کی دنیا کے بارے میں کتنا بتا سکے گی؟ جب کہ اس کی اپنی دنیا صرف گھر کی چار دیواری تک محدود ہو۔

رشیدہ اس نکتے کو جانتی تھیں۔ کم عمری میں شادی کی وجہ سے رشیدہ کی تعلیم اور حصول تعلیم کی خواہش ادھوری رہ گئی۔ لیکن رشیدہ نے حالات سازگار ہوتے ہی اعلیٰ تعلیم کے حصول کا بیڑہ اٹھا لیا۔ کتابوں سے اپنا ٹوٹا رشتہ استوار کیا اور اپنے سفر پر نکل کھڑی ہوئیں۔ رشیدہ کی خوش نصیبی یہ تھی کہ ان کے شوہر مظفر حسین کھلے دل کے اور بالغ نظر آدمی تھے۔ انہوں نے رشیدہ کا ساتھ دیا۔ یوں رشیدہ اپنا علمی سفر بڑی خوش اسلوبی سے طے کرتی چلی گئیں۔

رشیدہ مظفر حسین جو کبھی کبھی نظمیں بھی لکھتی ہیں اور رشی تخلص کرتی ہیں ۱۹۳۲ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ جامعہ کراچی سے ایم۔ اے کیا۔ رشیدہ بتاتی ہیں۔ میں نے کبھی ملازمت نہیں کی چند ماہ پی۔ اے۔ ایف اسکول کورنگی میں والنٹری پڑھایا تھا جب کہ نان میٹرک تھی ابتدا میں بچوں کے لئے کہانیاں لکھتی رہی جو بچوں کے مختلف رسائل میں خصوصاً" پابندی سے رسالہ "ساتھی" میں جس کے ایڈیٹر عزیز الرحمن صاحب تھے شائع ہوتے رہے اور ساتھ ہی افسانے بھی لکھتی رہی۔ میرا سب سے پہلا افسانہ "ایک کمرہ" روزنامہ امروز میں شائع ہوا تھا۔ میرے افسانے مختلف ماہناموں میں مسلسل شائع ہوتے رہے۔ اس زمانے میں رشیدہ رضویہ اور رشیدہ مظفر حسین دونوں کے افسانے ماہنامہ رومان میں شائع ہوتے تھے۔ اکثر قارئین کے خطوط موصول ہوتے تھے جس میں سوال کیا جاتا کہ یہ دونوں کون ہیں یا ایک ہی فرد کے دو نام تو نہیں؟ میں اپنے ماحول سے متاثر ہو کر لکھتی تو بہت تھی لیکن کبھی شائع کرانے کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ ابراہیم جلیس جو میرے شوہر کے بچپن کے دوست تھے میری ہمت افزائی کرتے اور اصرار کے ساتھ میرے افسانے اشاعت کے لئے مجھ سے لے جاتے تھے اسی طرح عثمان صحرائی صاحب اور میجر آفتاب حسن صاحب میرے سائنسی مضامین کو شائع کراتے تھے

بلکہ عثمان صحرائی صاحب تو مجھے ۶۱ سے ۶۳ تک میرے مضمون کے ۴۵ روپیہ ہر ماہ ماہنامہ "کارگر" سے دلواتے تھے۔ ممتاز حسن صاحب مرحوم (مینجنگ ڈائریکٹر نیشنل بنک) نے میرے سائنسی مضامین کو پڑھ کر مجھے خط لکھا تھا کہ "میں نے بہت سی خواتین کے افسانے ناول مضامین پڑھے ہیں لیکن آپ کی تحریر میں انفرادیت ہے۔ آپ نے سائنسی مضامین کو اس قدر عام فہم زبان میں لکھا ہے اور سائنسی اصطلاحات کا اردو میں بڑا اچھا ترجمہ کیا ہے جس کے لئے آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

"سلطانہ! میری ایک کمزوری یہ تھی کہ میں نے اپنے آپ کو متعارف کرانے کی کبھی کوشش نہ کی ابتدا میں نظمیں، افسانے کبھی خود سے اشاعت کے لئے کسی رسالے یا اخبار میں نہیں بھیجے۔ البتہ اپنے گھر والوں اور قریبی رشتہ داروں کو اپنا لکھا سنا لیتی تھی جب بھی میں اپنے خاندان کے افراد کو اپنی کہانیاں سناتی تو اکثر یہ ہوتا کہ وہ مجھ سے سوال کرتے "یہ تم نے فلاں آپا یا فلاں بھابھی کی کہانی تو نہیں لکھی ہے۔" کیونکہ اس زمانے میں عورتوں کے لئے لکھنے کا غالباً" یہی انداز تھا۔ لیکن اپنے شوہر مظفر کے اصرار پر اور ان ہی کے دوست ابراہیم جلیس صاحب ابن انشاء صاحب عزیزالرحمن صاحب عثمان علیم صاحب کے تعاون سے (چونکہ میرے افسانے اور کہانیاں مختلف اخبارات اور ماہناموں میں شائع ہوتے رہے) میں نے لکھنے کا عمل جاری رکھا۔ اس کے بعد ہی اخبار جہاں کی خاتون ایڈیٹر سلمیٰ رضا اور اخبار خواتین کی ایڈیٹر محترمہ شمیم اختر اور جنگ میں آپ نے بھی میرے چند مضامین شائع کیے۔ میرے افسانوں کی تعداد اتنی ہے کہ ایک دو کتابیں شائع ہو سکتی ہیں۔ میرے سائنسی مضامین "دعوت فکر" کے عنوان سے کارگر اور میجر آفتاب حسن کے کراچی یونیورسٹی کے "سائنس" میگزین میں شائع ہوتے رہے "سائنسی مضامین کے عنوان سے میری ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں "سمندریات" پانی کی قیمتی دھاتیں کاربن سے کاربن (ہیرے تک) اور "سلیکا" ایک نئے ذرے کی دریافت "اومیگا منفی" (جو ڈاکٹر سلام کی ایجاد یا تحقیق کا نتیجہ ہے جس پر ڈاکٹر سلام کو نوبل پرائز بھی ملا تھا) وغیرہ وغیرہ شامل ہیں اسی طرح نظمیں ہیں جو ابتدا میں اپنے گھر والوں خصوصاً" بچوں بہن بھائیوں کے لئے کہتی رہی۔ ۶۵ء کی جنگ کے دوران چند نظمیں لکھیں۔

اسی طرح نعتیں، منقبت حضرت علی اور بی بی فاطمہ زہرہ اور امام حسین شہید کربلا پر لکھیں۔ انشاء اللہ زندگی باقی رہی تو اپنی نظموں کا مجموعہ شائع کراؤں گی۔ تیرہ چودہ سال سے پاکستان اور ٹورنٹو آمدورفت نے اس طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ دیا۔ ٹورنٹو میں بھی چند نظمیں اور مضامین پاکیزہ الہلال اور ٹورنٹو اسٹار میں شائع ہوتے رہے۔ ابتدائی بھٹو دور میں میں نے مختلف جلسوں اور مجالس کی رپورٹنگ بھی کی تھی "عوامی عدالت" کی ایڈیٹر لیڈی رہی اور ۶۵ء

میں نئی پردیسی کے روزنامہ میں خواتین کے صفحہ کی ایڈیٹر رہی آپ کے ماہنامہ روپ میں بھی چند مضامین شائع ہوئے ہیں۔

میرے خیال میں نظم نثر سے زیادہ اثر رکھتی ہے اور کم سے کم وقت میں قاری پر ایک تاثر چھوڑ جاتی ہے اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ اپنے خیالات کا اظہار نظم کے ذریعہ ہی بہتر ہوگا۔

میرے پسندیدہ شعراء میں مولانا رومؔ، اقبالؔ، حالیؔ اور دوسرے دور کے شعرا میں جوشؔ، فیضؔ، ساحرؔ، سکندر علی وجدؔ، کلیم عاجزؔ، حفیظ اخگر عارف افتخارؔ، پروین شاکر اور سلطانہ مہر شامل ہیں افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر شفیق الرحمٰن۔ ابن انشاء (کے سفرنامے) ابراہیم جلیس، قرۃ العین حیدر اور واجدہ تبسم شامل ہیں۔ اس کے سوا میں ہر قسم کے تاریخی مذہبی اور سائنسی مضامین کی کتابیں ہمیشہ پڑھتی رہتی ہوں۔

۴۔ میری زندگی کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ تقسیم ہند کے ہونے والے واقعات سے گھبرا کر میرے سرپرستوں نے میری شادی بہت ہی کم عمری میں میرے تایا زاد بھائی سے کر دی اس وقت میں نویں جماعت کی طالبہ تھی۔ میرے شوہر انڈین آرمی میں اس وقت لفٹنٹ تھے حیدر آباد دکن کے پولیس ایکشن کے فوراً" بعد میں پاکستان آگئی شادی کے تیرہ سال بعد جس چیز کے حصول کی میرے دل میں تڑپ تھی اس کے حصول کے بند دروازے وا ہو گئے۔ ایک مہربان کے ایک جملے نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ اسی دن سے میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں میٹرک کا امتحان اسی سال دونگی اور جب تک ایم۔ اے نہ کر لونگی کسی حال میں بھی اپنے ارادے کو ترک نہ کرونگی وہ جملہ یہ تھا "میں ایم۔ اے ہوں اور آپ نان میٹرک" جب میں نے میٹرک پاس کیا تو کراچی کے بیشتر اخباروں میں اس قسم کی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی کہ "پانچ بچوں کی ماں نے میٹرک میں اچھی پوزیشن حاصل کی" پاکستان ایئر فورس کے آفیسر کی بیگم نے میٹرک پاس کر لیا۔ جلیس بھائی نے اخبار جنگ میں ایک پورا کالم لکھا کہ "بڑے میاں سو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ" مجھے یاد ہے میرے بی۔ اے پاس کرنے پر آپ نے بھی روزنامہ انجام میں میرا انٹرویو شائع کیا تھا۔ میں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے بڑے ہی مشکل حالات کے باوجود پاس کر لیا۔ یہی میری زندگی کا اہم اور دلچسپ واقعہ ہے۔ اور میرا یہ یقین ہے کہ مصمم ارادہ اور سچی لگن ہو تو نا ممکن ہے کہ انسان اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو یہ شعر میرے احساسات کا ترجمان ہے۔

وہ دعا ہاں وہ دعا جس میں یقیں شامل ہو
کون کہتا ہے کہ محروم اثر ہوتی ہے

اردو چونکہ آج بھی دنیا کے ہر حصے میں ہر شہر ہر ملک میں بولی جاتی ہے اس لئے اس کے مستقبل کے بارے میں بڑی حد تک پر امید ہوں۔

ہر شاعری کی اپنی اپنی روش ہے جس صنف میں بھی عبور حاصل ہو اور خیالات کا ایسا اظہار ہو جو قاری کو متاثر کر سکے چاہے وہ کسی بھی صنف سے متعلق ہو تو وہی بہتر صنف ہے مشاعرے اور تخلیقی نشستیں دونوں اپنی جگہ اہم ہیں اور بہتر کردار ادا کر رہی ہیں۔

کتابوں اور جرائد کی بقا کا انحصار تخلیقی اور دلچسپ مضامین اور معلومات مواد پر منحصر ہے دلچسپ سبق آموز افسانے یا معلومات مضامین سائنسی مضامین یا تاریخی دستاویزات نظم ہو یا نثر ان میں اثر آفرینی ہو سادہ عام فہم زبان ہو تو وطن سے دور رہنے والے قارئین کو متوجہ کر سکتے ہیں۔ بہتر کاغذ اور اچھا سرورق بھی اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا چاہے کتنا ہی پر اثر ہو لیکن کتابوں اور جرائد کی افادیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

۸) "مشاعروں کی طرح تنقیدی نشستیں بھی باقاعدہ منعقد ہوا کریں تو ادب کی ترقی میں یقیناً" معاون ثابت ہونگی۔"

MRS. RASHEEDA MUZAFFAR HUSSAIN
16 MOGUL DRIVE, NORTH YORK
M2H 2M7 ONT. CANADA

کٹی ہوئی پتنگ کی طرح بیٹا گھر سے چلا گیا تو ماں باپ کے ہوش اڑ گئے۔
عیش میاں اگر باپ نے احکامات صادر کیے۔ "وہ ہمارے مذہب کا نہیں
ہے۔ یوں رہنا بے شرمی کی بات ہے۔ فوراً واپس آجاؤ۔ ورنہ... ورنہ...
ورنہ.....!" اباجان کے پھینکے ہوئے "ورنہ" ربر کی گیندوں کی
طرح دیوار پر ٹپ کھا کے اور اباجان کے سر پر واپس آگئے۔"

۱۰/ اکتوبر ۱۹۹۹ء

رضاء الجبار
ٹورنٹو کینیڈا

رضاء الجبار کے چند افسانوں نے مجھے بہت ہی متاثر کیا تھا۔ بعض افسانوں کی سلاست زبان اور جملوں کی کاٹ ایسی لگی جیسے آرزو لکھنوی کا گیت اور بیگم اختر ملک کی مترنم آواز کا سوز اپنے تمام ترجادو کے ساتھ دل کے نہاں خانوں میں اترا چلا جا رہا ہو۔

اور کیوں نہ ہو۔ جن کہانیوں کو کرشن چندر کے تعریفی بول مل چکے ہوں۔ ظ انصاری جنہیں خراج تحسین پیش کر چکے ہوں، عوض سعید اور اکرام بریلوی جن کی تحریروں کے گن گا چکے ہوں وہ تحریریں معمولی تو نہیں ہو سکتیں!۔

کرشن چندر نے لکھا۔

"ان کی کہانیوں میں نفسیاتی کھینچ تان بہت کم ہے جن سے نئی کہانیوں کے صفحے کالے کر دیے جاتے ہیں اور جنہیں نئی نسل کے بیشتر مصنف پلاٹ، کہانی اور موضوع کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ پھر بھی قاری کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اور پڑے بھی کیسے؟ ان مصنفوں کا اصلی مقصد کہانی سنانا نہیں ہوتا۔ قاری کو اپنی علمیت سے مرعوب کرنا ہوتا ہے یا بیانیہ

الجھاوے میں گرفتار کرنا ہوتا ہے۔"

رضاء الجبار محدود کینوس میں کام کرتے ہیں مگر جو بھی کینوس لیتے ہیں اس کے چاروں گوشوں پر نظر رکھتے ہیں اور اس کینوس کے احاطے پر اپنی مکمل گرفت رکھتے ہیں۔ ہر اس محدود کینوس کے اندر ایسی باریک نقاشی کرتے ہیں کہ کہانی MINIATURE PAINTING معلوم ہونے لگتی ہے۔ رضاء الجبار کو باریک کاتنے میں مزا آتا ہے۔ وہ فنی نزاکتوں پر عبور رکھتے ہیں، اور انہیں اس احتیاط سے برتتے ہیں کہ اکثر اوقات ان کی نوعمری اور نوخیزی پر شبہ ہونے لگتا ہے۔

ڈاکٹر خالد سہیل نے کتنا خوبصورت نفسیاتی پہلو ان کے کردار میں تلاش کیا ہے وہ اس تبصرے سے ظاہر ہے۔

"رضا الجبار کے افسانوں میں طنز کا پہلا نشتر انسان اور خدا کے رشتے پر جا کر لگتا ہے۔ ان کی بھرپور کہانی "چاند کی کشتی کا تنہا مسافر" کے کردار میں مہیش جسے اس کے والدین معذوروں کے ایک ہسپتال میں چھوڑ آئے ہیں۔ لیکن جب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے والدین کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے اور وہ ایک یتیم یسیر بچے کی طرح ہسپتال کے بستر پر ہمیشہ پڑا رہے گا تو وہ سوچتا ہے کہ آخر اس کے والدین کی طرح اس کا خدا جو اپنے آپ کو خالق، مالک اور سب کا پالن ہار کہلانا پسند کرتا ہے اسے محرومیوں، ناکامیوں اور مجبوریوں کے مارے دیگر انسانوں کی طرح کیوں اذیتوں کی زندگی سے نجات نہیں دلاتا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔ "مت پکارو اصغر! میں برداشت کر لوں گا۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ میرے ہسپتال کے اخرجات میرے پتاجی نہیں بھیج رہے ہیں۔ اب اس درد کی بات بتا کر میں کیسے دوا لوں۔"

پھر وہ چاند کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اب اس کشتی میں میں اکیلا ہی سفر کروں گا اور کہیں بھگوان نظر آئیں تو انہیں ہاتھ جوڑ کر کہوں گا کہ لوگوں میں اتنی بے حساب معذوری بانٹنے سے پہلے بھگوان اسے قابو میں رکھنے کے بھی سامان کرو۔"

رضا الجبار کے ان جملوں میں مرزا غالب کے طنز کی گونج سنائی دیتی ہے۔

زندگی اپنی جب اس طور سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

رضاء الجبار ۱۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حیدر آباد دکن میں ہوئی۔ ۱۹۶۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم کام اور ۱۹۶۵ء میں بمبئی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کرنے کے بعد ۱۹۷۴ء میں چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۸۱ء کے اوائل تک حکومت ہند کی نگرانی میں بحری جہاز بنانے والی کمپنی میں بطور

اکاؤنٹس آفیسر ملازمت کی۔ ساتھ ہی بمبئی کے برہانی کالج آف کامرس میں جز وقتی پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی فرائض بھی انجام دیے۔

اپریل ۱۹۸۱ء میں امیگریشن حاصل کر کے کینیڈا کے شہر ٹورنٹو منتقل ہو گئے۔ کچھ عرصے وہاں ملازمت کی ادھر تین سال سے اپنی فرم قائم کرلی ہے اب تجارتی اداروں کے حسابات اور ٹیکس کا کام انجام دے رہے ہیں۔

ادبی سفر کی ابتداء ۱۹۵۴ء میں پہلی انعام یافتہ کہانی "لڑکیوں کا وارڈ" سے ہوئی جو مسز کلثوم سایانی کی ادارت میں بمبئی سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ جریدے "رہبر" میں (جو اردو اور ہندی میں چھپتا تھا) شائع ہوئی۔ باقاعدہ افسانہ نگاری ۱۹۵۸ء سے شروع کی ابتداء" ان کے افسانے بیسویں صدی دہلی میں شائع ہوئے۔ تعلیمی سال ۶۰-۱۹۵۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے "مجلہ عثمانیہ" کی ادارت سنبھالی۔ یونیورسٹی کے چار سالہ دور میں انگریزی، اردو اور ہندی کے شعبوں سے شائع ہونے والے رسائل میں بہترین کہانیوں اور بین الکلیاتی افسانہ نگاری کے مقابلوں میں متعدد انعامات حاصل کیے۔

کینیڈا منتقل ہونے کے بعد رضاء الجبار نے انگلستان، اسکاٹ لینڈ، فرانس، امریکہ اور کینیڈا کے متعدد ملکوں کی سیاحت کی اور کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں مغربی ممالک کی جداگانہ تہذیب کے مشاہدات اور مغرب و مشرق کے ٹکراؤ سے تارکین وطن کے ان گنت مسائل کو موضوع بنا کر کئی کامیاب افسانے تخلیق کیے ہیں۔ وہ ایک دوماہی دینی، علمی اور تحقیقی مجلہ "ہرسمت" بھی ٹورنٹو سے شائع کرتے تھے۔ رضاء الجبار کی شخصیت ہیں عزم و حوصلہ اس لیے بھی لائق صد تحسین و توصیف ہے کہ وہ بچپن میں پولیو کے مرض میں مبتلا ہوئے اور ٹانگوں کی قوت چھن گئی۔ لیکن اس حوصلہ مند نوجوان نے ہاتھوں کی توانائی سے پیڈل چلانے والی تین پہیے کی سائیکل سے زندہ رہنے کا عزم کیا اور ڈگریوں پر ڈگریاں حاصل کیں۔ حتیٰ کہ وہ جب موٹر کار چلاتے ہیں تو اپنی سائیکل کو فولڈ کر کے کار میں رکھ لیتے ہیں اور آج ایک کامیاب اور سربلند چارٹرڈ اکاؤنٹ ہی نہیں... ایک معروف افسانہ نگار بھی ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں زرینہ جبار ایم اے بی ایڈ سے ان کی شادی ہوئی اور ایک بیٹا خالق رضا اور ایک بیٹی شحنہ راجین ان کا سرمایہ حیات ہیں۔ ان کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

پہلا افسانوی مجموعہ "روشنی کی کرن" ۱۹۷۱ء۔ صوبائی حکومت مہاراشٹر نے اس کتاب پر اعزاز دیا۔ ہندی ایڈیشن پر حکومت ہند سے ادبی انعام ملا۔ "نئی دھڑکن" (افسانے۔) اس مجموعے پر آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے اعزاز سے نوازا۔ "نو ہیرے بچوں کے لئے" ۱۹۵۴ء۔ تالیفات میں "حدیث دل" (دکن پر لکھی ہوئی نظمیں) اور "رنگ برنگے پھول" (شمالی امریکہ میں ہند و پاک سے آنے والے شعراء کا انتخاب) یہ دونوں کتابچے کینیڈا

سے شائع ہوئے۔ ۱۹۹۳ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ "چاند کی کشتی کا پہلا مسافر" شائع ہو کر عوام میں خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ افسانوں کے دو مجموعے اور ایک ناول زیر اشاعت ہیں۔ ۲۹ مئی ۹۴ء کے دن ان کے افسانوں کے مجموعے "چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر" کی رسم اجراء کے موقع پر شکاگو کے معروف شاعر توفیق انصاری احمد نے بڑی خوبصورت رباعیاں پیش کیں۔

ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

اس بات سے کس شخص کو ہوگا انکار
اونچی ہے نظر اور ہیں اونچے افکار
عباس نے' چندر نے لکھا بالکل سچ
پایہ کا ہے فن کار' رضاء الجبار

ہمارے سوالوں کے جواب میں رضاء الجبار نے کہا۔ "بیسویں صدی میں افسانہ نگاری میں بہت تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی۔ پریم چند کو افسانہ نگاری کی دنیا کا باوا آدم مانا گیا۔ افسانہ نگاری کی تاریخ میں پریم چند زندہ رہیں گے۔ ان کے ساتھ راشد الخیری' سجاد حیدر یلدرم' نیاز فتح پوری کا غلبہ ہوا۔ انہوں نے افسانہ نگاری کے فن کے اندر نئے شوشے نکالے اور فن کو نکھارا۔ کرشن چندر' عصمت چغتائی' سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی افسانہ نگاری کے فن کے ماہر تھے۔ انہوں نے افسانے کو عظمت عطا کی۔ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے افسانہ نگاری کے فن کے اندر نئے اسلوب رائج کئے۔ یہ نام اہم ہیں۔ یہ نام اردو ادب کی تاریخ میں گونجتے رہیں گے۔

۳۔جدیدیت کی تحریک کو شروع کرنے کے لیے محرکات پیدا ہوئے اور اس کے نتیجے میں یہ تحریک شروع ہو گئی۔ ابتدائی دور میں یہ ایک چونکا دینے والا نعرہ تھا۔ جب اس کا جھنڈا قائم ہو گیا تو جھنڈے تلے بہت سے لوگ اپنے قلم تھام کر آ گئے۔ ان لوگوں کی نیت میں کوئی فتور نہیں تھا۔ وہ ادب کی لطافت کو مجروح کرنے کے لیے نہیں آئے تھے۔ علامت اور حقیقت کے امتزاج کی بجائے انہوں نے افسانہ نگاری کی لیبارٹری میں علامت کو علامت سے ضرب دیا۔ جب علامت پر علامت کی مار پڑی تو کہانی میں سے کہانی پن اپنا دامن بچا کر بھاگ گئی۔ کہانی پن کے بغیر کہانی کی ایسی درگت بنی کہ قاری کو پریشانی اٹھانی پڑی۔ اسے احساس کمتری نے گھیر لیا وہ ڈپریشن کا شکار ہوا۔ تب قاری نے جدید ادب سے دامن جھٹک کر اسے اپنے سے دور کر دیا۔ اب جدیدیت کے حامیوں کو ہوش آیا۔ انہوں نے نئے چراغ جلائے کہانی پن کو سمجھا بجھا کر اپنے محل میں لے آئے۔ انہیں نئے انداز اور نئے فیشن کے لباس پہنائے۔ وہ حقیقت کے قریب آئے۔ اب مختلف عصری مسائل پر ان کے اپنے انداز میں تجربے ہو رہے ہیں۔ اس

طرح جدیدیت کے باعث اردو ادب کے کینوس کو وسعت ملی' زیادہ رنگ اور روغن ملے۔ چنانچہ یہ کہنا حق بجانب ہے کہ جدیدیت فکشن کے آرٹ کے لطافت اور اس کے حسن کو نکھارنے کا رول ادا کر رہی ہے۔

میں کہوں گا کہ بیسویں صدی کے آخری سالوں میں ہماری زندگیوں میں اتنی تبدیلیاں آئی ہیں کہ ان کی فہرست بنانا آسان نہیں ہے۔ سائنس کی ترقی اور صنعتی ترقی کے باعث ہماری زندگی تیز رفتار ہو گئی ہے۔ ہماری ضرورتیں بڑھ گئی ہیں۔ ہمارا معیار اونچا ہو گیا۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اور اس اونچے معیار کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں زیادہ محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ فرصت کے اوقات ہماری زندگیوں میں سے بہت کم ہو گئے ہیں۔ پہلے ریڈیو' ٹی وی کے چینل' ویڈیو گیم' وی سی آر' کمپیوٹر پروگرامات' انٹرنیٹ وغیرہ نہیں تھے۔ اب وہ حشرات الارض کی طرح ابل پڑے ہیں۔ ہماری فرصت کے لمحات جو پہلے سے ہی کم آچکے ہیں وہ ان کے نام ہو گئے۔ اب ناول کون پڑھے گا جناب کس کے پاس وقت ہے۔ ناول پڑھنا صبر آزما کام ہو گیا ہے۔ صرف تعلیمی اداروں میں شریک لوگ اپنے کورس کی خاطر ناول پڑھتے ہیں یا وہ استاد پڑھاتے ہیں جن کا کام ناول کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ آج کا ادیب مختلف انواع کے بحران میں مبتلا ہے۔ جو ادیب مادی بحران میں مبتلا ہے وہ سلمان رشدی بن رہا ہے۔ ذہنی اور نفسیاتی بحران رکھنے والا ادیب تنہائی چاہتا ہے وہ روپوش ہو کر اپنی سانسیں گننا چاہتا ہے۔ جو ادیب روحانی بحران میں مبتلا ہے وہ مذہب کی طرف آ رہا ہے۔

ہمارے ادب میں معیاری ادب کا کوئی پیمانہ ہے ہی نہیں۔ جن رسائل پر "معیاری ادب" کا لیبل لگا ہوا ہے وہ قارئین سے محروم ہیں۔ ان معیاری رسائل کے مدیران کشکول لے کر گھومتے ہیں۔ جن رسائل کے ساتھ قارئین ہوتے ہیں ان کے معیار پر ادب کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کی طرف سے پتھروں کی بارش ہوتی ہے۔ ہماری زبان کے ادیب و شاعر اپنی شہرت اور نام نمود کی خاطر مختلف خانوں میں بٹ گئے ہیں۔ ہر خانے کے گروپ کے ہاں معیار کی تعریف یا معیار کا پیمانہ الگ ہے۔ وہ دوسرے خانے کے ادیبوں کی تخلیقات کو معیاری نہیں مانتے۔ ان پر کیچڑ پھینکنے کو اپنا ادبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے ادب میں جس کے پاس لاٹھی ہے بس اسی کو معیار کی بھینس مل جاتی ہے۔ وہ دودھ نہیں دیتی البتہ اس کے گوبر سے اپلے ضرور بن جاتے ہیں جو نمائش میں رکھنے کے کام آتے ہیں۔"

سوال نمبر ۲ کے جواب میں عرض ہے کہ نثر نگاری یوں تو آسان معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں اوزان کی پابندیاں نہیں ہوتیں لیکن اگر کوئی اصناف سخن سے اپنی واقفیت کر لے' ان کے اوزان و پیمانوں کو سیکھ لے اور ان پر حاوی ہو جائے تو شعر کہنا یا نظم موزوں کرنا چٹکیاں

بجانے کے مترادف ہو جاتا ہے۔ اس زاویے سے جانچا جائے تو نثر نگاری کے مقابلے میں شاعری کرنا سستا" آسان کام ہے۔ نثر نگاری خون جلانے کے برابر ہے۔ مضمون لکھنے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے معلومات کا ذخیرہ ہونا ضروری ہے۔ افسانہ نگاری کے بھی لوازمات ہوتے ہیں۔ ان لوازمات کے بغیر دال نہیں گلتی۔ افسانے کے نقطہ عروج تک پہنچنے کے لیے کئی صفحات کو مکمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دو تین بار افسانے کو پڑھنا اور اس کے جھول کو ختم کرنا اس کے بعد مسودہ جو صاف کرنا ہوتا ہے جو وقت طلب ہے۔ لکھنے والے کے لیے موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ جرات کی کمی ضرور ہے۔"

آپ نے زندگی کے اہم واقعات کے بارے میں پوچھا ہے۔ میرے افسانے ہمیشہ ہی ذاتی مشاہدوں' ذاتی تجربوں اور خبرناموں کے ذریعہ سے ہی وجود میں آتے ہیں۔ انہیں پڑھنے والوں کو میری زندگی کے اہم اور دلچسپ واقعات مل جائیں گے۔

آخری سوال کا جواب طوالت چاہتا ہے۔ میں گریز کر رہا ہوں۔ اس لیے اس فقرے کے آخری حصے پر آکر یہ کہہ رہا ہوں کہ ہاں اردو زبان کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ میری رائے میں اردو زبان کے بدن میں زہر میں بجھی ہوئی سوئیاں پیوست ہوتی جا رہی ہیں اور اردو زبان اب اقساط کی موت مر رہی ہے۔ بہت سی قسطیں جا چکی ہیں اور بہت سی ابھی باقی ہیں۔ آخری قسط سے پہلے اگر کوئی جان بچانے والا گروپ مل گیا تو مل گیا ورنہ... خدا حافظ۔ پاکستان میں اردو کے تعلق سے کیا کام ہو رہا ہے اس کا مجھے علم نہیں ہے اوپر دیا ہوا میرا تجربہ ہندوستان' امریکہ اور کینیڈا کے تعلق سے ہے۔ اردو کے بہت سے تخلیق نگار اور قارئین نارتھ امریکہ میں جمع ہیں لیکن اردو کے تعلق سے کوئی منظم کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ یہی حالت ہندوستان میں ہے۔ نئی پود میں بہت سے طالب علم اردو کی بجائے ہندی پڑھنے کی جانب راغب ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کے مقابلے میں ہندی زبان روزگار کے مواقع زیادہ رکھتی ہے۔"

RAZA UL JABBAR
3311 KINGSTON RD.
APT. 901 SCARBOROUGH,
ONT. M1M 1R1 CANADA

"مگر میں نے دیکھا کہ آج کا آدمی نہ جرمنی کے کالے جنگلات میں کھو سکتا ہے نہ افریقہ کے سبز جنگلات میں۔ ہر جگہ کا چپہ چپہ کسی نہ کسی کی ملکیت ہے۔ وہ زمانہ جب لوگ بن میں کنٹیا ڈال کر ہرن کا شکار کھیلتے تھے اب صدیوں پیچھے رہ گیا ہے۔"

رضیہ فصیح احمد —
صدیوں کی زنجیر سے اقتباس —
صفحہ (۲۳۲)

۱۸/مارچ/۲۰۰۹

رضیہ فصیح احمد
شکاگو

دو ماہی "الفاظ" علی گڑھ کا افسانہ نمبر جلد دوم مئی جون جولائی اگست ۱۹۸۱ء کے مشترکہ شمارہ میں صفحہ ۱۱۷ پر محترمہ رضیہ فصیح احمد کا افسانہ "رنگ کینوس اور نقاد" پڑھ لیجیے۔ ممکن ہے یہ ان کے کسی افسانے کے مجموعے میں بھی ہو۔ اس کا ایک پیراگراف ہے۔

"اور پھر اس نے آخری نمائش کرنے کا فیصلہ کرلیا جس میں اس کی تیس پینٹنگز رکھی جائیں گی۔ اس نے تیس کینوس تیار کر کے اپنے اسٹوڈیو میں چاروں طرف رکھ دیئے۔ اور پرانا سارا کاٹھ کباڑ نکال ڈالا۔ اب وہ دلچسپی سے کام کرے گا۔ اس کا موضوع آنکھیں ہونگی۔ "بصارت اور بصیرت۔" وہ ملٹن کو پینٹ کرے گا۔ آنکھیں جانے سے پہلے اور آنکھیں جانے کے بعد۔ بینائی کھونے سے پہلے بے چین اور مضطرب اور بینائی کھونے کے بعد مطمئن اور پرسکون۔ مگر کیا یہ ممکن ہے؟ نہیں! جوں جوں اس کی بصارت زائل ہو رہی تھی اس پر اضطراب اور خوف کا ایک عجیب عالم طاری ہو رہا تھا۔ اس کی بھوک پیاس اور راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ کسی صورت چین نہ آتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آسیب اس کی تاک میں ہوں۔ رو رو کر

دعائیں مانگتا تھا۔ "یا اللہ رحم کر۔ میری جان لے لے مگر میری آنکھیں نہ لے۔"
اس کے بعد اگلے پیراگرافوں سے چند سطریں ملاحظہ کریں۔ "جسمانی تھکن اور ذہنی کرب اور خوف نے اسے بیمار کر ڈالا تھا۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ ذہنی مریضوں کے اسپتال میں داخل کر دیا گیا اور اسپتال میں پڑے پڑے ہی وہ بصارت سے محروم ہو گیا۔
گھر آتے ہی وہ سب سے پہلے اپنے اسٹوڈیو میں گیا۔ سب کچھ اسی طرح تھا مگر اب وہ ان اندھی بہری ٹیوبوں کا کیا کرے اور بے حس اور بے آواز برشوں کا کیا کرے! اس کی ساری عمر کی محنت رائیگاں گئی۔ آخر اس نے اپنے ہاتھوں اور انگلیوں کو اپنے ذہن کے خوابوں کا کچھ حصہ تو دیا تھا۔ کیا یہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے؟ یقیناً" نہیں۔ جب وہ ہی نہیں دیکھ سکتا تو وہ کیا کر سکتے ہیں۔ اس نے دوبارہ ٹیوبوں کو چھوا۔
"کوئی طریقہ تو ہوگا رنگوں کے علم کا!" غصے میں اس نے اندھا دھند ٹیوبیں کھول کھول کر پلیٹ پر رنگوں کے انبار لگا دیئے۔ اور پھر برش کا بنڈل اٹھا کر ایزل کے پاس پہنچا اور رنگ کینوس پر پھیلانے شروع کر دیئے۔ پھینکنے شروع کر دیئے۔ کبھی غصے میں انہیں رگڑ ڈالا کبھی پیار سے انہیں اچھال دیا۔ کبھی ہمدردی سے انہیں سہلا دیا۔ ایک کے بعد ایک اس نے سارے کینوس رنگ ڈالے۔ جب پلیٹ پر رنگ ختم ہو جاتے تو وہ ٹیوبوں سے پلیٹ پر رنگ انڈیل لیتا اور برش اپنا کام شروع کر دیتے۔ اسے نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا اور جب تینوں کینوس پورے ہو گئے تو دنیا انہیں دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ تصویریں کسی اندھے آرٹسٹ نے بنائی ہیں۔ ان میں رنگوں کی جو بصیرت تھی' ہنرمندی کا جو کمال تھا۔ لکیروں میں جو آہنگ تھا اور مکمل پینٹنگ میں جو موسیقی تھی وہ آج تک کسی آنکھوں والے کے کام میں نہیں دیکھی گئی تھی۔ اس کی نمائش میں سارے لوگ دوڑے چلے آ رہے تھے۔ نوجوان مصور اس کی انگلیوں کے پوروں کو آنکھوں سے لگا رہے تھے۔ شائقین اس کی بے نور آنکھوں کو عقیدت سے دیکھ رہے تھے انٹرویو لینے والے مائک اس کے آگے دھرے بیٹھے تھے اور وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔
"میں آرٹسٹ نہیں ہوں۔ میں ایک کینوس ہوں۔ میں نے چالیس برس رنگ پیا ہے اور اب رنگ خود بخود میرے اندر سے پھوٹ رہے ہیں۔ میں کسی پینٹنگ کی تخلیق نہیں کرتا۔ وہ تو میری ذات' میری شخصیت میری سائیکی اور میرے وجود کا حصہ بن گئی ہیں۔ بس میں خوش ہوں کہ میرے پینٹ نے' میرے برش نے اور میری انگلیوں نے میرے ساتھ غداری نہیں کی۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ یہ سب میری آنکھوں کے تابع نہیں تھے۔ میرے تابع تھے' میری روح کے تابع تھے۔ یہ آنکھوں کے شاگرد نہیں تھے۔ روح کے شاگرد تھے۔ سچے شاگرد تھے۔"
اور آرٹ کے نقاد نے لکھا۔ "وہ ذہنی طور پر پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے تھے۔ وہ

بکی بکی باتیں کر رہے تھے۔ مثلاً "انہوں نے کہا۔ "وہ آرٹسٹ نہیں بلکہ ایک کینوس ہیں۔"

رضیہ فصیح احمد کا یہی ایک افسانہ انہیں اردو ادب میں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ مگر رضیہ نے ایک نہیں ایسے کئی افسانوں سے اردو ادب کے خزانے کو مالا مال کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن کی زیر نگرانی "عصری ادب" دہلی کے "خواتین خصوصی نمبر" میں وہ رضیہ فصیح احمد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"رضیہ فصیح احمد کی کہانی "جب پھوپھی کھو گئی تھیں" ایک قابل ذکر کارنامہ اس ضمن میں ہے کہ اب عورت صرف عورت نہیں رہ گئی بلکہ ایک وسیع تر مخلوقات کا جز ہے اور کائناتی مسائل کا ایک حصہ بھی۔ عورتوں کو خصوصاً" بوڑھی یا ان پڑھ جاہل پردہ نشین عورتوں کو دراصل مال و اسباب کی طرح بے جان اور مجہول سمجھا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت وہ نہ اس قدر بے عقل ہوتی ہیں نہ اتنی بے وقوف۔ صدیوں کے استحصال اور غلامی نے البتہ ان کو ایسا بنا دیا ہے۔ جس طرح برسوں تک جب کسی طوطے کو بند رکھا جائے تو اس کے بازو مفلوج ہو جاتے ہیں اسی طرح ہماری عورتوں کو بھی صدیوں کی غلامی نے مفلوج کر دیا ہے۔ اس مسئلے پر ایسا دلدوز افسانہ ایسے لطیف اور ہلکے پھلکے پیرائے میں اس سے قبل نہیں لکھا گیا۔"

اب ہم رضیہ فصیح احمد سے بھی پوچھتے چلیں کہ وہ خود اپنے بارے میں کیا کہتی ہیں۔ انہوں نے اپنے بارے میں بتایا۔

"پہلے میرا نام رضیہ بانو، پھر رضیہ وریع اس کے بعد رضیہ فصیح احمد ہوا۔ جائے پیدائش مراد آباد یوپی ہے۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے شادی کے بعد کیا۔ میرے بارے میں کم ہی لوگ جانتے ہیں میں خود بھی نہیں جانتی۔ ادب کے بارے میں یہ ہے کہ مجھے بچپن سے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ بہت کم عمری میں اردو اور انگریزی کے ناول پڑھے۔ ابھی اسکول میں تھی کہ لکھنا خود بخود شروع ہو گیا... اور مجھے کہ چھپنا بھی ایسا ہی خود کار رہا کہ جو لکھ کر بھیج دیا وہ چھپ گیا۔

پہلا ناول کیوں لکھا اب یاد نہیں۔ بس ذہن میں کوئی خیال آیا لکھنا شروع کر دیا۔ ناول بڑھتا رہا۔ تقریباً" ایک سال میں پورا ہو گیا۔ اس کے شائع ہونے میں کچھ وقت لگا۔ مگر شائع ہو گیا اور اسے آدم جی انعام ۶۵۔۶۴ کا ملا۔ آدم جی ایوارڈ لینے ڈھاکہ گئی تب زیادہ تر لکھنے والوں سے ملاقات ہوئی ناول کا نام "آبلہ پا" ہے اس کے بعد چند ناول اور اسی طرح لکھے کہ ایک خیال مثلاً" کسی فوجی افسر نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ اس بیوی کے ساتھ کام کرنے والی کسی خاتون نے مجھے اس کے بارے میں کچھ بتایا۔ اور میرے ناول "انتظار موسم گل" کی داغ بیل پڑی۔ کہانی کی ساری خانہ پری میں نے خود کی۔ مختلف جگہوں پر رہ کر زمیندارانہ ماحول دیکھا۔

"متاعِ درد" ایک لڑکی کی کہانی ہے جس کا نام غنچہ تھا۔ پھلوں کو مہر بند کرنے والے ایک کارخانے میں کام کرتی تھی۔ کوشش سے وہ نرس بنی اور پھر ایک بڑے فوجی افسر کی بیوی بن کر گل کھلائی اور خوب گل کھلائے۔

"اک جہاں اور بھی ہے۔" میرا وہ ناول ہے جو آبلہ پا سے پہلے رسالہ "قند" مردان میں "بھولی ہوئی منزل" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس وقت یہ ناولٹ کی شکل میں تھا۔ اس سے بھی پہلے ایک ناول "سیمیں" لکھا تھا جسے شائع کروانا نہیں چاہتی تھی لیکن "لارک پبلشرز" نے دیکھنے کے بہانے لے کر اسے شائع کر دیا تھا۔ میں اس کا ذکر نہیں کرتی تھی۔ اب اس لئے کرنا چاہتی ہوں کہ اس ناول کو میں نے رضیہ بٹ کے نام سے بھی چھپا دیکھا ہے۔ (یہ حال ہمارے ہاں کاپی رائٹ کا ہے) "آزارِ عشق" کا موضوع سنجیدہ ہے لیکن اندازِ تحریر شگفتہ اور مزاحیہ ہے۔ کرادر زیادہ تر مزاحیہ ہیں۔ اس ناول کے پندرہ سال بعد تک کوئی ناول نہیں لکھا اس خیال سے کہ لکھا جائے تو کوئی بڑا اور اچھا ناول ہو۔ ۸۵۔ ۸۴ میں "صدیوں کی زنجیر" ناول لکھنا شروع کیا۔ اس سے پیشتر تحقیق کرتی رہی۔ ۷۱ء کی جنگ اور بنگلہ دیش کی تحریک اور اس کے اوپر اثر انداز ہونے والے عوامل کی تحقیق... مشرقی پاکستان سے آنے والوں سے انٹرویو وغیرہ۔ ناول ختم ہوا تو چھپنے کے لئے دے کر امریکہ چلی آئی۔ دو سال بعد ۸۷ء میں شائع ہوا۔ امریکہ آنے کے بعد ایک اور ناول کی ابتداء ہوئی جو ۸۸ء میں "یہ خواب سارے" کے نام سے شائع ہوا۔ (شاعری ابھی شروع کی ہے۔ تنہا تخلص ہے مگر فی الحال اس کے بارے میں کیا کہوں)

اس سارے عرصے میں افسانے لکھتی رہی اور وہ مختلف پرچوں میں چھپتے رہے ماہنامہ "لیل و نہار"، "سیپ"، "فنون"، "صبا"، "حیدر آباد دکن"، "ماہِ نو" اور "نقوش" وغیرہ میں بہت افسانے چھپے اور ڈائجسٹوں میں بے تحاشا، بلا تکلف بغیر اجازت شائع ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ پڑھنے والے پندرہ بیس سال پرانے افسانوں کو میرے تازہ افسانے سمجھتے رہے۔ افسانوں کا پہلا مجموعہ "دو پاٹن کے بیچ" تھا۔ پھر "بارش کا آخری قطرہ"، "کالی برف"، "نقاب پوش" اور پانچ طویل افسانوں کا مجموعہ "بے سمت مسافر" کے نام سے شائع ہوا۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین "سچ بولنے کا وقت" کے نام سے شائع ہوئے۔ "کالا چور ریڈیو اور ٹی۔وی کے مزاحیہ ڈرامے ہیں۔ طویل دورانئے کے ڈرامے رسالوں میں شائع ہوتے ہیں مگر کتابی شکل میں نہیں آئے۔ تازہ افسانے بھی پرچوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ کہانیاں کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ کئی انگریزی کہانیوں کا ترجمہ The Man with the Mask. کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔
"صدیوں کی زنجیر" کا ترجمہ انگریزی میں ہو رہا ہے اور چند کہانیاں اور فکاہیہ مضامین انگریزی

میں لکھے ہیں۔ صرف ایک کتاب "بے سمت مسافر" کی رونمائی ہوئی تھی جو ناشر صاحب نے بہ اصرار کروائی تھی۔ اس میں مجھ پر اور میرے فن پر مضامین پڑھے گئے تھے ورنہ خدا کے فضل سے کبھی کوئی گوشہ نہیں چھپا نہ جشن منایا گیا۔ میری کتابوں پر اور کہانیوں پر اچھے تبصرے آتے رہے ہیں مگر بڑے بڑے لوگوں نے جنھوں نے بعض چھوٹے چھوٹے لوگوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے میرے بارے میں نہیں لکھا۔ ایک مذاق اور ہے کہ امریکہ کی زیادہ تر لائبریریوں میں میری کتابیں فصیح احمد... رضیہ کے نام سے ہیں۔ جب پاکستان سے کتابیں آئی ہوں گی تب کسی نے پہلا نام اور آخری نام اس طرح لکھ دیا۔ ارادہ ہے کہ وقت ملا تو تصحیح کروا دوں گی... ورنہ کیا فرق پڑ رہا ہے، کتنے لوگ پڑھتے ہیں؟ لائبریری میں جائیے تو ساری زبانوں کے سیکھنے کے لئے ویڈیو ملتے ہیں۔ نہیں ہے تو اردو کا... کوئی وڈیو نہیں۔ سارے ملکوں کی خوب صورت کتابیں ان کی رسموں کے ساتھ خوب صورت تصاویر کے ساتھ بھری پڑی ہیں۔ اپنی ڈھونڈنے سے شاید کہیں ایک آدھ نکل آئے ویسے تو رکھی نظر نہیں آتی۔ ایک کتاب موجود ہے بعنوان "Writers Market" میں دیکھئے تو ہر زبان کے ترجموں کے ادارے نظر آتے ہیں، اردو کا اس کتاب میں تو شامل نہیں نہ کبھی سننے میں آیا۔ انفرادی سطح پر کام ہو رہا ہے یا شاید آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے ذریعہ..."

سوال نمبر ۲ کے جواب میں انہوں نے کہا۔ "کون سی صدی میں ادب میں کتنے نام رہ جائیں گے یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ یہ ہمارا منصب نہیں ہے۔ جدیدیت نہ ادب کو لطافت دیتی ہے نہ نکھارتی ہے نہ مجروح کرتی ہے بات ہر چیز کو سلیقے سے برتنے کی ہے۔ سلیقے سے ادب نکھرتا اور سنورتا ہے بد سلیقگی سے مجروح ہوتا ہے۔ اردو میں ناول نگاری کی عمر دیکھتے ہوئے موجودہ صدی میں اردو ادب میں بہت اچھے ناول لکھے گئے ہیں۔

ادیب ہمیشہ سے مادی، ذہنی اور روحانی بحران میں مبتلا رہے ہیں۔ یہی چیز ان کو آرٹ میں "مبتلا" کرتی ہے۔ ان کی سوچ سے نظام فکر نکلتے ہیں۔ ہر عہد اپنی سوچ، فکر اور نظام کا خود ذمے دار ہے۔ بیسویں صدی نے ترقی پسندی، ادب برائے ادب اور پاکستانی ادب کو آزمایا۔ اکیسویں صدی اپنا نظام فکر خود ڈھونڈے گی۔

شاعری ہو یا ادب، معیاری ادب کے پیمانے بین الاقوامی ہیں۔ ماضی کے بھی اور آج کے بھی۔

شاعری کے معیار کے لحاظ سے شاعری بھی کچھ بہت حوصلہ افزا نہیں ہو رہی۔ نثر کم لکھے جانے کی وجہ وقت کی کمی ہو سکتی ہے، موضوعات کی کمی نہیں۔ اچھے لکھنے والوں کے لئے جرات کی کمی بھی نہیں ہونی چاہئے۔

زبان کی نشوونما فطری ہونی چاہئے۔ اگر ایک ملک میں کوئی چیز باہر سے آتی ہے جو وہاں پہلے

سے موجود نہیں تو اسی زبان کا لفظ جوں کا توں یا تبدیلی کے ساتھ لے لیا جاتا ہے۔ یہ فطری بات ہے جیسے لالٹین، ٹیلی فون اور ٹی۔وی وغیرہ۔ لیکن جب الفاظ اپنی زبان میں موجود ہوں تو کرسی کو چیئر اور میز کو ٹیبل کہنا یا لکھنا مناسب نہیں۔ نئی نسل بہت سے الفاظ کے مترادفات نہیں جانتی اور سمجھتی ہے کہ وہ الفاظ اردو میں موجود ہی نہیں ہیں۔ انگریزی زبان سے الفاظ بلاوجہ استعمال کرنا اپنے الفاظ کو متروک بنا دینے کے برابر ہے۔ یہ اردو ادب اور اردو زبان کی ترقی کا عہد نہیں ہے اس لئے ہر چیز روبہ زوال ہے۔ جس ملک اور معاشرے کی ساکھ بین الاقوامی طور پر کم ہوتی ہے اس کی زبان کی اہمیت بھی کم ہی ہوتی ہے۔ امریکہ میں تراجم کے ادارے اس لئے نہیں ہیں کہ کوئی مالی منفعت نظر نہیں آتی۔ امریکہ کے ناشر اردو کے تراجم سے مانوس نہیں ہیں۔ Mainstream ناشروں کی کتابوں میں ایسی کتابیں نظر نہیں آتیں جو اردو سے ترجمہ ہوتی ہوں جب کہ دوسری زبانوں کی نظر آتی ہیں۔ اردو کا کام اکا دکا یونیورسٹی کرتی دکھائی دیتی ہے یا انفرادی طور پر چند لوگ جو قدم قدم پر مشکلات کا ذکر کرتے ہیں۔"

۹۸ء کے وائل میں رضیہ فصیح لاس اینجلس آئی تھیں۔ محترم شاعر ضیا خان نے اپنے ہاں کی افسانوی و شعری محفل میں انہیں بطور مہمان خصوصی مدعو کیا تھا۔ اس موقع پر خالد خواجہ نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا۔

"جس زمانہ میں رضیہ فصیح احمد کے نام کا ڈنکا بجتا تھا ان دنوں وہ اور میں دونوں پشاور کے باشندے تھے مگر کئی سال تک ہم دونوں پشاور کے ادبی میدان میں ڈٹے رہنے کے باوجود اجنبی ہی رہے۔ رضیہ بہت مدہم مزاج کی (Low Profile) خاتون ہیں۔ خاصی شرمیلی ہیں اور منکسر المزاج بھی۔

"آبلہ پا" کی مصنفہ کے بارے میں خال خال تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ دراصل رضیہ کی پی۔ آر کمزور تھی اور اس قسم کی محفلیں جمانے کے لئے جس زمانہ سازی یا چابک دستی کی ضرورت ہوتی ہے وہ رضیہ میں نہیں تھی۔

بہرحال رضیہ میری پسندیدہ ادیبہ ہیں شاعرہ بھی ہیں میں ان کا بہت احترام کرتا ہوں۔"

لیکن رضیہ خالد خواجہ کی ہی نہیں اردو پڑھنے والی اکثریت کی پسندیدہ ادیبہ ہیں۔

RAZIA FASEEH AHMED
1121 COURT B HANOVER PARK
IL 60103 U.S.A.

فراق سے بھی گئے ہم وصال سے بھی گئے
سبک ہوئے ہیں تو عیشِ ملال سے بھی گئے

رفیعہ منظور الامین

۱۲ اکتوبر ۹۹ء
حیدرآباد

رفیعہ منظور الامین
حیدر آباد دکن

ماں کی گود آسودگی بخشتی ہے اور حرف تحریریں بن کر ہمارے اندر اجالا پھیلاتے ہیں۔ وہ تحریریں جہاں مرد لکھتے ہیں وہاں عورتیں بھی اپنی انگلیاں فگار کر کے بنجر زمین کی آبیاری اپنی تحریروں سے کرتی ہیں۔

تحریریں جو ہمارے اندر کی دنیا کو کشادگی دیتی ہیں اور ہمیں ابدی خواہشوں کی وہ قوت بخشتی ہیں جس کا ہاتھ تھام کر ہم اس دنیا میں اپنے فگار پاؤں' اپنی زخمی آنکھوں اور اپنے شکستہ جسموں کے لئے آسودگیوں کا موسم تلاش کر سکتے ہیں۔ کسی اچھی کتاب کے مطالعے سے ہم وقت کی اس ابدی رفتار میں اپنی شناخت کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں۔

رفیعہ منظور الامین کا شمار بھی ان تخلیق کاروں میں کیا جا سکتا ہے کہ جن کی نثری تخلیقات ہمیں اپنی شناخت کا ادراک بخشتی ہیں۔

''میری نصف ملاقات جب رفیعہ سے ہوئی تو دو جملوں کے تبادلے بعد مجھے محسوس ہوا میں تو رفیعہ سے کئی بار ملی ہوں۔ کچھ شخصیات ہوتی ہی ایسی ہیں۔ رفیعہ بھی انہی میں سے ہیں۔

رفیعہ ہمیں اپنے بارے میں بتائیے۔ آپ کہاں پیدا ہوئیں تعلیم کہاں حاصل کی اور کب سے لکھ رہی ہیں؟ میں نے پوچھا تو رفیعہ مسکرا کر بولیں۔ "رفیعہ منظور الامین میرا نام ہے۔ اسی صدی میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئی' و-یمس کالج سے بی۔ایس۔سی کیا لیکن کہیں ملازمت نہیں کی۔

ددھیال کا سلسلہ نسب حضرت سید احمد بادپا سے ملتا ہے جو پنجاب کے تھے۔ دادا محمد عبدالمجید حیدر آباد کے پہلے سیویلین افسروں میں سے ایک تھے۔ انسپکٹر جنرل (جیل) کے علاوہ اکاؤنٹ جنرل کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ دادی کے والد پیارے صاحب عزیز سکندر آباد کے مشہور تاجروں میں سے تھے۔ انہوں نے سکندر آباد میں مسلم گرلز ہائی اسکول قائم کیا جہاں آج بھی ایک ہزار لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔

والد محمد عبدالحمید پولیس ٹریننگ اسکول کے پرنسپل کے عہدے پر وظیفہ یاب ہوئے جو خود ایک اچھے شاعر اور فنون لطیفہ کے ماہر تھے۔ ننھیال کا سلسلہ نسب جناب شمس الدین سے ملتا ہے جو ٹیپو سلطان کے وزیر تھے۔

میرا بچپن اضلاع کی خوشگوار ہواؤں میں گزرا۔ بوقت تعلیم حیدر آباد میں سکونت رہی۔ منظور الامین صاحب سے شادی ہوئی جو کچھ سال پہلے ڈائریکٹر جنرل ٹیلی ویژن کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے۔ وہ نہ صرف ایک کامیاب ایڈمنسٹریٹر رہے بلکہ اعلیٰ درجے کے شاعر اور نثر نگار بھی ہیں۔ ان کے ساتھ اندرون اور بیرون ہندوستان کئی مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا جس نے میرے تجربے اور مشاہدے میں اضافہ کیا جو میرے فن کے لئے مددگار ثابت ہوا۔

میں پچھلے تیس سال سے لکھ رہی ہوں میری ماشاءاللہ دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی ذیشان امریکہ میں ڈاکٹر ہے اور چھوٹی فروزاں' عمان ایرویز کا جاب چھوڑ کر کینیڈا میں مقیم ہے۔

۲۔ تاریخ نے کسی کو نہیں بخشا جنہیں بلندیوں پر بٹھایا گیا' آج ان کی عیب جوئی کی جاتی ہے... شیکسپیر کے مطابق یہ دنیا ایک اسٹیج ہے جہاں ہر کوئی جانفشانی سے اپنا رول نبھاتا اور چلا جاتا ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ ہر دور میں ادیبوں فنکاروں نے اپنے نقش قدم چھوڑے ہیں۔ انہیں fossils کے حوالے مت کیجئے۔

۳۔ جدیدیت کو میں زندہ ادب کا ایک تجربہ جانتی ہوں... جس طرح ہر تجربہ کامیاب نہیں ہوتا' جدیدیت کا تجربہ بھی مایوس کن رہا... شاعری میں یہ کسی حد تک ضرور کامیاب رہا لیکن فکشن پر اس کا اثر بہت مجہول رہا چنانچہ اسے رد کر دیا گیا۔ (یہ میری ذاتی رائے ہے)

۴۔ اردو ادب میں ناول نگاری کا فن مغرب سے آیا۔ مستعار لی ہوئی چیز ہاتھوں میں ایک عجوبے کی طرح ہوتی ہے۔ اسے مکمل طور پر اپنانے کے لیے اس کی روح تک پہنچنا پڑتا ہے۔ اس کے بیرونی نژاد ہونے کو مسترد کر کے اس کی تکنیک کو خود اپنے ماحول اور کرداروں سے

وابستہ کرنا پڑتا ہے۔ نیز اس زمین میں نیا آہنگ اور خود اپنا یوگ دان بھی ضروری ہے سب سے زیادہ ادارک اور Analytical Mind کی ضرورت ہے اسی کا فقدان ہے۔ اس صدی کے اکثر ناول نگار اپنا مبلغ علم بڑھانے کی کوشش نہیں کرتے چنانچہ معیاری ناول بہت کم لکھے جا رہے ہیں۔ جن میں تکنیکی خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

۵۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ آج کا ادیب نہ صرف مادی بلکہ ذہنی نفسیاتی اور روحانی بحران میں مبتلا ہے۔ آج ادب کا رشتہ راست معاشیات سے جڑ گیا ہے۔ یہ بڑی پھسلن والی زمین ہے جس کا دو شاخہ راستہ ہے۔ ایک معاشی کامیابی کی طرف جاتا ہے دوسرا ناکامی اور frustration کی طرف۔ اس کی ذمہ داری ایک حد تک میڈیا پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ شائقین ایک وقت کا کھانا تیاگ کر اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے کوئی کتاب خریدا کرتے تھے۔ یہ وقت گزاری کا ایک مہذب ذریعہ بھی تھا جب کہ ذمہ داری اب ٹی وی اور فلموں نے سنبھال لی ہے جو ریڈی میڈ دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اور ناظر کا ذہنی ارتقا گھٹ کر رہ جاتا ہے یہاں سے ادب کو پھسلن والی زمین اس لئے کہا کہ جہاں ایک اچھا بھلا ادیب اپنا مسودہ ہاتھ میں لئے مایوس کھڑا رہ جاتا ہے وہاں ایک نام نہاد ادیب اپنی تیسرے درجے کی گھٹیا کاوش فروخت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے برسرپیکار نہیں ہوا جا سکتا۔ امید افزا بات یہ ہے کہ اس فانی دنیا میں کوئی چیز ابدی نہیں ہوتی۔ یہ دور بھی گزر جائیگا۔

جہاں تک رہنمائی کا سوال ہے میرا مضبوط عقیدہ ہے کہ آج کے دور میں One-Nostril Specialists کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ادیب بھی ایک انسان ہے اور اسی سماج کا ایک فرد۔ اسے بھی بقا کے لئے اپنی شخصیت کو ہمہ جہتی بنانا ہوگا۔ اپنی سوچ کی کمند دور دور تک پھینکنی ہوگی۔ خود اعتمادی پیدا کرنی ہوگی۔ خود اپنا محاسبہ کرنا ہوگا۔

۶۔ معیاری ادب میری نظر میں تازہ ہوا کا وہ جھونکا ہے جو قاری کے ذہن کے دریچے کھول دے۔ اور قاری ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے خود سوچ کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کردے۔ اس دوڑ میں کبھی وہ جیت جائے تو کبھی ادب اس پر حاوی ہو جائے۔

۷۔ معیاری نثر یا معیاری شاعری دونوں ہی خون جگر مانگتے ہیں لیکن نثر میں Commitment زیادہ ہوتا ہے۔ نثر نگار کو زیادہ چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو مگرمچھ کی دم کی طرح وار کرتے ہیں جب کہ کوئی یونہی سا شاعر بے معنی شعر کہہ کر شان بے نیازی سے گزر جاتا ہے۔ یہی سہل پسندی ہے جو لوگ شاعری کے میدان کو زرخیز سمجھتے ہیں۔

قوم کی قوم سخن ور ہے تو اے دیدہ ورد
ہم پہ احساں ہو اگر ہم کو سخن داں نہ کہو

۸۔ اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ کی شمولیت کے لئے فراخ دلی کی ضرورت ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ اردو اپنی شناخت اور انفرادیت کھودے۔ بہت ہی مشکل اور غیر مانوس اردو الفاظ کی جگہ عام بول چال میں مستعمل بامعنی انگریزی الفاظ کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس طرح اردو زیادہ عام فہم ہوگی۔ لیکن ادب عالیہ میں جہاں تک ہو سکے اس ملاوٹ سے احتراز ہونا چاہئے۔

۹۔ آج اپنی زندگی کی کتاب کے اوراق الٹتی ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالٰی نے مجھے بڑی دلچسپ اور متحرک زندگی عطا فرمائی۔ دلچسپ واقعات کا ایک سلسلہ ہے جس کا بیان ضروری نہیں۔ کیونکہ ان یادوں کی نوعیت جذباتی اور نجی ہے۔ بہر حال ایک واقعہ قلمبند کرونگی۔

مجھے ہر طرح کی کمزوری سے عناد ہے وہ خواہ جسمانی ہو جذباتی ہو یا کردار کی... شاید یہی وجہ ہے کہ بچپن میں مجھے فلم ایکٹریس ناڈیہ متاثر کرتی تھی... میرے ناپختہ ذہن میں وہ ایسی ناقابل تسخیر شخصیت تھی جو چٹانوں سے ٹکر لیتی۔ بے سہاروں کا سہارا بن جاتی وغیرہ... شاید یہی وجہ تھی کہ بچپن ہی سے ایسے کھیلوں میں دلچسپی تھی جہاں ہمت اور استقامت کی ضرورت تھی جیسے تیراکی' گھوڑ سواری اور stunts۔ والد پولیس افسر تھے۔ اضلاع پر تعیناتی ہوتی تھی... گھوڑوں کا شوق انہیں بھی تھا اور انہوں نے ہی مجھے بھی اس طرف راغب کیا تھا۔ اصطبل میں ایک نیا گھوڑا آیا... منہ زور تھا۔ مجھے اس پر سواری کرنے سے منع کیا گیا۔ ایک دن والد دورے پر گئے تو مجھے موقع ملا اور میں وہی گھوڑا لے کر نکل گئی۔ سائیس واویلا مچاتا رہا مختصر یہ کہ برسات کی پھسلن تھی اور گھوڑا جان گیا کہ نو سکھ سواری ہے اس نے مجھے گدلے پانی بھرے گڈھے میں پٹک دیا اور خود فرار شد۔ جب ہوش آیا تو ہاتھ سلنگ میں تھا اور سر پر زخم جس کا نشان اب بھی موجود ہے۔ یہ واقعہ دلچسپ یوں تھا کہ جہاں سرزنش کا اندیشہ تھا والد کی طرف سے نڈر ہونے پر شاباشی ملی۔

۱۰۔ تنقید کسی اور کے تخلیقی عمل پر بے لاگ اور صحت مند رائے زنی کا نام ہے اس کے لئے خود تنقید نگار کا باشعور' باریک بین اور تنقیدی رجحان سے لیس ہونا ضروری ہے۔ احتشام حسین' ممتاز حسین اور مجنوں گورکھپوری کا زمانہ ختم ہو چکا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آج کہ دانشور اس فن سے مبرا ہیں لیکن بدقسمتی سے انکا انداز زیادہ قاتلانہ ہو گیا۔ یا پھر اتنا فدویانہ کہ تنقید تعریف نامہ بن کر رہ جاتی ہے... دونوں ہی باتیں نا منصفانہ ہیں ایک علت یہ بھی ہے کہ عام طور پر ادیبوں میں Creativity کم ہو گئی ہے... شاید اسی وجہ سے جو اچھے ناقد ہیں انہیں قابل اعتناء نہیں سمجھتے۔"

MRS. RAFIAA MANZOORUL AMIN 3-B
FAIR VIEW ROAD NO. 7 BANJARA
HILLS, HYDERABAD-500034 INDIA

ہتھیلی پہ دل کے لہو اس نے میرا
کیا سب سے دیکھو نیا رنگِ حنا ہے
ریحان اظہر
20 جون 99

ریحان اظہر

ریاض

اظہر کی نیکیوں کی بہت دھوم تھی مگر
ہم کو تو شہر بھر میں وہ بدنام سا ملا

بات درست ہے مگر ریحان اظہر بدنام بھی اپنی نیکیوں کے حوالے سے ہی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی خوبی ہے "وقت کی قدر کرنا" وہ پل پل کی قدر و قیمت سمجھتے ہیں' اسی لئے کامیابی کی طرف رواں دواں ہیں۔ بہت کم وقت میں ادب افق پر ابھرا اور چھانے لگے ہیں۔

ریحان اظہر لاہور میں پیدا ہوئے (انہوں نے تاریخ پیدائش اور سن لکھنا پسند نہیں کیا) انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا اور ایک ایئر لائن میں ایگزیکٹو کے عہدے سے وابستہ ہو گئے۔ انہیں فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ بچپن میں آغاز ریڈیو میں صداکاری سے کیا۔ پھر ٹی وی میں بطور ہیرو بے شمار ڈرامے کئے۔ 1980ء میں پاکستان سے امریکہ آئے اور 1983ء میں سعودی عرب چلے گئے۔ سو اب وہیں مقیم ہیں۔

ریحان اظہر کی پہلی کتاب سفرنامہ ہے "ہائے امریکہ' ہائے امریکہ" جسے جنگ پبلشرز نے چھاپا۔

اب تک چار ایڈیشن آچکے ہیں۔ اس کے بعد شاعری کا مجموعہ "جانم" الحمد پبلشرز لاہور نے شائع کیا۔ دوسرا ایڈیشن ختم ہوچکا ہے۔ اظہر کو نثر سے بھی دلچسپی ہے چنانچہ ان کے افسانوں کا مجموعہ "کھوکھلے لوگ" ترتیب پبلشرز نے چھاپا۔ اس کے بعد دو ایڈیشن آچکے ہیں۔ ان کی چوتھی کتاب انگریزی شاعری ہے "My Heart Beat" امریکہ میں شائع ہوئی ہے۔ امریکہ کے موجودہ صدر جناب بل کلنٹن نے انہیں اس کے متعلق تعریفی خط بھی بھیجا ہے۔ ان کی پانچویں کتاب "رابعہ زندہ ہے" ایک ناول ہے جو عورتوں کے مسائل اور مشکلات سے متعلق ہے۔ اس کے بھی دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

ریحان سے "گفتنی" کے لئے چند سوالات پوچھے۔ ایک سوال یہ کہ بیسویں صدی میں اردو ادب کی تاریخ میں موجود رہ جانے والے چند ادیبوں کے نام بتائیں۔ ریحان نے بلا تامل کہا۔ جناب احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، احمد فراز اور اشفاق احمد۔

فکشن میں جدیدیت کی شمولیت سے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جدیدیت میں اگر جدت ہو اور ادب کی بنیاد پر لکھا جائے تو اس میں نکھار آتا ہے اور اگر اس کے برعکس ہو تو اس کا آرٹ مجروح ہوتا ہے۔

ریحان کہتے ہیں موجودہ صدی میں اردو ادب میں کم ناول لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ناول نویسی ایک محنت طلب کام ہے۔ تجربہ، سوچ کی وسعت، کردار نگاری میں مہارت اور پلاٹ پر مکمل عبور بہت ضروری ہے۔ بغیر اس کے آپ ایک کامیاب ناول نہیں لکھ سکتے۔ ان کا کہنا ہے میں نے حال ہی میں ایک ناول "رابعہ زندہ ہے" لکھا ہے جسے لکھنے میں، میں نے دو سال صرف کئے۔

آج کا ادیب نفسیاتی اور روحانی بحران سے کیسے نکلے اس ضمن میں کہتے ہیں۔ ہمارے ماحول اور نظام میں ادب روحانی تسکین کا ذریعہ تو بن سکتا ہے لیکن ذریعہ معاش نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسے "پارٹ ٹائم شوق" کے طور پر اپنایا جائے۔ اچھے ادیب کے لئے مالی مشکلات سے آزاد ہونا ضروری ہے۔

معیاری ادب کے پیمانے کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں ان کا کہنا ہے۔ میرے نزدیک معیاری ادب وہ ہے جو ایک عام قاری کی سمجھ میں آئے اور اس کے مطالعے کی تسکین کا باعث بنے۔ وہ جھنجھلا کر اسے پرے نہ پھینک دے۔"

بیرون پاک و ہند میں شاعری کے بجائے نثر کم لکھی جارہی ہے۔ اس کی وجوہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا "شاعری ادب کی ایک مقبول صنف ہے۔ ہمارے ہاں اسے لکھنا اور سمجھنا آسان سمجھا جاتا ہے اور جو چیز آسان ہو وہ زیادہ سامنے آتی ہے۔

ریحان اظہر کی رائے میں اردو تحریروں میں انگریزی کے الفاظ کے استعمال سے گریز کرنا چاہئے۔ اس سے اردو کا تشخص مجروح ہوتا ہے۔ پوچھتے ہیں کیا انگریزی ادب میں اردو کے الفاظ

استعمال کئے جاتے ہیں؟ اور اگر ہوں تو انگریزی کی شکل کیا ہو؟

ریحان کا خیال ہے کہ آج کے اردو ادب کے زوال میں سب سے بڑی وجہ ناقدوں کی کمی ہے۔ آج تنقید برائے تنقید ہوتی ہے جبکہ تنقید برائے ترقی ہونی چاہئے اور پھر ناقدوں کا خود قابل ہونا بھی ضروری ہے۔ علاقائی زبانوں پر کام کے لئے حکومت پاکستان نے ایک ادارہ بنایا تو ہے۔ دیکھئے کیا کام سامنے آتا ہے۔

اپنی زندگی کے یادگار واقعات سناتے ہوئے ریحان اظہر نے کہا میری انگریزی شاعری کی تعریف میں امریکہ کے صدر بل کلنٹن کا میرے نام خط ایک خوش گوار واقعہ تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا بطور صدر منو بھائی کے اسٹیج ڈرامے "جلوس" میں میری اداکاری کو سراہنا بھی ایک یادگار واقعہ تھا اور ایک واقعہ جو میرے ملک میں پیش آیا آج بھی برچھی کی کہانی کی طرح چبھتا ہے۔

میرے والد جناب محمد اظہر مرحوم جو کہ خود بھی ایک شاعر تھے' مجھے بے حد عزیز تھے۔ ان کی موت ایک حادثے میں ہوئی۔ حادثے کے بعد جب ان میں کچھ سانسیں باقی تھیں۔ ان کو ایمبولینس میں ڈال کر ہسپتال لے جایا جا رہا تھا۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ ان کا جلد از جلد ہسپتال پہنچنا ضروری تھا لیکن راستے میں ایک بارات جس کے ساتھ بے شمار بینڈ باجے والے تھے' انہوں نے پوری سڑک روک رکھی تھی۔ میرا دل رو رہا تھا لیکن پس منظر میں بینڈ باجے کی آوازیں تھیں۔ میں ایمبولینس سے اترا اور بارات کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن کوئی میری آواز نہیں سن رہا تھا اور جب انہوں نے میری آواز سنی اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی کیونکہ میرے والد صاحب دم توڑ چکے تھے۔ آہ! وہ بارات... ریحان اظہر کی ایک چھوٹی سی کہانی ضرور پڑھ لیں۔

نیلی آنکھیں

جب میں پہلی مرتبہ امریکہ گیا تو میرے پاس صرف پانچ سو ڈالر تھے جو کہ امریکہ پہنچتے پہنچتے چار سو رہ گئے۔

پاکستان سے نکلتے وقت جب ڈالروں کو پاکستانی روپوں سے ضرب دی تو رقم خاصی لگتی تھی۔ لیکن امریکہ جا کر پتا چلا کہ وہاں ایک کا مطلب ایک ہی ہوتا ہے کیونکہ جس طرح ہمارے ہاں روپیہ ایک یونٹ ہے اسی طرح وہاں ڈالر کی حیثیت بھی ایک یونٹ ہی کی ہے۔

اس احساس سے کہ اب صرف چار سو ڈالر باقی ہیں مجھے اچھی خاصی کپکپی طاری ہو گئی اور میرے دانت کٹ کٹ بجنے لگے۔ اس کپکپی کے طاری ہونے میں دسمبر کی سخت برفانی سردی کے ساتھ ساتھ جیب کے ہلکے ہونے کا بھی حصہ تھا۔

نیویارک 1980ء میں اتنا مہنگا نہیں تھا جتنا کہ آج ہے۔ اس وقت انڈر گراؤنڈ ٹرین کا کرایہ ساٹھ سینٹ تھا جو کہ اب 1991ء میں بڑھ کر ایک ڈالر اور پچیس سینٹ ہو گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے چار سو ڈالروں نے اس زمانے میں پندرہ دن تک میرا ساتھ دیا۔

اب میری جیب میں صرف ایک ڈالر اور ساٹھ سینٹ باقی تھے اور مجھے نیویارک اور Queens سے Manhattan جانا تھا۔ انڈر گراؤنڈ ٹرین کا کرایہ ساٹھ سینٹ تھا۔ میں نے Queens اسٹیشن سے ایک ٹوکن خریدا اور Manhattan پہنچنے کے لئے ٹرین پر سوار ہو گیا۔

میری پریشانی اپنے عروج پر تھی کیونکہ سات سمندر پار' دیار غیر' جیب میں صرف ایک ڈالر' نہ کوئی عزیز' نہ کوئی رشتے دار' نہ کوئی دوست' امریکہ کا حسن اب آہستہ آہستہ میرے لئے ماند پڑ رہا تھا۔ وہاں کے نظارے دھندلا رہے تھے۔ بار بار میرا ہاتھ جیب میں پڑی P.I.A ریٹرن ٹکٹ کی طرف جا رہا تھا۔ "اوہ! یہ کیا ہوا میری ٹکٹ کہاں ہے.....؟" میں نے چند سیکنڈوں میں اپنی تمام جیبوں کو ٹٹول ڈالا۔ سخت سردی میں میرے ہاتھ پر پسینہ تھا۔ پوری ٹرین میں جیسے میں ایک واحد شخص تھا جو پریشان تھا لیکن مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ امریکہ میں کوئی کسی کو نہیں دیکھتا۔ سب اپنی اپنی سوچ میں غرق دکھائی دیتے تھے۔ میرے اندر ایک شخص چیخ چیخ کر ان سب کو پکار رہا تھا اور کہہ رہا تھا" اے امریکہ کے لوگو! دیکھو میں کتنا بے بس ہوں۔" لیکن اندر کی آواز تو کسی کو بھی سنائی نہیں دیتی۔

ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی اور رکی ہی رہ گئی۔ میں جیسے اچانک نیند سے بیدار ہو گیا۔ ایک پولیس والا ٹرین میں سوار ہوا۔ میں نے پوچھا "Manhattan کتنی دیر میں آئے گا؟"۔ "ارے! وہ تو بہت پیچھے رہ گیا۔ یہ تو ورلڈ ٹریڈ سینٹر ہے اور اس ٹرین کا آخری اسٹاپ ہے۔ اب یہی ٹرین واپس جائے گی تو تم Manhattan پر اتر جانا" اس نے بڑے اخلاق سے جواب دیا۔

امریکہ میں بھولے بھٹکے اور بے ڈالر مسافروں کے حق میں ٹرینوں کے کرائے کا یہ نظام اچھا ثابت ہوتا ہے کہ ایک ٹوکن اس وقت تک کارآمد رہتا ہے جب تک مسافر مکمل طور سے اسٹیشن سے باہر نہ چلا جائے۔ اسی لئے مجھے یہ اطمینان تھا کہ کم از کم مجھے نیا ٹوکن تو نہیں لینا پڑے گا واپس Manhattan جانے کے لئے۔

ٹرین میں صرف چند مسافر تھے۔ جیسے ہی ٹرین چلنے لگی ایک انتہائی خوبصورت لڑکی ٹرین پر سوار ہوئی اور جھٹکا لگنے سے میرے سامنے والی سیٹ پر جیسے گر گئی۔ ٹرین میں خاصی خاصی سردی تھی کیونکہ اس زمانے میں نیویارک کی ٹرینوں کی حالت کافی خستہ تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوتے تھے اور جگہ جگہ سیاہ روشنائی سے مختلف زبانوں میں طرح طرح کے سلوگن ٹرینوں کی دیواروں پر درج ہوتے تھے۔ جس کا داؤ لگتا تھا کچھ نہ کچھ لکھ جاتا تھا۔

ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے لڑکی ٹھٹھر رہی تھی۔ سردی میں ٹھٹھرتی ہوئی وہ اور بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔ وقتی طور پر جیسے میں اس کے حسن میں کھو گیا اور اپنی پریشانیوں کو بھول گیا۔ ریشمی' بھورے بالوں والی گورے رنگ کی خوبصورت لڑکی اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھوں سے مجھے تکے جا رہی تھی۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا شخص اس کے حسن بے بہا سے بے خبر اخبار پڑھنے میں مشغول تھا۔ ٹرین' وال اسٹریٹ کے اسٹاپ پر رکی اور وہ شخص اتر کر چلا گیا۔ اچانک میری نظر اس خالی سیٹ

پر پڑی جس پر سے وہ اخبار پڑھنے والا شخص اترا تھا۔ ایک سیاہ رنگ کا خوبصورت بٹوہ جو کہ ڈالروں سے بھرا ہوا تھا' وہاں اس سیٹ پر پڑا تھا جو یقیناً" وہ شخص اترتے ہوئے بھول گیا تھا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اللہ تعالیٰ کو میری حالت پر ترس آگیا ہو اور اس نے میرے لئے آسمانوں سے ڈالر بھیجے ہوں۔

میرے سامنے بیٹھی نیلی آنکھوں والی خوبصورت لڑکی' کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ جونہی میں بٹوہ اٹھانے لگا اس کی نظر مجھ پر پڑی میں نے گھبراہٹ کے عالم میں بٹوہ واپس اسی سیٹ پر پھینک دیا اور خود بٹوہ کے اوپر بیٹھ گیا۔ میں کسی بھی طرح بٹوہ کو اپنی جیب میں ڈالنا چاہتا تھا لیکن اس لڑکی کے خوف سے ایسا نہ کرسکا۔ لڑکی متواتر مجھے دیکھے جارہی تھی۔ میرا پورا جسم گھبراہٹ کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہورہا تھا۔

آخر میں نے جلدی سے بٹوہ اٹھایا اور اپنی جیب میں ڈال لیا لیکن جیسے ہی میں نے ایسا کیا' وہ لڑکی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں ڈر گیا۔ اسی طرح جیسے کوئی شخص چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکی شور مچاتی' میں نے ڈالروں سے بھرا ہوا بٹوہ چلتی ٹرین میں کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

اتنے میں ٹرین رکی۔ وہ لڑکی جو پہلے سے کھڑی تھی اور مجھے تکے جارہی تھی کہنے لگی۔ "پلیز! کیا آپ مجھے دروازے تک لے جاسکتے ہیں۔ مجھے یہاں اترنا ہے؟" میں نے اپنے کانپتے ہوئے یخ بستہ ہاتھوں سے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور دروازے تک چھوڑ دیا۔ وہاں ایک شخص پہلے سے اس کا انتظار کررہا تھا۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور ساتھ لے گیا۔

"ارے یہ کیا! لڑکی تو اندھی تھی۔" میں نے اپنے آپ سے ہنستے ہوئے کہا اور کہتا چلا گیا "یہ لڑکی تو اندھی تھی.... اندھی تھی اندھی تھی....."

MR. REHAN AZHER, P.O. BOX 2836,
RIYADH 11461, SAUDI ARABIA

ساتھی ہاتھ بڑھانا
ایک اکیلا تھک جائے گا
مل کر بوجھ اٹھانا
ساتھی ہاتھ بڑھانا
(ساحر)

سائیں سچا

سائیں سچا

سویڈن

سائیں سچا نے بہت علم حاصل کیا مگر اپنے علم کا شور مچانے سے گریز کیا۔ بس چپکے چپکے کام کرتے رہے اور کتابوں کی لڑیوں میں علم کے موتی پروتے رہے۔ اس کام کا آغاز انہوں نے 1985ء سے کیا۔ ان کی پہلی کتاب کا نام ہے "The Roots of Misery" انگریزی میں لکھی گئی اس کتاب میں انہوں نے پاکستان کے سیاسی و سماجی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے تیسری دنیا کے دیگر صنعتی ممالک کا سماجی فلسفے کی روشنی میں پاکستان اور سویڈن کو مثال بناتے ہوئے تقابلی جائزہ لیا ہے۔

ان کی دوسری کتاب "Manniskans Anrop" احمد فراز کی 230 نظموں کا سویڈش زبان میں ترجمہ ہے جو Gail Ramsay کے تعاون سے انہوں نے 1986ء میں مکمل کیا۔

"Inte Ensam" ان کی تیسری کتاب کا نام ہے۔ یہ فیض کی 28 نظموں، غزلوں کا سویڈش میں ترجمہ ہے جو 1987ء میں Gail Ramsay کے ساتھ انہوں نے مکمل کیا۔

چوتھی کتاب فیض کی 33 نظموں، غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ "Memory" کے عنوان سے 1987ء میں انہوں نے خود کیا۔

کامیاب اور ناکام کاوشیں اس پورے عمل کا حصہ ہوتی ہیں جو مختلف ادیبوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ ابھی کافی وقت درکار ہے کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ جدیدیت کا اردو ادب پر کیا اثر پڑا۔

4- موجودہ صدی ہی نہیں، اردو زبان میں ویسے ہی بہت کم ناول لکھے گئے ہیں۔ ایک غزل، نظم یا افسانہ عموماً" ایک بیٹھک میں ہی لکھا جاتا ہے۔ اس کے مقابل ایک اچھا مضمون یا ناول بالکل مختلف برتاؤ مانگتا ہے۔ اگر ایک لکھاری نسیم حجازی کی مانند تاریخ یا حقائق کو محض اپنے دماغ کی پیداوار ہی نہیں سمجھتا تو اس کے لئے علم کا حصول ایک بنیادی ضرورت ہوتی ہے جو تفصیلی مطالعے اور کھوج کے بعد ہی پوری ہو سکتی ہے۔ اردو ادیبوں میں ابھی تک بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس قسم کا شوق رکھتے ہیں۔

5- انسان نے جب سے اپنا دماغ منطقی سطح پر استعمال کرنا شروع کیا ہے وہ اسی بحران میں مبتلا ہے جسے آپ صرف آج کل کے دور سے وابستہ کر رہی ہیں۔ انسانی علم کے حصول کا بس ایک ہی طریقہ ہے، حقائق اور اردگرد کے عوامل کا مشاہدہ، اس کی ذاتی اور مشترکہ طور پر پرکھ اور پھر اس پرکھ کے بعد ان یقینوں کو علم میں ڈھالنا جو کسوٹی پر پورے اتریں اور ان یقینوں سے چھٹکارا حاصل کرنا جو محض خوش فہمی یا بدخیالی پر مبنی ہوں۔ میری نظر میں انسانیت یا انسان دوستی (humanism) ہماری روشن خیالی کے لئے ایک بہترین راستہ ہے۔

6- پیمانہ وہی اچھا ہے جو نہ تو خالی ہو اور نہ ہی چھلک کر گند ڈالے۔ معیاری ادب انسانی خیالات کی وہ تشکیل ہے جو وقت اور جگہ کی پابندی سے آزاد ہمارے ذوق لطیف و ثقیل کی تسلی کرتے ہوئے ایسے اثرات بھی پیدا کرے جو ہمیں مزید سوچنے پر اکسائیں اور اگر یہ خیالات کچھ ایسے انداز سے پیش کئے جائیں کہ وہ کسی مخصوص بھاشا کے علاوہ کسی بھی اور زبان میں ڈھالے جا سکیں تو تب ہم ایک عالمی ادب کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

7- اس کا سبب نہ تو موضوعات کی کمی اور نہ ہی جرات کی۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں شاعری کا ابہام اس میں خیال کی وسعت اور گہرائی پیدا کرتا ہے وہاں وہ ایک ایسی دیوار بھی مہیا کرتا ہے جس کے پیچھے چھپ کر انتہائی بے معنی، فضول اور کبھی کبھی واہیات الفاظ کی بوچھاڑ سے معصوم ذہنوں کو مجروح کیا جاتا ہے۔ نثر میں بھی ہر طرح کی تحریر ممکن ہے لیکن لکھاری کے پاس چھپنے کے لئے جگہ بہت کم ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک نثری تعمیر عموماً" اپنے معمار سے زیادہ وقت اور منطق مانگتی ہے جبکہ آج کل وقت کی دستیابی اور منطق کا درست استعمال ہی نایاب اجزاء ہو چکے ہیں۔

8- آپ کا کہنا بجا ہے کہ اردو کئی زبانوں کا مخلوط ہے جس میں انگریزی بھی شامل ہے۔ میری نظر میں انگریزی یا کسی بھی اور زبان کا اس وقت استعمال جب وہ اردو میں نئے خیالات اور سوچ کا اضافہ یا کسی خاص ماحول کی عکاسی کریں بالکل جائز ہے لیکن کسی غیر لفظ کا برتنا اگر صرف سستی یا ایک شخص کا محض یہ دکھانا کہ اسے انگریزی بھی آتی ہے تو یہ ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ اگر لکھتے لکھتے

پانچویں کتاب 1987ء میں ہی انہوں نے "Discourses With It" کے نام سے انگریزی میں سات کہانیاں لکھیں۔ 1988ء میں ان کہانیوں کا سویڈش زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ معاونت تھی Ylva Hildeman and Gorel Hildeman کتاب کا نام "Mote Med Det" ہے۔

ساتویں کتاب انہوں نے ساحر لدھیانوی کی 30 نظموں' غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ "Sorcery" کے نام سے کیا۔

ساؤتھ ایشیاء میں پیدا ہونے والے مگر بعد میں یورپ اور امریکہ میں مقیم ان چودہ ادیبوں کی نثری و شعری تحریروں کی تالیف 1991ء میں انہوں نے کی۔ یہ چودہ ادیب وہ تھے جو جو 1989ء میں اسٹاک ہوم میں منعقد ہونے والے سیمینار میں شریک تھے۔

1992ء میں انہوں نے ڈاکٹر خالد سہیل کے اردو ناول "ٹوٹا ہوا آدمی" اور دیگر افسانوں کا انگریزی میں "A Broken Man and Other Stories" کے عنوان سے کیا۔

"چٹکیاں" کے عنوان سے انگریزی میں لکھی گئی آٹھ کہانیوں اور تین مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا۔

سعید انجم اور سائیں سچا کی پانچ پانچ اردو کہانیاں "سوچیں" کے عنوان سے مرتب کی گئیں۔

میں سائیں تک بہت دیر میں پہنچی جب ان کا پتا ماہنامہ "شاعر" میں دیکھا تو انہیں خط لکھا۔ میرا خط پاکر انہوں نے اپنی مختلف کتابیں بھیجیں اور سوالات کے جواب بھی لکھے۔ 12/ اپریل 1941ء کو مشتاق احمد منٹگمری (پاکستان) میں جواب ساہیوال شہر کے نام سے جانا جاتا ہے) پیدا ہوئے۔ قلمی نام "سائیں سچا" اختیار کیا۔ تعلیم بی ایس سی (پنجاب یونیورسٹی) فیل کاند (اسٹاک ہولم یونیورسٹی) سے حاصل کی۔ پھر مختلف مزدوریاں کیں جن میں ریسرچ کیمسٹ' مستری' کتب فروش' فوٹو گرافر' ڈسک جوکی' کلب ماسٹر' تاجر' ٹیکسی بان اور ناشر سب ہی کچھ شامل ہے۔ یوں زندگی کے تلخ اور میٹھے تجربات و مشاہدات سے آشنا ہوئے۔ سوال نامہ اپنے سامنے رکھ کر لکھتے ہیں۔

2- فیض احمد فیض' ساحر لدھیانوی' سعادت حسن منٹو' کرشن چندر' پریم چند' غلام عباس' احمد ندیم قاسمی' احمد فراز' راجندر سنگھ بیدی' عصمت چغتائی' اشفاق احمد' انتظار حسین' عبداللہ حسین' پطرس بخاری' قرۃ العین حیدر' شفیق الرحمن' فہمیدہ ریاض' کشور ناہید' وزیر آغا' ناصر کاظمی' گلزار اور منیر نیازی اردو کے اعلیٰ لکھاریوں میں سے ہیں۔ ان کے علاوہ دور حاضر میں ہندوپاک سے باہر اہم ادیبوں میں ساقی فاروقی' بخش لائلپوری' اشفاق حسین' خالد سہیل' سعید انجم' افتخار نسیم' جتیندر بلو' حمیرا رحمن' نعیمہ ضیاءالدین' منیر الدین احمد اور نسیم سید کا نام شامل ہونا چاہئے اور چند نام جو میری یادداشت میں نہیں ہیں۔

3- ایک اچھا لکھاری جس طرح بھی لکھے وہ الفاظ کی کلیاں کھلائے گا۔ جدیدیت ایک نئے انداز سے سوچنے اور لکھنے کا طریقہ ہے جس کا تجربہ اردو میں بھی ہوا۔ ایک ادبی تجرباتی دور میں

ایک ادیب کو اپنے خیالات کو گرفت میں لینے کے لئے بالکل مناسب الفاظ نہ ملیں تو لغت میں محنت کرنی چاہئے اور اگر مناسب ہو تو نئے الفاظ کی تشکیل اردو کے ہی موجودہ مواد میں سے ہونی چاہئے۔ مجھے یہ بھی اقرار ہے کہ عربی اور فارسی کا اردو میں زبردستی دخول انتہائی غلط اور مضر ہے۔

پوری زندگی ہی ایک دلچسپ حادثہ ہے۔ جب میں پیدا ہوا تو اس دنیا میں اکثریت ایک دوسرے کو مارنے پر تلی ہوئی تھی' جب ذرا بڑا ہوا تو ہمسائے نے ہمسائے کا خون کیا' لاکھوں لوگ چند افراد کی انا کی تسلی کے لئے قربان ہوئے اور ان قربانی دینے والے افراد کے تحفظ کے لئے بھی وہی لوگ آگے آئے جنھوں نے انہیں ایک دوسرے کے قتل کے لئے اکسایا تھا۔ جوانی نے دل پر دستک دی ہی تھی تو ذہن نے کہا کہ کوچ کا وقت آچکا ہے اپنا آشیانہ اس جھوٹے اور دوہرے معیاروں والی خلقت سے ہٹ کر کہیں اور بناؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے پیاروں سے دور بہت دور غیروں میں پہلی مرتبہ بلا کسی بندش اور جبر کے سوچنے' سیکھنے اور پھر کہنے کا موقع ملا۔ مغرب کو ہندوپاک میں مشرقی دلال بہت بھیانک معاشرے کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ مغرب کے چند بد اخلاق سیاستدانوں اور سرمایہ داروں کے باوجود یہ لوگ انسانیت کی ایک ایسی دنیا بنانے میں مصروف ہیں جس کی ہر مرد مومن اپنی موت کے بعد توقع رکھتا ہے۔ میرا یہ کہنا نہیں کہ مغربی معاشرہ ہر قسم کی بدی سے آزاد ہوچکا ہے بلکہ یہ اصرار ہے کہ یہاں بدی کو کھلے طور پر بدی اور جھوٹ کو جھوٹ کہا جاسکتا ہے اور جہاں ظلم و تشدد کی کھلی نشان دہی ہوسکے وہاں ان عیبوں کو مٹانے کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ میرا خود آج زندہ ہونا اور میرے ساتھ ہجرت کرنے والے لاکھوں افراد کا مغرب میں بس جانا ایک جامع ثبوت ہے کہ ہمیں گھر کی دھرتی سے زیادہ دیار غیر کی مٹی راس آئی۔ ان لوگوں نے ہمیں کیوں آنے دیا اور ان کے سرمایہ داروں کے کیا مقاصد تھے وہ ایک اور قصہ ہے لیکن حقیقت یہ ہی ہے کہ ہم یہاں آئے' محنت کی اور اپنی محنت کا اجر ملنے پر اس اجنبی ماحول اور ان اجنبیوں کے درمیان جم سکے۔

میری زندگی کا سب سے اہم واقعہ یہ ہی ہے کہ جب میں چھ برس کا تھا تو مجھ سے چند گز پرے ایک نہتے مزدور سکھ کو ایک ایسے انسان نے ذبح کردیا تھا جو اسے جانتا تک نہیں تھا اور اس قتل کے بعد شاید سوچ رہا ہو کہ اس نے کتنا نیک کام کیا تھا کہ ایک کافر کو مار دیا۔ میں بھی اس دن سے سوچ رہا ہوں کہ کیا کوئی ایسا بھی خالق ہوسکتا ہے جو اپنی مخلوق کو ایسے کرموں کی اجازت دے۔

10- ایک جائز ادبی تنقید تب ہی ممکن ہے جب ایک نقاد ہر قسم کے دباؤ سے ہٹ کر ایک تحریر یا خیال کو پرکھ سکے جس ماحول میں اصحاب اقتدار کے پنجے احباب ادب کی گردنوں پر ہوں وہاں کیسے کوئی بے دھڑک تنقید کرسکتا ہے؟ یہ اصحاب اقتدار چاہے سیاسی بدمعاش ہوں یا ادبی غنڈے ان کا رویہ ایک جیسا ہی ہے۔ اردو کی بدقسمتی ہے کہ نہ تو اپنے گھر میں شاداں ہوسکی اور سسرال میں اسے اتنا گھٹن و جبر کا ماحول ملا کہ وہ اگر ناچے تو کانپ کانپ کر اور گائے تو سہم سہم کر۔

جہاں تک تراجم کا تعلق ہے تو یہ نشان دہی ضروری ہے کہ ایک زبان کا دوسری زبانوں میں ڈھل جانا اور دوسری زبانوں کے خیالات کو اپنا لینا اس کی اپنی بڑائی ہے۔ اس لئے اردو میں اور اردو سے ترجمہ ہونا لازم ہے۔ یہاں بھی ان تراجم کے نہ ہونے میں سیاست اور ہندوپاک کے حکمرانوں کے ذاتی مفاد کا تعلق زیادہ ہے۔ وہ لوگ یہ چاہتے ہی نہیں کہ کولھو کے بیل اپنی آنکھ کی پٹی ہٹا کر دور کی دنیا بھی دیکھ سکیں۔ جتنا ملک کی مختلف اقوام میں فاصلہ زیادہ ہو اتنے ہی امکانات کم ہیں کہ وہ کبھی متحد ہو کر موجودہ حکمرانوں کو للکار سکیں۔ ترجمے مختلف لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں اور یہ قربت وہاں کی سیاست کو راس نہیں۔ اس لئے مغرب میں بسے ہوئے اردو لکھاریوں کے لئے لازم ہے کہ وہ دنیا بھر کے ادب کو اپنی توفیق کے مطابق اردو میں قلم بند کریں اور اپنے ادب سے دوسری اقوام کو متعارف کریں۔

آپ نے سوال نمبر 9 کے ضمن میں سائیں سچا کے جذبات و احساسات کا مطالعہ کیا۔ ان حالات نے ہی سائیں کو سچ لکھنے کی دولت سے مالا مال کیا۔ ان کی تحریر سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

ہماری پوری قوم خود اپنی نفی ہے۔ ہم جس زمین سے کھاتے ہیں اسے ایک ریتیلے ،بنجر صحرا کے مقابلے میں حقیر سمجھتے ہیں' جس تہذیب سے ہمارا وجود پھولا پھلا اسے اجنبی احادیث کے سامنے جھوٹا مانتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ جس دھرتی سے کھائیں اسے اپنے پیار سے سینچیں جس پیٹ سے جنم لیں اس کی اچھائیوں کو دل سے پوجیں اور جس تہذیب سے ہمارا خمیر اٹھا ہو اس کی خوبیوں کا دنیا میں پرچار کریں۔ آپ بتائیں وہ اقوام جو ہمارے بچوں کو جانوروں سے کمتر سمجھ کر انہیں اپنی تفریح کے دوران اونٹوں کے پاؤں تلے کچلوانے سے گریز نہ کریں' ہماری بچیوں کو زبردستی بطور داشتہ استعمال کریں' ہمارے جوانوں کے ساتھ عہد قدیم کے غلاموں سے بھی بدتر سلوک کریں' ہم ان ہی اقوام کی ایک ایک عمارت کے لئے اپنے سارے گھر گروا سکتے ہیں' ان کی جان کی حفاظت کے لئے اپنے سیکڑوں بیٹے مروا سکتے ہیں تو پھر ہمارے بچے کس ملک' قوم یا پرچم کے لئے دنیا کے دوسرے جوانوں سے مقابلہ کریں گے؟ ان کے پاس سر اٹھانے اور سینہ تاننے کے لئے کچھ تو ہو جو دوسروں کی طرح بلند ہو۔ آپ.....

ارشد: کس چکر میں پڑ گئے یار؟ دائیں دیکھو' بائیں دیکھو' باغ بہشت میں بیٹھے ہو' کیوں یہاں دل جلانے کی باتیں کرتے ہو؟

سائیں جی: اس باغ بہشت کو دیکھ کر ہی تو دل جلتا ہے۔ اس باغ سے نہیں' اس کے برعکس کے تصور سے۔ جانتے ہیں کہ یہی عورتیں وہاں بھی ہیں جنہیں ہم مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے کو سر سے پاؤں تک ڈھانپ کر رکھیں لیکن یہاں پر یہ صرف ایک رومال باندھ کر کیوں بے خوف و خطر لیٹی ہیں اور ہر وہ جابر جو انہیں وہاں کوڑے مارنے کو تیار ہے۔ اس کی یہاں اتنی مجال نہیں کہ ان سے اونچی آواز میں بات تک کر سکے۔ ہمارے مرحوم امیر المومنین اپنے ملک میں قدرت کے بنائے ہوئے ان

کرشموں پر پردہ ڈلوا کر خود ہاتھ میں کشکول پکڑے مارگریٹ تھیچر جسے اس کی پارٹی والے آہنی فوطوں والی میگی کہتے تھے کے گھٹنوں کے پاس سر رکھے اس سے معاشی اور اسلحہ کے اترن کی بھیک مانگتے تھے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ وہاں عورت کا سر جھکوانے والے پر تکبر مرد خود مغرب کی عورتوں‘ چاہے وہ ملک کی وزیر اعظم ہو یا کسی سوشل مدد کرنے والے دفتر کی کلرک‘ کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں عورت اور مرد کا امتیاز صرف بستر تک محدود ہے۔ بستر سے باہر یہ سب اس قوم کے خود اختیار اور معاشی طور پر آزاد افراد ہیں جو صرف نوے لاکھ کی آبادی سے یورپ میں رقبہ کے لحاظ سے تیسرے سب سے بڑے ملک کے مالک ہیں۔ یہاں ہر کوشش کی جاتی ہے کہ ایک دوسرے کا ایک منظم طریقہ سے خیال کریں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس معاشرے میں مکمل انسانی مساوات کا راج ہے مگر یہ لوگ اس منزل کی طرف نہ صرف گامزن ہیں بلکہ اس کے کافی قریب پہنچ چکے ہیں۔ گو یہاں بھی نسل پرست اور شرانگیز لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان کے حکومتی افسر‘ ان کے حکمران نہیں بلکہ نوکر سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے حرامی حکمران ان غداروں کی اولاد ہیں جنھوں نے اپنے وقت میں سب غاصب اقوام سے اپنے لوگوں کے خلاف تعاون کیا۔ جناب عالی‘ حضور اعلیٰ جہاں پناہ‘ یس سر‘ نو سر کہنے کے صلے میں آج خان بہادر‘ جاگیردار صاحب اور سائیں وڈیرا کہلوانے والے یہ سب بہروپیئے دشمن عوام ہیں۔ جنھیں ورثے میں غداری ملی ہو اور ان کی موجودہ جائیداد اس گذاری کا ملا ہوا انعام ہو وہ کیسے کبھی خلوص دل سے محب قوم ہو سکتے ہیں؟

”آپ بہت سخت قسم کا الزام لگا رہے ہیں‘ ارشد میاں۔“ حاجی صاحب نے ارشد سے کہا۔

کیوں نہ لگاؤں؟ دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد کتنی اقوام نے آزادی کا جنم لیا تھا۔ ذرا گھوم کر جدید تاریخ پر نظر ڈالیں۔ بھارت‘ چین‘ اسرائیل‘ انڈونیشیا‘ سری لنکا‘ ملائشیا‘ سنگاپور‘ برما‘ کوریا‘ ویت نام سب وہ ایشیائی ممالک ہیں جنھیں ہمارے ساتھ یا بعد میں آزادی ملی۔ آج یہ سب ممالک معاشی اور اقتصادی دوڑ میں ہم سے میلوں آگے بڑھ چکے ہیں۔ ان ممالک کے مذاہب مختلف‘ زبانیں مختلف‘ ثقافت مختلف مگر ایک چیز مشترک ہے۔ انھوں نے خود اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کی خود لڑے اور خود اپنا ملک حاصل کیا۔ اس لئے انھیں اپنی زمین‘ زبان‘ تہذیب اور قومیت پر فخر ہے اور وہ ان کی قدر کرتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی بمبئی کا وکیل نہیں بولا تھا یا پورب‘ بہار اور مشرقی پنجاب کے شہید نہیں گرے تھے۔ ہمارے لئے بولا کوئی‘ لڑا کوئی‘ مرا کوئی۔ دوسروں کے جلتے گھروں سے ہم نے اپنی نئی تاریخ کا چراغ روشن کیا جس میں تیل کی بجائے لاکھوں معصوموں کا خون جلا اور اپنے سر کا ایک بال گرائے بغیر ہمارے جاگیرداروں‘ سرداروں اور وڈیروں کے ہاتھ میں دنیا کی چھٹی یا ساتویں سادہ لوح خلقت آ گئی جسے انھوں نے کولھو کا بیل بنا کر‘ ملاؤں کے دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کروانے کے بعد‘ ماضی کے قصوں کے چکر میں گھما گھما کر شعوری طور

پر بالکل خصی کر دیا ہے۔ حاجی صاحب! ہمارا ملک اس لئے بنا تھا کہ وہاں اب مسلمانوں سے کبھی زیادتی نہ ہوگی۔ الرحمن الرحیم کا نظام قائم ہوگا' ذات پات کی تقسیم کی جگہ انسانی اخوت اور ہمدردی بڑھے گی نہ کہ اس لئے کہ وہاں بد فطرت خبیث کبھی خاکی وردی پہن کر کبھی بالوں کا نقاب اگا کر اسلام کے نام پر ہر انسان سے زیادتی کریں۔ آپ ہی بتائیں ہر روز آپ آکر ان برہنہ دوشیزاؤں کے ساتھ بیٹھتے ہیں' کبھی کسی کی عزت خطرے میں نظر آئی' کسی کی عصمت لٹی؟ اس کے برعکس ہماری ہر عورت سے' چاہے وہ سر پر صرف چادر پہنے یا اپنے کو برقعہ میں مقید رکھے' ہمارے ملک میں ہر قدم پر سب ہوس کے مارے بصری زنا کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بے حیائی کہاں ہے' یہاں یا وہاں؟

SAIN SUCHA
P.O. BOX 6099, 19206
SOLLENTUNA, SWEDEN

کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے
نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے۔

سجاد حیدر۔
۶ نومبر ۹۶ء

سید سجاد حیدر
انڈیانا

اللہ تعالیٰ اگر ماں باپ کے دلوں کو اولاد کی محبت کی آماجگاہ نہ بناتا تو آج انسان کا شمار اشرف المخلوقات میں ہرگز ہرگز نہ ہوتا۔

کہتے ہیں ماں کی محبت کا کوئی بدل نہیں۔ اور یہ بھی کہ ماں سے زیادہ اولاد کو دنیا میں کوئی اور چاہ ہی نہیں سکتا اور ٹیپ کا بند یہ کہ ایک ماں اپنی اولاد کو جس درجہ چاہتی ہے باپ نہیں چاہ سکتا۔ مگر یہ کلیہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ ساری مثالیں سو فیصد درست ہیں۔ شہنشاہ بابر کا تاریخی واقعہ سب کو ہی معلوم ہوگا کہ اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کی بیماری کے موقع پر اس کے پلنگ کے گرد چکر لگا کر خدا سے اس کی صحت کے لئے دعا مانگی اور اپنی زندگی قربان کر دی۔

امریکا کی ایک ریاست انڈیانا میں رہنے والے ڈاکٹر سید سجاد حیدر بھی ایسے ہی ایک باپ ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کے علاج اور اس کی نگہداشت کی خاطر قریہ قریہ خاک چھانی اور معذور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے خصوصی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے اپنے مشاہدات اور تجربات پر مبنی ایک کتاب لکھی جو زیرِ طبع ہے۔ کتاب کا نام ہے "صحرا کے پھول۔"

سید سجاد حیدر ۹ دسمبر ۱۹۲۴ء کو گجرات پنجاب میں پیدا ہوئے ان کا آبائی گاؤں مسانیاں (تحصیل بٹالہ) ضلع گورداس پور ہندوستان ہے۔

سجاد حیدر نے ۲۹ دسمبر ۱۹۴۴ء میں پنجاب ایگریکلچر کالج سے گریجویٹ ہونے کے بعد پنجاب گورنمنٹ کے محکمہ انہار کے شعبہ اصلاح اراضی میں ۲۲ سال ملازمت کی۔ آباد و زرخیز زمینوں میں باغبانی کی نسبت شور زدہ غیر آباد و نشوونما سے معذور زمینوں کی قوت روئیدگی کو بحال کرنے میں انہیں سکون و راحت قلب ملتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا تو سجاد حیدر مجبوراً" آبائی گاؤں چھوڑ کر پاکستان آ بسے۔

انہوں نے بتایا "اللہ تعالیٰ نے دو بیٹیاں ثمینہ اور مبینہ اور دو بیٹے شہید عباس حیدر و قاسم عباس حیدر عطا کئے۔ شہید ۶ سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ قاسم عباس حیدر کی قوت گویائی ذہنی معذوری کی وجہ سے نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لئے ۱۹۶۴ء میں اسے علاج اور خصوصی تعلیم کے لئے لندن میں اپنی بہن سیدہ خالدہ رحمان کے پاس چھوڑ کر خود اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ پہنچ گیا اور Soil Science میں ایم۔ ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ جب لندن میں اسپیشلسٹ نے بتایا کہ قاسم عمر دوسروں کا محتاج رہے گا۔ تو راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ ایسے بچوں سے جو سلوک پاکستان میں ہوتا ہے۔ یہ آگاہی ہی سکھ اور چین کو ڈسنے لگی۔ اصلاح اراضی کو تیاگ کر اسپیشل ایجوکیشن پی ایم ایس سی اور ۱۹۷۱ء میں ایجوکیشن میں پی۔ ایم ڈی کی ڈگری حاصل کر کے پاکستان و دیگر افریقی و ایشیائی ممالک میں معذور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے خدمات پیش کیں۔ ہر طرف سے مایوس کن جواب ملا کہ۔

"ہم ذہین بچوں کی تعلیم کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور آپ معذور بچوں کی بات کرتے ہیں۔" سال بھر پاکستان میں جو کوشش کی وہ پتھر سے ٹکرانے کے مترادف تھی۔ قاسم کو لے کر واپس امریکہ آ گیا۔ دو سال یونیورسٹی میں پڑھایا اور پھر بائیس سال منے سوٹا کے پبلک اسکول میں بطور پرنسپل معذور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے پروگرام کو آرڈی نیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۹۳ء میں نیشنل ایوارڈ لے کر ریٹائر ہو گیا۔ ادبی شوق جو صرف پڑھنے تک محدود تھا۔ اب وقت کی فراوانی کا فائدہ اٹھا کر لکھنے اور پڑھنے کی طرف مائل ہو گیا۔ اردو کی پہلی کتاب "اسلام ایک ابدی حقیقت" ۱۹۹۴ء میں پاکستان میں شائع ہو کر مقبول ہوئی۔ ۱۹۹۷ء میں انگریزی کی کتاب "Love virtues and commandments" امریکہ میں چھپ گئی دوسری انگریزی کی کتاب "Time Bears Witness" پریس میں ہے۔ چند ماہ میں دستیاب ہو جائے گی۔ اردو کی کتاب "صحرا کے پھول" معذور بچوں کے والدین کے لئے نصاب تعلیم و تربیت نصف سے زیادہ مکمل ہو گئی ہے۔

سید سجاد حیدر دوران گفتگو بتا رہے تھے کہ میں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور جی

بھر کر پیار کیا ہے۔ کیونکہ علیم وخبیر خالق حقیقی نے تخلیق کائنات کی بنیاد محبت الٰہی پر رکھی ورنہ اس وحدہ لاشریک کو (نعوذ باللہ) کوئی مجبوری نہ تھی اور نہ ہے۔ کوئی شے باطل و بے مقصد و عبث پیدا نہیں کی اسی لئے تو ساری کائنات نے اسلام قبول کیا۔ تسبیح بھی کرتی ہے اور سجدہ ریز بھی ہے اور محبت ہی ان سب میں جزو لازم ہے۔ قاسم نے میرے دل کی حساس دھڑکنوں کو سوز گداز بخشا اور اک پر سکون آہنگ سے آشنا کیا ہے۔

آپ نے بیسویں صدی میں اردو ادب میں زندہ رہنے والے نام پوچھے ہیں تو عرض ہے کہ آسمان ادب پر چمکنے والے ستاروں کا شمار اتنا آسان نہیں۔ سبھی نے اپنے خاص انداز سے اردو زبان کے حسن کو جگمگایا ہے۔ چند ادیبوں کی یگانہ صلاحیتوں نے حسن خیز ادب سے ذہن انسانی میں حسن صبیح و ملیح کی بہار پیدا کر رکھی ہے۔ میرے ذہن میں جو نام درخشاں رہتے ہیں پیش قارئین ہیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال۔ جوش ملیح آبادی۔ فیض احمد فیض۔ علی سردار جعفری۔ آل رضا۔ احمد ندیم قاسمی۔ آغا بابر۔ ممتاز مفتی۔ قرۃ العین حیدر۔ اشفاق احمد۔ بانو قدسیہ۔ کرشن چندر۔ راجندر سنگھ بیدی۔ خواجہ احمد عباس۔ اختر ریاض الدین۔ مرزا ادیب اور منشی پریم چند۔

افسانہ واقعی ایک لطیف فن ہے۔ اردو کی علاقائی تہذیب اور تمدن کے دائرے میں رہتے ہوئے اگر کوئی اس کی لطافت جاذبیت اور حسن کو برقرار رکھ سکے تو جدیدیت یا قدامت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حسن و لطافت تو ہر زمانے میں ایک ہی تاثیر رکھتے ہیں۔

زمانہ ایک' حیات ایک' کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم
اقبال

آپ کے سوال نمبر ۵ کے جواب میں عرض ہے کہ "ادیب تو بھرپور زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کی حساس طبیعت ہر رنگ۔ اشکال اور زاویوں کا شعور رکھتی ہے۔ اگر معاشرہ میں مادہ پرستی۔ ذہنی کشمکش نفسیاتی الجھنیں و روحانی مفلسی کے دھند لکے چھائے ہوئے ہوں تو باشعور ادیب کا ان مختلف اڑچنوں میں پھنس جانا بعید از قیاس نہیں... اللہ تعالیٰ نے اسے پر سوز اور حساس ذہن دے کر خیالات و احساسات کو موتی کی لڑیوں کی طرح پرونے کی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ جہاں اس کی ذمہ داری ہے کہ معاشرہ کے رستے ہوئے ناسوروں کی نشاندہی و تصویر کشی درد بھرے الفاظ میں کرے وہاں وجوہات کی طرف لطیف اشارہ فہمی سے قارئین کو مائل کرنا اور دکھ بانٹنے کے طریق اور صحت و راحت جان کے آفاقی راز کی طرف متوجہ کرنا بھی ادیب کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ باشعور ادیب اگر خود فکر و عمل کے تضاد میں مبتلا ہو تو ذہنی نفسیاتی اور روحانی بحران روز مرہ کے مہمان بن جاتے ہیں۔ اس اماوس کو ماہ شب چار دھم

میں بدلنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ ہے خود شناسی و فرض شناسی کی اعلیٰ اقدار کو قول و فعل میں بسا کر خدمت خلوص یا محبت و ایثار سے مخلوق خدا کی بہبودی کے لئے علم و عرفان کا رزق الٰہی ادب کے بااختیار قلم کے ذریعے خرچ کرنا تاکہ ادیب کے اشک موتی کی مانند انسانیت کی جبیں پہ چمکتے رہیں۔"

سوال نمبر۶ کے جواب میں وہ کہہ رہے تھے "حسن' ادب کے کسی ایک شعبے کی جاگیر نہیں ہے بلکہ حسن اردو ادب کی تمام اصناف میں یکجہتی سے آشکار ہونے کا نام ہے۔ ادبی حسن کی بنیاد توازن پر ہے۔ معیاری ادب کے لئے حسن موضوع' حسن کلام' حسن بیان' حسن سلوک' حسن قبول' و حسن سوز بنیادی ارکان ہیں۔ حسن کے لئے ان میں توازن بھی ضروری ہے۔ اگر وہ عناصر جو حسن کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیتے ہیں مناسب توازن سے محروم ہوں تو معیاری ادب میں دل نشینی۔ دل ربائی۔ کشش۔ محبت و رعنائی کی جگہ بدنما سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔"

کم لکھے جانے کی وجہ بتاتے ہوئے وہ کہہ رہے تھے کہ "لکھنے والوں کے پاس نثری موضوعات یا جرات کی کمی نہیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ تو شاعری کا بھی لازمہ ہیں۔ میرے خیال میں روزگار کی مصروفیات اور ناشران ادب کے محدود وسائل۔ مہنگائی اور مارکیٹ میں مقابلے کے تقاضے راستے میں حائل ہیں۔ جہاں اخبار کے ایک صفحہ پر بیس غزلیں آجاتی ہیں وہاں مشکل سے ایک افسانہ آتا ہے۔ جس شے کی مانگ ماند پڑ جائے اس کی تخلیق کا شوق مرجھانے لگتا ہے۔"

انہوں نے کہا "کوئی بھی زبان اپنے اندر دوسری زبانوں کے الفاظ صرف اس وقت سموتی ہے جب اس کے اپنے پاس کسی مفہوم یا جذبات کی ادائیگی کے لئے مناسب الفاظ موجود نہ ہوں۔ جب اردو تشکیل ہوئی تو دکن اور گنگا جمنی تہذیب میں عربی۔ فارسی۔ ترکی۔ ہندی۔ سنسکرت۔ پنجابی۔ مرہٹی وغیرہ بولنے والوں کے الفاظ کے مجموعہ سے اس کی لغت تیار ہوئی۔ یہی اردو کہلائی۔ اب اگر اردو زبان میں کوئی لفظ موجود نہیں تو دوسری زبانوں کے الفاظ استعمال کر لینا مناسب ہے۔ لیکن انگریزی کی بھرمار صرف اس لیے نہیں ہونی چاہیے کہ یہ دنیا کی بڑی علمی زبان ہے۔"

اپنی زندگی کا ایک نہ بھلایا جانے والا واقعہ بیان کرتے ہوئے وہ بولے۔ "مجھے یاد آ رہا ہے آزادی کا سال خون میں لت پت ہو کر خزاں کے موسم کے تھپیڑے سہہ رہا تھا کہ شام کے دھندلکوں میں ایک بوڑھے بابے نے دروازے پہ دستک دی میری خوش قسمتی نے دروازہ کھولا تو میں اس کی حالت دیکھ کر لرزنے لگا۔ ویسے تو اس سال وحشی انسانوں نے جو دوسرے انسانوں کی حالت کر رکھی تھی خونخوار جانور بھی انگشت بدنداں تھے کہ الٰہی کیا یہی اشرف المخلوقات ہے؟

بڑے میاں سر سے پاؤں تک چیتھڑوں اور پٹیوں میں ملبوس ہنستے روتے زخموں کی سوجن سے مظلومیت کا مجسمہ تھے۔ ٹانگوں اور بازوؤں کے گرد چیتھڑوں میں جمے ہوئے اور تازہ خون کی باس میں سے تشکر کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے آنکھوں میں جھانکا تو ذہانت کی بجائے کھردری نظروں میں ستم رسیدگی اور اطمینان جھلک رہے تھے۔ خدا جانے شکوہ و شکایت کہاں کھو گئے تھے۔ کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی بے زبانی ہی زبان تھی۔ اس لئے ملازم سے کہا کہ بابے کے لئے چارپائی پہ بستر لگا دو۔ یہ ہمارے مہمان ہیں ایسے محسوس ہوا کہ کمرے میں روشنی اندھیرے کی جالی سے چھن چھن کے داخل ہو رہی ہے۔ پہلے بھی کبھی زندگی کے افق پر نور کا تڑکا دیکھا تھا۔ لیکن یہ روشنی تو اندھیرے کی جڑوں میں اتر گئی۔

معالجے و دیکھ بھال سے "بابا شابھو" رو بہ صحت ہو گیا اور گھر کا فرد بن گیا۔ اس کی دیہاتی سادگی اور اکھڑپن میں شخصیت کا انوکھا روپ سب جاننے والوں کے لئے فرحت بخش تھا۔ جیسے کھردرے پتھروں میں سے خلوص و سادگی و خدمت کے سوتے پھوٹ رہے ہوں۔ کچھ منفرد عادات حیران کن تھیں کہ یا اللہ یہ کہیں جن و انس کی صفات کا مجموعہ تو نہیں۔ مثلاً دسمبر کی یخ راتوں میں ان کا بڑی گہری نہر میں گھنٹوں تیرتے رہنا اور گرمیوں کی دوپہر میں نہر کے کنارے جنگل میں سانپوں سے باتیں کرنا اور وہیں سو جانا۔ بابا بے غرض و مطمئن دس بارہ سال گھر میں رہ کر پھر کہیں روپوش ہو گیا اور یادوں کے گہرے نقش چھوڑ گیا۔ اب بھی جب ہم بہن بھائی اکٹھے ہوتے ہیں تو "بابے شابھو" کا فرحت بخش ذکر ضرور ہوتا ہے۔"

میری رائے میں اردو ادب کی تنقید زیادہ تر یورپی زبانوں کے معیار پر کی جا رہی ہے۔ ادبی تحریکوں کی جڑیں بھی اردو کو جنم دینے والی تہذیب میں نہیں رہیں۔ کیونکہ ادب کی اصناف میں تحقیق و تنقید سنگلاخ زمین کی طرح ہے۔ نظریات کی بنیاد معاشرہ کی بہبودی کے اصولوں اور زندگی کی سدا بہار امنگوں پہ ہوتی ہے۔ یہی نظریات کسی علاقے کی قومی تہذیب اور تمدن کی تشکیل کرتے ہیں۔ زبان اور ادب تو نظریات تہذیب و تمدن کے ترجمان ہوتے ہیں۔ کسی بیرونی نظریاتی یلغار سے ان سب کا آپس میں رشتہ ٹوٹ جائے تو ایک ایسا انتشار پھیل جاتا ہے جس میں کوئی ٹھوس و پائیدار ادبی عمل ممکن نہیں سوائے اس کے کہ اس انتشار کی ترجمانی شعوری یا لاشعوری طور پر ہوتی چلی جائے۔ اور یہی اردو زبان کے لئے نقصان کا باعث ہو گا۔

DR. SAJJAD HYDER
5610 ST. CATHERINE CT.
NEWBURGH, IN 47630, U.S.A.

چیسلن پر سب کا وزن مساوی ہوتا ہے۔
سعید انجم
20/6-99

سعید انجم

ناروے

سعید انجم کے افسانوں میں انسان دوستی کے جو جذبات موجیں مارتے مجھے نظر آئے وہی سعید انجم کی ذاتی زندگی کا بھی حصہ ہیں۔ وہ اچھے انسان ہیں اسی لئے ان کی تحریر میں سچ کا تاثر بھرپور ہے۔

سعید انجم نے جید نقادانِ ادب سے اپنی تحریروں پر خراجِ تحسین و محبت وصول کیا ہے پھر بھی ان میں نخوت نہیں۔ میں نے ناروے کے شاعر فیصل ہاشمی کی معرفت انہیں جنوری 1999ء میں "گفتنی" کا سوالنامہ بھجوایا تھا اور ہفتے عشرے میں ان کا جواب میرے پاس موجود تھا کہ وہ ڈیڑھ دو ماہ کے لئے لاہور اور دہلی کے سفر پر نکلنے والے ہیں اور روانگی سے پہلے اتنا وقت نہیں کہ وہ سوالوں کے جواب دے سکیں چنانچہ ان پر لکھے گئے مضامین کی فوٹو کاپیاں ان کا بایوڈیٹا وہ مجھے بھجوا رہے ہیں۔ ساتھ ہی ایک جملہ اور تھا۔ "بند سیپیاں" کی مصنفہ سلطانہ مہر سے درخواست ہے کہ وہ ان تحریروں سے ایک تعارف خود تیار کرلیں۔ اگر آپ کے لئے یہ کام اچھا نہ ہو تو آپ نہ کریں۔ اپریل 1999ء میں میری واپسی ہوگی اس وقت جواب لکھنے کی کوشش کروں گا۔"

میں نے سعید انجم کا وہ خط سنبھال کر فائل میں رکھ لیا۔ مئی 1999ء کے آخر میں، میں نے

انہیں براہ راست دوبارہ سوالنامہ بھیجا کہ اب ان کا پتہ میرے پاس تھا اور مبادا وہ سوالنامہ ادھر ادھر کر بیٹھے ہوں۔ 2 جون 1999ء کو سعید نے مجھے دوسرا خط لکھا ساتھ میں جوابات' دو تصویریں اور عکس تحریر کے لئے لکھی تحریر بھی تھی۔

میں نے لکھا کہ "میں صرف سوانح جمع نہیں کر رہی ادیبوں اور شعراء پر لکھے گئے مضامین تو میں یہاں وہاں سے بھی جمع کر سکتی ہوں۔ مجھے ان سوالوں پر ان کی سوچ اور فکر کا اظہار چاہئے۔ سعید انجم نے میری خواہش کا احترام کیا۔ ورنہ وہ پڑھے لکھے ہو کر "بے پڑھے لکھے" ادیبوں جیسے نخرے بھی دکھا سکتے تھے اور جھوٹ بھی بول سکتے تھے کہ میں نے "سب کچھ" ڈاک سے بھجوا دیا ہے۔ اب لٹکے رہئے انتظار کی سولی پر۔

"جی ہاں ایسا بھی کئی لوگوں نے کیا ہے میں انہیں اچھا اور بڑا ادیب جان کر اور مان کر یاد دہانی کراتی رہتی ہوں۔ فون کرتی ہوں۔ اپنا وقت' اپنی صلاحیت و طاقت اور اپنا پیسہ جو میں کتابوں کی اشاعت کے لئے بڑی محنت سے جمع کرتی ہوں ان کو فون کر کے صرف اس لئے ضائع کر رہی ہوتی ہوں کہ انہوں نے زندگی میں اردو زبان و ادب کے لئے جتنا بھی کام کیا ہے۔ میری "اردو سے محبت" ان کی مقروض ہے۔ مگر میری "اردو سے محبت" جھوٹے ادیبوں اور نام نہاد دانشوروں کی قطعی مقروض نہیں۔

حمایت علی شاعر نے کہا ہے۔

ٹھوکریں کھا کر تو سنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ

سو اب مجھے بھی سنبھل جانا چاہئے اور "بادشاہ گر" بننے کی بجائے خود کو "بادشاہ" بنانے پر توجہ دینی چاہئے جس کا مشورہ پچھلے دنوں ناروے ہی کے جناب ہرچرن چاؤلہ نے دیا ہے اور ان کا مشورہ بھی ایک سچے ادب دوست کا مشورہ ہے۔

ذکر ہو رہا تھا سعید انجم کی انکساری اور انسان دوستی کے جذبے کا اور ان کی کمنٹمنٹ کا۔ ان کی کمنٹمنٹ کے حوالے سے ڈاکٹر پرویز پروازی سعید انجم کے افسانوی مجموعے "سوتے جاگتے خواب" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "سوتے جاگتے خواب" کے افسانے سعید انجم کے ذہن اور اس کی سوچ کے ایک نئے رخ کی نشاندہی کرتے ہیں مگر سب افسانوں کی بازگشت وہی پرانی کمنٹمنٹ ہے۔ پاکستان سے کمنٹمنٹ اس مجموعے کے دو حصوں میں زیادہ تر حصہ علامتی افسانوں کا ہے۔ ایک نمایاں فرق جو سعید انجم اور دیگر افسانہ نگاروں میں نظر آتا ہے وہ مکالمہ کا فقدان ہے۔ سعید انجم کے ہاں مکالمہ دو افراد کے درمیان نہیں ہوتا اس میں ایک تیسری جہت بھی شامل رہتی ہے۔ اس کے مکالمے سہ رخی مکالمے ہیں اور آپ جانتے ہیں دو رخی تصویر سے سہ رخی تصویر زیادہ گہری اور گمبھیر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے لفظ بے ربط نہیں ہیں۔ یہ سعید انجم کا اسلوب ہے جو اس کے غیر علامتی افسانوں میں بھی اسی طرح موجود ہے۔

"ادیب بننا ہے تو ادبی پرچوں میں چھپو۔" میرے ایک دوست نے مشورہ دیا۔
"میں نے ادبی پرچوں کے ورق کھنگالے۔ سماجی شعور کے گلے پر کند چھریاں چل رہی تھیں۔"
"دریا میں رہنا ہے تو مگرمچھ سے بیر ممکن نہیں۔" بڑے شہر کا مشورہ چھوٹے قصبے کے لئے۔"
سعید انجم کے ہاں اس قسم کے سہ رخی مکالمے بہت ہیں اور یہ اس کا خاص انداز ہے۔ اس کے دوسرے مجموعے کا پہلا افسانہ "نیک بندوں کا زیور" دور حاضر کا ممتاز ترین افسانہ کہلانے کا مستحق ہے اس افسانے کی ساری خوبصورتی ہی اس کے سہ رخی مکالموں کی رہین منت ہے۔ سعید انجم، صرف کرداروں سے ہی مکالمہ نہیں کرواتا ماحول کو بھی بولنے پر آمادہ کرلیتا ہے:
"کابل کتنی دور رہ گیا ہے؟" ان گنت فلیش لائیٹیں چمکیں۔
"جلال آباد میں کیا ہو رہا ہے؟ بے شمار کیمروں نے سوال کیا۔ (نیک بندوں کا زیور)
"نیک بندوں کا زیور" کاؤ بوائے اسلام پرستوں کی اسلام پر لائی ہوئی آفتوں کی کہانی ہے۔ پاکستان میں ضیاء الحق کی لائی ہوئی آفتوں کی کہانی ہے۔ ضیاء الحق کی لائی ہوئی اسلام پرستی نے جو قبیح شکلیں اختیار کیں وہ اس افسانے کا موضوع ہیں' فوج کی گھناؤنی بالادستی نے گلی کوچوں میں جو اسلام نافذ کیا وہ Millitant اسلام تھا۔ "کلاشنکوف' وردی' پجیرو' یہ نیک بندوں کا زیور ہے۔ اور وہ غریب غربا جو اس زیور سے آراستہ نہیں ہیں ان کا پاکستان کے اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ ان کا ایمان کمزور ہے۔ سعید انجم کے اس افسانے کو عالمی افسانوں کی صف میں جگہ ملنی چاہئے اور ضرور ملے گی۔
"سوتا جاگتا خواب" اسی موضوع پر زیادہ وسیع کینوس کا حامل افسانہ ہے جس میں مغرب کے ماحول میں بھی اسلام کے بنیادی تصور کو سینے سے لگانے والے محنت کشوں کی ٹریجڈی بیان ہوئی ہے۔ وہ جس اسلام کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اس اسلام کے نام نہاد اجارہ دار اس اسلام کا جوا کب سے اتار کر پھینک چکے ہیں۔ وہ سرزمین جہاں سے اس دین کے سوتے پھوٹے تھے' امریکنوں کی دست برد میں ہے جو وہاں اب علی الاعلان نمازیوں سے bear مانگتے ہیں۔ اس دین کے نام نہاد محافظوں نے اپنی سلامتی کے لئے دین کی سلامتی کو قربان کر دیا ہے اور یہ تضاد ارشد کی سمجھ سے بالا ہے۔
افسانہ پھر پاکستان کی طرف مراجعت کرتا ہے جہاں کا صدر اسلامی ایٹم بم کے حوالے سے معتبر سمجھا جاتا ہے مگر پاکستان کے رہنے والے ایک بوتل تیل خریدنے کی سکت نہیں رکھتے۔ تضادات ہی تضادات!! "سوتا جاگتا خواب" ایک خوبصورت علامتی افسانہ ہے۔ اس افسانے کی بازگشت اسی مجموعے کے دوسرے حصے میں شامل افسانے "قربانی" میں ملتی ہے' قربانی ان سورماؤں کی کہانی ہے جو اپنے ہی وطن کو فتح کرکے ترقیاں حاصل کرتے چلے جاتے ہیں اور انتہا یہ ہے کہ "اب اللہ بخش سوچ رہا ہے کہ اگر میری جان کو خطرہ ہوا تو کسے قربان کروں گا؟" فضا میں ایک دبی دبی گونج ہے۔ پاکستان! پاکستان!! اپنے موضوع پر یہ مختصر افسانہ' بڑا گھمبیر اور گہرا افسانہ ہے!

سعید انجم کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ مغرب کے اردو افسانے (حصہ اول) پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے (نئی کتابیں اکتوبر 1998ء) میں لکھا ہے۔ سعید انجم محض ادیب ہی نہیں ایک مخلص قاری بھی ہیں جس سے انہیں نقاد بننے میں مدد ملتی ہے۔ یہ کتاب سعید انجم کے پروجیکٹ کا حصہ اول ہے۔ جس میں انہوں نے مصطفیٰ کریم' قیصر تمکین' منیر الدین احمد' جیتندر بلو' افتخار نسیم ہرچرن چاؤلہ' سائیں سچا' خالد سہیل اور نصر ملک کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس میں انہوں نے جو محسوس کیا ہے اسے بلا کم و کاست بیان کردیا ہے۔ ان تمام مضامین میں وہ اہم نکات آگئے ہیں جو برصغیر کے نقادوں اور محققین کی ضرورتوں کو بھی پورا کریں گے۔ اس مجموعے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اب باہر کی دنیا سے تنقیدی سرمایہ برصغیر کی طرف آئے گا۔ یوں لین دین کی ایسی فنی اور فکری فضا قائم ہوگی جو اردو زبان و ادب کے افق کو مزید وسعت عطا کرے گی۔ اس کتاب کے آخر میں شاعر ڈرامہ نگار جاوید دانش کے ڈرامائی فن پر بھی ایک مضمون ہے اسی کتاب پر ایک مضمون لندن میں مقیم نقاد جناب حیدر طباطبائی نے بھی لکھا ہے۔ اپنے مضمون میں وہ لکھتے ہیں۔

"انجم نے ادب کے اس گنڈ دور میں اپنی کتاب "مغرب کے اردو افسانے" کا حصہ اول پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں سعید انجم نے جن لوگوں پر لکھا ہے اس کے عنوانات اس قدر پیارے ہیں کہ قاری عنوان پڑھتے ہی پورا مضمون پڑھ کر ہی دم لیتا ہے۔ قیصر تمکین کے لئے لکھا ہے "صحافت سے صحیفوں تک" سعید انجم فن کے قدر داں ہیں اور افسانوی مجموعوں کو صحیفہ لکھ کر فن افسانہ نگاری کی کیا عظمت ہے ان کے دل میں یہ منعکس کردیا ہے۔ جیتندر بلو کے مضمون کا عنوان ہے "دوسری آنکھ کا تیسرا رخ" خالد سہیل کے مضمون کا عنوان ہے "عقیدوں کے شہر میں تجربوں کا آدمی" اس طرح عنوانات سے مصنف کی ندرت کمال کے جوہر سامنے آتے ہیں۔ اس طرح سعید انجم جگہ جگہ افسانوی کرافٹ کے پہلو بہ پہلو سرخ قالین بچھا کر افسانوی فسوں دکھانے میں بہت کامیاب رہے ہیں۔"

سعید انجم سے کئی لوگوں نے دوبدو گفتگو کرکے اردو ادب اور افسانوں کے علاوہ ان کئی موضوعات پر ان سے گفتگو کی ہے۔ یہ گفتگو معلوماتی بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس سے استفادہ کرنے سے قبل ہم آپ کو سعید انجم کے بارے میں تھوڑی سی معلومات فراہم کردیں تو کیا حرج ہے۔

سعید انجم پنجاب (ضلع گورداس پور) میں 24/ اکتوبر 1946ء کو پیدا ہوئے۔ یہ اقوام متحدہ کا بھی یوم پیدائش ہے۔ انہوں نے گورکی کی یونیورسٹیوں (کسان مزدور تنظیموں میں کام کاج) کے علاوہ 1967ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بھی ایم اے اکنامکس کا امتحان دیا اور 1968ء میں پہلی ملازمت کے لئے ڈپٹی کنٹرولر پی ٹی اینڈ ٹی لاہور (آڈیٹر) مقرر ہوئے۔ ان کی دوسری ملازمت 1973ء میں لاہور میں

برکلے اردو پروگرام کے تحت پوسٹ گریجویٹ امریکن طلباء کے لئے معلمی کی تھی۔
1967ء سے 1975ء ثقافتی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ ادبی نیم ادبی اور فلمی رسالوں میں افسانے لکھے۔ ریڈیو کے لئے فیچر اور اسٹیج کے لئے ڈرامے لکھے جو ترجمے بھی تھے اور طبع زاد بھی۔ یہ سب کھیل پاکستان آرٹس کونسل لاہور' ایجوکیشنل آڈیٹوریم کے علاوہ پورے ملک کی کسان کانفرنسوں اور مزدور ریلیوں میں پیش کئے گئے۔ اکثر کی ہدایات بھی دیں۔ حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند مصنفین سے بھی ان کی وابستگی تھی۔ 1975ء میں ناروے آئے۔ 1975ء سے 1977ء تک درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔ 1977ء سے 1979ء تک کئی مختصر فلموں کے اسکرپٹ لکھے اور ہدایت دیں۔ ایک فیچر فلم "سات سمندر پار" نارویجن کولیگ کے ساتھ مل کر لکھی اور اسے ڈائریکٹ کیا۔ نارویجن سینماؤں پر اس کا پریمیئر 1991ء میں ہوا اسی سال یہ فلم نیشنل ایوارڈ کے لئے نامزد ہوئی۔ 1992ء میں اسے بیلجیم سے یورپ کی بہترین یوتھ فلم کا انعام ملا۔ 1993ء میں سوئیز لینڈ کے عالمی فلمی میلے میں دوسرا انعام ملا۔ اسی سال اسے کینز CANNS جونیئر کے لئے فرانس میں نامزد کیا گیا۔
1991ء تک سعید انجم سیاست میں بھی متحرک رہے۔ اوسلو کے اسکول بورڈ اور سٹی کونسل کے رکن رہے۔ 1989ء میں پارلیمنٹ کے الیکشن میں حصہ لیا۔ اب عملی سیاست کو خیرباد کہہ چکے ہیں اور درس و تدریس میں مصروف ہیں۔
ان کی تصانیف یہ ہیں 1- سب اچھا ہو گا (افسانے) 1981ء 2- سوتے جاگتے خواب (افسانے) 1994ء 3- نارویجن افسانے (تراجم) زیر طبع 4- مغرب کے اردو افسانے (مضامین) دسمبر 1997ء (اس کتاب میں مندرجہ ذیل افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ قیصر تمکین' منیر الدین احمد' جیتندر بلو' ہرچرن چاولہ' ساگر سچا' خالد سہیل نصر ملک' مصطفیٰ کریم' افتخار نسیم۔) 5- اوسلو کے مہمان (مضامین) 1999ء (اس کتاب میں مندرجہ ذیل ادیبوں اور دانشوروں کا اوسلو کے ساتھ دو طرفہ تعارف ہے۔ رام لعل' قرۃ العین حیدر' عبداللہ حسین' حبیب جالب' احمد فراز' حضرت شاہ' عاصم صحرائی' افتخار قیصر' انعام الحق جاوید' سید سبط حسن' سعیدہ گزدر' عابد حسن منٹو۔)
زیر تصنیف آدھی رات کا سورج قیام نامہ ناروے۔
سعید انجم اپنے ابتدائی زمانے میں کس طرح سوچتے تھے اس کی چند جھلکیاں ان کے ایک انٹرویو (مطبوعہ روزنامہ قومی آواز دہلی 14 نومبر 1997ء) میں ملتی ہیں۔ یہ انٹرویو ڈاکٹر جمیل اختر نے کیا تھا۔ انہی دنوں سعید انجم جواہر لعل یونیورسٹی دہلی میں عالمی ادب میں عشقیہ شاعری کے موضوع پر ہونے والے سیمینار میں گئے تھے سعید انجم کہہ رہے تھے۔ "مغرب میں آباد ہونے والے اردو ادیب دو طرح کی قدروں کے تجربے سے گزرتے ہیں۔ وطن کی اقدار جن میں وہ ہوش سنبھالتے ہیں اور پردیس کی اقدار' جہاں پر وہ نئی زندگی گزارنے کا عزم کرتے ہیں۔

نئی اقدار کے تجربے سے اردو ادیب کے ہاں ازلی ابدی اقدار کا تصور ڈگمگانے لگتا ہے۔ حصول مسرت کے معیار اسے حیران کرتے ہیں نئی صورتحال میں نئے سوال اسے جکڑتے ہیں گناہ و ثواب کی ماہیت کیا ہے؟ ضمیر کس کو کہتے ہیں۔

وطن میں رہتے ہوئے فرد مقامی حوالوں کا حصہ ہوتا ہے اور قومی تقاضوں سے آگاہ پردیس میں لغت تبدیل ہو جاتی ہے۔ اجنبی محاوروں کو ارد گرد کے لوگ روزمرہ کی زندگی سمجھتے ہیں۔ پردیسی کے عالمی تصورات دوسروں کی زبان میں کچھ اور کہلاتے ہیں۔ باطنی عقیدے خارجی موسموں پر اثر انداز ہونے کی قوت کھو دیتے ہیں۔

جمیل اختر: ایسی صورتحال میں انسان کیا کرتا ہے؟

سعید انجم: ذاتی حوالے سے اپنی بات کروں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ انسان خواب دیکھتا ہے۔ میرا افسانوی مجموعہ "سوتے جاگتے خواب" ایسے خوابوں ہی کا ماجرا ہے۔ ان میں سے کچھ تو سوتی آنکھوں میں اترے اور باقی خواب جاگتی آنکھوں نے دیکھے۔

جمیل اختر: تو پھر آپ کے خواب اور کیا ہیں؟

سعید انجم: ابھی تک ایک ہی خواب ہے جو میں پال رہا ہوں کہ کوئی زندہ رہ جانے والا افسانہ لکھ سکوں۔ کوئی کردار تخلیق کر سکوں جو پڑھنے کے بعد قاری کے دل و دماغ پر نقش ہو جائے۔

اب ہم نے گفتگو شروع کی۔ "سعید انجم صاحب اب ہم آپ سے "گفتنی" کے لئے کئے گئے سوالات کے جواب چاہتے ہیں۔

یہ رہا سوالنامہ اور سوال نمبر 2 ہے۔ "بیسویں صدی میں اردو ادب میں زندہ رہ جانے والے ادیبوں کے نام آپ کی رائے میں کون ہیں؟

میری رائے میں پریمچند، اقبال، سجاد ظہیر، فیض، منٹو، بیدی، کرشن، عصمت، غلام عباس اور بہت سے دوسرے۔"

سوال نمبر 3 کا جواب ہے اردو ادب میں جدیدیت کے زیر اثر قاری اور قلم کار کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا ہوئی جو دو دہائیوں تک بڑھتی چلی گئی۔ لیکن اب ویسی صورتحال نہیں ہے۔

4- موجودہ صدی میں اردو دنیا نے چونکہ سارے ہی صبر آزما کام کم کئے ہیں، اس لئے ناول بھی بہت کم لکھے گئے۔

5- ادیب کی راہنمائی ہر وہ بات کر سکتی ہے جس میں اس کے قاری کو دلچسپی ہو۔

6- معیاری ادب کا پیمانہ تو شاید ایک ہی ہے سماج زندگی کا ایسا جذباتی اظہار جو دل و دماغ کو قابو کر سکے۔

7- اچھی شاعری اور نثر ہر جگہ ہی کچھ آہستہ خرامی کی خوگر ہے اور اس کا سبب شاید تخلیقی ریاضت کی کمی ہے۔

8- انگریزی اور دوسری زبانوں کے اثرات کے بغیر بھی اردو اکیڈمیوں اور مقتدرہ اردو کی حدود کے باہر اردو زبان کی ترقی اچھے خاصے عرصے سے رکی ہوئی ہے۔

9- میری زندگی کے اہم واقعات میں میری شادی اور میرے ناروے منتقل ہونے کے علاوہ ان کتابوں کا ذکر کر سکتا ہوں (جو اب تک شائع ہوئی ہیں۔)

10- اردو زبان کی ترقی اور تنزل کے لئے رنگ برنگے دعووں کی فہرست دلچسپ بھی ہے اور طویل بھی۔ وارث علوی کے خیال میں موجودہ دور تنقید کا ہے۔ کسی کا کہنا ہے ترجمے کا عہد تو ابھی آیا ہے۔ پھر یہ دعویٰ بھی ملتا ہے کہ برصغیر کی علاقائی زبانوں کا ترجمہ تو ابھی شروع ہوا ہے وغیرہ وغیرہ میرے خیال میں صورتحال وہی ہے جو آٹھویں سوال کے جواب میں اوپر لکھ چکا ہوں۔

MR. SAEED ANJUM
NEBBE JORDET - 15, 1266
OSLO, NORWAY

تیرے وصال کی رُتیں بیرات آ بھی چکی،
میں آئینے کے مقابل رہی سنگھار میں ہوں

سعیدہ افضل
معرفہ، ۲۶ اپریل ۱۹۹۶ء

سعیدہ افضل
ڈیرہ غازی خان

"افسانوی ادب کا پہلا مسئلہ یہی رہا ہے کہ واقعات کی محدود نوعیت سے ان کے لامحدود معانی کو محسوس کیا جا سکے۔ ایسے نازک کام کی تکمیل میں افسانہ نگار کو اندھی لغویت کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ اچھا لکھنے والوں کو استادانہ التزام سے واقعات کی زیبائش نہیں کرنی ہوتی بلکہ زبان میں دم پھونک کر اسے اپنے وارداتی سفر پر چڑھانا ہوتا ہے۔"

یہ رائے محترم افسانہ نگار جوگند رپال کی ہے جو انہوں نے اپنے مضمون "نیا اردو افسانہ' زبان و بیان کے مسائل" میں بیان کی ہے۔ انہوں نے رام لعل (آں جہانی) کے افسانے "او۔ سی" کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے لفظوں کے عارضی پن پر قدرت حاصل کر کے ایک ہنگامی واقعہ کے تحیر کو کیسے ٹھیرا سا لیا ہے۔

سیدہ افضل بھی اسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتی ہیں اور پھر صحافت کے میدان کی شہ سواری نے ان کے قلم کو صیقل کیا۔ سعیدہ نے صحافت کے میدان میں ۱۹۶۷ء کے آخر میں قدم رکھا۔ ادارہ جنگ کراچی کے ہفت روزہ اخبار جہاں کے پہلے شمارے سے وابستہ ہوئیں اور آج تک

اسی سے منسلک ہیں۔ ہر ہفتے "تین عورتیں تین کہانیاں" لکھ کر ڈیرہ غازی خان سے بھجواتی ہیں کیونکہ وہیں مقیم ہیں۔ یہی ان کی جائے پیدائش بھی ہے ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کے دن جنم لینے والی سعیدہ افضل نے میٹرک تک تعلیم بھی ڈی جی خان میں پائی پھر ۱۹۶۴ء میں گورنمنٹ کالج برائے خواتین (کراچی) سے گریجویشن کیا۔ تعلیم کے دوران چار سال تک لگاتار میرٹ اسکالر شپ بھی حاصل کی۔ پھر جامعہ کراچی سے ۱۹۶۶ء میں اردو میں ایم۔ اے کیا۔ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں خاصی سرگرم رہیں۔ جامعہ کراچی کی بزم ادب اور تمام زبانوں کی ادبی سوسائٹی کی جنرل سیکریٹری تھیں۔ طالب علم یونین کلیہ فنون کی نمائندہ بھی رہیں۔ شاعری بھی کی مگر رجحان افسانہ نگاری کا تھا۔ ریڈیو کے لئے بچوں کی کہانیاں فیچر' خواتین پروگرام کے لئے ڈرامہ اسکرپٹ بھی لاتعداد لکھے۔ ان کے افسانے سہ ماہی سیپ کراچی' نقش اور ہندوستانی جرائد میں بھی شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۷۰ء میں پہلا ناول "جنگل کا پھول" شائع ہوا پہلے یہ اخبار جہاں میں قسط وار شائع ہوتا تھا ان کا دوسرا ناول "جھوٹے سچے لوگ" میں نے جنگ کے صفحہ خواتین پر قسط وار شائع کیا۔ اس وقت میں روزنامہ جنگ کراچی کے صفحات خواتین کی مدیرہ تھی۔ سعیدہ کا تیسرا ناولٹ "انجمن آراء" سہ ماہی "سیپ" کے ناولٹ نمبر میں شائع ہوا۔

۲۶ اپریل ۱۹۷۰ء کے دن سعیدہ میاں اعجاز قادر قریشی کی شریک حیات بنیں۔ اعجاز ڈیرہ غازی خان کے نامور وکیل تھے۔ ۱۹۷۶ء میں سعیدہ اور اعجاز کراچی آ گئے۔ اعجاز نے یہاں ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ سعیدہ اخبار جہاں کے ادارتی عملے میں شامل تھیں۔ یوں گیارہ سال گزرے دو بیٹے سکندر اعجاز اور حیدر اعجاز اور ایک بیٹی نادیہ اعجاز طالب علم ہیں۔ فروری ۹۵ء میں گلے کے کینسر کی وجہ سے اعجاز نے وفات پائی۔ وفات سے قبل ہی کراچی کے ناسازگار حالات کی وجہ سے اعجاز بیوی بچوں کو لے کر ڈیرہ غازی خان منتقل ہو گئے تھے۔

سعیدہ ڈیرہ غازی کی کئی سماجی انجمنوں سے وابستہ ہیں اور فلاحی کاموں میں حصہ لیتی ہیں۔ سعیدہ نے مسائل کا خصوصاً" گاؤں کی خواتین کے مسائل کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ سعیدہ کہتی ہیں کہ اس کام اور کہانیوں کے ذریعے اس مظلوم طبقے کی آواز ایوان بالا تک پہنچتی ہے اور کسی حد تک ان کی فریاد سن لی جاتی ہے۔ گاؤں میں غیرت کے نام پر ان عورتوں کو بڑی آسانی سے قتل کر دیا جاتا ہے اور کوئی اس ناانصافی کا ازالہ کرنے والا نہیں۔ سعیدہ نے کہا کہ وہ اب تک چار ہزار سے زائد کہانیاں لکھ چکی ہیں۔ یہ دراصل پاکستانی عورت کی پچاس سالہ معاشرتی ناانصافی اور اس کے ساتھ روا رکھے جانے والے ظلم کی کہانیاں ہیں۔ وہ انصاف مانگنے کے لئے عدالت تک چلی بھی جائیں تو نتیجے میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ یہ کہانیاں وہ کورٹ کچہری جا کر وکلاء سے مل کر دارالامان میں عورتوں سے ملاقات کر کے اور جیل میں عورتوں کی زبانی ان کی مظلومیت کی داستان سن کر لکھتی رہی ہیں۔ ان کہانیوں کو سعیدہ نے

افسانے کا اسلوب دیا ہے اور اصناف سخن میں ایک نئی صنف سچی کہانیاں یا آپ بیتی کا اضافہ کیا ہے۔

سعیدہ سے اس طویل گفتگو کے بعد میں نے سوال نمبر۲ کے بارے میں استفسار کیا تو وہ کہنے لگیں۔ نام تو کئی ہیں مگر اردو ادب میں اس وقت باقی رہ جانے والے جو نام یاد آرہے ہیں ان میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، منٹو، کرشن چندر، فیض احمد فیض اور سر فہرست شاعری میں علامہ اقبال ہیں جو ہمیشہ باقی رہیں گے۔

جدیدیت نے فکشن کو بیسویں صدی کی اس آخری دہائی کے حوالے سے نکھارا کم اور مجروح زیادہ کیا ہے۔ کیونکہ ان دنوں لوگوں میں محنت و مشقت کی عادت کم ہو گئی ہے۔ "پبلک ریلیشننگ" پر زیادہ انحصار ہو گیا ہے زندگی عجلت پسندی کی نذر ہو گئی ہے اور تیزی بھاگ دوڑ اور مادیت پرستی نے تخلیق کاروں کے سکون کو بھی تباہ کیا ہے۔ لوگوں میں وہ تحمل باقی نہیں رہا جس کی کوکھ سے اعلیٰ پائے کے فنون لطیفہ جنم لیتے ہیں۔ موجودہ صدی میں اردو ادب میں کم ناول لکھے جانے کی وجہ زندگی میں تیز رفتاری ہے۔ دوسری وجہ رہن سہن کے طور طریقوں میں تبدیلی، سائنس کی ترقی، مال و دولت کے حصول کی خواہش میں روز افزوں ترقی اور سادگی کی بجائے تنوع پسندی نیز الیکٹرانک میڈیا جن سے تفریح کی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ لوگوں کے پاس آرام سے بیٹھ کر ناول پڑھنے کا وقت نہیں ہے نظریات بدل گئے ہیں اور "فرصت نہیں ہے" کا ہر کسی کو رونا ہے۔ ناول طویل نثری آرٹ ہے۔ لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کو وقت چاہئے جب کہ جدید دور کا المیہ یہ ہے کہ اس میں پڑاؤ کی گنجائش نہیں ہے۔ اب آدمی کا معزز ہونا اس کے دولت مند ہونے میں ہے۔ اعلیٰ پائے کے تخلیق کاروں کو مالی مسائل درپیش ہیں۔ انہیں حکومت کی کم سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ سفارشی لوگ زیادہ نام پاتے ہیں۔ اچھے قلمکاروں کو روٹی کمانے کے لئے اخبارات کا رخ کرنا پڑا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ صحافت ادب کو کھا جاتی ہے۔ بہت سے جرائد نکل آئے جس میں ادب صحافتی طرز کا ہے اور ڈائجسٹ میں چھپنے والے مواد نے قاری کے مزاج کو یک دم بدل دیا ہے بلکہ میں یہ کہوں گی کہ مادی ذہنی اور نفسیاتی بحران میں صرف ادیب ہی نہیں تمام معاشرہ مبتلا ہے اور ادیب بھی اس معاشرے کا حصہ ہے۔ یہ ابتلائی صورت حال ہمارے سیاست دانوں کی پیدا کردہ ہے۔ خواہ کسی جماعت یا پارٹی سے ہوں ان کی ہوس اقتدار نہیں مٹتی۔ جاگیردارانہ نظام نے ناانصافی کو رواج دیا ہے۔ انہوں نے ملک کی دولت کو لوٹ کر بیرون ملک اپنے ذاتی اکاؤنٹس میں جمع کیا ہے یہی وطن اور انسانیت کے اصل مجرم ہیں۔ ان کی بیخ کنی سے ہی ملک کو عوام کو اور ادیب کو بہتر نظام حیات میسر آئے گا۔ جب تک ایسے بد دیانت لوگ کیفر کردار تک نہیں پہنچ جاتے ملک میں خوشحالی نہیں آسکتی ادیب اور عوام پر ذہنی نفسیاتی اور مالی بحران بڑھتا ہی رہے گا۔

سوال نمبر۶۔ شاعری ہو کہ نثر' معیاری ادب کے پیمانے یہ ہیں کہ ادب میں آفاقی سچائی ہو۔ سادگی ہو اور دل پذیری ہو۔ جو تحریریں ان اوصاف سے محروم ہوتی ہیں وہ مٹ جاتی ہیں اعلیٰ ادیب' اعلیٰ اخلاقی اقدار کا امین ہوتا ہے۔ ادیب کوئی عام آدمی نہیں ہوتا۔ بے شک وہ عوام سے ہوتا ہے اور عوام کا ترجمان ہوتا ہے' عوام کا ذہنی رہنما اور لیڈر ہوتا ہے لیکن وہ خود خاص شخص ہوتا ہے تب ہی تو وہ عوام پر اثرات مرتب کرتا ہے۔ وہ عوام کے اذہان کو نکھار اور سنوار بھی سکتا ہے اور توڑ مروڑ بھی سکتا ہے وہ رہنما ہی نہیں معمار اور مورخ بھی ہوتا ہے۔

سوال نمبر۷۔ نثر سے زیادہ شاعری ہو رہی ہے اس کا سبب وقت کی کمی ہے۔ دور جدید کے تقاضے ہیں کہ قارئین کا رجحان تیز رفتاری کی جانب ہے وہ ٹھری ہوئی چیزوں کے ساتھ ٹھر نہیں سکتے۔

سوال نمبر۸۔ ایک حد تک انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کا کسی زبان میں مدغم ہونا جائز ہے' جب متبادل لفظ یا الفاظ اس قدر رچ بچ گئے ہوں کہ ان کو حذف کرنے سے یا ان کے ہم معنی اردو الفاظ استعمال کرنے سے معنی آفرینی کا لطف اور حسن دونوں میں کمی واقع ہو جاتی ہو۔ ویسے تو یہ ایک قدرتی عمل ہے جس کے تحت انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ خود بخود اردو زبان کا حصہ بنتے جائیں گے ہم اس عمل کو شعوری طور پر روکنے کی کوشش بھی کریں تو نہیں کر سکتے۔

سوال نمبر۱۰۔ آج کل وطن میں علاقائی' قوم پرستی رواج پا رہی ہے جس نے لسانی تعصب کو بھی جنم دیا ہے۔ اس کی وجہ جو بھی ہو کسی خاص قوم کا احساس محرومی یا جو بھی کچھ اور اس سے وقتی طور پر اردو کو کچھ نقصان ضرور پہنچے گا۔ تاہم اردو آج بھی مختلف علاقائی قوموں کے درمیان رابطہ کی زبان ہے اور قومی زبان کی حیثیت سے بھی اس کی اہمیت ہے۔ لسانی اور علاقائی تعصب کی وجہ کچھ علاقوں کو نظرانداز کرنا اور وہاں کے باسیوں کو انصاف کا نہ ملنا بھی ہو سکتا ہے۔ جس سے علاقائی اور لسانی تعصب کو فروغ ملتا ہے۔ پاکستان میں علاقائی زبانوں پر ان دنوں تھوڑا بہت زور دیا جا رہا ہے اور چھوٹی سطح پر بلکہ مقامی طور پر کہنا چاہئے کام بھی ہو رہا ہے۔

یہ سچ ہے کہ تنقید کا حق پوری طرح ادا نہیں ہو پا رہا۔ اصل وجہ ادیب کے لئے وسائل کی کمی بھی ہے اسی لئے زیادہ کام نہیں ہو پا رہا اور ذاتی روابط کی وجہ سے تنقید کا حق بھی ادا نہیں ہو رہا۔

میری زندگی کا ایک اہم اور دلچسپ واقعہ جس نے میری زندگی کا رخ موڑ دیا اس زمانے کا ہے جب میرے ایم اے کا نتیجہ نہیں آیا تھا میں بچوں کے پروگرام کے لئے "ویٹنگ سکرپٹ" کر کے ریڈیو پاکستان کراچی کی عمارت سے نکلی جنگ کا دفتر جو ان دنوں برنس روڈ پر واقع تھا

میں وہاں سے گزر رہی تھی کہ خیال آیا جنگ کا دفتر دیکھنا چاہیے۔... جب میں دفتر کے ایک کمرہ کی طرف گئی۔ وہاں نذیر ناجی صاحب کچھ خواتین سے انٹرویو کر رہے تھے۔ وہ سمجھے میں بھی انٹرویو دینے آئی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے بھی چند سوالات کئے اور پھر کہا کہ آپ کو "ہفت روزہ اخبار جہاں" کے لئے بطور مدیرہ منتخب کر لیا ہے۔ میں آپ کو تقرری کا لیٹر ٹائپ کروا دیتا ہوں... میں نے کہا... میں کل آپ کو بتاؤں گی مجھے گھر والوں سے مشورہ کرنا ہے وہ بولے...

"آپ بس کل صبح آجایئے گا۔ یہاں کام کرنا پسند نہ آئے تو چھوڑ دیجئے گا مگر آ کر دیکھئے تو سہی..."

اگلے دن جب میں جنگ کے دفتر گئی ان دنوں ہفت روزہ اخبار جہاں کا اجراء ہونے والا تھا یوں اس دن سے آج تک میں اسی ادارے سے منسلک ہوں۔ نذیر ناجی صاحب اخبار جہاں کے پہلے ایڈیٹر تھے۔ اور بہت محنتی آدمی ہیں وہ انسان دوست آدمی ہیں اور میر خلیل الرحمٰن صاحب بھی صاحب بصیرت اور صاحب فراست شخص تھے جو انسان کی پہچان رکھتے تھے... اور اپنے ادارے کے کارکنوں کو اعتماد دیتے تھے۔"

MRS. SAEEDA AFZAL
HOUSE NO. 38, BLOCK 28
DERA GHAZI KHAN, PUNJAB PAKISTAN

ڈاکٹر سلیم اختر

لاہور

"تاریخ ادب اردو" (رام بابو سکسینہ) بہت پہلے پڑھی تھی۔ آب حیات کے مزے بھی لوٹے تھے اور محمد حسین آزاد کی اردو زبان کو اپنانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے اللہ میاں سے دعا بھی کی تھی کہ اپنی مرضی سے جہاں پیدا کر دیا تو نے سو کر دیا کہ ہم تیرے مجبور اور بے بس بندے ہیں۔ تیرے پاس بھی مجبور اور اماں ابا کے گھر میں بھی۔ کہ جہاں پڑھنے کے سلسلے میں حرف حرف پر پابندی ہے سو اللہ میاں جی اتنا تو کریے کہ لکھنے پڑھنے کے شوق کو زندگی دیجئے۔ باقی دکھ ہم سہ لیں گے۔

اللہ میاں نے قبولیت کی گھڑی میں مانگی گئی دعائیں قبول کر لیں۔ چنانچہ اردو کی تاریخ پڑھتے پڑھتے ہم ان کے خالقوں تک جا پہنچے... اپنے پروفیسر مجتبٰی حسین کو سنا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو سنا' ڈاکٹر جمیل جالبی اور محترم سید ہاشم رضا کو موتی رولتے دیکھا اور انہی جیسے اور بھی زندگی کی راہوں میں ملے کہ بے ساختہ ہم نے ایک نظم کہہ دی جس کا ایک بند ہے۔

میرے دل' مرے سمندر

جب جب تو حرفوں کی مالا گوندھے
تب تب چاند سے کرنیں پھوٹیں
اور گھور اماوس راتوں کا
ہر پل اجلا اجلا سا ہو جائے

اس نظم میں "میرے دل میرے سمندر" علامات اور مخاطب سارے اہل علم ہیں" پھر میرے ادبی سفر کے ایک موڑ پر میری نصف ملاقات ڈاکٹر سلیم اختر سے بھی ہوئی۔ اس نصف ملاقات میں اندازہ ہوا کہ بہت خاموش طبع ہونگے... جیسے فیض احمد فیض جن سے کھڈہ کراچی کے عبداللہ ہارون کالج میں پہلی بار میں ملی تھی۔

ڈاکٹر سلیم نے میرے خط کا جواب دیا۔ خط کے یہ تین چار چھوٹے سے پیراگراف مجھے پھر اردو ادب کی دنیا میں لے گئے جہاں بہت سی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ ان میں ایک ڈاکٹر سلیم اختر کی "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" بھی تھی۔ یہ کتاب ۹۶ء میں میں نے اردو بازار کراچی کے نذیر بکڈپو سے خریدی تھی۔ بھائی نذیر نے بتایا کہ ان کی ساری کتابیں ختم ہو چکی ہیں بس ان تین کتابوں کی ایک ایک کاپی ہے۔ دوسری دو کتابیں افسانوں کا مجموعہ مٹھی بھر سانپ اور کڑوے بادام تھیں۔ نذیر بھائی نے بتایا کہ اردو ادب کی تاریخ کا یہ ۱۹۹۳ء والا پندرھواں ایڈیشن ہے اور اس کی مقبولیت کی وجہ اس کا اختصار ہی نہیں اس کے مواد کی جامعیت اور توازن بھی ہے۔ ادب کا طالب علم اگر کم وقت میں اہم معلومات چاہے تو اس سے خاطر خواہ استفادہ کر سکتا ہے۔

میں نے بھی کراچی سے لاس اینجلس کے ۲۶ گھنٹے کے سفر میں اس کتاب سے استفادہ کیا۔ ویسے لکھنؤ کا دبستان شاعری و نثر اور دلی کا دبستان' شاعری نثر کے علاوہ گل رعنا "شعر الہند" وغیرہ جو بہت پہلے زیر مطالعہ رہا کرتی تھیں اور اب ان کے کچھ کچھ حصے یاد آجاتے ہیں چونکہ خاصی طویل تھیں اس لحاظ سے یہ مختصر "تاریخ ادب اردو" بہت غنیمت معلوم ہوئی۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے تو ایک زندگی اپنی انہی کاموں کے لئے وقف کر دی ہے۔ ان کے کاموں کی فہرست گنوانے سے پہلے یہ بتادوں کہ انہیں ان کی ادبی خدمات کے صلے میں جو چند اعزازات ملے ہیں وہ ہیں۔

(۱) نقوش ایوارڈ ۱۹۸۹ء برائے سفرنامہ بھارت ۹۸ء
(۲) گلڈ انعام برائے تنقید "اقبال اور ہمارے فکری رویے" ۱۹۸۲ء
(۳) داؤد انعام برائے تحقیق "ادب اور لاشعور" ۱۹۷۶ء
(۴) بھارت کے صوبہ بہار کے شہر ہزاری باغ کے ایک اسکالر جلیل اشرف نے "اردو تنقید کے فروغ میں ڈاکٹر سلیم اختر کا حصہ" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ قلم بند کر کے رانچی یونیورسٹی

(بہار ہندوستان) سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔
ڈاکٹر سلیم اختر کی ادبی خدمات کے تقریباً" ۵۰ پیکر ہیں۔ جن میں تنقید' طنز و مزاح' نفسیات' افسانے اور مطالعاتی مضامین پر مشتمل کئی کتابیں ہیں۔ جن کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اور دیگر زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے ہیں۔
انہوں نے غالب پر بھی کام کیا ہے اور "غالب شناسی و نیاز و نگار" کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔
ڈاکٹر سلیم اختر کی ادبی خدمات پر ایم اے اردو کی سطح کے مختلف جامعات میں تحقیقی مقالے قلم بند ہونے کے علاوہ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ایک باضابطہ کتاب بعنوان "ہم سفر بگولوں کا" (لاہور) ۸۵ء میں قلم بند کی۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی ہی نے "ڈاکٹر سلیم اختر "شخصیت و تخلیقی شخصیت" کے نام سے سات سو 700 صفحات کی ضخیم کتاب بھی 1996ء میں لاہور میں مرتب کی۔
اب میں اور ڈاکٹر سلیم اختر آمنے سامنے تھے کوئی معرکہ سر نہیں ہو رہا تھا لیکن حقیقتاً" بڑا معرکہ سر ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے قیمتی وقت کا بڑا حصہ مجھے عنایت کیا۔ میرے سوالوں کے بڑے تیکھے مگر کھرے کھرے جواب دیئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر جب گفتگو کرتے ہیں تو آبشار بہاتے ہیں۔ انہوں نے بتایا۔ ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ء کو وہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صاحب عبدالحمدی کا بسلسلہ ملازمت غیر منقسم ہندوستان کے مختلف شہروں میں تبادلہ ہوتا رہا۔ لہٰذا انہوں نے لاہور فورٹ سنڈے من (بلوچستان) پونا' انبالہ شہر اور راولپنڈی کے اسکولوں میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں میٹرک کیا اور ۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ کالج راولپنڈی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی میں سرٹیفکیٹ ان لائبریری سائنس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۱ء میں ایم۔ اے اردو اور ۱۹۷۸ء میں اردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔
بی۔ اے کے بعد کچھ دیر تک روزنامہ "شہباز" پشاور سے وابستہ رہے۔ پھر پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں ملازمت کی۔ ۵ جنوری ۱۹۶۲ء کو بطور اردو لیکچرر ایمرسن کالج ملتان سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۵ جون ۱۹۷۲ء کو گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے۔ یہیں سے ۱۰ جنوری ۱۹۹۴ء کو ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور ریٹائرمنٹ کے بعد تاحال بطور وزیٹنگ پروفیسر گورنمنٹ کالج ہی سے تعلق قائم ہے۔ یکم اپریل ۱۹۶۲ء کو شادی ہوئی جو بقول ان کے ہنوز برقرار ہے۔ دو بیٹیاں سائیکی اور ارم ہیں اور ایک بیٹا جودت سلیم۔ یہ سبھی شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔
اب ڈاکٹر سلیم اختر نے سوال نمبر ۲ پر نظر ڈالی اور فرمایا "جہاں تک بیسویں صدی میں

تخلیقی طور پر فعال رہ کر دائمی شہرت کے حامل اہل قلم کی اسم شماری کا تعلق ہے تو یہ اتنا آسان کام نہیں کہ محض رواروی میں چند نام گنوا دیے جائیں۔ اسے آپ اس مثال سے سمجھئے کہ مرزا رسوا کا امراؤ جان ادا ۱۹۰۱ء میں شائع ہوتا ہے ان کے بعد پریم چند کی فکشن آتی ہے پھر نیاز فتح پوری، یلدرم اور اختر شیرانی کی رومانیت، ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ادب کی بے حد فعال توانا مگر متنازع ادبی تحریک اور اس سے وابستہ منور ناموں کی کہکشاں جیسے کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری، عزیز احمد وغیرہ۔ ان سے ہٹ کر جب دیکھیں تو جدید نظم میں میراجی، ن۔ م۔ راشد اور مجید امجد جیسے شعراء نظر آتے ہیں پھر ناقدین ہیں محققین ہیں۔ الغرض یہ صدی بے شمار اہم تخلیق کاروں کی تخلیقی کاوشوں کی امین ہے۔"

سوال نمبر ۳ کے جواب میں کہنے لگے۔ "میں اس سوال کو نہیں سمجھ سکا۔ آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ فکشن ایک "لطیف آرٹ" ہے محترمہ! فکشن لکھنا تو کانٹوں بھرے راستے پر چلنے کے مترادف ہے اس لیے کہ فکشن لکھنے والا جہاں حقیقت سے سروکار رکھتا ہے اور معاشرے میں پھیلی تلخیوں، بے انصافیوں، تدغنوں اور تضادات کی کہانی بتاتا اور اپنے کرداروں کے ذریعے تجزیاتی مطالعہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہ آسان کام نہیں ہے۔ اگر آپ اس میں یہ بات بھی شامل کرلیں کہ ہر اچھا فکشن نگار انسانی نفسیات اور اس کے حوالے سے جنس اور ٹیبوز کا بھی مطالعہ کرتا ہے تو فکشن لکھنے والے کی مشکلات کا اندازہ لگانا دشوار نہیں رہتا۔ اسی لیے شعراء کے جم غفیر کی غوغا آرائی کے مقابلے میں اچھے افسانے کم اور اچھا ناول اس سے بھی کم لکھے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس پوری صدی میں شاید دو درجن سے زیادہ اچھے ناول نہ مل سکیں گے۔ اور اگر جدیدیت سے مراد علامت نگاری اور تجرید کے رجحانات ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ (بالخصوص) علامت نگاری نے اردو افسانے کو نئی جہت سے روشناس کرایا۔ وہ اردو افسانہ جو خارجی حقیقت نگاری کی ترجمانی کے لیے وقف ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے علامت نے باطن کے نہاں خانے اور سائیکی کی بھید بھری پرچھائیوں کا ترجمان بنانے کی کوشش کی۔ پاکستان میں ضیاء کی عسکری آمریت کے دوران جب کھل کر بات کہنے کا ماحول نہ تھا تو افسانہ نگاروں نے علامت کے ذریعے سے عصری صورت حال کی ترجمانی کی۔ اگرچہ اب ہمارے ہاں یہ چلن ختم ہوتا آرہا ہے۔ لیکن مارشل لاء میں بھرپور کردار ادا کرنے کی وجہ سے علامت کا رجحان فکشن کی تاریخ میں اہم ثابت ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر بڑی روانی سے گفتگو کر رہے تھے۔

انہوں نے کہا۔ "سوال نمبر ۳ کے جواب میں عرض کرچکا ہوں مزید یہ کہ ہمارے ہاں بڑا ناول نہ لکھے جانے کی متعدد وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ بڑا ناول بڑے موضوع کا متقاضی

ہوتا ہے۔ بڑے موضوع کو سنبھالنے کے لئے بڑی تخلیقی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اتنی بڑی تخلیقی شخصیات کبھی بھی نہ پیدا ہوئیں جنہیں ہم ٹالسٹائی یا دستوئسکی کے مقابلے میں کھڑا کر سکتے۔ ہماری ادبی اور تخلیقی تربیت غزل سے ہوتی ہے۔ جو منتشر خیالی میں دروں بینی کا ماجرا سناتی ہے۔ غزل کی کنڈیشننگ کے باعث ہم زندگی اور افراد کو اجزاء میں تقسیم کر کے دیکھتے ہیں ہم انہیں ایک بہت بڑے اور وسیع کل میں دیکھنے کی استعداد نہیں رکھتے اسی لئے افسانے بہت لکھے جاتے ہیں لیکن بڑے ناول بہت کم ہیں۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ کسی قوم کی تخلیقی نعلیت کے اظہار کے لیے ناول نقطہ عروج کا کام کرتا ہے جس طرح بڑی قوم بڑی شخصیات سے پہچانی جاتی ہے اسی طرح بڑی قوم بڑے ناول نگاروں سے بھی پہچانی جاتی ہے۔ جب ہم بڑی قوم بھی نہیں تو بڑا ناول نگار کہاں سے لائیں؟"

سوال نمبر۵ کے جواب کے سلسلے میں انہوں نے کہا "مجھے اس سوال سے اتفاق نہیں آج کا ادیب نہیں بلکہ ہر عہد کا ادیب "مادی بلکہ ذہنی نفسیاتی اور روحانی بحران میں مبتلا" رہا ہے۔ آپ نے جسے بہتر زندگی کی تلاش کہا ہے وہ بنیادی طور پر تلاش روزگار کا مسئلہ ہے۔ اردو ادب کی تاریخ کے چند شعراء کو چھوڑ کر باقی سب نے زندگی خراب اور پریشان حالات میں بسر کی۔ میر اور غالب کی مثالیں تو سامنے کی ہیں باقی بھی انہیں کی مانند لشتم پشتم زیست کرتے رہے۔ وہی میر والی بات... "نامرادانہ زیست کرتے رہے۔" جہاں تک آج کے ادیب کا تعلق ہے تو ہم جیسے گھر میں بیٹھ کر سنجیدگی سے محنت اور کام کرنے والے گنتی کے چند قلم کاروں کو چھوڑ کر آج کا ادیب بہتر سخن ساز اور چالباز ہے۔ وہ استعارہ فروشی سے حکام کی قربت حاصل کرتا ہے صحافت اور کالموں کو مقصد براری کے لیے استعمال کرتا ہے اور ہر طرح کی سازشوں سے خود کو منواتا اور پیسے کماتا ہے ادھر موسم گرما میں یورپ کے مختلف ممالک میں منعقد ہونے والے مشاعروں نے ایک اور "حجرہ ہفت بلد" کا راستہ کھول دیا ہے۔ اس ضمن میں ایک ایسا سریع الحرکت طائفہ حرکت پذیر نظر آتا ہے کہ انسان ان کی تیزیاں اور پھرتیاں دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ یہی اعزازات حاصل کرتے ہیں انہی کو ایوارڈز ملتے ہیں۔ یہی عہدے اور مال حاصل کرتے ہیں اور یہی ممالک غیر میں پاکستان کی تہذیب و ثقافت اور تخلیقی صورت حال کی نمائندگی کرتے ہیں... آنکھوں والوں کے لئے ان میں عبرت ہے!

انہوں نے کہا معیاری ادب کا صرف ایک پیمانہ ہے کہ وہ معیاری ہو۔ جہاں تک تخلیقات کی معیار بندی کا تعلق ہے تو اس ضمن میں مختلف اصحاب کی مختلف آراء ہوں گی' میں سمجھتا ہوں کہ معیاری تخلیق کی تشکیل میں دو چیزیں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ نمبر۱۔ بڑا خیال۔ نمبر۲۔ اسلوب کی جمالیات۔ اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اگر اسلوب کی جمالیات نہیں تو لکھنے والا بڑے خیال کے اظہار و ابلاغ میں ویسے ہی ناکام رہے گا جیسے پھوہڑ بیوی غیر متناسب نمک

مرچ کی وجہ سے سالن کو بدمزہ بنا دیتی ہے۔ اسی طرح برے اسلوب سے بھی گذارا نہیں ہوتا۔ اسلوب کی جمالیات ایک عمومی بات ہے کیونکہ اسلوب میں بذات خود بہت تنوع ملتا ہے۔ اسے میر غالب اور اقبال کے اسلوب کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔"

اب بات ہو رہی تھی پاکستان اور ہندوستان سے باہر شاعری کے متعلق۔ کہنے لگے۔

"شاعری اگرچہ بے حد مشکل تخلیقی عمل ہے لیکن اس کے باوجود قافیہ ردیف کے فارمولے پر عمل پیرا ہو کر یار لوگ دن رات غزلیں گھڑتے رہتے ہیں امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں مقیم اردو دان محض اس لیے شاعری کرتے ہیں کہ وہ اور کچھ کرنے کے اہل نہیں یہ سب ڈالر اور پونڈ کے چکر میں جائز یا ناجائز ذرائع سے باہر گئے۔ خوب مال کمایا اور پھر جب وطن کے بارے میں جذباتی ہونے لگے تو اردو کی محبت میں بے وزن اور بے معنی شاعری شروع کر دی۔ ادھر ہمارے ہاں بھی ایک ایسا طبقہ پیدا ہو چکا ہے جو مفت کی سیر کے ساتھ مشاعروں کے "لفافے" بھی کمانا چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ عجب گٹھ جوڑ ہو گیا۔ جس طرح سرد ممالک سے سردیوں میں پرندے ہجرت کر کے گرم علاقوں میں آتے ہیں اور پھر رت بدلنے پر واپس اپنے گھونسلوں کو پرواز کر جاتے ہیں اسی طرح یہ شعراء بھی مہاجر پرندوں (Migeratery Birds) کی مانند مغرب سے یہاں اور یہاں سے وہاں محو پرواز رہتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں تقریبات ہوتی ہیں کھانے کھلائے جاتے ہیں' کتابیں چھپتی اور رونمائی ہوتی ہے جس میں ہم جیسوں کو بربنائے مروت مقالے پڑھنے پڑتے ہیں اور ان کی شاعری میں وہ خوبیاں تلاش کرنا پڑتی ہیں جن سے ان بے چاروں کا کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ محترمہ اب شاعری ایک ریکٹ (Racet) میں تبدیل ہو چکی ہے۔ نثر نگاری میں بھلا کیا مزا؟"

"آپ نے بالکل درست لکھا کہ اردو کئی زبانوں کا مجموعہ ہے تاہم آپ کے لکھنے کے برعکس ہمارے ہاں اب انگریزی زبان کے الفاظ کی شمولیت سے گریز نہیں ہو رہا۔ بلکہ گزشتہ بیس پچیس برس سے ہماری زبان میں جس کثرت سے انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال بڑھا وہ حیران کن ہے اور اس کی وجہ جاننا اتنا مشکل بھی نہیں اس لیے کہ اب ہمارے معاشرے کا آئیڈیل پاکستانی بننا نہیں بلکہ امریکی شہریت اختیار کرنا ہے۔ ہم عجب دور منافقت میں زیست کر رہے ہیں اسلامی رنگ سبز' پاکستانی پرچم سبز' اور مزاروں پر سبز چادر چڑھائی جاتی ہے۔ ہمارا پاسپورٹ سبز ہے کہ صاحب حیثیت بیگمات پاکستان میں حاملہ ہوتی ہیں لیکن بچہ امریکہ جا کر جنتی ہیں تاکہ وہ پیدا ہی امریکی شہری کے طور پر ہو۔ اب اچھی تعلیم کا ایک ہی معیار ہے کہ بچہ انگلش میڈیم میں تعلیم حاصل کرے ادھر نودولیہ طبقہ اور اسمگلروں کی اولادیں خود کو کلچرڈ ظاہر کرنے کے لیے انگریزی ہی کا سہارا لے رہی ہیں۔ میں نہیں جانتا آپ کو کراچی سے امریکہ آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو چکا ہے تاہم اگر آپ اب واپس آئیں گی تو آپ کو پہلے کے مقابلے میں

کہیں زیادہ انگریزی سننے کو ملے گی البتہ اس کے درست ہونے کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی۔"

میں نے پوچھا آپ کی زندگی کا اہم واقعہ؟ "کہنے لگے ایک دن میری کلاس کا پڑھنے کا موڈ نہ تھا تو ایک لڑکا کہتا ہے کہ سر اپنی زندگی کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ سنایئے۔ میں نے اسے کہا بھائی! میری زندگی کے تو عام واقعات بھی قابل فراموش ہیں سو محترمہ میرے پاس آپ کو سنانے کے لیے اہم اور دلچسپ واقعہ نہیں ہے اور رہے وہ واقعات جو واقعی اہم اور دلچسپ ہوتے ہیں تو میں انہیں سنسر کر رہا ہوں کہ یہ "ناگفتنی" ہیں۔"

میرے سوال نمبر ۱۰ کے جواب میں انہوں نے پاکستان کے حالات کے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے بجا ارشاد فرمایا تنقید کے لفظ سے جس غیر معتصبانہ رویے گہری تحلیلی نگاہ، بلند پایہ علمیت اور بے باکانہ اظہار رائے کی توقع بنتی ہے۔ معاصر تنقید اس سے بالعموم معراء نظر آتی ہے۔ اس کا ایک سبب تو میری تنقید نگاری بھی ہو سکتی ہے۔ دیگر اسباب میں ایک وجہ (اور یہ میری ذاتی رائے ہے) یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی ہم زوال کے عمل کا شکار ہیں۔ عہد زوال کی قوم جس طرح بلند کرداری اور روشن اعمال سے محروم ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ اعلیٰ تخلیقی صلا سے بھی تہی دست ہوتی ہے۔ جب یہ سب نہیں تو پھر اچھی تنقید کہاں سے آئے۔ معاصر تنقید کے معیار کے گرے ہوئے گراف اور عمومی عدم مقبولیت کا ایک بڑا سبب د اور فلیپ نگاری اور اس کے ساتھ کتابوں کی تقریبات اور ادیبوں کے ساتھ منائی جانے والی شاموں کے لیے تحریر کردہ بھی ہے۔ آج جو نقاد کو ہدف ملامت بنایا جاتا ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تنقید کسی قوم کی تخلیقات کے حوالے سی اس کے تہذیبی تشخص ک کرنے کے ذہنی عمل کا نام ہے اور یہی نہیں ہو رہا۔ ادھر ہم جیسے پروفیسر حضرات تنقید کے نام پر اپنے کالج کے نوٹس چھپوا دیتے ہیں جن کے پڑھنے سے طالب علموں کا بھی بھلا نہیں ہوتا پاس ہونا تو دور کی بات ہے۔ آپ نے درست لکھا کہ ہمارے ہاں تنقید میں نئے نظریات اور انتقادی تصورات کی بھی کمی ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک نے اردو تنقید میں مارکسی انداز نظر کو فروغ دیا تھا اس کے بعد سے ہماری تنقید میں کوئی بڑا نظریہ نہیں آیا۔ مختلف ناقدین کے ہاں آپ کو مختلف تنقیدی دبستانوں سے انفرادی سطح پر شغف ملے گا جیسے میں اپنی تنقید میں نفسیات سے کام لیتا ہوں۔

ان دنوں ہمارے ہاں ساختیات پس ساختیات، جدیدیات اور مابعد جدیدیت جیسی اصطلاحات سنائی دے رہی ہیں لیکن یہ اردو تنقید کو کچھ زیادہ نہ دے پائیں۔ ایک تو اس لئے کہ ان کے مبلغین نے انگریزی کتابیں پڑھیں اور وہاں سے اخذ و ترجمہ کے بعد مضامین گھڑ لیے اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ان تصورات کی روشنی میں کلاسیکی یا معاصر ادبیات کی چھان پھٹک نہ کی گئی۔ اس لیے یہ سب ہوائی باتیں ہیں۔

ہمارے ہاں فکشن اور شاعری کے تراجم ہوتے رہتے ہیں لیکن اچھی تنقیدی کتابوں یا نظریہ ساز ناقدین کی کتابوں کے تراجم واقعی نہیں ہو رہے۔ اور وہ جو کہتے ہیں کہ "بھاری پتھر چوم کر چھوڑ دیا" کچھ یہی عالم اس ضمن میں بھی نظر آتا ہے۔

علاقائی زبانوں پر کام ہونے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ دراصل اب ہمارے ہاں اس طرح کے مسائل، تہذیبی، ثقافتی، تخلیقی یا جمالیات کے برعکس سیاسی بن چکے ہیں۔ اب علاقائیت یا صوبائیت اہم سیاسی مسئلہ ہے اور اسی لیے زبانوں کے بارے میں علمی لسانی یا تحقیقی مباحث کے برعکس جذباتی اور سیاسی گرم گفتاری کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ تاہم اس کے باوجود مختلف اصحاب کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں خوش آئند بات یہ ہے کہ اب اردو میں دیگر پاکستانی زبانوں کے الفاظ استعمال کرنے کا رجحان فروغ پا رہا ہے شاعری میں بھی فکشن میں بھی اور بعض ٹیلی ویژن ڈراموں میں بھی قومی زبانوں کے نئے الفاظ کی شمولیت سے جہاں اردو زبان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوگا اور نئے تصورات کے اظہار کے لیے مزید الفاظ میسر آجائیں گے وہاں اس رویے کو پاکستانی قوم کی تشکیل کی منزل کے حصول کے لیے راست قدم بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔"

DR. SALEEM AKHTER
AL-JOODAT 569-C, LANE NO. 17
JAHANZEB BLOCK. ALLAMA IQBAL
TOWN LAHORE (PAKISTAN)

سلیم شہزاد

مالیگاؤں

سلیم شہزاد کو گاہے گاہے پڑھا تھا مگر ان سے ملاقات دسمبر 1999ء میں اس وقت ہوئی جب میں جلال صابر کے گھر مالیگاؤں میں مقیم تھی۔

سلیم شہزاد کے نام پر شاعری کے دو مجموعے ہیں۔ دعا پر منتشر (1981ء) اور تزکیہ (1987ء) مگر نہ تو انہیں مشاعرے میں بلایا جاتا ہے نہ ہی شاعر کے حوالے سے ان کی شناخت ہے۔ ان کی شناخت اب بحیثیت ایک دانشورو، محقق اور ناقد کی ہے کیونکہ انہوں نے تنقید کے حوالے سے چار کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ جدید شاعری کی ابجد (1983ء) قصہ جدید افسانے کا (1989ء) بیان کی وسعت (1992ء) اور متن و معانی کا تجزیہ (1996ء) ''وحشت آدم'' کے عنوان سے (1985ء) میں ایک ناول بھی لکھا ہے۔ 1998ء میں ''فرہنگ ادبیات'' کے نام سے ایک لغت تیار کی ہے اور اس سلسلے پر مزید کام کر رہے ہیں۔

ان کی زیر ترتیب وطباعت کتب کے نام ہیں جیم سے جملے تک (لسانیات) ویرگاتھا (ناول) حمد و نعت (شاعری) نظمیں (شاعری) منظوم تمثیلات (ڈرامے) مضامین (تنقید) تبصرے (تنقید) لفظیات

غالب (لغت) وغیرہ۔

سلیم شہزاد کا پیدائشی نام سلیم خان والد ابراہیم خان ہے۔ یکم جون 1949ء کو دھولیہ (مہاراشٹر ہندوستان) میں پیدا ہوئے' انگریزی ادبیات و اردو میں ایم۔ اے کیا اور تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوگئے۔ "گفتنی" کے سوال نمبر2 کے جواب میں انہوں نے کہا۔ بیسویں صدی میں اردو ادب کی تاریخ میں یاد کئے جانے کے لائق چند نام یہ ہیں۔ شاعری میں اقبال' اکبر' جوش' فراق' فیض' سردار جعفری' ظفر اقبال' باقی' عمیق حنفی' قاضی سلیم ' اختر الایمان' احمد ندیم قاسمی۔ فکشن میں پریم چند' کرشن چندر' منٹو' بیدی' عصمت چغتائی' قرۃ العین حیدر' انتظار حسین' محمد حسن عسکری' سلیم احمد' شمس الرحمٰن فاروقی' وزیر آغا۔ تنقید میں نیاز فتح پوری' آل احمد سرور' کلیم الدین احمد' احتشام حسین' محمد حسن عسکری' سلیم احمد' شمس الرحمٰن فاروقی' وزیر آغا۔

سوال نمبر3 کے جواب میں کہتے ہیں۔ ادب اگر فنون میں شمار کیا جائے تو فکشن بھی ضرور ایک لطیف آرٹ کا مقام پاسکتا ہے لیکن حقیقتاً" ادب کی یہ صنف کچھ ایسی خاص لطیف نہیں کیونکہ یہ زندگی کے اچھے برے تمام پہلوؤں کو اپنا موضوع بناتی ہے جو یقیناً" ہر طرح لطیف نہیں ہوتے۔ جدیدیت نے فکشن کے آرٹ کو بالخصوص ترقی پسند تحریک کے زمانے سے لطیف رہنے نہیں دیا تھا۔ اگلی کسر جدید تجرباتی فکشن نے پوری کردی۔ ویسے جدید فکشن نے اس کے حسن کو صرف مجروح نہیں کیا بلکہ اسے بعض پہلوؤں سے نکھارا سنوارا بھی ہے جس کے لئے جدید فکشن کا معروضی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

انہوں نے کہا "موجودہ صدی میں اگر ناول کم لکھے گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ گذشتہ صدی میں اردو ادب میں ناول زیادہ لکھے گئے تھے۔ عرض ہے کہ ناول کی صنف اردو میں اسی صدی کی چیز ہے اور بظاہر ناول کم بھی نہیں لکھے گئے ہیں' البتہ اس صنف کے معیاری کلاسک نمونے اردو میں کم تخلیق ہوئے ہیں۔ پھر مغربی جدیدیت کی یلغار نے اس میں جو تجربہ پسندی کو فروغ دیا اس سے بھی ناول میں لکھنے پڑھنے والوں نے دلچسپی کم دکھائی۔ ویسے ناول کی صنف میں فنی اظہار لکھنے والے میں خاصی اظہاری طاقت کا متقاضی ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں جدید فکشن لکھنے والوں میں افسانہ لکھنے بھر کی طاقت تو ہے لیکن ناول کے لئے ضروری طاقت کا اچھے اچھوں میں فقدان ہے۔"

شہزاد سلیم کہہ رہے تھے۔ واقعی آج کا ادیب مادی' ذہنی' نفسی اور روحانی بحران میں مبتلا ہے اور بہتر زندگی گزارنے کے وسائل کے لئے ہاتھ پیر مارتا رہتا ہے جو اسے وقتی طور پر آسودہ کرسکتے ہیں' دائمی مسرت نہیں دے سکتے۔ اس لئے وہ کبھی اس نظام فکر کی طرف اور کبھی اس نظریے کی طرف لپکتا ہے اور کبھی بیزار ہو کر ہر ایک سے اپنی برات کا اعلان کردیتا ہے۔ ایسی صورت میں اسے صرف اور صرف ایک آفاقی نظریہ' زمان و مکاں پر حاوی نظریہ یعنی اسلام ہی پناہ دے سکتا ہے اور

اس نظریے (جو یقیناً" محض ایک نظریہ نہیں ہے) اسلام سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے اپنے عقائد اور اعمال و کردار کے ساتھ اور بحیثیت ادیب ایک سماجی اکائی کے روبکار ہونا پڑے گا جو موجودہ عصری نام نہاد مابعد جدید وغیرہ صورتحال میں اس کے لئے ایک امتحان سے گزرنے سے کم نہیں۔

سوال نمبر 4 کے جواب میں سلیم شہزاد کا کہنا ہے کہ معیاری ادب کے پیمانے معلوم کرنے سے پہلے آپ کو طے کرنا ہوگا کہ معیاری ادب یا کسی تخلیق کا ادبی معیار کس چڑیا کا نام ہے؟ راقم السطور نے اپنی تالیف "فرہنگ ادبیات" میں اصطلاح 'ادبی معیار کے تحت لکھا ہے کہ

ادبی معیار وہ تصور ہے جو ادب میں اعلیٰ ادبی اقدار و روایات کا پاس و لحاظ رکھے۔ ادبی تخلیق اسی وقت ادبی معیار کی حامل ہوتی ہے جب اس سے یہ تصور وابستہ ہو ورنہ معیار کو کسی پیمانے سے ناپا نہیں جاسکتا۔ اس میں پسند اور ناپسند کے عوامل بھی شامل ہوسکتے ہیں جو خاص ماحول، تعلیم و تربیت سے پیدا ہوتے ہیں چنانچہ مذہبی ماحول اور تعلیم کے زیر اثر فرد صرف اخلاقی اور اصلاحی قدروں کو ادب کا معیار تسلیم کرے گا اور بے دین تعلیم یافتہ شخص عام اخلاقیات کو اپنی پسند قرار دے گا۔ ادبی معیار کی یہ صورت ادب کے قارئین تک رہتی ہے۔ دوسری صورت میں عصرو فکر کے پس منظر میں خود ادب کو مقام و معیار دینا مقصود ہوتا ہے یعنی موجودہ حالات میں کس ادب کو معیاری قرار دیا جائے، گذشتہ روایتی ادب کو یا آج کے غیر روایتی ادب کو؟ اس ضمن میں کلاسک اور غیر کلاسک کی بحث آتی ہے، نظریے اور مخصوص فکر سے پہلو تہی بھی یہاں ممکن نہیں، ساتھ ہی غیر وابستگی اور غیر جانبداری کے تصورات کو بھی معیار کے سلسلے میں زیر بحث لایا جاسکتا ہے۔ آج عصرو فکر نے یقیناً" اذہان کی قلب ماہیت کردی ہے۔ روایت اور غیر روایت کے تصورات ہر موقع پر درست معلوم نہیں ہوتے پھر زمان و مکاں کے اطناب سے اطراف اور ماحول میں جو قربت اور مشینی تیزی آگئی ہے ان حقائق کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ ساری دنیا میں آج جدیدیت کو ادب کا معیار یا جدید ادب کو معیاری ادب قرار دیا جارہا ہے۔ اس جدیدیت کے مفاہیم بھی مختلف اور متنوع ہیں۔ اس میں احیائے علوم کی تحریک سے لے کر شکست ذات کے فلسفے تک کو شامل کیا جاتا ہے چنانچہ جس ادب میں روایت و درایت کے سلسلے عصرو فکر اور زبان کی جدیدیت سے آکر ملیں، اسی کو آج کا معیار کہنا درست معلوم ہوتا ہے (یعنی کل کا معیار کچھ اور تھا اور مستقبل کا معیار کچھ اور ہی ہوسکتا ہے)

سلیم کہتے ہیں اردو کئی زبانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کیونکہ کوئی بھی زبان مختلف زبانوں کا مجموعہ ہرگز نہیں ہوتی (اور یہ ایک سائنسی یعنی لسانیاتی اصول ہے) البتہ کسی زبان میں مختلف زبانوں کے اظہاری لسانی ساختیے شامل ہوسکتے ہیں جیسا کہ نہ صرف اردو بلکہ دنیا کی ہر زبان میں شامل ہیں۔

بعض ضرورتوں کے تحت ایک زبان میں کسی زبان کے الفاظ مستعار بھی لئے جاتے ہیں جیسا کہ اردو میں (اور انگریزی میں بھی) اس کی مثالیں موجود ہیں لیکن انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہے اس لئے اس کے الفاظ اردو میں (بلا ضرورت) شامل کرلئے جائیں۔ یہ نامناسب' غیر سائنسی اور غیر ضروری عمل ہے۔ یہ اطلاع بھی عجیب ہے کہ فارسی اور عربی نئے علوم سے محروم زبانیں ہیں۔ ان زبانوں نے بھی ضرورتاً" مغربی زبانوں کے الفاظ مستعار لئے ہیں اور انہیں فارسی اور عربی بنا لیا ہے۔ اردو میں بھی یہ صلاحیت موجود ہے جسے وقت آنے پر وہ برابر استعمال کرتی ہے۔

سوال نمبر 9 کے جواب بہت سنجیدہ ہو کر بولے اگر اس واقعے کو اہم مانا جاسکتا ہے کہ ایک شخص قطعی غیر ادبی و لسانی ماحول میں جنم لے کر ایسا ادیب وغیرہ بن جائے کہ (ایک معمولی میونسپل اسکول میں مدرس ہونے کے باوجود) ہندوستان کے نامی گرامی یونیورسٹی پروفیسرز کے بیچ اپنی تحریریں پڑھے' لکھے اور شائع کرائے تو یقیناً" اس خاکسار کے تعلق سے یہ واقعہ اہم اور ساتھ ہی دلچسپ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

سلیم خود نقاد ہیں چنانچہ ان کا تجزیہ ہے کہ اردو ادب میں تنقید برائے نام نہیں رہ گئی صاحب' مجھے تو ہر طرف اسی کا زور نظر آتا ہے۔ تخلیقی کام البتہ اپنی چمک دمک کھو چکے ہیں۔ ویسے جو تنقید ہو رہی ہے اس پر تنقید برائے نام کی بجائے تنقید برائے تنقیص کا لیبل زیادہ مناسب ہوگا۔ نظریات بے وقعت ہو چکے ہیں اس لئے مابعد جدید مفکرین نے ایسا نظریہ اپنالیا جو کسی نظریے کی سچائی کو قبول نہیں کرتا اور اپنے آپ میں ایک بڑا جھوٹ ہے۔

پاکستان کا حال تو اللہ بہتر جانتا ہے' ہندوستان میں اردو سے دوسری ہندوستانی زبانوں میں اور ان زبانوں سے اردو میں خوب تراجم ہو رہے ہیں۔ ادھر مہاراشٹر میں ہر سال تین چار کتابیں تراجم کی شائع ہو جاتی ہیں۔ سرکار ان کتابوں کے مصنفین کو انعام و اکرام سے نوازتی بھی ہے' شاید یہ اسی کا نتیجہ ہو (یا شاید انعام و اکرام حاصل کرنے کے لئے اہل قلم نے یہ وطیرہ اختیار کیا ہو۔)

MR. SALEEM SHEZAD
323 MANGAL WARD, MALABARA,
MALEGAON (NASIK) MAHARASHTRA
INDIA

بعض شخص تحقیق و تنقید کو دوسرے درجہ کا ادب تصور
کرتے ہیں جو درست نہیں۔ محقق تخلیق کار کا درجہ رکھتا ہے
اور تنقید نگار ایک فن پارے کی تفہیم و تحسین میں
اور اس کی ... ہے۔

سیدہ جعفر

ڈاکٹر سیدہ جعفر

بھوپال

محترم ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "تنقید و تخلیق کا ساتھ تو اکثر دیکھا ہے لیکن تحقیق و تخلیق میں ایک طرح کا تناقص ہے۔ تخلیق میں ساری کارگزاری، جذبے اور وجدان کی ہے۔ جہاں تعقل کے پر جلتے ہیں لیکن تحقیق کا سارا کاروبار ہی منطقی نوعیت کا ہے جہاں عقلیت کی حکومت ہے تاہم اجتماع ضدین کی استثنائی صورتیں خال خال نظر آجاتی ہیں۔

سیدہ جعفر کا شمار بھی انہی خال خال صورتوں میں کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے بھی ایک عمر تحقیق، تنقید و ترجمہ کے کاموں میں گزاری ہے اور 28 تصانیف کے خزانے سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔

میں بھوپال کے پروفیسر محترم آفاق احمد کی شکر گزار ہوں جنہوں نے "گفتنی" کا سوالنامہ محترمہ سیدہ جعفر تک پہنچایا اور سیدہ جعفر نے اپنی مصروفیات سے "گفتنی" کے قارئین کے لئے وقت چھین کر اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔

سیدہ جعفر 5/ اپریل 1934ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ تعلیمی میدان میں ایم۔ اے اور

پی ایچ ڈی ہیں۔ ملازمت کی ابتداء نظام کالج (عثمانیہ یونیورسٹی) سے بحیثیت ریڈر کی۔ اور پروفیسر و صدر شعبہ اردو بھی رہیں۔ 1991ء میں پروفیسر و صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدر آباد سے وابستہ ہوئیں۔ سیدہ جعفر کو ان کی تصانیف پر مختلف اداروں اور اکادمیوں سے 21 ایوارڈز ملے جن میں سے چھ خصوصی ایوارڈز درج ذیل ہیں:

1- ڈاکٹر زور ایوارڈ برائے تحقیق (عالمی اردو کانفرنس، دہلی)
2- نوائے میر ایوارڈ برائے ادبی خدمات (میر اکادمی، لکھنؤ)
3- قاضی عبدالودود ایوارڈ (بہار اردو اکادمی، بہار)
4- بہترین اردو رائٹر ایوارڈ (اے پی ہندی پرچار سبھا)
5- مخدوم ایوارڈ (آندھرا پردیش اردو اکادمی)
6- فراق گورکھپوری ایوارڈ (عالمی اردو کانفرنس، دہلی)

سیدہ جعفر کی تحریروں کا عربی، ہندی، انگریزی اور مراٹھی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف بین الاقوامی طور پر بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان کے نام

1- Marquis who's who (New Providence U.S.A)

2- Out Standing People of the 20th Century (Cambridge. England)

3- Asia / Pacific Who is who

میں درج کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ سات اور ہو از ہو میں نام شامل کیا گیا ہے جس کی تفصیل ان کے سوانحی کارناموں میں درج ہے۔ سیدہ جعفر کی رہنمائی میں نو پی ایچ ڈی کے اسکالروں کو عثمانیہ یونیورسٹی اور سینٹرل یونیورسٹی آف حیدر آباد میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے اور بلاشبہ یہ بڑے اعزاز کی بات ہے۔ حیدر آباد کے روزنامہ سیاست میں ہر دو شنبہ "ادب عالیہ" میں ان کا مضمون کسی ادبی شخصیت پر باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ سیدہ جعفر کی ادبی خدمات کے پیش نظر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن حکومت ہند نے انہیں اپنے خصوصی منصوبے بعنوان "اردو ادب میں ہندوستانی عناصر 1800ء تک" کے شعبہ تحقیق کا سربراہ مقرر کیا ہے۔ اپنے ادبی سفر میں انہوں نے شام، ایران، سعودی عرب، پاکستان اور لندن کی سیاحت کی ہے۔

گفتنی کے لئے سوال نمبر 2 کے جواب میں انہوں نے کہا۔ آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، ندا فاضلی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

سوال نمبر 3 کے جواب میں ان کا کہنا ہے۔ ہر تحریک یا رجحان اپنے وقت کا ایک اہم تقاضہ اور ادبی تصورات کے تسلسل کا مظہر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا مطالعہ اس کے عصری تناظر میں کرنا چاہئے۔ جدیدیت نے فکشن کو سنوارا بھی ہے اور اسے نئی جہات سے روشناس کر کے وسعت بھی عطا کی ہے۔

سوال 4 کے جواب میں فرماتی ہیں۔

فرصت کاروبار شوق کے
ذوق نظارہ جمال کہاں

سوال نمبر 5 کے جواب انہوں نے کہا۔ اسلام نے جہد مسلسل اور نفس مطمئنہ کا جو تصور پیش کیا ہے وہ انسان کی رہبری کر سکتا ہے۔

سوال نمبر 6 کے جواب میں ان کا کہنا ہے۔ شاعری یا نثر کی مختلف اصناف میں معیاری تخلیق وہ ہوتی ہے جس میں انسانی تجربے کی کسک موجود ہو اور جس میں آفاقی عناصر کی نظر آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ فنی تقاضوں کی تکمیل بھی کرے۔

سوال نمبر 7 کا جواب دیتے ہوئے کہتی ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان سے باہر شاعری کی طرف فنکار جو زیادہ متوجہ ہو رہے ہیں اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انفرادی جذبات و احساسات کا اظہار شعر کے پیکر میں زیادہ موثر انداز میں کیا جا سکتا ہے۔

سوال نمبر 8 کے جواب میں کہتی ہیں۔ عربی اور فارسی کے بہت سے الفاظ اردو زبان کے خمیر کا جزو رہے ہیں اور جدید دور میں انگریزی کے بہت سے الفاظ نے بھی اردو میں اپنی مستقل جگہ بنالی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انگریزی الفاظ اور اظہار کے سانچوں کی شمولیت سے اس وقت گریز کیا جاتا ہے۔ جب وہ اردو کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ محسوس نہیں ہوتے۔

9- میری زندگی کے سب ہی واقعات دلچسپ ہیں۔ میرا سلسلہ نسب اسلام کے عالم متبحر اور (نہج البلاغہ) کے مرتب سید رضی تک پہنچتا ہے۔ میرے رفیق حیات احمد مہدی ایڈوکیٹ میرے علمی و ادبی کاموں میں تعاون کرتے ہیں۔ وہ قانون داں ہیں اور اردو ادب سے بہت زیادہ واقف نہیں ہیں۔ اس کے باوجود میرے علمی و ادبی کاموں سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے بڑا بیٹا ڈاکٹر نوازش مہدی میکنکل انجینئر ہے اور اس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ میرے چھوٹا بیٹا حسین مہدی پائلٹ ہے۔ فلائنگ کے بعد جو وقت ملتا ہے اس میں وہ میرا کام کرتا رہتا ہے۔ اگر مجھے اپنے افراد خاندان کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو میری ادبی کاوشوں کا سلسلہ ختم ہو گیا ہوتا۔ میں ساہتیہ اکادمی اور نیشنل کونسل فار آف اردو کی ممبر بھی رہ چکی ہوں اور اردو ادب کی ترویج کے لئے خاصا کام کر چکی ہوں۔

10- مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ اردو میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ اس وقت اردو کے تنقید نگار تین زمروں میں منقسم نظر آتے ہیں۔ کچھ تنقید نگار جدیدیت اور اس کے مختلف رجحانات سے متاثر ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جن کی تنقید میں جہاں تہاں ترقی پسند میلانات کا عکس نظر آتا ہے۔

MRS. SYEDA JAFER
HOUSE NO. 9-1-24 LANGER HOUSE,
HYDERABAD - 500008 A.P. INDIA

ان کو، جو اپنی آنکھ کا دیکھیں نہ شہتیر
ہر آدمی کی آنکھ میں تنکا دکھائی دے

۲۳ جون ۱۹۹۹ء

ش صغیر ادیب

ش۔ صغیر ادیب

بلیک برن۔ برطانیہ

چار بج چکے تھے۔ فجر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ اکثر سحر کے انتظار میں کبھی لکھنے اور کبھی پڑھنے کے کام کا آغاز ہو جاتا ہے اور گاہے گاہے آسمان کی طرف نظریں اٹھتی ہیں کہ اب پو پھٹی اور اب روشنی آئی کہ آئی۔ اور جب سورج کی پہلی کرن دستک دیتی تو دل کو سکون نصیب ہوتا کہ یہ کرن، رات اور اندھیرے کے مہیب سناٹے کو ساتھ لے کر ہی جائے گی۔

اس دن بھی بلکہ اس وقت بھی جب ابھی دن نہیں نکلا تھا، بجھی بجھی طبیعت موڈ کے جگنوؤں سے روشنی مانگ رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں بریڈ فورڈ (برطانیہ) کے ہفت روزہ "راوی" 18 جون 1994 کا صفحہ تھا۔ اس میں ش۔ صغیر ادیب کا افسانہ تھا۔ "کبوتر کب لوٹیں گے؟" میں افسانہ پڑھ رہی تھی کہ ایک موڑ پر پہنچ کر لگا یکایک بہت سے چراغ روشن ہو گئے ہوں حالانکہ ابھی تک سورج کی پہلی کرن میں جرات پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ انسانوں کا اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں پر ظلم ڈھائے جانے کا نظارہ کرے۔ ابھی شب کی سیاہ چادر تار تار نہیں ہوئی تھی لیکن یہ روشنی تو ش۔ صغیر ادیب کے افسانے سے پھوٹی تھی۔

اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ جب سچا ادب تخلیق کیا جاتا ہے تو حروف بول اٹھتے ہیں اور علم کا چراغ بھی روشن ہو جاتا ہے۔ یہی ش۔ صغیر کے افسانے کا کمال تھا۔

یہ افسانہ ایک آدمی 'عمر گنیبچ کے انتظار سے شروع ہوتا ہے۔ جس کے اہل خانہ سرب ظلم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے پالے ہوئے کبوتر بھی ظالم سرب فوجیوں کی توپ اور گولیوں کی گھن گرج سے خوفزدہ ہو کر اڑ گئے اور بصارت سے محروم عمر اس بارودی ماحول میں تنہا رہ جاتا ہے اور اپنے کبوتروں کے لوٹنے کا منتظر رہتا ہے جبکہ دوسری جانب زندہ رہ جانے والی اس کی پڑوسن Velma اقوام متحدہ کے سینٹر سے راشن لے کر آتی ہے اور تنہائی کے زخموں سے چور عمر سے کہتی ہے "تم ٹھیک کہتے ہو عمر! باہر بہت اندھیرا ہے اور دور تک کچھ بھی نظر نہیں آتا لیکن یوں ہمت ہارنا بھی تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" پھر وہ چائے بنا کر لاتی ہے تو عمر چائے کا گھونٹ لے کر کہتا ہے "آج تو جی خوش ہو گیا' ولما۔ شاید تین دن بعد راشن ملا ہے اور ہم لوگ چار پانچ دن تک اس خوراک سے گزارا کر سکتے ہیں۔" پھر وہ ولما سے پوچھتا "کیا کبوتر کبھی واپس لوٹ کر آئیں گے؟" کبوتر جو اس کی تنہائی کے ساتھی تھے۔ ولما کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا جواب دے۔ وہ کیسے بتا سکتی ہے کب زندگی کا اعتبار واپس آئے گا۔ جب سب کچھ اجڑ جائے گا' بستیاں ویران ہو جائیں گی اور فضا میں اتنا زہر گھل جائے گا کہ انہیں اپنا ٹھکانہ 'اپنا نشیمن چھوڑ کر کہیں اور جانا پڑے گا۔ اب نہ جانے وہ کہاں ہوں گے۔ وہاں عمر گنیبچ جیسا کوئی آدمی انہیں دانے کھلاتا ہو گا یا نہیں۔ معاً" ولما کا دل بھر آتا ہے۔ وہ رحم بھری نظروں سے عمر کو دیکھتی ہے اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے "عمر! مجھے امید ہے کہ کبوتر ایک نہ ایک دن ضرور واپس آئیں گے۔"

مگر کبوتر واپس نہیں آئے۔ ولما بھی اسی ظلم کا شکار ہو جاتی ہے۔ ادھر عمر پھر ویسا ہی تنہا رہ جاتا ہے۔ ش۔ صغیر کی کہانی کا تاثر یہ ہے کہ تنہائی کا شکار ایک قاری خود کو تنہا نہیں سمجھتا۔ کہانی کا کردار عمر کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اسی ماحول میں پہنچ جاتا ہے اور عمر کا کرب محسوس کرکے اس کی اپنی تنہائی کا کرب اسے ہلکا محسوس ہونے لگتا ہے اور یہی ادیب کی تحریر کا کمال ہے۔

"راوی" کے ایڈیٹر اور مشہور افسانہ نویس مقصود الٰہی شیخ نے جب ش۔ صغیر کا تعارف لکھا اور یہ واضح کیا کہ عاشور کاظمی اگر اپنی کتاب "فسانہ کہیں جسے" مرتب نہ کرتے تو شاید وہ "نوٹ" بھی جو ش۔ صغیر کے افسانے کی دستار بنا ہے' شرمندہ اشاعت نہ ہوتا کیونکہ برطانیہ میں ان کے علاوہ کسی اور نے قلمکار کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔"

مقصود الٰہی شیخ کا تحریری تعارف جو "راوی" 23 / اپریل 1994ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے' قابل ستائش ہے۔ کتاب "فسانہ کہیں جسے" میں عاشور کاظمی کے حوالے سے کئی سطریں پڑھیں۔ میں عاشور کاظمی کی مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے یہ کتاب عنایت کی۔ اس میں مجھے بہت سے افسانہ نگاروں کی کہانیاں بھی پڑھنے کو ملیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ادیبوں کے تعارفی خاکوں نے بھی

میری رہنمائی کی۔ عاشور لکھتے ہیں.... "ش۔ صغیر ادیب جیسے سچے اور جینوئن (genuine) اہل قلم، گوشہ تنہائی اختیار کرلیں تو ذہن میں یہ سوچ ابھرتی ہے کہ زمانے کی ناقدری کا سبب ہے یا فنکار کی اپنی تنہائی پسندی لیکن اگر یہ ان کی تنہائی پسندی ہوتی تو ان کی تخلیقات جرائد تک کیسے پہنچتیں؟ عاشور جب یہ سوال اٹھاتے ہیں تو پھر وہ ش۔ صغیر کو گوشہ تنہائی سے باہر کیوں نہیں لاتے؟ کیا مقصود الہٰی شیخ اور عاشور یہ نہیں جانتے کہ یہ تعلقات کی دنیا ہے، یہاں وہی کامیاب ہوتا ہے جو اونچی آواز میں بولنا جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ش۔ صغیر کی گوشہ تنہائی کی کئی اور وجوہ بھی ہوں۔ بہرحال میں نے تو انہیں کسی طرح بھی ڈھونڈ نکالا ہے۔

ش۔ صغیر ادیب کو برسوں پہلے اس صدی کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر نے بھی "شمع" دہلی میں شائع ہونے والے افسانہ "گلاب کا پھول" پڑھ کر داد دی تھی جس کا حوالہ مقصود صاحب نے بھی اپنے تعارف میں پیش کیا ہے۔ اگر ش۔ صغیر کی پی آر مضبوط ہوتی تو اب تک ان کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہوتا اور افسانوں کے میدان میں ان کی واہ واہ ہوتی۔ مگر افسوس! کہ چار سو سے زائد کہانیوں کے خالق ہونے کے باوجود ان کے افسانوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔

اب میں آپ کو ان کا تعارف کراتی ہوں۔ جب میں نے ان سے نام اور افسانوں کے متعلق سوال کیا، تو کہنے لگے "میرا نام احمد انصاری ہے جبکہ قلمی نام ش۔ صغیر ادیب اپنایا۔ ش میرے بچپن کے گھریلو نام کا پہلا حرف ہے۔ بچپن کی یادوں سے ایک گہرا جذباتی لگاؤ ہے۔ شاید اس لئے کہ بچپن خوبصورت اور پر مسرت تھا۔ بعد کی زندگی فکر و آلام، محرومی، مایوسی اور پچھتاؤں سے پر رہی ہے۔"

انہوں نے بتایا میری پیدائش کانپور (بھارت) میں ہوئی تھی۔ والدین کے بیان کے مطابق تاریخ تھی 26 جون 1936ء یا 1937ء ابھی نو عمر ہی تھا کہ والدین کے ساتھ پاکستان آگیا۔ والدین نے رحیم یار خان (پہلے ریاست بھاولپور اب پنجاب) میں مستقل گھر بنایا چنانچہ رحیم یار خان کو بھی اپنا وطن ثانی سمجھتا ہوں۔

آزادی، بٹوارہ اور پاکستان ہجرت کی بنا پر تعلیم ادھوری ہی رہ گئی کہ ان دنوں حالات بے حد نامساعد تھے۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ادیب عالم کا امتحان پاس کیا تھا۔ والدین کا ہاتھ بٹانے کے لئے نو عمری ہی میں نوکری بھی کرنا پڑی۔ کالج جانے کا موقع نہیں ملا۔ کئی سال بعد پرائیوٹ طور پر میٹرک کا امتحان دیا اور اعلیٰ نمبروں سے فیل ہوا۔ انگلستان آنے کے بعد کئی سال تو فکر روزگار کی نذر ہو گئے۔ پھر محض شوقیہ طور پر دوبارہ او لیول کیا۔ اس کے بعد اے لیول میں داخلہ لیا لیکن شدید اور طویل بیماری کے سبب امتحان میں بیٹھنے سے محروم رہا۔

مطالعہ کا شوق بچپن ہی سے ہے۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں ادبی رسائل اور کتب کا مطالعہ شروع کردیا تھا۔ ہرچند کہ ابتداء میں شرر، صادق سردھنوی نسیم امروہوی اور ایم اسلم وغیرہ کی تحریریں بھی اچھی لگتی تھیں مگر دل و دماغ پر زیادہ گہرا اثر ان تحریروں نے مرتب کیا جو ترقی پسند

نظریات کے تحت لکھی گئی تھیں۔ سب سے پہلے پریم چند اور کرشن چندر نے متاثر کیا۔ پھر منٹو، بیدی اور قرۃ العین حیدر بھی سمجھ میں آنے لگے۔ ان فنکاروں کا بہت گہرا اثر اس وقت بھی تھا اور آج بھی ہے۔

لکھتے ہوئے بڑی مدت ہو گئی ہے۔ بچوں کی کہانیاں لکھیں۔ جاسوسی کہانیاں لکھیں۔ پھر جاسوسی ناول لکھے جو فرضی ناموں سے چھپے۔ میری مطلوبہ کہانیوں کی تعداد کتنی ہے۔ مجھے نہیں معلوم لیکن قوی اندازہ ہے کہ چار سو سے اوپر ہے۔ ان میں بری بھلی، الم غلم تحریریں سب ہی شامل ہیں۔ اب تک کوئی کتاب نہیں چھپی۔ کچھ تو اس بنا پر کہ فی زمانہ کتاب چھپوانا کچھ آسان نہیں۔ دوئم اس لئے کہ میں نے اس طرف زیادہ سنجیدگی سے کبھی توجہ ہی نہیں دی۔ اب اس بارے میں سوچ رہا ہوں۔

"بیسوں صدی آخری سانسیں لے رہی ہے" وہ بتانے لگے دنیا تغیر کی زد میں ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں ہر شعبے میں حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ زبان و ادب بھی تبدیلیوں کی اس یلغار سے نہیں بچ سکے ہیں۔ خاص طور پر الیکٹرونک میڈیا نے عوام کے مذاق پر گہرا اثر ڈالا ہے چنانچہ سنجیدہ اور نظریاتی ادب کی تخلیق میں بتدریج کمی ہوئی ہے۔ تفریحی اور سطحی ادب (اگر اسے ادب کہا جائے تو) کا چلن بڑھا۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اس صدی نے اردو ادب کو کچھ ایسے نام ضرور دیئے ہیں جن میں قدروں کے تغیر و تبدل اور شکست و ریخت کے باوجود، زندہ رہنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اقبال کا نام تو خیر امر ہے لیکن علامہ اقبال کے علاوہ پریم چند، فیض، جوش، قرۃ العین، حفیظ اور چند ایک دوسرے مشاہیر کا نام ضرور زندہ رہے گا۔"

فکشن پر جدیدیت کی یلغار کے حوالے سے ش نے ایک زندہ سوچ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "زندہ زبانوں کا ادب نہ ساکن ہوتا ہے نہ جامد۔ وہ ہمیشہ نئے رویوں، نئے رجحانات اور نئی تحریکات کو قبول کرتا رہتا ہے۔ اردو بھی ایک زندہ اور متحرک زبان ہے اور فطرت کے اس کلیے سے مبرا نہیں۔ ابتدائی دور کی اصلاح پسندی سے لے کر دور حاضر کی مابعد جدیدیت تک کئی تحریکیں ہمارے ادب کی گود میں پلتی رہی ہیں۔ ایک رجحان یا تحریک جب اپنا اثر کھونا شروع کرتی ہے تو دوسرے رجحان یا فکر کے لئے فضا تیار ہو جاتی ہے۔ اردو یا ترقی پسند تحریک بتدریج اپنا اثر کھو رہی تھی۔ نتیجے میں جدیدیت نے جنم لیا اور جلد ہی ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی۔ ترقی پسند تحریک اردو ادب کی بلاشبہ انتہائی اہم اور پر اثر تحریک رہی ہے۔ اس تحریک کے فکری نظام نے ایک سے زیادہ نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ جدیدیت ترقی پسند تحریک کی طرح اہم اور موثر تو نہیں رہی لیکن جدیدیت کو کسی بھی لحاظ سے نظر انداز یا رد کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اس سوال پر پہلے بھی بحث ہوتی رہی ہے اور اب بھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے کہ جدیدیت نے آرٹ کو کیا دیا؟ مخالفین نے جدیدیت کو رد کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن جدیدیت بہرحال خود کو منوانے اور ادب پر اپنے گہرے اثرات مرتب کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ ترقی پسند تحریک نے بلاشبہ اردو ادب کو اپنے فکر و فن سے مالا مال کیا ہے تاہم

جدیدیت کا کنٹری بیوشن بھی ایسا نہیں ہے جسے نظر انداز کیا جا سکے۔"
اگلے سوال کے جواب میں کئی وجوہ بتاتے ہوئے انہوں نے کہا۔
"اس میں شک نہیں کہ اس صدی میں اور بالخصوص گذشتہ کچھ برسوں میں اردو میں ناول بہت کم لکھے گئے ہیں۔ اس کی وجوہ کئی ہیں۔ ناخواندگی، معاشرتی اتھل پتھل، الیکٹرانک میڈیا، کتابوں کی گراں قیمتیں، حکومتوں کا غیر ہمدردانہ بلکہ کسی حد تک معاندانہ رویہ۔ پھر یہ بھی ہے کہ ناول لکھ کر مصنف کو شہرت بھلے ہی ملتی ہو۔ مالی فائدہ عموماً" نہیں ہوتا۔ ناشر آسانی سے نہیں ملتا اور اکثر اپنی گرہ سے ہی رقم خرچ کر کے کتاب چھپوانی پڑتی ہے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ مہینوں کی نیند اور سکون حرام کر کے ناول لکھا جائے کیوں نہ مختصر افسانے لکھ کر کام چلایا جائے۔ شاید یہی سبب ہے کہ افسانوی مجموعے تو اکثر چھپتے رہتے ہیں جبکہ ناول کی طرف توجہ کم ہے۔"
ہمارے پانچویں سوال سے اتفاق کرتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ "ایک پر سکون پر امن اور پر مست زندگی کا خواب آدمی نے غالباً" روز اول ہی سے دیکھا ہے اور ادیب بھی اس سے مبرا نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ادیب ایک بہتر معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے یعنی وہ صرف اپنے لئے نہیں بلکہ عام آدمی کے لئے بھی بہتر زندگی کا خواب دیکھتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ آج کا ادیب نہ صرف مادی بلکہ ذہنی اور نفسیاتی بحران کا بھی شکار ہے۔ ایک بھول بھلیاں میں گم ہے۔ پہلے اس کے پاس ایک مقصد تھا ایک نصب العین تھا۔ دوسرے الفاظ میں ایک "خواب" تھا۔ آزادی کا خواب، فیوڈل ازم سے نجات کا خواب، اب حالات مختلف ہیں۔ آزادی تو ملی لیکن سرمایہ داری اور نوکر شاہی کا عذاب آج بھی مسلط ہے۔ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ قدریں اپنی قدر کھو رہی ہیں۔ یہ ایک الگ اور طویل بحث ہے کہ ادیب کو اپنے خواب کی تعبیر ملی یا نہیں۔ لیکن جس فکر کو لے کر وہ چلا تھا، وہ فکر اسے منزل تک شاید نہیں لے گئی۔ نتیجے کے طور پر ادب ہر پہلو سے انتشار و بحران کا شکار ہوا۔ "خواب" اب بھی اس کے پاس ہے لیکن وہ نظام فکر سے کسی حد تک محروم ہے۔ آج بھی وہ ایک بہتر اور منصفانہ معاشرے کا خواہش مند ہے۔ ایک پر امن اور پر مسرت زندگی بسر کرنا چاہتا ہے لیکن جس بھول بھلیاں میں وہ گم ہے اس سے باہر نکلے تو کیسے؟ میرے خیال میں رہنمائی کے لئے ہمارے ادیب کو خود اپنی طرف دیکھنا چاہئے۔ مستعار فکر کسی کام نہیں آئے گی اور جو تحریر، شعر ہو یا نثر پارہ، زبان و بیان کی لطافت اور ندرت خیالی سے محروم ہو اور روح عصر سے خالی ہو۔ میرے نزدیک اسے معیاری ادب میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ برصغیر سے باہر شاعری بہت زیادہ ہو رہی ہے جبکہ نثر کی طرف رجحان بہت کم ہے کیونکہ عمدہ نثر پارہ لکھنے کے لئے نہ صرف محنت کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ وقت بھی درکار ہوتا ہے جو کہ مشکل سے میسر آتا ہے کہ زندگی مغرب میں چلتی نہیں بھاگتی ہے۔ شعر کہنے کے لئے وقت نکالنا کچھ زیادہ دشوار نہیں۔ لیکن نثر نگاری کے جملہ تقاضے پورے کرنے کا عمل دشوار ہے۔"

اردو میں انگریزی کی آمیزش کے سلسلے میں ان کا تجزیہ ملاحظہ ہو۔

"اردو بلاشبہ دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس کا نثری اور شعری سرمایہ بھی قابل فخر ہے۔ تاہم ہماری اس محبوب زبان میں ابھی وہ وسعت موجود نہیں جو انگریزی میں ہے۔ (ہمیں بہرحال یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ انگریزی کا بیشتر ذخیرہ الفاظ دوسری زبانوں کا مرہون احسان ہے۔ کسی بھی زبان کی ترقی اور وسعت کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے ذخیرہ الفاظ میں اضافے کا عمل جاری رہے چونکہ اردو کی تشکیل مختلف زبانوں کے آمیزے سے ہوئی ہے' لہٰذا اردو کی ترقی و توسیع کے لئے بھی ہمیں دوسری زبانوں ہی کی طرف دیکھنا پڑے گا اور ہرچند کہ میں زبان کے سلسلے میں کسی تعصب و تنگ نظری کا قائل نہیں۔ پھر بھی اس بات کا حامی نہیں کہ انگریزی کے عام الفاظ غیر ضروری طور پر اردو میں استعمال کئے جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انگریزی کی ایسی تیکنیکی اور سائنسی اصطلاحات اور ایسے الفاظ اردو لغت میں فوراً" شامل کرلینا چاہئے جن کا متبادل اردو میں موجود نہیں۔ لیکن عام الفاظ کے استعمال سے گریز کرنا چاہئے۔

اردو تنقید غالباً" ہمیشہ ہی تنقید کا شکار رہی ہے اور اب تو برائے نام رہ گئی ہے۔ جہاں تک اردو میں تراجم کا تعلق ہے۔ یہ واقعی افسوسناک صورت حال ہے کہ اردو دوسری زبانوں کے اعلیٰ ادب پاروں سے محروم ہے۔ دنیا کی تمام بڑی زبانیں دوسری زبانوں کے تراجم سے بھری پڑی ہیں۔ اس چلن کو بدلنا چاہئے۔ اس سے بلاشبہ اردو کو فائدہ پہنچے گا۔ اور نہ صرف ہمارا ادب مالامال ہوگا بلکہ اردو کا رشتہ علاقائی زبانوں سے مضبوط ہوگا۔ نیز زبان میں وسعت بھی پیدا ہوگی۔

S.S. ADEEB
65 BLACK BURN ST.
BLACK BURN LANE BBI 7NG U.K.

رائگاں عمر
ہر اُس زندگی کے نام
جس نے پایا رائگاں عمر ہے

شفیقہ فرحت
۲۷ مارچ ۱۹۹۹ء

شفیقہ فرحت

بھوپال

شفیقہ فرحت اردو ادب کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ نثر میں ان کی چھ عدد تصانیف ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ ایک شعری مجموعہ بھی زیر طبع ہے۔ ان کی ادبی کاوشوں پر انہیں آندھرا پردیش اردو اکادمی سے ایک بار اعزاز مل چکا ہے۔ ماہنامہ دوشیزہ کراچی پاکستان کا ایوارڈ بھی لے چکی ہیں اور راجہ جی ایوارڈ بھی، مہاتما گاندھی سمیتی پردیش سمان بھی انہیں دیا گیا ہے اور مریم لنڈبری اسرائیل شاعری برائے امن کا ایوارڈ بھی 1996ء میں اس خاتون ادیبہ نے حاصل کیا ہے۔

شفیقہ بولنے کا ہنر جانتی ہیں۔ داستان گو نہیں مگر ان کی بات سنیں تو لگتا ہے داستان گوئی ہو رہی ہے۔ ہم نے تو بس انہیں چھیڑا ہی تھا کہ آپ کا نام شفیقہ ہے یا فرحت؟ انہوں نے کیا کہا یہ انہی کی زبانی سنتے ہیں۔

"نام تو ہمارا شفیقہ ہے اور نام کی کہانی یہ ہے کہ نام رکھنے کے معاملے میں بھی والدین تن آسان اور غیر ذمہ دار ثابت ہوئے۔ کالی پیلی دبلی پتلی، مقررہ وقت سے پہلے پیدا ہو جانے والی بالشت بھر کی بچی کا چھوٹا سا نام رکھ دیا۔ نویں کلاس تک پہنچتے پہنچتے بڑی بڑی کتابوں میں تین حرفی چار حرفی لمبے

چوڑے بھاری بھرکم نام پڑھ پڑھ کر "ہر چند کہیں کہ ہے مگر نہیں ہے" قسم کا احساس پیدا ہونے لگا۔ لہٰذا غور و فکر اور بھائی بہنوں کے صلاح و مشورے سے شفیقہ کے ساتھ فرحت کو چسپاں کردیا۔ اور ہم بن گئے شفیقہ فرحت۔ اور اب فرحت تخلص بھی ہے اور نام کا اٹوٹ حصہ بھی۔

تاریخ پیدائش وہی ہے جو دنیا کی عظیم اور نوبل پرائز یافتہ خاتون مدر ٹریسا کی ہے یعنی 26 / اگست 1931ء شاید یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی عالمی ہمدردی اور جذبہ خدمت گزاری کا بہت ہلکا سا معمولی سا اثر مجھے اپنی زندگی میں نظر آتا ہے۔ جائے پیدائش شہر ناگپور ہے۔

چار سال کی عمر میں سینٹ جوزف کانونٹ میں داخل کردیا گیا۔ ابھی ٹھیک سے انگریزی میں گٹ پٹ کرنا سیکھا بھی نہ تھا کہ والد صاحب کا تبادلہ تاریخی شہر برہان پور ہوگیا۔ نویں تک تاپتی ندی کے کنارے بنے حکیمیہ اسکول میں پڑھا۔ پھر ناگپور واپسی ہوگئی۔ میٹرک اور بی۔ اے یہیں سے کیا۔ بی اے بعد ایم۔ اے کرنے کے بجائے صحافت کے ڈپلوما کورس میں داخلہ لے لیا۔ دراصل 1953ء میں ناگپور ملک بھر میں پہلی یونیورسٹی تھی جہاں صحافت کا ڈپلوما کورس شروع ہوا تھا۔ اس طرح یہ آپ کی شفیقہ فرحت ملک کی پہلی مسلم خاتون تھیں جنہوں نے یہ ڈپلوما لیا۔

اسی دوران ریڈیو میں ملازمت کی پیشکش کی گئی۔ لیکن خاندانی روایتوں کی بنا پر اجازت نہ ملی۔ کسی انگریزی روزنامے میں کام کرنے کی تجویز کا بھی یہی حشر ہوا۔ اب ڈپلوما لیا تھا۔ کچھ نہ کچھ تو اس کا کرنا ہی تھا۔ سو اپنا ایک رسالہ "کرنیں" برائے خواتین و اطفال نکالا۔ محدود وسائل، ناتجربہ کاری اور ادبی اعتبار سے ناگپور جیسا بنجر شہر۔ رسالہ چلتا تو کیسے۔ سال بھر میں ہی بند کرنا پڑا۔

بعد ماتم و آہ و زاری 1957ء میں ناگپور یونیورسٹی سے فرسٹ پوزیشن اور فرسٹ ڈویژن کے ساتھ اردو میں ایم۔ اے کیا۔ 1961ء میں فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ 1978ء میں پی ایچ ڈی کیا۔ اسی سال شہر بھوپال کے (جو سال بھر پہلے ہی ملک کے سب سے وسیع صوبے مدھیہ پردیش کا دارالخلافہ بنا تھا) مہارانی لکشمی بائی کالج میں اردو کی لیکچرار شپ مل گئی۔ 1986ء میں اسی شہر کے حمیدیہ پوسٹ گریجویٹ کالج میں پروفیسر ہوئی اور یہیں سے 1992ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئی۔ بچپن سے انا خودداری اور خود مختاری کے جذبات حاوی تھے۔ اسی لئے تنہا زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔

جناب مجھے طنز و مزاح سے دلچسپی ہے بلکہ یہی میری پہچان ہے وہ یوں کہ ایک زمانے تک خالص طنز و مزاح کو اردو ہندی کی کسی ادیبہ نے اپنا موضوع نہیں بنایا تھا۔ افسانوں اور ناولوں میں طنزیہ رنگ اوروں کے یہاں بھی رہا ہے۔ لیکن صرف طنز و مزاح کسی کی پہچان نہیں۔ یہ صنف ادب میں نے چیلنج کے طور پر اختیار کی۔ کیونکہ جب میں نے لکھنا شروع کیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ اس صنف سخن میں کوئی عورت کامیاب نہیں ہوسکتی۔ کہانیاں لکھنا اور بات ہے۔ لہٰذا میں نے افسانوں کے بجائے طنزیہ مزاحیہ مضامین لکھے جو ملک کے تقریباً تمام رسائل میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کے تین مجموعے لو آج ہم بھی، رانگ نمبر اور گول مال شائع ہوچکے ہیں۔ چوتھا مجموعہ "چلتے چلاتے" زیر

طبع ہے۔ طنزیہ مضامین کے علاوہ افسانے بھی لکھے ہیں، جن کا مجموعہ اس سال کے آخر تک شائع ہوجائے گا۔ بچوں کے لئے کہانیوں کا مجموعہ "چوں چوں بیگم" شائع ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ دو تصانیف اور ہیں بچوں کے نظیر اکبر آبادی اور نظیر اکبر آبادی کے کام کا انتخاب ہندی رسم الخط میں۔

ویسے آپ کے اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ شاعری سے بھی دلچسپی ہے پچھلے دو برسوں سے گاہے گاہے نثری نظمیں لکھتی ہوں۔ ایک نظم "پتھر گلی کی پچلی سیپ" کو 1997ء میں بین الاقوامی اعزاز مل چکا ہے اس کا انگریزی میں ترجمہ World Poetry Meet منعقدہ ٹوکیو (جاپان) میں پڑھا گیا تھا۔

میری شاعری کسی مکتبہ فکر سے نہیں زندگی سے متاثر ہے اور اس کی تلخ حقیقتوں سے کلام کی اشاعت ابھی کسی رسالے میں نہیں ہوئی۔ براہ راست مجموعہ ہی اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔

مجھے مطالعے کا بے حد شوق ہے چنانچہ اردو اور انگریزی زبان میں شائع ہونے والے تقریباً تمام شہرت یافتہ ناول پڑھے ہیں۔ اردو کی افسانوی تخلیقات چاٹ چکی ہوں۔ اس کے علاوہ سفرنامے اور اہم تاریخی کتب سے بھی دلچسپی رہی۔

شاعری سوائے اردو فارسی کے کسی زبان کی پسند نہیں۔ اردو میں غالب سے بہتر کسی کو پایا نہیں۔ میر تقی میر، اقبال، فیض بھی پسندیدہ شعراء ہیں۔ پڑھا تمام اساتذہ اور جدید اور جدید ترین ادب کو بھی ہے۔ اور اب بھی یہی شغل ہے۔

میری زندگی دلچسپ واقعات سے نہ صرف بھری پڑی ہے بلکہ چھلکی چھلکی پڑتی ہے۔ ہم بظاہر جتنے عقلمند نظر آتے ہیں یا نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اتنے ہی بے وقوف ہیں۔ سو چند حادثات اور چند واقعات نہیں کہ آسانی سے لکھے جائیں۔

میں مانتی ہوں کہ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ لیکن اس کا مستقبل کچھ زیادہ تابناک نہیں، جن کی یہ مادری زبان ہے وہی اسے فراموش کررہے ہیں۔ پاکستان کی یہ سرکاری قومی زبان ہے۔ لیکن بچے اور نوجوان انگریزی میں مہارت پیدا کررہے ہیں۔ ہندوستان میں اسے سرکاری سطح پر سہولتیں حاصل ہیں۔ لیکن عملی طور پر موجودہ نسل اس سے تقریباً نابلد ہے۔ امریکہ اور برطانیہ میں اسے زیادہ فروغ حاصل ہورہا ہے۔ لیکن یہ زبان ہر حالت میں زندہ رہے گی۔

غزل ہمیشہ سے پسندیدہ اور مقبول صنف سخن رہی ہے۔ اس میں جو گہرائی اور گیرائی ہے وہ کسی اور میں نہیں لیکن یہ بڑی ریاضت و علمیت مانگتی ہے۔ فنی باریکیوں کی طلب گار ہے۔ دوسری بات یہ کہ آج کا قاری ان اشاروں کنایوں اور روایتی پس منظر سے بھی پوری طرح واقف نہیں جس سے غزل کے تانے بانے بنے جاتے ہیں۔ لہٰذا عصری مسائل واضح طور پر سامنے نہیں آپاتے جو ایک زندہ ادب کے لئے لازمی ہیں۔ نثری نظم، نثری غزل اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ یہ تجربے اگر زبان و

بیان پر قدرت اور فکر کی جدت کے ساتھ کئے جائیں تو کامیاب ہوتے ہیں۔ شاعری میں شعریت کو بہر صورت برقرار رہنا چاہئے۔

میں سمجھتی ہوں مشاعرے تخلیق میں زیادہ معاونت نہیں کرتے لیکن زبان و ادب کی مقبولیت میں یقیناً" مددگار ہیں۔ مشاعروں کا اپنا ایک نظام اور مقام ہے۔ انہیں برقرار رہنا چاہئے۔ نثری نشستیں بھی ہوتی رہنی چاہئیں تاکہ ادب کا دائرہ محدود نہ ہوجائے۔ ویسے نثر پڑھنے کی چیز ہے۔

سلطانہ مہر! آج کی ایک تلخ حقیقت ہے کہ الیکٹرونک میڈیم کی وجہ سے کتب و رسائل کے مطالعہ میں تشویشناک حد تک کمی ہوگئی ہے۔ اس رجحان کو روکنا مشکل ہے۔ یقیناً" کتابوں کی اہمیت زیادہ ہے کہ ان کا مطالعہ اپنے وقت اور اپنی سہولت کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ ٹی وی کے وقت سے نہیں۔ پرنٹیڈ میڈیا میں پڑھنے والے کا دماغ اس کی فکر اور نظریات بھی ساتھ دیتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں شاپنگ لسٹ میں سے چند غیر ضروری اشیا مثلاً" نئے نئے مہنگے صابن' لوشن' شمپو' عطر وغیرہ کم کرکے ایک آدھ اچھی کتاب کو اس میں شامل کرلینا چاہئے۔

میں تو کہوں گی کہ تنقید ہر دور میں ادب کی ترقی کے لئے ضروری رہی ہے۔ لیکن تنقید میں کسی قسم کی جانب داری مناسب نہیں۔ نہ بے جا لاگ لگاؤ۔ نہ کسی خاص نظریہ کی پاسداری۔ اس سے گمراہ کن ادبی تاریخ سامنے آرہی ہے۔

SHAFIQA FARHAT
24 TAPTI APT. T.T. NAGER
BHOPAL - 462003 INDIA

"ایک حقیقت افروز اور مایوس کن قول نے زندگی بھر آزردہ کیے رکھا۔ یونانی مفکر یا فلسفی نے کہا تھا۔ شاید ارسطو یا افلاطون یا سقراط نے۔ اُس نے کہا تھا 'میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا'"

شکیل عادل زادہ ۔ ۱۹ اپریل ۱۹۹۳ء کراچی

شکیل عادل زادہ

کراچی

آج جب میں شکیل عادل زادہ کا تعارف لکھنے بیٹھی ہوں تو مجھے خود اپنی ذات سے وابستہ ماضی کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔

میں روزنامہ "جنگ" کے صفحہ خواتین کی ایڈیٹر تھی۔ اس سے قبل ڈیڑھ سال تک روزنامہ "انجام" کے صفحہ خواتین "بنت حوا" کی ایڈیٹر تھی۔ میرے پہلے ایڈیٹر محترم طفیل احمد جمالی مرحوم تھے۔ دوسرے ایڈیٹر محترم ابراہیم جلیس مرحوم تھے۔ میں نے مختصر عرصے ہی میں صحافت کے میدان میں یوں قدم جما لیے کہ عورتوں کے صفحے میں کچھ ادبی تفریحی سلسلے شروع کردیے تھے۔ جیسے "قلمی مشاعرہ" جسے قوت متخیلہ کے سہارے بحری جہاز پر منعقد کیا اور محترمہ ہاجرہ مسرور کو کرسی صدارت پر بٹھایا۔ وہ صفحہ خواتین اس قدر مقبول ہوا کہ جب روزنامہ انجام کی صحافیوں کی ہڑتال میں حصہ لینے کی پاداش میں مجھے ملازمت سے برخاست کردیا گیا تو "جنگ" کے مالک و مدیر محترم خلیل الرحمن نے پہلی ملاقات ہی میں اپنے موقر روزنامے میں صفحہ خواتین کی ادارت میرے سپرد کردی۔ یہاں بھی میں نے کچھ اور نئے سلسلے شروع کیے جن میں سے ایک

"آج کا شاعر" کے تحت شعراء و شاعرات کے کچھ انٹرویوز بھی تھے اور پھر کچھ ایسا ہوا' خواتین کے ساتھ ساتھ میں کالج اور یونی ورسٹی کی طالبات کے لیے ایک ماورائی سی شخصیت بن گئی۔ ایک دن کا ذکر ہے' جامع کلاتھ مارکیٹ پر ٹھیلے سے "امرود" خریدتی ہوئی پکڑی گئی۔ ایک خاتون بھی امرود خرید رہی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے کھسکتے ہوئے قریب آئیں اور پوچھا۔
"آپ سلطانہ مہر ہیں؟"

"جی۔" میں نے سچ بولا اور ان کا چہرہ بجھ گیا' کہنے لگیں۔ "لو جی۔ ہم تو آپ کو دیکھنے کو ترستے ہیں اور آپ یہاں...." وہ کسمسا کے بولیں۔ "ٹھیلے پر موجود ہیں۔" کچھ دیر کو تو مجھے ان جانی سی شرمندگی ہوئی کہ کاش میں کسی ٹویوٹا یا مرسڈیز گاڑی میں بیٹھی اپنے ڈرائیور یا ملازم سے "امرود" خریدوا رہی ہوتی..... لیکن ایسا میں نے چونکہ کبھی سوچا نہ تھا لٰہذا وہ ملال زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ ہاں بہ یک وقت خوشی ہوئی اور بہت ہوئی۔ اس مسرت کی سرشاری آج تک قائم ہے اور اس کی خوشبو میں ہر دم بس رہتی ہوں اور جینے کا حوصلہ پاتی ہوں۔ ایک آرزو تھی کہ لوگ مجھے میری تحریروں سے شناخت کریں۔ میری کوئی ادبی حیثیت ہو اور جس طرح مجھے کبھی کرشن چندر اور ساحر لدھیانوی سے مل کر بے پناہ مسرت ہوتی تھی اسی طرح لوگ مجھ سے ملنے کو ایک واقعہ سمجھیں۔

اور ٹھیلے پر کھڑی امرود خریدنے والی سلطانہ مہر کو اس دن وہ شناخت مل چکی تھی۔

پھر میں اور آگے بڑھی۔ وہ زمانہ تھا "سب رنگ" ڈائجسٹ کے دھوم مچانے کا۔ اس کے کئی سلسلے مجھے انتہائی تھکن میں بھی راتوں کو جگا کر پڑھنے پر مجبور کرتے تھے۔ دن میں فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ میں ملازمت کے ساتھ تعلیم بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ افسانے اور ناول لکھ رہی تھی اور نوکر کے اچانک غائب ہو جانے پر گھر میں کھانا بھی پکاتی تھی' بوقت ضرورت برتن بھی مانجھتی اور کپڑے بھی دھوتی تھی اور کالم نویس انعام درانی مرحوم کے سوا کسی کو یقین نہیں آتا تھا "سلطانہ مہر" کپڑے دھونے کی مشقت بھی کر سکتی ہے۔

سب رنگ کا سلسلہ "انکا" مجھے بے حد پسند تھا۔ لکھنے والے کا نام تھا' جمیل احمد خاں.... مگر میں تو اصل خالق کے نام کی تلاش میں تھی اور اس سے مل کر اسے مبارک باد دینا چاہتی تھی کہ اس کی تحریر میں ایک جادو تھا۔ جادو اس لیے تھا کہ وہ "پڑھا لکھا" شخص تھا اور میں ایسی شخصیات کو ہمیشہ خراج تحسین پیش کرنا اپنے فرض منصبی سے بھی کچھ زیادہ سمجھتی تھی۔ "انکا" کے بعد "بازی گر" نے مجھے اور بھی متاثر کیا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا "اصل مصنف" کون ہے۔ میں اس سے مل چکی تھی مگر کبھی تفصیل سے ملنا چاہتی تھی اور اس کی فرصت مجھے اس وقت نہ مل سکی۔

کہتے ہیں کہ... اور میرا سو فیصد یقین ہے کہ ہر کام کے لیے اللہ تعالٰی کی جانب سے ایک

وقت مقرر کیا جا چکا ہے اور وہ کام اسی وقت انجام پاتا ہے.... چنانچہ اب "گفتنی" کے حوالے سے مجھے شکیل عادل زادہ سے ملنے کا موقع ملا۔ سب رنگ کے ذریعے تو میں ان سے ملتی ہی رہتی تھی بلکہ میرا ڈاکٹر بیٹا سہیل سعید اب تک "سب رنگ" کا دیوانہ ہے۔ جب میں لاس اینجلس سے کراچی آتی ہوں، اس کی فرمائش ہوتی ہے۔ "امی! نیا سب رنگ ضرور لائیے گا، بھولیں گی نہیں...." اس ڈاکٹر کو امریکا میں لمحے کی فرصت مشکل سے ملتی ہے (وہ ان دنوں کینسر پر ریسرچ کر رہا ہے) مگر وہ مجھ سے پرانے "سب رنگ" لے گیا ہے۔ میں پرانے سب رنگ "نقوش" کی طرح ساتھ لے گئی تھی۔ سب رنگ کی ادبی کہانیاں میری تنہائی کی ساتھی ہوتی تھیں اور شکیل عادل زادہ کی دل نواز تحریریں۔ اکثر سوچتی تھی۔ سب رنگ سے شکیل کو الگ کر دیا جائے، شکیل سے سب رنگ کو۔ دونوں ہی ادھورے معلوم ہوں گے۔ یہ شکیل عادل زادہ کی ذہانت اور مسحور کن تحریر کا کرشمہ ہے کہ ڈائجسٹوں کے میلے میں "سب رنگ" کا اپنا ایک رنگ ہے۔ سب رنگ نے لوگوں کو جتنا انتظار کرایا اور اپنی جو انفرادی حیثیت قائم کی وہ کوئی اور ڈائجسٹ ماضی میں نہ کر سکا اور نہ مستقبل میں دور دور تک اس کا امکان نظر آتا ہے۔

شکیل عادل زادہ نے یا سب رنگ نے ادیبوں کو ان کی تحریروں کے حوالے سے جو اعتماد بخشا، جو شناخت دی ہے، جو استحکام دیا ہے، وہ کوئی ادبی جریدہ ہی دے سکتا ہے مگر سب رنگ کی یا شکیل عادل زادہ کی ایک انفرادیت اور بھی ہے جو کسی ادبی جریدے کی نہیں کہ "سب رنگ" نے ادیبوں کو مالی آسودگی بھی دی ہے۔

شکیل عادل زادہ سے کبھی کسی نے پوچھا تھا کہ "سب رنگ" کی اس بے پناہ مقبولیت کا سبب کیا ہے؟" شکیل نے کہا "مجھے نہیں معلوم، میں نے کبھی دوسرے ڈائجسٹوں کو پڑھا ہی نہیں۔"

مگر مجھے معلوم ہے.... سب رنگ کے ہر صفحے بلکہ ہر سطر میں شکیل عادل زادہ کی ذہانت کے ساتھ نئی جہت اور نئے آسمانوں کی تلاش کی بھرپور جدوجہد اور سچی لگن شامل ہے۔ آدمی جب اپنے کام کے ساتھ دیانت برتتا ہے تو کامیابی کی منزلیں اس کی تلاش میں نکل پڑتی ہیں۔ اس کے قدموں کی خاک سے بھی لپٹ پڑنے کو بے چین ہو جاتی ہیں۔

شکیل عادل زادہ کی زندگی کا ہر ورق ان کی جدوجہد کی کہانی سناتا ہے۔ شکیل ۱۰ مارچ ۱۹۴۰ء کے دن مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ شکیل کے والد صاحب بھی صحافی تھے۔ مراد آباد میں ان کی برادری والوں نے عام لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک عظیم مسافر خانہ قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ان کے والد صاحب نے وہیں سے ایک رسالہ "مسافر" کے نام سے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک نکالا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے اور افسانے بھی لکھتے تھے۔ اس رسالے کا کچھ ریکارڈ اب بھی شکیل عادل زادہ کے پاس محفوظ ہے۔ رئیس امروہوی مرحوم کو بھی وہ امروہہ سے مراد آباد لے آئے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے کاغذ مہنگا ہو گیا اور رسالے کی

اشاعت جاری نہ رہ سکی۔ شکیل کے والد صاحب کو یہ غم کھا گیا اور وہ دق کا شکار ہو کر چل بسے۔ اس وقت شکیل کی عمر چھ سال تھی' ان کے دل میں یہ خواہش جڑ پکڑ چکی تھی کہ بڑے ہو کر وہ بھی کوئی رسالہ نکالیں گے۔ گو اس وقت انہیں اردو کی بس شدبد ہی تھی۔

ابا کے انتقال کے بعد شکیل کی پرورش ان کے نانا نے کی۔ شکیل انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے جب ان کی کہانی نویسی کی ابتدا ہوئی۔ انہی دنوں انہوں نے ایک طویل ناول بھی لکھا جس کا کچھ حصہ ان کے پاس اب تک محفوظ ہے۔ نانا کی خواہش پر شکیل نے قرآن بھی حفظ کر لیا مگر رجحان کہانی اور افسانے لکھنے کی طرف تھا۔ ان کے ایک عزیز جو کراچی میں رہتے تھے' انہی دنوں مراد آباد آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کراچی کی بہت تعریفیں کی تھیں۔ چنانچہ شکیل نے رخت سفر باندھا اور فروری ۱۹۵۷ء کو چند کپڑوں اور چالیس روپے کی پونجی سمیت یہ پنجاب میل سے لاہور اور کراچی ایکس پریس سے کراچی پہنچے اور یہیں سے ان کی زندگی کی کڑی آزمائشوں کا دور شروع ہوا۔ شکیل نے جز وقتی ملازمت' ایک طرح کی مزدوری بھی کی اور تعلیم کا حصول بھی جاری رکھا۔ اردو کالج سے شام کی کلاسوں میں داخلہ لے کر ۱۹۶۲ء میں بی کام اور ۶۵ء میں سوشیالوجی میں اور ۶۷ء میں پولٹیکل سائنس میں ایم۔ اے کیا۔ انہوں نے رئیس امروہوی صاحب کے اخبار "شیراز" اور انشا میں بھی کام کیا جو بعد میں "عالمی ڈائجسٹ" بن گیا۔ شکیل نے اپنی محنت اور عمر کا بہترین حصہ اس پرچے کی نذر کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں انہیں احساس ہوا کہ وہ خود تنہا بھی اپنا ایک رسالہ شائع کر سکتے ہیں۔ جہاں ان کی حیثیت ثانوی نہ ہوگی۔ یوں "سب رنگ" وجود میں آیا اور ڈائجسٹوں کی دنیا میں اس نے ریکارڈ توڑ "ہنگامہ" کیا۔ آج اسی شکیل عادل زادہ یا "سب رنگ" سے ہماری تفصیلی گفتگو ٹھہری۔ شکیل سے ان کی ذاتی زندگی کی گفتگو کے بعد میں نے دوسرا سوال کیا۔ انہوں نے کہا۔ "اگر اردو زندہ رہی تو اردو کے کچھ ادیب یقیناً زندہ رہیں گے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ادب بار بار چھلنی ہوتا ہے اور وہی زندہ رہتا ہے جس کا کام چھلنی ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ کون ادیب۔ البتہ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جنہوں نے آنے والی نسلوں کے لیے کچھ آفاقی قسم کی اور سنگ میل قسم کی تحریریں تخلیق کی ہیں' وہی صاحبان۔ نثر اور شاعری کا معاملہ اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے' اتنے تجربے ہو رہے ہیں کہ جو عبارتیں' خیالات اور افکار اس وقت ہم بہت مقبول سمجھتے ہیں اور ہمیں معیاری معلوم ہوتے ہیں' کیا پتہ' کل وہ باقی رہیں گے یا رد کر دیے جائیں گے۔ میرا خیال ہے وہ افسانہ باقی رہے گا جو عالمی معیار کے افسانے کا مقابلہ کر سکے گا اور جس میں وقت کے گرد و غبار سے بچنے کی قوت ہوگی۔ شاید منٹو باقی رہ جائے۔ کرشن چندر کی بیس کہانیاں باقی رہ جائیں یعنی جزوی طور پر کچھ منفرد قسم کی تخلیقات باقی رہ جائیں۔ کلی طور پر تو شاید کوئی ادیب باقی نہیں رہے گا' کیونکہ کلی طور پر کسی کا دعویٰ بھی نہیں

ہو تا کہ اس کی ساری چیزیں معیاری ہیں۔ شاعری کا بھی یہی پیمانہ ہے۔"
سوال نمبر ۳ سن کر انہوں نے کہا "بات یہ ہے کہ کہانی جب فکشن سے دور ہو جائے گی تو وہ کوئی اور چیز بن جائے گی، اظہاریہ، تاثریہ، انشائیہ یعنی آپ اسے کوئی بھی نام دے لیں لیکن وہ کہانی نہیں رہے گی۔ قلم کاروں نے اسلوب اور ہیئت کے تجربے بہت کیے ہیں، رفتہ رفتہ وہ اپنے تجربوں یا اجتہاد میں اتنے شدید ہو گئے کہ کہانی سے دور ہو گئے اور یوں کہیے، فکشن کے نام پر کچھ اور نمونے وجود میں آ گئے۔ بہتر ہو گا، ہم اس نوع کی تحریروں کے لیے فکشن کا کوئی علیحدہ خانہ طے کر لیں۔ کچھ ادیب جو جدیدیت کی دوڑ میں جانے کہاں سے کہاں جا چکے ہیں، ان کی تخلیقات کا اوسط درجے کے قاری سے کوئی واسطہ نہیں رہا ہے۔ میں فکشن کا آدمی ہوں، فکشن کی بات کرتا ہوں، میری گزارش ہے کہ صرف کہانی باقی رہے گی۔ فکشن کے نام پر اسلوب اور ہیئت اور تجرید کے تجربے کسی اور کھاتے میں ڈال دیے جائیں گے۔ میں اسلوب کے تجربے کرنے کے بہت حق میں ہوں۔ ہم نے یہ کام خوب کیا ہے، مثلاً داستان سے ہم جدید افسانے تک آئے ہیں۔ جدید افسانے سے مراد تجریدی افسانہ نہیں ہے۔ اب آپ کو پریم چند کی تحریر بھی کسی قدر بوسیدہ لگتی ہے یعنی وہ Phrases جو پریم چند استعمال کرتے تھے، ہم اب اپنی عام زندگی میں یہ استعمال نہیں کرتے۔ پریم چند کے مقابلے میں منٹو کی تحریریں ابھی تک ترو تازہ ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو نثر جس تیزی سے ترقی کر رہی ہے اور بلاشبہ شاعری سے زیادہ کر رہی ہے، میرا خیال ہے کہ ہمارے بیش تر افسانہ نگار خارج از ادب ہو جائیں گے، صرف ایک یاد بن جائیں گے۔ اب عبدالحلیم شرر کا کوئی نام نہیں لیتا اور بہت سے ایسے نام ہیں کہ اپنے زمانے میں جن کا طوطی بولتا تھا، جو سکہ رائج الوقت تھے، آہ کہ اب ہم انہیں پڑھنا نہیں چاہتے۔ اب لہجے بدل گئے، معیار بدل گئے ہیں۔ اب پیمانے مختلف ہو گئے ہیں۔ آئندہ ہمارے تیزی سے بدلتے رویے کیا شکل اختیار کر جائیں گے، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمیں آج کے کتنے زندہ اور توانا ادیبوں کی فنی و تخلیقی موت کا سانحہ برداشت کرنا ہو گا۔ مقصود یہ ہے کہ کہانی بہر حال موجود رہے گی۔ اگر کہانی آنے والے دور کے بدلے ہوئے لہجے سے کوئی مناسبت اور مطابقت رکھتی ہو۔

"اس حوالے سے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے سب رنگ ڈائجسٹ نکالا ہے اور ادب کو ایک نیا روپ دیا ہے۔ عام طور پر ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والی تحریروں کو ادب نہیں سمجھا جاتا لیکن آپ نے ڈائجسٹ میں اچھے ادب اور ادیبوں کی تخلیقات چھاپ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اب ڈائجسٹ کا ادب بھی ادب میں شمار ہوتا ہے، آپ کی کیا رائے ہے۔"

"ہمارے ہاں ادب کیا ہے، کیا نہیں کا مسئلہ خاصا پرانا اور دل چسپ ہے۔ ہم نے اپنے الگ معیار قائم کیے ہیں۔ ادب پرکھنے اور جانچنے کے بین الاقوامی پیمانے سے یہ معیار بہت

مختلف ہیں۔ مغرب میں موضوعات کی بنیاد پر نہیں، تخلیق کی فنی خوبی کی بنیاد پر کسی تحریر کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو بعض موضوعات ادب کے زمرے ہی میں نہیں آتے۔ جاسوسی ادب کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ جرم و سزا کے معاملات کی قلم بندی ادب سے خارج سمجھی جاتی ہے۔ ادھر مغرب میں کانن ڈائل کو بڑی عزت حاصل ہے، نصاب میں اس کی تخلیقات شامل ہیں۔ سب سے پہلے جاسوسی کہانیاں لکھنے والے ایڈگرایلن پو کو تو مغربی ادب میں LEGEND کی حیثیت حاصل ہے، جرم و سزا، پر اسرار واقعات کا تعلق بھی زندگی سے ہے، یہ زندگی سے باہر کے مسائل نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں ان موضوعات کو افسانہ بنانے والے ادیبوں کی صفوں میں جگہ نہیں پاتے۔ یہ ایک طرح کا تعصب ہے۔ معلوم نہیں، اس عداوت کا سبب کیا ہے؟ ایک جاسوسی کہانی بھی زندگی میں بالعموم پیش آنے والے واقعات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اگر اس تحریر میں قاری کا جی لگ رہا ہے، اس کے سامنے زندگی کے وہ گوشے سامنے آرہے ہیں، جو اس کی نظروں سے اوجھل رہے۔ اس تحریر کو چاہے وہ کتنی دل پزیر ہو، ہمارے یہاں کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ مغرب میں جاسوسی، جرم و سزا، ماورائی واقعات، رومانس، ایڈونچر، عام زندگی کے مسائل و مصائب، مستقبل کے سائنسی قیاسیات، صدفی صد تصورات پر مبنی موضوعات کے لیے انھوں نے خانے بنا رکھے ہیں اور کہانیوں کے بیان کی خوبی پر انھیں ادب میں شامل کیا جاتا یا باہر رکھا جاتا ہے، موضوع کی بنیاد پر نہیں۔ اصل میں موضوع اتنا اہم نہیں ہے، جتنا کہانی کا قالب، ڈھانچا، بنت یا بیان کی ہنرمندی، مشاقی اور نیا پن اور تاثر۔ کم زور موضوع توانا بیان سے شاہ کار بن سکتا ہے، کہانی برتنے کے ڈھنگ سے ادب اور ناادب کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ایک اور بات، ہر کہانی کا ڈھانچا کسی تصویر، آئینے، کچے چٹھے، غیبت وغیرہ پر استوار ہوتا ہے۔ اپنے ہاں کیا ہے۔ ہماری بیش تر کہانیاں اپنی سکہ بند سماجی روایات سے صاف انحراف کرتی نظر آتی ہیں۔ ہر کہانی میں ہماری عام زندگی کے ہونے ان ہونے واقعات بیان ہوتے ہیں، ان کا ذکر لوگ کانا پھوسیوں اور سرگوشیوں میں کتنا ہی کریں، کھلے عام ان تذکروں سے اجتناب کرتے ہیں، کہانی میں یہ طشت ازبام ہوجاتے ہیں۔ عشقیہ کہانیاں ہمیں بہت مرغوب ہیں۔ کسی پری وش کے حسن بے مثال کا بیان، ہجروصال میں اضطراب کا احوال، بے وفائیاں، کج ادائیاں، بے مہریاں، خلوتوں میں تانکا جھانکی ہماری کہانیوں میں معمول کے بیانات ہوتے ہیں۔ یہ بیانات ہمیں عشق پر اکساتے ہیں، یہ عبارتیں ہماری راتیں بے خواب کرتی ہیں۔ غور کیا جائے تو ادب کی یہ روش کیا ہمارے روایتی معاشرے سے صریحا انحراف نہیں ہے؟ کیوں صاحب، یہ سچائی، بے باکی اور جرات کیوں جرم نہیں؟ اور جرم کا لفظ اگر شدید ہے تو ناروائی کہیئے، نازیبائی کہئے۔ قبلہ شوکت صدیقی صاحب چوری، قتل، دغابازی، جاگیرداروں کی انسانیت سوز حرکات و واقعات پر قلم اٹھاتے ہیں تو ہم اسے اعلا ادب میں شمار کرتے ہیں لیکن

زندگی سے گہرا تعلق رکھنے والی جنس و جرم، سراغ رسی اور ماورائی موضوعات وغیرہ کی کہانیوں کو سفلہ ادب کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں کچھ عجیب سا تضاد ہے۔ کہانی کا موضوع مسئلہ نہیں ہونا چاہئے۔ اصل کسوٹی اس کا پیرایہ بیان، اس کے اثر کی شدت، خالق کی دل سوزی اور شمولیت ہے۔ جرم و سزا پر مشتمل کسی بے حد شدید کہانی سے جرم کی ہول ناکی بھی عیاں ہوتی ہے اس سے جرم سے دور رکھنے کی ترغیب بھی مل سکتی ہے۔ اس سے لوگ جرم سے محتاط بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ بات پرانی اور بڑی پیچیدہ ہے اور تفصیل طلب ہے آپ دوسرا سوال کیجئے، سلطانہ مہر صاحبہ!"

شکیل عادل زادہ سے چونکہ براہ راست گفتگو ہو رہی تھی اس لیے موقع مناسب جان کر میں نے پوچھا، "میں ابھی حال میں ہندوستان سے ہو کر آ رہی ہوں۔ وہاں یہ بات زیر بحث آئی کہ عصمت چغتائی کی کہانی لحاف نصاب میں شامل ہونی چاہئے یا نہیں۔ وہاں یہ ایک متنازعہ بحث بن گئی ہے۔ ہندوستان میں تو خیر یہ شاید ممکن بھی ہو لیکن پاکستان میں نصاب میں اس کی شمولیت مشکل بات ہوگی۔ آپ کی کیا رائے ہے۔"

"میری رائے میں لحاف کو نصاب میں شامل نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے حال میں "لحاف" دوبارہ پڑھی تو ایک طرح کی لذت سی محسوس ہوئی۔ بچوں کے لیے جو ابھی طالب علم ہیں، میرے خیال میں، انہیں ناپختہ عمر میں اسے نہیں پڑھوانا چاہیے، وہ جب اس دور سے نکل جائیں اور قدم سنبھالتے سفید و سیاہ کی اچھی طرح تمیز کرنے اور دوسرے لفظوں میں اعلیٰ ادب کے اور حقیقت پسندانہ ادب کے دائرے میں داخل ہونے لگیں تو اس وقت بے شک وہ لحاف پڑھ لیں۔"

میں نے پوچھا "آپ اس دور کا تعین کیسے کریں گے یعنی کالج کا طالب علم یا یونی ورسٹی کا طالب علم اسے پڑھ سکتا ہے؟"

"سچ تو یہ ہے کہ آدمی میچور زندگی کے تجربات اور کثرت مطالعہ سے ہوتا ہے۔ یونی ورسٹی کے بہت سے پختہ عمر طالب علم بڑے ناپختہ ہوتے ہیں اور بعض کم عمر بڑے پختہ۔ میرے خیال میں یونی ورسٹی کی سطح پر ایسی تحریریں گزارنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ یوں مطالعے کا شوق ہو تو ساری زندگی جاری رہتا ہے اور زندگی بھر آدمی سیکھتا رہتا ہے اور میچوریشن کا عمل ساری زندگی جاری رہتا ہے"

"کیا آپ سب رنگ میں ایسی تحریریں چھاپنے سے گریز کرتے ہیں؟" میں نے ان سے ایک اور سوال کیا۔

"ہاں بالکل! شاید ابتدا میں ہم سے کچھ کوتاہیاں ہوئیں یعنی شروع کے ایک دو سال میں ہم نے اس سلسلے میں اتنی توجہ نہیں دی تھی۔ بعد میں تو ہم نے اس بات کا بہت خیال کیا۔ گو ہمارا

پرچا کوئی مذہبی یا دینی پرچا نہیں۔ کوشش ہے کہ اس میں ایسی کہانیاں شائع کی جائیں جنہیں آپ اعتماد سے اپنے گھر میں اپنے چھوٹوں کو دے سکیں اور وہ اس سے زبان سیکھیں' بیان سیکھیں۔ اس سے اچھے تیور سیکھیں۔ اچھی طرز زندگی کی طرف ان کا رجحان ہو۔ دیکھئے! جنس کے پرچے بھی نہیں چلتے۔ یہاں ایک پرچا نکلتا تھا۔ مکمل جنسی موضوعات پر۔ اس کی اشاعت سب سے زیادہ ہونی چاہئے تھی جو ظاہر ہے نہیں۔ پلے بوائے کی اشاعت ریڈرز ڈائجسٹ کی اشاعت سے کم ہے۔ ننگی فلمی یا بلیو فلمیں بہت کم دیکھی جاتی ہیں۔ میں کہتا ہوں جب آپ رومانس' جنس اور خوب صورتی کو نہایت اچھے اسلوب میں پیش کرسکتے ہیں تو اسے خراب نہ کریں۔ اسے اتنا بے رحم نہ کریں اور ایسے وحشیانہ انداز میں پیش نہ کریں کہ احساس جمال مجروح ہو۔ بہت سلیقے سے ناگفتنیاں گفتنی کی جاسکتی ہیں۔ غالب و میر کیوں زندہ ہیں' یہ اپنے "چرکین صاحب قبلہ" کیوں نہیں۔"

"ہمارے اردو ادیب معاشی طور پر کیوں آسودہ نہیں۔" اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے شکیل عادل زادہ کہنے لگے۔

"یہ سوسائٹی جب تک معاشی طور پر آسودہ نہیں ہوگی ادیب بھی بدحال رہے گا۔ اس سوسائٹی میں جب تک خواندگی کی یہی اوسط رہے گی' جواب ہے' تو آپ کا ادیب کبھی خوش حال نہیں ہوگا۔ یورپ میں جب آپ کوئی تحریر لکھتے ہیں تو آپ اتنے ذلیل و خوار نہیں ہوتے جتنے اپنے ہاں۔ حیرت ہے' سب سے زیادہ چھپنے والے جنگ اخبار میں آپ کی تحریر کا معاوضہ نہیں ملتا۔ کیوں نہیں ملتا کہ جنگ کے ہاں دس ہزار لکھنے والے قطار میں موجود ہیں۔ وہ معاوضہ نہیں دیتے لیکن اگر خواندگی زیادہ ہوتی اور اخبارات زیادہ چھپتے' زیادہ رسالے' زیادہ کتابیں چھپتیں تو ادیبوں کی پوچھ بھی ہوتی۔ جیسے اب ٹیلے ویژن پر ہونے لگی ہے۔ اب مختلف چینل آرہے ہیں اور اب دس ہزار روپے فی قسط سے لے کر چالیس ہزار روپے فی قسط تک معاوضہ پہنچ چکا ہے۔ گویا کوئی صاحب چار قسطیں ایک مہینے میں ٹی وی کے لیے لکھتے ہیں تو پچیس ہزار سے ایک لاکھ روپے مہینے تک کی آمدنی ہوسکتی ہے۔ چونکہ ٹیلی ویژن کے دیکھنے والے بہت ہیں' اخبار پڑھنے والے کم ہیں' کتابیں پڑھنے والے اور بھی کم ہیں۔ جب تک پاکستان میں خواندگی کی اوسط نہیں بڑھے گی' اس وقت تک ہمارا ادیب ناآسودہ ہی رہے گا۔ یہ ایک سیدھی سی بات ہے۔ ادیب کے گھر میں فاقہ ہوگا تو وہ کیسے کوئی توانا تحریر تخلیق کرسکے گا۔ لازمی حوالے والی کتابیں خریدنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں ہوں گے تو وہ اعتماد سے قلم کس طرح اٹھا سکے گا۔ اس کے پاس آمد و رفت کے ذرائع نہیں ہوں گے' اس کے بچے اسکول میں پڑھنے نہیں جاسکیں گے تو وہ کیا یک سوئی سے لکھ پائے گا۔ آسودگی اچھے ادب کے لیے شرط ہے۔ یہ کہنا کہ ناآسودگی میں بہتر تحریریں لکھی جاتی ہیں' یہ فرمودہ مجھے کبھی قائل نہیں کرتا۔ ورنہ یورپ میں وہ تحریریں نہیں

لکھی جاتیں جو ابھی اردو میں لکھنی شروع بھی نہیں ہوئی ہیں۔

"پاکستان میں اردو ادب اور علاقائی زبانوں پر کیا کام ہو رہا ہے؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا "پاکستان میں کسی سطح پر کوئی بڑا کام نہیں ہو رہا ہے یہ جو اکیڈمیاں قائم ہیں' یہ تو بہت معمولی کام کرتی ہیں۔ پاکستان میں کوئی بڑا کام شاید ہو ہی نہیں ہو سکتا۔ بات وہی ہے' جب تک خواندگی نہیں بڑھے گی۔ یہ ساری باتیں خواندگی سے لازم و ملزوم ہیں اور خواندگی کے لیے معاشی آسودگی ضروری ہے۔ معاشی آسودگی کے لیے پہلے سیاسی حالات بہتر ہونے چاہئیں۔ ملک کو کسی نہایت سچے انقلاب کی ضرورت ہے' ایک تعلیمی' سماجی اور معاشی انقلاب کی۔ یہ ساری تعبیریں ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ سیاسی استحکام ہو گا' اچھی پلاننگ ہو گی تو تعلیم بھی عام ہو گی' مگر پچھلے پچاس' باون برسوں میں کیا ہوا۔ آئینہ یہ ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ مایوس لوگوں کا وطن ہے۔ بے چارگاں پس ماندگاں کا۔ حالات بہتر تبھی ہو سکتے ہیں جب سیاسی اور معاشی استحکام ہو اور علم حاصل کیا جائے' ہر سطح پر علم کا حصول۔ علم کے بغیر اس نئی دنیا میں ہماری کوئی حیثیت نہیں۔ بے علم آدمی کسی معذور کے مانند ہوتا ہے۔ بے علم قوم غلام رہتی ہے۔ علم بینائی ہے' اور کچھ ایسا ہے' ہمارے لوگوں کے پاس آنکھیں تو ہیں' بینائی نہیں۔

MR. SHAKIL ADILZADA
EDITOR "SUBRANG"
47-48 PRESS CHAMBER
OFF. I.I. CHUNDRIGAR ROAD,
KARACHI (PAKISTAN)

پسندیدہ فقرہ یا شعر یا کچھ اور لکھیے ۔ مجھے جوگندر پال کا یہ مختصر ترین
افسانہ بے حد پسند ہے ۔ اسے لکھ لو ـــــ

آج بھی میرے ساتھ وہی ہوا، جس کا ڈر تھا

آج بھی کچھ نہیں ہوا

(جوگندر پال)

شکیلہ رفیق
۹.۲.۲۰۰۰

شکیلہ رفیق

ٹورانٹو

افسانہ لکھنے کے لئے موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ زندگی میں گردوپیش میں اتنے موضوعات بھرے پڑے ہیں کہ ان کو سمیٹا نہیں جاسکتا۔

چیخوف نے کہا تھا اور درست کہا تھا کہ وہ کسی چیز پر بھی افسانہ لکھ سکتا ہے۔ تکنیک ہر افسانہ نگار کی جدا ہوتی ہے اور جس کو اس پر قدرت حاصل ہو' وہ اپنے موضوع کے اندر ایک ذہنی ربط پیدا کرکے قاری کو اپنے ساتھ لئے چلتا ہے۔

شکیلہ رفیق یہ گر جانتی ہیں اور شکیلہ یہ بھی جانتی ہیں کہ ابلاغ کے بنا ایک کہانی کامیاب کہانی نہیں کہلائی جاسکتی۔ بہت عرصہ پہلے جب شکیلہ کے افسانوں کا مجموعہ "خوشبو کے جزیرے" شائع ہوا تو اس کے فلیپ پر پاکستان کے نامور افسانہ نگار سید انور مرحوم نے شکیلہ کی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "وہ ابلاغ کی قائل ہے۔ یہ کیسی لڑکی ہے۔ اس دور کی لڑکیاں تو فیشن پرست ہیں۔ یہ لڑکی علامت نگاری کے فیشن سے متاثر کیوں نہیں ہوئی؟ علامت نگاری کتنی آسان ہے۔ علامتی کہانی وہ ہوتی ہے جس کا ابلاغ نہ ہو جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے' جو بے معنی ہو' جس کا

سر پیر نہ ہو تو ایسی کہانی لکھنا کیا مشکل ہے۔ شکیلہ رفیق کو دیکھو کہ اس نے اپنے لئے اتنا دشوار گزار راستہ منتخب کیا ہے۔"

شکیلہ کے فن پر اظہار خیال کرنے والوں میں کئی نام ہیں۔ ان میں رام لعل، جوگندر پال، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، انور سدید، انور عنایت اللہ مرحوم، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سحر انصاری، احمد ہمدانی، مرزا ادیب مرحوم، انیس صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام شامل ہیں۔

مرحومہ عصمت چغتائی نے ان کی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "شکیلہ رفیق کہانی لکھتی نہیں بلکہ سامنے بیٹھے قاری سے باتیں کرتی ہیں۔" شکیلہ خود کہتی ہیں کہ "میں نے ابلاغ کو کہانی کا شرط اولیں اس وقت قرار دیا تھا جب مجھ جیسی نووارد لکھنے والی چہار جانب سے تجریدیت و علامت کے بادلوں میں گھری ہوئی تھی اور میرے اس خیال کی تائید تمام معتبر لکھنے والوں نے کی۔"

شکیلہ پیدا تو سیتاپور (یوپی ہندوستان) میں ہوئیں مگر ہجرت کے بعد کراچی آئیں اور اسکول سے لے کر جامعہ تک ساری تعلیم کراچی میں حاصل کی۔ شادی ہوئی تو شکیلہ رفیق بنیں۔ اردو ادب میں ایم۔ اے بھی شادی کے بعد کیا۔ پی آئی اے (پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز) کے شعبہ تعلقات عامہ میں بطور افسر خدمات انجام دیں لیکن 1992ء میں اپنی ذاتی مجبوری اور دفتری سیاست کے باعث استعفیٰ دے دیا۔ بچے جب اپنی تعلیمی ضروریات کے تحت کینیڈا آئے تو شکیلہ بھی ان کی وجہ سے چلی آئیں۔

اگست 1999ء میں میری شکیلہ سے (برسوں بعد) ملاقات کینیڈا میں ہوئی۔ شکیلہ سوالنامہ کا تعویذ بنائے بیٹھی تھیں۔ میرے پوچھنے پر مصروفیات کی فہرست گنوادی۔ میں نے بھی اپنا حق دوستی استعمال کرتے ہوئے الٹی میٹم دے دیا تو بی بی راہ راست پر آئیں اور گفتنی کا سوالنامہ نکال کر بیٹھ گئیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ان کے والد محترم عبدالرحیم خان سیتاپور شہر کے نامی گرامی وکیل تھے۔ لکھنؤ میں بھی کافی عرصہ رہائش رہی۔ سات بہن بھائیوں میں شکیلہ آخری اولاد سے پہلے نمبر پہ تھیں۔ والد صاحب اعلیٰ ادبی ذوق کے حامل تھے اور باموقع اشعار پڑھا کرتے تھے جس سے ادب کی جانب بچپن سے ہی شکیلہ کی طبیعت مائل ہوگئی اور کم عمری میں انہوں نے بچوں کی کچھ کہانیاں بھی لکھیں۔ افسانہ نگاری کی ابتداء 1972ء سے ہوئی۔

شکیلہ کہتی ہیں "بیسویں صدی میں لکھنے والے یا زندہ رہ جانے والے ادیبوں کے ناموں میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، جوگندر پال، منٹو، رام لعل، غلام عباس وغیرہ شامل ہیں۔ تنقید و تحقیق میں مشفق خواجہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے علاوہ بھی کئی نام ہیں۔ شکیلہ نے کہا "جدیدیت کو اگر ان معنی میں لیا جائے جو مستعمل ہے یعنی شہ پارے کو اس کے رنگ سے مختلف رنگ میں یا بگاڑ کر پیش کرنا۔ ان معنوں میں تو کسی بھی شہ پارے کا حسن مجروح ہونا یقینی ہے لیکن میں جدیدیت کو جن

معنی میں لیتی ہوں وہ ہے شہ پارے کو نیا اور مختلف رنگ کا تجربہ دینا ہے۔ میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ تجربات سے ادب میں نئی راہیں کھلتی ہیں لیکن تجربے کا مطلب وہ تجریدیت ہرگز نہیں جو انسان کی سمجھ سے بالاتر ہو۔

تخلیق نگار کی اپنی سوچ کے مطابق تخلیق خواہ کتنی ہی خوبصورت' انوکھی اور روایتی ہو' لیکن اگر وہ پڑھنے والے تک اسے پہچاننے میں ناکام ہے تو پھر وہ خود بھی ایک ناکام تخلیق نگار ہے۔ دوسرے الفاظ میں بات دوسروں تک پہنچ جانی چاہئے۔

اگلے سوال کے جواب میں شکیلہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ پھر ہنس کر بولیں۔ "خاتون محترم ناول لکھنا جان جوکھوں کا کام ہے اس کے لئے نہ صرف وافر وقت درکار ہے بلکہ وسیع مطالعہ بھی اور انتھک محنت' لگن اور سعی مسلسل اس کے علاوہ ہے۔ فی زمانہ ہر ایک کے پاس وقت کی کمی ہے۔ بہت سے مطالعے کی وسعت سے ہراساں ہیں۔ کچھ محنت و لگن سے بھاگتے ہیں' کوئی سعی مسلسل کی بجائے شارٹ کٹ کا قائل ہے جبکہ ناول لکھنے کے لئے خون تھوکنا اور کرداروں کے ساتھ رہنا' بسنا اور سونا جاگنا بے حد اہم ہے۔ اگر کرداروں اور واقعات کو تنہا چھوڑ کر الگ ہو گئے تو اصل اور صحیح ناول کی تکمیل ناممکن ہے۔

ادیبوں کے مسائل پر گفتگو ہوئی تو شکیلہ نے کہا "ہماری زندگی دو زندگیوں سے مل کر بنی ہے۔ ایک وقت کے حساب سے اور دوسری کچھ خاص قدروں کے حساب سے۔ کچھ لوگ قد آوروں کی رکابیاں تھامے' ان میں جو کچھ بچا کھچا ہے وہ بھی کھائے جا رہے ہیں اور کچھ وقت کی لگامیں تھامے بغیر بگ ٹٹ بھاگے جا رہے ہیں۔ دونوں ہی غلط ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ نقطہ نظر میں بھی تبدیلی ہوتی ہے۔ جہاں تک راہنمائی کا سوال ہے کسی کی بھی راہ نمائی صرف اس وقت کارگر ہوتی ہے جب ہم راہ نما کو مکمل طور پر تسلیم کر رہے ہوں مگر ایسا ہوتا نہیں ہے۔

مادی' ذہنی' نفسیاتی اور روحانی ان تمام بحرانوں کا ایک ہی علاج ہے --- قناعت اور دوسرا اتفاق۔ سب سے بہتر حل یہی ہے کہ انسان کسی بھی نظام فکر کو اپنائے تو انتہا سے گریز کرے' اپنا تجزیہ کرے' اپنے راستے اور منزل کا تعین خود کرے مجھے یقین ہے اس کے بعد نظام فکر کی تربیت اس کا ذہن خود تلاش کر لے گا۔

اور جناب معیاری ادب کے پیمانے کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں کہوں گی کہ ادب کے لئے پیمانے کا لفظ کچھ عجب سا لگا۔ بہرحال شاعری ہو یا نثر دونوں کے لئے ضروری امر یہ ہے کہ وہ نہ صرف دل پہ اثر کرے بلکہ اس میں روشنیوں کے دیئے بھی جلانے اور معیار برقرار رکھنے کے لئے اپنی تحریر میں یا شعر میں فکر کا پہلو بھی ضرور رکھے' پڑھنے والے کے علم و معلومات میں اضافہ کرے اور ان کے اذہان میں سوچ کے نئے زاویے اجاگر ہوں۔

نثر کم لکھی جانے کی وجہ بتاتے ہوئے شکیلہ نے کہا "شعر کہنے کی نسبت نثر لکھنا زیادہ دشواریوں

ہے کہ اس کی سب سے پہلی ضرورت وقت ہے۔ رہی موضوعات کی بات' تو وہ تو یہاں جا بہ جا بکھرے پڑے ہیں۔ باہر کے ممالک میں رہنے بسنے والوں کے پاس وقت کی کمی ہے۔ شعر کی آمد اگر بس میں یا subway میں ہو جائے تو کاغذ کے ایک پرزے یا بقول ابن انشاء آستین کے ایک کف پہ بھی لکھا جاسکتا ہے مگر نثر کی ہانڈی خواہ پوری ہی کیوں نہ ذہن میں پک جائے اسے کاغذ پہ منتقل کرنے کے لئے بہر حال وقت درکار ہے۔ اور جم کر بیٹھنا از حد ضروری۔ رہی بات جرات کی تو اگر مصنف جرات مندی سے عاری ہے تب پھر وہ تخلیق کار نہیں۔ جس کے پاس جرات ہے' موضوعات ہیں اسے لکھنے میں بھلا کیا عار ہو سکتا ہے؟ آپ کی یہ بات کہ شاعری زیادہ ہو رہی ہے تو اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ دل میں اتر جانے والی یا فکر و عمل کی شاعری ہے۔ ہر تیسرا شخص شاعر ہے اور بزعم خود شاعری کی سب سے اونچی منزل پہ چڑھا دوسروں کو بونا سمجھ رہا ہے۔ نہیں جانتا کہ نیچے اتر آنے پہ وہ ان سے بھی چھوٹا ہو جائے گا۔

شکیلہ اردو میں انگریزی کی آمیزش کو پسند نہیں کرتیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک زبان جس طرح وجود میں آگئی وہی اس کی پہچان ہے۔ دنیا میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہم کیوں اپنی زبان میں اور زبانوں کے الفاظ شامل کر کے اس کی انفرادیت کو مجروح کریں۔ اس کی ضرورت یوں بھی نہیں کہ اردو کی تشکیل تو پہلے ہی کئی زبانوں سے مل کر ہوئی ہے۔ یہ ایک مکمل اور مستند زبان ہے۔ اس کی ترقی کبھی نہیں رکے گی۔ روزمرہ کی بول چال میں تو انگریزی کے الفاظ از خود یا دانستہ در ہی آئے ہیں لیکن انہیں تحریر میں شامل کر دینے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کو اصل اردو سے نہیں بلکہ تبدیل شدہ زبان سے متعارف کرائیں گے۔ کسی زبان کی انفرادیت ہی اس کی پہچان ہے اور تبدیلی سے اس کی انفرادیت کو نقصان پہنچے گا۔

میں نے کہا شکیلہ اپنی زندگی سے کوئی اہم اور دلچسپ واقعہ سناؤ' بولیں۔ "زندگی میں اہم اور دلچسپ واقعات کی کمی نہیں لیکن اس وقت میں ایک چھوٹا واقعہ سنانے پہ اکتفا کروں گی جو بہت دلچسپ ہے۔ 1980ء کی دہائی کی بات ہے کہ قبیلے کے تمام لوگ اہل قلم کانفرنس میں جانے کے لئے جہاز میں سوار تھے۔ میرے برابر محترم و ممتاز ادیب ابوالفضل صدیقی تشریف فرما تھے ان سے ملاقاتیں تو جالبی صاحب کے یہاں کئی بار ہوئی تھیں مگر تکلف اور ادب کا پردہ درمیان میں حائل تھا۔ لیکن مجھے اس وقت بہت اچھا لگا جب انہوں نے مجھے صدیقی صاحب کہنے پہ ٹوکا اور کہا تم تو میری بیٹی کے برابر ہو۔ ان کی اس بات نے میرا حوصلہ بڑھایا اور بے تکلف گفتگو شروع ہو گئی۔

مجھے جہاز کے ٹیک آف اور لینڈنگ دونوں وقت متلی محسوس ہوتی ہے' لہٰذا میں نے ایئر ہوسٹس کو بلا کر حسب معمول لیموں کا عرق ملا سیون اپ کا ایک گلاس لانے کو کہا۔ انہوں نے فوراً" اپنے لئے بھی ایک ایسا ہی گلاس منگوایا پھر مجھ سے چپکے سے بولے مجھے کچھ نہیں ہوتا مگر میں تمہاری نقل کر رہا ہوں۔ میں نے ہنستے ہوئے انہیں بتایا کہ اس کے باوجود بعد میں مجھے لیمن ڈراپ

لینی پڑتی ہے تب یہ کیفیت ختم ہوتی ہے انہوں نے فوراً" کہا جب تم کھانا تو مجھے بھی دینا۔ مگر اس وقت میرے اوسان خطا ہوگئے جب پرس میں ہاتھ ڈالنے پر صرف ایک candy نکلی۔ انہوں نے میری گھبراہٹ محسوس کر کے مسکرا کر کہا توڑ کے دو ٹکڑے کرلو۔ میں نے توڑ کر بڑا ٹکڑا ان کی جانب بڑھایا اور انہوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اسے تھام لیا۔ پھر باتیں ہونے لگیں۔ باتوں کے دوران فلیپ پہ آراء کی بات چل نکلی۔ میں نے پوچھا کہ میرے افسانوں کے مجموعے کی پہلی کتاب آنے والی ہے کیا آپ اس پر اپنی رائے دیں گے؟ وہ رضا مند ہوگئے اور بولے میں مختصر کہتا ہوں مگر بھرپور۔ اس پر میں نے بھی مسکرا کر کہا "مگر آپ نے ایک خاتون کی کتاب کے فلیپ پر تو نہ صرف طویل رائے دی ہے بلکہ انہیں عصمت چغتائی کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔" پوچھا کون؟ میں نے کہا کہ حلیمہ خانم گوہر (فرض کرلیں یہی نام تھا) وہ سن کر بے حد اطمینان اور بے نیازی سے بولے۔

"میں ان تینوں میں سے کسی کو نہیں جانتا۔" اور میں ہنس ہنس کر بے حال ہوگئی۔ جب بھی وہ سفر یاد آتا ہے تو ان کی شگفتہ مزاجی دیر تک محظوظ کئے رکھتی ہے۔

آخری سوال سن کر شکیلہ بولیں "اردو زبان کو واقعی نقصان پہنچ رہا ہے۔ میں آپ سے متفق ہوں۔ تراجم ہمارے یہاں بہت ہی کم ہوئے ہیں جبکہ اردو کے علاوہ بھی ادب لکھنے والے ہر صوبے میں موجود ہیں۔ میں نے دو چار جگہ سندھی افسانے کا ترجمہ پڑھا تو ان کہانیوں نے بھرپور انداز میں متاثر کیا۔ افسوس ہوا کہ کیوں نہیں زیادہ تراجم کئے جاتے یا کرائے جاتے ہیں۔ یہ ہمارے ملک کے ادبی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ علاقائی زبانوں کے ادب کو آپس میں متعارف کرانے کے لئے تراجم کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دیں۔

MRS. SHAKILA RAFIQUE
1 VELMA DRIVE
TORONTO ONT M8Z 2N2 CANADA

ترے فرقِ ناز پہ تاج ہے مرے دوشِ غم پہ گلیم ہے
تری داستاں بھی عظیم ہے مری داستاں بھی عظیم ہے

حمید امجد

ملتان ۵ مئی ۹۹ء

صباحت مشتاق
ملتان

میں نے شمع دہلی میں غالباً ۹۷ء میں ایک نووارد لڑکی کی کہانی پڑھی۔ نووارد اس لحاظ سے کہ یہ اس لڑکی کی پہلی کہانی تھی جو میری نظر سے گذری تھی۔ میں نے وہ پرچہ سنبھال کر رکھ لیا۔ اس کے بعد میری نظر سے اس کی اور بھی کہانیاں گذریں۔ میں ۹۸ء میں "سخن ور سوم" کی اشاعت کے سلسلے میں کراچی میں تھی۔ بہادر شاہ مارکیٹ میں واقع کتابوں کی دکان فضلی سنز گئی تو میری نظر ایک کتاب پر پڑی "سات کہانیاں" افسانہ نگار کا نام تھا صباحت مشتاق۔ میں تو صباحت کی کتاب کی تلاش میں تھی۔ کتاب خرید لی۔ گھر آ کر ساری کہانیاں پڑھ لیں مگر ابتدا دیباچے سے کی۔ پہلا پیراگراف پڑھا۔

"مجھے تو تصنیفی مضامین لکھنے نہیں آتے۔" پورا پیراگراف پڑھنے کے بعد ایک خوبصورت چہرہ نظر کے سامنے ابھرا۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ اتنا سچ بولنے کے لئے بھی تو جرات چاہئے اور پھر تعارف کے پیراگراف میں..."

پھر میں نے پورا دیباچہ پڑھے بغیر آخر میں نام پڑھا۔ میرا گمان درست نکلا۔ جو تصویر ذہن

کے پردہ پر ابھری تھی وہ مجسم ہو کر سامنے آ گئی۔ یہ قرۃ العین حیدر تھیں جن سے میں کبھی ملی نہیں۔ مگر رسالوں میں ان کی تصاویر دیکھتی رہی اور ان کی کتابیں خرید کر پڑھتی رہی۔

نومبر ۹۸ء میں جب میں نے "گفتنی" (نثر نگاروں کا تذکرہ) کا سلسلہ شروع کیا تو شمع میں دیئے گئے پتے پر لندن میں صباحت کو سوالنامہ بھجوایا۔ دو ماہ بعد مجھے صباحت کا خط ملا۔ تب پتہ چلا کہ یہ لڑکی تو اولیاؤں کے شہر ملتان میں رہتی ہے۔ خط کے ساتھ سوالنامے کے جواب اور صباحت کی تصویر بھی تھی۔ "معصوم سی لڑکی۔ اللہ تمہارے چہرے کی مسکراہٹ سلامت رکھے اور تمہیں نظر بد سے بھی بچائے۔" اس کے لئے دعا کے یہ الفاظ بے اختیار میرے دل سے نکلے۔

صباحت نے اپنے تعارف میں جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھنے سے پہلے اگر محترمہ قرۃ العین حیدر کا لکھا تعارف پڑھ لیں تو خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ اس میں ایک زمانے کی تاریخ بھی رقم ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

"یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ عورتوں نے جب لکھنا شروع کیا' اٹھارھویں صدی سے یورپ اور انگلستان میں اور اس کے بعد اواخر بیسویں صدی میں' اور خود ہمارے یہاں اردو میں تو خواتین محض موضوع سخن نہ رہیں بلکہ ان میں یہ جسارت آ گئی کہ وہ یہ بتا سکیں کہ زندگی اور دنیا کے بارے میں ان کی رائے کیا ہے۔ ہمارے یہاں عورتوں کی اس پیش رفت کو بھی بڑے شک و شبہ یا استہزاء کی نظر سے دیکھا گیا۔ شروع شروع میں ایک عرصہ تک یہ کہا گیا کہ ارے صاحب فلاں فلاں خود تھوڑے ہی لکھتی ہیں' ان کے والد یا شوہر یا بھائی ان کو لکھ کر دیتے ہیں۔ چلئے! عورتوں نے یہ مرحلہ بھی طے کیا کہ خود ان کی ادبی حیثیت کو بھی قبول کر لیا گیا۔

سماجی رویے بدلتے دیر نہیں لگتی۔ خود میری والدہ نے جب اپنی شادی سے قبل لکھنا شروع کیا اور زنانہ رسالوں کی حد بندی کو توڑ کر ایک دم ان کے مضامین اور افسانے "مخزن" میں شائع ہونے لگے تو ان کے لیے یہ افواہ پھیلی کہ وہ کلب میں جا کر گوروں کے ساتھ ڈانس کرتی ہیں' مگر بہت جلد ہی اردو دنیا نے ان کو بحیثیت ایک مضمون نگار' مرد لکھنے والوں کی صف اول میں جگہ دے دی۔

اسی طرح والدہ مرحومہ کی پھوپھی اکبری بیگم جن کا معرکہ کا ناول "گودڑ کا لال" ۱۹۰۷ء میں چھپا۔ اس سے قبل "گلدستہ وفا" انہوں نے مردانہ فرضی نام عباس مرتضٰی کی حیثیت سے چھپوایا تھا۔ ۱۹۰۷ء تک کے تعصبات کچھ کم ہوئے لیکن پھر بھی وہ اپنے بیٹے کی والدہ کی حیثیت سے ہی لکھتی رہیں۔ اپنا نام کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا اور "گودڑ کا لال" بھی اردو کے مین اسٹریم فکشن میں شامل نہیں کیا گیا۔ ان کی بھتیجی بنت نذر الباقر نے محض اپنے زور بیان اور ادبی صلاحیت کی بنا پر تعصبات کی اس سرحد کو بھی بہت جلد پار کر لیا اور ان کے مضامین و

افسانے مردانہ رسالوں میں بھی شائع ہونے لگے۔
ان کا افسانہ "ایک مکالمہ" اپنی نوعیت کی پہلی ادبی تخلیق تھی جس میں محض مکالمے کی تکنیک استعمال کی گئی تھی اور یہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ "خاتون" علی گڑھ میں شائع ہوا تھا۔ شاید ہمارے سماج کے پردہ سسٹم کی وجہ سے عورتوں اور مردوں کے لکھے ہوئے ادب کو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا گیا تھا اور بہت جلد یعنی آج سے تقریباً نوے سال قبل اردو کی ان Pioneer خواتین نے جن میں محمدی بیگم' بنت نذر الباقر اور صغریٰ ہمایوں مرزا شامل تھیں ان حد بندیوں کو توڑا۔ اس کے باوجود عورت کے لکھے ہوئے ادب کے بارے میں تحفظات کہیں کہیں موجود رہے۔ عام طور پر یہ کہا گیا کہ ان کا فکشن ادنیٰ درجے کا ادب ہے۔ یہ رائے ہمارے محترم نقاد پروفیسر وقار عظیم کی بھی تھی۔
لیکن تعجب ہوتا ہے اگر آپ محض ایک زنانہ ماہنامہ "زیب النسا" کے پرانے فائل اٹھا کر دیکھئے کہ خواتین کی کتنی بڑی تعداد نے کتنے اچھے افسانے لکھے۔ بے شک وہ افسانے مجموعی طور پر رومانٹک کہلائے جاسکتے ہیں لیکن ان میں انسانی نفسیات' زندگی کے پیچیدہ معاملات کے متعلق ان خواتین نے کیسی روانی اور فطری بیانیہ انداز میں کتنی اچھی کہانیاں لکھیں۔ گو یہ افسانہ نگار خواتین زیادہ تر بھلا دی گئیں۔
حجاب امتیاز علی منفرد ہیں۔ ان کا اسلوب اور جس دنیا کی انہوں نے تخلیق کی وہ ایسی انوکھی اور دل آویز تھی کہ اس کی کوئی تقلید نہ کر سکا۔ گو ترقی پسندوں نے ان کا مذاق اڑانا اپنا فرض جانا۔ عصمت چغتائی پہلی خاتون تھیں جو اپنی مغلیہ ترک تازی کے ساتھ ادب کے قلعہ پر حملہ آور ہوئیں اور اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ان کے بعد دوسری عصمت چغتائی کا سامنے آنا ذرا مشکل تھا کیونکہ عصمت آپا نے ادب میں ایک تاریخی رول ادا کیا۔ عصمت آپا کے پہلے مجموعہ "کلیاں" کی اشاعت کے بعد سے اب تک ادب کی دنیا میں بہت انقلاب آئے۔ خارجیت سے داخلیت کی جانب جانے کا سلسلہ رہا۔ ہاجرہ' خدیجہ' بانو قدسیہ' خالدہ حسین پاکستان کے چند بڑے نام ہیں۔ بہت سی خواتین ڈائجسٹوں کی کمرشل تحریروں کی طرف چلی گئی ہیں اور اس میدان میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت کامیاب رہی ہیں۔ ہندوستان میں جیلانی بانو کا ادبی مقام تو مسلم ہے۔ واجدہ تبسم کمرشل رائٹر بن گئیں۔ رفیعہ منظور الامین نے ایک اچھا ناولٹ لکھا۔ نئی لکھنے والیوں میں ذکیہ مشہدی اور شمیم صادقہ قابل ذکر ہیں۔ مقبول فکشن رائٹرز کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ایک مرتبہ میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پانچ سو پروفیسروں اور طلبا کی Reading Habits کا ایک سروے کرایا تھا جس میں زیادہ تر پروفیسروں اور طلبا نے اپنی پسندیدہ مصنفہ رضیہ بٹ کو بتایا۔ لہٰذا قبول عام بھی ادبی مرتبے کی سند نہیں ہے۔

اب بالکل آج کی نسل پر آیئے۔ میرے ہاتھ میں چند کہانیاں نئی لکھنے والی صباحت مشتاق کی ہیں۔ ان کو کس خانے میں رکھا جائے؟ یہاں پر مجھے ایک بات یاد آئی۔ ۱۹۸۸ء میں جب میں لاہور گئی تو حجاب امتیاز علی نے مجھے بلایا۔ وہ میری والدہ کی بہت پرانی دوست تھیں اور ان کی شادی بھی امتیاز علی تاج سے میرے والد مرحوم نے کرائی تھی۔ اس سے قبل امتیاز علی تاج کے والد شمس العلما مولوی سید ممتاز علی نے جو میری والدہ کے منہ بولے بھائی تھے ان کی شادی یلدرم سے کرائی تھی چنانچہ قصہ کوتاہ حجاب امتیاز علی سے ایک عرصے کے بعد لاہور میں ملی تو ان کو ماشاء اللہ نہایت بشاش پایا۔ تب انہوں نے اپنے یہاں دعوت میں ٹی۔وی کے ایک گائیک کو بلایا تھا۔ مجھ سے کہنے لگیں میوزک دو طرح کی ہوتی ہے۔ اچھی میوزک اور بری۔ یہ اچھی میوزک والے ہیں۔ تو آمدم بر سر مطلب اس طرح قدم و جدید' نئی نسل اور پرانی نسل' ترقی پسند اور غیر ترقی پسند' بیانیہ' تجریدی اور علامتی قضیوں سے قطع نظر ادب محض دو طرح کا ہوتا ہے۔ اچھا ادب اور برا۔ تو صباحت مشتاق کے افسانوں کو میں سمجھتی ہوں کہ اچھے ادب کے خانے میں رکھا جائے گا۔ نئے لکھنے والوں کے ہجوم میں شناخت قائم کرنا آسان نہیں ہے لیکن صباحت بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا راستہ بنا چکی ہے۔ ان کے افسانوں میں مجھ کو ایک اہم وصف یہ نظر آیا کہ ان میں آورد نہیں ہے نہ ہی وہ اس خیال سے لکھے گئے ہیں کہ کسی انوکھی تکنیک کا مظاہرہ کیا جائے۔ مصنفہ کی ذہنی پختگی اور اسلوب پر ان کی گرفت بہت واضح ہے۔ موضوعات کا تنوع بھی قابل ذکر ہے۔ ان کے مجموعے کا پہلا افسانہ "ماریا" دور حاضر میں لکھے گئے چند بہت اچھے افسانوں میں باسانی شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس افسانے کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ دنیا کے کسی بھی معاشرے کی کہانی ہو سکتی ہے۔ ماریا ایک چینی کیتھولک لڑکی بھی ہو سکتی ہے' وہ بمبئی کی گوانی لڑکی بھی ہو سکتی ہے اور لاہور' مری یا کینیڈا کی بھی۔ یہ ایک یونیورسل افسانہ ہے۔ جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے صباحت مشتاق جذباتیت سے صاف بچ جاتی ہیں۔ غیر ضروری الفاظ اور فالتو تفصیلات کو ان کے افسانوں میں جگہ نہیں ملتی۔ ان کے بعض جملے اچانک چونکا دیتے ہیں۔ مثلاً" یہ تعارفی جملہ کہ "میں وہ بن مانس ہوں جو خلائی سفر پر بھیجا گیا تھا۔" "ماریا" اور "اعتراف" جدید اور مغربی انداز کی غیر معمولی کہانیاں ہیں۔ اسی طرح "آسیب" بھی ایک غیر معمولی داستان ہے۔ "برف" بھی بہت اچھی اور متاثر کرتی ہے۔ میں صباحت مشتاق کو ایک مشورہ دینا چاہتی ہوں۔ اس کی بعض کہانیاں ضرورت سے زیادہ مختصر ہیں۔ وہ ایسی منی ایچر تصویریں بنانے کی بجائے کینوس کو ذرا وسیع بھی کر سکتی ہیں۔ بہر حال ابھی تو اکیسویں صدی ان کی منتظر ہے اور اس کے آغاز میں اردو افسانے میں مجھے یقین ہے کہ صباحت ادب میں ایک اہم مقام حاصل کر لیں گی۔"

محترمہ قرۃالعین کی پیش گوئی یقیناً" سچ ہو گی انشاء اللہ۔ اسی تناظر میں' میں نے صباحت

مشتاق سے سوالات کئے ان کے جوابات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ اصل اور قلمی نام صباحت مشتاق ہے۔ پیدائش ۱۹۶۳ء اوکاڑہ پنجاب اور تعلیم ایم اے اردو۔ میں نے ملازمت پبلی کیشنز عورت فاؤنڈیشن ایل ڈی اے فلیٹس لارنس روڈ لاہور پاکستان میں کی۔ اردو افسانے کے اسلوب پر پی ایچ ڈی بھی کر رہی ہوں۔ ابا ملتان میں ایڈوکیٹ ہیں۔ ایک بھائی امریکہ (ورجینا) اور ایک بہن لندن میں مقیم ہیں ۲۔ شاعری میں اقبال (انہیں ادیب کہنا گستاخی ہے۔ وہ تو اپنے پیش رو غالب کی طرح شعری دنیا کے کج کلاہ ہیں) پھر مجید امجد اور کسی حد تک فیض' آگے بس۔ ایک آدھ شعر تو کسی کا بھی مقبول ہو سکتا ہے۔ نثر میں مکمل طور منٹو' بیدی' کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر کے نام مستند ہیں۔ تاہم غلام عباس کا "اوور کوٹ" عبداللہ حسین کا "ندی" اور شفیق الرحمان کا "برساتی" یاد رکھے جائیں گے۔

۳۔ صرف مجروح؟ مکمل مسمار اور برباد کیا ہے۔ یہ علامتی ایمائی اور ہذیانی اسلوب بے ہنری کی دلیل ہے۔ ادب کا مورخ ان کے بارے میں شاید ایک سطر بھی نہ لکھے۔ روس کے عظیم ناول نگاروں' فرانس کے افسانہ نگار اور انگلستان کے شعرا اور پھر لاطینی امریکہ کا گارسیا مارکیز۔ کسی نے بھی جدیدیت کا ڈھونگ نہیں رچایا سبھی نے دل میں اتر جانے والا سیدھا سادا مشاہداتی اسلوب اپنایا اور لازوال ہو گئے۔

۴۔ چالیس اور پچاس کی دہائی میں تو ناولوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ مگر یہ سب ایک آنہ لائبریری کے معیار کے تھے۔ نام کسی ناول نگار کا نہیں لیتی کہ سبھی مرحوم ہو چکے۔ ادب کی تاریخ میں نام پانے کے لئے ناول نگاری میں پلاٹ سے وابستہ سرزمین کا تاریخی اور ثقافتی شعور' کردار سازی کے لئے گہرا مشاہدہ (کہ کردار قاری سے ہمکلام ہو) اور تخیل کی ایسی ساحری جس سے موضوع کو پھیلاتے اور سمیٹتے ہوئے کہانی کا ماحول اور فضا دل نشیں ہو جائے ازبس ضروری ہے اور یہ ساری خوبیاں قدرت سبھی قلمکاروں کو ودیعت نہیں کرتی۔ دوستوئسکی' ٹالسٹائی' بالزاک اور مارکیز تو غیر ملکی تھے مجھے تو قرۃ العین حیدر کے بعد اس پائے کا ادیب اپنے یہاں دور تک نظر نہیں آیا۔ معیاری ناول نگاروں کی قلیل تعداد کے سبب ہی معیاری ناول کم لکھے گئے۔ ویسے افسانے کے مقابلے میں ہر ملک میں (سوائے روس کے) ناول کم لکھے گئے۔ داستانی اسلوب نے ہمارے ہاں اس صدی کے آغاز پر ہی دم توڑ دیا۔ جب آنے والے سالوں میں روسی اور فرانسیسی ادب سے آگاہی ہوئی اور نئے اسلوب سامنے آئے۔ ترقی پسند تحریک ابھری جس سے وابستہ یا متاثرہ ادیبوں نے اردو ادب کو چند قابل ذکر ناول نگار دیئے جن میں پریم چند' عزیز احمد' قرۃ العین حیدر' عبداللہ حسین اور کسی حد تک اے حمید شامل ہیں۔ درجنوں نام اور بھی ہیں جو اردو ادب کی تاریخ میں جگہ پانے پر مصر ہوں گے مگر میں ان سے صرف نظر کرتی ہوں۔

۵۔ ادیب کا یہ بحران تو دنیا کے ہر ملک کا مسئلہ ہے۔ نظام فکر تو ادیب خود دیتا ہے تلاش کیسی؟

بہتر زندگی کے لیے "دیوانہ بکار خویش ہشیار" کے طور سارے جہاں کا درد جگر سے نکال کر آس پاس بکھری چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے رابطہ کرنا چاہیے بشرطیکہ مالی آسودگی ہو۔

۶۔ یہ سوال نقاد حضرات کے لیے ہے۔

۷۔ اس کے جواب کے لیے معذرت کہ مجھے بیرون ملک ہونے والی شعری اور نثری مقدار کا بھرپور علم نہیں ماسوائے اخباری ادبی خبرناموں کے۔

۸۔ اردو تو پہلے ہی فارسی ہندی پنجابی اور برصغیر کی علاقائی زبانوں پر مشتمل لشکری زبان ہے۔ پھر انگریزی جیسی Lingua franca سے گریز کیسا۔ ہمیں تو اپنی گفتگو میں بھی جب کوئی لفظ نہیں سوجھتا تو جھٹ انگریزی متبادل ٹانک لیتے ہیں۔ بقول انشاء اللہ خاں انشا اگر کسی دوسری زبان کا لفظ کثرت استعمال میں آجائے تو اسے اپنی ہی زبان کا لفظ سمجھ کر اپنا لینا چاہیے جیسے ایس پی۔ ڈی سی۔ گورنر۔ انجن۔ اسٹیشن۔ فائل۔ کلرک وغیرہ اور اگر کوئی اردو کا "بنیاد پرست" لائبریری کو کتب خانہ کہنے پر بضد ہو تو کتب خانہ بھی تو فارسی لفظ ہے۔ ہم لوگ غالباً مذہبی طرف داری کی بنا پر ایسی ضد کرسکتے ہیں جبھی بھارت والے اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھ کر اسے بھارت سے دیس نکالا دے رہے ہیں۔

۹۔ زندگی کا اہم واقعہ میری کہانیوں کے پہلے مجموعے پر محترمہ قرۃالعین حیدر کا دیباچہ لکھنا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ انہوں نے نہ کبھی اپنی کتاب کا دیباچہ لکھوایا اور نہ ہی کسی اور کا لکھا۔ (شبانہ اعظمی والے جاوید اختر کے شعری مجموعے "ترکش" پر انہوں نے کچھ رائے دی ہے جو غالباً" لکھنؤ کی ہم وطنی کا قرض اتارا ہے۔ حالانکہ عینی آپا کا شاعری سے کیا ناطہ؟)

۱۰۔ یہ سوال بھی نقاد حضرات کے لیے ہے جو میں نہیں ہوں۔

SABAHAT MUSHTAQ
158 NAQSHBAND COLONY
MULTAN PAKISTAN

ساقی پلا رہا ہے تو پینا ہے ناگزیر
ورنہ شرابِ زیست میں تلخی بلا کی ہے۔

(رسیدہ فوٹو)

صغرا مہدی
۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۹۹

ڈاکٹر صغریٰ مہدی

دہلی

یہ امامت فاطمہ ہیں جو ادبی دنیا میں ڈاکٹر صغریٰ مہدی کے قلمی نام سے جانی جاتی ہیں۔
۸ر اگست ۱۹۳۷ء کو بھوپال (مدھیہ پردیش ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ تعلیم جامعہ ملیہ دہلی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہوئی۔ اسکول سے جامعہ تک درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہیں۔ مشہور دانشور، مترجم، مفکر اور ادیب ڈاکٹر عابد حسین کی بھانجی ہیں۔ مشہور ادیبہ صالحہ عابد حسین ان کی ممانی تھیں جنھوں نے دس سال کی عمر سے انہیں اپنے پاس رکھا تھا اور ان کی تعلیم و تربیت کی۔ بچپن بھوپال اور اس کے خوب صورت مقامات پر گزرا۔ اس کے بعد ان کے وطن داعی پور ضلع فرخ آباد میں رہیں جہاں انھوں نے اپنے دادا سے اردو حساب اور مذہب کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور قرآن مجید پڑھا۔ لڑکپن سے اب تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں رہیں۔ شادی نہیں کی۔ اب بھی جامعہ کے کیمپس میں رہتی ہیں۔ تصنیف و تالیف کا کام کرتی ہیں۔ نو عمری سے لکھنا شروع کر دیا تھا مگر اپنی تخلیقات پر کافی عرصہ گذر جانے کے بعد توجہ دی۔ اب تک چھ ناول لکھ چکی ہیں تین افسانوں کے مجموعے۔ ترجمہ اور تالیف کی ہوئی کتابوں

کے علاوہ بچوں کے لئے تیس سے زیادہ کتابیں لکھ چکی ہیں۔ پی ایچ ڈی کا موضوع "اکبر الہ آبادی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ" تھا۔ مقالہ شائع ہوا پسند کیا گیا اور لوگوں نے بغیر؟ کے اس کے حوالے دیے ہیں۔ (بلاشبہ یہ تکلیف دہ عمل ہے۔ کم از کم مصنف یا محقق کا نام تو شامل کرنا چاہیے۔)

یہ غالباً "۹۸ء کی بات ہے۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی اپنے ساتھیوں کے ساتھ پشاور پاکستان آئی تھیں۔ اس کی روداد انہوں نے "سفرنامہ امن" کے نام سے لکھی۔ انہوں نے بھی دیگر ادیبوں کی طرح پاک و ہند دوستی کی فضا کو مزید خوشگوار بنانے کے لئے اپنے اور عوام کے احساسات کی جس طرح ترجمانی کی ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔۔۔ سرحدوں کے جھگڑے سرحدوں کے لیڈروں کو مبارک، مگر اس دعا کے ساتھ کہ خدا انہیں دونوں ملکوں کے عوام کی بھلائی کا جذبہ عطا کرے تاکہ دونوں ملک امن کے پرچم تلے اپنے اپنے ملکوں کے عوام کے لئے جلد خوشحالی لائیں آمین۔

اب ذرا ایک ہندوستانی عورت جو ادیبہ بھی ہے اس کے احساسات ملاحظہ ہوں کہ یہ تحریر واقعی دلوں کو چھو جانے والا محبت کا ایک پیغام بھی ہے۔

"نومبر کے آخری دنوں میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں یہ مصرعہ ان ہندوستانیوں کی زبان پر تھا جن کے دل میں ہند و پاک دوستی کا جذبہ ہے اور ان کا تعلق India Pak Peoples Fourum for peace and Democracy سے ہے۔ فورم کا چوتھا کنونشن پشاور میں 21، 22 نومبر کو ہونا طے ہوا تھا۔ اس سے قبل ایک کنونشن دہلی دوسرا لاہور اور تیسرا کلکتہ میں ہو چکا تھا۔ فورم دونوں ملکوں میں جانا جاتا ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مدتوں سے جگر مراد آبادی کا یہ شعر سنتے آئے ہیں

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

یوں سمجھئے فورم اس شعر کو عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان دوستی و محبت ہو، ایک دوسرے کے قریب آئیں، ایک دوسرے کے ملک کو، اس کے لوگوں کو جانیں پہچانیں اور اپنے اپنے ملک میں امن و جمہوریت کے لیے کوشاں ہوں۔ ان سب مسئلوں سے نمٹیں جو ان دونوں ملکوں کو درپیش ہیں۔ اس فورم کا خیال پاکستانی مدبر اور سیاست داں ڈاکٹر مبشر حسن کو آیا اور انہوں نے اس کے لیے جدوجہد شروع کی تو ہندوستان پاکستان کے بہت سے لوگ ان کے ساتھ آ گئے۔ اس میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ ہیں ہر مذہب و ملت کے شاعر ادیب جرنلسٹ، ا[illegible] دسٹ، وکیل اور استاد بھی۔

20 نومبر کو مختلف ذرائع آمد و رفت سے مختلف وقتوں میں کوئی ڈیڑھ سو لوگ امرتسر پہنچے اور

صبح کو بذریعہ بس واگہہ پہنچے۔ واگہہ پر عجب چہل پہل تھی بھانت بھانت کے لوگ تھے عورتیں مرد جوان نوجوان ادھیڑ عمر کے بوڑھے اور ضعیف بھی۔ سب لوگ ایک دوسرے سے مل رہے تھے اپنا تعارف کرا رہے تھے اپنے ان جذبات کو شیئر کر رہے جو ان کے دلوں میں تھے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو پاکستان میں ہی پیدا ہوئے تھے اپنی جنم بھومی کو دیکھنے کو بے قرار تھے اور فورم کے شکر گزار تھے کہ اس کی بدولت ان کو یہ موقع مل سکا۔

دو تین گھنٹے سرکاری کارروائی میں لگ گئے کسٹم والوں نے بہت مہربانوں کا سا سلوک کیا چند قدم پیدل چل کر ہم پاکستان میں تھے۔ جہاں فورم کے ہندوستان منتظمین اور پاکستانی میزبان مسکرا کر ہمارا استقبال اس طرح کر رہے تھے کہ ہماری نظروں میں ان کے چہرے گڈمڈ ہو گئے۔ میں دسویں بار پاکستان آئی تھی پہلے جب آئی تو چند عزیزوں کو اپنا میزبان سمجھتی تھی مگر اس دفعہ اتنے پر محبت چہرے خوش آمدید کہہ رہے تھے کہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس پر کیسے خوشی کا اظہار کیا جائے ایک بڑا سا شامیانہ لگا تھا ریڈ کارپٹ اور مخملیں کرسیاں' پر تکلف چائے اور ناشتہ سراپا اخلاق و محبت کے پیکر دوست' دوپہر کو کھانے کے بعد ساڑھے تین بجے ہم لوگ مختلف بسوں میں واگہہ سے پشاور روانہ ہوئے۔

پشاور پھولوں کی وادی' چلئے شہر کہہ لیجئے' پشاور لفظ سنسکرت پشپ سے نکلا ہے اس کے معنی پھولوں کے شہر کے ہیں۔ تاریخی شہر گندھارا کی سرزمین' ابھی تک صرف نام سنا تھا اب دیکھیں گے' یہ سوچ کر خوشی ہو رہی تھی۔ بسوں میں ہندوستانی گانے گائے جا رہے تھے "کچھ کچھ ہوتا ہے" جب کہ ہندوستانی مسافروں کا اصرار تھا کہ پاکستانی گانے سنیں گے۔ ہماری بسوں پر جو بینرز لگے تھے ان کو دیکھ دیکھ کر لوگ ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ہماری بسیں پاکستان کے شاندار موٹر وے پر تیر رہی تھیں۔ ہم لاہور سے گزرے' راولپنڈی سے گزرے پھر واہ اور ٹیکسلا سے پھر حسن ابدال آیا جہاں پنجہ صاحب ہے پھر اٹک اور آخر میں نوشہرہ۔ ہم نے راوی چناب اور جہلم ندیوں کو دیکھا اور پاکستان کے ٹائم سے ساڑھے بارہ بجے رات کو پشاور میں تھے۔ ہم سب نہایت ایکسائیٹڈ تھے' ساؤتھ ایشیا کے سب سے پرانے شہروں میں سے ایک شہر پشاور میں ہم ہیں جو مہاتما بدھ کا شہر بھی ہے ایک طرح جو پٹھانوں کا پیرس کہلاتا ہے جہاں قصہ خوانی بازار ہے جو وسط ایشیا کا پگڈی کہلاتا ہے جو بادشاہ خان کا شہر ہے ولی خاں اور محمد یونس کا شہر ہے۔ صفدر حسین صدیقی معہ اپنے ساتھیوں کے ہمارے منتظر تھے۔ ہوٹل کے شاندار کمرے بھی ہمارے منتظر تھے۔ کھانا بھی کھایا غرضیکہ رات کو رت جگا رہا۔

دوسرے دن یعنی 21 نومبر کو ہم کانفرنس کے نشتر ہال میں تھے جہاں پر بہت سے لوگ تھے۔ عورتیں بھی مرد بھی لڑکے لڑکیاں سب ایک دوسرے سے اپنا تعارف کرا رہے تھے ان ہی میں راحیلہ درانی بھی تھیں جو اپنے بالوں اور مردانہ قمیض و شلوار میں سب سے الگ الگ نظر آ

رہی تھیں۔ راحیلہ اپنے کو نہ جانے کیا بتا رہی تھیں لاکی پریکٹس بھی کرتی ہوں جرنلسٹ بھی ہوں جوڈو کراٹے بھی جانتی ہوں انگریزی میں شاعری بھی کرتی ہوں' میں نے مسکرا کر کہا ارے بھئی تم کیا کیا کرتی ہو تو وہ ہنسنے لگی۔ وہ ہندوستان اور خاص طور سے ہندوستانی نوجوانوں کے بارے میں مجھ سے سوالات کرنے لگی۔ مجھے اسے دیکھ کر اپنے یہاں کی لڑکیاں یاد آ رہی تھیں۔ کتنی ملتی جلتی تھی وہ ان سے۔ وہی مسائل تھے اس کے بھی۔ تشدد' کرپشن' غریبی' عدم مساوات خاص طور سے جنسی عدم مساوات۔ وہ ان سب سے بہت پریشان تھی مگر خوشی کی بات ہے کہ ان سے لڑنے کا اس میں حوصلہ بھی تھا۔

میں راحیلہ درانی سے باتیں کر رہی تھی کہ میری نظر مسٹر شرما پر پڑی جو دہلی سے ہمارے ساتھ امرتسر گئے تھے مگر اس وقت تو وہ پشاوری چپل پشاوری پگڑی اور شلوار میں خالص پشاوری لگ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خاص چمک تھی۔ میں نے کہا "شرما صاحب آپ تو پہچانے ہی نہیں جا رہے ہیں بالکل پشاوری لگ رہے ہیں" ان کی آنکھیں نم تھیں۔ انہوں نے بند مٹھی کھولی تو ان کے ہاتھ میں مٹی تھی جو وہ قصہ خوانی بازار سے اٹھا لائے تھے راحیلہ ان کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر صغریٰ مہدی نے بالترتیب "گفتنی" کے لئے سوالوں کے جواب اس طرح دیئے۔

"بیسویں صدی میں اردو ادب میں زندہ رہ جانے والے چند نہیں بہت سے نام ہیں اور ان کے نام گنوانا آسان نہیں ہے۔"

۳۔ "جدیدیت نے فکشن کو نکھارا بھی سنوارا بھی اور مجروح بھی کیا ہے۔"

۴۔ "میرا تو ایسا خیال نہیں ہے۔ بہت ناول لکھے گئے اور ان میں بہت اچھے بھی ہیں۔"

۵۔ "آج کل پر کیا منحصر ہے ہر زمانے میں یہ ادیبوں کا ہی نہیں سب انسانوں کا یہ مسئلہ رہا ہے۔ ہمیشہ ہر ایک نے اپنی اپنی پسند اور استطاعت کے مطابق مختلف مکتبہ ہائے فکر سے رہنمائی حاصل کی ہے۔"

۶۔ "معیاری ادب وہ ہے جسے مشہور ناقدان فن معیاری کہیں۔"

۷۔ "شاعری اردو میں ہمیشہ زیادہ ہوئی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ شعر کہنا آسان ہے مگر شعر لوگوں کو زیادہ اور جلدی متاثر کرتا ہے۔ اور نثر اتنی کم بھی نہیں لکھی گئی۔"

۸۔ کون گریز کر رہا ہے؟ اب تو خوب انگریزی زبان کے الفاظ بلکہ فقرے بھی اردو میں استعمال ہو رہے ہیں۔ اور اپنے تلفظ کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اس کا حصہ بن گئے ہیں۔ اس لیے اردو کی ترقی رکنے کی اور وجوہات ہو سکتی ہیں یہ نہیں۔"

۹۔ "زندگی دلچسپ واقعات سے بھری ہوئی ہے کون سا سناؤں کون سا چھوڑوں؟ بس یہ سمجھئے کہ زندگی ایک حسینہ ہے چھیل بانکی۔ اس کی ہر ایک ادا نذر دل و جاں مانگے۔"

۱۰۔ ''تنقید خوب لکھی جا رہی ہے اور نظریات بھی وضع ہو رہے ہیں تراجم بھی ہندوستان میں خوب ہو رہے ہیں پاکستان کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتی۔ ویسے وہاں بھی کچھ لوگ یہ کام کر تو رہے ہیں۔

ڈاکٹر صغریٰ مہدی کی کتابوں کے نام یہ ہیں۔

ناول۔ پابہ جولاں (۱۹۷۳ء) دھند (۱۹۷۶ء) پروائی (۱۹۷۸ء) راگ بھوپالی (۱۹۸۵ء) اور جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو (۱۹۹۰ء)

افسانوں کے مجموعے... پتھر کا شہزادہ (۱۹۷۵ء) جو میرا وہ راجہ کا نہیں (۱۹۸۷ء) پہچان (۱۹۹۵ء) تالیفات اور ترجمے اس کے علاوہ ہیں۔

انہیں ''پابہ جولاں'' پر اردو اکیڈمی ایوارڈ 1978ء میں دیا گیا اور ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کو ۱۹۸۰ء میں یو۔پی۔ اردو اکیڈمی کی جانب سے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

DR. SUGHRA MEHDI
ABID VILLA, GULMOHAR AVENUE
JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25 INDIA

چپ چاپ سکوں سے بیت گئی — کیا غربت کی لمبی گھڑیاں
یا بہت کٹھن تھے روز و شب — دن سال بنے، بیتے صدیاں

صفیہ صدیقی
لندن - اپریل ۱۹۹۹ء

صفیہ صدیقی

لندن

ادب میں افسانہ اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے بھی کسی حقیقی یا فرضی واقعے کا بیان ہے۔ یہ واقعہ تاریخی بھی ہو سکتا ہے، زمانی بھی، نفسیاتی واردات بھی اور ایک تاثر کا اظہار بھی۔ لیکن کہانی میں واقعہ کو بہر حال اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے کہانی کا اسلوب ہمیشہ سے بیانیہ رہا ہے۔ زندگی جس سے ہم کہانیاں لیتے ہیں بہت رنگا رنگ، وسیع، متنوع اور پہلو دار ہے۔ اس کا بیان بھی رنگا رنگی اور تنوع کا متقاضی ہے۔ زندگی اور اس کے تجربات کو چند بندھی ٹکی مفروضہ علامتوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ اور میری رائے میں جو تحریر ابلاغ کے تقاضوں کو پورا نہ کرے وہ ناکام ہے، چاہے وہ شاعری ہو یا افسانہ۔

صفیہ صدیقی کے افسانے میں نے پڑھے ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "پہلی نسل کا گناہ" شائع ہوا۔ لندن کے پروفیسر جناب رالف رسل صفیہ کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"میں صفیہ صدیقی کو عرصے سے جانتا ہوں لیکن مجھے ان کی تحریروں کے بارے میں تین چار

سال قبل اس وقت علم ہوا جب میں نے ان کا افسانہ "کمیونٹی لیڈر" پڑھا۔ اس افسانہ نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا۔ برطانیہ میں بسنے والے پاکستانیوں کے رویہ اور انداز فکر میں جو خوب و نا خوب تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کو صفیہ صدیقی نے اس افسانہ میں نہایت جرات اور سچائی سے بڑے دلچسپ اور حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ میں نے صفیہ صدیقی کے تقریباً تمام افسانوں کو پڑھا ہے اور ان کی بہترین تحریریں ان خوبیوں سے مزین ہیں۔ جرات اور سچائی کی یہی خوبیاں تھیں جن کے باعث اس صدی کے تیسرے عشرے میں اردو کے افسانہ نگاروں نے وہ مرتبہ پالیا کہ ان کا موازنہ دنیا کی کسی بھی زبان کے مصنفین کے ساتھ کیا جا سکے۔ صفیہ صدیقی کے افسانے اس روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں اور وہ ان افسانوں میں جو نئے اور اہم موضوعات پیش کر رہی ہیں وہ اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں۔"

اردو دنیا کے محترم محمود ہاشمی صاحب اردو دنیا کے جانے پہچانے ادیب ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

"صفیہ صدیقی کے ہاں انگریزی سے بیگانگی بھی ہے اور اپنائیت بھی۔ اس سے قرب اور دوری پسند اور ناپسند اور تعصب کے انداز گوناگوں ہیں ہر جذبے کے رخ کثیرا لجہات ہیں۔ اس صدی کے آغاز میں انگریزی افسانہ نگار اور ناول نویس کپلنگ نے لاہور میں بیٹھ کر ہمیں اپنے مشہور کردار "کم" سے روشناس کرایا تھا اور اب اس صدی کے خاتمہ پر لندن میں مقیم صفیہ صدیقی ہمیں "کرسٹوفر" سے ملا رہی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کپلنگ کا "کم" سیاست تہذیب اور سماج کے کئی پر پیچ بندھنوں سے آزاد ہو کر وقت کے طول و طویل فاصلے کو طے کر کے ایک نئی شخصیت اختیار کر چکا ہے۔ کہیں کل کا "کم" آج کا "کرسٹوفر" تو نہیں؟ کپلنگ نے کہا تھا۔ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی نہیں مل سکتے۔" صفیہ صدیقی نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ انہوں نے اسے جھٹلایا بھی نہیں۔ لیکن افسانے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ مشرق اور مغرب کے نہ صرف جغرافیائی فاصلے سکڑ رہے ہیں۔ بلکہ ذہنوں میں بھی انقلاب آ رہا ہے اور دنیا اور دنیا والے... کم کم ہی سہی غیر شعوری طور پر ہی سہی' بے دلی سے ہی سہی... بدل رہے ہیں۔ بیگانگی اور اپنائیت کے معنی وہی ہیں۔ کہ جو تھے۔ لیکن نظر کے زاویے مختلف ہیں۔ معیار بدل رہے ہیں اور صفیہ صدیقی بہ کمال حسن و خوبی ان کی ترجمانی کر رہی ہیں۔"

جرمنی میں مقیم معروف افسانہ نگار نعیمہ ضیاء الدین صفیہ کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

"معروف روسی خاتون ادیب و فلاسفر مشیلے لا دیوف کہتی ہے۔ "کاش دنیا کے اسٹیج پر عورتوں کی حیثیت اور ان کی اہمیت کا بھی تعین ہو سکتا۔ ان کے لئے آسامیاں مخصوص ہوتیں' تاکہ وہ بھی مردوں کے ساتھ پورے عمل میں برابر کے شریک کار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے

آتیں...“ مشیلے لادیوف آگے چل کر ذکر کرتی ہے۔ ”مردوں نے تو عورتوں کو شیکسپیر کے کھیل میں اسٹیج پر ابھرنے والے مسخروں سے بھی کم تر جانا ہے۔ کم از کم وہ غل غپاڑہ مچانے اور ہنسنے ہنسانے کا سامان تو کر سکتے ہیں۔ یہ قہقہے ہر چند کہ دوسروں کو ہنسانے کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن اس طور وہ اپنی داد رسی تو کر لیتے ہیں۔ جب کہ ہم عورتوں کو ان تقاضوں سے بھی ہمیشہ محروم رکھا گیا...“

فن کار کو دکھائی دینے والی یا محسوس ہونے والی مظلوم طبقات کی یہی ”محرومی“ اس کے فن کا اظہاریہ بن جاتی ہے۔ اپنی آنکھ کے آنسو میں تمام محروم آنکھوں کے اشک دیکھنا اور ہر نظر کو دکھانا ہی فن کی معراج کہلاتا ہے۔

صفیہ صدیقی اس ہنر مندی میں کامیاب ہیں۔ اور سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے اس کمال کو بھی غرور کی آمیزش میں ملا کر دوسروں پر نہیں ٹھونستیں' بلکہ کمال سادگی سے وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچا کر خود ایک جانب ہٹ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ بعد میں محسوس ہوتا ہے کہ کہنے والا ”کچھ“ کہہ گیا ہے۔

اب آیئے افسانہ نگار صفیہ صدیقی سے ان کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں۔ ”میرا آبائی وطن قصبہ نگرام ضلع لکھنؤ ہے۔ میرے دادا نگرام کے محلّہ مولویانہ میں رہتے تھے۔ میرے والد کا انتقال ہوا تو میری عمر سات سال تھی اس کے بعد ہم اپنے نانا کے پاس رائے بریلی آگئے۔ جہاں پانچ سال تک ہم رہے پھر میری پھوپھی نے ہمیں شملہ بلوالیا۔ ابھی ہمیں شملہ پہنچے دو تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ ملک آزاد ہوا' تقسیم ہوا اور فسادات پھوٹ پڑے۔ ہم سب بھی کسی نہ کسی طرح جان بچا کر کالکا کیمپ پہنچے اور وہاں سے پھر لاہور اور راولپنڈی' جہاں پھوپھا کا تقرر ہو گیا تھا۔ بچپن کی یادوں میں زیادہ تر روشن یادیں رائے بریلی کی ہیں ورنہ ہجرت ہے اور جدائی کا دکھ۔ میری امی اور ایک چھوٹا بھائی ہندوستان ہی میں رہ گئے تھے۔ میں ۱۹۳۵ء میں رائے بریلی میں پیدا ہوئی تھی۔

چونکہ میرے والد زیادہ تر دورے پر رہتے تھے اس لئے ایک ماسٹر صاحب ہمارے ساتھ رہتے تھے جو ہمیں فارسی' اردو' انگریزی اور حساب پڑھاتے' والد کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا تو میں رائے بریلی گورنمنٹ اسکول فار گرلز میں داخل کرادی گئی۔ راولپنڈی میں پھوپھا نے اسکول جانے کی اجازت نہیں دی۔ وہ بھی محلّہ مولویانہ کے تھے اور سخت مذہبی۔ ہمارے یہاں شادی وغیرہ میں کوئی رسومات نہیں ہوتی تھیں سادگی اور قناعت پر بہت زور تھا اور لڑکیوں کو گھر پر تعلیم دی جاتی تھی۔ اسکول بھیجنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

پندرہ سال کی عمر میں میری شادی ہو گئی اور میں کراچی آگئی۔ ۱۹۶۱ء میں چند سال کے لئے لندن آئی لیکن یہ مختصر عرصہ طویل ہو تا گیا۔ ۱۹۷۳ء میں واپس پاکستان گئی مگر بچوں کی تعلیم میں

مشکلات ہوئیں اور دوبارہ انگلستان واپس آنا پڑا۔
میں نے شادی کے بعد کچھ امتحان پرائیوٹ طور پر پاس کئے تھے، پھر لندن آکر کچھ کئے اور ۱۹۷۸ء میں میچور اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی سے "ساؤتھ ایشین اسٹڈیز" میں کل وقتی تین سالہ کورس کیا اور بی اے آنرز کی ڈگری لی۔
لندن آنے سے قبل میں کہانیاں اور نظمیں لکھا کرتی تھی جو شائع بھی ہوئیں، یہاں آکر یہ سلسلہ تقریباً" بند ہو گیا۔ ۱۹۷۱ء میں "جنگ" کا لندن میں اجراء ہوا اور میں نے جب اس میں کام کرنا شروع کیا تو لکھنے کی خواہش پھر بیدار ہوئی۔ ادبی نشستوں نے اس تحریک کو تقویت بخشی۔ جنگ کے لئے میں نے مختصر افسانے، نظمیں لکھیں۔ ترجمے کئے، انٹرویوز لئے۔ مضامین اور رپورٹیں لکھیں۔ یونیورسٹی جانے کے بعد میں جز وقتی طور پر اس کے لئے کام کرتی رہی تھی۔ ڈگری لینے کے بعد میں جنگ میں واپس گئی لیکن ایک دو سال بعد خرابی صحت کی بناء پر کام چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے سماجی کارکنوں اور امیگریشن آفیسرز کو کالج میں اردو پڑھائی اور کبھی کبھار ترجمے بھی کئے۔ لیکن اب میں اپنی توجہ لکھنے پر مرکوز کرنا چاہتی ہوں۔ میں ہفت روزہ "راوی" کے لئے جو بریڈ فورڈ سے نکلتا ہے کالم لکھتی ہوں۔
میں نے Methovin پبلشرز کی "ٹین ایج انتھولوجی" کے لئے ایک کہانی انگریزی میں "ان سرچ آف اے چائلڈ ہڈ" لکھی۔
(In Search of a Childhood)
عصمت چغتائی کے افسانے "چوتھی کا جوڑا" کا ترجمہ Virago پبلشرز کی ہندوستانی کہانیوں کے مجموعے کے لئے کیا۔
میرا دوسرا افسانوی مجموعہ "چاند کی تلاش" سنگ میل پبلکیشنز لاہور نے ۹۴ء میں شائع کیا۔
انگلستان میں رہائش پذیر ساؤتھ افریکن رائٹر میرئن مولیسو (Marion Molteno) کے ایشائی تارکین وطن کے بارے میں افسانوں کا مجموعہ (A language in Common) کا اردو میں، میں نے ترجمہ کیا جسے انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کیا۔ برطانیہ کی بارہ افسانہ نگار خواتین کے ایک ایک افسانے کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو اب اشاعت کے لیے تیار ہے۔ رالف رسل کے طویل مضمون "Urdu an I" کا ترجمہ اردو میں کر رہی ہوں جسے "آج پبلشرز" کراچی میں کتابی صورت میں شائع کریں گے۔ تیسرے افسانوی مجموعے کے لئے متن اکٹھا ہو گیا ہے اب پبلشر کی تلاش ہے۔"
صفیہ نے دوسرے سوال کے جواب میں کہا۔
"یہ تو آنے والا وقت بتائے گا کہ بیسویں صدی کی اردو ادب کی تاریخ میں کون سے نام

زندہ رہیں گے ویسے میرے خیال میں تو یہ فہرست کافی لمبی ہے۔ سرفہرست تو قرۃ العین حیدر ہیں پھر شوکت صدیقی' انتظار حسین 'الطاف فاطمہ' بانو قدسیہ 'اشفاق احمد' رضیہ فصیح احمد' ممتاز مفتی اور نجانے کتنے اور ہوں گے جن کے نام مجھے اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں اور بہت سے وہ جن کے نام سے میں واقف نہیں۔ اور یہ سب نثر نگار ہیں۔ شعراء کی فہرست اور لمبی ہے۔

فکشن کو جہاں تک میں سمجھتی ہوں جدیدیت نے اس میں الجھاؤ اور ابہام پیدا کر کے مجروح کیا ہے۔

اردو ادب کی عمر بہت کم ہے اور اس کی نشوونما تو بیسویں صدی ہی میں مکمل ہوئی ہے اس لئے یہ بھی ناول کم لکھے جانے کی وجہ ہو سکتی ہے۔ اور یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے ملک میں اشاعت' تقسیم اور پبلیٹی کے اتنے مسائل ہیں اور قاری کا فقدان۔ ناول زیادہ توجہ اور وقت مانگتا ہے۔ ان مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے اردو میں ناول کی تعداد اتنی کم بھی نہیں ہے۔"

سوال نمبر ۵ کے سلسلے میں کہتی ہیں۔

"میری ناقص رائے میں تو بہتر زندگی گذارنے کے لئے کسی نظام فکر کو وضع کرنے کے لئے آج ہمارے پاس کافی ادبی ذخیرہ ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکروں اور دانشوروں کی ایسی تحریریں ہیں اور جو ہمیں خود اپنے لئے ایک نظام فکر ترتیب دینے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں جو ہماری اپنی روایت' عقیدے اور فکر کو جلا بخشنے میں اس سے ٹکر نہ کھاتی ہوں تاکہ اس سمٹتی ہوئی دنیا میں ہم امن و سکون سے باعزت طور پر اپنا مقام بنا سکیں۔

اور جناب معیاری ادب کے پیمانے تو نقاد متعین کرتے ہیں میں تو صرف ایک افسانہ نگار ہوں۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ معیاری ادب میں زبان' اسلوب' اور ابلاغ کے ساتھ ندرت فکر بھی ہونی چاہئے۔

ہاں مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ پاکستان اور ہندوستان سے باہر نثر کم لکھی جا رہی ہے۔ لکھی زیادہ جا رہی ہے اور جتنی لکھی جا رہی ہے اتنی شائع نہیں ہو رہی ہے۔ شاعر تو لوگ تفریحاً" بھی بن جاتے ہیں۔ مگر نثر میں وقت کے ساتھ غور و فکر کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ ہندوستان پاکستان سے باہر نثر خوب لکھی جا رہی ہے اور بہت اچھی لکھی جا رہی ہے۔

اردو زبان میں انگریزی زبان کے الفاظ کی شمولیت سے گریز بہتر ہے۔ یوں ہی ہندوستان اور پاکستان میں ادیب اور نقاد اتنی زیادہ انگریزی استعمال کرتے ہیں اگر اس کی ہمت افزائی کی گئی تو اردو کی شکل ہی بگڑ کر رہ جائے گی اور انگریزی اردو میں لکھی جانے لگے گی۔ انگریزی میں تو آپ لاطینی یا فرانسیسی الفاظ نہیں دیکھتے حالانکہ لاطینی زبان پڑھنا بیس پچیس سال قبل تک انگریزی ادب پڑھنے والوں کے لئے ضروری تھا۔ ان کی ادبی روایتیں سب لاطینی اور یونانی

ہیں۔

سلطانہ مہر! میری زندگی تو ہجرتوں پر مشتمل رہی ہے جس میں جدائی اور تنہائی کے دکھ زیادہ رہے۔ مجھے صرف ایک دلچسپ اور یاد رکھنے کے قابل واقعہ یاد آ رہا ہے۔ فیض صاحب لندن آئے ہوئے تھے ۸۰ کی دہائی کا زمانہ تھا۔ (غالباً") ان کی کلیات کا اجراء اردو مرکز لندن نے کیا تھا۔ تقریب ختم ہونے کے بعد مرد تو چائے پینے میں مصروف تھے اور عورتوں نے فیض صاحب کو گھیر رکھا تھا اور بغیر کسی جھجک کے باری باری ان کے ساتھ تصویر کھنچوا رہی تھیں۔ میں علیحدہ کھڑی ان "غیر ادبی" خواتین کی ہمت پر عش عش کر رہی تھی کہ "جنگ" اخبار کے فوٹو گرافر میرے پاس آئے اور کہا کہ آیئے آپ بھی فیض صاحب کے ساتھ تصویر کھنچوا لیجئے۔ میں نے انکار کر دیا۔ بھلا کہاں میں کہاں فیض صاحب۔ وہ ایک لیجنڈ ہیں۔ وہ اصرار کر رہے تھے اور میں انکار۔ کہ ایک دم سے فیض صاحب آ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے "آیئے بی بی۔ تصویر کھنچوائیں۔" انہوں نے ہماری گفتگو سن لی تھی۔

اردو ادب میں ترقی کو ہم صرف پاکستان کے سیاسی پس منظر اور ملک اور معاشرے کی ترقی (یا تنزلی) کے حوالے سے دیکھ سکتے ہیں۔ عملی یا نظریاتی ترقی نہ ہونے کا باعث بھی یہی عوامل ہو سکتے ہیں۔ جس ملک میں خواندگی کا تناسب اتنا کم ہو' جہاں کتاب خریدنے کی استطاعت رکھنے والے بھی کتاب مفت مل جانے کے متمنی رہتے ہیں۔ جہاں قاری کا فقدان ہو' جہاں ادیب اور افسانہ نگار بھی دوسرے ادیبوں اور افسانوں نگاروں کی کتابیں خریدنے سے گریز کریں۔ جہاں ادیب' افسانہ نگار' شاعر کو عام طور سے کسی قسم کا معاوضہ نہ ملتا ہو' وہاں جو کچھ کام ہو رہا ہے اسی کو غنیمت جانئے اور ان لوگوں کو دعا دیجئے جو کسی نہ کسی طور تھوڑا بہت کام محض اپنے شوق سے اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر کر رہے ہیں۔ اسی لحاظ سے ترجمے کا کام بھی ہو رہا ہے۔ علاقائی زبانوں کے ترجمے بھی ہو رہے ہیں۔ اب تو ادیب اور افسانہ نگار جو علاقائی زبانیں جانتے ہیں' یا جس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں وہ ترجمہ کر رہے ہیں۔ پاکستان کے ادبی منظر کا مغرب کے ادبی منظر سے موازنہ کرنا ناانصافی ہے۔ ہم ان سے سو سال کے قریب پیچھے ہیں۔"

MRS. SAFIA SIDDIQUE
10 TWYFORD ABBEY ROAD
LONDON NW10 7HG U.K

[illegible]

[illegible]

صہبا لکھنوی

[illegible]

صہبا لکھنوی
کراچی

صہبا لکھنوی کا خاندانی نام سید شرافت علی نہ بھی ہوتا تو بھی ان کے چہرے پر محبت، خلوص، سچائی اور وضعداری کی پھیلی روشنی خود کہتی کہ یہ مجسم شرافت ہیں۔ اچھے بھلے شاعر تھے اور کینیڈا کے اشفاق حسین کی دعوت پر ۱۹۸۸ء میں کینیڈا اور امریکا بحیثیت شاعر گئے مگر ان کے اندر کے صحافی نے آہستہ آہستہ ان کے قدموں کی زنجیر کی کڑیوں میں اضافہ کرنا شروع کیا اور صہبا لکھنوی پھر صرف اپنے جریدے ماہنامہ "افکار" کے ہو رہے۔ کیسی شاعری اور کہاں کا ادب۔ ورنہ یہی صہبا لکھنوی تھے جنہوں نے اپنی نظم "تاریخ کا ایک ورق" کے عنوان سے جو نظم کہی تھی اس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

سرحدِ پاک پر
سبز پرچم فضاؤں میں لہرا رہا ہے
جو انانِ ملت کے
احساس و جذبے کو گرما رہا ہے

یہ میرا وطن ہے، مری سرزمیں ہے
جسے میں نے اپنے لہو کی حرارت سے
نغمہ کی لے، روح کی تازگی، سرخوشی
چاند کی روشنی، دلکشی، عشق کا ولولہ
حسن کا بانکپن، عزم کی پختگی بخش دی ہے

صہبا لکھنوی نے غلط تو نہیں کہا۔ انہوں نے راہ بدل دی اور بجائے شاعری کے "صحافت" کا علم اٹھایا مگر منزل ان کی وہی رہی۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں "افکار" کا ڈکلریشن حاصل کیا تو سن ۲۰۰۰ء تک ان کی لگن نے "افکار" کے حسن کو نکھارنے سنوارنے میں ایک تاریخی کردار ادا کیا اور اب بھی صہبا لکھنوی کی سرپرستی میں "افکار" کی مشعل روشن ہے اور انشاء اللہ روشن رہے گی۔ آمین۔

صہبا لکھنوی ۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ویسے ان کا آبائی وطن لکھنؤ یوپی ہندوستان ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۰ء سے ہو گیا تھا۔ جب ان کی عمر گیارہ سال کی رہی ہوگی بی اے کرنے کے بعد ۱۹۴۴ء سے ملازمت کا آغاز ہوا۔ ریاست بھوپال میں محکمہ مالیات میں بحیثیت پیش کار ان کا تقرر ہوا اور چند ماہ بعد محکمہ تعلیم میں مدرس کی حیثیت سے ان کا تبادلہ کر دیا گیا۔ مگر صہبا لکھنوی کی منزل اور تھی۔ انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی اختیار کی تو حکام نے انہیں افکار اور انجمن دونوں سے لاتعلق ہونے کا حکم دیا۔ صہبا نے یہ بہتر جانا کہ ملازمت کو ہی خیرباد کہہ دیا جائے تاکہ "فکر" کی آزادی برقرار رہے۔ صہبا لکھنوی ۱۹۵۰ء میں پاکستان آگئے تھے۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ "ماہ پارے" ۱۹۴۳ء میں منظر عام پر آیا۔ بچوں کے لئے بھی انہوں نے لکھا اور ۱۹۴۴ء میں دس کتابوں کا سیٹ شائع کیا۔ "مجاز ایک آہنگ" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں اور دوسرا ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ مشرقی پاکستان کا سفرنامہ بعنوان "میرے خوابوں کی سرزمین" ۱۹۶۳ء میں اور اقبال پر تحقیق "اقبال اور بھوپال" کے عنوان سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ انہوں نے محترم شبنم رومانی کے تعاون اور اشتراک سے "ارمغان مجنوں" مرتب کی جو ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔ "رئیس امروہوی فن و شخصیت" اور "منٹو ایک کتاب" ۱۹۹۰ء میں مرتب کی۔

کراچی آکر انہوں نے ۱۹۵۱ء سے "افکار" کے اجراء کے دوسرے دور کا آغاز کیا۔ صہبا لکھنوی کا سب سے بڑا کام زندہ مشاہیر پر افکار کے خصوصی نمبروں کی اشاعت ہے۔ صہبا بھائی نے ۱۹۶۱ء سے اس کا آغاز کیا۔ جوش نمبر پہلا ضخیم نمبر تھا۔ پھر سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۶۳ء میں انہوں نے حفیظ جالندھری پر ۱۹۶۵ء میں فیض احمد فیض نمبر ۱۹۷۵ء میں احمد ندیم قاسمی نمبر

۱۹۸۶ء میں اختر حسین رائے پوری نمبر ۱۹۸۹ء میں آذر زوبی نمبر اور ۱۹۹۱ء میں علی سردار جعفری نمبر شائع کئے۔ اس وقت تک کسی مصور پر کوئی نمبر نہیں نکلا تھا مگر "افکار" نے پاکستان کے مایہ ناز مصور محترم آذر زوبی کو خراج محبت پیش کیا... اور صہبا لکھنوی اگر اس پر فخر کرتے ہیں تو یہ بے جا نہیں ہے۔

محترم جمیل الدین عالی "افکار فاؤنڈیشن" کے سرگرم رکن بھی ہیں اور ٹرسٹی بھی۔ ان کی تجویز پر صہبا صاحب نے ۱۹۹۶ء میں افکار کا منتخب افسانہ نمبر منتخب منظومات نمبر اور منتخب مضامین نمبر کی صورت میں تین خصوصی ایڈیشن شائع کئے... یہ وہ پچاس سال کا مطبوعہ انتخاب تھا جو "افکار" میں شائع ہو چکا تھا۔

"افکار" کو یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ وہ بغیر کسی تعطل کے باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ دھان پان سے صہبا لکھنوی سے میرا اکثر سامنا ہوتا تھا جب وہ اپنے "افکار" کے لئے اور میں اپنے ماہنامہ "روپ" کے لئے اشتہارات کے حصول کے لئے نکلتے، صہبا بھائی کے ہاتھ میں ایک بیگ ہوتا تھا۔ انہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ اردو ادیبوں کی کم مائیگی کا احساس کاٹ کاٹ کھاتا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو میں ان کو بھی اور خود کو بھی ایک ٹھنڈے ٹھار عالیشان دفتر تک محدود کر دیتی کہ صرف تخلیقی منصب کے لئے کام کریں مگر ہمارے مقدر میں اپنے جرائد کے لئے ہر ماہ کاغذ کی فراہمی کا مسئلہ بھی رہتا اور دیگر مسائل بھی ذہنی عذاب بنے رہتے۔

ہمارے بعض حکمرانوں کے زمانے میں وہ مجھے محکمہ اطلاعات کے دفتر میں بھی نظر آتے جہاں ہمیں اپنے جرائد کے مواد کو سنسر کرانا ہوتا تھا کہ حکمرانوں نے اسے بھی ہم جیسے ادیبوں صحافیوں کا مقدر بنا دیا تھا باوجود اس کے کہ ہم ایک آزاد ملک کے شہری تھے۔

بات ہو رہی تھی افکار کی باقاعدہ اشاعت کی۔ یہ دسمبر ۱۹۹۹ء کا مہینہ تھا۔ میں دہلی میں تھی اور "گفتنی" (نثر نگاروں کا تذکرۂ اول) کے لئے ادیبوں کے انٹرویوز لینے میں مصروف تھی کہ مجھے محترم رفعت سروش سے فون پر اطلاع ملی کہ "افکار" بند ہو گیا۔ پھر بمبئی میں جب جناب ظفر گورکھپوری سے ملاقات ہوئی تو یہ خوشخبری ملی کہ "افکار" جاری ہو گیا۔ مگر جو ہوا تھا برا ہوا۔ ایسا کیوں ہوا؟ تفصیل طلب سوال ہے مگر ہم سب کی بے اعتنائیوں سے ہی ہوا۔

چنانچہ کراچی آنے کے بعد فوراً ہی میں جنوری ۲۰۰۰ء میں صہبا بھائی سے ملی۔ مجھے "گفتنی" کے لئے بھی ان کا تعارف درکار تھا۔ ان سے ملاقات پر "افکار" کے حوالے سے بھی گفتگو ہوئی۔ انہوں نے بتایا فنڈز ختم ہو گئے تھے۔ اس وقت جمیل الدین عالی صاحب نے بڑا تعاون کیا۔ دس ہزار روپے فنڈ میں جمع کرائے۔ اسی طرح اور احباب نے بھی تعاون کیا روزنامہ "جنگ" کے فورم پر اسی مقصد کے لئے تقریب منعقد کی گئی۔ "افکار" کی پذیرائی کی گئی اور یوں "افکار" کو نئی زندگی ملی۔ اب صہبا بھائی کی سرپرستی میں ان کی

صاحبزادی... اور دیگر احباب کے تعاون سے "افکار" باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

میں نے ان سے گفتنی کے حوالے سے سوالات کئے۔ پہلا سوال تھا۔ "آپ نے بہت سے لوگوں کو شائع کیا ہے آپ کی نظر میں وہ کون لوگ ہیں جو اس صدی میں اردو ادب کے حوالے سے باقی رہ جائیں گے انہوں نے کہا۔ شاعری یا نثر کے حوالے سے مصطفےٰ زیدی' جوش ملیح آبادی' حفیظ جالندھری اور فیض شاعروں میں زندہ رہیں گے جب کہ نثر نگاروں میں انتظار حسین' اشفاق احمد' بانو قدسیہ' ہاجرہ مسرور' شوکت صدیقی' قرۃ العین حیدر کے نام لئے جا سکتے ہیں۔"

"نئے لوگوں میں کچھ نام آپ بتا سکتے ہیں جن سے کچھ اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہوں؟

"انہوں نے سوچ کر کہا۔" ہاں امتیاز ساغر' زاہدہ حنا' امجد اسلام امجد' عطاء الحق قاسمی' امراؤ طارق' فردوس حیدر' آصف فرخی وغیرہ کے نام ہیں۔

"آپ شعر بھی کہتے ہیں پھر آپ نثری نظم کیوں نہیں چھاپتے؟ "میں نثری نظم کو شاعری تسلیم نہیں کرتا یا تو نثر ہوتی ہے یا نظم۔ نثری نظم میرے نزدیک مہمل اصطلاح ہے۔"

"ہائیکو اور ماہیے کے تجربات بھی ہو رہے ہیں کیا آپ انہیں شائع کرتے ہیں؟"

"ماہیے وغیرہ شائع کرتے ہیں تلاثی اور ہائیکو بھی شائع کیے ہیں البتہ ترووینی کو ہم تسلیم نہیں کرتے۔"

میں نے کہا۔ "صہبا صاحب نئے تجربے تو ہوں گے۔ آزاد غزل میں تجربہ ہو رہا ہے نثمانے بھی لکھے گئے ہیں اسی بارے میں فرمایئے۔"

وہ بولے۔ "محسن بھوپالی نے نثمانے لکھے انہیں یہ عنوان ہم ہی نے دیا تھا لیکن ان کے بعد نثمانے کسی نے بھی نہیں کہے۔ اسی طرح حمایت علی شاعر کے بعد تلاثی پر بھی کسی نے کام نہیں کیا۔ کیونکہ یہ تجربات غالباً" لوگوں کو پسند نہیں آئے اگر پسند آتے تو یقیناً" لوگ ان کی تقلید کرتے آزاد غزل کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایک شخص کے بعد کوئی اس طرف نہیں آیا۔"

"ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں شاعروں کے مالی حالات اب بہتر ہیں یا پہلے بہتر تھے کہا جاتا ہے اب بیرونی دورے ہو رہے ہیں پیسے مل رہے ہیں۔" "صہبا صاحب کا جواب تھا۔

"پاکستان میں تو ادب سے ادیبوں کو کچھ نہیں مل رہا ہے دیگر ذرائع سے اگر کچھ آمدنی ہے تو وہ دیگر بات ہے۔"

"اردو کے سلسلے میں آپ کیا کہیں گے۔ کیا پاکستان اور ہندوستان میں اس کا مستقبل محفوظ ہے؟"

"پاکستان میں اردو کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ پندرہ پندرہ سال کی مدت بڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ قومی زبان ہوتے ہوئے سرکاری زبان

نہیں بناتے جو بھی نیا حکمران آتا ہے وہ اس کے نفاذ کی مدت بڑھا دیتا ہے۔"

میرا اگلا سوال تھا ہمارے ادیب جو بعض اوقات بااختیار بھی ہیں کیا اس کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتے کیا انہیں اردو زبان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے؟

انہوں نے کہا۔ "کوئی کوشش نہیں کرتے اگرچہ لگاؤ ہے۔ انفرادی طور پر انعامات مل رہے ہیں۔ پانچ لاکھ روپے قاسمی صاحب کو ملے پانچ لاکھ روپے انتظار حسین کو ملے اشفاق صاحب کو ملے۔

میں نے کہا کہ "ان انعامات کے بارے میں باہر یہی کہا جاتا ہے کہ یہ P.R یا تعلقات عامہ کی بناء پر ملتے ہیں مجھے ہندوستان کے ادیبوں نے بھی لکھا ہے اور پاکستان کے ادیبوں نے بھی لکھا ہے کہ یہ انعامات تعلقات کی بنا پر ملتے ہیں آپ کی کیا رائے ہے؟

صہبا صاحب نے کہا۔ "بالکل یہی بات ہے انعامات تعلقات کی بنیاد پر ہی ملتے ہیں۔ اس طرح نئے ادیبوں کے لئے کوئی اچھی صورتحال دکھائی نہیں دیتی کوئی رہنمائی نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا۔ "آپ ایک پرچے کے مدیر ہیں۔ یہ فرمایئے کہ آج کل جو تنقید ہو رہی ہے کیا اس سے ہمارے نئے ادیبوں کی رہنمائی ہو رہی ہے؟

ان کا جواب تھا۔ "کوئی رہنمائی نہیں ہو رہی۔ تنقید اب تعریف اور تحسین میں تبدیل ہو گئی ہے صرف تعریف کی جا رہی ہے۔"

مشاعروں کے موضوع پر گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا۔ مشاعرے زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں پیسے ملتے ہیں شاعروں کو پانچ ہزار دس ہزار روپے مل جاتے ہیں۔

میں نے انہیں بتایا کہ جو گندرپال صاحب تجربہ کر رہے ہیں اور چھوٹے افسانے لکھ رہے ہیں تو مختصر افسانوں کا رواج ہو تو نثری نشستیں بھی ہو سکتی ہیں آپ کے خیال میں یہ کوشش کامیابی سے ہم کنار ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کہا۔ "ہاں تجربہ کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ جہاں اور تجربات ہو رہے ہیں وہاں یہ بھی سہی تاہم جب کرشن چندر زندہ تھے تو افسانے پڑھنے کا رواج زیادہ تھا کرشن، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، غلام عباس وغیرہ افسانے پڑھنے جاتے تھے اور ایک ایک لاکھ کا مجمع افسانے سنتا تھا مشاعرہ کی طرح افسانوں کی نشست کا رواج بھی پڑ گیا تھا اور بہت کامیاب رہا تھا اور عوام میں بے حد مقبول بھی تھا۔"

"اب ایسا رجحان کیوں نہیں رہا کیا لوگوں کا ذوق کم ہو گیا ہے؟" "اب ایسے افسانے ہی کہاں لکھے جا رہے ہیں۔ پھر مطالعے اور تعلیم کا فقدان ہے اسی وجہ سے اردو نثر ہو یا نظم ادب میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا ہے اگرچہ یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ طلبہ میں ادبی شعور پیدا کریں اور جس میں صلاحیت اور Talent دیکھیں اسے آگے بڑھائیں اور ایسی ادبی سرگرمیاں کریں جس سے اردو ادب زندہ رہے ورنہ تو ادب کا دور ہی ختم ہو جائے گا کیونکہ

دور حاضر میں کوئی بہت اچھا ادب کہیں تخلیق نہیں پا رہا ہے۔" وہ لمحے بھر کو رک کے پھر بولے۔
"اس میں ادب کے اساتذہ کا بھی یقیناً" قصور ہے وہ پورا وقت نہیں دیتے اب اسے کیا کہا جائے۔"

وقت کی کمی بھی ایک مسئلہ ہے۔ میں نے کہا تھا۔ صہبا صاحب نے کہا۔ "نہیں لگن کی کمی ہے وقت تو پھر بھی مل سکتا ہے اور آج طالب علم مطالعہ بھی نہیں کرتے۔ حالانکہ آج ٹی وی پر ادبی پروگرام "ادبی منظر" پیش کیا جاتا ہے لیکن اس کا تاثر ہی نہیں بن پاتا ہے۔"

"گویا ادبی منظر میں کچھ تبدیلیاں ہونی چاہئیں آپ کے خیال میں کس قسم کی تبدیلیاں سود مند ہو سکتی ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "نئے لوگوں کو سامنے لایا جائے پروگرام دلچسپ بنایا جائے تو مشاعرے کی طرح لوگ اسے بھی دلچسپی سے دیکھیں گے۔ مختصر افسانے پر سیمینار بھی ہو سکتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "یہ کام تو مقتدرہ قومی زبان اور اکیڈمیاں بھی کر سکتی ہیں!"

"مقتدرہ نمائشی ہے صرف کتابیں چھاپ رہا ہے اصطلاحات کی 200 یا 250 کتابیں چھپ چکی ہیں اب تک حالانکہ دیگر ادبی کام بھی اسے کرنا چاہئیں۔ جس کام کے لئے مقتدرہ بنا ہے یعنی نفاذ اردو اس کام کو انہیں فوراً" کرنا چاہئے۔ حالانکہ مقتدرہ کے علاوہ یہاں اکیڈمی آف لیٹرز بھی ہے۔ اس کے تحت انعامات دیتے ہیں۔ جب کہ یہ کوئی ادبی رسالہ بھی نکال سکتے ہیں۔ صرف ایک رسالہ نکال کر رہ گئے سیمینار وغیرہ کرانے چاہئیں۔"

گفتگو خاصی ہو چکی تھی آخر میں انہوں نے کہا "افکار" کے تمام کرم فرماؤں کا شکر گذار ہوں جن کے تعاون سے "افکار" کے حالات بہتر ہوئے۔

SEHBA LAKHNAVI
1002 P.I.B. COLONY
KARACHI - 74800 PAKISTAN

بارے دنیا میں رہو، غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو
(میر)
طلعت سلیم ۱۱ نومبر ۱۹۹۹ء

طلعت سلیم
برمنگھم

کبھی کبھی کسی کسی دن کا سورج کتنا مہربان ہوتا ہے کہ آب و تاب سے طلوع ہوتا ہے اور سوا نیزے پر پہنچ جانے کے باوجود ایسی ٹھنڈک دے جاتا ہے کہ ماضی میں کی گئی "محنتوں" کا حساب آپ ہی آپ بے باق ہو جاتا ہے۔

ایسی ہی ایک "صبح" تھی جب مجھے لندن سے طلعت سلیم کا خط ملا۔ گفتنی کے لئے تعارف بھی ساتھ تھا۔ جس طرح اور ادیبوں کو سوال نامہ بھیجا تھا طلعت تک بھی سوال نامہ پہنچا۔ مگر جب طلعت کا جواب آیا تو اس کا خط میرے لئے خوشیوں کے ساتھ فخر اور قدر شناسی کے جذبات سے بھرپور اعزاز بھی ساتھ لایا۔ میں یہ سوچ کر اپنے آپ پر ناز کروں کہ میں نے ۱۹۶۵ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک اس کی نصف صدی میں روزنامہ انجام اور روزنامہ جنگ کراچی کے خواتین کے صفحات کے ذریعے (جن کی میں مدیرہ رہی) بہت سی شاعرات' افسانہ نگار اور صحافی لڑکیوں کی ایسی ذہنی تربیت کی کہ کل کی وہ نو آموز آج کی مایہ ناز شاعرات' افسانہ نگار اور صحافی ہیں اور جس طرح انہیں ان میدانوں میں کامیابی اور سرخ روئی حاصل ہوئی ہے اسی

طرح میں بھی خدا کے حضور سر جھکا کر شکر ادا کر کے اپنی ذات پر فخر کرنے میں حق بجانب ہوں کہ اس نے مجھے میرے حصے کا علم کا چراغ جلانے کی توفیق عطا کی اور میں بھی اس کے حضور سرخ رو رہی۔"

بہت سی لڑکیاں تھیں جن کی میں ان دیکھی سلطانہ باجی تھی۔ ان دنوں کے خواتین کے صفحات بلاشبہ اپنی ذات میں ایک ادارہ، ایک انسٹی ٹیوشن ہوا کرتے تھے۔ ہر اتوار کو صفحہ خواتین کی ایسی محفل جمتی تھی کہ اگلی اتوار تک اس محفل کا خواتین اور اسکول کالج اور جامعات کی طالبات کو بے قراری سے انتظار رہتا تھا۔ میں نے یکم جولائی ۱۹۶۵ء سے روزنامہ انجام کراچی میں صفحہ خواتین جس کا نام "بنت حوا" تھا اس کی ادارت سنبھالی تھی۔ میرے اس وقت کے ایڈیٹر طفیل احمد جمالی (مرحوم) اور پھر ابراہیم جلیس (مرحوم) میری تحریروں کی سلیقگی کے گن گاتے تھے۔ وہ صفحہ اتنا مقبول ہو چلا کہ اس کی روز افزوں بڑھتی ہوئی ڈاک اور صفحے کی مقبولیت کی خبر سے متاثر ہو کر محترم خلیل الرحمٰن (مرحوم) نے روزنامہ جنگ کراچی کے صفحہ خواتین کی ادارت کی ذمہ داری مجھے سونپتے ہوئے خوشی محسوس کی۔ میں نے انجام کیوں چھوڑا اور پھر بارہ سال تک جنگ میں صفحہ خواتین کی ادارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے بالکل اچانک استعفیٰ دے کر اس فرض سے سبکدوشی کیوں حاصل کی یہ ایک طویل کہانی ہے اور اس کا ذکر پھر کبھی سہی۔

سردست طلعت سلیم کا ذکر ہو جائے جن کے خط نے ان خوب صورت اور یادگار دنوں کی یادوں کو زندۂ جاوید کر دیا۔ طلعت اب تک وہ کتاب سنبھالے ہوئے ہیں جس پر ان کے نام میں نے چند سطریں لکھی تھیں... طلعت کے ۱۱ نومبر ۹۹ء کے خط سے چند سطریں ملاحظہ ہوں

"آپ سے مجھے بڑا پرانا تعارف حاصل ہے۔ ۶۵ء میں آپ روزنامہ "انجام" کراچی کے "بنت حوا" سیکشن کی انچارج تھیں تا جب آپ نے ایک ادبی انعامی مقابلہ کے تحت مجھے چند کتابیں بھیجی تھیں۔ "میگھ ملہار (مصنفہ ممتاز شیریں) اب بھی میرے پاس ہے۔ آپ کی خوبصورت تحریر میں لکھا ہے اس پر محترمہ طلعت پروین درانی صاحبہ کی خدمت میں بہترین خواہشات کے ساتھ بہ سلسلہ ادبی انعامی مقابلہ ماہ مارچ ۱۹۶۵ء از طرف "بنت حوا" روزنامہ انجام کراچی۔ سلطانہ مہر ۲ اپریل ۶۵ء۔ آپ کے اس انعام نے مجھے کس قدر خوشی بخشی تھی آپ کیا جانیں مضمون جس پر انعام ملا اس کا ذکر میں نے "راوی" کے لئے اپنے بارے میں لکھتے ہوئے کیا ہے۔ آپ پڑھیں گی تو لطف آئے گا آپ کو..."

اور اس خط میں طلعت نے ایک اور خوش خبری بھی دی ہے کہ اسے ۹ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو "بزم اردو اسکاٹ لینڈ" کے مختصر کہانی مقابلہ میں کہانی "ایک آئینہ ٹوٹ جانے سے" پر پہلا انعام ملا ہے۔ (ضیاء الدین کو دوسرا اور عطیہ خان کو تیسرا انعام ملا ہے)۔ ان تینوں افسانوں

نویسوں کا تعارف گفتنی میں شامل ہے) میرے لئے یہ اطلاع دوہری خوشی کا باعث ہے۔ کل کی طلعت درانی اور آج کی طلعت سلیم کو میری طرف سے دلی مبارکباد۔

طلعت نے تعارف کے ساتھ اپنا کلام بھی بھیجا ہے۔ سونے پر سہاگہ والی بات ہے کہ طلعت شعر بھی کہتی ہیں اور بہت اچھے شعر کہتی ہیں۔ شاعری میں ان کے استاد محترم رئیس امروہوی (مرحوم) تھے۔ ان کی ایک نظم سے چند مصرعے دیکھئے۔

بہت پہلے
میرے گلشن کے اک پودے کی ٹہنی پر
بہت پیاری سی' اک ننھی حسیں چڑیا
کہیں سے آن بیٹھی تھی
پروں کے درمیاں اس کے بندھا تھا ریشمی دھاگے سے اک پرزہ
اسے جب کھول کر دیکھا تو لکھا تھا
یہاں چند دن بسیرا کر کے اس کو
اک نئے گلشن میں جانا ہے' یہ مہماں ہے

پھر مصنفہ نے یعنی اک ماں نے اس نظم میں یہ دعا بھی دی۔

خداوندا! مری ننھی حسیں معصوم سی چڑیا
جہاں' جس شہر میں جس باغ میں جائے
وہاں ہر سو' ہر اک لمحہ سدا خوشیوں کی بارش ہو
وہاں جس پیڑ پر ہو آشیاں اس کا
الٰہی! اس کی ساری ٹہنیاں پھولوں سے بھر دینا
وہاں کی گھاس کو' بیلوں کو' سارے پھول بوٹوں کو
سدا باران رحمت سے ہرا رکھنا' بھرا رکھنا
خزاں نا آشنا رکھنا

ادھر دس پندرہ سال سے طلعت سلیم نعتیں کہنے لگی ہیں اور اب زیادہ تر نعتیں ہی کہتی ہیں۔ میں نے طلعت کی کئی پابند اور آزاد نعتیں پڑھیں اور میرے دل پر ان کے اشعار نقش ہوتے چلے گئے۔ ان کی ایک نعت سے چند مصرعے پیش ہیں۔

الٰہی کیا تھا جو پیدا میں صدیوں پیش تر ہوتی
مری آنکھوں کو آقاؐ کی زیارت سے مشرف بار ہونے کا
کوئی امکان تو ہوتا
مرے دل میں خیال آتا ہے مکے کے کسی کوچے کی شاید میں مکیں ہوتی

کہ آگاہی کی بستی میں کہیں میرا بھی گھر ہوتا
میں سو سو بار خود پہ رشک کرتی جب مری تقدیر مجھ پہ مہرباں ہوتی

اب طلعت سے بھی کچھ گفتگو ہو جائے کہ وہ اپنے ادبی سفر میں کن مراحل سے گزریں۔

طلعت پروین درانی نے ۲۹ مئی ۱۹۴۵ء کو پاکستان کے شہر گجرات (پنجاب) میں جنم لیا۔ یہ سوہنی کا شہر ہونے کی وجہ سے بھی شہرت کا حامل ہے۔ طلعت کی ابتدائی تعلیم راولپنڈی' بنوں اور لاہور میں ہوئی۔ کوئٹہ سے بی۔اے کیا اور پھر جامعہ کراچی سے اردو میں ایم۔اے کر رہی تھیں کہ امتحان سے دس دن قبل سلیم جاوید کی شریک سفر اور شریک حیات بن کر ۱۹۶۷ء میں لندن آ گئیں۔ ۱۹۸۶ء سے مختلف اسکولوں میں اردو کی تدریس شروع کی۔ اب پچھلے دس برس سے ساؤتھ برمنگھم کالج میں اردو پڑھا رہی ہیں۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ "یا نبیؐ یا نبیؐ یا نبیؐ" کے عنوان سے زیر اشاعت ہے۔ طلعت پڑھنے لکھنے کی ہمیشہ سے شیدائی تھیں۔ زیادہ تر مضامین اور ہلکے پھلکے افسانے لکھا کرتی تھیں۔ تحریر میں پختگی تھی اور دل میں لگن کہ یہ رفتہ رفتہ ان تحریروں میں نکھار آنے لگا۔ ایک انعام ہماری جانب سے وصولنے کا قصہ تو آپ کی نظر سے گزر ہی چکا ہے اس انعام کے حصول سے ایک دلچسپ قصہ بھی وابستہ ہے۔ طلعت بتا رہی ہیں کہ "ایک دن مزے کی بات ہوئی۔ میں مچھلی تلنے کی بجائے ایک انعامی مضمون لکھنے بیٹھ گئی۔ اماں جان کی ڈانٹ ڈپٹ کان میں پڑی تو یہ سوچ کر کہ موضوع کی قید تو ہے نہیں کیوں نہ دل کی بھڑاس نکالوں کہ ہانڈی روٹی سیکھنے کی ضرورت کو لڑکیوں کے فطری و قلبی رجحان پر حاوی کرنا زیادتی ہے۔ اماں جان کے کانوں میں بھنک پڑی تو بولیں۔ دیکھنا کیسے منہ پر مارے گا ایڈیٹر۔ جب کہ ہوا اس کے برعکس۔ وہ خاتون ایڈیٹر تھیں۔ مضمون کی واپسی کی بجائے انہوں نے کتابوں کا پارسل انعام میں بھیجا اور تعریفی خط اس پر مستزاد جس نے اپنا یقین اس بات پر اور پختہ کر دیا کہ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

سوال نمبر ۲ کے جواب میں انہوں نے محشر بدایونی کا شعر سنایا۔

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

پھر بھی ان کا خیال ہے۔ قرۃ العین حیدر' احمد ندیم قاسمی' عصمت چغتائی اور منٹو کے نام باقی رہ جانے والے ہیں۔

۳۔ طلعت کہہ رہی تھیں جدیدیت نے فکشن کو ہمارے آس پاس بکھری ہوئی سچائیوں سے ہمکنار کر کے' اس میں جیتی جاگتی زندگی کی توانائی' حرارت' رعنائی اور بوقلمونی پیدا کی۔ ہاں! جدیدیت کے نام پر روایت سے نفرت اور لفظ و بیان کی کسی بھی پابندی کو قبول نہ کرنا ایسا رویہ ہے جس کے تحت بالکل سمجھ میں نہ آنے والی تحریریں جنم لیتی ہیں۔ حد سے بڑھی ہوئی

اشاریت' ابہام' رمزیت اور من مانی' دور از کار علامات کا بے تحاشا استعمال فکشن کو حسن بخشنے کی بجائے اسے نفسیاتی گورکھ دھندا سا بنا کر رکھ دیتا ہے۔

۴۔ آج کی تیز رفتار زندگی اور اس سے وابستہ گوناگوں مصروفیات کے چکر۔ اس میں کچھ حصہ تن آسانی کا بھی ہے۔ اچھا ناول دنوں' مہینوں نہیں برسوں میں لکھا جاتا ہے۔

۵۔ موجودہ دور بہت سی اقدار کی توڑ پھوڑ کا دور ہے۔ ادیب اور شاعر اس آشوب کو عام لوگوں کی نسبت زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ جنگ آزادی سے لے کر قیام پاکستان تک اپنے وقت کے بڑے شعرا ادبا نے بتایا اور دکھایا کہ وقت کی یورش کے سامنے اپنے نظریات پر کیسے جم کر کھڑے ہوتے ہیں انہیں سچ کی ترجمانی اور سچ کی پاسداری میں زخم کھاتے اور اپنا آپ گنواتے دیکھ کر دوسروں کا حوصلہ بڑھتا رہا اب بھی ہمیں ضرورت ہے ان جیسوں کی اور رہا نظام فکر' تو اسے ڈھونڈنا کیسا وہ تو چودہ سو سال سے ہمارے سامنے ہے بات تو اسے اپنا کر کیا کیا کچھ سہنے کی ہے۔

۶۔ معیاری ادب کے پیمانوں کا تعین نقاد کرتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کے لئے پیمانہ انہیں کتنی دیر میں میسر ہوا۔

۷۔ اس کا سبب وقت کی کمی ہے۔ زندگی کی تیز رفتاری' موضوعات کی کمی تو میں نہیں سمجھتی۔ شاعر ادیب کی نظر تو ہر شے میں کوئی نہ کوئی بات ڈھونڈ ہی لیتی ہے پھر یہاں مشاعروں کی طرز پر' نثر پاروں کی محفلیں بھی تو نہیں ہوتیں۔

۸۔ ہم انگریزی کے الفاظ کو اردو کے قالب میں ڈھال کر اپنا سکتے ہیں۔ جوں کے توں شامل کرتے جائیں تو ان الفاظ کی بہتات تو اس کا حلیہ بگاڑ دے گی۔ جہاں ترجمہ ہو سکتا ہے کر لیں جہاں ترجمے کی شکل میں بے حد نامانوس اور دشوار سے لفظ بنتے ہوں وہاں اردو کے قالب میں ڈھال لینا اچھا رہتا ہے اس طرح وہ لفظ ہمارا ہو جاتا ہے۔

۹۔ آج کل تنقید ہے تو سہی مگر اسے توصیفی تنقید کہا جائے تو بہتر ہے۔ تنقید کے مقصد کے تحت ادب پارے کے حسن و قبح کو واضح کر کے قاری کو بتایا جائے کہ کون سی شے معیاری ہے کون سی غیر معیاری۔ آج کل تو لگتا ہے نقاد کا پہلا منصب یہ دیکھنا ہے کہ تحریر کا خالق کون ہے؟ پھر اس میں مغربی حوالوں' اصطلاحوں کی تکرار اور بھرمار دیکھ کر تنقید نگار کی قابلیت یا دوسرے لفظوں میں مغربی ادب کے وسیع مطالعہ کی دھاک تو قاری کے دل پر بیٹھ جاتی ہے چاہے کچھ پلے پڑے یا نہ پڑے۔

تراجم کی رفتار کا کم ہوتے جانا بلاشبہ ہماری زبان کے حق میں اچھا نہیں۔ اس سے شعر و ادب کی دنیا میں رنگا رنگی بڑھتی ہے' دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھے ہوئے شہ پارے ترجمہ ہو کر سامنے آتے ہیں تو ان کا قاری کے لئے جنت نگاہ اور فردوس گوش بننا تو ایک بات ہے دوسری

طرف لکھنے والوں کے قلب و ذہن میں کشادگی پیدا ہوتی ہے' نئی نئی باتیں' نئے طریق اظہار' نئے افکار سامنے آتے ہیں۔

علاقائی زبانوں کی رنگا رنگی تو ایک دولت ہے۔ ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی ہونی چاہیے اس سے اردو کا دامن مالا مال ہوگا۔

MRS TALAT SALEEM
48 HARTON WAY
KINGS HEATH
BHANE B14 6P F U.K.

زندگی میں خوشی اور مسرت کے لمحے بہت مختصر ہوتے ہیں،
کاش، کوئی ایسا سسٹم یا طریقہ ہوتا، جو ان لمحوں کو کسی
کیسٹ یا ڈسک میں قید کر لیتا۔
پھر... جب جی چاہے ری وائنڈ کر کے ان لمحوں کو
دوبارہ پایا جا سکتا... کاش... ایسا ہو سکتا!!
طٰہٰ آفندی

طٰہٰ آفندی

بحرین

ادب کی تعریف کرتے ہوئے پاکستان کے نامور نقاد و محقق جناب ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا تھا کہ ادب پوری تہذیب اور پورے کلچر کو اس سطح پر دیکھتا، سمیٹتا اور اس کو استعمال کرتا ہے جہاں اس کا تعلق زندگی اور اس کے عوامل سے جڑ جاتا ہے۔ ادیب کسی "پارٹی لائن" کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ کسی نظریے، کسی آدرش، کسی خواب سے وابستہ تو ہو سکتا ہے لیکن اسے کسی پارٹی کا پابند نہیں ہونا چاہئے۔ ادیب جو کچھ سوچے، جو کچھ دیکھے، جس تجربے سے گزرے، زندگی جس زاویے یا جس طرح اس کے سامنے آئے اسے چاہئے کہ آزادی اور اعتماد کے ساتھ بہترین و پراثر انداز میں اسے پیش کردے، یہی ادب ہے۔ زندگی سے براہ راست تعلق رکھے بغیر زندہ ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔

سید محمد طٰہٰ آفندی جو ادبی دنیا میں طٰہٰ آفندی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ادب کی اس تعریف سے متفق ہیں۔ اب تک انہوں نے بے شمار افسانے اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے تراجم بھی ہو چکے ہیں اور منتخب افسانوں میں ان کے افسانوں کو شامل کیا گیا ہے۔

طٰہٰ آفندی 7 مئی 1945ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کی عمر میں میٹرک کیا اور

ساڑھے سولہ سال کی عمر میں "نیوی بوائے" کی حیثیت سے انڈین نیوی سے وابستہ ہو گئے۔ نیوی کی فضائی شاخ سے منسلک ہو کر انہوں نے سولہ سال گزار دیئے۔ نیوی چھوڑنے کے بعد ایک سال تک مائننگ کارپوریشن آف آندھرا پردیش میں سیکوریٹی افسر رہے۔ پھر بہتر روزگار کی تلاش میں خلیجی ریاست بحرین کا رخ کیا اور اب تک بحرین پولیس کی فضائی شاخ Flaying Wing Division میں ہیلی کاپٹر انجینئر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ظ آفندی شعر کہتے ہیں مگر مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے۔ انہوں نے بتایا ان کی پہلی منظوم تحریر چودہ سال کی عمر میں ہائی اسکول کے میگزین میں شائع ہوئی تھی جس کے دو شعر کچھ یوں تھے۔

محبت میں ایسے مقامات آئے
کہ خود ہی وہ بہر ملاقات آئے

نہ تھا کوئی قاصد شب ہجر میرا
مگر پھر بھی ان کے پیامات آئے

اس کے بعد مقامی روزنامے "رہنمائے دکن" میں "بچوں کے صفحے" پر ان کی بے شمار کہانیاں شائع ہوئیں۔ پھر لکھنے کا سلسلہ قائم نہ رہا اور نیوی کی ملازمت کے دوران لگ بھگ نو دس سال تک تعطل رہا۔ اس کے بعد پھر طبیعت لکھنے کی طرف راغب ہوئی۔ ہند و پاک کے لگ بھگ تیس سے زائد ماہناموں اور ڈائجسٹوں میں ان کی تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے ریڈیو کے لئے ڈرامے بھی لکھے، جو نشر ہونے کے ساتھ ساتھ شائع بھی ہوئے۔

اسٹار پبلی کیشنز (دہلی) نے ایک ناول "دہشت کا سفر" شائع کیا۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "نقش حیات" اردو اکادمی آندھرا پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہو چکا ہے۔

گفتنی کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا میں خود جن ادیبوں سے متاثر ہوں، ان میں قابل ذکر کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس، ابن صفی اور رام لعل ہیں اور یقین ہے کہ انہی کے نام اردو ادب میں باقی رہیں گے۔

فکشن یقینی طور پر ایک لطیف آرٹ ہے، جدیدیت نے اس کے حسن کو نکھارنے کے بجائے نقصان ہی پہنچایا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ اپنا تاثر کھو رہا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اردو ادب میں ناول بہت کم لکھے گئے، کئی وجوہات بیان کی جا سکتی ہیں۔

میری رائے میں ناول نگار کے پاس وقت کی کمی ہے کیونکہ وہ حصول روزگار میں الجھا رہتا ہے۔ اس سے ہٹ کر ناول کے قاری بھی کم رہ گئے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیم، پرنٹ میڈیم پر بہت زیادہ حاوی ہو گیا ہے۔ ادبی رسائل دم توڑ رہے ہیں۔ پڑھنے کے بجائے لوگ ٹی وی سے چپکے رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور جب پڑھنے والے کے پاس ہی وقت نہ ہو تو کوئی کیا لکھے گا؟ اور کون چھاپے گا؟

یہ سچ ہے کہ آج کا شاعر یا ادیب، ذہنی طور پر منتشر ہے۔ اس کی اہم وجہ ایک مرتبہ پھر دوہرانا پسند کروں گا۔ بیشتر ادیب معاشی بحران کا شکار ہیں۔ تخیل کی دنیا سے باہر آنا نہیں چاہتے۔ یہ بات ہر اردو لکھنے والا جانتا ہے کہ شاعری یا نثرنگاری سے مالی فوائد ممکن نہیں، جن سے گھر کے اخراجات پورے کئے جاسکیں۔ میرے خیال میں ان کی رہنمائی اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ شاعر یا ادیب صرف قلم پر بھروسہ کرنے کے بجائے بہتر تعلیم یا کوئی ہنر سیکھیں، اردو ادب کو روزگار سے نہ جوڑ لیں تب ہی شاید بہتر ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے۔

میں اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ اردو میں انگریزی زبان کے الفاظ کی شمولیت سے گریز کیا جارہا ہے بلکہ اظہار خیال کے لئے انگریزی کچھ زیادہ ہی استعمال ہو رہی ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ تو قصہ پارینہ لگتے ہیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس طرح اردو زبان کی ترقی رک جائے گی بلکہ پاک و ہند سے باہر اردو کی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں۔ کام ضرور ہو رہا ہے مگر رفتار دھیمی ہے۔

میری زندگی کا اہم واقعہ جسے آپ شاید اہمیت نہ دیں مگر میرے لئے دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔

ہوا یوں کہ میرا لکھا ہوا ایک ڈرامہ "واسکوڈی گاما" ریڈیو سے نشر ہوا تھا۔ ڈرامے کے معاوضے کا چیک لے کر جب میں بینک پہنچا تو وہیں ایک خوبصورت لڑکی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ بھی ریڈیو اسٹیشن کا چیک کیش کرانے آئی تھی۔ چیک جمع کراتے وقت اس نے مجھ سے پوچھا تھا "کیا آپ بھی ریڈیو آرٹسٹ ہیں اور ڈراموں میں کام کرتے ہیں؟" میں نے صرف انکار میں سر ہلایا اور اس سے پوچھا کہ وہ کیا کرتی ہیں۔ تب اس نے بتایا۔ وہ ایک ریڈیو آرٹسٹ ہے ڈرامہ "واسکوڈی گاما" میں رول کرنے کا معاوضہ کیش کرانے آئی ہے۔

میں نے پوچھا "کیا آپ اس ڈرامانگار سے ملی ہیں؟" اس نے انکار میں جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ "سنا ہے کوئی ملا ٹائپ شخص ہے جو لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتا یا پھر کسی complex کا شکار ہے۔"

اس واقعہ کو گزرے لگ بھگ بیس سال ہو چکے ہیں۔ وہ دن ہے اور آج کا دن گمنامی پسند کرتا ہوں۔ لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہیں کرنے دیں۔ مزہ آتا ہے۔ اوٹ پٹانگ تبصرے سن کر۔

MR. TAHA AFANDI
FLYING WING DIVISION
P.O. BOX NO. 13 MANAMA
BAHRAIN (A.G)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

پشاور پاکستان

پروفیسر محمد حسن عسکری (مرحوم) جید عالم تھے۔ انہوں نے اردو ادب اور شاعری کے مستقبل پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "وہ لوگ اس سلسلے میں نمایاں کردار ادا کریں گے جو کل وقتی ادیب نہیں ہوں گے۔ ان کی اس بات کا اس وقت پیشہ ورانہ ادیبوں نے خوب مذاق اڑایا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کی بات درست ہوتی چلی گئی۔ ان کا تجزیہ غلط نہ تھا۔ اردو ادب اور شاعری کا کسی رخ سے جائزہ لیجئے اس میں ہمہ وقتی لوگ قد آور ادیب دکھائی نہیں دیتے لیکن میں سوچتی ہوں کیا انہیں ہمہ وقتی اور کل وقتی نہیں کہا جائے گا جنہوں نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد خود کو ادب کی تخلیق کے لیے وقف کر دیا ہے۔ یہ بھی درست کہ زود نویسی کے باعث کتابوں کے ڈھیر لگا دینے کے قطعی یہ معنی بھی نہیں کہ ان کا لکھا آج نہ سہی مستقبل میں "مستند" کے زمرے میں بھی آ سکتا ہے۔ دراصل کسی بھی ادیب کی کامیابی کی گواہی اس کے قارئین سے ملتی ہے آپ کوئی ذریعہ اظہار اختیار کیجئے چاہے نثر ہو یا نظم۔

لیکن ہم نے دیکھا تو ہے کہ شعری مجموعوں کے قارئین زیادہ ہوتے ہیں کیوں کہ نثر کے

مقابلے میں شعری مجموعوں کے کئی کئی ایڈیشن طبع ہوتے ہیں اور فروخت ہو جاتے ہیں۔

لیکن پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نثر لکھنے کے باوجود اپنے قارئین میں مقبول ہیں کہ اب تک ان کی ۲۱ کتابیں چھپ چکی ہیں اور سولہ کتابیں زیر اشاعت ہیں۔ ان کا تعارف کراتے ہوئے "ادارۂ علم و فن پاکستان" کے صدر کرنل عنایت اللہ خان کہتے ہیں۔ ایم اے اردو' انگریزی' پولیٹیکل سائنس' ایم ایس (انٹرنیشنل ریلیشنز (امریکہ) پی ایچ ڈی سنٹرل ایشین سٹڈیز' یونائیٹڈ نیشنز انٹرن شپ (نیویارک) سیکریٹری جنرل تھرڈ ورلڈ ایجوکیشن فورم اور ادارہ علم و فن' ممبر APSA (امریکہ) ممبر UN رائٹرز ایسوسی ایشن (نیویارک) یہ ہیں ہمارے دوست پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان جن کی زندگی علم و ادب اور تحریر و تقریر سے عبارت ہے۔

لکھنا پڑھنا اور چونکھی لڑنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اتنا زود رنج اور زود نویس آدمی ہم نے نہیں دیکھا۔ لکھ لکھ کر کشتوں کے پشتے لگا دیے ہیں۔ ادب' علم' صحافت' سیاست' کالم نویسی' خاکہ نگاری' سفرنامہ نگاری' بین الاقوامی امور' اقبالیات غرض کسی موضوع کو انہوں نے چھوڑا نہیں ہے۔ اردو انگریزی دونوں میں رواں ہیں۔ لگتا ہے امریکہ سے کتابیں لکھنے کا کوئی کورس کر کے آئے ہیں۔ قلم میں غضب کی کاٹ ہے۔ ذو معنی جملے لکھنے کے ماہر ہیں۔ تحریر میں ادبی شان پائی جاتی ہے۔ علم کے ساتھ ادبیت مل کر ان کے اسلوب کو مزید نکھار دیتی ہے۔ استاد' صحافی' دانشور' ادیب پتہ نہیں کیا کچھ ہیں۔ کچھ ہی عرصے میں انہوں نے مضامین نو کے انبار لگا دیے ہیں۔

ان کے ادبی خاکوں کی کتاب "سب دوست ہمارے" کو اباسین ادبی ایوارڈ اور گولڈ میڈل بھی ملا ہے۔ دو اقبال' نذر نظیر خسرو' غالب و فیض کے نام سے ادبی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ دو سفرنامے "دیکھ کبیرا رویا" اور "امریکہ نامہ" منظرعام پر آچکے ہیں۔ ترکی ادب و ثقافت پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ کالموں کے دو مجموعے کالم اور بیکار مباش' سیاسی و سماجی مضامین کا مجموعہ دو پاکستان' ادبی کتابیں "اقبال و علی شر۔عتی" "اقبال و افغانستان" "اقبال و افغان شخصیات" "اقبال و افغان شناسی" اور اقبال و ادب سرحد کے عنوانات سے تکمیل کے مختلف مراحل میں ہیں۔ ایک انگریزی کتاب کشمیر انتفادہ بھی چھپ چکی ہے۔ صاحب طرز ادیب ڈاکٹر ظہور اعوان صوبہ سرحد کی نثری ادب کی ایک پہچان بن کر ظاہر ہوئے ہیں۔ ان کی تحریر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی تحریر میں خود موجود ہیں۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان ۴ جنوری ۱۹۴۲ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر ایم اے اور پی ایچ ڈی تک انہوں نے پشاور میں حاصل کی۔ ایم ایس بین الاقوامی امور امریکہ سے ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۲ء میں کیا۔ امریکا کینیڈا' لندن اور بھارت کے سفر کیے اور سفرنامے لکھے۔

ان کا کہنا ہے کہ فکشن ایک لطیف آرٹ ہے مگر جدیدیت نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اسے ابہام، تجرید اور تجربات کی زد میں لا کر ابلاغ سے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیوں کے لکھے ہوئے فکشن کو ادب میں کوئی پذیرائی نہیں ملی۔ اس کی مقبولیت کے لیے ایک حساس، درد مند اور تاثیر میں ڈوبا ہوا قلم کار بھی چاہیے جو قاری کے احساس کو چھو سکے۔

پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کہتے ہیں "بیسویں صدی ادب کے حوالے سے ایک بھرپور زرخیز صدی کہلا سکتی ہے۔ اس میں اقبال، فیض، فراز، جوش، احمد ندیم قاسمی، منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، نیاز فتح پوری، عصمت چغتائی، عبداللہ حسین، ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب جیسے لوگوں کے نام زندہ رہ جانے والے ہیں۔

انہوں نے کہا موجودہ صدی میں اردو ادب میں بہت کم ناول لکھے گئے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ تو قاری کی عدم دلچسپی ہے۔ زندگی کی گہما گہمی اور ذرائع ابلاغ میڈیا کے بڑھنے نے بھی اس صنف ادب پر اثر ڈالا ہے۔ اب قارئین کے پاس وقت کی کمی ہے۔ وہ ناول کے ذریعے اپنے اردگرد کی زندگی سے آگاہ ہونے کے بجائے ذرائع پر انحصار کرنے لگے ہیں۔ اگرچہ انسان ازل سے کہانی کا رسیا ہے لیکن اس کا یہ شوق بھی سفرنامے کی صورت میں پورا ہو رہا ہے۔ آج کے سفرنامے میں کہانی پن کو خاص مقام حاصل ہو گیا ہے اور اسی وجہ سے قارئین کی زیادہ توجہ سفرنامے کی طرف ہو رہی ہے۔ ان عوامل کے علاوہ فنی لحاظ سے ناول میں ابہام و اشاریت، علامتوں کے استعمال نے بھی اس کے ابلاغ کی قوت کو کم کیا ہے۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کا ادیب نہ صرف مادی بلکہ ذہنی، نفسیاتی اور روحانی بحران میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔ اس عدم استحکام کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کسی کو اپنے سامنے کوئی خاص مقصد نظر نہیں آ رہا جس کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ اس کے علاوہ عظیم روایات سے ناواقفیت بھی اہم عنصر ہے۔ جب تک ادیب ماضی کے ذہنی ارتقا کو نہیں سمجھے گا وہ مستقبل کے امکانات پر نظر نہیں رکھ سکتا۔ چناں چہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ماضی سے رشتہ توڑے بغیر حال کے مشاہدات و تجربات کا ادراک رکھتے ہوئے مستقبل کے امکانات پر نگاہ رکھی جائے۔

آج کا ادیب ذہنی، نفسیاتی اور روحانی بلندی پر اسی وقت پہنچ سکتا ہے جب اسے اپنے سامنے ایک واضح نصب العین نظر آئے گا۔ یہ نصب العین کسی خاص نظریے یا عقیدے میں نہیں بلکہ زندگی کے جیتے جاگتے لمس میں ہے۔

میرے نزدیک شاعری اور نثر میں معیاری ادب کا پیمانہ صرف یہ ہے کہ تخلیق کار کسی ذہنی، جذباتی وابستگی کے بغیر زندگی کا زندہ وجود پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اسے غیر جانبدار مبصر حیات ہونا چاہیے کسی بھی نظریاتی و جذباتی وابستگی کی بنا پر وہ زندگی کی محض ایک ہی جہت کو

دیکھ سکتا ہے جب کہ اسے تو اس پر محیط ہونا چاہیے۔ اگر ادب حسن تخلیق کر لیتا ہے تو دوامی قدروں کا حامل بن کر مسرت آگین بن جاتا ہے۔

نثر کا لکھنا ایک وقت طلب اور صبر آزما کام ہے۔ اس میں تخلیق سے زیادہ محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے لیے مطالعے اور مطالعے کے لیے وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیرون برصغیر تارکین وطن کے پاس وقت کی بہت زیادہ کمی ہوتی ہے۔ مغربی معاشروں کی اپنی ضروریات اور ترجیحات ہوتی ہیں۔ پھر وہاں وہ مسائل درپیش نہیں ہوتے جو تیسری دنیا کے باسیوں کا نصیب ہوتے ہیں۔ روٹی' روزگار' جمہوریت' انصاف' آزادی اظہار' جنسی آزادیاں بڑی حد تک میسر ہو رہی ہیں ان کا سب سے بڑا مسئلہ فراق و حسن کا ہے جس کا تخلیقی اظہار شاعری میں ہو جاتا ہے۔

اردو کئی زبانوں کا مجموعہ ہے اور انگریزی زبان کے کئی الفاظ اس میں مستعمل ہیں پھر ہر روز کئی الفاظ اس کا حصہ بن رہے ہیں۔ عام بول چال کی زبان میں ان کا استعمال زیادہ ہے۔ اگرچہ ادبی زبان میں اس کا عمل دخل کم ہے لیکن عام مشاہدہ ہے کہ الفاظ پہلے عام بولی ٹھولی میں مستعمل ہوتے ہیں اور پھر ادب کا حصہ بنتے ہیں۔ ممکن ہے ارتقائی عمل کے بعد اردو ادب میں بھی انگریزی زبان کا دخل ہونے لگے۔ دنیا ایک گلوبل ویلج بنتی جا رہی ہے چناں چہ اردو مستقبل میں انگریزی زبان کے اثرات سے بچ نہیں سکے گی اور ایسا ہونا اردو کے حق میں یقیناً" بہتر ہو گا۔

اردو ادب میں تنقیدی کام کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ آج ہر نقاد کسی نہ کسی خاص نظریے سے چمٹا نظر آ رہا ہے۔ جو ناقدین مشرقی علوم میں دسترس رکھتے ہیں وہ مغربی نظریات کی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ جو مغربی علوم جانتے ہیں وہ مشرقی روایت سے رشتہ توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پھر ایک اور اہم وجہ یہ بھی ہے کہ جو ناقدین نظری تنقید پیش کرتے ہیں اسے عملی طور پر برت نہیں سکتے۔ اس طرح نظری تنقید سے زیادہ عملی تنقید کو نقصان پہنچا ہے چناں چہ اردو میں عملی تنقید کی کمی نظر آتی ہے۔ لیکن یہ کہنا پوری طرح درست نہیں کہ اردو میں تنقید لکھی نہیں جا رہی۔ پاکستان میں کم سہی ہندوستان میں اس حوالے سے اچھا کام ہو رہا ہے۔ ہاں ترجمہ کی کمی واقعی محسوس ہو رہی ہے۔ حالاں کہ علاقائی زبانوں میں اچھا خاصا کام ہو رہا ہے مگر اسے اردو میں منتقل کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے جس سے اردو زبان کا دامن وسعت پذیر نہیں ہو رہا۔ نہ ہی قومی یک جہتی کو فروغ مل رہا ہے۔

DR. ZAHOOR AHMED AIWAN
F-19, ARMY OFFICERS COLONY
QAYOOM STADIUM
PESHAWER PAKISTAN

جو لوگ ستارے دیکھنے کے لئے بے تاب ہوتے ہیں، وہ
سورج کی روشنی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

عبدالغنی شیخ
6/8/1999

عبدالغنی شیخ

لداخ

لداخ میں رہنے والے عبدالغنی شیخ کی چند کہانیاں میں نے "شمع" دہلی میں پڑھی ہیں۔ کہانیاں معمولی نہ تھیں اور مصنف کے وسیع مطالعہ اور مشاہدہ کی غماز تھیں چنانچہ میں نے ان سے رابطہ کیا۔ ان سے گفتگو خاصی دلچسپ رہی۔

عبدالغنی شیخ کی جائے پیدائش لیہہ' لداخ ہے اور تاریخ پیدائش 1936ء۔ انہوں نے میٹرک پاس کرنے کے بعد ادیب فاضل کیا اور ملازمت کرتے ہوئے راجستھان یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ ملازمت بھی ایسی ویسی نہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں پھل فروش' خوانچہ فروش' استاد' کلرک' وٹرنرین (veternarian) اور مختلف کام کیا۔

بعد میں یونین پبلک سروس سے انڈین انفارمیشن سروس کا امتحان پاس کیا۔ مرکزی حکومت میں وزارت اطلاعات و نشریات میں بطور فیلڈ پبلسٹی آفیسر' پریس انفارمیشن بیورو میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر' ریڈیو میں نامہ نگار اور نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ شیخ صاحب نے پونے تین سال پہلے ریٹائرمنٹ لیا اور لیہ میں اسلامیہ پبلک ہائی اسکول میں بطور پرنسپل دو سال کام کیا۔ ایک انگریزی

ہفتہ وار اخبار "نوائے صبح" کے لئے ایک سال کالم بھی لکھا۔ دو سال کے لئے لداخ مسلم ایسوسی ایشن کے نائب صدر رہے۔ آج کل ایک ادبی انجمن "لداخ بزم ادب" لیہہ کے صدر ہیں۔

عبدالغنی شیخ نے مجھے اپنا ایک مضمون بھیجا ہے۔ عنوان ہے "دنیا کے چند مشہور ترین ناول جو ماہنامہ "آجکل نئی دہلی" کے نومبر 1996ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ 14 بڑے صفحات پر مشتمل یہ مضمون خاصا معلوماتی ہے۔ اس میں 52 ناولوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ طوالت کی وجہ سے پورا مضمون تو یہاں شائع نہیں کیا جاسکتا لیکن ابتدائی معلومات "گفتنی" کے قارئین کے لئے ضرور درج کرنا چاہتی ہوں تاکہ بہت سے وہ افراد جو ان معلومات میں دلچسپی رکھتے ہوں وہ استفادہ کر سکیں۔

ناول ادب کی ایک اہم ترین صنف ہے۔ خاص کر نثری ادب میں ناول سب سے زیادہ مقبول ہے اور سب سے زیادہ فروخت ہوتے ہیں۔ ادبی انعامات بھی زیادہ تر ناول کو ملتے ہیں۔ ناول کو پاکٹ تھیٹر یا جیبی نگار خانہ کہا گیا ہے۔ ایک معیاری اور کامیاب ناول حقائق کا مرقع اور اپنے دور کا ترجمان ہوتا ہے۔ انسانی جذبات ' احساسات اور نفسیاتی باریکیوں کو اچھے ناولوں میں بڑی خوبصورتی اور چابک دستی سے اجاگر کیا جاتا ہے۔

اتحاد زماں (unity of time) اتحاد مکاں (unity of space) اور اتحاد عمل (unity of action) ناول کی بنیادی ضروریات ہیں۔ اگر وقت ' مقام اور عمل میں تضادات ہوں تو ناول میں بھی تضادات ہوں گے۔ جب ان میں ہم آہنگی ہو تو ناول میں تاثر ہو گا۔

پلاٹ ' تکنیک ' کہانی ' کردار اور اسٹائل ناول کے اجزاء ہیں جن سے ناول کا خمیر تیار ہوتا ہے۔ کبھی ایک عنصر کا غلبہ ہوتا ہے ' کبھی دوسرے کا۔ کچھ ناول نگار ایک ایسا کردار تخلیق کرتے ہیں جو ناول پر چھا جاتا ہے۔ کوئی منظر نگاری سے سماں باندھتا ہے۔ کوئی جذبات نگاری سے متاثر کرتا ہے۔ کوئی بر محل اور دلچسپ مکالموں سے ترسیل اور ابلاغ کا کام لیتا ہے۔

سامرسٹ مام اپنی کتاب "The Ten Basic Novels of the World" میں رقم طراز ہے۔ " ناول ' پڑھنے میں لطف سے عاری ہو تو بے کار ہے۔ اس کا نفس موضوع قبولیت عام کی خوبی رکھتا ہو۔ یہ نقاد ' پروفیسر ' دانش ور یا برتن مانجھنے والے اور ٹرک ڈرائیور پر مشتمل کسی ایک ٹولہ کی دلچسپی تک محدود نہ ہو بلکہ ہر مرد اور عورت کے لئے اس میں دلچسپی کا سامان ہو۔"

عظیم ناول گنجلک اور پیچیدہ نہیں ہوتے۔ علامت نگاری کے نام پر ابہام نہیں پایا جاتا۔ اوسط ذہن رکھنے والا ایک قاری بھی اسے سمجھ سکتا ہے لیکن یہ بات بھی نہیں کہ ناول کی کہانی روایتی داستان کی طرح سپاٹ انداز میں پیش کی گئی ہو۔ ناول نگاری کوئی داستان سرائی نہیں بلکہ فنی تخلیق ہے جو فنکار کی ذہانت ' مشاہدات ' تجربات اور فکر و نظر کی عکاسی کرتی ہے۔

ہیمنگوے لکھتا ہے "افسانہ نگار جس چیز سے متعلق لکھ رہا ہے ' اگر اسے اس کا صحیح علم اور واقفیت ہے تو وہ آسانی سے ایسی چیزوں کو ترک کر سکتا ہے جو اس کے اور قاری کے تجربات میں

مشترکہ ہیں۔" اس کا اطلاق ایک ناول پر بھی ہوتا ہے۔

ایک نقاد لکھتا ہے "ناول نگار کو قاری کی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست پہ شک نہیں کرنا چاہئے اور اپنے تجربات کو قاری کے تجربات میں شامل کرنا چاہئے۔"

ناول کی کہانی استعاراتی، علامتی یا اشاراتی طور پر پیش کی گئی ہو، فرق نہیں پڑتا۔ جب تک یہ فنکارانہ انداز سے پیش نہ کی گئی ہو اور وحدت تاثر (unity of impression) نہ رکھتی ہو۔ کامیاب ادیبوں نے بندھے ٹکے فورم سے گریز کیا ہے اور چند ہندسوں، خاکوں یا لکیروں سے اپنی کہانی کی تفہیم قاری تک پہنچائی ہے۔

آج تجریدی آرٹ اور علامت نگاری کی آڑ میں اول جلول اور فضول چیزیں لکھی جاتی ہیں۔ شاید اس ضمن میں آئزک سنگر نے لکھا تھا "ہمارے پاس ایک کافکا تھا لیکن اب ہمارے پاس ہزاروں نقال ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اول جلول لکھ دیں تو بس کافکا ہو گئے۔"

ادب پر نوبل انعام یافتہ یہ ادیب رقم طراز ہے "اگر میں صحیح قلم کار نہ ہوتا تو میں کوئی ایسا دھندا کرتا جو صاف ستھرا ہوتا۔ میں ٹھیلا چلاتا لیکن سلیقے سے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ بنا توڑے فرنیچر پہنچانے کا کام کرتا۔ اس ملک میں بھلا ایک ہی دھندا ہے کرنے کے لئے۔ اگر دکاندار ہمیں باسی روٹی، خراب چیز یا پھٹا دودھ دے دیتا ہے تو ہم کچھ نہیں کرتے۔"

تاہم یہ امر پیش نظر رہے کہ ایک مشہور ناول کو بھی ہر لحاظ سے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ سامرسٹ مام نے اپنے پسندیدہ دنیا کے دس بہترین ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس طرح ایک ہیرے میں نقص ہوتا ہے، اسی طرح ایک بہترین ناول میں بھی نقص ہو سکتا ہے۔ ٹالسٹائی، دوستوو سکی اور چارلس ڈکنز جیسے مشہور قلم کاروں کی زبان میں سقم پایا جاتا ہے۔

اپنے تعارف میں انہوں نے اردو میں اپنے لکھے گئے ناولوں کی فروخت کا حشر بتایا ہے پھر بھی شیخ صاحب کا یہ مضمون پڑھ کر اس خواہش کا پیدا ہونا فطری امر ہے کہ جس طرح انہوں نے مختلف زبانوں کے ادیبوں کے ناولوں پر تحقیق کی ہے۔ اس طرح وہ اردو زبان کے ناولوں پر بھی ایک مضمون لکھیں اور معلومات بہم پہنچائیں کہ ان کی تحقیق اردو ادب کے سرمائے میں ایک غیر معمولی اضافہ ہوگی۔

عبدالغنی شیخ خاصے مصروف ادیب ہیں مگر انہوں نے اپنے قیمتی وقت سے تھوڑا وقت ہمارے لئے بھی صرف کیا ہے۔ میں ان کی شکر گزار ہوں اور "گفتنی" کے قارئین کو بتانا چاہتی ہوں کہ ہمارے سوالات پر انہوں نے کس خوبصورت انداز میں اپنی فکر کا اظہار کیا ہے۔

سوال نمبر 2 کے جواب میں انہوں نے کہا... اکیسویں صدی میں اردو ادب کی تاریخ میں موجود رہنے والے متعدد ادیبوں کے نام لئے جا سکتے ہیں جن میں اقبال، جوش، فراق، جگر، حسرت، مجاز، سردار جعفری، اختر الایمان، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، پروین شاکر، پریم چند، کرشن چندر، منٹو، بیدی،

خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر، محی الدین نواب، انتظار حسین، رام لعل، جیلانی بانو (ناول و افسانہ نگار) احتشام حسین، آل احمد سرور، ممتاز حسین، محمد حسن، وقار عظیم، ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الدین فاروقی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وحید قریشی (نقاد) کنہیا لال کپور، پطرس بخاری، مجتبیٰ حسین، فکر تونسوی، شوکت تھانوی (مزاح نگار) ہیں۔

سوال نمبر3 کے جواب میں ان کا کہنا ہے کہ جدیدیت بذات خود بری نہیں ہے۔ بشرطیکہ یہ ابہام سے پاک ہو۔ فنی محاسن کا پاس رکھتے ہوئے قاری کو اپنا پیغام پہنچائے لیکن جدیدیت کے نام پر جو تجریدی، علامتی، اشارتی، اساطیری اور دیومالائی افسانے لکھے جارہے ہیں وہ قاری کے فہم و فراست سے بالا ہیں۔ 1960ء کے بعد اردو افسانوں کی مقبولیت کم ہوگئی ہے۔ اس کی وجہ جدیدیت بتائی جاتی ہے۔ اب جدیدیت خود زوال پذیر ہے۔

عالمی سطح پر مسلمہ ادب عالیہ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فکشن میں عمومی طور پر بیانیہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ چوٹی کے قلم کاروں نے فنی چابکدستی اور مہارت سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ جدیدیت نے آرٹ کی لطافت کو مجروح کیا ہے۔

سوال نمبر4 کا جواب وہ اس طرح دیتے ہیں کہ ناول اردو میں مقبول ترین صنف ہے تاہم برصغیر میں کروڑوں اردو دان ہونے کے باوجود آبادی کے تناسب سے بہت کم ناول لکھے گئے ہیں اور لکھے جارہے ہیں۔ خاص کر اچھے ناولوں کی تعداد بہت کم ہے۔ آزادی کے چند سال بعد ناول کا ارتقا ہوا تھا جمود بعد میں آیا۔

میرے خیال میں ایک بڑی وجہ نکاس ہے۔ مغرب میں ایک اچھا ناول لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوجاتا ہے لیکن یہاں بڑے بڑے ناول نگاروں کے ناول اور دوسرے ادیبوں کی کتب کئی سو سے زیادہ نہیں بکتیں۔ اتنی کم تعداد میں بکنے کے لئے کئی سال لگ جاتے ہیں۔ اعلیٰ ناولوں کی قدر و قیمت تنقید نگاروں کے مقالوں کی صرف زینت بنی ہے۔

میں اپنا ذاتی تجربہ بتاؤں۔ میں نے اب تک صرف دو ناول لکھے۔ دونوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک ناول پر جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کا پہلا انعام ملا۔ یہ سن 1980ء کی بات ہے۔ تب سے کوئی ناول نہیں لکھا۔ میرے مذکورہ دو ناول تو دو تین سال کے اندر فروخت ہوئے لیکن پھر ان کی مانگ نہیں ہوئی۔

1980ء کے بعد میں نے بیک وقت کئی ناول لکھنے کے لئے بہت مواد جمع کیا۔ ان کے خاکے بنائے لیکن روز افزوں کتابت، طباعت، کاغذ کی مہنگائی اور نکاس کے اندیشوں کی وجہ سے میری خواہش پروان نہیں چڑھی اور مزید ناول لکھنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔

چند سال پہلے میں نے اپنے افسانوں کا نیا مجموعہ شائع کیا سرکاری لائبریریوں نے کم کاپیاں خریدیں چنانچہ میں نے بک سیلرز کو گھاٹے میں فروخت کیا۔ انہی بک سیلرز نے یہ کتابیں سرکاری

لائبریریوں کو فراہم کی ہوں گی اور اچھا نفع کمایا ہوگا۔
گلشن نندہ اور ابن صفی قبیل کے ناول نگاروں کے رومانی اور جاسوسی ناول زیادہ بکے ہیں جن کی نقادوں نے پذیرائی نہیں کی ہے۔ بڑے ادیبوں کو اکادمیوں کے ایوارڈ پر قناعت کرنا پڑتا ہے۔
اب ٹی وی کی وجہ سے بھی لوگ فکشن کم پڑھنے لگے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان میں پھر بھی ہندوستان کے مقابلے میں اردو ناول زیادہ چھپتے ہیں۔
سوال نمبر 6 کے جواب میں ان کا کہنا ہے چاہے نثر ہو یا نظم' معیاری ادب کا پیمانہ یہ ہے کہ دلوں کو چھولے۔ اسے پڑھ کر ہر کس و ناکس یہ کہے کہ یہ اس کے دل کی بات ہے۔ ادیب کا نظریہ واضح اور تعمیری ہونا چاہئے جو قاری کی سوچ میں مثبت میلان پیدا کرے۔ ادب کو کسی ازم کا تابع نہیں بنانا چاہئے۔
ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ یہ قاری اور ادیب سمیت ایک مثلث بناتا ہے اور اسی مثلث کے اتصال سے ادب پروان چڑھتا ہے۔ ادب اپنے زمانے کی دستاویز ہوتی ہے اور عصری زندگی کا صحیح ترجمان ہوتا ہے۔ اچھا ادب آفاقی ہوتا ہے۔ یہ زماں و مکاں کی قیود سے بالاتر ہوتا ہے۔ سماج کا ہو بہو نقشہ پیش کرنا ادیب کا فرض ہے۔ غلاظت پر مٹی ڈالنا نہیں۔
سوال نمبر 7 کے جواب میں فرماتے ہیں نثر کم لکھنے کا سبب موضوعات یا جرات کی کمی نہیں ہو سکتی۔ البتہ وقت کی کمی ایک سبب ہو سکتا ہے۔ اردو میں ایسے ادیبوں کی کمی نہیں جو نظم اور نثر دونوں میں لکھنے کی اچھی قدرت رکھتے ہیں۔ ماضی میں بھی کئی ادیبوں نے نظم اور نثر دونوں میں اعلیٰ تخلیقات پیش کی ہیں۔
پاکستان سے متعلق میں نہیں کہہ سکتا لیکن یہاں ہندوستان میں اردو رسائل کے مدیران کئی دفعہ لکھتے ہیں کہ منظوم تخلیقات زیادہ جمع ہو گئی ہیں' اس لئے نظم' غزل وغیرہ نہ بھیجیں۔ اس لئے زیادہ شاعری ہونے کا رجحان بیرون ہندوستان تک محدود نہیں۔
ایک علمی اور ادبی مضمون لکھنے کے لئے تحقیق اور ریسرچ کی ضرورت ہوتی ہے جو محنت طلب کام ہے۔ ایک ناول یا افسانہ لکھنے کے لئے حالات و معاملات سے سطحی واقفیت کافی نہیں ہے' اس کے لئے وسیع تجربے' گہرے مشاہدے اور تخیل کی ضرورت ہے۔
سوال نمبر 8 کے جواب میں وہ کہتے ہیں اردو نے انگریزی سمیت دوسری زبانوں کے الفاظ فراخ دلی سے قبول کئے ہیں۔ اس لحاظ سے اردو ایک روادار زبان ہے۔ انگریزی سے بہت ساری سائنسی اصطلاحات اردو میں وضع کی گئی ہیں۔ فارسی اور عربی نے اردو کو متعدد الفاظ دیئے ہیں جن سے اردو کے الفاظ کا خزانہ بڑھا ہے۔ اردو کو جس طرح فارسیت اور عربیت نہیں بنانا چاہئے اس طرح اس پر سنسکرت نہیں لادنا چاہئے اور نہ انگریزیت بنانی چاہئے۔ اردو کی اپنی انفرادیت ہے۔ اس کی گھلاوٹ' لوچ اور مٹھاس کو برقرار رکھنا چاہئے۔

انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں سے استفادہ ضروری ہے لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے' اس لئے الفاظ لیتے وقت زبان کے مزاج کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ بقول عبدالحمید سالک یہ زبان کی اپنی آب و ہوا ہوتی ہے۔ انگریزی زبان کو انہوں نے غالباً" سرد خشک بتایا ہے۔ ان کے مطابق انگریز طبعاً" مشکل پسند ہے جس کا اظہار انگریزی زبان سے ہوتا ہے۔

بہت سارے انگریزی الفاظ اپنی اصلی صورت میں اردو میں گھل مل گئے ہیں۔ متعدد الفاظ کو معمولی تغیر و تبدیل اور ترمیم کے بعد اردو میں شامل کیا گیا لیکن بہت سارے ایسے الفاظ ہیں جو اردو کے مزاج سے میل نہیں کھاتے۔ ان کے لئے مترادف اور متبادل ترکیبیں وضع کی گئی ہیں جیسے سب ویرین کے لئے آبدوز کشتی اور آرمڈ کار کے لئے بکتربند گاڑی وضع کی گئی ہے۔ اس اصول پر انگریزی سے الفاظ مستعار لانے ہوں گے۔ پچھلے دنوں بی بی سی نے اپنی انگریزی میں انگریزی لفظ detente استعمال کیا۔ کئی سامعین کو یہ لفظ کھٹکنے لگا۔ اردو میں اس کا متبادل لفظ نہیں ہے۔ اس کے لئے متبادل لفظ ڈھونڈنا ہوگا یا detente کو ترمیم کرکے اردو کے ہم مزاج بنانا چاہیے۔

contribution اور inspiration کے لئے اردو میں موزوں متبادل الفاظ نہیں ہیں۔ انگریزی کے یہ الفاظ اسی روپ میں اردو سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ ہندی میں ان کے لئے موزوں متبادل الفاظ ہیں۔ اگر inspiration کے لئے اردو میں ہندی کی پریرنا اور contribution کے لئے یوگ دان استعمال کئے جائیں تو میرے خیال میں اردو کے دھارے میں یہ گھل مل جائیں گے۔

سوال نمبر 9 کے جواب میں ان کا کہنا ہے۔ اردو میں معیاری تنقیدی کام اب بہت کم ہو رہا ہے۔ اردو جرائد میں کسی شاعر یا نثر نگار پر سپاٹ انداز میں مضمون لکھا جاتا ہے جس میں تنقیدی پہلو بہت کم ہوتا ہے۔ تنقید کے لئے تحقیق کی ضرورت ہے۔ جب تک نقاد کا مطالعہ وسیع نہ ہو' وہ تنقید اور احتساب کی بصیرت نہیں پاتا۔

بہت سارے قلم کار نقادوں سے بے زار نظر آتے ہیں۔ اور برملا کہا جاتا ہے کہ ہر ادیب اپنی تخلیقات کا خود ناقد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک بڑا طبقہ نقاد کو ادب کی نشوونما اور بقا کے لئے ناگزیر سمجھتا ہے۔ ہمیں ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک راستہ انتخاب کرنا ہوگا۔

نقادوں نے فن تنقید کو گورکھ دھندا بنایا ہے۔ ایک عام قاری اور ادیب اس کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ تنقید کی اقسام میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اب شگاگو تنقید' نئی تنقید' ساختیاتی تنقید' پس ساختیاتی تنقید' مابعد جدیدیت تنقید' نو انسانیت پرستانہ تنقید' رد تعمیر نظریہ تنقید..... جیسی اصطلاحیں پڑھنے کو مل رہے ہیں۔

اردو تنقید پر مغرب کا گہرا اثر رہا ہے۔ آزادی کے بعد ترقی پسند نقادوں کے مضامین بہت دیکھنے میں آتے تھے۔ ہرچند ان کے نفس مضمون اور نظریات سے پورا اتفاق نہیں کیا جاسکتا لیکن احتشام حسین' ممتاز حسین' مجنون گورکھپوری وغیرہ کے مضامین میں گہرائی ہوتی تھی لیکن ایک مارکسی نقاد

غیر مار کسی ادیب کو بور ژوا تصور کرتے تھے۔ آل احمد سرور جیسے کئی نقادوں نے اپنے آپ کو کسی بھی ازم سے ہمیشہ الگ رکھا ہے۔ ناقدین ادب کا فرض ہے کہ دیانت داری سے لکھیں۔ بے جا ستائش اور نکتہ چینی سے گریز کریں۔ گوناگوں علوم کا حوالہ دے کر ایک سیدھی سادی تخلیق کو بوجھل نہ بنائیں۔

پاکستان میں پھر بھی اردو میں بہت کام ہو رہا ہے۔ یہاں دہلی میں چھپنے والے کئی اردو رسائل' پاکستانی رسائل کے بل بوتے پر جی رہے ہیں۔ یہ پاکستان کے رسائل میں چھپنے والی کہانیوں اور ناولوں کو نقل کر کے قسطوں میں شائع کر دیتے ہیں۔ ہر چند سرقہ سہی یہاں کے اردو قارئین کو طبع زاد اور غیر ملکی زبانوں سے تراجم کی ہوئی عمدہ کہانیاں پڑھنے کو نصیب ہو جاتی ہیں۔ ہندوستانی اردو ادیب طبع زاد کہانیاں لکھیں بھی تو ان رسائل کے مدیر معاوضہ نہیں دیتے۔

عبدالغنی شیخ کی مطبوعہ کتب یہ ہیں-----دل ہی تو ہے' وہ زمانہ (ناول) زوجیلا کے آرپار اور دوراہا کے عنوان سے انہوں نے افسانوں اور کہانیوں پر تحقیق کی ہے۔

"سونام نوابو" سوانح ہے۔ ان کی کہانیاں تیلگو' ہندی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر مختلف جرائد میں شائع ہوئی ہیں۔ ساٹھ سے اوپر مضامین اردو' ہندی' لداخی اور انگریزی زبان میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ مضامین تاریخ' کلچر' روایات و عقائد' قدیم نباتات اور خطے کے جانوروں کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔

ان کے ایک مضمون کو مہاراشٹر کے ہائر سیکنڈری اردو کورس کے امتحانی بورڈ میں شامل کیا گیا ہے۔ ٹیلی ویژن کے لئے ان کے دو سیریل منظور کے جا چکے ہیں۔ علاوہ اس کے سری نگر اور دہلی ریڈیو اور دوردرشن ٹیلی ویژن کے لے انہوں نے خاکے اور مضامین بھی لکھے ہیں اور بحیثیت مبصر بھی گفتگو میں شریک رہے ہیں۔

ان کی زیر طبع تصنیفات یہ ہیں۔ لداخ کی سیر' لداخ کی دنیا' لداخ کی نئی تاریخ۔

عبدالغنی شیخ نے دنیا کے کئی ممالک کی سیر کی ہے۔ بحیثیت مقالہ نگار مدعو کیئے گئے ہیں۔

جموں اینڈ کشمیر کلچرل اکیڈمی سری نگر کی جانب سے انہیں ان کے ناول "دل ہی تو ہے" پر 1980ء میں بہترین کتاب کا ایوارڈ دیا گیا ہے۔

جموں' کشمیر حکومت کی جانب سے بچوں کے عالمی سال پر انہیں ان کے دستاویزی مسودے لداخ کی سیر اور کتابوں کی دنیا پر ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

کلچرل اکیڈمی نے انہیں گاندھی جی کی صد سالہ سالگرہ پر لکھے گئے ان کے مضمون پر بھی ایوارڈ دیا ہے۔

ABDUL GHANI SHEIKH
FORT ROAD LEH, LADAKH
JAMMU AND KASHMIR - 194101 INDIA

دولت کی مستی سے خدا کی پناہ مانگو کہ
اس سے لوگ بہت دیر سے ہوش میں آتے ہیں
(حضرت علیؓ)

گاؤں سنسان کر گئی سارا
پاؤں جیسا گل بجاتی پھرتی تھی
لڑکیاں آنگنوں کی چڑیاں ہیں

عذرا اصغر

راولپنڈی

عذرا اصغر اردو افسانے کا اب ایک معتبر نام بن چکا ہے۔ عذرا نے فن کے میدان میں سہل انگاری سے کام نہیں لیا اور تجربات و مشاہدات کی وادی سے آبلہ پا ہو کر بھی گزری ہیں تب ہی اجالوں کی قندیلیں روشن ہوئی ہیں۔ یوں بھی تجربے کے اندھیرے سے اظہار کے اجالے تک کے سفر کا راستہ سیدھا نہیں ہے۔ کہانی لکھنے کا عمل وجدان' جذبے' شعور اور فن پر گرفت چاہتا ہے اور عذرا یہ فنی تقاضے پورے کرنا جانتی ہیں۔

میں نے لاس اینجلس سے عذرا کو خط لکھا' سوالنامہ بھجوایا۔ عذرا نے دیر سے سہی لیکن مجھ سے رابطہ کیا۔ میں عذرا کی شکر گزار ہوں۔ اپنی جانب سے بھی اور "گفتنی" کے قارئین کی جانب سے بھی۔ عذرا لکھتی ہیں۔

پیاری سلطانہ مہر!

بھئی کہاں جا کر آباد ہو گئی ہو؟ کب گئیں مجھے واقعی علم نہیں ہو سکا۔ چلو جہاں رہو خوش رہو' صحت مند رہو۔ تمہارا سوالنامہ اور اپنے نام چند سطریں پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اگرچہ بہت تاخیر ہو گئی

ہے تمہارا خط ملے لیکن پھر بھی سوالنامہ پر کر کے بھیج رہی ہوں۔ خدا کرے رایگاں نہ جائے۔
معذرت خواہ ہوں۔ تاخیر کی وجہ لکھنے بیٹھی تو ایک الگ داستان بن جائے گی لہٰذا گزارش یہی ہے کہ
معاف کر دینا۔ خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔ نیر جہاں آپا سے ملاقات ہو تو میرا سلام
کہنا۔

خدا حافظ، تمہاری اپنی، عذرا اصغر

اب گفتنی کے لئے عذرا کے جوابات ملاحظہ ہوں۔
سوال نمبر 1 کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔
21 دسمبر 1940ء کی ایک دوپہر کو دہلی کے محلے حوض قاضی میں والدین کی آخری اولاد کے طور
پر میرا ورود ہوا تو دادی اماں نے نام مبارک شاہی رکھا جسے میری پھوپی زادوں نے بدل کر عذرا
کر دیا۔ میں نے ہوش سنبھال کر عذرا کے ساتھ مبارک کا اضافہ کیا اور یوں عذرا مبارک رہی۔
شادی کے بعد عذرا اصغر ہو گئی اور اسی نام سے پہچانی گئی۔ گھر میں بزرگ بنّو کہہ کر پکارتے تھے۔ حتیٰ
کہ میرے خسر مرحوم بھی اسی نام سے بلاتے تھے۔ اب یہ نام لینے والا کوئی نہیں بچا ماسوائے میرے
ہم عمر ایک کزن جنہیں میں شبیر بھائی اور وہ مجھے بنّو باجی کہتے ہیں یا کراچی کی ایک شاعرہ اور صحافی
خاتون دوست غنچہ جعفری جو میری بہو کی خالہ ہیں مجھے بنّو باجی کہتی ہیں وہ آج کل امریکہ میں آباد
ہیں۔
میرے اجداد قصبہ ککرولی ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ یہ ضلع سادات بارہہ کے نام سے
معروف ہے۔ میرے دادا، والد کا تعلق مشرقی پنجاب پولیس سے تھا۔ تقسیم کے بعد لائل پور (فیصل
آباد) میں میرا خاندان آباد ہوا اور پھر روزگار لاہور لے آیا۔ میرے سسرال ساہیوال میں آباد تھے۔
میں شادی کے چند ماہ بعد بغرض میاں کے تبادلے کے لاہور آئی اور چودہ برس پہلے تک وہیں رہی۔
اسلام آباد بھی ہم محکمانہ ٹرانسفر کے سبب آئے لیکن اب یہیں گھر بنا لیا ہے۔ اصغر ریٹائر ہو گئے ہیں
بیٹا وکالت کرتا ہے ہم سب اکٹھے رہتے ہیں۔ میری بیٹی شبہ طراز لاہور میں ہے۔ شبہ کا رجحان
شاعری کی طرف ہے۔ اس کی ایک کتاب "جگنو ہنستے ہیں" چھپ چکی ہے۔ یہ ہائیکو اور ماہیے پر
مشتمل ہے۔ بنیادی طور پر شبہ آرٹسٹ ہے۔ نیشنل کالج آف آرٹس سے سند یافتہ ہے۔ لاہور کالج
لاہور سے بی ایس سی اسلام آباد سے ڈی ایچ ایم ایس کیا۔ کمپیوٹر میں بھی ڈپلومہ یافتہ ہے۔ چند
افسانے بھی ادبی پرچوں میں چھپتے رہے ہیں۔ بے شمار کتب کے سرورق بنا چکی ہے۔ حتیٰ کہ میری
آٹھ سالہ نواسی دعا عباس انگریزی میں خوبصورت نظمیں لکھتی ہے۔ بیٹا عنبر تاجور ایم اے ایل ایل
بی ہے۔ پی ایس اور سی ایس ایس کے امتحانات میں کامیاب ہو کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ دوران
تعلیم افسانہ لکھتا تھا، چھپتا تھا۔ ایک ایران کا سفرنامہ "مبلغ" کے نام سے تحریر کیا جو قسط وار روزنامہ
"امروز" لاہور میں چھپا۔ آج کل عدیم الفرصتی کا شکار ہے۔

سوال نمبر 2 کا جواب ہے.... میرے خیال میں تو بہت سے ادیبوں کے نام زندہ رہیں گے۔ میرے اور تمہارے سمیت۔

سوال نمبر 3 کے جواب میں وہ کہتی ہیں.... مجروح ہی نہیں کیا ہے بے حد مجروح کیا ہے۔

سوال نمبر 4 کے جواب میں عرض ہے..... ناول تو کم نہیں لکھے گئے لیکن ان تک رسائی مشکل رہی۔ لوگوں میں پڑھنے کا رجحان نسبتاً'' کم رہا۔ نئے نظام تعلیم نے اس پر ''سونے پر سہاگہ'' والا کام کیا۔ رفتہ رفتہ اردو سے رغبت کم ہو رہی ہے کہ نئی نسل انگریزی نظام تعلیم کی فیض یافتہ ہے۔ اردو کے رسیا زیادہ تر اسٹیٹس بنانے کے چکر میں مطالعے پر وقت صرف نہیں کرپاتے۔ بچا کھچا وقت اخبارات کے ایڈیشن اور ٹی وی کی نذر ہو جاتا ہے۔ ادب میں گروہ بندیاں ہیں۔ مخالفتیں ہیں' پسند و ناپسند ہے۔ ناشرین کتابیں چھاپ کر پتہ نہیں کن لائبریریوں کو بیچ کر پیسہ کماتے ہیں۔ مارکیٹ میں کتاب نایاب رہتی ہے۔ گنتی کے چند اصحاب کے علاوہ کسی کی کتاب نظر نہیں آتی۔ شائقین مہنگی ہونے کے باوجود کتاب خریدنا چاہتے ہیں لیکن دکان دکان پھر کر بھی کتاب نہیں ملتی۔ رضیہ بٹ' مستنصر تارڑ یا احمد فراز کی کتابوں کے علاوہ بمشکل دیگر لکھنے والوں کی کتابیں ملتی ہیں۔ کراچی کی چھپی ہوئی کتابیں لاہور یا اسلام آباد میں مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں یہی صورت ادھر سے چھپنے والی کتابوں کی وہاں ہوگی۔

سوال نمبر 5 کے جواب میں عرض ہے ''خدا پر یقین کامل ہے۔ آج کل مذہب کا چرچہ تو بہت لیکن یہ صرف نعری بازی ہے۔ در حقیقت خدا اور معاد (آخرت) پر آج کے انسان کا یقین کامل نہیں ہے۔ وہ قناعت سے بہرہ مند نہیں ہے۔ ذہنی' نفسیاتی' مادی اور روحانی خلفشار کا سبب میرے نزدیک یہی ہے۔''

سوال نمبر 6 کا جواب ہے.... جو دل کے تاروں کو چھو لے' حقیقت جیسا ہو' جس کو پڑھ کر ہر پڑھنے والا اپنا عکس دیکھے اور جو شائستہ ہو۔

سوال نمبر 7 کے جواب عرض ہے.... جرات اور موضوعات کی کمی نہیں' جلد شہرت پانے کی ہوس ہے۔

سوال نمبر 8 کے جواب میں کہتی ہیں۔ بے شک اردو کئی زبانوں کا مرکب یا مجموعہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جا بے جا انگریزی الفاظ کی بھرمار کرکے اردو زبان کو تہس نہس کردیا جائے۔ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور اس لحاظ سے بہت محترم ہے کہ یہ ہماری شناخت ہے۔ اگرچہ بوجوہ ہمارا نظام تعلیم انگریزی ہے لیکن محب وطن پاکستانی اس کو تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ پاکستان میں بولی جانے والی سب علاقائی زبانوں کے لفظ آہستہ آہستہ اردو میں رواج پارہے ہیں۔ انگریزی کے بیشتر الفاظ پہلے سے ہی اردو میں مستعمل ہیں البتہ اب جو نیا طبقہ وجود میں آرہا ہے اور سنجیدہ گفتگو کرتے ہوئے بلاوجہ انگریزی لفظ اردو کے بیچ میں گھسیٹ رہا ہے جیسے and، but اور

because وغیرہ تو یہ بے حد مضحکہ خیز لگتا ہے اور اردو کے پرستار اس انداز گفتگو کے مخالف ہیں۔ اردو ایک بڑی اور امیر زبان ہے اور مسلسل ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

سوال نمبر 9 کے جواب میں عذرا کہنے لگیں۔ زندگی اہم اور دلچسپ واقعات کا مجموعہ ہے۔ میری زندگی کا اہم ترین واقعہ تو تقسیم ہے۔ وہ خوف و ہراس، گھر چھوڑنے کا المیہ، بے شمار یادوں کا تسلسل ہے۔ ایک عمر گزار چکنے کے بعد بھی مجھے اپنے ددھیال والے گھر کے خواب آتے رہتے ہیں۔ پھر شادی ایک اہم اور عجیب واقعہ تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ شادی کس سے ہو رہی ہے، وہ شخص کیا ہے۔ میں پڑھنا چاہتی تھی لیکن بے حد کم تعلیم کے ساتھ میں ایک اجنبی کے ساتھ بیاہ دی گئی۔ پھر اس اجنبی شخص کی بے پناہ، ناقابل یقین، اپنائیت، بیٹے اور پھر بیٹی کی پیدائش، غرض ہر ہر واقعہ بے حد اہم اور دلچسپ ہے۔ چند برس پہلے ایک معروف شاعر چائنا سے واپس آئے وہ اردو کے پروفیسر ہیں۔ وہاں ڈیپوٹیشن پر گئے تھے۔ انہوں نے کہا آپ کے (یعنی میرے) افسانے بیجنگ یونیورسٹی میں پڑھائے جا رہے ہیں۔ یہ بات اتنی عجیب تھی کہ مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ کیا آپ کو غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟ مجھے آپ پہچانتے تو نہیں نا؟ پھر کسی نے چائنا میں لکھی ایک کتاب مجھے لا کر دی جس میں میرا افسانہ ترجمہ ہو کر چھپا ہوا ہے۔ خوشی اور اچنبھا یہ ہوا کہ یہ سب میری کسی کوشش کے بغیر ہوا تھا۔

سوال نمبر 10 کا جواب میرے نزدیک دوست نوازی، سہل انگاری اور گروہ بندی ہے۔ تنقید نگاروں نے محنت کرنا چھوڑ دیا ہے۔ مصلحت پسند ہو گئے ہیں۔ ایک نقاد نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہر لکھنے والا اپنا نقاد ساتھ لے کر آتا ہے۔ علاقائی زبانوں پر بھی کام نہیں ہو رہا اس لئے کہ ترجمہ کرنے والے سوچتے ہیں بغیر کسی مادی فائدے کے کسی کو ترجمہ کر کے شہرت کیوں دیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ادب بھی مفاد کی زد پر ہے۔

AZRA ASGHAR
52-C, LANE 7-A, GULISTAN COLONY.
RAWALPINDI - PAKISTAN

جگر دل کے لہو میں ڈبوئے ہیں انگلیاں عرفانؔ
جنوں کے نقش ادھورے تو نہیں ابھرتے ہیں

علی عرفان عابدی
16-2-2000
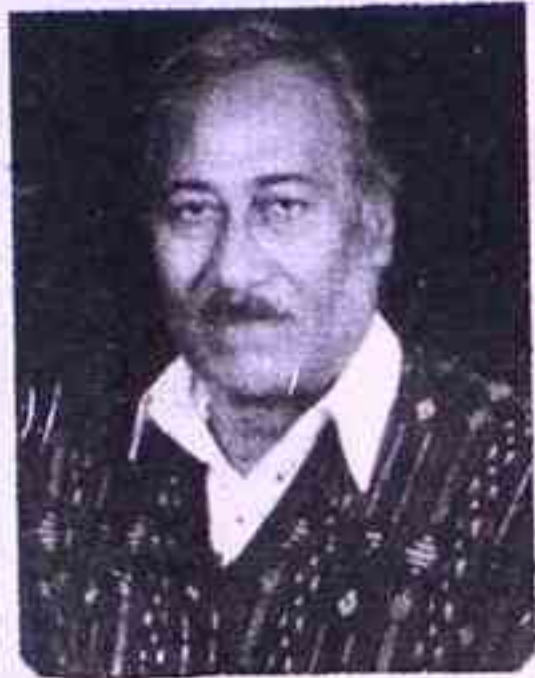
علی عرفان عابدی

کراچی

بہت دور کی بات نہیں ۱۹۸۰ء کا عشرہ تھا۔ میں اپنا ذاتی ماہنامہ روپ شائع کرتی تھی۔ تب میں نے علی عرفان عابدی کے افسانوں کا مطالعہ کیا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں شاعری کی ابتدا نوحوں اور نعتوں سے کرنے والا یہ نوجوان اب افسانوں کی دنیا میں بھی دبے قدموں داخل ہو گیا تھا اور پھر یہ اس کی محنت اور لگن ٹھہری کہ اس نے اس میدان میں اپنے قدم جما لئے۔

یہ بھی بہت اچھا ہوا کہ اس نے آپا دھاپی سے کام نہیں لیا اور اپنے افسانوں کا مجموعہ "انسانوں کی تازہ فصل" اس وقت (۱۹۹۹ء میں) طبع کرایا جب اپنے قلم پر پختگی اور اپنی تحریروں پر اسے اعتماد حاصل ہو چکا تھا کیونکہ وہ رہین ستم ہائے روزگار کے باوجود کتابوں سے اپنا رشتہ مضبوط تر بنائے ہوئے ہے۔ ہر ماہ باقاعدگی سے نئی اور پرانی کتابیں خریدتا ہے اور ان کا مطالعہ بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے افسانوں میں نئے تجربات کئے ہیں۔ ایسے سائنسی تجربات بھی کہ ملک اور بیرون ملک کے مایہ ناز ادیبوں نے اس کے فن کو سراہا۔

سید علی عرفان جو ادبی دنیا میں اب علی عرفان عابدی کے نام سے جانے جاتے ہیں ۲۰-۴-۱۹۴۴ء

کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۵۰-۱۹۴۹ء سے کراچی میں ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا۔ بی ایس سی سندھ مسلم کالج سے اور پھر ملازمت کے دوران سیاسیات میں ایم اے بھی مکمل کیا۔ ۱۹۶۹ء سے محکمہ ٹیلیفون سے منسلک ہیں۔ آج کل اسسٹنٹ ڈویژنل انجینیئر کے عہدے پر فائز ہیں اور شعبہ ترقیات سے وابستہ ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں خصوصی تربیت کے لئے جرمنی گئے تھے لیکن سیاحت کا شوق انہیں انگلینڈ، آسٹریا، بلجیم، سوئزرلینڈ، سعودی عرب اور بھارت بھی لے گیا۔ آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کی ادبی کمیٹی کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین، دبستان لوح و قلم، بزم امروز اور کئی دیگر انجمنوں سے وابستہ رہ کر ادبی اور سماجی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ احباب اور واقف کاروں کے لئے خود کو ہمیشہ وقف رکھتے ہیں۔

عرفان عابدی شعر بھی کہتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

صرف رسوا نہ کیا ہم کو شناسائی نے
زخم تازہ کئے بے فصل کی پروائی نے
بڑھ کے ہر تازہ خبر ہاں پس دیوار کہیں
دیکھے کچھ زندہ جنازے مری بینائی نے

جس نے کبھی کبھی مرے دل میں گزر کیا
میں نے اسی کے ساتھ سفر عمر بھر کیا
ہر جام بے خودی میں خودی کی رہی تلاش
ہر آگہی نے خود سے مجھے بے خبر کیا

"گفتنی" کے لئے کئے گئے سوالات کے جوابات بالترتیب انہوں نے اس طرح دیئے۔

"بیسویں صدی کے اردو ادب کے زندہ رہ جانے والے ناموں میں جیہ پال آنند، احمد ندیم قاسمی، قرۃالعین حیدر، شوکت صدیقی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔"

"میرے نزدیک جدیدیت کا چڑھا ہوا ملمع فکشن سے جلد ہی اتر گیا کیونکہ فکشن کی خوبیاں کہانی، واقعات اور اصل زندگی کے کرداروں پر مشتمل ہوتی ہیں ان کے بغیر وہ ایک بے روح کا جسم ہیں۔

موجودہ صدی ایک تیز تر سائنسی ترقی کی صدی ہے۔ جہاں یہ بہت سے وسائل سے مالا مال ہے وہیں اسے بہت سے مسائل کا بھی سامنا ہے۔ اب تو انسان کو اپنی نیند پوری کرنے کا وقت نہیں ملتا وہ کس طرح ناول پڑھنے کے لئے وقت نکالے گا۔ چنانچہ افسانہ جو مختصر اور کم وقت لیتا ہی اس نے ناول کی جگہ لے لی ہے اور آج کے ادیب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اگر ادب کو پیشہ بناتا ہے تو ۹۹٪ ادیب اپنے آجر کے پروگرام کے تحت چلے جاتے ہیں اور ادب ایک طرف چلا جاتا ہے۔ ادیب کو اس کی صلاحیت اور کام کے حوالے سے سرپرستی کا کوئی سائبان میسر نہیں۔ اگر

کہیں ایسا ہے۔ مثلاً ”میڈیا پر لکھنے والے یا ڈائجسٹوں میں لکھنے والے ادیبوں کو سکہ بند ادیبوں میں تسلیم نہیں کیا جاتا اور وہ اس برادری سے کٹ جاتے ہیں۔ نہ ہی ادیبوں کو حکومت کا تعاون یا رہنمائی حاصل ہے۔“

”میری رائے میں معیاری ادب وہی ہے جس میں آفاقیت ہو' روح اور دل کی آواز ہو' جسے پڑھ کر انسان کسی زاویے سے اپنے اوپر منطبق کرنے کی کوشش کرے' جس میں کمال ہنر یہ ہو کہ حق ہو' سچ ہو اور حقیقت سے قریب تر ہو۔“

”پاکستان اور ہندوستان سے باہر شاعری وقت کی فراہمی ہی کا مسئلہ ہے جہاں نان و جویں کا دباؤ زیادہ رہتا ہے۔ احساس ذمہ داری' تفکرات کے گھیراؤ میں یا تو ڈائری یا شاعری ہی ممکن ہے۔“

”اردو کے سلسلے میں عرض ہے کہ اردو ہمیشہ سے ایک انجذابی زبان رہی ہے۔ جہاں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اس پر مقامی رنگ ضرور جھلکتا ہے جیسے کراچی کا لہجہ' ممبئی کا انداز' پشاور اور دہلی کی اردو' اور ہمارے ادیب اور شاعر اردو کی پاکیزگی اور روایتوں کے ساتھ ان سب کو سنبھالے ہیں وہ اس بات کا بہت خیال رکھتے ہیں اور رکھنا بھی چاہیے کہ اصطلاحات بذات خود اردو کی ہی ہوں اور عام فہم بھی ہوں۔

اور یہ ہیں میری زندگی کے چند اہم واقعات۔

آغا مسعود حسین اور ہم چند دوست سوات کی سیر کے دوران ایک ہینگنگ برج کے دوسری طرف گئے کہ آغا صاحب تیز رو بہاؤ میں کائی لگے پتھروں سے سلپ ہو گئے۔ میں اتفاق سے بہاؤ کی طرف پچاس قدم آگے تھا شور سن کر متوجہ ہوا۔ دوڑ کر پانی میں کودا اور آغا صاحب کو بالوں سے پکڑ کر باہر لے آیا۔ کہتے ہیں میں نے یہ بے ساختہ عمل جس انداز میں کیا تھا خود میں بھی ذرا سی غلطی سے پانی کی نذر ہو سکتا تھا۔

ایک بار ساٹھ کی دہائی میں ہم چند ادب دوست ہوٹل میں خوش گپیاں اور تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ ایک سوالیہ آیا اور اس نے کہا اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔ میں نے دیکھا کہ وہ واقعی بھوکا نظر آ رہا تھا لیکن یہی کیفیت میری جیب کی تھی... میں اس کے بعد تقریباً دو دہائی ادب سے دور رہا کیونکہ میں نے دیکھا کہ ہم دوستوں کے سر میں سب کچھ تھا مگر کسی کو دو روٹی کھلانے کے قابل نہیں تھے تب میں نہ تہیہ کیا پہلے اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا جائے۔ دو روٹی کھانے کھلانے کے قابل ہو کر ادب کی خدمت کرنے کا موقع ملے تو اچھا ہے۔ یہ ہے آج کے ادب کا المیہ!

سوال نمبر ۱۰ کے جواب میں پہلے تو یہ شعر ملاحظہ ہو۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

یعنی جب بھی اقتدار میں اہل فرد آئے ہیں' دانشور آئے ہیں' اہل زبان ہونے کے باوجود انہوں نے گلے سے انگریزی کا جوا اتار کر نہیں پھینکا۔ اردو کو اقتدار کے ذریعے رائج نہیں کیا۔ یہاں تک کہ "اردو یونیورسٹی" تک وجود میں نہیں لائے۔ اس طرح آج تنقید ستائش باہمی یا ذاتی نمود کا نام بن کر رہ گئی ہے۔

(ب) نظریاتی طور پر پاکستان میں خود کو اپنے وجود میں لائے جانے والے نظریے کی حفاظت نہیں کی گئی تو بھلا زبان کیا ترقی کرے گی۔ دراصل اردو اور اس کی ترقی میں وہ تمام ادارے مانع ہیں جو گروہ بندی "لابی ازم" اور "PR" کے حوالے سے اپنے لوگوں کو فیضیاب کر رہے ہیں لیکن خود اردو کو اس کے عروج کی طرف لے جانے میں رکاوٹ ہیں۔"

SYED IRFAN ALI ABEDI
A-24, ABIDYA CENTER
MALIR COLONY KARACHI - 75080
PAKISTAN

"اگر کسی نے تمہاری راہ میں کانٹا رکھا اور تم نے بھی اسکے جواب میں کانٹا رکھ دیا تو تم نے اس کے بجائے دو کانٹے کر دیئے۔ اسطرح عمل اور ردعمل کا سلسلہ چلتا رہے تو زندگی میں کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔" (حضرت نظام الدین اولیا)

عطیہ خان
10. 6. 99

عطیہ خان
لندن

عطیہ خان کے افسانوں کا مجموعہ "تجربات و حوادث" مئی ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا ہے مگر ابھی پوری طرح منظر عام پر نہیں آیا۔ یعنی ابھی اس کی تعارفی تقریب منعقد نہیں ہوئی نہ ہی کہیں تبصرے شائع ہوئے۔ ممکن ہے ۲۰۰۰ء تک یہ باقاعدہ اپنے قارئین تک پہنچ جائے اس مجموعے میں ایک افسانہ "رنجیت سنگھ" نے مجھے خاصا متاثر کیا۔ (میں نے ابھی اس کتاب کی تمام کہانیاں نہیں پڑھی ہیں) کہانی بابری مسجد کے واقعے سے پیدا ہونے والی صورت حال کے گرد گھومتی ہے۔ افسانہ کے کردار "میں" کے والد بیمار ہیں وہ پریشان ہو کر لندن سے دلی پہنچتی ہے۔ دلی سے لکھنؤ جانے والی فلائٹ خاصی لیٹ ہے چنانچہ وہ اپنی دوست اوشا سے ملنے کے لئے ٹیکسی لے کر نکلتی ہے۔ واپسی پر ٹیکسی ڈرائیور اسے وقت سے قبل لے کر اوشا کی بستی سے نکل آتا ہے اور ایئرپورٹ پہنچا کر اسے بتاتا ہے کہ وہ بستی کے لوگوں کے رویے سے مشکوک ہو گیا تھا کہ کہیں "میں" کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے اس لئے وہ اسے بہانہ بنا کر جلد لے آیا پھر وہ اپنی کہانی سناتا ہے کہ کس طرح اس کے ماں باپ نے برصغیر کی تقسیم کے وقت اپنا سب

کچھ لٹا کر لاہور سے ہجرت کی تھی پھر ۸۴ء میں دہلی میں ہندو سکھ فسادات کے موقع پر اس کے والد نے دکان بند کر کے خود کو بلوائیوں سے محفوظ کرنا چاہا کہ بلوائیوں نے اس دکان کو آگ لگا دی اور اس کے والد اندر ہی خاک ہو گئے۔ ایک سوال کے جواب میں وہ کہتا ہے۔

"جی ہاں میں سکھ ہوں۔ میرا نام رنجیت سنگھ ہے۔ دار جی (ابا) کے حادثے کے بعد میں نے پگڑی اتار دی۔ بال کٹوا لئے اور شیو بنا لی۔ انسان اپنی جان بچانے کے لئے کیا نہیں کرتا۔"

"میں" کا اگلا جملہ تھا۔

تمہاری ماں کو تو مسلمانوں اور ہندوؤں سے نفرت ہو گی انہوں نے دونوں ہی کے ہاتھوں ظلم سہے۔"

رنجیت سنگھ جواب دیتا ہے۔ "نہیں نہیں جی میری ماں کو کسی سے نفرت نہیں۔ وہ تو کہتی ہے کہ جب دل میں نفرت کی آگ بھڑکتی ہے تو سارا دھواں دماغ میں بھر جاتا ہے۔ پھر انسان کو اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی اس لئے نفرت کو ہمیشہ دل سے دور رکھنا چاہئے۔"

اس خوب صورت فقرے سے "میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے" کا جو تاثر ابھرتا ہے وہ معمولی تاثر نہیں۔ ایک اچھے افسانے کی خوبی یہ ہے کہ وہ افراد کو منظر نامہ سے غائب کر دیتا ہے۔ مقام اور وقت کو مبہم کر دیتا ہے لیکن گرد و پیش اور اس کے احوال کو اپنی گرفت سے جانے نہیں دیتا۔ وہ اپنے دور کے ذہن، اپنے وقت کے تقاضوں اور ماحول کی خصوصی صفات کو اپنی فنی یافت میں پیوست کر لیتا ہے۔ چنانچہ ایسا افسانہ اپنے عصر کی فنکارانہ نمائندگی کا صحیح معنوں میں حق ادا کرتا ہے۔

عطیہ خان کے بیشتر افسانے اس خوبی سے مزین ہیں۔ حالانکہ ان کے لکھنے کی مدت طویل نہیں لیکن فن پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی ہے۔

عطیہ کی کتاب پر سوائے پبلشر انیس دہلوی کے کسی کا دیباچہ یا پیش لفظ نہیں ہے۔ وہ کہتی ہیں "نہ میں کسی کو جانتی ہوں نہ مجھے یہ رسم پسند ہے۔ میں خاصی گوشہ نشین ہوں۔ میری مہربان دوست بانو ارشد دھکے دے کر میرا نام ادھر ادھر پہنچا دیتی ہیں۔ میں "پی آر" کے گر بھی جانتی ہوں۔" حالانکہ ان افسانوں کی اور عطیہ خان کی محنت کی خوشبو دور دور تک پہنچ چکی ہے چنانچہ برطانیہ کی ایک ادبی سوسائٹی کی جانب سے ان کے افسانوی مجموعہ کو دوسرا انعام دیا گیا ہے۔

عطیہ خان ۳۱ جولائی ۱۹۳۴ء کو مراد آباد میں پیدا ہوئیں۔ مگر ان کی ابتدائی زندگی کا زیادہ تر حصہ لکھنؤ میں گزرا جہاں ان کے والد صاحب سید شاہد علی کالون تعلقہ دار اس کالج میں تاریخ کے لیکچرر تھے۔ عطیہ نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۵۶ء میں اردو میں ایم اے اور ۱۹۵۸ء میں ایم ایڈ کیا۔ اسی سال یو پی پبلک سروس کمیشن سے اردو لیکچرر کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہو گیا

چنانچہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۹ء تک یو پی کے مختلف گورنمنٹ گرلز کالجوں میں اردو پڑھائی۔ ۱۹۶۸ء میں شادی ہو گئی۔ ان کے شوہر عبد الرشید خاں لندن میں مقیم تھے اس لئے شادی کے بعد عطیہ بھی لندن آ گئیں۔

عطیہ کے مزاحیہ مضامین اور کہانیاں یونیورسٹی کے طالب علمی کے زمانے میں شائع ہوئیں۔ پھر انہیں حالات کی بناء پر لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ انہوں نے بتایا لندن آنے کے بعد تقریباً" بیس سال تک اردو سے تعلق ہی نہیں رہا۔ ۱۹۹۴ء سے باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ ابتدائی کہانیاں اور مزاحیہ مضامین برطانیہ کے جرائد میں شائع ہوئے۔ ۱۹۹۶ء سے ہندوستان لندن اور پاکستان کے جرائد میں لکھا۔ جن میں کتاب نما' راوی' انشاء' نیا دور' آج کل' باجی' شاعر' لبرٹی' خوشبو کا سفر' افکار' سفیر اردو' سخن ور' آگہی' ششما' ادب لطیف' خرام' ترسیل' اردو ادب' جنگ' فلمی ستارے' صدا اور دیگر کئی جرائد شامل ہیں۔

سوال نمبر ۲ کے جواب میں انہوں نے کہا۔ "بیسویں صدی کی اردو کی تاریخ میں یوں تو بہت سے نام زندہ رہنا چاہئیں لیکن میرے خیال میں جو نام ضرور باقی رہیں گے وہ ہیں شاعروں میں اقبال' فیض' جوش' فراق ساحر لدھیانوی' حمایت علی شاعر' احمد فراز اور کشور ناہید۔ اور نثر نگاروں میں کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی' سعادت حسن منٹو' عصمت چغتائی اور محترمہ قرۃ العین حیدر۔

میری رائے میں فکشن ایک لطیف آرٹ ہے جس میں خواہ کسی بھی موضوع کو بیان کیا جائے' انداز بیان پر اثر اور دلکش ہونا چاہئے زندگی کے مکروہ پہلوؤں کا بیان بھی اس طرح ہونا چاہئے کہ ان کثافتوں کو دور کرنے کے جذبات ابھریں مگر ان کا بیان پڑھ کر ذوق لطیف کو ٹھیس نہ لگے۔ جدیدیت کی تحریک نے میرے خیال میں اردو ادب کو مجروح کیا ہے۔ اس دور میں جو چیزیں لکھی گئیں انہوں نے دیرپا اثر نہیں چھوڑا اکثر افسانہ نگاروں نے زندگی کے مکروہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے ایسا مکروہ انداز بیان اختیار کیا ہے کہ پڑھ کر دل پر اثر ہونے کے بجائے جی متلانے لگتا ہے۔

میرے خیال میں تو اردو ادب میں اس صدی میں سب سے زیادہ ناول لکھے گئے ہیں۔ اس سے پہلے تو ناول نگاری کی صرف بنیاد ہی پڑی تھی لیکن بیسویں صدی میں کئی بہت اچھے ناول لکھے گئے ہیں۔ مثلاً" عصمت چغتائی کا ٹیڑھی لکیر قرۃ العین حیدر کا ناول آگ کا دریا اور دوسرے ناول۔ غیاث احمد کا فائر ایریا وغیرہ بڑے جاندار ناول ہیں۔ مادی' ذہنی' نفسیاتی اور روحانی بحران موجودہ دور کی منڈی' معشیت اور انتہائی تیز رفتاری سے بدلتی ہوئی دنیا کا رد عمل ہیں۔ ادیب و شاعر کیونکہ زیادہ حساس ہوتے ہیں اس لئے یہ بحران ان میں زیادہ نظر آتا ہے۔ بہتر زندگی بسر کرنے کی کوشش تو ابد سے جاری ہے شاعر و ادیب سماج کا دل و دماغ ہوتے

ہیں۔ اس لئے وہ اس جہد میں زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ لیکن ان کوششوں میں اکثر جلد بازی میں غلط اقدام اٹھا لئے جاتے ہیں۔ اقبال کی فکر نے مسلمانوں کو یکجا کر کے ان کی بہتری کا خواب دیکھا تھا لیکن جلد ہی ثابت ہو گیا کہ مذہب بہت مضبوط بندھن (Binding Force) (Fimnding Force) نہیں ہوتا۔ اسلامی ممالک سے بہت بڑی تعداد میں لوگ بہتر زندگی کی تلاش میں یورپ کے سیکولر ممالک میں آکر بس گئے ہیں اور بہت سے لوگ یہاں رہنے کی جدوجہد میں لگے رہتے ہیں حالانکہ بہتر زندگی یہاں بھی نہیں ملتی کیونکہ تہذیبوں کا تصادم نئے مسائل پیدا کرتا ہے۔ مغرب میں جو اردو کے لکھنے والے ہیں وہ اسی تصادم کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ رہا ادیب کی رہنمائی کا سوال تو اپنا فہم راست ہی رہنمائی کر سکتا ہے ورنہ کیا کیا خضر نے سکندر سے؟

معیاری ادب کے پیمانے مقرر کرنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ ادب سائنس نہیں ہے جس کے لئے فارمولے بنائے جا سکیں۔

پاکستان اور ہندوستان سے باہر بے شک نثر کے مقابلے میں شاعری زیادہ ہو رہی ہے۔ جس کی وجہ مشاعروں کی کثرت ہے لیکن یہ شاعری معیاری اعتبار سے بہت کمتر ہے۔ میں نے کئی شاعروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ افسانہ لکھنے میں دیر لگتی ہے اس لئے وہ شاعری کرتے ہیں۔ میرے خیال میں شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں۔ اسی لئے مغرب کے اردو شاعروں میں شاعروں سے زیادہ تعداد میں متشاعر ہیں جن کا کلام کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑتا۔ جب کہ نثر لکھنا قدرتی صلاحیت سے زیادہ اکتسابی عمل ہے جس میں پڑتی ہے محنت زیادہ اور مغرب کی مصروف زندگی میں محنت کے لئے وقت کم نصیب ہوتا ہے۔

اردو بے شک کئی زبانوں کا مجموعہ ہے جو الفاظ مختلف زبانوں کے اس میں شامل ہو چکے ہیں۔ وہ اسی کا حصہ ہیں اردو ایک بے حد لوچدار زبان ہے اور اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ جذب کر لینے کی زبردست صلاحیت ہے۔ انگریزی کے بھی بیشمار الفاظ اس میں شامل ہو کر جذب ہو چکے ہیں جو سائنس اور علمی ترقیاں انگریزی زبان سے وابستہ ہیں اور ان کے لئے اردو میں پہلے سے الفاظ موجود نہیں ہیں وہ سب اردو میں اپنی اصل شکل میں شامل ہو چکے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ مثلاً" ٹیلیفون' ریڈیو' ٹیلیویژن وغیرہ لیکن انگریزی کے جو الفاظ بھدے پن سے شامل کئے جاتے ہیں ان سے اردو کا حسن ضرور بگڑتا ہے۔ جو الفاظ اردو میں موجود ہیں ان کی جگہ انگریزی کے الفاظ استعمال کرنا فیشن ہو گیا ہے اور اچھے اچھے معیاری رسالوں میں ایسی تحریریں ملتی ہیں جن میں انگریزی کے الفاظ بے موقع بے محل بلا ضرورت اور بلاوجہ استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً" آج کل اردو میں باورچی خانے کی جگہ کچن' غسل خانے کی جگہ باتھ روم' تحفے کی جگہ گفٹ اور اسی قسم کے بیشمار الفاظ استعمال کئے جانے لگے ہیں جو ذوق سلیم کو ناگوار

گذرتے ہیں اگر اسی طرح اردو کے سارے الفاظ کو انگریزی سے بدل لینا ضروری ہے تو پھر اردو کی ضرورت ہی کیا انگریزی ہی استعمال کی جائے۔

میری زندگی میں ایسا تو کوئی واقعہ نہیں گذرا جو دلچسپ واقعہ کی طرح ذہن میں ابھرے ہاں اہم واقعات ضرور ہیں۔ سب سے پہلا اہم واقعہ تو چھ سال کی عمر میں والدہ کی موت ہے جس نے زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ والدہ کی موت کے بعد جو دھکے کھائے ان کی وجہ سے بچپن بہت جلد رخصت ہو گیا۔ دوسرا اہم واقعہ جس نے میرے ذہن و فکر و خیالات اور جذبات کے دھارے کو بالکل نیا رخ دے دیا وہ تھا تقسیم ہند کا واقعہ۔ پاکستان بننے کے فوراً ہی بعد مجھے رشتہ داروں کے پاس پاکستان بھیج دیا گیا جب کہ والد صاحب ہندوستان ہی میں رہے اس لئے ڈیڑھ سال پاکستان میں گذار کر میں بھی ہندوستان واپس آ گئی۔ اس ڈیڑھ سال کے عرصے نے میری شخصیت اور ذہن کو بنانے میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔

"اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔" یہ کہنا اس لئے مشکل ہے کہ اردو ادب میں تنقید کے نام پر پہلے بھی کوئی کارنامہ وجود میں نہیں آیا۔ حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" کی اہمیت تنقیدی کارنامہ ہونے کے مقابلے میں اس کی اولیت کی وجہ سے ہے۔ مجھے خود تنقید سے زیادہ واقفیت نہیں ہے اس لئے تنقید پر اظہار خیال میرے لئے مناسب نہیں ہے۔ اردو میں دوسری زبانوں کی تصانیف کے ترجمے بھی کم ہی ہو رہے ہیں۔ حال ہی میں میری نظر سے "خرام" کانپور کا غیر ملکی ادبی شمارہ نظر سے گذرا ادب لطیف لاہور کے بھی دو شمارے ترجموں ہی کے لئے وقف تھے۔ لیکن مسند اقتدار پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی توجہ اس کی طرف کم نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں ہر صوبے میں اردو اکیڈمی موجود ہے۔ ان اداروں میں انعامات کی تقسیم کے علاوہ کوئی بڑا کارنامہ اردو زبان و ادب کی بقاء ترقی اور ترویج کے سلسلے میں نظر نہیں آتا۔ پاکستان میں علاقائی زبانوں پر کوئی کام ہو رہا ہے یا نہیں اس کا مجھے کوئی علم نہیں ہے کیونکہ میرا تعلق پاکستان سے نہیں ہے۔

MRS. ATIYA KHAN
52 BRENT WAY
LONDON. N3 1AP U.K

ہندوستان کی تقسیم سے قبل کشمیر کے
چنیدہ لوگوں نے راجہ کے خلاف اعلان بغاوت
کیا اُن میں میرے جدِ امجد جمال الدین بھی
شامل تھے۔ حالات نے اُن پر زمین تنگ کردی۔
فردوس حیدر
۱۲ فروری ۲۰۰۰ء
کراچی

فردوس حیدر
کراچی

ادب کے افق پر فردوس حیدر کا نام ایک کرن کی صورت کراچی کی فضاؤں سے ابھرا اور دور تک روشنی پھیلاتا چلا گیا۔ اب آج وہی نام ایک ماہتاب کی صورت میں عالمی افق ادب پر جگمگا رہا ہے اور فردوس نظر بھی بنا ہوا ہے۔

ان کے بارے میں نامور نقادان ادب نے جو کچھ لکھا ہے ان میں محترم اکرام بریلوی کی رائے ملاحظہ ہو۔ ”ڈگریوں اور اسناد کے حوالے سے فردوس حیدر خاصی تعلیم یافتہ‘ سیرو سیاحت کے اعتبار سے بڑی وسیع النظر اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے متوازن خاتون نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز‘ باقاعدہ طور پر 1965ء سے کیا اور جب سے آج تک بڑے رضا کارانہ جذبے‘ پورے انہماک اور تسلسل کے ساتھ لکھ رہی ہیں۔ یوں تو انہوں نے اپنے تخلیقی سفر کی ابتداء ”اجنبی“ سے کی مگر ”اجنبی“ کے بعد کئی ناول لکھے پھر نہ جانے کیوں انہوں نے افسانوں ہی کو اپنے فن کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ”راستے میں شام“ 1982ء میں شائع ہوا جس کے فکری تعمق‘ زندگی کے ایک مخصوص طبقے سے گہری دلچسپی‘ موضوع اور مواد کے تنوع اور طنز کی کاٹ

نے بہت جلد قارئین اور فکشن کے ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ 1986ء میں یہی مجموعہ دوسری بار شائع ہوا اور اب 1988ء میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ "بارشوں کی آرزو" ہماری توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس طرح فردوس حیدر چار ناولوں' ایک سفرنامے' دائروں میں دائرے (جس پر سفرنامے سے زیادہ فکشن کا گمان ہوتا ہے) اور دو افسانوی مجموعوں کی مصنف ہیں۔ میں نے انہیں جان بوجھ کر مصنفہ نہیں لکھا کیونکہ میں انہیں مردوں سے علیحدہ کر کے ادب میں طبقہ واریت کو تقویت پہنچانا پسند نہیں کرتا۔"

شہاب الدین شہاب نے جس خوبصورت انداز میں فردوس کے فن کا جائزہ لیا ہے وہ بھی قابل قدر ہے۔ کہتے ہیں.... لاجونتی کے پیش لفظ میں راجندر سنگھ بیدی نے لکھا ہے۔ مختصر افسانے کا کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا البتہ اس کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔ پنج تنتر کے قصوں اور الف لیلیٰ کی داستانوں سے لے کر ہزاروں لوگ اپنی بات اپنے منفرد طریقے سے کہتے رہے۔

چیخوف کی طرح کے بھی آئے جن کو زندگی کے صحرا میں بڑا سا تربوز مل گیا اور انہوں نے بڑے پیار' بڑی ہمدردی سے اس کی چھوٹی چھوٹی پھانکیں کاٹیں اور سب کے ہاتھ میں تھمادیں۔ لارنس نے حیات کی نیم غنودگی میں رنگ و بو کا نکلخہ سونگھا اور دوسروں کو بھی سونگھا دیا۔ ایڈگرایلن پو نے کہا کہانی کا ہر وہ حصہ کاٹ دو جو برق و تجلی ہو کیونکہ وہ شب رنگ کہانی کے مجموعی تاثر کو دبادے گا اور وہ یہ بھول ہی گئے کہ ایسی کہانی بھی لکھی جا سکتی ہے جس میں دن کا رنگ غالب ہو۔

معاصرین کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کرنا یوں بھی مشکل ہوتا ہے اور پھر یہاں کسی Assessment کے بجائے مجھے فردوس حیدر کے فن کا اعتراف کرنا ہے۔ وہ فردوس حیدر جس نے ناول لکھے' سفرنامہ لکھا اور کہانیاں لکھیں۔ فردوس کی تحریروں کے مطالعے سے ایک بات واضح طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ انہوں نے ناول لکھا ہو' سفرنامہ یا افسانہ فردوس کا بنیادی مزاج ایک کہانی کار کا ہے۔ ان کے فن کا آغاز افسانہ نگاری کی معلوم جہت اور مروجہ اسلوب سے ہوتا ہوا جہاں نامعلوم اور غیر مروجہ اسلوب میں داخل ہوتا ہے وہاں سے فردوس حیدر کے فن کی پہچان شروع ہوتی ہے۔

فردوس حیدر کی کہانیوں کی فضا مانوس اور اجنبی سے گتھ کر بنی ہے۔ ان کے موضوعات نہ ہی انوکھے ہیں اور نہ ہی اچھوتے مگر ان عمومی موضوعات کو کہانی کر دینے کا فن فردوس کا اپنا ہے۔ ان کے کردار جیتے جاگتے' چلتے پھرتے' لڑتے جھگڑتے' چیختے اور سرگوشیاں کرتے اور محبتیں کرتے اور ایڑیاں رگڑتے ہوئے زندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ حیات کی اس معروضی صورتحال اور اس سے پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیوں کو فردوس حیدر کا تخلیقی ذہن فن پارہ بناتا ہے۔

محترم نورالہدیٰ سید نے بھی فردوس کے فن کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں...."
فردوس حیدر نے جہاں سے جدید افسانہ نگاری شروع کی ہے وہاں سے ان کا فکری اور حسی سفر زندگی

کی نئی سمتوں کی طرف گامزن ہوا ہے۔ یہ بات "بارشوں کی آرزو" میں شامل افسانوں کو پڑھ کر محسوس کی جاسکتی ہے۔ بالخصوص ان کے افسانے ---عذابوں کا پل صراط' دھند' ہتھیلیوں کی زبان' نہ ختم ہونے والی چپ' ایک رکا ہوا لمحہ اور بارشوں کی آرزو۔ فردوس حیدر اپنے مخصوص اسٹائل کی کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں' اس لئے ان کے اسٹائل میں لکھنا بڑے خطرے کی بات ہے۔

فردوس حیدر کے جدید افسانوں کو پڑھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ جدید افسانہ نگاروں کے کن کن ناموں سے متاثر ہوئی ہیں حالانکہ اس میدان میں راجندر سنگھ بیدی' قرۃ العین حیدر' انتظار حسین اور مسعود اشعر کے علاوہ انور سجاد' احمد ہمیش' محمود واجد' محمد منشایاد' رشید امجد' احمد داؤد شاہد' کامرانی اور کئی دوسرے اہم جدید افسانہ نگاروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ تاہم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ فردوس حیدر کے افسانے زندگی کی صداقتوں کو پیش کرنے لگے ہیں اور اسی عمل میں وہ گویا سونے میں سوچنے لگی ہیں تاکہ کم از کم پتیل میں بیان کرسکیں۔"

اب ذرا فردوس حیدر سے ہماری دو بہ دو گفتگو ہو جائے کیونکہ وہ سوالنامہ تھامے منتظر ہیں۔

سوال نمبر 1 کے جواب میں انہوں نے کہا۔ میرا پیدائشی نام فردوس بریں اور قلمی نام فردوس حیدر ہے۔ 5 نومبر 1940 کے دن گوجرانوالہ (پاکستان) میں پیدا ہوئی۔ فارسی میں آنرز کیا۔ اردو میں ایم اے اور ترکی زبان میں ڈپلومہ کیا۔ دس سال پشاور یونیورسٹی میں درس و تدریس سے منسلک رہی۔ 1976ء سے کراچی میں مقیم ہوں۔ پندرہ سال سے غیر ملکیوں کو اردو پڑھا رہی ہوں۔ اس سلسلے میں "Urdu Direct Method" اور کتاب دو آڈیو کیسٹس کے ساتھ لکھی اور شائع کی۔

سوال نمبر 2 کے جواب میں وہ کہہ رہی تھیں۔ بیسویں صدی کے اردو ادیبوں میں باقی رہ جانے والے چند نام ہیں--- ڈاکٹر حسن منظر' عبداللہ حسین' جوگندر پال اور قرۃ العین حیدر۔

سوال 3 کا جواب تھا۔ "جدیدیت نے فکشن میں آرٹ کی لطافت کو سنوارا ہے۔"

4- "ناول ادیب کی پوری توجہ مانگتا ہے۔ مشینی دور میں ادیب خود کئی حصوں میں تقسیم ہے۔ وہ یکسوئی میسر نہیں جس کا ناول مطالبہ کرتا ہے۔

5- مراقبہ کے ذریعے مسائل کا حل انسان کو اپنے اندر تلاش کرنا چاہئے۔ وہ اندر جہاں خدا ملتا ہے۔ ہم اپنے مسائل خارجی دنیا میں تلاش کرتے ہیں اس لئے پریشان رہتے ہیں۔

6- ادب زندگی اور اس کی سچائی قرینے سے لکھ کر دوسروں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ دل میں اتر جائے۔

7- وقت کی کمی ہی۔

8- ہر زبان غیر شعوری طور پر بدلتی رہتی ہے۔ اردو میں انگریزی کے الفاظ بھی شامل ہو رہے ہیں۔ دکنی اردو سے لے کر اب تک جو تبدیلیاں آئی ہیں اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرسکا تو

مستقبل میں بھی ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ وقت کا بہاؤ خود فیصلہ کر لیتا ہے بلکہ میرے خیال میں اردو میں ضرورت سے زیادہ انگریزی کے الفاظ استعمال ہو رہے ہیں۔ نئی نسل کے بچے ایک جملہ اردو اور ایک انگریزی کا بولتے ہیں۔ اب تو ہماری خبروں میں بھی بہت سے انگریزی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

10- بے شک اردو ادب میں تنقید برائے نام ہو رہی ہے۔ تنقید میں مطالعہ اور پھر مستقل لکھنا موجودہ مشینی دور میں وقت طلب ہے۔ معاشی مسائل کی بنا پر یکسوئی ممکن نہیں اور نہ ہی اتنا وقت ملتا ہے کہ اس قدر عرق ریزی کی جائے۔ البتہ تراجم پھر بھی ہو رہے ہیں۔ چند ادارے اس پر توجہ دے رہے ہیں۔ حکومتی سطح پر کچھ نہیں ہو رہا۔ علاقائی زبانوں پر بھی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس سے اردو زبان کا نہیں ادیبوں کا بھی نقصان ہے وہ ادیب جو انگریزی نہیں پڑھ سکتے انہیں بطور خاص محرومی کا احساس ہے۔ مختلف عہد و ادوار و ممالک میں ادیبوں نے کیا لکھا' کیا سوچا اور ملک کے سیاسی و سماجی مسائل میں کیا کردار ادا کیا وہ تراجم کے وسیلے سے ہی ہم تک پہنچ سکتا ہے۔

میری زندگی کے چند اہم اور دلچسپ واقعات یہ ہیں۔

"ایک دن دوستوں کے ساتھ بیت بازی کے مقابلے میں جب دوسرے شاعروں کے شعر یاد نہ آئے تو (جو کچھ یاد تھا سنانے کے بعد) اچانک میں شعر کہنے لگی۔ اس سے پہلے کبھی سوچا نہ تھا کہ میں شعر کہہ سکتی ہوں۔ بعد میں اکثر اشعار اپنی ڈائری میں لکھ کر چھپا دیتی تھی۔ (میری والدہ کو ادیبوں' شاعروں سے چڑ تھی) میری پنجابی کی کچھ نظمیں "تخلیق" میں بھی شائع ہوئی تھیں۔

کوڑیاں حقیقتاں دے ڈونگھے پھٹ
ویلے دی اڈدی مٹی نال بھردے رہے
پر آساں دی بکل پسر پسر ہوندی رہی میں' موم بتی وانگوں بلدی رہی' ڈھل دی رہی
توں مینوں کہندا رہیا
اپنے اندروں بت توڑتے انگلاں ہو وچ ڈوب' تیرے چار چوفیرے ڈونگھا انھیرا اے
میں اپنے ہتھ وچ قلم پھڑ کے سوچیا
میریاں آساں دی بکل وچ' اجے کجھ سِراں باقی تیئں' میں ہور اڈیکاں گی

2- جب میرا پہلا ناول "پیار کا ساگر" لاہور سے نسیم بک ڈپو نے شائع کیا تھا اور میرے والد کو علم ہوا تو انہوں نے مجھے کہا "بیٹا مجھے تو بتا دیتیں۔ بہرحال لکھتی رہنا۔ بہت سے عذابوں سے بچی رہو گی۔ اس کے بعد میں اپنے والد کو اپنے تخلیقی سفر میں شریک کرنے لگی۔ آج وہ نہیں ہیں لیکن ان کی رہنمائی محسوس کرتی ہوں۔

3- تصدق سہیل (افسانہ نگار' مصور) جب میرے افسانوں کے مجموعہ "پتھر میری تلاش میں" کا ٹائٹل بنانے لگے۔ کاغذ پر پانی اور رنگ ملا کر اس میں سے تصویریں اور شکلیں تلاش کرتے ہوئے

کہنے لگے دیکھو میں کیسے مصوری کرتا ہوں تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ ان بہتے رنگوں میں سے میں بھی شکلیں دیکھ سکتی ہوں۔ اس دن سے میں نے بھی پینٹنگ شروع کردی۔ میرے اندر ایک مصور موجود تھا۔ دریافت ہوا' خوشی ہوئی۔

4- صوفی غلام مصطفیٰ تبسم میرے استاد تھے۔ میں "خانہ فرہنگ" لاہور میں ان سے فارسی سیکھنے جاتی تھی۔ جب بھی ان کو پتہ چلتا میں گوجرانوالہ جارہی ہوں۔ وہ حقے کی ٹوپی (چلم) کی فرمائش کرتے۔ گوجرانوالہ مٹی کی چلم سازی میں ماہر سمجھا جاتا تھا (بقول صوفی صاحب) ہر بار میں کمہار سے چلم خرید کر لاتی لیکن جب تک ان کے گھر پہنچتی وہ ٹوٹ جاتی۔ کبھی میرے ہاتھ سے گر کر' کبھی رکشہ سے گر کر اور میں ٹوٹی ہوئی چلم لے جاکر کہتی آپ اتنی بڑی ذمہ داری مجھے نہ سونپا کریں۔ وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتے۔ ایک بار میں بڑی کوشش اور احتیاط سے سالم چلم پہنچانے میں کامیاب ہوگئی۔ صوفی صاحب اپنی گھر کے باہر کھڑے تھے۔ میرے ایک ہاتھ میں کپڑوں کا تھیلا اور دوسرے ہاتھ میں چلم تھی۔ صوفی صاحب نے ایک فقیر کا گریبان پکڑا ہوا تھا اور کہہ رہے تھے کہ تم مجھ سے زیادہ امیر ہو۔ صبح تم نے ایک سیر گوشت خریدا ہے اور میں نے آدھا سیر۔ میں نے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے جلدی سے چلم سامنے کی۔ دیکھئے صوفی صاحب اس بار میں سالم چلم لانے میں کامیاب ہوگئی۔ صوفی صاحب نے میری آواز سنی نہ چلم کو دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کر پکڑا اور زمین پر پٹخ دی۔ گریباں چھٹ جانے سے فقیر بھاگ لیا۔ تب صوفی صاحب نے میری طرف دیکھا میں حیران ٹوٹی چلم کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑے آرام سے بولے "تم نے یہ کیا کیا مجھے روکا کیوں نہیں۔"

فردوس نے ٹی وی کے لئے کئی ڈرامے بھی لکھے جو ٹیلی کاسٹ ہوئے اور اب کتابی صورت میں بھی شائع ہوں گے۔ فردوس کی مطبوعہ کتب یہ ہیں۔

افسانوی مجموعے۔۔۔راستے میں شام' بارشوں کی آرزو' پتھر میری تلاش میں۔ سفرنامے۔۔۔دائروں میں دائرے (تھائی لینڈ) یہ دوریاں یہ فاصلے (بھارت)۔ ناول۔۔۔ نقش قدم' رازداں' مردم گزیدہ اور پیار کا ساگر۔

FIRDAUS HYDER
5104 APT. 1ST FLOOR,
DEFENCE GARDEN, KORANGI ROAD.
KARACHI - 46 PAKISTAN

انہیں میں تھے نکلنے والے جو چمن کو پھونک دیتا تھا
ابھی امید تمہارے ستم سے پائی جاتی ہے

فرمان فتح پوری
۱۹۲۶ء
۸-۱-۲۰۰۰
کراچی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

کراچی

نپولین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی ترقی کا راز یہ تھا کہ اسے اپنی نیند پر قابو تھا۔ نیند کے سرکش گھوڑے پر قابو پا جانا بڑی صلاحیت کی بات ہے لیکن ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے پاس تو ایسی کئی کئی صلاحیتوں کے ہمزاد مقید ہیں کہ وہ جب چاہتے ہیں ان سے اپنی مرضی کا کام لے لیتے ہیں۔

مثلاً" ڈاکٹر فرمان وقت کے بہت پابند ہیں۔ اپنے کام کی منصوبہ بندی بھی کرتے ہیں اور اس پر سختی سے عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں ابتدائی عمر سے ہی صبح پانچ بجے اٹھنے کا عادی ہوں اور اس عمر میں بھی اس معمول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کوئی بھی شخص اگر خود کو اس انداز کا پابند بنا لے تو اس کی افادیت سمجھ میں آجائے گی۔ دنیا میں کامیاب لوگوں میں یہ خوبی آپ کو مشترک ملے گی۔

آج ہماری نئی نسل اگر ادب کی ترقی کی طرف راغب نہیں تو ڈاکٹر فرمان کے نکتہ نظر سے اس میں قصور ان کا کم اور ہمارا زیادہ ہے۔ وہ کہتے ہیں نئی نسل کی شکایت کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ انہیں ہم نے کیسا ماحول فراہم کیا ہے۔ ہم انہیں ڈگریوں کی تعلیم تو دے رہے ہیں لیکن کیا

ہم انہیں کتابوں سے محبت کرنے کی تعلیم و ترغیب بھی دے رہے ہیں؟ ہماری ابتدائی درسگاہ کے اساتذہ حقیقی معنوں میں ہمارے استاد ہوتے تھے۔ آپ یقین کریں کہ میں جس مدرسہ میں پڑھتا تھا' اس میں ملازم بھی ہو گیا تھا۔ اس زمانے کے لوگ مجھے اب بھی ماسٹر جی کہتے ہیں۔ اب یہ عالم ہے کہ ہمارے اسکول' کالج اور جامعات میں اساتذہ کو طالب علموں کے کوائف کا علم نہیں ہوتا۔ یہ لوگ روبوٹ کی طرح مشینی انداز میں اپنا مضمون پڑھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ استاد اور طالب علم کے درمیان لاتعلقی پیدا ہونے سے اس رشتہ میں اتنا بڑا خلا پیدا ہو گیا کہ تعلیمی اداروں میں سیاست داخل ہو گئی۔ خود اساتذہ بھی تقسیم ہو گئے۔ ہمارے زمانے میں ایسا نہ تھا حالانکہ میں نے جس مدرسے میں تعلیم پائی اسی میں علامہ نیاز فتح پوری اور مولانا حسرت موہانی نے بھی پڑھا۔ بھلا ان کی محبتوں اور خدمات کو فراموش کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان کے چہرے پر اس محبت اور شفقت کا نور اجاگر تھا جو انہیں اپنے اساتذہ سے ملی تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ خود اپنے طالب علموں میں' اپنے احباب میں اور اپنے واقف کاروں میں بھی محبت کے پھول بانٹتے پھرتے ہیں۔ مجھ سے تو وہ جب اور جہاں ملے اتنے خلوص سے ملے کہ ان سے رخصت ہونے کو جی نہ چاہے۔

ایسی ہی ایک محفل تھی۔ غالباً" کسی کتاب کی تعارفی تقریب تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری جب مائیک پر آئے اور اظہار خیال شروع کیا تو چند لمحوں میں حاضرین کو میں نے ان کی گفتگو کے سحر میں محو دیکھا۔ خود میرا یہ عالم تھا کہ میں ان کی گفتگو سن رہی تھی اور کاغذ کے پرزے پر لکھ رہی تھی۔

اے کہ تو ہے فرمان روا
علم و ہنر کی دنیا کا
ایسی تیری بانی
کہ جیسے
رم جھم بوندیں برسیں
پیاسے تن سیراب کریں
یا جیسے منہ بند کلیاں چٹکیں
اور عالم کو مہکائیں
میں بھی ان کلیوں کی خوشبو کے
ریشم میں لپٹ کر
اپنا جنم مہکانا چاہتا ہوں

ڈاکٹر فرمان کی پسندیدہ صنف سخن شاعری ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی شاعری سے ہوا۔

اب بھی شعر کہتے ہیں گو کہ تنقید و تحقیق کے میدان کو اپنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعری جمالیاتی ذوق کو پروان چڑھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس کے باوجود کہ ڈاکٹر فرمان شعر کہتے ہیں مگر مشاعروں میں بحیثیت شاعر شریک نہیں ہوتے۔

دوران گفتگو مشاعروں کے حوالے سے انہوں نے ایک واقعہ سنایا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔ اس وجہ سے مشاعروں کے انعقاد کا اہتمام بھی کیا کرتا تھا۔ میں جس درسگاہ میں پڑھتا تھا وہاں میں نے ایک مشاعرے کا پروگرام بنایا اور فیصلہ کیا کہ علامہ نیاز فتح پوری کی صدارت رکھی جائے۔ یہ زمانہ علامہ نیاز کی شہرت کے عروج کا زمانہ تھا۔ میں نے انہیں ایک خط لکھا اور متوجہ کیا کہ اس درسگاہ سے ان کا بھی تعلق رہ چکا ہے۔ پھر انہیں مدعو کرنے میں ذاتی طور پر لکھنؤ بھی گیا۔ علامہ نیاز سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ میں ان کے احترام کو ملحوظ رکھے ہوئے تھا اور بہت محتاط ہو کر گفتگو کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے خود کا تعارف کرا پایا۔ اتنے بڑے جید عالم کے سامنے مدعا بیان کرنا آسان نہ تھا۔ بارے وہ انکار کر دیں مگر انہوں نے میرے خط کے موصول ہو جانے کی تصدیق کر دی اور پوچھا "کیا واقعی میری صدارت رکھی گئی ہے؟" میں نے کہا "جی ہاں! آخر آپ بھی تو اس درس گاہ میں پڑھتے رہے ہیں۔" میرا جواب سن کر وہ بولے "میں تو سمجھا تھا کہ فتح پور والے مجھے بھول گئے۔" میں نے محسوس کیا۔ وہ آب دیدہ ہو رہے تھے۔ پھر انہوں نے مجھے فراق گورکھپوری اور اثر لکھنؤی کے لئے خط لکھ دیئے کہ میں انہیں مشاعرے میں مدعو کروں تو مجھے مایوسی نہ ہو۔"

گفتگو اردو کے مستقبل کے حوالے سے ہونے لگی تو انہوں نے کہا کہ اردو کو ہندی یا دیوناگری رسم الخط دینے کی تجویز آج کی نہیں "نگار" میں پروفیسر احتشام حسین مرحوم کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے اردو کو ہندی رسم الخط میں تبدیل کرنے کی زور دار وکالت کی تھی۔ میں نے اس وقت زبان کے حوالے سے کوئی خاص مطالعہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی تحقیق و تنقید کے میدان میں قدم رکھا تھا مگر میں نے اپنے خیالات کو مربوط کر کے ایک مضمون کی شکل دے لی اور "نگار" میں بھجوا دیا۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے اس مضمون کے حوالے سے ایک بھرپور تعریفی خط لکھا۔ میں پاکستان آ چکا تھا اور مجنوں صاحب ہندوستان میں تھے۔ میری ان سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی مگر اس مضمون نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ یہاں علامہ نیاز فتح پوری نے مجھے مشورہ دیا کہ میں شاعری ترک کر کے مضامین لکھوں۔ علامہ نیاز بھی شاعری ترک کر چکے تھے اور میں اس جانب بھی آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا کہ جب کسی نو آموز کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے تو اس کی تحریر میں وسعت آتی ہے۔ اگر سینئر لکھنے والے نئے لکھنے والوں کا نوٹس ہی نہ لیں تو بات آگے نہیں بڑھتی۔ انسان کی فطرت کا خاصا ہے کہ تعریف سے اس کا حوصلہ بڑھتا ہے مگر ساتھ ہی یہ انتباہ بھی کرنا چاہوں گا کہ ہمیں اس تعریف کے حصار میں خود کو قید نہیں کر دینا چاہئے۔ حقیقی کامیابی تو اس

حصار سے باہر نکل کر ہی ملتی ہے۔ ورنہ تو انسان گمراہ ہو جاتا ہے اور اس کی منزل گرد راہ بن جاتی ہے۔

"گفتنی" کے اکثر قارئین کو شاید معلوم نہ ہو کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا گھریلو نام سید دلدار علی ہے۔ 26 جنوری 1926ء کو یوپی' ہندوستان کے شہر فتح پور (ہسوہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ 1946ء میں انہوں نے اسلامیہ فتح پور ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ الہ آباد یونیورسٹی سے ایف اے 1948 میں اور آگرہ یونیورسٹی سے 1950ء میں بی۔ اے کیا۔ 1953ء میں ایس ایم لا کالج کراچی سے ایل ایل بی کرنے کے بعد 1955ء میں گورنمنٹ ٹیچر ٹریننگ کالج کراچی سے بی ایڈ اور جامعہ کراچی سے 1958ء میں اردو میں ایم اے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کر کے کیا۔

بعد ازاں جامعہ کراچی سے 1964ء میں اردو کی منظوم داستانوں پر تحقیقی کام کر کے پی ایچ ڈی اور کراچی یونیورسٹی ہی سے 1974ء میں "اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" نامی کتاب پر ڈی لٹ کی ڈگری لی۔ ابتداء میں شاعری سے شغف رہا۔ 1940ء اور 1950ء کی درمیانی دہائی میں ان کی نظمیں اور غزلیں دہلی کے مشہور اخبار "وحدت" اور "الامان" میں شائع ہوئیں۔ تحقیق کے حوالے سے پہلا قابل قدر مضمون اکتوبر 1951ء کے نگار (لکھنؤ) میں "زبان اور رسم الخط" کے عنوان سے شائع ہوا۔ پہلا تنقیدی مضمون "کلام غالب میں استفہام" کے عنوان سے نگار (لکھنؤ) میں اکتوبر 1952ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں آپ کا رجحان شاعری سے ہٹ کر خالصتاً نثر کی طرف ہو گیا اور متعدد نثری کتابیں لکھیں۔ تیس برس تک جامعہ کراچی کے شعبہ اردو میں تدریس سے وابستہ رہے اور صدر شعبہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ بعد ازاں اردو ڈکشنری بورڈ کے سیکریٹری اور مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ متعدد تعلیمی اور ادبی اداروں سے وابستگی آج بھی ہے۔ تقریباً 18 اداروں میں مختلف عہدوں اور رکن کی حیثیت سے وابستہ ہیں' جن میں خاص طور پر ٹیکسٹ بک بورڈ' اکادمی ادبیات پاکستان' مقتدرہ قومی زبان' مختلف جامعات میں ریسرچ اسکالرز کے نگران اور ممتحن' ادارہ یادگار غالب اردو سائنس بورڈ علامہ اقبال اکادمی وغیرہ شامل ہیں۔ 1947ء میں محترمہ سلمٰی بیگم سے شادی ہوئی۔ دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحب عہدہ ہیں۔ علامہ نیاز فتح پوری سے تعلق خاص رہا ہے اور 1962ء سے ماہنامہ "نگار" کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ نیاز فتح پوری کے انتقال کے بعد سے تاحال سلسلہ نیاز و نگار کے تحت باقاعدگی سے سیمینار منعقد کرتے ہیں۔ چالیس کتابوں کے مصنف ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

1- اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء 2- تحقیق و تنقید 3- تدریس اردو 4- غالب شاعر امروز فردا 5- اردو کی منظوم داستانیں 6- نواب مرزا شوق کی مثنویاں 7- دریائے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی مطالعہ 8- اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری 9- زبان اور اردو زبان 10- اردو کی نعتیہ شاعری 11- نیا اور پرانا ادب 12- قمر زمانی بیگم 13- ارمغان گوکل پرشاد 14-

میرانیس حیات اور شاعری 15- ہندی اردو تنازع 16- اردو املا اور رسم الخط 17- اقبال سب کے لئے 18- اردو افسانہ اور افسانہ نگار 19- دید و باز دید (سفرنامہ) 20- فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت 21- تاویل و تعبیر نیاز 22- فتح پوری شخصیت اور فن 23- اردو کی ظریفانہ شاعری 24- اردو کا افسانوی ادب 25- نیاز فتح پوری دیدہ و شنیدہ 26- اردو املا اور قواعد 27- اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ 28- اردو کی بہترین مثنویاں 29- ادبیات و شخصیات 30- قائداعظم اور تحریک پاکستان 31- خطبات محمود 32- اردو نثر کا فنی ارتقاء 33- اردو شاعری کا فنی ارتقاء 34- مولانا جوہر حیات اور کارنامے 35- مولانا حسرت موہانی شخصیت اور فن 36- قومی یکجہتی اردو اور پاکستان 37- سری پر کاش اور پاکستان 38- ڈاکٹر محمود حسین شخصیت اور کارنامے 39- سر سید احمد خان 40- تحریک پاکستان ہندی اردو تنازعہ شامل ہیں۔

کم و بیش تین سو تحقیقی و تنقیدی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ تقریباً" چھ سو ادبی کتابوں پر تبصرے و تنقیدی مضامین چار سو کے قریب اداریے ' تقریباً" پچاس کتابوں پر دیباچے لکھے۔ امریکہ ' کینیڈا ' برطانیہ ' اٹلی ' فرانس ' جرمنی ' سعودی عرب ' چین ' مسقط خلیج فارس ہندوستان اور دیگر ملکوں میں منعقدہ مذاکرے سیمینار اور کانفرنسوں میں شرکت کی متعدد نامی گرامی ادبی ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں جس میں غیر معمولی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان نے 1985ء میں ستارہ امتیاز سے سرفراز کیا۔ انہیں رائٹرز گلڈ پاکستان کی طرف سے داؤد ادبی ایوارڈ بھی دیا گیا۔ فیض احمد فیض ایوارڈ اور نعت اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔ 1994ء میں امریکہ اور کینیڈا کے مختلف شہروں میں نیویارک اردو انجمن ' ظفری زیدی میموریل سوسائٹی نیویارک ' بزم فن و ادب نیویارک اردو انٹرنیشنل ٹورانٹو اور اردو اکادمی نیویارک کی جانب سے "جشن فرمان فتح پوری" منایا گیا۔

میں نے "گفتنی" کا سوالنامہ ڈاکٹر فرمان کے سامنے رکھا۔ سوال نمبر 2 کے جواب میں انہوں نے کہا۔

سوال واضح نہیں ہے اگر صرف بیسویں صدی کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں سوال ہے تو یہ بات ذہن ' میں رکھنا چاہئے کہ درجنوں اہل قلم ایسے ہیں جس کے نام اگلی صدی اور اس کے بعد بھی موجود رہیں گے مگر کسی خاص صنف ' کسی خاص زاویہ فکر ' کسی خاص تحریک ' کسی خاص اسلوب ' کسی خاص تحقیقی کام ' کسی خاص تنقیدی نقطہ نظر کی وجہ سے۔

3- جدیدیت نے سنوارا بھی ہے ' مجروح بھی کیا ہے۔ فکر انگیز بھی بنایا ہے اور پیچیدگیاں بھی پیدا کی ہیں۔

4- کروٹ لی ہے ' دم نہیں توڑا ' اگر کسی کے نزدیک ایسا ہے بھی تو میرے لفظوں میں صرف یوں خیال کرنا چاہئے کہ یعنی "آگے بڑھیں گے دم لے کر"

5- جدیدیت کی ایک نئی جہت' جدیدیت کی ایک تازہ نمود اور جدیدیت کا فروغ برنگ دیگر۔

6- فکر و خیال کی ترجمانی الفاظ کے ذریعے اور دلکشی و تاثیر کے ساتھ عمومی پہچان یہی ہے۔

7- پاکستان اور ہندوستان کے باہر ہی نہیں اندر بھی شاعری زیادہ ہو رہی ہے۔ نثر کم لکھی جا رہی ہے' بنیادی وجہ وقت ہے' نثر جتنا وقت چاہتی ہے شاعری نہیں چاہتی۔

8- یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا انگریزی الفاظ تیزی سے اور کثرت سے اردو میں شامل ہو رہے ہیں۔

10- اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے' تنقید لکھی جا رہی ہے۔ ترجمے بھی ہو رہے ہیں۔

11- علاقائی زبانوں میں بھی کام ہو رہا ہے اور پہلے کی بہ نسبت اس وقت زیادہ ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے خلوص' محبت' اپنی شفقت اور اپنے میٹھے بولوں کی وجہ سے تو ہر ایک دل میں بستے ہیں مگر اردو زبان سے ان کی محبت اور لگن کا یہ عالم ہے کہ ڈاکٹر عبد الرحمٰن عبد (نیویارک) اور محترم ریاض الدین عطش (شکاگو) بے اختیار کہہ اٹھے ہیں۔

فرمان فتح پوری وہ نام بلند ہے
جس میں جمال حرف و بیاں نقش بند ہے

جس کے قلم سے عالم اردو ہے فیضیاب
جس کی نظر ادب میں تجلی پسند ہے

مسند نشیں نیاز کے ہیں آپ ہی عطش
اردو میں جن کے نام کا طرہ بلند ہے

ایسا بھی مل گیا کہ سب اچھا کہیں جسے

اردو کی ہر ادا سے شناسا کہیں جسے
وہ مہرباں کہ غیر بھی اپنا کہیں جسے

نقاد اس بلا کا کہ عالم میں بے مثال
تحقیق کے امور میں یکتا کہیں جسے

ہے اور کون ڈاکٹر فرمان کے سوا
اردو ادب کی لاج سراپا کہیں جسے

قسمت ہماری دیکھئے اس دور میں ہمیں
ایسا بھی مل گیا سبھی اچھا کہیں جسے

ڈاکٹر عبد الرحمٰن عبد

ڈاکٹر فرمان اردو ادب کی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں پاکستان کے نامور افسانہ نگار امراؤ طارق نے "ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ حیات و خدمات" کے عنوان سے تین ضخیم والیوم 1994ء میں شائع کئے جن میں ڈاکٹر صاحب پر تقریباً 90 ادیبوں اور دانشوروں نے منظوم و غیر منظوم تحریروں کے ذریعے انہیں خراج تحسین و محبت پیش کیا۔

کسی ادیب کی زندگی میں اگر اس کی خدمات کا اعتراف کرلیا جائے تو بلاشبہ کسی حد تک سہی اس کی محنت کا حق تو ادا ہو ہی جاتا ہے۔

اوج کمال نے بھی ڈاکٹر فرمان کے لئے اپنے جریدہ ماہنامہ "دنیائے ادب" کا ایک گوشہ مخصوص کیا اور انہیں خراج محبت پیش کرتے ہوئے میر تقی میر کا یہ شعر ایک لفظ کے تصرف سے ان کی نذر کیا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے "فرمان" نکلتا ہے

DR. FARMAN FATEHPURI
C, 28 BLOCK 13-D
GULSHAN-E-IQBAL
KARACHI - 75300 PAKISTAN

"کیسے یاد رکھوں کیسے بھول جاؤں" والی بات ہے۔

فیروز عالم

اردو ادب میں تنقیدی ادب کا فقدان فیروز عالم!

ڈاکٹر فیروز عالم
لاس اینجلس

ڈاکٹر فیروز عالم لاس اینجلس (امریکا) کی ایک جانی پہچانی طبی و ادبی شخصیت ہیں۔ ادب سے ان کا لگاؤ انہیں اپنے گھر پر شعری محفلیں منعقد کرنے کی دعوت دیتا ہے اور یہ احباب کو مدعو کر کے پہلے انہیں طعام سے نوازتے ہیں اور پھر شعرا و شاعرات کو ان کے کلام سے سامعین کو نوازنے کی محبت بھری زحمت دیتے ہیں۔

پاکستان کے ہفت روزہ "پاکستان لنک" کے اردو حصے میں طبی کالم لکھتے ہیں جس پر اردو ادب کی شکر کی کوٹنگ کچھ اس خوش نما انداز میں ہوتی ہے کہ لوگ ان کالموں کی فائل بنا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم نظامت کا ملکہ رکھتے ہیں، بولنے کا ہنر جانتے ہیں۔ خوبصورت جملے اور اشعار انہیں ازبر ہیں۔ فرصت نہیں ملتی مگر وقت کو کبھی چراتے ہیں اور کبھی لمحوں کی چھین جھپٹ کر کے مکالعہ ضرور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی لائبریری میں سردیوں میں کتابوں کی گرمی اور گرمیوں میں علم کی ٹھنڈک اور خوشبو سے ماحول بارہ ماسا خوشگوار رہتا ہے۔

بڑی مشکل سے مجھے ڈاکٹر فیروز عالم ہاتھ لگے ہیں۔ آیئے آج ان سے ان کے بارے میں

سنیں تو لگے کہ۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
(مصرعہ ثانی کسی اور وقت کے لئے محفوظ کیا گیا ہے)

"ہاں تو ڈاکٹر صاحب آپ فرما رہے تھے کہ..." میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا...

"جی میں عرض کر رہا تھا کہ میرا نام فیروز عالم ہے اور اسی نام سے لکھتا ہوں۔ کچھ افسانے ایک قلمی نام سے بھی لکھے ہیں مگر اس نام کا تذکرہ نہیں کر سکوں گا۔ ہمارا خاندان مراد آباد یوپی سے تعلق رکھتا ہے مگر میری پیدائش راجستھان کے شہر جودھپور میں ہوئی کیونکہ میرے والد سرکاری ملازمت کے سلسلے میں تقسیم سے قبل وہاں تعینات تھے۔ تقسیم کے فوراً بعد ہم لوگ سندھ کے ایک چھوٹے مگر بہت ہی صاف ستھرے شہر میرپور خاص میں بس گئے۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی جو شہر اور ماحول اپنی جانب دیکھا وہ میرپور خاص ہی تھا اس لئے کہ مجھے جودھپور یا ہندوستان بالکل بھی یاد نہیں۔"

"پھر کچھ باتیں میرپور خاص کی بھی تو ہو جائیں۔" ہم نے انہیں ٹوکا تو بولے "ہاں ہاں میں بھی کچھ تذکرہ میرپور خاص کا ضروری سمجھتا ہوں۔ سندھ کا یہ چھوٹا سا شہر اس وقت پاکستان کے سب سے بڑے ضلع "ضلع تھرپارکر" کا صدر مقام تھا۔ ہندوستان سے ریل کے ذریعے کراچی کو ملانے والے اہم راستے پر کھوکھراپار کی سرحد کے بعد یہ سب سے بڑا شہر تھا۔ اس کے بعد حیدر آباد اور پھر کراچی تھا اس لئے تقسیم کے بعد اور آج بھی ہندوستان سے ہجرت کرنے اور اردو بولنے والوں کی سب سے بڑی تعداد انہی تینوں شہروں میں آباد ہے۔ اس شہر کا ماحول' علم و ادب' شعر و شاعری' کھیلوں کے مقابلے' مضمون نویسی اور مباحثوں کے لئے نہایت زرخیز تھا پھر ہمارے گھر میں میری والدہ کو اردو شاعری سے بے حد دلچسپی تھی اور انہیں اساتذہ کے سینکڑوں اشعار یاد تھے جو وہ وقتاً فوقتاً موقع کی مناسبت سے پڑھا کرتی تھیں اس وجہ سے اردو ادب کا ذوق بچپن سے ہی پیدا ہو گیا تھا۔

میری سب سے پہلی تحریر "چور" جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا "امروز" کراچی کے بچوں کے صفحے پر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ (یوں آپ ڈاکٹر فیروز عالم کی عمر کا تعین کر سکتے ہیں) اس کے بعد "امروز" اور "جنگ" میں بچوں کے صفحے میں لکھتا رہا۔ کالج میں داخلے کے بعد سنجیدہ مضامین لکھے۔ اپنا پہلا سنجیدہ مضمون حکیم مومن خان مومن کی شاعری پر اخبار جنگ میں اس وقت شائع ہوا جب میں فرسٹ ایر میں پڑھتا تھا۔ اسی زمانے میں کالج کے مجلے کی ادارت کی اور کئی مضامین مختلف رسالوں اور اخبارات میں شائع ہوئے۔ طبیعت کا رجحان تنقید اور اردو ادب کے سنجیدہ موضوعات کی طرف تھا مگر کچھ افسانے بھی لکھے جو "رومان" کراچی اور "شمع" لاہور میں چھپے۔ ۱۹۶۳ء میں میڈیکل کالج میں داخلے کے بعد

لکھنا بالکل ترک کر دیا اور پھر ۱۹۷۰ء میں امریکہ آنے کے بعد اردو ادب سے رابطہ بالکل منقطع ہو گیا۔

۱۹۸۷ء میں جب واپس کراچی جا کر آغا خان ہسپتال میں تعینات ہوا تو اس احساس کے ساتھ کے پاکستانی عوام میں صحت کے متعلق معلومات افسوسناک حد تک کم ہیں کچھ مضامین صحت اور مختلف امراض کے متعلق لکھے جو اخبار جنگ میں شائع ہوئے۔ میں ۱۹۹۲ء میں واپس امریکہ آیا اور یہاں پاکستان لنک کے مدیر جناب عبدالرحمٰن صدیقی صاحب کی تحریک اور اصرار پر پہلے کچھ مضامین لکھے پھر ایک مستقل کالم تقریباً" پانچ سال تک لکھا۔ اب مصروفیت کی بنا پر کالم ختم کر دیا ہے مگر گاہے گاہے اب بھی کچھ لکھ لیتا ہوں۔

جی ہاں۔ بلکہ یوں کہوں گا کہ بیسویں صدی تو اردو ادب کے لئے ایک تابناک دور لے کر آئی تھی۔ اسی صدی میں ترقی پسند تحریک نے جنم لیا اور اسی صدی میں اردو کے بڑے بڑے جرائد منظر عام پر آئے۔ نثر لکھنے والوں میں اس صدی میں آل احمد سرور' رشید احمد صدیقی' ڈاکٹر عبادت بریلوی' نیاز فتح پوری شامل ہیں افسانہ نگاروں میں کس کس کا نام لکھوں اردو افسانہ تو پیداوار ہی بیسوی صدی کی ہے احمد ندیم قاسمی' راجندر سنگھ بیدی' عصمت چغتائی' سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر اور بہت سے دوسرے نام فہرست طویل ہو جائے گی۔ شاعری میں اقبال' جگر' شکیل' ساحر' فیض وغیرہ۔

۳۔ اگر فکشن سے آپ کی مراد کہانی یا افسانہ ہے تو میں یہ کہوں گا کہ افسانہ یا کہانی تو ہمارے اطراف بکھرے ہوئے حالات یا واقعات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ جب تک انسانی زندگی اپنے مسائل' احساسات' خوشیوں اور غموں کے ساتھ جاری و ساری رہے گی ادیب پر اس کہانیاں قلم بند کرتے رہیں گے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب' ان کا رنگ بدلتا رہے گا مگر "جدیدیت" کا اس پر کوئی منفی اثر نہیں پڑ سکتا۔

۴۔ میرے خیال میں اس کی وجہ فاضل وقت کا فقدان ہے۔ اب نہ قاری کئی سو صفحات کا ناول پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہے نہ ادیب کئی ماہ کسی ناول کی تحریر کی نذر کر سکتا ہے۔ اسی کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اگر ناول شائع ہو بھی جائے تو اس کے خریدار نہیں ملتے اس لئے ناشر بھی ناول چھاپنے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ اسی لئے اردو میں ناول آج کمیاب ہے۔ آپ کے سوال میں میں یہ تصحیح کروں گا کہ موجودہ صدی تو نہیں مگر گذشتہ تین عشروں میں ناول کم لکھے گئے ہیں جن کی وجہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔

۵۔ مہر صاحبہ دراصل آج ہی کا ادیب نہیں بلکہ ہر دور کا ادیب مادی اور ذہنی پریشانیوں میں جتلا رہا ہے۔ غالب کی تنگ دستی کس پر آشکار نہیں۔ مغربی دنیا میں میں چارلس ڈکنس' ایڈگر ایلن پو اور دوسرے کلاسیکی ادیب تنگ دستی کا شکار رہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ معدودے

چند خوش نصیب ادیبوں کے، جنہیں کمرشل کامیابی ملی ادب کو معاش کا ذریعہ سمجھنا غلطی ہے ادب صرف ادب کے لئے ہونا چاہئے کیونکہ یہ بڑی حد تک روحانی ELATION کا ذریعہ ہے۔

۶۔ صرف ایک کہ... "شائد کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات" دونوں کو براہ راست دل میں اتر جانا چاہئے۔

۷۔ جرات کی کمی تو نہیں کہی جا سکتی کیونکہ غیر ممالک میں تو تحریر و تقریر کی مکمل آزادی ہے۔ وقت کی کمی بھی نہیں کہ ان ممالک میں رہنے والی آبادی تو مجموعی طور پر تفریحی مشغلوں میں برصغیر کے باسیوں سے زیادہ وقت گذارتی ہے۔ میرے خیال سے اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ نثر لکھنا "نسبتاً" زیادہ مشکل ہے کہ اس کے لئے موضوع، اس پر تحقیق اور پھر نثری مضمون کی طوالت کے پیش نظر اس کی نذر کیا جانے والا وقت غیر ممالک میں رہنے والوں کے CARE-FREE انداز زندگی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ دوسری وجہ یہ کہ برصغیر میں رہتے ہوئے ہمارے اطراف کا ماحول ہم پر زیادہ اثر کرتا ہے کیونکہ ہم اس ماحول کا حصہ ہیں یہاں ہم میں سے اکثریت کا رویہ یہ ہے کہ یہ ہمارا ماحول نہیں، یہ ہمارے مسائل نہیں، ہم یہاں کچھ مادی فوائد کی وجہ سے رہ رہے ہیں مگر ہم جذباتی طور پر اس سے بالکل لاتعلق ہیں اس لئے ہم پر وہ جذباتی اثر نہیں ہوتا جو نثری ادب یا افسانے کو جنم دیتا ہے۔

۸۔ انگریزی تو اب زبان عالم ہے اس کے بغیر تو اب اپنی زبان پر تعصب کی حد تک فاخر قومیں یعنی جرمن، فرنچ اور اہسپش بھی گذارا نہیں کر پا رہیں تو ہم اس کے بغیر کیسے نئی صدی میں زندہ رہ سکیں گے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انگریزی کے الفاظ اردو میں شامل ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

۱۰۔ اردو ادب میں تنقیدی ادب کا فقدان یقیناً" ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ آج اردو ادب صرف Popular ادب کے طور پر ہی کامیاب ہے یعنی وہ ادب جو ڈائجسٹوں میں چھپ رہا ہے۔ سنجیدہ ادب جو کسی زمانے میں نقوش، افکار، ادب لطیف، ساقی اور نگار میں چھپا کرتا تھا ناپید ہے۔ اب جب کہ سنجیدہ ادب ہی کمیاب ہے تو تنقید کس پر کی جائے پھر غیر Popular ادب میں بھی سب سے ثقیل اور غیر دلچسپ تنقیدی ادب ہوتا ہے جس کو پڑھنے والے بھی گنے چنے ہوتے ہیں اس لئے شاید ہمارے جرائد بھی تنقیدی ادب لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔"

DR. FEROZE ALAM 8783 MANDARIN
AVE. ALTALOMA CA 91701 U.S.A

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

فیروز مکرجی
لندن
15.6.99

فیروز مکرجی

لندن

یہ 1997ء کی بات ہے جب ہم پیرس سے لندن پہنچے تو ہماری میزبان سحر مہدی' بھائی رحمٰن مہدی اور پروین مہدی کی محبتوں اور کوششوں سے ہماری ملاقات لندن کے ادیبوں اور شعراء سے ہوئی۔ یہ ایک شام تھی جو ہمارے اعزاز میں تھی۔ سحر نے بڑی پھرتی دکھائی اور کم وقت میں بہت سارے لوگوں کو مدعو کر لیا تھا۔ ان کی انجمن حلقہ احباب (فرینڈز فورم) کے صدر صدیقی صاحب کی محبتیں بھی شامل تھیں اور دیگر کارکنان کی بھی۔ جناب اکبر حیدر آبادی نے صدارت فرمائی۔ مقالہ نگاروں میں جناب عقیل دانش' فیروز مکرجی اور اطہر راز تھے۔ مشکور حسین یاد بھی اس محفل میں تشریف فرما تھے۔ ڈاکٹر مختار الدین نے بھی رونق بخشی تھی۔ نور جہاں نوری نے نعت پڑھ کر محفل کا حسن دوبالا کیا اور ہمارا پیارا گلوکار اخلاق احمد بھی تھا۔ جس نے ہماری غزل گائی تھی۔ اخلاق احمد اب اس دنیا میں نہیں 4/ اگست 1999ء بروز بدھ وہ ہم سے روٹھ کر چل دیا۔ کینسر کے موذی مرض سے وہ ساوں لڑا۔ اخلاق سے ہماری کراچی کی ملاقاتیں تھیں۔ ماہنامہ "روپ" کے دفتر میں وہ' میں اور کاشف گھنٹوں خوش گپیاں کرتے رہتے تھے۔ روپ کے لئے میں نے اخلاق کا انٹرویو لیا تھا اور

کاشف نے تصویریں بنائی تھیں۔ اللہ اس پیارے شخص کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے (آمین)
اس محفل میں پہلی بار میں فیروز مکرجی سے ملی ان کی شخصیت بڑی جادو بھری ہے۔ پھر عاشور کاظمی کی کتاب "فسانہ کہیں جسے" میں ان کا افسانہ "رعنائی خیال" پڑھا تو مکرجی کی شخصیت کا جادو سرچڑھ کر بولنے لگا۔ مشرق و مغرب کی تہذیب کے تصادم میں زندگی کی بعض مجبوریوں سے سمجھوتہ اور خوش اسلوبی سے کیا گیا سمجھوتہ اس کہانی کا موضوع ہے۔ اس نازک خیالی کو فیروز مکرجی نے اپنی ہنرمندی سے ایسا نبھایا ہے اور اسے ایسی خوبصورتی دی ہے جیسے سہاگ رات گزارنے کے بعد دوسری صبح دلہن کے ماتھے پر جگمگانے والی بندی کا روپ ہوتا ہے۔
بعض جگہ افسانے کے حسن کو فیروز کے محتاط قلم نے اس خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے کہ اس پر عریانی کا ٹھپہ نہیں لگنے دیا۔ ایک جگہ راج کا شوہر دیپک اپنی بیوی سے اس وقت کہتا ہے جب وہ ہندوستان چھوڑ کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے لندن جارہی تھی۔ "ہم دونوں ایک دوسرے سے دو سال کے لئے الگ ہورہے ہیں۔ نہ میں سنیاسی ہوں نہ تم سے اس کی توقع کرتا ہوں۔ اگر اس عرصے میں چند لمحوں کے لئے ہم کہیں سہارا لے لیں تو وہ کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ نہ میں تم سے پوچھوں گا نہ تم مجھ سے سوال کرنا۔"
فیروز مکرجی سے باتیں کیجئے اور گھنٹوں کیجئے مگر تھکن محسوس نہیں ہوتی۔ آیئے میں آپ کو ان سے ملاؤں۔
"ڈاکٹر فیروز مکرجی ہمیں اپنے بارے میں تفصیل سے بتایئے۔" میں نے کہا تو فیروز تھوڑا سا مسکرائیں پھر بولیں۔
"میرا پورا نام فیروز مکرجی ہے۔ والدین کا دیا ہوا نام فیروز جبیں ہے جو عرصہ دراز سے میں نے ترک کردیا۔ شادی کے بعد میں نے اپنے شوہر نشیتھ مکرجی کے نام کی وجہ سے فیروز مکرجی لکھنا شروع کیا۔ میں یوپی کے چھوٹے سے ضلع میں پیدا ہوئی لیکن بہت جلد اسے میرے والدین نے چھوڑ دیا۔ ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں پائی۔ پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ پروفیسر احتشام حسین کی شاگرد رہی ان کے خیالات اور ان کی تحریروں سے بہت متاثر ہوئی اور ان کا اثر اب تک باقی ہے۔
تقسیم کے بعد 1949ء میں ایک سال کے لئے کراچی جاکر "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں اور روزنامہ ڈان میں بحیثیت رپورٹر کام کیا پھر ہندوستان واپس چلی گئی اور لکھنؤ میں روزنامہ پایونیر میں کام کیا۔ 1952ء میں جرنلزم کا کورس کرکے لندن واپس آگئی۔ اور جناب رالف رسل کی نگرانی میں پنڈت رتن ناتھ سرشار (فسانہ آزاد کے مصنف) پر انگریزی میں مقالہ لکھ کر 1964ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد چار سال کے لئے کلکتہ واپس چلی گئی وہاں ایک اسکول کی ہیڈ مسٹریس کی حیثیت سے کام کیا۔ بنگالی زبان سیکھی پھر 1968ء میں لندن واپس آگئی اور ایک اسکول میں

مدرس ہو گئی۔

میں نے سولہ سال کی عمر سے افسانہ لکھنا شروع کیا لیکن اشاعت کے لئے اپنی تحریریں نہیں بھجوائیں بعد کو طالب علمی کے زمانے میں ساقی۔ ادب لطیف اور ادبی دنیا اور دوسرے رسالوں میں کہانیاں شائع ہوئیں۔ پھر سالہا سال تک ریسرچ، سیاست اور ذاتی اور خانگی ذمہ داریوں کی مصروفیات کی وجہ سے افسانہ نگاری کی طرف توجہ نہیں دی۔ 1987ء میں دوبارہ اس طرف توجہ دی۔ پہلا افسانہ "پرانا گھر نئے باسی" ماہنامہ آجکل ہندوستان میں شائع ہوا وہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ سرشار پر میرا مقالہ Lucknow and the World of Sarshar کے نام سے کراچی میں سعد پبلی کیشن نے شائع کیا۔ اس کا ترجمہ مسعود الحق (جامعہ ملیہ) نے اردو میں کیا جو ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی ملکوں میں زیر اشاعت ہے۔

افسانوں کا مجموعہ "دور کی آواز" زیر اشاعت ہے۔ آج کل خواتین کے اردو افسانے جو انہوں نے محبت کے عنوان پر لکھے ہیں ان کا انگریزی میں ترجمہ کر رہی ہوں۔"

سوال نمبر دو کے جواب میں فیروز کہہ رہی تھیں "بیسویں صدی کے اردو ادب میں جو چند نام یاد رہیں گے ان میں شاعروں میں اقبال کا نام ہے جو ہماری صدی کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ وہ اپنے فلسفہ خودی کی وجہ سے خاص طور پر یاد رہیں گے۔ دوسرا نام فیض احمد صاحب کا ہے۔ بقول قرۃ العین "ہر عہد اپنے ایک شاعر کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے۔" یہ فیض صاحب کا دور ہے اور یہ دور نقش فریادی کی اشاعت کے وقت سے چلا آرہا ہے وہ خواص و عوام دونوں کو ہی خوش آتے ہیں۔ فیض نے ایک بہتر دنیا انسان دوستی اور امن کا خواب دیکھا تھا جس کی تمنا ہر انسان کے دل میں ہے فیض اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔

نثر میں اردو کے سب سے اہم فکشن نگار پریم چند ہیں۔ فیض کی طرح وہ بھی خواص و عوام کو خوش آتے ہیں۔ ان کی زبان گنگا جمنی تہذیب کی زبان ہے۔ میرا خیال ہے فیض اور پریم چند کا نظریہ زندگی ایک دوسرے سے بہت قریب ہے۔ انہوں نے بھی ہندوستان کی دکھی مخلوق کے لئے ایک خواب دیکھا تھا جس کی ترجمانی بڑی سادگی سے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں اس طرح کی ہے کہ ان کی بات دل میں اتر کر اپنا گھر کر لیتی ہے۔ اگلی صدی کا نقاد جب اردو ادب کا مطالعہ کرے گا یہ باتیں اسے متاثر کریں گی اور وہ انہیں شاید ہم سے بھی زیادہ بلند درجہ دے گا۔

افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی نے سب سے پہلے عورتوں کو خودشناسی دی اور کھل کر ان کے جذبات کی ترجمانی کی۔ وہ بھی اپنی زبان اور فن کی وجہ سے یاد کی جائیں گی۔ قرۃ العین ہمارے عہد کی سب سے بڑی ناول نگار ہیں انہوں نے اردو افسانے اور خاص کر ناول کا جس طرح درجہ بلند کیا ہے وہ اگلی صدی میں بھی یاد رکھا جائے گا۔

فیروز کا کہنا ہے "یقیناً" فکشن ہمارے ادب کا بہت اہم اور لطیف آرٹ ہے۔ ہر عہد میں ادب

میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ جدیدیت بھی ایک نئی تبدیلی تھی جس کی وجہ سے فکشن نئے انداز سے لکھا گیا اور کئی نئی آوازیں ہمارے ادب میں آئیں۔ میرا خیال ہے جدیدیت کے زیر اثر جنہوں نے لکھا ہے ان میں انتظار حسین کی تصنیفات بہت اہم ہیں۔ انہوں نے ایک نئے انداز سے اپنے عہد کی ترجمانی کی ہے لیکن جدیدیت کے گرو و پیش شمس الرحمٰن فاروقی اور ان کے پیروکاروں نے انجمن ترقی پسند مصنفین پر جو حملے کئے وہ کسی طرح بھی اردو ادب کے لئے فائدہ مند نہیں ہیں۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں انجمن ترقی پسند مصنفین نے اردو ادب کو ایک نئی آواز دی۔ عوام کی آواز کو ادب میں شامل ہی نہیں کیا بلکہ ادب کو عوام کے قریب لے گئے۔ یقیناً" انہوں نے غلطیاں بھی کیں لیکن انجمن ترقی پسند مصنفین کے عروج کا زمانہ اردو ادب کا نشاط ثانیہ ہے۔ جس طرح جدیدیت کے علم بردار ترقی پسند ادب کی تحریک پر حملے کرتے ہیں وہ کسی طرح بھی اردو ادب کے لئے فائدہ مند نہیں ہے۔ اس سے محض ان کے تعصب اور کم نظری کا احساس ہوتا ہے۔ جدیدیت کے زیر اثر جو لکھا گیا ہے وہ بڑی حد تک قاری اور فکشن نگار کے درمیان فاصلہ بڑھاتا ہے اسی لئے جدیدیت زیادہ دن قائم نہیں رہ سکی چنانچہ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ اس نے آرٹ کی لطافت اور حسن کو نکھارا یا سنوارا ہے۔"

مکرجی کو اس سے اختلاف ہے کہ موجودہ صدی میں بہت کم ناول لکھے گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اسی صدی میں پریم چند نے اپنا عظیم ناول گئودان لکھا۔ قرۃ العین کا شاہکار ناول "آگ کا دریا" لکھا گیا جس میں انہوں نے ہندوستان کی قدیم تاریخ سے لے کر عہد حاضر تک کو ایک دائرہ میں کر لیا ہے۔ اس سے پہلے اردو میں ایسا ناول کبھی نہیں لکھا گیا۔ اگلی صدی میں شاید ناول زیادہ لکھا جائے گا کیونکہ اس کی مانگ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ادیب ہی نہیں ساری دنیا ایک ذہنی' روحانی اور نفسیاتی بحران سے گزر رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ سیاسی معاشی تناظر میں تبدیلی بھی ہے۔ انسان بہتر زندگی بسر کرنے کے لئے فکری اور سیاسی نظام فکر کی تلاش میں ہے۔ موجودہ سیاسی اور معاشرتی حالات کی بنا پر اور امریکہ کی اجارہ داری کی وجہ سے پرانا توازن درہم برہم ہو گیا ہے۔ ادیب کے سامنے بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اس سوال کا جواب دینے کے لئے ساری دنیا کے دانشور غور و خوض کر رہے ہیں۔

شاعری ویسے اردو ادب کی سب سے مقبول اور ترقی یافتہ صنف ہے لیکن سوا چند شاعروں کے برصغیر کے باہر جو شاعری ہو رہی ہے اس کا معیار ایسا نہیں ہے۔ جس کا مقام اردو شاعری میں بلند ہو گا۔ کم از کم برطانیہ کے شاعر مشاعروں کے شاعر ہیں۔ انہوں نے وہ ریاض اور مطالعہ نہیں کیا جو انہیں اچھا شاعر بنا دے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ نثر بہت کم لکھی جا رہی ہے۔ افسانہ برابر لکھا جا رہا ہے جس میں خواتین افسانہ نگاروں کی تعداد شاید زیادہ ہی ہے اور وہ مردوں کے شانہ بشانہ برابر اچھے افسانے لکھ رہی ہیں۔ برصغیر کے باہر رہ کر جو اردو لکھ رہے ہیں ان میں جرات کی کمی نہیں ہے۔

اپنے دیش سے باہر آکر عورتوں کی زندگی میں خاص کر بہت بڑی تبدیلی آئی ہے۔ وہ ان مسائل پر بڑی جرات سے لکھ رہی ہیں جو آنے والی sochiologist کے لئے ایک بہت اہم مواد ہوگا اور آئندہ جو تاریخ لکھی جائے گی اس میں برصغیر سے باہر لکھے جانے والے ادب کی بہت اہمیت ہوگی۔

یہ صحیح ہے کہ اردو زبان نے کئی زبانوں سے الفاظ لئے ہیں' اس کی قواعد سنسکرت سے لی گئی ہے۔ انگریزی دنیا کی بڑی علمی زبان ہی نہیں' وہ سائنس' تجارت اور ٹیکنالوجی کی بھی زبان ہے اس کے علاوہ ماضی میں ان کی حکومت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی' اس لئے وہ رابطہ کی زبان بھی ہوگئی۔ عربی اور فارسی میں اچھا ادب لکھا جارہا ہے لیکن ہم عربی میں قرآن ہی پڑھ کر رک جاتے ہیں۔ عربی سارے عرب ممالک کی زبان ہے۔ اس میں افسانہ ڈرامہ اور شاعری بھی ان سارے ممالک کے ادیبوں کی تخلیقات ہیں۔ ان کے ترجمے انگریزی میں اور کبھی کبھی اردو میں دستیاب ہے۔

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا اردو تنقید اس صدی کے آخر میں کم سے کم لکھی جارہی ہے یہ افسوس کا مقام ہے جبکہ اس صدی کے وسط میں تنقیدیں زیادہ لکھی جارہی تھیں۔ ان میں احتشام حسین کا نام پیش پیش ہے۔ انہوں نے اسے حالی کی سنجیدگی اور محمد حسن آزاد کی شگفتگی دی ہے انہوں نے تنقید کو عام قاری کے قریب لانے کی کوشش کی میرا خیال بحیثیت نقاد کے ان کا نام بھی اگلی صدی میں یاد رہے گا۔ ترجمے اردو میں اس لئے بھی کم ہوئے ہیں کیونکہ خود اردو ہی کم پڑھی جارہی ہے۔ بقول ایک اڑیا افسانہ نگار کے "ہماری زبانوں کو جو نقصان برطانیہ کی حکومت نہ پہنچا سکی اب اس کا عفریت وہ کام بڑی تیزی اور کامیابی سے کررہا ہے۔"

فیروز مکرجی غالب کی بڑی مداح ہیں۔ کہنے لگیں "غالب میرے محبوب شاعر ہی نہیں وہ میرے گرو بھی ہیں۔ زندگی میں جب ایسے منازل آتے ہیں جب کسی کی رہبری کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے۔ وہ چپکے سے آکر اپنا کوئی شعر یاد دلا جاتے ہیں اور میں سمجھ لیتی ہوں جیسے انہوں نے منزل کی طرف اشارہ کردیا اور میری مشکل آسان ہوگئی۔ ان کے کتنے شعر ہیں جو میرے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن مندرجہ ذیل شعر میرا فلسفہ بھی ہے جس پر میں نے عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

DR. (MRS) FIROZE MOOKERJEE
61 WINDERMERE ROAD,
MUSWELL HILL, LONDON N10 2RG U.K

دعائیں

سلطانہ مہر کے لیے

قرۃ العین حیدر

14 نومبر 99

قرۃ العین حیدر

نوائیڈہ' ہندوستان

اتوار۔ ماہ اپریل 2000ء کا آج آخری دن ہے۔ میں محترمہ قرۃ العین حیدر کا تعارف لکھنے بیٹھی ہوں تو مجھے یاد آرہا ہے کہ ابھی پچھلے ہی ہفتے جناب و بیگم حمایت علی شاعر نے تین "خواتین" کو اپنے گھر عشائیے پر مدعو کیا۔ "خواتین" پر زور یوں ہے کہ چوتھے مرد مہمان عمران الارشد تھے جو حمایت صاحب کے دوست ہیں اور بانو ارشد کے بھائی۔ یہ دونوں بھائی بہن لندن سے آئے تھے۔ میں امریکا سے آئی مہمان تھی اور کنیز فاطمہ سڈنی آسٹریلیا سے آئی ہوئی ہیں۔ انہی دنوں بانو ارشد کے نئے افسانوی مجموعے "بانو کی کہانیاں" کی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد کتابوں کے تحائف کا تبادلہ شروع ہوا اور بانو نے اپنی کتاب پر دستخط کرنے کیلئے مجھ سے قلم مانگا۔ قلم ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ بولیں۔ "خدا کرے اس قلم کو چھو کر مجھے بھی آپ جیسی لکھنے کی قوت اور تخیل کی پرواز مل جائے..... آمین۔"

بانو کی اس معصومیت پر میرے دل سے اس کیلئے دعا نکلی اور اسی لمحے مجھے یاد آیا کہ 14 نومبر 99ء کے دن میں نے بھی ایسی ہی خواہش کا اظہار کیا تھا جب محترمہ قرۃ العین حیدر سے ملی تھی۔ انہوں

نے جیلانی بانو اور ان کے رفیق حیات ڈاکٹر انور معظم اور جناب ہرچرن چاؤلہ کے ساتھ مجھے بھی اپنے گھر ٹھہرانے پر مدعو کیا تھا۔ ایک دن پہلے میں مس حیدر کی عزیزہ ڈاکٹر صغریٰ مہدی سے ان کے گھر انٹرویو کیلئے موجود تھی۔ اس درمیان قرۃ العین صاحبہ کا فون آیا اور جب انہیں معلوم ہوا کہ میں دہلی میں ہوں تو انہوں نے فون پر مجھ سے گفتگو کی اور نہ صرف مجھے بلکہ میری میزبان انور نزہت کو بھی کھانے پر مدعو کیا۔ ان سے میری دوسری ملاقات کچھ عرصے بعد پھر ہوئی جس دن مجھے ان سے انٹرویو کرنا تھا۔ اس دن ان سے ڈھیروں باتیں ہوئیں۔ ادب کے حوالے سے بھی اور ان کے گڑیاں کھیلنے اور تعلیم حاصل کرنے کے اور پاکستان آنے تک کے حوالے سے۔ ہمارے ساتھ انہوں نے بڑی خوش دلی سے تصویریں بھی کھنچوائیں۔ جبکہ ان کے سلسلے میں لوگوں نے مجھے شرمندگی کی حد تک خوفزدہ کردیا تھا کہ وہ بے حد غصہ ور ہیں۔ میں نے ان دو ملاقاتوں میں ہر پہلو سے ان کے مزاج کا تجزیہ کیا اور مجھے اندازہ ہوا کہ ان سے انٹرویو کرنے والوں نے ممکن ہے ان کے ساتھ انصاف نہ کیا ہو۔ جو اکثر ممکنات میں سے ہے کہ انٹرویو دینے والا کچھ کہتا ہے اور لکھا کچھ اور جاتا ہے۔ کیونکہ میرے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے۔ چنانچہ میں یہی تجزیہ کرپائی۔ ورنہ قرۃ العین جتنی اپنی تحریروں میں مدبر اور سلجھی ہوئی ہیں اس سے کہیں زیادہ ان میں تدبر اور سلیقہ میں نے ان سے دوبدو گفتگو میں پایا۔

لاس اینجلس سے جب میں دہلی کیلئے روانہ ہوئی تو قرۃ العین حیدر سے ملنے کی خواہش سرفہرست تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی تھی کیونکہ جب بھی جس سے تذکرہ کیا کہ میں قرۃ العین حیدر سے ملنا چاہتی ہوں اس نے ایسا سماں باندھا کہ میرے حوصلوں کے شہ پر ٹوٹتے نظر آئے۔ ایسے ہی ٹوٹے بکھرے لمحوں میں، میں نے ہمیشہ اللہ سے مدد مانگی ہے اور خود ہی اپنے آپ کو حوصلہ دیا ہے اور کامیاب ہوئی ہوں۔

چنانچہ 14 نومبر 99ء کا دن میری زندگی کے یادگار دنوں میں سے ایک ہے جب میں نے نہ صرف آج کی ایک بڑی ادیبہ سے ملاقات کی، اسے دیکھا بلکہ اسکے ہمراہ گھنٹوں گذارے۔ اس سے ہاتھ ملایا اور اس لمس سے اپنے ہاتھوں میں نوشگفتہ پھولوں کی مہک اب بھی محسوس کررہی ہوں۔ قرۃ العین کی مسکراہٹوں کے چراغ اب بھی میری فکر کی دنیا میں سامنے روشن ہیں۔

میں نے ان سے کہا کہ آپ ایک دو سطریں میرے نام لکھدیں۔ تو انہوں نے قلم سنبھالتے ہوئے کہا "دیکھو میری تحریر بڑی شکستہ ہوگی۔ اسے چھاپنا مت۔ میرے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے میرے ہاتھ میں مستقل تکلیف رہتی ہے۔" انہوں نے اپنا داہنا ہاتھ میرے سامنے کیا۔ میں نے اس عظیم لکھاری خاتون کے اس ہاتھ کو تصور میں عقیدت اور محبت سے بھرا بوسہ دیا۔ میرے ہونٹوں پر تتلیوں کے پروں کے رنگوں کی دھنک بکھر گئی اور ان میں کنول کی پتیوں کی خوشبو رچ بس گئی۔ میں سوچ رہی تھی۔ وقت ایسا موقع پھر زندگی میں کبھی دے نہ دے۔ وقت ہربار تو اتنا فراخدل

نہیں ہوتا کہ ہم جو مانگیں وہ عطا کر دے۔ اس وقت ایک محفل قرۃ العین حیدر صاحبہ کے گھر میں سجی تھی اور ایک "انجمن" میرے اندر آباد ہو رہی تھی۔ جیلانی بانو اور قرۃ العین گفتگو کر رہی تھیں اور میں سن رہی تھی۔ اس وقت ادب کے چاند ستارے ایک "سورج" کے گرد ہالہ کئے ہوئے تھے اور میں ان سب کی روشنی اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔ فکر کی اس روشنی سے چند کرنیں میں آپ سب کیلئے بھی لائی ہوں۔ یہ تحفہ ہے ایک اہل علم کا' ہر اس اہل علم' اہل ادب اور اہل ہنر کیلئے جو اسے پانے کا متمنی ہے۔

"گفتنی" کے حوالے سے ایک سوال تھا کہ بیسویں صدی میں اردو ادب میں زندہ رہ جانے والے وہ چند ادیب کون ہو سکتے ہیں۔ اس سوال کے جواب میں اسی فیصد قلم کاروں نے دیگر ادیبوں کے ساتھ محترمہ قرۃ العین کا نام لکھا ہے۔ اب میں اسی ہستی سے یہ سوال پوچھ رہی تھی وہ بے ساختگی سے بولیں۔ "بڑا مشکل ہے اس سوال کا جواب دینا اس لئے کہ ہر ذرہ جو ہے اپنی جگہ آفتاب ہے۔ سب ہی نے اردو کیلئے کچھ نہ کچھ کام کیا ہے۔ ادب کو پرکھنے کے' اسے سمجھنے کے یا اس کو یاد رکھنے کے ٹرینڈز بدلتے رہتے ہیں۔ جو چیزیں وکٹورین ایج (age) میں لکھی گئیں ان کو ہم آج نہیں پڑھتے لیکن اس زمانے میں وہ بہت مقبول تھیں۔ اس کے بعد اس صدی کے شروع میں جو لکھا گیا اس کو ہم آج نہیں پڑھتے حالانکہ وہ اس وقت بہت مقبول تھا کیونکہ اس زمانے کا ٹرینڈ تھا اور اس زمانے کے جو ادبی اسٹائل بن گئے تھے وہ اور تھے۔ موضوعات اور تھے' آج وہ نہیں ہیں۔ ادب ایک بہتا ہوا دریا ہے اب یہ کہنا کہ مستقبل میں کون باقی رہے گا اور کون نہیں یہ قبل از وقت ہوگا۔ لیکن ایک اندازے کے مطابق اگر ہم تعین کریں تو کچھ نام سامنے آتے ہیں۔ ہاں اگر آپ چنیت میں نکلتے ہیں۔ تو ل' محمد اکبر آبادی یا نیاز فتح پوری کے نام سامنے آتے ہیں۔ لیکن ان کا ادب بہت گریٹر (greater) لگتا ہے۔ لیکن اب ہمارے زمانے میں نہیں کھپتا۔ گو ان لوگوں کا ادب آج بھی اچھا لگتا ہے۔ "ان داتا" پڑھیے آج بھی کن ٹم پوریری (contemporary) ہے۔ تو میرے خیال میں اس ادب میں بہت توانائی تھی۔ چند لوگ ایسے تھے جو باقی رہ جانے والے لوگ ہیں۔ جیسے منٹو' بیدی' عصمت چغتائی ان ناموں پر ظاہر ہے سب لوگ اتفاق کریں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس کے بعد دوسری نسل آئی ان میں ایسے ایسے لوگ ہیں جن کا ذکر ہم اس شدومد سے نہیں کرتے ان میں بعض نام ہیں اشفاق احمد' بانو قدسیہ انہوں نے بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے چند چیزیں بہت اچھی لکھیں۔ کچھ نام مجھے یاد نہیں ہیں۔

میں نے زاہدہ حنا اور دوسرے نام لئے تو انہوں نے کہا۔ "یہ نئی پود ہے۔ ان لوگوں نے اپنی کوئی راہ نہیں نکالی ہے میرے خیال میں جو راستہ ان کو ان کے بڑوں نے دکھایا تھا تقریباً" یہ اسی پر چل رہے ہیں۔"

ان نئے لوگوں میں علی تنہا ہیں یا علی امام نقوی کے نام لئے جا سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ ان کا

جواب تھا۔ ''ان میں علی امام نقوی' کو اور انور قمر کو میں نے پڑھا ہے مگر یہ نئے لوگ نہیں ہیں۔ ان لوگوں نے یقیناً'' اپنی نئی راہ نکالی ہے۔ ان میں کچھ بات ہے۔ آپ نے ابھی امراؤ طارق اور فردوس حیدر کے نام لئے میں نے ان کو بھی پڑھا ہے۔ out-standing ایک چیز ہوتی ہے۔ یہ ان ناموں کے ساتھ بن کر اور ابھر کر سامنے نہیں آئی۔ پتہ نہیں آپ میری رائے سے اتفاق کریں گی یا نہیں لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آگے جا کر یہ چیز سامنے آئے۔ ابھی تو یہ سب لکھ ہی رہے ہیں کچھ عرصے کے بعد ہم دیکھیں گے ہو سکتا ہے ابھی تو کہنا مشکل ہے کہ یہ کیا رخ لیں گے۔ پچاس پچپن سال گزرے ہیں ابھی تو ترقی پسند تحریک کو اب یہ جن لوگوں نے لکھنا شروع کیا ہے ان کا رویہ اور ٹرینڈ جو بنتا ہے اس کا اندازہ مستقبل میں ہوگا۔''

اب میں نے ان سے سوال نمبر 3 کا جواب پوچھا۔ تب انہوں نے خود مجھ سے سوال کیا کہ '' جدیدیت کیا چیز ہے؟'' میں نے کہا۔ ''جو لوگ ترقی پسندوں کے حامی ہیں ان کا کہنا ہے کہ جدیدیت نام ہے ابہام کا۔ یہ گروپ ترقی پسندوں کی مخالفت میں وجود میں آیا۔ انہوں نے ترقی پسندوں سے ایک الگ راہ اپنائی ہے۔ اور اس کو جدیدیت کا لیبل دے دیا ہے۔''

قرۃ العین حیدر کا جواب تھا۔ ''میرے خیال میں جدیدیت میں کچھ بہت زیادہ غیر معمولی کارنامے انجام نہیں دیئے گئے۔ کوئی outstanding کام سامنے نہیں آیا۔ پھر ناموں کی بات سامنے آئے گی جو جھگڑے والی بات ہے۔ لیکن اس دور میں جس کو جدیدیت کا علم بردار کہا جاتا ہے ان میں کون لوگ ہیں؟ انور سجاد ہیں۔ اور نام لو۔ میں نے چند نام لئے۔ سریندر پرکاش، بلراج منرا اور انتظار حسین ہیں۔''

قرۃ العین کہنے لگیں ''انتظار حسین جدیدیت میں نہیں ہیں۔ انتظار حسین بذات خود ایک اسکول ہیں۔ داستانی ہیں اور انہوں نے بہت سوں کو ایک نیا راستہ دکھایا وہ بذات خود ایک مدرسہ ہیں۔ لیکن باقی جو لوگ ہیں انور سجاد' سریندر پرکاش ہیں بلراج منرا ہیں یہ ایک زمانے میں اینگری ینگ مین بن کر اٹھے تھے ان کے غصے کا کیا نتیجہ بر آمد ہوا؟ ان کے غصے کا کیا رخ نکلا؟ ترقی پسند تحریک نے تو لوگوں کو ایک حتمی راستہ دکھایا ایک تحریک بنی اور ذہنوں کی انہوں نے تربیت کی۔ وہ صحیح تھی یا غلط یہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن اس نے نوجوانوں کو بلکہ پوری دو نسلوں کو ایک راستہ دکھایا۔ ترقی پسند تحریک بہرحال ایک انسٹی ٹیوٹ ایک مکتب بن گئی تھی اس میں دو طرح کی چیزیں تھیں۔ ایک تو نیا طرز بیان اور نئی فکر تھی اور زندگی کو سمجھنے کا نیا رویہ تھا۔ جدیدیت نے کیا کیا ہے وہ میں ابھی تک نہیں سمجھ پائی ہوں۔ جیسے وہ لکھتے ہیں کہ وہ الجھا ہوا انسان وہ مکڑی کے جالے میں پھنسا ہوا آدمی۔ وہ الٹا ٹنگا ہوا آدمی۔ یہ سب کیا ہے؟ میرے خیال میں یہ سب شعبدہ بازی ہے ویسے انفرادی طور پر جدیدیت والوں نے بھی کچھ اچھی چیزیں لکھیں لیکن مجموعی طور پر کوئی بڑا کام سامنے نہیں آیا۔''

اب گفتگو جدیدیت سے مابعد جدیدیت پر آئی۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ مجھے بتائیں کہ مابعد

جدیدیت کیا چیز ہے؟

قرۃ العین حیدر کا جواب تھا۔ یہ سب جو قصے ہیں۔ یہ نقادوں کی پھلجڑیاں ہوتی ہیں۔ انہیں کچھ لکھنا ہے اور کچھ Dissucss کرنا ہے تاکہ لوگ قہوہ خانوں میں بیٹھ کر ان پر بحث کریں۔ طالب علمی کے زمانے میں ہم بھی یہی کرتے تھے کہ بھئی فلاں نے کیا لکھا اور فلاں نے کیا کہا۔ تو وہ سب شعبدہ بازیاں ہیں۔ مابعد جدیدیت کی ترکیب اور تعریف میری سمجھ میں تو نہیں آئی۔ ہاں جو اچھی چیز ہے جو اچھا فن پارہ ہے چاہے وہ 1890ء میں لکھا گیا ہو یا 1990ء میں۔ وہ اپنی جگہ پر اچھا ہی رہے گا۔ اس کے سیاق وسباق کا آپ اندازہ کر سکتی ہیں۔ لیکن ابہام والی تحریریں جیسے انھوں نے لکھی ہیں کہ الٹی مکھی کا چودھواں سفر یا بھڑ کے چھتے میں ٹنگا ہوا مرغا۔ یہ سب بچپنا تھا اور مسخرہ پن تھا۔ ایک تو ہندوستان میں اردو پڑھنے والوں کا حلقہ بہت محدود ہے۔ ایک بار بلراج منرا نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ جب لکھ رہی تھیں آپ کے سامنے ایک بہت بڑی انڈسٹری تھی۔ آپ کو فیڈ بیک (Back Feed) ملتا تھا۔ اب ہمارے سامنے کیا ہے۔ بات درست ہے خود میں بھی سمجھتی ہوں کہ پاکستان میں بھی کچھ حوصلہ افزا حالات نہیں ہیں۔ اردو بہت کم لوگ پڑھ رہے ہیں شوق ہی نہیں ہے۔ اردو پڑھنے والے رفتہ رفتہ کم ہوتے جارہے ہیں۔"

میں ان سے اگلا سوال پوچھا کہ قرۃ العین صاحبہ بیسویں صدی میں بہت کم ناول لکھے گئے ہیں کیا آپ اس سے متفق ہیں۔ تو اس کی وجوہ کیا ہیں؟ ان کا جواب تھا۔

"بھئی ہمارا ادب جو ہے اس کا بنیادی مزاج شاعری کا ہے۔ افسانے اور ناول کا نمبر دوسرا ہے۔ دوسری وجہ وقت ہے۔ ناول لکھنے کیلئے بہت وقت چاہیے حالانکہ یورپ اور امریکہ میں لوگوں کے پاس وقت کم ہے پھر بھی وہاں بہت لکھا جارہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں مانگ ہے۔ وہاں ریڈرشپ ہے' فیڈ بیک ہے جو ہمارے ہاں نہیں ہے۔ اور یہ بہت ضروری ہے۔ فیڈ بیک بڑی چیز ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ دربھنگہ میں رہنے والا میرے لئے کیا لکھ رہا ہے کیا پڑھ رہا ہے۔ یا پونا میں رہنے والا لڑکا ہمارے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔ یہ بہت بڑی وجہ ہے۔ بہت ناول لکھے گئے' بہت افسانے لکھے گئے لیکن ان میں سے آج کتنے پڑھے جاتے ہیں؟ ان کی readability ختم ہوگئی۔ کیوں ختم ہوئی کیوں کہ زمانے کا مزاج بدل گیا مجموعی طور پر دوسری دلچسپیاں پیدا ہوجانے سے بھی لوگوں کے مطالعے کی عادت ختم ہوتی جارہی ہے کیونکہ یہ جو میڈیا ہے اس میں اور بہت دلچسپ چیزیں آگئی ہیں۔ پہلے لڑکیاں کالج سے گھر آکر بھی پڑھتی تھیں ہم بھی کالج سے جب چھٹیوں میں گھر جاتے تھے تو لائبریری سے کتابوں کا ڈھیر لے کر جاتے تھے پڑھنے کیلئے۔ لیکن آج کل لڑکیوں کے پاس پڑھنے کا شوق نہیں ہے ان کی دلچسپی ٹی وی میں زیادہ ہوگئی ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ گو ہماری والدہ کی نسل کی جن خواتین نے اسکول میں نہیں پڑھا تھا مگر گھر پر سب تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ ان کا مطالعہ بھی بہت زیادہ ہوتا تھا۔ میری والدہ جن کا نام نذر سجاد حیدر تھا۔ (میں نے درمیان میں پوچھا محمدی بیگم

کون تھیں؟ قرۃ العین نے بتایا۔ وہ امتیاز علی تاج کی والدہ کا نام تھا۔) میری والدہ نے بہت ناول لکھے ہیں۔ اولین ناول جو انہوں نے لکھے تھے اختر النسا بیگم اور بچوں کیلئے کتابیں اور طبع زاد افسانے لکھے تھے۔"

"کیا انہوں نے کوئی رسالہ بھی نکالا تھا؟" میں نے پوچھا۔

نہیں رسالہ نہیں نکالا تھا۔ لیکن لکھا انہوں نے بہت ہے۔ 1910ء میں اماں "پھول" کی ایڈیٹر تھیں جبکہ وہ خود میرے خیال میں اس وقت پندرہ سولہ سال کی تھیں۔ اماں کی شادی سن 1912ء میں اٹھارہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ اس وقت ایسا ایک جوش پیدا ہو گیا تھا لوگوں میں یہ سرسید کی تحریک کا زمانہ تھا۔ مانا کہ سرسید نے عورتوں کیلئے تحریک نہیں دی تھی مگر ان کی وہ بات کہ جب مرد پڑھے لکھے ہوں گے تو ان کی عورتیں بھی پڑھ لکھ جائیں گی۔ انہوں نے کہا کہ بھئی لڑکوں کو پڑھاؤ لڑکے جب پڑھے لکھے ہوں گے تو وہ اپنے گھر کی بیٹیوں کو پڑھائیں گے اور وہی ہوا بھی۔ لہٰذا سرسید کی جنریشن میں وہ جو ایک عجیب وغریب تحریک جس نے امنگ حوصلہ اور ولولہ عورتوں میں پیدا کر دیا تھا۔ اس زمانے کی عورتوں کا ادب آپ پڑھیے تو میرے خیال میں کسی اور ہندوستانی زبانوں میں ایسا نہیں ہے کہ عورتوں کا ادب الگ ہو اور نہایت توانا ادب ہو۔"

"ان عورتوں کے نام بتایئے گا؟"

"صغریٰ ہمایوں مرزا' آمنہ نازلی۔ یہ اماں کی جنریشن کی خواتین تھیں۔ صالحہ عابد حسین تھیں ان کی والدہ اور خاتون اکرم تھیں راشد الخیری کی بہو اور بہت سی تھیں۔ ہاں حجاب امتیاز علی۔ کتنا بڑا نام ہے اردو ادب کا۔"

ڈاکٹر صغریٰ مہدی بھی گفتگو میں شریک تھیں کیونکہ یہ انٹرویو انہی کے گھر پر ہو رہا تھا۔ وہ بتا رہی تھیں "کہ میں نے جو ابھی جاپان کا سفرنامہ لکھا ہے اس میں میں نے لکھا ہے کہ ہمارے بچپن میں ایک منبر لاس ہوا کرتی تھیں وہ سفرنامہ لکھا کرتیں تھیں جاپان کا۔ وہ سفرنامہ ہم نے اپنے بچپن میں پڑھا تھا۔ تب سے ہم سوچتے تھے کہ جاپان ضرور جائیں گے۔"

قرۃ العین حیدر نے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا۔ وہ کہہ رہی تھیں "ہندوستان کی بہت سی زبانیں جو بہت ماڈرن تو نہیں ہیں۔ بہت توانا زبانیں ہیں اور بہت جیتی جاگتی زبانیں ہیں جیسے مراٹھی۔ تامل تو ہم جانتے ہی ہیں اردو ہندی مراٹھی اور گجراتی ان کا خاندان ایک ہی ہے اور ان کے ترجمے بھی بہت ہوئے ہیں۔ بنگلہ زبان کے ادب کا ترجمہ بھی ہوا ہے۔ یہ تراجم اس زمانے میں بھی پڑھے جاتے تھے۔ اس زمانے میں عورتوں کا ادب الگ سے پیدا نہیں ہوا۔ ان زبانوں کا اتنا شاندار اتنا حساس اور اپنے وقت کے حالات کو سمجھنے بوجھنے والا ادب عورتوں نے پیدا کیا یہ ادب عورتوں نے لکھا وہ عورتیں جو اسکول اور کالج نہیں گئی تھیں۔ پردے میں تھیں سوائے آمنہ نازلی کے خاندان کے۔ بیگم شاہنواز کا خاندان تھا میری والدہ کا خاندان تھا۔ یہ سب انگلیوں پر گنی جا سکتی تھیں۔

ڈاکٹر صغریٰ نے کہا۔ "ہماری والدہ بھی برقع اوڑھتی تھیں۔ 45 سال تک انہوں نے برقع اوڑھا۔"

"مگر ہماری والدہ نے 1920ء میں برقع چھوڑ دیا تھا۔ اس کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کا جو آئیڈیل تھا وہ ترکی تھا۔ اب عرب ممالک نے تو ترکی نے کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ انہیں پتہ ہی نہ تھا کہ ترکی کیا چیز ہے۔ ترکی نے ترقی کی' ترکی یورپین تھا' ترکی میں عورتیں بہت ماڈرن تھیں ہمارے والد ترکی پر عاشق تھے وہ ترکی زبان جانتے تھے۔ چنانچہ جب مصطفیٰ کمال نے قانوناً" ترکی سے پردے کا رواج ختم کیا اور کہا کہ کل سے عورتیں نقاب نہیں پہنیں گی کیونکہ عورتوں کی پس ماندگی کا ایک سبب یہ ہے کہ ان کو پردے میں رکھا جاتا ہے۔ برقعے میں لپیٹا جاتا ہے چنانچہ عورتیں باہر نکلیں اور دنیا مان گئی۔ 1918ء تک ہماری والدہ بھی پردہ کرتی تھیں لیکن وہ روایتی برقعہ نہیں پہنتی تھیں۔ انہوں نے ایک نیا برقعہ ایجاد کیا تھا۔ وہ ایک گاؤن پہن لیتی تھیں اور سر پر رومال باندھ لیتی تھیں جیسے عربوں کا ہوتا ہے۔ مراکشی حجاب تھا وہ جسے پہن کر موصوفہ باہر نکلتی تھیں۔ اس کے بعد ابا جان نے کہا کہ مصطفیٰ کمال نے پردہ ختم کردیا ہے تم بھی اسے چھوڑ دو۔ چنانچہ اماں نے فٹافٹ چھوڑ دیا۔ اماں نے برقعہ اتارا اور پھر انہوں نے علی گڑھ کی ساری خواتین کا برقعہ اتروادیا۔ علی گڑھ میں بہت سی خواتین تھیں بیگم ہادی حسن وغیرہ۔ عطیہ فیضی تو پہلے سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ وہ معبئی میں رہتی تھیں وہاں کی معاشرت اور وہاں کا انداز ہی مختلف تھا۔ بوہرہ' خوجے اور میمن لوگ چونکہ مرکنٹائل فیملیز تھیں۔ کیونٹیز تھیں ان میں میانہ روی تھی۔ چنانچہ اس طرح ہماری خواتین میں انقلاب آیا۔ دراصل ہمارے ہاں سوشل ہسٹری نہیں لکھی گئی۔ ہمارے ہاں معاشرتی انقلاب بتدریج آیا ہے یہ نہیں ہوا کہ راتوں رات لڑکیوں نے فراکیں پہن لی ہوں۔ جیسا کہ مڈل ایسٹ میں ہوا۔ ہمارے ہاں اعتدال قائم رکھا گیا۔"

"آپ کے والد صاحب کا ادب کا مطالعہ کیسا تھا؟ نوعمری میں؟ کیا ان کے مطالعاتی رجحان نے آپ کی معاونت کی؟ میں نے پوچھا۔

"میرے والد صاحب کا جب انتقال ہوا تو میں سترہویں سال میں تھی۔ اس وقت کی بات چھوڑیئے۔ وہ تو بچپن کی بات تھی۔"

"تو کیا گھر کا ماحول ایسا تھا جس سے آپ کو مہمیز ملی؟"

"گھر کا ماحول بہت ولایتی تھا۔ میں نے کہا نا کہ ہماری والدہ نے سن 18ء میں پردہ چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے ہمارے گھر کے ماحول میں گھٹن نہ تھی۔"

"آپ کی پیدائش کہاں ہوئی؟"

"علی گڑھ میں۔ اماں ہماری روایت پسند بھی تھیں۔ سرسید کا کہنا تھا کہ ہمیں نئی چیزیں قبول کرنا چاہئیں مگر اپنا بنیادی ثقافتی ورثہ نہیں چھوڑنا ہے۔ یہ ایک نئی چیز تھی جو انہوں نے سکھائی۔ اس میں

ایک اعتدال تھا جو ہماری اماں اور ہم سب نے قبول کیا تھا۔ لہٰذا آپ دیکھئے کہ اس نے کیسا ذہنی انقلاب پیدا کیا۔ میں اس زمانے کی خواتین کی بہت قائل ہوں۔ خاص طور پر شائستہ اکرام اللہ جیسی خواتین بہت کم ملیں گی جنہوں نے اتنا کام کیا۔ اب ان پر کام ہونا چاہیے۔ آپ ''عصمت'' اور ''تہذیب نسواں'' کے پرانے پرچے اٹھائیے۔ ان لوگوں نے اپنا پورا پریس چلایا۔ پوری ایک تحریک چلائی ایک احتجاجی تحریک تھی وہ۔ ان خواتین کو کس نے یاد رکھا ہے جنہوں نے ویمنز لب (Women's Lib) شروع کی تھی۔ باجی رشیدہ لطیف تھیں بیگم شاہ نواز تھیں اور بہت سے نام ہیں جو مجھے یاد نہیں۔ یہ خواتین اسمبلی میں پہنچیں بیگم بھوپال بہت زبردست خاتون تھیں۔ انہوں نے بہت کام کیا ہے خواتین کیلئے پہلی خاتون تھیں ہندوستان یونیورسٹی کی وہ چانسلر تھیں اس کے بعد کوئی نہیں ہوئیں۔ یعنی یہ 1920ء کی بات ہے جب علی گڑھ یونیورسٹی قائم ہوئی تو پہلی چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی کی جو بنائی گئی تھیں وہ بیگم بھوپال تھیں وہ نقاب پہن کر سارے کام کرتی تھیں باہر آتی تھیں تقریریں کرتی تھیں۔ بھئی یہ بہت بڑی چیز تھیں۔ بھوپال کی خواتین تعلیم میں مقابلتاً'' (Comparatively) بہت آزاد تھیں۔ وہاں کی جو فرماں رواں تھیں تین جنریشن تک تین خواتین نے حکومت کی۔ 1- سکندرا جہاں بیگم' 2- شاہ جہاں بیگم' 3- سلطان جہاں بیگم' تین بیگمات نے حکومت کی وہاں یہ نہیں تھا کہ شوہر ان کے نواب تھے اور وہ بیگمات تھیں۔ وہ بیگم تھیں کام کرنے والی۔ باقاعدہ تخت پر بیٹھ کر کام کرتی تھیں۔ اچھا اس میں ایک دلچسپ بات یہ کہ ہماری اماں نے جب مضامین لکھنے شروع کیے تو بڑی دھوم مچی ان کی۔ ظاہر ہے شادی سے پہلے وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھیں۔ لیکن وہ سائیکل چلاتی تھیں اپنے والد کے باغ میں۔ پردے میں تھیں لیکن سائیکل چلانا سیکھی تھی۔ انہوں نے گولف بھی سیکھی تھی اور انگریزی وغیرہ پڑھ لی تھی اس وقت Upper Middle Class گھرانوں میں میم آتی تھی انگریزی پڑھانے۔''

''آپ نے سائیکل چلائی؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔

''سائیکل بہت چلائی میں نے۔ اور گاڑی بھی چلائی لیکن گاڑی میں نے بہت زیادہ نہیں چلائی کیونکہ میں بہت نروس ہوں مجھے Right اور Left نہیں معلوم۔ اگر مجھے Right کو جانا ہے تو میں Left مڑ جاؤں گی۔ تو میں کیوں دوسروں کی جان خطرے میں ڈالوں۔'' وہ ہولے سے ہنسیں۔

''آپ کو فوٹوگرافی کا شوق رہا؟'' میں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی تھی۔

''ہاں فوٹوگرافی کی میں نے۔ پینٹنگ بھی کی۔ ڈانس بھی سیکھا میں نے ستار بجانا سیکھا۔ بھئی ہر فن مولا ہوں۔ سائیکل میں نے بہت چلائی سائیکل پر کالج جاتی تھی۔ بھئی وہ زمانہ بہت کمال کا تھا۔ پیانو بجانا بھی سیکھا۔''

''ابتدائی پڑھائی آپ نے کہاں کی؟''

''دہرہ دون میں' پھر لکھنؤ I.T.College میں پھر اس کے بعد دہلی نمبر اس کالج میں پھر لکھنؤ

یونیورسٹی میں۔"

"اچھا جب آپ نے پہلا افسانہ لکھا تو کس رسالے میں اشاعت کے لئے بھیجا تھا؟"

"پھول میں لکھتی آئی تھی بچپن سے۔ پھول اخبار جو تھا لاہور کا۔ اس میں بچوں کی کہانیاں لکھتی تھی۔ پہلا انعام دس روپے ملا تھا تو بہت خوش ہوئے تھے ہم۔ اوہو دس روپے۔ مجھے پہلا انعام ملا تھا "بی چوہیا" کی کہانی پر۔"

"پھر اس کے بعد کن رسالوں میں لکھا؟"

"پھول" کے بعد "تہذیب نسواں" میں لکھا۔ ترجمہ کیا تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے مسز وجے لکشمی پنڈت، سیلف لوکل گورنمنٹ کی وزیر ہوئی تھیں وہ جواہر لال نہرو کی بہن تھیں۔ ان کا ایک مضمون چھپا تھا The Story of Pink Carpet اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ میں جب لوکل سیلف گورنمنٹ کی وزیر بنی اور جب اپنے دفتر میں گئی تو وہ مجھے بہت اجاڑ لگا۔ چنانچہ سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ دفتر کیلئے گلابی رنگ کا قالین منگوایا۔ وہ بہت اچھا مضمون تھا۔ شاید "stateman" میں چھپا تھا۔ اس زمانے میں ہم لوگ رنگون میں تھے۔ میں نے پڑھا اور اس کا ترجمہ کیا۔ "گلابی قالین کی کہانی" وہ بھیج دیا۔ اور وہ چھپ گیا۔ بس اس کے بعد ہم لکھتے رہے اور چھپتے رہے۔"

"ساقی" میں لکھا؟

"ساقی" میں بہت بعد میں لکھا۔ بی اے میں آکر۔ "ساقی" میں لکھا "ہمایوں" میں لکھا۔ ہاں "ادب لطیف" میں لکھا۔ "نیرنگ خیال" میں لکھا۔ وہ بند ہو گیا تھا۔

"اس وقت آپ کو اپنے کچھ مداحوں کے خطوط بھی ملے ہوں گے یا ایسا بھی ہوا کہ کسی نے آپ کی تحریر سے اتفاق یا اختلاف کیا ہو؟"

"بہت پسند کیا بھئی ہم نے جو پہلے لکھا۔ پہلی دفعہ سے لیکر کوئی افسانہ واپس نہیں آیا جب واپس نہیں آیا تو ہمت بڑھ گئی۔"

"پاکستان میں بھی آپ کے ناول چھپے ہیں ان کی رائلٹی ملی آپ کو؟

"توبہ کیجئے رائلٹی کیا ملے گی۔ میں نے بتایا کہ جیلانی بانو نے تو وہاں جاکر باقاعدہ احتجاج کیا تھا انہیں کچھ تو معاوضہ ملا تھا۔ "لیکن ہم نے کچھ نہیں کیا۔" وہ بولیں اس بار جو میں گئی تھی تو ایک پبلشر نے کچھ رقم دی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں دیا اور لاکھوں روپے کمائے انہوں نے۔"

"کچھ عرصہ آپ پاکستان میں بھی رہی رہیں؟"

"میں رہی تھی کوئی پانچ سال 48ء سے 52ء پھر یورپ سے واپس آئی تو پھر رہی دو تین سال۔ اسکے بعد میں انڈیا آگئی۔"

"اردو کئی زبانوں کا مجموعہ ہے لیکن دیکھا جارہا ہے کہ انگریزی زبان کے الفاظ کی شمولیت سے گریز کیا جاتا ہے۔ جبکہ انگریز دنیا کی بڑی علمی زبان ہے۔ تو آپ کے خیال میں اگر انگریزی زبان کے الفاظ شامل ہوں تو کوئی حرج تو نہیں؟"

"تو کوئی آج سے تو انگریزی الفاظ شامل نہیں ایک زمانے سے شامل ہیں۔ بھئی دیکھئے آپ اردو میں انگریزی کے الفاظ کہاں تک شامل نہیں کریں گی آپ Doctor کہتی ہیں۔ اسکول کہتی ہیں کالج کہتی ہیں Hospital کہتی ہیں آپ کیسے نکال دیں گی۔ زبان بڑھتی پھولتی پھیلتی ہے تو اس میں ہر زبان کے الفاظ آتے ہیں آپ کیسے روک سکتی ہیں۔ ناول کیلئے کیا لفظ ہے آپ کے پاس؟"

"اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ نہ نظریاتی نہ علمی نہ ادبی..... آپ کا کیا خیال ہے؟"

"بھئی تنقید کی بات مجھ سے نہ کرو۔ تنقید میں پارٹی بازی بہت ہے تنقید میں ذاتیات بہت ہے۔ ہاں لکھ دیجئے کہ تنقید میں خالص تنقید بہت کم رہ گئی ہے ذاتیات' دوستیاں یا جھگڑے وہ سب شامل ہو گئے ہیں۔"

"پاکستان اور ہندوستان میں اردو ادیب کی زندگی میں بحران ہے۔ یہ حالات کس طرح بہتر ہو سکتے ہیں؟"

"اب یہ بہت بڑا سوال ہے۔ جو ملک کے حالات ہوں گے وہی ادیب کے حالات ہوں گے۔ ادیب کوئی الگ سے تو کسی جزیرے میں نہیں ہے اگر ملک کے حالات اچھے ہوں گے تو اس کے حالات بھی اچھے ہوں گے اگر ملک کے حالات خراب ہیں تو اس کے حالات بھی خراب ہوں گے۔ اگر ملک کی ذہنی حالت خراب ہے اس میں وہ اپنے آپ کو بچائے رکھے یہی بہت بڑی بات ہے۔ سلطانہ آپ ویسٹ میں رہتی ہیں تو آپ کو Third World کا اندازہ نہیں کہ یہاں کے حالات ایسے نہیں کہ ایک چیز نہیں ہے۔ بہت سے معاملات ہیں اتنے الجھے ہوئے معاملات ہیں کہ اگر آپ شروع کریں ان کے بارے میں بیان کرنا تو سویرا ہو جائے گا۔ تو اس میں جو بھی بیٹھا ہوا کچھ کر رہا ہے بس کر رہا ہے۔"

"پاکستان کا ادب بھی آپ پڑھ رہی ہیں یہاں کے اور وہاں کے ادب میں کچھ فرق پاتی ہیں؟"

ذریعہ ہے اپنے اظہار کا۔ یہاں پر ٹوٹل Freedom ہے آپ لکھئے نہ لکھئے گالی دیجئے نہ دیجئے کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ اس سے بڑا فرق پڑتا ہے۔"

"آپ کی زندگی کا کوئی اہم واقعہ؟"

وہ بہت زور سے ہنسیں۔ "ایک واقعہ؟ ہزاروں واقعات سے زندگی بھری پڑی ہے۔ میں اب "کار جہاں دراز ہے" کا تیسرا والیوم (حصہ) لکھ رہی ہوں۔ اس میں بہت سے واقعات ملیں گے۔"

آپ کس چیز سے خوف کھاتی ہیں۔ چھپکلی سے ڈرتی ہیں؟ میں نے پوچھا۔ کیونکہ بہت سی بے

خوف خواتین بھی چھپکلی سے ڈرتی ہیں۔ جانے کیوں؟ اور میرا خیال درست نکلا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"ہاں بھئی۔ چھپکلی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ حالانکہ اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا۔ آپ دیکھئے میں اکیلی رہی ہوں کیلاش ہوسٹل میں۔ شاید برسات کا زمانہ تھا سب لڑکیاں چلی گئی تھیں اور میں ایک یا دو ہفتے تک بالکل اکیلی تھی۔ رات کو پورا ہوسٹل اکیلا اور چاروں طرف سناٹا ہوتا تھا۔ نیچے دو چوکیدار اور اوپر وہ بیرا جو صبح چائے وائے لیکر آجاتا تھا۔ اور میرا پلنگ باہر برآمدے میں جنگلے کے پاس بچھا ہوتا تھا۔ سائیں سائیں اور ہوں ہوں کی آواز جو برسات میں آتی ہے۔ دراصل ہمیں بچپن سے ڈرنا سکھایا ہی نہیں گیا تھا۔ ہماری اماں نے بہت نڈر بنایا تھا ہمیں۔ ایک چیز مجھے اور یاد ہے کہ مجھے سانپ بچھو کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔ مجھے گڑیوں کا بہت شوق تھا۔ گڑیاں میں نے ہائی اسکول تک کھیلی ہیں۔ تو میرا گڑیوں کا ڈبہ جو تھا بڑا سا اس میں سے کچھ چیزیں میں نے پلٹیں تو اس میں سے ایک اتنا بڑا کیڑا نکلا ڈنک اٹھائے ہوئے تو میں نے کہا اماں اماں یہ دیکھیں ایک عجیب قسم کا جانور ہے دیکھیں تو۔ جناب وہ بچھو تھا اتنا بڑا۔"

"عجیب قسم کا جانور" کہہ کر وہ زور سے ہنسیں۔ پھر بولیں "دراصل ہم جہاں رہتے تھے بڑی بڑی پرانی کوٹھیاں ہوتی تھیں بڑے بڑے کمرے ہوتے تھے اور لق ودق اونچی چھتوں والے گھر اور گھاس کے بڑے بڑے میدان ہوتے تھے تو وہاں سانپ بچھو جیسی چیزیں پائی جاتی تھیں۔"

اس کے بعد گفتگو زندگی اور موت کے فلسفے پر ہوتی رہی۔ میں نے ان سے ان کی تاریخ پیدائش نہیں پوچھی لیکن ان پر جو مضامین لکھے گئے ہیں اور جو مختلف جرائد میں شائع ہوئے ہیں ان میں پڑھا ہے جیسے نیا دور لکھنؤ مئی 1990ء' ماہنامہ پگ ڈنڈی امرتسر (سجاد حیدر یلدرم نمبر) کار جہاں دراز ہے جلد دوم اور دیگر تحریروں سے میں نے محترمہ قرۃ العین حیدر کے بارے میں ان کی کتابوں اور ان کے فن کے ضمن میں خاصا کچھ پڑھ رکھا تھا۔ ماہنامہ بیسویں صدی دہلی کی مدیرہ محترمہ شمع افروز زیدی نے بھی کچھ مضامین مجھے پڑھنے کیلئے دیئے تھے۔ ہندوستان کے ایک صاحب نے (جن کا نام میں نوٹ کرنا بھول گئی) محترمہ قرۃ العین حیدر پر ایم۔ فل کیا ہے۔ ان کا مقالہ بھی خاصا معلوماتی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔ "قرۃ العین حیدر کا نام آسمان ادب پر اس ستارے کی مانند روشن ہے جس نے صدیوں کی تاریخ' وقت کی چال ڈھال اور رفتار کا بنظر تعمق مطالعہ و مشاہدہ کیا ہو۔ ان کا اردو فکشن میں جو مقام و مرتبہ ہے وہ یقیناً" اردو ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی ولادت 20 جنوری 1926ء کو بمقام علی گڑھ ہوئی۔ بچپن میں ان کا نام نیلوفر رکھا گیا جسے بعد میں قرۃ العین حیدر میں تبدیل کردیا گیا۔ وہ قرۃ العین سے عینی بنیں اور آج وہ اپنے عزیز واقربا کیلئے عینی آپا ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے والد سجاد حیدر یلدرم جو اردو ادب کے معمار اور ایک عظیم اور اولین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں ان دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں رجسٹرار کے عہدے پر فائز تھے۔ قرۃ العین حیدر کی والدہ زہرہ حیدر شیعہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جبکہ

یلدرم سنی مسلک سے منسلک تھے۔ تاہم ان لوگوں کی آپسی رواداری نے کبھی کسی کو کسی قسم کے نظریاتی اختلافات کا شائبہ نہ گزرنے دیا۔ اسی مشترکہ تہذیبی خاندان میں قرۃ العین حیدر نے پرورش پائی اس ماحول نے انہیں وسیع النظری عطا کی اور ان کے تشخص میں غیر جانبدارانہ اور غیر تعصبانہ صفات پیدا کیں۔ 1929ء میں سجاد حیدر یلدرم رجسٹرار کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد 1930ء میں جزائر انڈیمان نیکوبار کے ریونیو کمشنر مقرر ہوئے تو قرۃ العین حیدر کو بھی ان کے ہمراہ جزائر انڈیمان نیکوبار جانے کی سعادت نصیب ہوئی اور اس طرح ان کا بچپن پورٹ بلئیر (جزائر انڈیمان نیکوبار) میں گزرا۔

قرۃ العین حیدر نے ابتدائی تعلیم علی گڑھ سے شروع کی۔ پھر کانونٹ اسکول دہرہ دون میں داخلہ لیا۔ بعد میں ازابلا تھاربن کالج لکھنؤ میں پڑھنے کا شرف حاصل ہوا اور 1947ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے انگریزی کا امتحان پاس کیا' کیونکہ زندگی کے آخری دور میں یلدرم مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر چکے تھے جب تک بقید حیات رہے یہیں مقیم رہے اور یہیں پر انھوں نے 12/ پریل 1942ء میں وفات پائی۔ لہٰذا اب قرۃ العین حیدر لکھنؤ ہی میں قیام پذیر تھیں۔ آرٹ کی تعلیم کے حصول کے لئے انھوں نے گورنمنٹ اسکول آف آرٹ لکھنؤ اور ہیدر لیز اسکول آف آرٹ لندن میں داخلہ لیا۔ جب ہندوستان کے سیاسی سماجی اور معاشرتی حالات نے کروٹ بدلی اور ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تو موصوفہ بھی حالات کے بے رحم دھارے سے متاثر ہوئیں اور پاکستان چلی گئیں۔ جہاں وہ کراچی میں وزارت اطلاعات ونشریات میں انفارمیشن آفیسر اور ڈاکومنٹری فلمز کی پروڈیوسر رائٹر تھیں۔ پی آئی اے کی انفارمیشن آفیسر' پاکستان کوارٹرلی کی ایکٹنگ ایڈیٹر اور پاکستان ہائی کمیشن لندن میں ایکٹنگ پریس اتاشی جیسے متعدد عہدوں پر فائز رہیں۔ 1961ء میں وہ دوبارہ ہندوستان چلی آئیں۔ یہاں ممبئی میں "امپرنٹ" اور "السٹریٹڈ" ویکلی آف انڈیا کے لئے ادارتی خدمات انجام دیں۔ وہ ساہتیہ اکادمی کے ایڈوائزری بورڈ فار اردو کی جنرل کونسل اور آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کے ایڈوائزری بورڈ فار اردو کی ممبر بنیں۔ سینٹرل بورڈ آف فلم سینسر بمبئی میں چیئرمین کی ایڈوائزر رہیں۔ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خود ایم اے۔ اردو نہ ہونے کے باوجود اردو ویزیٹنگ پروفیسر کے عہدے پر فائز رہیں۔

وہ اپنے بارے میں لکھتی ہیں۔

"یلدرم کے خاندان کو ان سب چیزوں پر بڑا فخر تھا' جو ایک زمانے میں انسانیت کا اعلیٰ ترین معیار سمجھی جاتی تھیں۔ یعنی تہذیب اور شرافت نفس۔ سید حسن ترمذی یلدرم کے نگر سگر دادا تھے۔ وہ ترمذ وسط ایشیا سے ہندوستان آئے۔ (ترمز آج کل سویٹ ترکستان میں ہے) اور صدیوں تک اس گھرانے میں علم کی وراثت ایک نسل دوسری نسل کے ہاتھ سونپتی گئی۔ یہ سب عالم لوگ تھے۔ روایتی قسم کے مولوی نہیں تھے لہٰذا علمیت کے ساتھ ساتھ زندگی کی لہر بھی قائم رہی۔ اس گھرانے

کی ایک بی بی سیدہ ام مریم نے قرآن شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ سیدہ ام مریم کی بیٹی یلدرم کی ماں تھیں۔ قصبہ نہٹور (ضلع بجنور) ان لوگوں کا وطن تھا۔ غدر 1857ء میں یلدرم کے دادا میر احمد علی نے زور و شور سے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ لہٰذا جاگیریں ضبط ہوئیں اور زوال آیا اور نئی پود کو انگریزی پڑھنا اور سرکاری ملازمتیں کرنا پڑیں۔"

واقعتاً "ایک دور تھا جب ہندوستان میں مسلم علماء نے انگریزوں کے ساتھ ساتھ انگریزی کی بھی مخالفت کی لیکن بعد میں قرۃ العین حیدر کے خاندان نے وقت کی نبض کو پہچانتے ہوئے دوسرے علوم کے ساتھ انگریزی تعلیم کی جانب توجہ دی۔ یہ تعلیم صرف مردوں ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ عورتوں کو بھی اس تعلیم سے آشنا کیا گیا۔ جیسا کہ ذکر ہوا قرۃ العین حیدر نے خود انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ انہیں شروع سے انگریزی ادب سے اس قدر لگاؤ رہا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے دوران تعلیم صرف کیٹس پر تنقید کی پندرہ کتابیں پڑھ ڈالیں۔ یہ شوق محض پڑھنے کی حد تک نہیں تھا بلکہ انہوں نے ابتدائی دور میں نظمیں وغیرہ بھی لکھیں جو انگریزی رسائل و جرائد میں شائع ہوئیں۔ قرۃ العین حیدر اپنے بارے میں لکھتی ہیں۔

"ان دنوں ظہور ماموں کے ہاں سمندر کے رخ برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر میں نے بے حد ننگ کی اور بے حد نظمیں لکھیں۔ طویل' مختصر' امیجسٹ' تجریدی' علامتی' آپ صنف کا نام لیجئے' کھٹ سے نظم تیار۔ آمد ہی آمد ہے ان میں سے چند جو ضائع ہونے سے بچ رہیں پاکستان ٹائمز اور پاکستان کوارٹر میں شائع ہوئیں۔"

قرۃ العین کو آرٹ' موسیقی اور ڈرامہ سے خاص رغبت رہی ہے علاوہ ازیں تاریخ' فلسفہ' اور سیاست پر بھی ان کی طائرانہ نظر ہے۔ ان کا شمار ان قلمکاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے تقسیم وطن کے اردگرد کے دور میں لکھنا شروع کیا۔ انہوں نے بہت سے مختصر اور طویل افسانے' ناول' ناولٹ' رپور تاژ اور تراجم اردو ادب کو دیئے ہیں جن میں ہر لحظہ وقت کے کسی نہ کسی رخ کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کا انداز بالکل انوکھا اور منفرد ہے۔ وہ اپنی روش آپ بناتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں شعور کی رو کو خاص اہمیت اور دخل ہے۔ ناولوں اور افسانوں میں زیادہ تر اودھ ہی کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے جس بناء پر ان کی کڑیاں ملتی جلتی نظر آتی ہیں۔ اسی لئے کسی ایک کاوش کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے (خاص طور پر ناول "آگ کا دریا" کو) ان کی دوسری تصانیفات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے جس کی بناء پر قرۃ العین کی تخلیقات کو پوری طرح سمجھنا ہر ایک کیلئے مشکل ہو جاتا ہے۔ اس بات کا احساس خود مصنفہ کو بھی ہے۔ اس ضمن میں وہ اپنے ایک افسانہ "جہاں کارواں ٹھہرتا ہے" میں یوں رقم طراز ہیں۔

"ایک روز میں نے بے حد خوش ہو کر چائے کے وقت سب کو یہ خبر سنائی کہ بھئی' ہمارا مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔ کسی کو یقین ہی نہ آئے۔ بھائی جان کے ایک دوست نے انتہائی سنجیدگی سے فرمایا

کہ کتاب کے ساتھ ساتھ ایک شرح بھی چھپوا لیجئے تاکہ پڑھنے والوں کو سمجھ میں آجائے کہ آپ نے کیا لکھا ہے۔"

قرۃ العین حیدر کے پانچ یا چھ افسانوی مجموعے' سات ناول اور پانچ ناولٹ شائع ہو چکے ہیں۔ 1- ستاروں سے آگے۔ افسانوی مجموعہ 1946ء'2- میرے بھی صنم خانے ناول 1949ء'3- سفینہ غم دل ناول 1952ء'4- شیشے کا گھر افسانوی مجموعہ 1954ء'5- آگ کا دریا ناول 1959ء'6- کار جہاں دراز ہے ناول' پہلی جلد 1977ء' دوسری جلد 1979ء'7- آخر شب کے ہم سفر۔ ناول 1980ء'8- گردش رنگ چمن ناول 1988ء'9- چاندنی بیگم ناول 1990ء۔

دیگر افسانوی مجموعے یہ ہیں۔ پت جھڑ کی آواز' روشنی کی رفتار' فصل گل آئی یا اجل آئی' جگنوؤں کی دنیا' پانچ ناولٹ یہ ہیں۔ دلربا' سیتا ہرن' چائے کے باغ' اگلے صنم موہے بیٹا نہ کیجئو اور ہاؤسنگ سوسائٹی۔

قرۃ العین حیدر نے بچوں کیلئے بھی کئی کہانیاں لکھیں' ترجمے بھی کئے علاوہ اس کے انہوں نے رپور تاژ' کوہ دماوند' جہان دیگر گلگشت' ستمبر کا چاند' خضر سوچتا ہے' اور تراجم ہمیں چراغ ہمیں پروانے (پورٹریٹ آف اے لیڈی' ہنری جیمز) آدمی کا مقدر (میخائیل شولوخوف) کلیسا میں قتل (ٹی۔ ایس ایلیٹ) الپس کے گیت (واسل بائی کوف) ماں کی کھیتی (چنگیز اعتماد وف) تلاش (ٹرومین کاپوٹ) وغیرہ اردو ادب کی نذر کئے ہیں۔

اردو فکشن میں قرۃ العین حیدر کی خدمات کے عوض انہیں متعدد اعزازات حاصل ہوئے ہیں۔ 1967ء میں "پت جھڑ کی آواز" پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔ 1969ء میں انہیں تراجم کے سلسلے میں سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1982ء میں مجموعی ادبی خدمات کے صلہ میں اترپردیش اردو اکادمی نے انہیں اپنے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا۔ 1984ء میں انہیں حکومت ہند نے "پدم شری" کے اعزاز سے نوازا۔ 1990ء میں سال 1989ء کے لئے وہ ہندوستان کے سب سے بڑے علمی وادبی اعزاز "گیان پیٹھ" سے سرفراز ہوئی ہیں جو ان کی 1969ء سے 1983ء تک کی ادبی خدمات پر مبنی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا جدید اردو فکشن میں نمایاں مقام ہے۔ ان کی تخلیقات کے مطالعہ کے بعد یہ بات کہنے میں کوئی عار نہیں رہتی کہ انہوں نے نثر میں شاعری کی ہے۔ ان کے ناول یا افسانوں کے نام عموماً" ایسی علامتیں ہیں جنہیں ہمارے شعراء نے اپنے اشعار میں پہلے بھی استعمال کیا ہے۔ لیکن قرۃ العین حیدر نے ان علامتوں کو فکشن میں منفرد اور الگ معنی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

QURATUL-AIN HYDER
140 J, SECTOR 25
JAL VAU, VIHAR
NOIDA 201301 INDIA

خدا کرے یہ خط [illegible] تک
[illegible] پہنچے۔ لیکن اس ملک میں یہ بھی ممکن نہیں۔
[illegible]

قمر علی

قمر علی عباسی

نیویارک

نومبر کے پہلے ہفتے میں، میں دہلی ہندوستان میں تھی۔ اور سخن در چہارم اور گفتنی کے انٹرویو لینے اور لکھنے میں مصروف تھی۔ محترم سیاح قمر علی عباسی کا تعارف لکھتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ کبھی میں نے شیخ یوسف کمبل پوش کی سیاحت بارے میں پڑھا تھا۔ وہی ایک مختصر تفصیل میں "گفتنی" کے قارئین کے لئے یہاں نقل کر رہی ہوں۔ یقین ہے ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

"انیسویں صدی ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب کے تذکرے میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی عوام' یورپی عوام اور ان کی تہذیب سے روشناس ہو رہے تھے اور اپنی تہذیب کے تحفظ کے لئے اقدامات بھی کر رہے تھے۔ یورپ کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہونے کیلئے یہ ضروری تھا کہ کچھ آزاد خیال افراد یورپ کا سفر کریں اور وہاں کے معاشرے کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ یورپ کی سیاحت کے ذریعہ سے یورپی معاشرے سے آگہی ضروری تھی۔ چنانچہ سیر و سفر کا دلدادہ دکن کا ایک شخص اس راہ میں آگے آیا اور

یوسف کمبل پوش کے نام سے مشہور ہوا۔

یوسف کمبل پوش کا سفرنامہ "عجائبات فرنگ" کے نام سے پہلی بار ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اردو سفرناموں کی تاریخ میں یوسف کمبل پوش کے سفرنامے کو تاریخ ساز اہمیت حاصل ہے۔ اور اس سفرنامے کو اردو کا اولین سفرنامہ تصور کیا جاتا ہے۔

یوسف کمبل پوش نے لندن' پیرس' افریقہ کے ساحلی شہروں کے ساتھ لزبن اور مصر کی سیاحت کی۔ ان تمام مقامات کی سماجی اور تہذیبی زندگی کی عکاسی کے ساتھ ساتھ کمبل پوش نے ہندوستان کی تہذیب سے بیرونی ممالک کی تہذیب کا موازنہ بھی کیا' انگلستان کی ترقیات کے ساتھ ساتھ اس نے ہندوستان کی غلامی کے اسباب پر بھی غور کیا اور اپنے سفرنامے "عجائبات فرنگ" کو اردو کا اولین اور انتہائی دلچسپ سفرنامہ بنا دیا۔

یوسف خاں کمبل پوش نے اپنے سفرنامے کے آغاز میں اپنی شخصیت کے بارے میں مختصر سی معلومات تحریر کی ہیں۔ "حال مؤلف" کے عنوان سے کمبل پوش نے لکھا ہے۔

"یہ فقیر' بیچ ۱۸۲۸ء مطابق ۱۲۴۴ھ کے حیدر آباد وطن خاص اپنے کو چھوڑ کر عظیم آباد ڈھاکہ' مچھلی بندر' گورکھپور' نیپال' اکبر آباد' شاہ جہاں آباد وغیرہ دیکھتا ہوا بیت السلطنت لکھنؤ میں پہنچا' یہاں بہ مدد گاری نصیبے اور یاوری کپتان ممتاز خاں منکس صاحب بہادر کی ملازمت نصیر الدین حیدر بادشاہ سے عزت پانے والا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ نے ایسی عنایت اور خداوندی میرے حال پر مبذول فرمائی کہ ہرگز نہیں تاب بیان۔ اکبارگی' ۱۸۳۶ء میں دل میرا مطلب گار سیاحی جہان مخصوص ملک انگلستان کا ہوا۔"

کمبل پوش کی اس تحریر سے ظاہر ہے کہ اس کے سفر کا مدعا محض مشاہدہ اور سیاحت تھا۔ وہ ۱۸۳۶ء میں کلکتہ سے انگلستان پہنچا اور انگلستان کے ایک ایک منظر کو اپنے سفرنامے کا موضوع بنایا۔

پاکستان کے ممتاز ناقد جناب تحسین فراقی نے کمبل پوش کے سفرنامے کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"کمبل پوش کے سلسلے میں ایک قابل تعریف بات یہ ہے کہ اس نے دوران سیاحت جو کچھ دیکھا یا سنا من و عن بیان کر دیا۔ ورنہ اردو کے آج کے بعض سفرناموں کا حال تو بیشتر یہی ہے کہ ان میں آدھ تیچہ دہی کا ہوتا ہے اور دو ہیچہ پانی کے۔ کم از کم کمبل پوش کے یہاں مجھے واقعاتی غلط بیانی اور مبالغہ آرائی نظر نہیں آئی۔"

عجائبات فرنگ' صرف یورپ افریقہ کے ساحلی علاقوں' پرتگال اور مصر ہی کی تہذیب و تمدن کا سامان اپنے اندر نہیں سمیٹے بیٹھا بلکہ اس میں ہندوستان کے اس عہد کے حالات کی طرف بھی بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ زوال آمادہ ہندوستانی ریاستوں کا حال' انگریزوں کی روزافزوں قوت'

ہندوستان کے لوگوں کی عمومی بے حسی' ریاکاری اور عیش پرستی کی بھی افسوس ناک تصویر سامنے آتی ہے۔

یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ "عجائبات فرنگ" اردو کا ایک اہم سفرنامہ ہی نہیں انیسویں صدی کی اس تہذیبی اور سماجی فکر کا بھی آئینہ دار ہے جس میں ملک کی آزادی اور جمہوری فکر کے ابتدائی نقوش مضمر تھے۔

ویسے سفرنامے لکھنا کبھی فیشن کا چلن بھی تھا۔ یہ ۱۹۶۵ء کا زمانہ تھا جب میں روزنامہ "انجام" میں صفحہ خواتین کی مدیرہ تھی۔ اس زمانے میں سید وجاہت علی کا سفرنامہ پڑھنے ملا جو ہر ہفتہ اخبار میں شائع ہوتا تھا۔ وہ اپنے زمانے کا مقبول سفرنامہ یوں ہوا کہ کسی کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ وجاہت علی جو حالات لکھ رہے ہیں ان سے گذرے بھی ہونگے۔

پھر مستنصر حسین تارڑ کا سفرنامہ "نکلے تری تلاش میں" سامنے آیا جو ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ ان کا دوسرا سفرنامہ "اندلس میں اجنبی" تھا۔ ان دونوں سفرناموں نے خوب دھوم مچائی۔ اسی زمانے میں محترمہ اختر ریاض الدین' ابن انشا اور دیگر کئی سیاحوں کے سفرنامے پڑھنے کو ملے اور یوں سفرناموں کا سلسلہ چل نکلا۔

۱۹۹۰ء میں امجد اسلام امجد نے بھی اپنا ٹورنٹو' امریکا اور ہندوستان کی سیاحت پر مبنی سفرنامہ "شہر در شہر" لکھا اور جناب مشتاق احمد یوسفی کے منع کرنے کے باوجود یہ تجربہ کیا۔ سفرنامہ تو امجد کی شگفتہ تحریر کی وجہ سے خاصا دلچسپ ہے اور امجد نے مزید سفر بھی کئے ہونگے پھر بھی جانے کیوں انہوں نے کان پکڑ لئے۔ یا ان سے کان پکڑوائے گئے کہ ان کا دوسرا سفرنامہ ملک در ملک سامنے آتے آتے رہ گیا۔

ان ناموں کے بعد سفرناموں میں جس نام نے پائیداری حاصل کی وہ محترم قمر علی عباسی کا نام ہے۔ قمر علی عباسی کسی کام کے کرنے کا بیڑہ اٹھالیں تو پھر اسے پایہ تکمیل سے بھی آگے کی منزل تک پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار لندن کیا گئے۔ بس پھر ان کے پیر سے زنجیر کے حلقے ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے۔ پھر قمر علی عباسی کہاں رکنے والے تھے۔ لندن میں ان پر جو گزری انہوں نے "جانے دیں ہوا جو ہوا۔" پر عمل نہیں کیا اور بلا کم و کاست بیان کر ڈالا اور پھر تو یہ سلسلہ ایسا چل نکلا کہ دلی دور ہے (جو دور نہ تھی) چلا مسافر سنگا پور' بغداد زندہ باد' نیل کے ساحل' برطانیہ چلیں' امریکا مت جائیو (حالانکہ امریکا نہ صرف خود آئے بلکہ بیوی بچوں سے بھی کہا "امریکا آجائیو") ایک بار چلو وینس' واہ برطانیہ' جانا سوئزر لینڈ' لاپیرس' قرطبہ قرطبہ۔ سب کی روداد کچھ ایسے شگفتہ انداز میں سناتے چلے گئے کہ اب عباسی صاحب کمبل کو چھوڑ دیں مگر کمبل انہیں نہیں چھوڑتا۔

داد کی مستحق تو نیلو فر عباسی ہیں جو عباسی صاحب کی غیر موجودگی میں ماں کی کی ذمہ داریوں

سے بھی نبرد آزما ہوتی ہیں اور اس خوش اسلوبی سے کہ عباسی صاحب کو کہنا پڑتا ہے بلکہ ایک خاموش معاہدے کے تحت ہر کتاب پر لکھنا پڑتا ہے "میرے ہر سفر کی منزل میرے ہر سفر کی ساتھی۔ نیلو فر عباسی۔"

بقول جناب خضر زیدی (پروپرائٹر ویلکم بک پورٹ) یہ جملہ لکھ کر بھائی قمر علی عباسی بھابھی صاحبہ کو ساتھ نہ لے جانے کے بعد تسلی دے دیتے ہیں۔ (بات تو سو فیصد درست لگتی ہے)

اس بات پر یاد آیا کہ ابن بطوطہ کے سفرنامے پر تبصرہ کرتے ہوئے محترم رئیس احمد جعفری (مرحوم) نے لکھا تھا کہ ابن بطوطہ کا جہاں داؤ لگ جاتا شادی کئے بغیر نہ رہتا۔" عباسی صاحب بھلے نیلو فر کو ساتھ نہ لے جاتے ہوں مگر آدمی ہیں دیانتدار۔ بددیانتی اور وہ بھی بیوی سے! سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ابن بطوطہ کی یہ خصوصیت بے شک عباسی صاحب نے اپنائی ہے کہ معمولی معمولی سی جزئیات بھی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیتے اور اس خوبی سے واقعات بیان کرتے ہیں کہ قاری قمر علی عباسی کے کاندھے سے کاندھا ٹکائے خود کو ان کے ساتھ ساتھ چلتا محسوس کرتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ انہوں نے بچوں کے لئے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کے ناول پر مبنی ٹی وی سیریل "بہادر علی' بادبان' شیر خان اور سیر سوا سیر" براڈ کاسٹ ہوئے اور خوب مقبول ہوئے۔ "لندن کی سیر" بی بی سی لندن سے نشر ہوا۔ بچوں کے عالمی سال میں ان کی کہانیوں کا کیسٹ بھی جاری ہوا اور ناول "بہادر علی" کو یونیسکو نے دنیا بھر کی زبانوں میں شائع کیا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ سے بھی انہوں نے ایوارڈ حاصل کیا ہے اور آل پاکستان نیوز پیپر ایسوسی ایشن نے ۱۹۹۲ء میں کالم نگار کے ایوارڈ سے بھی انہیں نوازا ہے۔ ان کا کالم "دل دریا" کے عنوان سے جنگ اخبار میں ہر ہفتے شائع ہوتا رہا ہے۔ (اب کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے)

قمر علی عباسی نے سندھ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز' ایم اے معاشیات اور پھر اردو میں بھی ایم۔ اے کیا۔ اپنے زمانے میں نامی گرامی مقرر تھے۔ طلبا سیاست میں بھی حصہ لیا ہے۔ اب بھی بولتے ہیں تو سیاسی مقرر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ریڈیو پاکستان میں کنٹرولر اور ریڈیو پاکستان کراچی کے اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ جس طرح قارئین میں اپنی تحریروں کی وجہ سے مقبول ہیں اسی طرح اپنی بانی میں بھی اپنے سامعین کی ہر صنف میں مقبول ہیں خصوصاً "صنف مخالف" میں۔

ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ جب خود بولتے ہیں تو کسی کو بولنے نہیں دیتے۔ چنانچہ میں نے "گفتنی" کا سوالنامہ انہیں پکڑا دیا۔ اب ان کی شگفتگی ملاحظہ ہو۔

اپنے خط میں لکھتے ہیں۔ محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ

السلام علیکم

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

آپ کا سوالنامہ اپریل کے مہینے میں ملا تھا۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ غالباً" یہ کسی بڑے نامی گرامی محقق کے لئے تیار کیا گیا ہے اور ہمیں غلطی سے بھیج دیا گیا ہے۔ اس لئے ادھر ادھر کر دیا۔ لیکن یہ سوالنامہ دوبارہ حضرت رئیس وارثی کی معرفت ملا اور تاکید بھی کی کہ اسے جلد بھر کر بھجوا دیں۔ اس بار اسے دوبارہ دیکھا اور محسوس ہوا کہ اس کے ہر سوال پر سوائے نام اور پتے کے تحقیق کی جا سکتی ہے اور دس میں سے نو پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں بچپن سے ڈاکٹر پسند نہیں اس لئے ایسا کوئی ارادہ نہیں۔

میں طنز و مزاح لکھتا نہیں بلکہ کوشش کرتا ہوں۔ تحقیقی مسائل، ان پر ذکر اور فکر حضرت مشفق خواجہ کا میدان ہے۔ انہی سے رجوع کرنا چاہئے۔ مجھے ایک بات سنجیدگی سے بتایئے اتنا مشکل اور ڈرانے والا سوالنامہ آپ نے بنایا ہے؟ کیوں؟ ہمارا خیال ہے اردو میں جو دو ڈھائی سو مشکل الفاظ شامل ہیں ان میں پونے دو سو تو اس سوالنامے میں شامل ہیں۔ اور نو آموز مصنف تو اسے پڑھ کر ہی کوچ کر جائے گا۔

اول تو آپ نے مجھ سے میرا نام پوچھا ہے۔ اگر آپ کو یہ بھی معلوم نہیں تو جانے دیں۔ ہاں پیدائش تعلیم، ملازمت اور مختصر سوانح پوچھی جا سکتی ہیں۔ اس کے لئے میں نے دو ضخیم کتابیں۔ قمر علی عباسی 32 ناٹ آؤٹ اور اک عمر کا قصہ ہے لکھی ہیں جو بازار میں ملتی ہیں آپ کو پیش کروں گا۔ مختصر یہ کہ پیدا ہونا نہ اپنے اختیار میں نہ مرنا۔

"اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے۔"

("عباسی صاحب لاس اینجلس میں آپ کی سوانح پر مبنی کتاب مجھے دستیاب نہیں ہوئی۔ تاریخ پیدائش آپ نے خود لکھی نہیں۔ عورتیں بے چاری خواہ مخواہ بدنام ہیں اس معاملے میں۔")

۲۔ جہاں تک بیسویں صدی کے اختتام کا قصہ ہے۔ اس میں ہمارا قطعاً" قصور نہیں۔ نہ اس کے شروع کرنے میں نہ ختم کرنے پر۔ اس صدی میں اردو ادب میں اتنے بڑے نام موجود ہیں کہ گنوانے میں اک عمر لگ جائے گی۔ بس یوں سمجھ لیں تین نام اہم رہے ہیں۔ شفیق الرحمان ابن انشا اور قمر علی عباسی۔ پہلے دو نام تو "کلفا" لکھ دیئے ہیں۔ ورنہ ایک ہی کافی ہے۔

۳۔ فکشن نے سارا جگایا جادو۔ ورنہ وینس کی گلی کوچوں میں کیا رکھا ہے۔ سارا حسن تو لفظوں اور جملوں میں ہے۔ اس سے ہم نے بھی عمر بھر دھوکا کھایا ہے۔

۴۔ موجودہ صدی میں کم ناول لکھنے کی وجہ کاغذ کی کمی۔ پرنٹنگ پریس کا مسلسل کرنسی نوٹ

چھاپنا۔ حسین خواتین کا اپنے ہی خاندان میں کسی نزدیکی کزن سے شادی کرنا اور پچیس پارٹ کے خوفناک سیریل فلموں کی پروڈکشن ہے۔ اور آخر میں سارا قصور فیملی پلاننگ والوں کا ہے۔

۵۔ آج کا ادیب کیا ہر شخص معاش کی تلاش میں ہے۔ امریکہ میں رہنے والا لاٹری کا ٹکٹ خریدتا ہے۔ ہر روز امید لگاتا ہے۔ مایوس ہوتا ہے۔ پھر امید باندھتا ہے ہمارے خیال میں اسے ہر روز ٹکٹ خریدنا چاہئے

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

۶۔ ہمارے خیال میں معیاری ادب وہ ہوتا ہے جیسے پبلشر شائع کر کے مصنف کو رائلٹی نہ دے۔ اور پڑھنے والا مفت کتاب حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

۷۔ پاکستان اور ہندوستان سے باہر زیادہ شاعری کی وجہ موسم ہے۔ سردیوں میں لوگ اور تو کچھ کر نہیں سکتے۔ مشاعرے منعقد کر لیتے ہیں اور لوگ اس بہانے شعر کہتے ہیں۔ پڑھتے ہیں۔ اہل محفل "کلفا" داد دیتے ہیں۔ جن سے شاعروں کے حوصلے اس حد تک بلند ہو جاتے ہیں پھر کہ مذاق مذاق میں شاعری شروع کر دیتے ہیں اصلی۔ اور جن پبلشرز کو اپنے ملک سے باہر جانا ہوتا ہے۔ وہ ان کے دیوان شائع بھی کر دیتے ہیں اور شاعری باقاعدہ عروج پاتی ہے۔

۸۔ اردو واقعی کئی زبانوں کا مجموعہ ہے اور اس میں وقت ضرورت انگریزی لفظ بھی شامل ہو رہے ہیں۔ اور وہ روز ترقی کر رہی ہے۔ اگر آپ اس سے متفق نہیں تو کوئی بات نہیں۔ ہم نے تو اردو بولنے والوں تک کو ترقی کرتے دیکھا ہے۔ انگریزی دنیا کی بڑی علمی زبان ہے۔ آپ کی اس رائے سے ہم متفق نہیں کیونکہ نہ یہ فرانسیسی علاقوں میں سمجھی جاتی ہے۔ نہ مشرق وسطیٰ میں اس کی زیادہ قدر و قیمت ہے۔ لیکن اگر آپ چاہتی ہیں کہ اردو میں انگریزی کے الفاظ شامل کریں تو کسی کو کیا اعتراض ہوگا۔ کم از کم انگریزوں کو نہیں ہے۔ ہم نے اپنے ایک انگریز دوست سے پوچھا تھا۔ وہ سمجھا ہی نہیں۔ اس لئے آپ انگریزی کے ساتھ جو بھی چاہیں کریں۔

۹۔ جہاں تک ہماری زندگی کے اہم اور دلچسپ واقعات ہیں وہ ہمارے دشمنوں سے پوچھیں۔ اگر وہ نہ ہوتے تو زندگی سپاٹ اور بے لطف ہوتی۔ ان کی وجہ سے ہمیں اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ اپنے آپ میں دلچسپی محسوس کی اور واقعات رونما ہوئے۔ اور بھی بہت سے لوگ ہیں لیکن ان تک کبھی ہماری رسائی نہیں ہوئی۔ آپ کیسے پہنچے گی کیونکہ اس مین کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔

۱۰۔ اردو ادب میں تنقید تو رہ گئی ہے۔ جس کا جواب نہیں ایک شاعر دوسرے پر کیچڑ تک اچھال دیتا ہے۔ آپ نے جو یہ پوچھا ہے کہ علاقائی زبانوں میں کوئی کام نہیں ہو رہا تو ہم سمجھ رہے ہیں آپ پاکستان میں دوسری زبانیں بولنے والوں سے تعلقات خراب کرانا چاہتی ہیں یہ مناسب

نہیں۔

ہم دشمن بنانے مخالف پیدا کرنے اور ہر شخص کو ناراض کرنے والی شخصیت نہیں ہیں۔ آپ کا منصوبہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو دو چار علاقائی دوست رہ گئے ہیں ان سے بھی ہاتھ دھو لیں۔ خدارا اس ارادے سے باز آجائیں۔ ہم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ یہ کام ہمارا پبلشر کرے تو حق بجانب کہ اسے بار بار کتابیں شائع کرنی پڑتی ہیں۔

آپ نے آخر میں لکھا ہے کہ تمام سوالوں کے جواب لکھیں تاکہ تعارف کے ذریعے خیالات کا اظہار بخوبی ہو سکے... اس لئے حسب حکم جواب عرض کر دیئے ہیں۔

آپ کے خط میں فوٹو کی فرمائش بھی ہے... حالانکہ اس کی چنداں ضرورت نہیں لیکن شاید بوقت گرفت کام آئے۔ اس لئے بھجوا رہا ہوں۔

میں انشاء اللہ اکتوبر کے آخر میں پاکستان جاؤں گا اور واپسی میں آپ کے لئے قمر علی عباسی ''تھرٹی ٹو ناٹ آؤٹ'' اور اک عمر کا قصہ لے کر آؤں گا اور پیش کروں گا۔ ان کتابوں کے لئے الماری میں جگہ رکھیے گا۔

MR. QAMER ALI ABBASI
8710 APT 2B
GRAND AVE ELMHURST
NY 11373 U.S.A.

[illegible] ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم [illegible]

قیصر تمکین

قیصر تمکین

لندن

''اچھا ادب وہی ہے جو اپنے عہد کا ترجمان ہو اور سچا ادیب بھی وہی ہے جو عصر حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔''

اس کسوٹی کے پیش نظر میں محترم قیصر تمکین کو بڑا اور سچا ادیب تصور کرتی ہوں ان کے کئی افسانے میں نے پڑھے۔ افکار میں ان کے اداریوں سے بھی فیض یاب ہوئی۔ ان کے بعض انٹرویوز بھی نظر سے گزرے اور ان کے خیالات جاننے کا موقع ملا۔ چنانچہ ''گفتنی'' کے لئے میں نے انہیں سوالنامہ بھیجا۔ یہ جنوری 1999ء کا قصہ ہے۔ یکم فروری 1999ء کا لکھا ان کا جواب آیا۔

سیدہ عزیزہ سلطانہ صاحبہ

بہت بہت سلام اور دعاہائے صحت و سلامتی قبول فرمائیے۔

آپ کا انتہائی قابل قدر خط معہ سوالنامے کے ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ اہل ادب کا تذکرہ مرتب کررہی ہیں۔ بہت خوشی ہوئی۔ اللہ مبارک کرے۔ دعا ہے کہ آپ یہ اہم ادبی خدمت بحسن و خوبی مکمل کرسکیں۔

مگر آپ بھی کہاں ادبی جواہر میں اس خزف ریزے کے شمول کا ارادہ کررہی ہیں۔ میں کیا ہوں؟ من آنم کہ من دانم۔ میرے حالات یا میری رائے کسی بھی طرح کسی مسئلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ ہاں میں آپ کے سوالنامے کی اس بات سے ضرور (اور شدید) اختلاف کروں گا کہ اردو میں انگریزی کے الفاظ نہیں شامل ہورہے ہیں۔ اے صاحب آپ نے بھی بے خبری کی انتہا کردی۔ اردو تو اب اس طرح مسخ ہوچکی ہے' اہل ادب کے ہاتھوں۔ جیسے کسی حسین چہرے پر تیزاب چھڑک دیا جائے۔ میرے خیال سے تو کوئی ایسا ادیب باقی ہی نہیں ہے جو انگریزی کی بیساکھیوں کے بغیر ایک جملہ بھی آسان اردو میں لکھنے پر قادر ہو۔ سچ پوچھئے تو پاکستان میں اردو نہیں بلکہ "اردش" قومی زبان بن چکی ہے نمونہ ملاحظہ ہو "میں چائے سپ کررہی تھی۔ گارڈن میں ٹینک میں فراگس ہاپ کررہے تھے۔ اسکائی بلیو پانی میں یہ گرین فراگ نیلم میں امیر لڈ لگ رہے تھے وغیرہ وغیرہ۔

آپ کے اہل ادب یہ اردش لکھ رہے ہیں۔ بھارت میں دیوناگری لپی میں اس کی اشاعت ہورہی ہے تو پھر نئی صدی میں اس طرح کے میل جول سے جو زبان وجود میں آئے گی اس کا نام بھی نیا ہوگا۔ بہرحال ہم سے کیا؟ "مثال قطرہ شبنم رہے رہے نہ رہے" خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔ میری معذوری پر کسی طرح کی خفگی کو جگہ نہ دیجئے گا۔ ننگ اسلاف۔ قیصر تمکین

میں خاک ہوجاتی اگر مجھے علم نہ ہوتا کہ وہ بے حد منکسرالمزاج انسان ہیں۔ محترم حیدر طباطبائی سے گفتگو ہوئی تو میں نے ان کی معرفت سوالنامہ بھجوادیا۔ اس دوران قیصر تمکین ہندوستان چلے گئے۔ پھر ان کی واپسی ہوئی تو میں نے انہیں خط لکھا کہ سوالنامے کے جوابات انہیں ہی دینے ہیں۔ ان کی طرف سے کوئی اور لکھے (ان کے بارے میں لکھے یہ دگر بات ہے) وہ قابل قبول نہیں۔

33 جون 1999ء کا لکھا ان کا خط آیا۔ یہ خط ان کے منتہائے مقصود کا کسی حد تک مظہر بھی ہے۔ لکھتے ہیں۔

یہ آپ کی واقعی ذرہ نوازی ہے کہ اس خاکسار کے بارے میں بھی اپنی بیش قیمت تصنیف میں کچھ شامل کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے دو وجوہ سے اس باب میں عدم دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اول تو یہ کہ اب یہ عمر نہیں ہے کہ اس طرح کے باجے تاشے میں حصہ لے کر اپنی "عظمت واہمیت" کا اعلان کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ واقعی کیا کارنامے انجام دیئے ہیں کہ ان پر مسرت کے شادیانے بجائے جائیں؟ چنانچہ میں نے (غالباً) کسی ایک مسئلے پر اظہار خیال کیا تھا باقی سوالنامہ کے درمیانی میں ادھر ادھر ٹال دیا۔ معلوم نہیں کیا ہوا۔

مجھے بہت شروع سے کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا شوق رہا ہے۔ ان کہانیوں کے ذریعہ میں زیر لب کچھ کہہ جانے کی کوشش کرتا ہوں اگر میں اپنی بات کہنے میں ناکام رہتا ہوں یا میرا قاری' اگر کوئی ہے۔ بنیادی یا مرکزی نکتے تک نہیں پہنچ سکتا ہے تو پھر کرشن چندر یا عباس کی طرح وعظ خوانی سے

کیا فائدہ؟ پورا برصغیر سیاسی نعرے لگانے والوں سے بھرا پڑا ہے۔ اگر کوئی کہانی کار زندہ اور بھرپور کردار نہ تخلیق کر سکے تو وہ ناکام ہے۔ یہ تو صرف پریم چند۔ منٹو اور عصمت چغتائی ہیں جو یونان قدیم کے دیوتاؤں کی طرح زندگی سے بھرپور ہمیشہ کے لئے جیتے جاگتے کردار پیش کر دیتے ہیں۔ میں منٹو کے آس پاس پہنچنے میں کوشاں ہوں اور جب تک کامیابی نہ ہو خواہ مخواہ کے نقارے بجانے سے فائدہ؟ اگر اب بھی آپ میری ''من آنم کہ من دانم'' قسم کی معذرت سے متفق نہیں ہیں تو سوالنامہ پھر بھیج دیجئے گا حتی المقدور کچھ کہنے کی کوشش کروں گا۔''

قیصر تمکین صاحب کے فرمان کے مطابق میں نے سوالنامہ پھر بھیجا۔ ادیبوں اور شعراء کی اس قسم کی نوازشات کی اب میں کسی حد تک عادی ہو چلی ہوں مگر اس حد تک ہی کہ اس سے خلوص کی مہک بھی لیتی ہوں۔۔۔۔ جرمنی کے ایک ادیب نے چند سطریں لکھیں جن کا مفہوم تھا ''مجھے کسی ''گفتنی'' و تنتی میں شامل ہونے کا شوق نہیں'' جیسے کسی سے دنگا کر کے بیٹھے ہوں۔ میں نے بھی ان کا خط پرزے پرزے کر کے باتھ روم والی ردی کی ٹوکری میں ڈالا کہ مجھے بھی از قسم بدسلیقہ لوگوں کو برداشت کرنے کا شوق نہیں جو لکھنے کی ''تہذیب'' سے بھی واقف نہ ہوں اور نام ایسے رکھتے ہوں جیسے ''دین کے علم کی روشنی'' وہی تو پھیلائیں گے اور عالم کو منیر بن کر منور کریں گے۔ میرے وجود میں کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ پھر مجھے 19 اگست 1999ء کا لکھا جناب قیصر تمکین کا خط ملا۔ میں نے ''ہمالہ'' سر کر لیا تھا۔ محبت سے معرکہ جیت لیا تھا۔ مجھے قیصر تمکین کا خلوص سے بھیجا ہوا تعارف مل چکا تھا۔ انہی دنوں میں نے خبر پڑھی کہ انہیں ادارہ فروغ اردو لاہور کی جانب سے بارہ ہزار روپے کا انعام ان کی کہانی ''مزار شریف'' پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہانی لاہور کے ماہنامہ ''نقوش'' میں شائع ہوئی تھی۔

آیئے اب قیصر تمکین صاحب کی میٹھی گفتگو سے کڑوے ذائقے کو بدلتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

عزیزہ مہر سلطانہ صاحبہ بہت بہت سلام، محبتیں اور دعاہائے صحت و سلامتی قبول فرمایئے۔

بعض شخصیتیں محبت کے لئے ہوتی ہیں، بعض محبت افزا ہوتی ہیں اور دو ایک محبت طلب ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ محبت طلب آپ ہیں۔ محض اپنی لگن اور مساعی سے آپ دشمنوں تک کو جیت لینے پر قادر نظر آتی ہیں۔ اب جو میں آپ کی فرمائش پوری کرنے یا آپ جناب کا حکم بجالانے پر آمادہ ہوتا جا رہا ہوں وہ آپ کی یہی مخلصانہ کوششیں ہیں۔ خدا کرے آپ ہر آئینہ کامیاب ہوں (آمین)

1- میرا پورا اصلی و قلمی نام ہے۔ شریف احمد قیصر تمکین علوی۔ لکھنؤ میں یکم جنوری 1938ء کو پیدا ہوا۔ رسمی تعلیم مذہبی تعلیم کے بعد ہوئی۔ شروع میں قرآن پاک حفظ کیا پھر چھٹی جماعت سے مروجہ تعلیم ہوئی انگریزی میں ایم اے کیا۔ ایل ایل بی تک پڑھا۔ مگر فائنل امتحان نہیں دیا بلکہ ایک سرکاری نوکری مل گئی تو دہلی چلا گیا۔ 1965ء میں انگلستان آ گیا اور یہیں مستقل قیام پذیر ہوں۔

بیسویں صدی میں تو چاروں طرف اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی کہکشاں سجی ہوئی ہے۔ یہ

ضرور ہے کہ تخلیقی اعتبار سے اول نصف صدی زیادہ بھرپور ہے جبکہ ساٹھ کی دہائی سے تاحال فکری و تخلیقی دھارے سست رہے ہیں۔ حالی، شبلی، ابوالکلام آزاد، حسن نظامی، عبدالماجد دریابادی اور نیاز فتح پوری (نثر میں) اقبال، جوش، فیض اور فراق (نظم میں) اور پریم چند، منٹو اور عصمت چغتائی (افسانہ نگاری میں) اور قرۃ العین حیدر اور شوکت صدیقی (ناول نگاروں) میں ہماری صدی کی بہتر اور موثر نمائندگی کریں گے ان کے ذکر کے بغیر اردو ادب کے تدریجی ارتقا کا حال اور فانی کا نام تو ضرور لوں گا۔ یہ دونوں نام ہمیشہ کے لئے زندہ رہ جانے والے ہیں۔

جدیدیت نے اردو کہانی اور ناول کا اسی طرح کباڑہ کیا ہے کہ جس طرح بھانڈ اور زنخے انیس و غالب کی گت بنایا کرتے تھے۔ اردو محل کی تعمیر میں جدیدیت کا باب ایک بیت الخلا کی حیثیت رکھتا ہے۔

ناول لکھنے کے لئے مطالعے، مشاہدے اور ژرف نگہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو میں پریم چند اور قرۃ العین حیدر کے علاوہ کسی کے پاس نہ مطالعہ ہے اور نہ مشاہدہ۔ ویسے تو ناول ہر نتھو، بدھو، خیرو لکھ لیتا ہے۔ خود میں نے اس طرف ہمت ہی نہیں کی۔ کیوں کہ من آنم کہ من دانم۔

ادیب ہمیشہ ذہنی، نفسیاتی اور روحانی بحران میں مبتلا رہا ہے۔ اسے نظام الملک طوسی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے وہ قیس عامری کی طرح راہ جنوں میں قدم رکھتا ہے۔ وہ نظام فکر کا متلاشی نہیں بلکہ اس کا خالق ہوتا ہے۔ اسے رہنمائی کی کیا ضرورت؟

معیاری ادب کی اصطلاح خود اتنی پیچیدہ اور اختلاف انگیز ہے کہ اس پر یا اس کے پیمانوں پر دو لفظوں میں کچھ کہنا ناممکن ہے۔ ادب صحائف موسوی یا عشائے ربانی کی طرح ناقابل ترمیم و تنسیخ معیاروں کا پابند ہو ہی نہیں سکتا۔ ادبی معیار ہمیشہ تغیر پذیر رہتے ہیں۔

نثر لکھنے کے لئے مطالعے اور سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی اصطلاحات اور لفظیات بنانا پڑتی ہیں اتنی محنت کوئی کیوں کرے؟ شاعری بہت آسان ہے گھسے پٹے لفظوں اور اصطلاحوں سے کام چل جاتا ہے۔ اس میں مشاعروں کے ذریعے اچھی خاصی رقم مل جاتی ہے۔ نثر نگاری "نیکی کر دریا میں ڈال" ہوتی ہے۔

یہ سوال قدرے حیرت انگیز ہے۔ اردو میں نالائق، کاہل اور کلاسیکی ادبیات سے ناواقف لوگ صرف انگریزی ہی لکھتے ہیں۔ پورے برصغیر میں غالباً کوئی ایسا ادیب و شاعر نہیں رہ گیا ہے جو انگریزی کی بیساکھیوں کے بغیر ایک مکمل جملہ اردو میں لکھ سکے۔ خاص طور پر پاکستان میں تو "اردو" نام کی کوئی شے ہی نہیں نظر آتی ہے۔ ہاں "اردش" کا چلن ہر طرف ضرور ہے۔ اردو کی ترقی تو انگریزی کے غلاموں نے پہلے ہی روک رکھی ہے۔ اب اس کا رسم الخط بھارتی ادیب ذبح کر رہے ہیں۔

میں کیا میری زندگی کیا۔ اول دن سے جوتے کھاتے گزری۔ بچپن اور لڑکپن میں صاحب

حیثیت رشتے داروں کے جوتے کھائے۔ پھر ہم مذہب و ہم عقیدہ حضرات نے چھپایا۔ ہندو مسلم مسئلے پر ہمیشہ ذہنی و فکری جوتے کھائے۔ یورپ میں کالے اور تیسری دنیا کے جنگلی کے حیثیت سے ہمہ وقت جوتے کھائے۔ آج کل رشدی۔ بنیاد پرستی' پاکستانی بم اور بال ٹھاکرے کے بہانے جوتے پڑتے رہتے ہیں۔ یہ "جوتے کاری" ایک خاص نبیؑ کے امتی ہونے کے رشتے سے ہوتی ہے۔ پڑتے سب پر ہیں۔ مگر خوش خور۔ حرام خور اصحاب محسوس نہیں کرتے وہ بات دوسری ہے۔

اردو میں تنقید بحیثیت فن کبھی نہیں رہی۔ ترقی پسند تحریک نے اس طرف پیش رفت کی تھی مگر پھر بھی "جیالے" سرکاری ملازمتیں پاکر۔ خلعتیں اور مناصب حاصل کرنے کے چکر میں مصلحت پسندیوں کے اسیر ہوگئے۔ ضرورت تنقید کی ہو یا تراجم کی یا علاقائی زبانوں پر کام کرنے کی۔ صاحب اہلیت کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ جوڑ توڑ کرنے والے اپنے حلوے مانڈے کے چکر میں رہتے ہیں یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر زمانے میں اور ہر ادب میں یہی ہوتا آیا ہے۔ اسی میں یقیناً" کہیں کوئی مرد خود آگاہ بھی ہوگا ہی۔ ادب زندگی کے دھارے کے ساتھ ہے اور ہمیشہ رواں دواں ہے۔ کہیں کہیں مشکل مقام بھی آئیں گے۔ عام طور پر آلائشوں کی گرم بازاری بھی ہوگی۔ پھر بھی زندگی کے دوسرے مظاہر کی طرح ادب میں بھی کوئی مبارک مقام ضرور آئے گا۔ ادب زندگی ہے اور زندگی بقول اقبال۔ جاوداں ہر دم جواں پیہم رواں رہتی ہے۔

آپ نے میرا کوئی پسندیدہ شعر' جملہ یا مقولہ جاننا چاہا ہے۔ میں نے کلام پاک حفظ کیا ہے اس کا ایک ارشاد ہر وقت نوک زبان پر رہتا ہے۔ سماعت فرمائیے۔

ان اللہ لا یغیر یا بقوم حتیٰ یغیر ما بانفسہم (یقیناً" اللہ کسی قوم کی بدحالیوں کو اس وقت تک رفع نہیں فرماتا ہے جب تک اہل قوم اپنے نفس میں تبدیلی نہ پیدا کریں)

آپ کا قیصر تمکین

جناب قیصر تمکین اپنے تعارف کے اظہار میں جتنا اختصار برتنا چاہتے تھے انہوں نے برت لیا۔ میں نے چوں کہ صحافت پڑھی ہی نہیں صحافت برتی بھی ہے۔ چناں چہ میرے اندر ایک متجسس صحافی اور ادیبہ جب یکجا ہوئیں تو یہ معلومات وجود میں آئیں۔ ملاحظہ ہو۔

جناب قیصر تمکین کی تصنیفات یہ ہیں۔ جگ ہنسائے (1957ء) خیر گر (1986ء) سوابتیکا (1988ء) اللہ کے بندے (1989ء) The Prophet and Procrustian یروشلم (1993ء) او یاسمین (1993ء)

ایک بار ان سے پوچھا گیا۔ آپ کے افسانے کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں اور کیا آپ افسانے میں علامت نگاری کے قائل ہیں؟

انہوں نے جواب میں کہا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہانی تو ہو لیکن کہانی کے پیچھے کوئی بات بھی ہو۔ مثلاً" ایک کہانی ہے اس میں دنیا کے مسائل بھی ہیں۔ میں ایک چھوٹا سا جملہ لگا کر آگے بڑھ

جاؤں کہ ایک ناکام شاعر ہے وہ سماج کو گالیاں دیتا ہے کہ لوگ مجھے نہیں مان رہے ہیں لیکن وہ اس بات پر توجہ دینے سے قاصر ہے کہ اس کے فن میں بھی کوئی سقم ہو سکتا ہے یا خلوص کی کمی ہے۔ اگر آپ میں ذرا سا بھی اخلاص اور اہلیت ہے تو آج نہیں تو کل دنیا آپ کو ماننے پر مجبور ہوگی۔ میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ جو واقعہ بھی مجھے متاثر کر رہا ہے اس کی وجوہ کی طرف ہلکا سا اشارہ کرتا چلوں۔ کہانی میں محض رمزیت نہ ہو۔ رمزیت کے چکر میں بعض لوگوں نے کہانی کو عوام سے دور کر دیا۔ اگر کوئی پڑھے گا نہیں تو لکھنے کا کیا فائدہ؟ اب بات کرتے ہیں علامت نگاری کی۔ علامت نگاری کوئی بری چیز نہیں ہے لیکن علامت نگاری فیشن کے طور پر نہیں ہونی چاہئے۔ علامت نگاری میں بھی کہانی کا عنصر ہونا چاہئے۔ ان سے پوچھا گیا "کیا کہانی کے بغیر افسانہ تخلیق کیا جا سکتا ہے؟" ان کا جواب تھا۔

"گو یہ اختلافی بات ہے لیکن بہر حال کہانی ہے۔ تمام آسمانی صحائف کا بنیادی مرکزی کہانی ہی رہا ہے۔ کہانی ہی کے ذریعے انہوں نے ہمیں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ افسانے کو میں لطیف احمد اکبر آبادی اور نیاز فتح پوری سے منسوب کروں گا۔ ہم نے ترقی پسند تحریک کے دور میں افسانے نہیں کہانیاں لکھیں۔ ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ اس نے افسانے کو زندگی سے ہم آہنگ کر دیا۔ پریم چند کے افسانے "کفن" کو ہم کہانی ہی کہیں گے۔ اسے ہم افسانہ نہیں کہہ سکتے۔ حجاب اسماعیل، پریم چند، منٹو اور عصمت چغتائی افسانہ نگار نہیں کہانی نویس ہیں۔ دیہاتی زندگی پر لکھی جانے والی احمد ندیم قاسمی کی کہانیوں کو کیا افسانہ کہیں گے؟ میں نے اپنے اطمینان کے لئے یہ فرض کر لیا ہے کہ افسانے میں رومانویت کا تصور رہتا ہے اور کہانی سراسر حقیقت نگاری پر مشتمل ہوتی ہے۔"

قیصر تمکین کا کہنا ہے کہ "ہر شخص کسی نہ کسی نظریے یا تحریک سے متاثر ہوتا ہے۔ اس حوالے سے کچھ لوگ منظر عام پر آجاتے ہیں اور کچھ لوگ اپنی تحریروں میں اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ فن کار کی مہارت پر منحصر ہے کہ وہ کس چیز کو نمایاں کرپاتا ہے۔ احمد عباس انتہائی ناکام ہیں۔ کرشن چندر کہیں کہیں کامیاب ہوئے ہیں۔ عصمت چغتائی بہت کامیاب ہیں۔ وہ آدمی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کیا ہے۔ کرشن چندر اور احمد عباس مقصدیت میں گم ہو جاتے ہیں اس لئے ان کی کہانیاں ابھر نہیں پاتیں۔ قرۃ العین حیدر کی کہانیوں میں زندگی ہے۔ انہوں نے افسانے سے آغاز کیا تھا لیکن وہ اب حقیقت نگاری کی طرف آگئی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے دور میں زندگی بردوش کہانیاں لکھی گئیں۔ بلاشبہ کہانی ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔"

MR. QAISER TAMKEEN 160 OAKS FORD
CWMBRAN NP44 6UN SOUTH WELES
U.K

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

لندن 14/5/1996 کنول نین پرواز

کنول نین پرواز

لندن

کنول نین پرواز ان کا تخلص ہے جبکہ خاندانی نام کنول نین چھکر ہے۔ 13 دسمبر 1926ء کو پاکستان کے شمال مغرب سرحدی صوبہ کے شہر' بنوں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد برٹش ریلوے کے ملازم تھے۔ پرواز صاحب اپنی روداد اس طرح بیان کرتے ہیں:

"میری عمر جب چار سال کی تھی تو اسکول میں میرا داخلہ ٹیکسلا (شمال مغربی سرحدی صوبہ) میں ہوا تھا۔ میرے تایا نے 1915ء میں اپنے آبائی وطن میانوالی پنجاب کو خیر آباد کہہ دیا۔ اس کے بعد شملہ بمبئی سے ہوتے ہوئے 1917ء میں نیویارک جا پہنچے۔ وہاں قیام کے دوران کئی برس مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب حالات سازگار ہوئے تو 1929ء میں نیویارک کے مشہور Fifth Avenue کے علاقے میں اپنا کھلونے کا کاروبار شروع کیا۔ انہوں نے میرے والد کو ریلوے کی نوکری سے استعفیٰ دینے کے لئے کہا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ میرے والد سری نگر (کشمیر) میں اپنا کاروبار شروع کریں اور یہاں سے کشمیری دستکاری کا سامان خاص طور پر قالین اور نمدے وغیرہ برآمد کر سکیں۔

1934ء میں والد صاحب نے سری نگر میں اپنا کاروباری دفتر قائم کیا اور 1935ء میں وہاں اپنا گھر

بسانے کے بعد ہم لوگوں نے کشمیری شہریت حاصل کی۔ میں نے اسکول اور کالج (بی اے) کی تعلیم وہیں مکمل کی۔ کشمیر میں طویل قیام کی وجہ سے چند لوگوں نے میرے ادبی حوالے سے مجھے کشمیری نژاد لکھا ہے اور مجھے اس پر فخر بھی ہے۔ امریکہ میں کاروبار اب اتنا پھیل چکا تھا کہ میرے تایا نے اپنے بیٹے کو نیویارک بلا لیا۔ پھر انہوں نے 1948ء میں میری کالج کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد مجھے بھی نیویارک آنے کے لئے کہا۔ میں 1948 سے 1951ء تک یورپ اور امریکہ کا کاروباری دورہ کرتا رہا۔ لکھنے لکھنا اور اشاعت کا سلسلہ 1944ء سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ پہلے انٹرمیڈیٹ کالج میں اور پھر ڈگری کالج میں میگزین کا ایڈیٹر بھی رہا۔ ان دنوں ڈاکٹر دین محمد تاثیر کالج کے پرنسپل تھے اور ان موجودگی میں ایک بڑی خوشگوار ادبی فضا قائم ہو گئی تھی۔ ان کے چلے جانے کے بعد محمود ہاشمی جب جموں کالج کو چھوڑ کر سری نگر ڈگری کالج میں اردو کے استاد تعینات ہوئے تو وہاں کے اردو زبان اور ادبی کاموں میں مزید نکھار پیدا کرنے میں ان کا بھی ایک تاریخی رول ہے۔ ان کے مشورے سے ہم نے وہاں ایک حلقہ "احباب ذوق" قائم کیا اور پھر اسے انجمن ترقی ہند مصنفین میں بدل دیا۔ محمود ہاشمی دونوں انجمنوں کے صدر تھے اور مجھے جنرل سیکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ آنجہانی پروفیسر عبدالقادر سروری (سابق سربراہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی) جب کچھ عرصے بعد سری نگر یونیورسٹی میں ایک اعلیٰ عہدے پر تعینات ہوئے تو انہوں نے "کشمیر میں اردو" کے عنوان سے تین جلدوں میں ایک تاریخی دستاویز تحریر کی۔ اس میں ہاشمی صاحب اور اس خاکسار کا بھی انہوں نے خلوص و محنت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

کالج کے زمانے سے ہی برصغیر کے ممتاز جریدوں میں میرے افسانے اور ڈرامے شائع ہونا شروع ہو گئے۔ اداکاری کا شوق بھی اسکول کے زمانے سے ہی تھا۔ کالج کے اہم ڈراموں میں بھی حصہ لیا ہے۔ ممتاز اداکار، ڈرامانویس اور براڈکاسٹر بلراج ساہنی 1947ء میں سری نگر آئے تو انجمن ترقی ہند مصنفین قائم کرنے کا مشورہ انہوں نے ہی دیا تھا۔ اس سال کے آخر میں بمبئی میں ان سے عوامی تھیٹر میں جس کے وہ ان دنوں روح رواں تھے جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو میں بھی عوامی تھیٹر سے منسلک ہو گیا۔ احمد آباد میں 1948ء میں عوامی تھیٹر کی سالانہ کانفرنس میں شرکت کی اور بمبئی گروپ کے ڈرامہ "بھوت گاڑی" جو خواجہ احمد عباس اور بلراج کے چھوٹے بھائی 'بھیشم ساہنی (جو ایک اچھے ڈرامانگار اور اداکار تھے) نے مل کر لکھا تھا۔ اس ڈرامہ میں میرا بھی ایک پارٹ تھا۔ اس عرصے میں بلراج ساہنی کے ساتھ جو ایک قریبی ربط قائم ہو گیا تھا جس کی بنا پر 1952ء میں انہوں نے بمبئی میں اپنی بیوی سنتوش اور چند دوسرے کلچرل کارکنوں کے ساتھ مل کر "جوہو آرٹ تھیٹر" کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے بانیوں میں 'میرا بھی نام شامل تھا اور اس کے دو ڈراموں میں بھی میں نے اہم پارٹ ادا کئے تھے۔ 1949ء میں ریڈیو کشمیر قائم ہو چکا تھا۔ اس دوران ریڈیو کشمیر کے لئے بھی نہ صرف ڈرامے اور فیچر لکھنے کا آغاز کیا بلکہ اس کے ڈراموں میں بھی باقاعدگی سے شرکت کرتا رہا۔ پھر

1952ء میں بمبئی لوٹنے پر ترقی پسند معیاری ماہنامہ "شاہکار" جس کی ادارت ساحر لدھیانوی، پرکاش پنڈت، ظ۔ انصاری، مخمور جالندھری، فکر تونسوی اور وامق جونپوری جیسی مایہ ناز شخصیتوں نے کی۔ میں بھی اس کا دو برس فلم ایڈیٹر رہا۔ 1949ء سے 1956ء تک باقاعدگی سے اس جریدے کے لئے افسانے رپوتاژ اور فلمی مضامین لکھتا رہا۔ 1954ء سے 1956ء تک ریڈیو کشمیر پر اسٹاف آرٹسٹ اور اسکرپٹ رائٹر کے عہدے پر فائز رہا۔ 1956ء میں مستقل سکونت کے ارادے سے برطانیہ چلا گیا اور جب سے یہیں ہوں۔ غم روزگار اور دوسرے ذاتی اور مالی مسائل کے پیش نظر، اردو ادب سے جیسے کئی برس ایک سنیاس لے لیا تھا۔ شروع شروع میں بی بی سی ورلڈ سروس کے ڈراموں میں باقاعدگی سے حصہ لیا لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن نہیں چلا۔ کئی برسوں کی طویل خاموشی کے بعد 1975ء میں میرا قلم جیسے پھر جنبش میں آگیا۔ 1973ء میں میرے عزیز دوست، بلراج ساہنی کی اچانک موت کی خبر سے مجھے صدمہ پہنچا۔ یہ غالباً" اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی کہانی لکھنے کے آغاز سے میرا دوسرا ادبی جنم ہوا۔ اس کہانی کو لکھنے میں تقریباً" پندرہ برس لگ گئے۔ اس دوران سہ ماہی عصری ادب (دہلی) ابلاغ (نوشہرہ) ارتقاء (کراچی) ادب لطیف (لاہور) افکار (کراچی) اور عوامی منشور (کراچی) کے لئے خاکوں، افسانوں اور مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

1997ء میں میری پہلی کتاب "بلراج ساہنی میرے یادوں کے سائے میں" ماہنامہ "فلمی ستارے" دہلی کے مدیر حاجی انیس دہلوی نے اپنے مکتب سے شائع کی۔ ایک ناولٹ "ٹوکیو اسٹریٹ" سہ ماہی ارتقاء (کراچی) میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک اور ناول ماہنامہ "ادب لطیف" میں قسطوں میں شائع ہو رہا ہے۔ اطلاعات کے مطابق ان دونوں ناولوں کا تذکرہ پاکستان کے ٹیلی وژن کے ادبی مباحثوں میں ہو چکا ہے۔ لکھنے کے ساتھ ساتھ "اردو تحریک یورپ" اور آزادی فکر و خیال کے فورم "کی انتظامیہ کمیٹیوں کا رکن اور "فیض کلچرل اکیڈمی" کا نائب صدر بھی ہوں۔

اردو ادب کے حوالے سے بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک جس کا احیاء 1936ء میں منشی پریم چند، سجاد ظہیر اور حسرت موہانی جیسی اہم شخصیتوں کے ہاتھوں وجود میں آیا۔ اس کی گود میں پرورش پانے والے جن ادیبوں نے زبان و بیان، فنی شعور اور رجحانات کی نئی راہوں کا تعین کیا، ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اسے پوری طرح درج کرنے کے لئے ایک دفتر کی ضرورت ہوگی۔ بہرحال اس صدی کے وسط تک یہ تحریک ایک ایسے دور میں داخل ہو گئی تھی جسے نشاط الثانیہ renaisance سے موسوم کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اردو ادب کو یہ رتبہ بخشنے والے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، اوپندر ناتھ اشک اور احمد ندیم قاسمی ایسے افسانہ نگار ہیں جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

فکشن جیسے لطیف آرٹ کی لطافت اور اس کے حسن کو بنانے سنوانے میں ہماری ترقی پسند تحریک کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ "جدیدیت" ادب میں ایک رجحان کے طور پر پیدا ہوئی۔ یہ کوئی تحریک

نہیں تھی اور اسی طرح "علامت' تجریدیت اور مزاحمیت" جیسے رجحانات نے بھی ہمارے ادب میں کسی حد تک ایک "کھنک چھنک" ضرور پیدا کی لیکن جدیدیت کو جس کے سب سے بڑے علمبردار شمس الرحمٰن فاروقی ہیں جیسے لوگوں نے اسے ایک تحریک کا نام دے کر یہ لوگ ترقی پسندی کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک میں ایک ایسا وقت بھی آیا' جب اس میں انتشار کے آثار نظر آنے لگے۔ اس کی ایک وجہ تو ادب اور فنی شعور کو مکمل طور پر ایک سیاسی نقطہ نظر کے تابع کرنا تھا۔ اس کے ایک بانی سجاد ظہیر کو بار بار یہ بات دہرانا پڑی کہ ادب اگر خود کو صرف نعرہ بازی تک ہی محدود کر دے تو وہ اچھا اور عہد ساز ادب بننے سے محروم رہ جائے گا۔ میرے خیال میں ہر دور کا ادب تب ہی "عہد ساز" ادب قرار دیا جا سکتا ہے' جب وہ ہر نئے رجحان کا احترام کرتے ہوئے بھی ایسے قوانین کا محتاج نہ ہو جو اسے کسی مخصوص نقطہ نظر کا غلام بنا دیں۔ جدیدیت تو ہمارے ادب میں بہت بعد میں آئی اور ترقی پسند تحریک کے احیاء سے پہلے ہی منشی پریم چند' جنہیں نئے اردو افسانے کا امام کہا جاتا ہے "عہد ساز" افسانے لکھ رہے تھے اور اپنے فن کی تخلیق کے لئے جس زندگی کی وہ ترجمانی کر رہے تھے' انہیں اس سے کسی ادبی یا سیاسی "ازم" کی "بیساکھیوں" کی ضرورت نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

چوتھے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ ہمارے ادب میں اردو ناول کم لکھے جانے کی سب سے بڑی وجہ وقت کی بے مائیگی ہے۔ اس سے میری یہ مراد ہے کہ ناول لکھنے کے لئے بہت وقت درکار ہوتا ہے اور ناول پڑھنے کے لئے بھی۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ایک اچھا ناول پڑھنے کے لئے موسیقی کی طرح ایک خاص "مزاج" کی بھی ضرورت ہے۔ اب ہمارے اردو ادب کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ کتابوں اور رسالوں کا خریدار بننے کے بجائے ہم مفت خوری سے زیادہ کام لینے لگے ہیں۔ اس سے ناول کا دائرہ بھی تنگ سے تنگ تر ہو رہا ہے۔

معیاری ادب کے پیمانے وہی لوازمات ہیں جن کی طرف شروع میں اشارہ کر چکا ہوں۔ شاعری ہو یا نثر' زبان و بیان کی سادگی جمالیات اور اپنے ماحول اور عہد کے معاشرتی تقاضوں سے ہمکنار ہو کر آگے بڑھتا ہوا ادب کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

ہمارے ادب میں ایک مدرسہ خیال ایسا بھی ہے جو اردو زبان میں انگریزی زبان کے الفاظ کو استعمال کرنے پر بالکل رضامند نہیں۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اردو زبان جب دنیا بھر میں جگہ جگہ اپنی بستیاں قائم کر رہی ہے تو وہاں کی زبانوں کے خاص طور پر انگریزی زبان کے جواب دنیا کی نمبرون زبان قرار دی جا رہی ہے کچھ اچھے اور روزمرہ کے مناسب الفاظ کو اردو میں داخل کرنے پر پابندی لگانا' بدلتے ہوئے حالات کا منہ چڑانے کے مترادف ہو گا۔

اپنی ادبی زندگی کے حوالے سے مجھے کم از کم تین بار المیہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلا واقعہ 1947ء کا ہے۔ سری نگر میں اس سال جب انجمن ترقی پسند مصنفین کا انعقاد ہوا تھا' اس میں بلراج

ساہنی کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ میری طرح ان کا بھی ان دنوں کشمیر میں گھر تھا' چند برس بی بی سی سے براڈ کاسٹ کرنے کے بعد وہ اب بمبئی میں مقیم تھے اور براڈ کاسٹنگ' تھیٹر اور ادب کی دنیا میں ایک بڑی شخصیت تسلیم کئے جاتے تھے حالانکہ بعد میں وہ زیادہ تر ایک بہت بڑے اور ممتاز فلمی اداکار کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ جب میں 1947ء کے آخر میں بمبئی گیا تو عوامی تھیٹر IPTA میں بلراج سے ملنے جایا کرتا تھا۔ سردار جعفری بھی اکثر وہاں آیا کرتے تھے۔ بلراج نے ان سے میرا تعارف کرایا اور میری افسانہ نگاری کے حوالے سے کچھ گفتگو ہوئی تو جعفری صاحب کہنے لگے کہ مختلف رسالوں میں شائع شدہ افسانے اگر انہیں دے دوں تو بمبئی کے ایک معروف مکتب سے جن کے ساتھ ان کا قریبی ربط تھا وہ اس کا مجموعہ شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں نے قریباً" بارہ یا پندرہ افسانوں کے مسودے ان کے حوالے کردیئے۔ دوسری ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ مکتب میں آگ لگنے کی وجہ سے میرے مسودے بھی آگ کی نذر ہوگئے تھے۔ میرے پاس ان افسانوں کی کوئی نقل بھی نہیں تھی۔

1956ء میں 'میں برطانیہ چلا گیا۔ یہاں لندن میں مستقل قیام کے ارادہ سے 1956ء تک میرے جو بھی افسانے' رپوتاژ اور قلمی مضامین ماہنامہ "شاہراہ" دہلی میں شائع ہوئے تھے' وہ سب میں ساتھ لے آیا۔ لندن میں قیام کے دوران میں نے ایک عرصہ تک لکھنے کا سلسلہ ترک کردیا تھا' اس کی ایک وجہ ذریعہ معاش کا تھا جس نے ادب کو کہیں پیچھے دھکیل دیا تھا۔ میرا اشاعت شدہ سرمایہ میری بیوی نے ایک سوٹ کیس میں بند کرکے گھر کے کسی گوشے میں رکھ دیا تھا جہاں "فالتو سامان" رکھا جاتا ہے اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ مکان میں تبدیلیاں کی جارہی تھیں۔ جب گھر کا سب فالتو سامان باہر گلی میں کوڑا کرکٹ جمع کرنے والوں کے حوالے کیا جارہا تھا تو میری بیوی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی کہ میری "تخلیقات کا خزانہ" بھی اس میں شامل ہے۔ اس حرکت پر میں رویا بھی اور ہنسا بھی۔ اس خزانے میں میرا امریکہ کے ایک سفر کے دوران وہاں چار دن نظر بند کئے جانے کے حوالے سے میں نے ایک رپورتاژ لکھا تھا "جہاں آزادی کا بت ہے" جو "شاہراہ" کے ایک ضخیم خاص نمبر میں شائع ہوا تھا جس کی بڑی پذیرائی ہوئی تھی۔ وہ بھی "کوڑے کرکٹ" کی نذر ہوگیا تھا۔

تیسرا وقعہ 1967ء کا ہے۔ برطانیہ میں ایک طویل قیام یعنی قریباً" بارہ برس کے بعد جب میں پہلی بار ہندوستان گیا تو اپنے وطن کشمیر جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ وہاں ریڈیو کشمیر کے میرے پرانے دوست اور ساتھی کمال احمد صدیقی' پران کشور کول' علی محمد لون اور بشیر بٹ (جو اس وقت بھی ریڈیو کشمیر سے منسلک تھے) سے مل کر جو خوشی ہوئی اس کا اظہار ممکن نہیں۔ کمال احمد صدیقی نے ریڈیو سری نگر کی پرانی یادوں کے حوالے سے میرا انٹرویو بھی لیا۔ اس زمانے میں 'میں نے ریڈیو سری نگر سے قریباً" بارہ ڈرامے لکھے تھے۔ کچھ طبع زاد اور کچھ مغربی ڈراموں چینخوف' شیکسپئر اور

اوتھیلو پر مبنی۔ یہ ڈرامے بے حد کامیاب رہے۔ میں چاہتا تھا کہ انہیں کتابی شکل میں شائع کرایا جائے لیکن دس بارہ برس کے بعد یہ پرانا مواد "ردی کی نذر" کردیا جاتا ہے یعنی

"دیکھ کبیرا پھر رویا"

اچھی تنقید کے لئے کسی "ازم" یا نظریے کی نشاندہی یا شناخت کرنا ہی ضروری نہیں ہوتا بلکہ اچھے اور عہد ساز ادب کے لئے اس کا بھی ایک "تخلیقی عمل" ہوتا ہے۔ ہمارے ادب کی ترقی پسندی کے "سنہری دور" میں یعنی اس صدی کی پانچویں دہائی تک ہم نے بڑے بڑے جو نقاد بھی پیدا کئے ہیں' ان میں پروفیسر احتشام حسین کا نام پہلے آتا ہے۔ ہمارے ادب میں "جدیدیت کی وبا" نے جو گہرے اور سیاہ سائے ڈالنے کی کوشش کی ہے' اس سے تخلیقی ادب کو کسی حد تک نقصان پہنچا ہے۔ اس کی ایک مثال اوپندر ناتھ اشک جیسے ایک نامور افسانہ نگار ہیں ان پر جب ایک خاص نمبر شائع ہوا تو جدیدیت والے نام نہاد نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے جہاں دوسرے تبصرہ نگاروں خصوصاً" پروفیسر محمد حسن اور پھر پروفیسر قمر رئیس پر انگلیاں اٹھانے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی لکھ ڈالی کہ "اوپندر ناتھ کے افسانے تو بس جذباتیت اور رومانیت کے افسانے ہیں۔" میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر افسانے یا ادب سے "جذباتیت اور رومانیت" کو ظاہر کرنے سے خارج کردیا جائے تو نہ صرف زندگی بلکہ ادب کے حسن پر بھی داغ لگ جائے گا۔

کچھ عرصے سے اب جدیدیت کے بعد ہماری تنقید میں بھی "مابعد جدیدیت" کے پکوان پک رہے ہیں۔ اس طرح کی باتیں کہنا یا لکھنا کہ ہماری کہانی واپس آگئی ہے جیسے کہانی کوئی ایسی چیز ہے جسے کوئی اغوار کر کے لے گیا تھا۔

اردو ادب و زبان کے ساتھ ساتھ' علاقائی زبانوں کا بھی ہمارے ادب میں اپنا ایک خاص مقام ہے۔ ہندوستان میں بنگالی' مراٹھی اور گجراتی ادب کی ایک پرانی روایت قائم ہے اور اسی طرح پاکستان میں سندھی' پشتو اور پنجابی ادب بھی' اردو ادب کے شانہ بشانہ کھڑے رہنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ ایک دوسرے کی زبانوں کو پڑھنے' لکھنے اور تراجم کے کام کو زیادہ وسعت دینی چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو زبان' برصغیر کی دوسری زبانوں کو بھی اپنے اندر سمونے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

MR. KANWAL NAIN PERWAZ
63 WENT WORTH AVE
LONDON N3 1YN U.K.

”ادب میں صرف صداقت محض کافی نہیں،
صداقت میں شامل ہونا بھی ضروری ہے۔“

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

دہلی

یہ تعارف یا تذکرہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا ہے۔ کچھ لوگوں کو خدا پیدا ہی اس لئے کرتا ہے کہ وہ اس کے بندے اور نائب کی حیثیت سے اس کی زمین پر لوگوں کے دلوں کو علم کی روشنی سے منور کریں تاکہ یہ سلسلہ ازل سے ابد تک جاری رہے اور چراغ سے چراغ جلتا رہے۔ ایسے بندوں میں سے ایک ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بھی ہیں جو جینئس ہیں۔ اس لفظ جینئس پر مجھے یاد آیا کہ لندن میں بسنے والے ساقی فاروقی مجھ سے خفا ہیں کہ میری نظر میں وہ بھی ”جینئس“ ہیں مگر وہ میرے ”جینئس“ لکھنے پر ڈپریشن میں ڈوب گئے ہیں کہ اگر وہ جینئس ہیں تو پھر حضرت محمدؐ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، آئن اسٹائن، شیکسپئر وغیرہ کیا تھے؟

ساقی فاروقی سے کوئی کہہ دے کہ وہ جینئس تر بھی نہیں جینئس ترین تھے۔ دہلی تو گڑھ ہے عالم، فاضل اور جینئس لوگوں کا۔ منظر ایوبی ڈاکٹر تنویر علوی، پروفیسر ڈاکٹر نعیم چودھری، پروفیسر آفاق احمد اور ڈاکٹر خالد سہیل کو میں نے کینیڈا میں میر تقی میر سیمینار میں سنا اور ان کے علم و فکر کے موتی دامن میں سمیٹ لائی۔

ڈاکٹر نارنگ کو سننے کا پہلا موقع دہلی میں ملا۔ ان سے گفتگو کیجئے تو گفتگو کی "مٹھاس" محسوس ہوتی ہے۔ ان کے طالب علم خوش نصیب تھے جنہیں ڈاکٹر نارنگ سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ ملاقات کے اختتام کے بعد بھی ان کی میٹھی بانی کا رس کانوں میں گھلتا رہا۔ اور میں کیا' اپنے دور کے نامور شاعر اور نقاد سلیم احمد (مرحوم) بھی ڈاکٹر نارنگ کی نہ صرف علمیت بلکہ ان کی شخصیت کی خوبصورتی کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کو ایک خط میں وہ لکھتے ہیں۔

"ایک ادیب' نقاد اور محقق کی حیثیت سے میں ڈاکٹر نارنگ کو برسوں سے جانتا ہوں لیکن وہ اتنے خوبصورت انسان نکلیں گے اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں تو پہلی ہی ملاقات میں انہیں دل دے بیٹھا اور مفت میں بیٹھے بٹھائے عالی سے رقابت ہو گئی۔ عالی کہتے ہیں کہ "یار تم تو مسلمان آدمی ہو۔ اس کافر کے چکر میں کہاں پڑے؟" مسلمان تو خیر میں ہوں' بہرحال اب رقابت ہے تو رقابت ہی سہی۔ وہ مغل بچے ہیں تو اپن بھی سید زادے ہیں' دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک تو وہ روایت کے آدمی ہیں۔ دوسری طرف جدیدیت سے بھی ان کا ٹانکا بھڑا ہوا ہے۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ روایت اور جدیدیت کا جیسا خوبصورت سنگم ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی شخصیت میں ہوا ہے' اتنا تو شمس الرحمٰن فاروقی کی شخصیت میں بھی نہیں ملتا۔ نارنگ صاحب جیسے لوگوں کی اہمیت یہ ہے کہ ان کے زیر اثر جو جدیدیت پروان چڑھے گی اس کا حشر پاکستانیوں کی جدیدیت جیسا نہیں ہو گا۔ پاکستان میں روایت اور جدیدیت کے لوگ الگ الگ خانوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہاں ڈاکٹر نارنگ جیسے لوگ نہیں ہیں جنہیں میرے تو دونوں میٹھے کہنے کا فن آتا ہو۔

آپ سے اتنی مختصر ملاقاتیں ہوئیں کہ آسودگی کے بجائے تشنگی بڑھ گئی۔ جب سے آپ گئے ہیں کسی نہ کسی عنوان آپ کا ذکر خیر ہوتا رہتا ہے۔ آپ تو کراچی کو فتح کر کے چلے گئے۔ مجھے یہ رقابت ہوتی ہے کہ ہر شخص آپ کی تعریف کرتا ہے۔"

ڈاکٹر نارنگ سے ملاقات پر میں نے "سخن ور" (حصہ سوم) انہیں پیش کی۔ کہنے لگے یہ کتاب میری نظر سے گزری ہے۔ پھر مسکرا کر بولے۔ کیوں ان مشکلات میں خود کو ڈالتی ہیں۔ یہ جملہ ایک سوال بھی ہو سکتا ہے اور حسن سلوک کا ایک انداز بھی۔ میں نے ڈاکٹر نارنگ کا وہ انٹرویو پڑھ رکھا تھا جو لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کی ریڈر ڈاکٹر آصفہ زمانی نے لیا تھا' جس میں ڈاکٹر نارنگ نے اس سوال پر کہ اردو ادب میں آپ کی دلچسپی اور رغبت کی وجہ کیا ہے کہا تھا کہ سفر عشق میں دوسری راہ تو ہوتی ہی نہیں اور اگر آپ اپنی زبان سے محبت کریں تو زبان میں یہ طاقت ہے کہ وہ اس محبت کو سو گنا بڑھا کر لوٹا سکتی ہے۔

چنانچہ سفر عشق میں میرے لئے جو راہ منتخب کر دی گئی ہے میں بھی اس پر ہنسی خوشی گامزن ہوں۔

بلوچستان (پاکستان) کے شہر دکی میں یکم جنوری 1931ء کو پیدا ہونے والے گوپی چند نارنگ، دہلی کالج اور یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے، پی ایچ ڈی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں آنرز بھی کیا ہے اور دہلی یونیورسٹی سے لسانیات میں پوسٹ گریجویٹ کیا۔ ساتھ ہی سمعیات اور تشکیلی گرامر کا خصوصی کورس انڈیانا یونیورسٹی امریکہ سے کیا۔

میری ان سے ملاقات 27 دسمبر 1999ء کو دہلی میں ہوئی۔ افسانہ نگار انور نزہت میرے ساتھ تھیں۔ میرا پہلا سوال "گفتنی" کے لئے بیسویں صدی کے اردو ادب میں باقی رہ جانے والے ناموں سے متعلق تھا۔ وہ سنبھل کر بولے۔ اس ضمن میں قارئین کوئی حکم نہیں لگا سکتے اور نقاد بھی ایک قاری ہے۔ یہ فیصلہ وقت کرے گا۔ بہت سے لوگوں کے نام کا ڈنکا ان کی اپنی زندگی میں بڑے زور و شور سے بجتا ہے۔ پھر ان کی شہرتوں کے محلات دیکھتے ہی دیکھتے منہدم ہو جاتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسی بھی شخصیتیں ہوتی ہیں کہ زمانہ ان کی طرف گوشہ چشم بھی نہیں کھولتا لیکن بعد میں ان کا نام تاریخ کے صفحوں پر سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔ شناخت کے یہ سارے معاملات یا قبولیت جنہیں انگریزی میں Perception Theory کہتے ہیں تنقید کا ایک پورا دبستان ہے۔ جس کو جرمنی فلاسفر نے own کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے ثقافت، تاریخ اور خود فن کی جمالیاتی قدریں وقت کے مزاج کے ساتھ بدلتی ہیں۔ فرانس کے فلاسفر سوڈو نے بھی کہا ہے کہ کیا چیز ادب ہے، کیا ادب نہیں ہے، کیا اعلیٰ ادب ہے، کیا اعلیٰ ادب نہیں ہے، یہ چیز بھی طاقت کا کھیل طے کرتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ کہتا ہے کہ سچ بولنا کافی نہیں ہے، صداقت محض کافی نہیں ہے اس کا جملہ ہے It is not enough to be true you hve in the truth صداقت کے اندر شامل رہنا بھی بہت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر غالب کو ہم ہندوپاک اور برصغیر کا اپنا عظیم شاعر مانتے ہیں universal شاعر مگر غالب کی زندگی میں بہت کم لوگوں نے غالب کو اس کا مقام دیا۔ غالب اور داغ وغیرہ کے مقابلے پر ذوق کہیں زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کے شاگردوں کے سلسلے بھی خوب چلے اور علامہ اقبال نے ذوق کی شاگردی اختیار کی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ذوق اپنے عہد میں پاور میں شامل تھے جبکہ غالب حکومتی طاقت میں شامل نہیں تھے لیکن آہستہ آہستہ غالبیات کی تنقید میں خاص طور پر بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں نسخہ حمیدیہ کی اشاعت کے بعد جو بھوپال میں ملا تھا غالب پر توجہ دی جانے لگی۔ زمانے کا مذاق بدلا، جدید روشنی کی ہوا چلی اور شعر و سخن کے بارے میں نئی طرح سے گفتگو ہونے لگی چنانچہ شعر و سخن کے معیار پر غور ہوا تو پرکھا گیا کہ معنی آفرینی کیا چیز ہے۔ معنی آفرینی فارسی شعراء کی اصطلاح ہے۔ غالب نے بار بار یہ دعویٰ کیا ہے کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی ہے۔ معنی آفرینی پر جب توجہ ہوئی تو دیکھئے کہ غالب کا قد کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ چنانچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ طاقت کے کھیل میں کون شخصیتیں آگے جائیں گی۔ یہ بڑا عبرت ناک منظرنامہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مجھے یاد ہے کہ ساتویں یا آٹھویں دہائی میں جوش کے یہاں سے چلے جانے کے

بعد بھی بلکہ پانچویں اور چھٹی دہائی میں جوش کے نام کا ڈنکا بجتا تھا اور جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے صاحبان جوش کی سرپرستی کرتے تھے۔ جوش ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر جسے ''سر'' کا خطاب بھی ملا اور جسے اس نے ٹھکرا دیا۔ رابندر ناتھ ٹیگور جن کے نام پر یہ عمارت ہے۔ رابندرہ بھون انیسویں صدی میں یہ بنائی گئی تھی جس پر ہندوستان کی تینوں بڑی اکامیاں موجود ہیں۔ ساہتیہ ادب کی اکادمی، آرٹ کی اور سنگیت ناٹک یعنی رقص موسیقی اور تھیٹر کی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت ایک عام انسان کے لئے جوش کا نام ٹیگور سے بھی بڑا تھا لیکن آپ نے دیکھا کہ دو دہائیوں کے عمل میں جوش اپنی عبرت کی مثال بن کر رہ گئے۔ اپنی زندگی میں ہی ان کی مقبولیت اور شہرت کی کمان اتر گئی۔ ہماری پرانی تاریخ میں ناسخ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں سمجھتا ہوں جن شخصیات کا نام کسی نہ کسی طرح ادبی تاریخ کے کینوس میں پھیلتا اور سکڑتا رہتا ہے اپنے آپ کو revise کرتا ہے۔ وہ نام کسی نہ کسی طرح سے شامل رہیں گے۔ ہو سکتا ہے ان میں بعض شخصیات کا نقش اور واضح ہو جائے۔ مثال کے طور پر شاعری میں سب سے روشن نام بلکہ روشن ترین نام علامہ اقبال کا ہے۔ اور فکشن میں پریم چند کا ہے۔ توقع تھی کہ بیسویں صدی میں شاعری میں نظم کے تمام امکانات علامہ اقبال کی شاعری نے exhaust کر دیئے ہیں لیکن علامہ کے بعد ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی دو اور تین برس کے اندر اندر ایک اور شخصیت اردو شاعری کے افق پر نمودار ہوئی۔ اگر علامہ کی شاعری کا سرچشمہ مذہبیات اور الٰہیات ہے تو فیض احمد فیض کی شاعری کا سرچشمہ یقیناً'' مذہبیات اور الٰہیات نہیں ہے کیونکہ وہ یقیناً'' سیکولر شاعر ہے۔ ایک انقلابی شاعر ہے۔ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک کے ساتھ سوشلزم اور مارکس کی تعلیمات کے ساتھ تھا۔ جہاں مذہب کی گنجائش ہے ہی نہیں، اتنی بڑی کروٹ زمانے نے لی "گو میں فیض احمد فیض کو ایک true اور rebale شاعر نہیں مانتا۔ فیض احمد فیض کو ایک بڑا مارکسی شاعر بھی نہیں مانتا۔ میں اس سے بڑا باغی شاعر قاضی نذر الاسلام کو مانتا ہوں۔ بڑا شاعر وہ ہوتا ہے جو firy ہوتا ہے، جو آگ برساتا ہے، آتشیں ہوتا ہے، بیگانہ ہوتا ہے۔ فیض احمد فیض کی شاعری تغزل میں رچی بسی ہے۔ ان کی نظم بھی تغزل سے فیضان حاصل کرتی ہے۔ یہاں تو انہوں نے جمالیات کا ایسا جادو جگایا ہے کہ جمالیات اور تغزل کی روح کشید ہو کر ان کی شاعری میں آگئی ہے چنانچہ فیض کا نام زندہ رہے گا۔ فیض بعض نظموں کی مقبولیت اور ایسی نظموں کی جن میں سماجی آگ ہے، انسان کا درد ہے، وطنیت اور جذبہ حریت ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ فیض علامہ اقبال کے شہر سیالکوٹ کے ہیں مگر پاکستان سے کہیں زیادہ فیض کی شاعری کی شہرت اور مقبولیت ہندوستان میں ہوئی اور انہوں نے اپنی زندگی میں ہی ایک legend کا درجہ بھی اختیار کر لیا۔ بہت کم شعراء کو یہ سعادت نصیب ہوتی ہے۔ ان دو کے علاوہ میں فراق گورکھ پوری کی شاعری کا حوالہ بھی دوں گا۔ یہ ان کا کارنامہ ہے کہ اردو شاعری میں پورے برصغیر کی یعنی بنگال اور کلکتہ سے لے کر پشاور اور درہ خیبر تک اور ادھر کشمیر کی ہمالہ کی چوٹیوں سے

لے کر کنیا کماری تک اس کی روح عجیب و غریب طریقے سے کشید ہو کر آگئی ہے۔

ڈاکٹر نارنگ گفتگو کر رہے تھے اور ہم اس کیفیت میں تھے کہ۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بات چل نکلی اردو زبان کی طرف تو وہ بتانے لگے کہ یہ ایک انڈیکس (ترتیب وار) زبان ہے۔ یہ عربی، فارسی یا سنسکرت کے اظہار کا ایک اور ذریعہ نہیں ہے۔ اس کی اپنی پہچان ہے اور کارپردازی بھی ہے۔ گنگا و جمنا کی وادی میں پروان چڑھنے والی اس زبان میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کا جوہر سما گیا ہے جیسے عطر مجموعہ ہو۔ جیسے ہماری موسیقی جو عربی اور ایرانی موسیقی سے الگ ہے لیکن ہندوستان کے جنوب اور شمال کی موسیقی علیحدہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مناسبت رکھتی ہیں اور یہی مناسبت اردو شاعری کو sustain (جذب) کرتی ہے۔ اس sustainious (انجذاب) کی وجہ سے ہندوستان کی جو روح ہے، فراق گورکھ پوری نے ایک نئے انداز سے اس کی بازیافت کی ہے اور اپنی عشقیہ شاعری میں اس کا جادو جگایا ہے۔ فراق کا یہ contribution اس کے گھر آنگن کی رباعیاں ہیں۔ ہندوستانی عورت کی گھریلو زندگی پر اور اس کی ممتا پر گھریلو زندگی پر۔ یہ ممتا والا جو chapter تھا یہ اردو شاعری میں اس طرح سے نہیں آیا تھا۔ جس طرح اوروں کے ہاں آیا ہے۔ یعنی وہ عورت بیدی کے یہاں بھی ہے اور یہ وہی عورت ہے جو ماں بھی ہے، بہن بھی ہے اور بیٹی بھی ہے۔ وہ عورت محبوب بھی ہے اور معشوق بھی ہے۔ ہمارے ہاں اردو غزل کا جو معشوق تھا وہ خیالی تھا۔ اس کی رنگین تصویر تھی۔ فراق کی شاعری کا یہ کمال ہے کہ اس نے ایسی sensibility اردو شاعری کو دی جس سے کہ محبوبہ یا عورت اپنے تمام جذبات کے جسم و جمال کی نزاکتوں کے ساتھ اور اپنے اپنے جذبات کی گرمی و نرمی کے ساتھ اس میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ feminism سے پہلے کا chapter ہے جو اردو شاعری میں فراق نے کھولا۔ فراق کے علاوہ غزل میں دوسری آواز حسرت موہانی کی ہے جنھوں نے تہذیب رسم عاشقی کی باریافت کی اور احیا کیا۔ حسرت، جگر، فانی، اصغر لیکن اصغر اس میں ذرا کم کم ہیں لیکن حسرت اور جگر میرے خیال میں زندہ رہیں گے بعد کے شاعروں میں بہت سے نام ہیں لیکن exprementation کی وجہ سے دو بڑی آوازیں راشد اور اخترالایمان کی ہیں۔ اتنی بڑی کہ اکیسویں صدی ان کو آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکے گی۔ دوہے، ثلاثی ماہیا اور چھوٹی چیزیں جو پنجابی سے کچھ کھڑی بولیوں سے کچھ دوسری علاقائی زبانوں سے یہ اصناف اردو شاعری میں داخل ہو رہی ہیں۔ دوہے میں ایک بڑا نام جمیل الدین عالی کا ہے جنھوں نے دوہے کو اردو کی اصناف میں اہمیت دی۔ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ ہم نے ہندی سے اسے لیا ہے۔ نظم لکھنے والوں میں بعض نام اس کے بعد اچھے ہیں جس طرح محمد علوی، شہریار، ندا فاضلی، بشیر بدر اور مجید امجد ہیں لیکن ان کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس کا نام اکیسویں صدی میں رہ جائے گا۔ فکشن میں کرشن چندر کا نام پریم چند کے بعد لیا جائے گا۔ کرشن

چندر، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ۔ میرے خیال میں تاریخ کے صفحوں سے ان کا نام مٹ نہیں سکے گا۔ آنے والی صدیوں میں بعد کے لوگوں میں، میں دو بڑے نام شامل کرنا چاہوں گا۔ ان کا کنٹری بیوشن بھی کسی طرح سے منٹو یا بیدی سے کم نہیں اگرچہ منٹو کا سر اور بیدی کا سر پریم چند کے بعد لکھنے والوں میں سب سے نکلتا ہوا ہے۔ ایک نام تو ہے قرۃ العین حیدر سے شاید ہی کوئی بڑی شخصیت سامنے آئی ہو۔ وہ ہمالائی بلندی اور ہمالائی عزم کے ساتھ آئی ہیں۔ ان کے ناول اور کہانیوں میں ہندوستان کی تہذیب کی وسعت ہے اور ایک تسلسل ہے۔ یعنی تین، چار اور پانچ ملینیم کی تہذیب اور تاریخ کا نہیں بلکہ ہزاروں ملینیم کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ ان کا بنیادی فلسفہ بھی یہی ہے کہ اس زمین کی تہذیب ایک cyclic ہے اور ایک تسلسل کے ساتھ ہے۔ وہ ایک بہاؤ ہے دریا کی تشبیہ ان کے یہاں بار بار ہے۔ یہ تہذیب دائروی عمل میں رہتی ہے۔ یہ مٹ سکتی ہے بدل سکتی ہے مر نہیں سکتی۔ ہندوستان اور پاکستان کے وجود نے اسی تہذیب پر بہت بڑا سوالیہ نشان لگایا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا فکشن جھوٹا ہے یا ہماری تاریخ جھوٹی ہے یہ آنے والے پچاس برسوں میں ظاہر ہو گا۔

دوسرا نام ہے انتظار حسین کا، اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے ماضی کے دروازے پر دستک دی ہے اور اس کی معنویت کو آج کے سوالات کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا ہے۔ خاص طور سے انتظار حسین کا ناول "بستی" اور ان کی کہانیوں کا مجموعہ "شہر افسوس" ہمارے کلاسیکی ادب میں اس کا شمار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کسی صدی کے بطن میں اتنی بڑی دس پندرہ شخصیتیں بھی ہوں تو بہت ہے۔ یہی اردو زبان کا تشخص بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں اردو زبان کا رنگ بہت سی دوسری زبانوں کے مقابلے میں آج بھی بہت چوکھا ہے۔

ڈاکٹر نارنگ کچھ لمحے کو خاموش ہوئے تو میں نے پوچھا آپ نے انتظار حسین کے ناول کا ذکر کیا۔ ناول کے حوالے سے میں کہنا چاہوں گی کہ کیا موجودہ صدی میں اردو میں کم ناول لکھے گئے ہیں اور اس کی وجوہ کیا ہیں؟

ڈاکٹر نارنگ کا جواب تھا۔ ناول بے شک بہت کم لکھے گئے تھے اور ہمارے یہاں ناول کی روایت نہ ہونے کے برابر تھی لیکن پچھلے پچاس برس میں ناول پر خاصی توجہ ہوئی ہے اور اچھے اچھے ناول لکھے گئے۔ میں خاص طور سے ممتاز مفتی شوکت صدیقی، بانو قدسیہ، عبداللہ حسین، جمیلہ ہاشمی، رام لال، جوگندر پال، عبدالصمد اور بعض دوسرے لوگوں نے ناول کی طرف توجہ کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں سب سے زیادہ اثر شاعری اور شاعری میں بھی غزل کا ہے۔ غزل میں دو مصرعے کے شعر سے پوری معنوی معاہدہ بن جاتا ہے۔ کہانی اور افسانے کی طرف ہمارا رجحان زیادہ ہے لیکن آج کے زمانے کے تقاضے ناول کے بغیر پورے نہیں ہوتے۔ الیکٹرونک میڈیا میں اور تھیٹر میں بھی اور فلموں میں بھی۔ چونکہ ان سارے میڈیم کا سرچشمہ فکشن ہے۔ فکشن اگر انہیں غذا نہیں

پہنچائے گا تو ان کی سرگرمیاں ماند پڑ جائیں گی۔ جس زبان کا فکشن زیادہ طاقت ور ہو گا وہ زبان اتنی ہی طاقت سے مستقبل کے تقاضوں سے جڑے گی۔ انہوں نے چند معروف ناول نگاروں کے نام بتاتے ہوئے کہا۔ عبدالصمد کے چار پانچ ناول ہیں۔ ابھی محمد علیم کو سنسکرتی ایوارڈ اس کے ناول "جو اماں ملی تو کہاں ملی" پر ملا ہے۔ وہ کم عمر ہے' چالیس سال کا۔ میں نے کینیڈا کے ڈاکٹر خالد سہیل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ شاعری کی اہمیت اور مرکزیت برحق مگر لگتا ہے کہ اکیسویں صدی اردو ادب میں خاص طور پر ناول کی صدی ہو گی جبکہ یورپ میں ناول پٹ چکا ہے اور اگلی صدی یورپ میں ناول کی صدی نہیں ہو گی۔

اس سوال پر کہ جدیدیت نے فکشن کو نقصان پہنچایا یا سنوارا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جدیدیت نے اردو افسانے کو نقصان پہنچایا ہے۔ ضرورت سے زیادہ ابہام پر زور دے کر ابہام بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ دراصل علامت ہماری تہذیب کو زیادہ راس نہیں آئی۔ ہماری تہذیبی ضرورت تو تمثیل ہے' استعارے سے پوری ہو جاتی ہے۔ بہرحال علامت بھی ادب کے ارتقا کے کھیل میں ایک بہت بڑا ادبی حربہ ہے لیکن جب علامت کو بے جا طور پر محض علامت کے لئے یا محض تکنیکی طور پر افسانے میں برتا گیا تو اردو افسانے کو نقصان پہنچا۔ خاص طور پر ہندوستان میں جہاں اردو کے قاری کی ضرورت تھی اردو کو عوام سے جوڑے رکھنے کی ضرورت تھی۔ جیسے ترقی پسندوں نے جوڑا تھا۔ جدیدیت نے جب اس طرح کے لفظی گورکھ دھندے کو فروغ دیا اور علامت اور تجریدیت کے نام پر ایسی کہانی وجود میں آئی جو فیشن کا حصہ بن گئی تو بہرحال اب مراجعت ہوئی ہے۔ بیانیہ کی واپسی ہوئی ہے ہمارے یہاں بھی اور پاکستان میں بھی مانا گیا کہ کہانی اپنے کھوئے ہوئے وقار کو پا رہی ہے۔

افسانے کی بڑی شخصیتیں مثلاً" قرۃ العین حیدر نے بھی کچھ علامتی چیزیں لکھی ہیں اور mix سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ legend سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ انتظار حسین کے ہاں پرانی کتھائیں ہیں۔ ملفوظات ہیں۔ داستانی چیزیں ہیں مگر ان بڑے لکھنے والوں کے ہاں کہانی کا جوہر موجود ہے۔ جدیدیت نے کہانی کو تو نقصان پہنچایا مگر ناول کو چھونے کی جرات جدیدیت نہیں کر سکے گی۔ ناول اپنی روش پر قائم ہے۔ مثال کے طور پر پریم چند ہیں۔ منٹو نے کوئی ناول نہیں لکھا۔ کرشن چندر کے ناول کمرشل ضرورتوں سے لکھے گئے۔ بیدی کا ناول اپنی وضع کا ایک ہی ناول ہے۔ پھر جتنے ناول پاکستان میں لکھے گئے یا آج ہندوستان میں لکھے جا رہے ہیں' ان کا نام نہاد جدیدیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ بتائیے کہ مابعد جدیدیت کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

مابعد جدیدیت کو سمجھنے کے لئے ذہن کو ان مفروضات سے نجات دلانے کی ضرورت ہے جن میں ذہن گرفتار ہے۔ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ترقی پسندی ایک سیاسی عمل ہے۔ جدیدیت کا سب سے بڑا موقف یہ تھا کہ ادب سیاسی کھیل نہیں ہے گویا وہ اینٹی سیاست تھا۔ ہمارے

یہاں ذہن اب تک سیاست اور اینٹی سیاست میں پڑے ہوئے ہیں۔ مابعد جدیدیت نہ سیاسی کھیل کھیلتی ہے نہ اینٹی سیاسی تو پہلے ان مفروضوں سے نجات پانے کی ضرورت ہے پھر یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جس کمرے میں ہم بیٹھے ہوئے ہیں، اس سے جب تک باسی ہوا خارج نہیں ہو گی تازہ ہوا کیسے آئے گی۔ اگر ہم اسی فضا میں سانس لیتے رہیں گے اور یہ risk نہ لیں کہ یہ ہوا تو خارج ہونی ہی چاہئے تب ہی تو تازہ ہوا آئے گی۔ بالکل اسی طرح مابعد جدیدیت کے لئے بھی مفروضوں سے نجات کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر نارنگ کہہ رہے تھے۔ پچھلے دس پندرہ برس سے ہندوستان اور پاکستان میں نئی پیڑی کے لکھنے والے چاہے کسی عمر کے ہوں وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا نہ تو روایتی ترقی پسندی سے کوئی تعلق ہے نہ روایتی جدیدیت سے۔ ان سے میں پوچھنا چاہوں گا کہ کیا تم بے نام ہو کیا خلا میں ہو؟ کیا تاریخ میں تم کہیں نہیں ہو؟

ڈاکٹر نارنگ نے 1957ء میں اپنی ملازمت کا آغاز بطور لیکچرر سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی یونیورسٹی سے کیا تھا۔ پھر مختلف جامعات میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ 1986ء سے تاحال وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے بطور پروفیسر وابستہ ہیں۔ ساتھ ہی ساہتیہ اکادمی میں National Acadamy of Letters کے نائب صدر کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔

1990ء میں انہیں حکومت ہند کی جانب سے "پدم شری" ایوارڈ ملا ہے۔ 1977ء میں علامہ اقبالؒ کی شاعری و شخصیت پر محققانہ علمی و ادبی کام کرنے پر حکومت پاکستان کی جانب سے خصوصی گولڈ میڈل سے انہیں نوازا گیا دیگر اعزازات میں غالب ایوارڈ، امیر خسرو ایوارڈ، مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ، سرسید اردو ایوارڈ کے علاوہ کئی ملکی و غیر ملکی ایوارڈ بھی شامل ہیں۔ انہوں نے انگریزی، ہندی اور اردو میں اب تک پچاس کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ کئی ملکوں کی سیاحت کی ہے اور بیرون ملک میں بھی کئی یونیورسٹیز میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے علم کے چراغ روشن کئے ہیں۔

ڈاکٹر نارنگ سے ہماری گفتگو میں وقفہ اس وقت آیا جب ٹیپ ختم ہو چکا اور ریکارڈ بند ہو گیا۔ گھڑی پر نظر پڑی تو مغرب کا وقت قریب تھا۔ ہمیں ڈاکٹر شاہد اور ڈاکٹر ظل ہما کے ہاں افطار پر پہنچنا تھا، لہٰذا میں نے ڈاکٹر نارنگ سے اجازت چاہی اور سوال نامہ ان کے حوالے کر کے بقیہ سوالوں کے جواب ڈاک سے بھیج دینے کی خواہش ظاہر کی۔

ڈاکٹر نارنگ کی میں شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنا کہا نبھایا۔ میری گزارش کو عزت بخشی اور مجھے پاکستان کے پتے پر بقیہ سوالوں کے جواب تحریر کر کے بھجوا دیئے جو حسب ذیل ہیں۔

5۔ بے شک آج کا انسان ذہنی اور روحانی بحران میں مبتلا ہے جس کی سب سے بڑی وجہ انسانی قدروں کا زوال ہے۔ بالعموم سمجھا جاتا ہے کہ سائنسی اور تکنیکی ترقیوں سے انسانی تہذیب نے بھی ترقی کی ہے لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ انسانی ادب اور تہذیب کمرشل جکڑ کے ایسے

دوراہے پر آگئی ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ آگے کا راستہ کدھر ہے۔ ادب سے باطنی تزکیہ نفس ضرور ہوتا ہے لیکن آج کے ذہنی بحران کا واحد علاج جمالیاتی قدروں سے ممکن ہے یا نہیں اس کا کوئی آسان جواب دینا ممکن نہیں ہے۔

6- شاعری ہو یا نثر معیاری ادب کا سب سے بڑا پیمانہ یہ ہے کہ وہ زندہ رہ سکے اور وقت کی کلائی کو مروڑ سکے۔

بے شک باہر کے ملکوں میں شاعری زیادہ ہو رہی ہے اور نثر کم لکھی جا رہی ہے لیکن اس کا سبب وقت یا موضوعات کی کمی نہیں ہے بلکہ سنجیدگی کی کمی ہے۔ شاعری بھی اصلی کم اور روایتی زیادہ ہو رہی ہے جس کی نوعیت مجلسی ہے۔

8- اردو ایک کشادہ زبان ہے جس نے دوسری زبان کے لفظوں کو ہمیشہ اپنے دامن میں پناہ دی ہے اور انھیں اپنا بنایا ہے۔ زبانوں کی ترقی میں چھوت چھات سے کام نہیں چلتا جو زبانیں چھوت چھات کو روا رکھتی ہیں وہ سکڑ جاتی ہیں۔ اردو کا مزاج اس کے خلاف ہے۔

9- جہاں تک زندگی کے دلچسپ واقعات کا تعلق ہے ایک چھوٹی سی بات بتاتا ہوں جس نے میری زندگی کا رخ موڑ دیا۔ جب میں نویں جماعت میں پہنچا تو اختیاری مضامین میں اردو کی کلاس میں بیٹھنا چاہتا تھا لیکن اسکول کے ہیڈ ماسٹر میرے بڑے چچا تھے۔ وہ سائنس پڑھاتے تھے۔ ان کے حکم پر مجھے سائنس کی کلاس میں بیٹھنا پڑا' نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کی طلب میرے باطن کی ضرورت بن گئی اور میں زیادہ سے زیادہ اردو کی طرف کھنچنے لگا حتیٰ کہ اردو سے میرا رشتہ ایک طرح کے عشق میں بدل گیا۔

10- بے شک اردو میں روایتی تنقید عام ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ عملی اور نظریاتی تنقید نہ لکھی گئی ہو بلکہ ادھر تو یہ احساس عام ہے کہ موجودہ دور میں تنقید' تخلیق پر حاوی ہو گئی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ جتنے تراجم آج سے پچاس برس پہلے ہوتے تھے اتنے اب نہیں ہو رہے۔

آخر میں "گفتنی" کے قارئین کیلئے میں "ادب اور نظریہ میں رشتہ" کے حوالے سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے خیالات درج کرنا چاہوں گی جو یقیناً "ادب میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

ادب اور نظریہ (آگہی) میں رشتہ۔ نظریہ تخلیق کا بدل نہیں

(ان حالات میں بعض بنیادی باتوں کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے)

ادب اور نظریے میں پراسرار رشتہ ہے۔ ادب نظریے سے متاثر ہوتا بھی ہے اور ادب نظریے کو متاثر کرتا بھی ہے۔ یہ لین دین دو طرفہ ہے' تاہم ادب اور نظریے میں ایک اور ایک کی نسبت نہیں۔ ادب زندگی کی طرح گوناگوں' تہہ در تہہ' رنگا رنگ اور متنوع ہے۔ زندگی جس طرح رازوں سے بھرا بستہ ہے' ادب بھی رازوں سے بھرا بستہ ہے۔ نظریہ ان رازوں کا بھید جاننے کا

متمنی ہے لیکن جس طرح زندگی کے سارے بھید بڑے سے بڑے فلسفی اور اولیا بھی نہیں پاسکے' ادب کے سارے بھید بھی کوئی نظریہ (تھیوری یا تنقید) نہیں پاسکتی۔ جس طرح زندگی لامحدود ہے' اسی طرح ادب بھی لامحدود ہے جبکہ نظریہ محدود محض ہے۔ ادبی تخلیق میں رنگارنگی زندگی سے آتی ہے۔ زندگی بہرحال ادب سے بڑی ہے' اسی طرح ادب بہرحال نظریے سے بڑا ہے۔ نظریہ دن کی روشنی ہے۔ ادب دن رات کے اندھیرے اجالے اور دھندلکوں کا کھیل ہے۔ نظریہ تعقل ہے' ادب احساس و جذبہ و وجدان کا گھال میل ہے۔ نظریہ ٹھوس زمین پر چلتا ہے۔ ادب ان دیکھے آسمانوں کی خبر لاتا ہے' پاتال کی گہرائیوں کو ناپتا ہے۔ نظریہ جاگنے کا عمل ہے' ادب سوتے جاگتے کو ملانے کا عمل ہے جس میں خواب اور حقیقت' شعور اور لاشعور ضم ہو کر انسان کی سایکی کی ان گہرائیوں کا پتا دیتے ہیں جو ناقابل تسخیر ہیں۔ غرض کہ ادب ادب ہے اور نظریہ نظریہ' دونوں کی اپنی اپنی دنیا ہے' کوئی کسی کا بدل نہیں۔ نظریہ فلسفہ ہے' فلسفہ تخلیق کا بدل نہیں' ہو بھی نہیں سکتا' نہ ہی فلسفہ اس کا مدعی ہے۔

DR. GOPI CHAND NARANG
D 252 SARVODAYA ENCLAVE
NEW DELHI 110017 INDIA

ذات یوں گھٹتی رہی تو بے نشاں ہو جائے گی
چاند سورج شاذ گھٹتے آئے دن گھٹتا ہوں میں

گیان چند
آرواین
کیلی فورنیا ۱۳ مئی ۱۹۹۹ء

ڈاکٹر گیان چند جین
کیلیفورنیا امریکہ

دھان پان سے دانشور گیان چند جین جی کو پہلی بار ڈاکٹر جمیل جالبی کے اعزاز میں منعقدہ تقریب میں دیکھا۔ ان سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ جب سے سنا کیلیفورنیا آئے ہیں جی چاہا ان کے گھر جا کر ان سے طویل طویل گفتگو کروں۔ پاکستان لنک کے ایڈیٹر محترم رحمٰن صدیقی نے شاہنواز ریسٹورنٹ میں عشائیہ اور تقریب کا اہتمام کیا تو مدتوں بعد ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب اور ان کی بیگم سے بھی ملاقات ہو گئی۔ ڈاکٹر گیا چند سے بھی ملاقات ہو گئی۔ میں نے ماہنامہ "شاعر" بمبئی کے اپریل ۹۹ء کے شمارے میں ان کا طویل خط نما مضمون پڑھا۔ ان کا اسلوب تو ان کے خط سے جھلکتا ہی ہے مگر ان کے مزاج کے کچھ پہلو بھی اس خط سے نمایاں ہیں۔ میں اس کا اقتباس یہاں پیش کر رہی ہوں۔ پھر آگے چلتے ہیں اور گیان چند جی سے ملتے ہیں۔

"کل بالکل خلاف توقع شاعر کا نمبر مل گیا ہے۔ آپ نے ۱۸ فروری کو بھیجا اور یہ کل ۲۴ فروری کو آ گیا۔ امریکہ میں رجسٹری کا رواج نہیں کیونکہ یہاں ڈاک گم نہیں ہوتی۔ شمارہ دوسرے خطوط کے ساتھ لیٹر بکس میں رکھا ہوا تھا۔ اس پر ۳۴ روپے کا محصول دیکھ کر میں

کانپ گیا۔ میں ہرگز یہ مطالبہ یا توقع نہیں کرتا تھا کہ آپ اسے ہوائی ڈاک سے بھیجیں گے۔ شکاگو سے افتخار نسیم نے مجھے فون پر کہا تھا کہ ان کے پاس پرچہ آگیا ہے' وہ ہندوستان سے واپس آکر اسے پڑھ کر اپنی کاپی مجھے دے دیں گے۔

میں بہرحال محصول ڈاک کی تلافی کے ۳۵۰ روپے دوں گا۔ کسی طرح بھیجنے کا انتظام کروں گا۔ کالی داس گپتا کو لکھوں گا کہ وہ آپ کو دے دیں۔ ۲۴۷ روپے میں معاضے کے نام پر ضبط کر لوں گا۔ جب آپ نے مضمون کو عرصے تک نہیں چھاپا تو میں نے اسے یوپی اکادمی کے رسالہ اکادمی میں چھپنے کے لیے دے دیا۔ آپ کا خط آیا کہ میں اور کہیں نہ چھپواؤں۔ میں نے کئی ماہ کے بعد اکادمی سے واپس لے لیا وہ مجھے اس کا معاوضہ ۵۰۰ روپے دیتے۔ نیا دور لکھنؤ مجھے مضمون کے پانسو روپے دیتا تھا' پھر ایک ہزار روپے دینے لگے۔ نیا دور فراق نمبر (فراق صدی کی آواز) میں مجھے مضمون کی ۱۵۰۰ (ڈیڑھ ہزار روپے) دے کر میرا دماغ خراب کر دیا۔

میں نے پرچے کا ہر صفحہ الٹ کر دیکھ لیا ہے۔ فرصت میں اپنی دلچسپی کی تحریروں کو دیکھوں گا۔ آپ نے غیر معمولی کام کیا ہے۔ اس میں حوالے کا اتنا مواد ہے کہ مالک رام کے تذکرہ ماہ و سال کی طرح ہمیشہ دیکھتے رہنے کی ضرورت ہوگی۔ آخری حصے میں آپ نے جو سوانحی لغت اور انگریزی میں پتوں کی ڈائریکٹری دی ہے وہ مستقل افادیت کی امین ہے۔ اس میں ص ۱۱۸۵ پر میری تاریخ ولادت ۲۰ ستمبر ۱۹۲۳ء لکھی ہے' صحیح ۱۹ ستمبر ہے جو میں نے تذکرہ ماہ و سال کے مضمون میں بھی ص ۱۰۳۸ پر لکھی ہے۔ آپ نے اشک کی تاریخ وفات ص ۶۹۱ پر دسمبر ۱۹۹۶ء لکھی ہے۔ حد کر دی مبالغے کی۔ وہ ۱۹ جنوری ۱۹۹۶ء کو فوت ہوئے۔ اس طرح آپ نے عمر ایک سال بڑھا دی۔

تذکرہ ماہ و سال پر میرے مضمون میں کالی داس گپتا صاحب نے جو تصحیحات کی ہیں ان کی روشنی میں ایک ترمیم نامہ ملفوف کر رہا ہوں۔ براہ کرم شاعر کے کسی بھی شمارے میں چھاپ دیجیے۔ کالی داس گپتا صاحب نے یہ بہت اچھا کیا کہ میر پر لکھا۔ غالب پر بہت لکھا جا چکا ہے' ہند و پاک میں میریات کی تحقیق کا کوئی بھی ماہر نہیں۔ میر کی تنقید شمس الرحمٰن فاروقی نے سنبھال لی' میر کی تحقیق معہ تدوین کو کالی داس صاحب منگوالیں تو بہت اچھا ہو۔ انھوں نے توقیت میر دی وہ مستند ہونی چاہیے لیکن بعد میں آب حیات کی جو غیر مصدقہ کمزور روایات درج کر دی ہیں ان سے احتراز کرتے تو بہتر ہوتا۔ آزاد مرتبہ شاہی کو ہمیشہ مجروح کرتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میر آصف الدولہ سے ایسے گستاخانہ کلمات کہہ سکتے۔

اب گیان چند جی سے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند کا لکھا تعارف' ان کی مجھ سے فون پر گفتگو' سطر سطر اور حرف حرف معنی آفریں ہے۔ لکھتے ہیں نام گیان چند (GIAN CHAND JAIN) وطن: سیوہارہ' ضلع بجنور' اتر پردیش ہندوستان ہے۔ تاریخ ولادت ۱۹ ستمبر ۱۹۲۳ء

والد کا نام بحال سنگھ۔ پردادا حکیم پدم سین نے ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ ہرات (افغانستان) جا کر دو سال طب یونانی کا درس لیا اور اس کے بعد ایک سال کابل میں طب کا درس دیا۔ وہ فارسی ادب کے شائق اور عالم تھے۔ ان کے کتابت کیے ہوئے فارسی ادب کے کئی نسخے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش (چند) مونس اردو کے شاعر تھے اور داغ کے شاگرد کے شاگرد تھے۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر" شائع ہو چکا ہے۔

میری تعلیم سیوہارہ، مراد آباد اور الہ آباد میں ہوئی۔ میں نے جولائی ۱۹۴۱ء سے جون ۱۹۴۷ء تک الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھا۔ ۱۹۴۵ء میں ایم اے اردو فرسٹ کلاس اور فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ جون ۱۹۴۷ء میں ڈی فل (پی ایچ ڈی) کا مقالہ داخل کیا جس پر مارچ ۱۹۴۸ء میں ڈگری ملی۔ دوران ملازمت ایم اے (سوشیالوجی) اور ڈی لٹ (اردو) کی ڈگریاں لیں۔ تین سال کی بے روزگاری کے بعد جولائی ۱۹۵۰ء میں سرکاری حمیدیہ کالج بھوپال میں ملازم ہوا، پہلے لیکچرر، پھر ۱۹۵۶ء سے پوسٹ گریجویٹ شعبے کا صدر و پروفیسر تھا۔ اس کے بعد تین یونیورسٹیوں میں پروفیسر و صدر شعبہ اردو رہا۔ جموں یونیورسٹی ۱۹۶۵ء تا اکتوبر ۷۶ء، الہ آباد یونیورسٹی اکتوبر ۱۹۷۶ء تا مارچ ۷۹ء، حیدر آباد سینٹرل یونیورسٹی مارچ ۷۹ء تا اپریل ۷۹ء، یو جی سی کا فیلو ایمرٹس جولائی ۸۹ء تا جولائی ۹۱ء رہا۔ ریٹائرڈ ہو کر لکھنؤ آبسا اپریل ۹۰ء تا دسمبر ۱۹۹۷ء بھوپال، جموں اور حیدر آباد میں، میں نے نئے شعبہ اردو قائم کیے۔ جنوری ۱۹۹۸ء میں میں اور میری بیوی گرین کارڈ لے کر مستقلاً امریکہ آ گئے۔

میری ۱۱ مستقل کتابیں اور نو مضامین کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مستقل کتابیں یہ ہیں:
۱۔ اردو کی نثری داستانیں ۲۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں ۳۔ تفسیر غالب (غالب کے منسوخ کلام کی شرح) ۴۔ عام لسانیات (۹۱۰ صفحے) ۵۔ ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال ۱۹۰۸ء تک ۶۔ تحقیق کا فن ۷۔ اردو کا اپنا عروض ۸۔ ادبی اصناف ۹۔ کچے بول (شعری مجموعہ ۱۰۔ غالب شناس مالک رام ۱۱۔ تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک ۵ جلدیں بہ اشتراک ڈاکٹر سیدہ جعفر۔ مضامین کے مجموعے ہیں: ۱۲۔ تحریریں ۱۳۔ لسانی مطالعے ۱۴۔ تجزیے ۱۵۔ رموز غالب ۱۶۔ حقائق ۱۷۔ ذکر و فکر ۱۸۔ کھوج ۱۹۔ پرکھ اور پہچان ۲۰۔ مقدمے اور تبصرے۔ مزید تین کتابیں اور تین مجموعے زیر طبع ہیں ۲۱۔ اردو کی ادبی تاریخیں ۲۲۔ قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن ۲۳۔ اپندر ناتھ اشک۔ زیر طبع مضامین کے مجموعے: ۲۴۔ تحقیق اور محققین ۲۵۔ یہ کتاب ۲۶۔ حرف منتشر۔ کتابوں میں نمبر ۱، ۳، ۶، ۱۱، ۲۱ اور ۲۲ اہم تر ہیں۔

کئی انعام و اعزاز ملے جن میں قابل ذکر ہیں: غالب انسٹیٹیوٹ نئی دہلی کا غالب انعام ۱۹۷۳ء میں۔ ۲۔ مرکزی ساہتیہ اکادمی حکومت ہند کا اردو انعام ۱۹۸۲ء میں۔ ۳۔ نقوش لاہور کا ادبی

انعام ۹۳-۱۹۹۲ء میں۔

دو ریسرچ اسکالروں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد اور بنارس ہندو یونیورسٹی میں مجھ کمترین کی شخصیت اور کاموں پر پی ایچ ڈی کی ہیں۔ اہلیہ اور میں نے انگلستان، کینیڈا، جاپان، تھائی لینڈ، ہانگ کانگ اور سنگاپور کے سفر کیے ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں پہلی بار امریکہ آئے اب چھٹی بار آکر یہیں بس گئے ہیں۔

۲ بیسویں صدی کے متعدد اردو ادیب تاریخ میں باقی رہیں گے مثلاً "اقبال، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، جوش، فیض، فکشن نگار: پریم چند، نیاز فتح پوری، منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، انشائیہ نگار: رشید احمد صدیقی، پطرس، کنہیا لال کپور، مشتاق احمد یوسفی، عظیم بیگ چغتائی نقاد: سرور، احتشام، شمس الرحمٰن فاروقی محقق: محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مولانا عرشی، مسعود حسن رضوی، مالک رام، رشید حسن خاں اردو کے سالار: مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور۔

۳۔ جدیدیت نے ناول کو متاثر نہیں کیا۔ افسانے کو جدیدیت نے علامتی اور تجریدی روپ دیا جس نے اس کے حسن کو نکھارا نہیں، مجروح کیا اسی لیے اسے ترک کر دیا گیا ہے۔

۴۔ میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں کہ موجودہ صدی میں اردو میں بہت کم ناول لکھے گئے۔ ہزاروں ناول لکھے گئے ہیں جن میں اچھے ناولوں کی تعداد بھی سو سے زیادہ ہوگی۔

۵۔ ہر زمانے میں یہی کہا جاتا ہے کہ عوام اور ادیب سب ذہنی اعتبار سے پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے صرف نظام فکر سے رہنمائی نہیں ہو سکتی، مادی ترقی کی بھی ضرورت ہے۔ ایک نظام فکر مذہب مہیا کرتا ہے لیکن وہ ذہنی سکون کہاں فراہم کر رہا ہے۔ گاندھی واد، اشتراکیت، ادب کے ذریعے بخشا ہوا اعلیٰ اخلاقی نظریہ، متعدد God men کا بجھایا ہوا راستہ، غرضیکہ متعدد طریقے ہیں۔ ضروری ہے کہ انسان کی بنیادی ضرورتیں پوری کی جائیں، اس کے بعد وہ صارفانہ مزاج میں نہ کھو جائے بلکہ خواہشات کو مہمیز کر کے رکھے۔ یہ سب کیونکر ممکن ہو، میں نہیں جانتا۔

۶۔ شاعری اور نثر کے معیاری پیمانوں کا تعین کوئی نقاد ہی کر سکتا ہے اور میں وہ نقاد نہیں۔

۷۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں میں نثر کافی لکھی جا رہی ہے۔ ہر صنف نثر میں اچھی بری کافی تخلیقات ہو رہی ہیں۔

۸۔ اردو کے بولنے والے اپنی گفتگو میں انگریزی الفاظ کافی تعداد میں شامل کر لیتے ہیں۔ تحریر میں یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ میری رائے میں زبان کا سب سے بڑا مقصد ابلاغ و ترسیل ہے۔ عام استعمال میں آنے والے انگریزی الفاظ کو اردو میں اسی طرح داخل کر لینا چاہیے جیسا اگلے زمانے میں عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ کیا گیا تھا، خصوصاً جدید علوم و فنون کی اصطلاحوں کو

انگریزی یعنی بین الاقوامی شکل میں قبول کرلینا چاہیے۔
۹۔ مجھ جیسے غیر اہم شخص کی زندگی میں اہم واقعات کہاں سے آئیں گے؟ زیادہ دلچسپ تجربے بھی نہیں ہوئے۔ بہر حال امتثال امر میں کچھ تو عرض کرنا ہی ہے۔ ملاحظہ ہو۔
شاید ۱۹۶۱ء کی بات ہے کہ میں حمیدیہ کالج بھوپال میں پورے گریجویٹ شعبہ اردو کا صدر اور پروفیسر تھا۔ کالج کا پروفیسر یونیورسٹی کے ریڈر کے برابر ہوتا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن سے اردو کے پروفیسر کی جگہ کا اشتہار ہوا۔ وہاں سے سبک دوش ہونے والے پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب نے میرے پاس فارم بھیجا اور اصرار کر کے مجھ سے درخواست دلوائی۔ بعد میں میرے پاس عثمانیہ یونیورسٹی سے اطلاع آئی کہ مجھے وہاں کے پروفیسر اردو کی سلیکشن کمیٹی میں ماہر ممبر نامزد کیا گیا ہے۔ میں نے یونیورسٹی کو لکھا کہ میں تو خود اس جگہ کے لیے امیدوار ہوں' میں کیونکر سینیاریٹی کا ماہر مقرر ہو سکتا ہوں۔ بعد میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں بھی اس پوسٹ کے امیدوار ہوئے۔ ان کی سینیاریٹی دیکھ کر میں نے اپنی درخواست واپس لینی چاہی لیکن سروری صاحب اور ڈاکٹر زور نے مجھے اس سے باز رکھا۔ میں انٹرویو میں گیا اور منتخب نہ ہوا۔ مسعود حسین خاں لیے گئے جو مناسب تھا۔
۱۹۶۵ء میں' میں جموں یونیورسٹی میں پروفیسر ہو کر چلا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں ڈاکٹر محمد حسن کشمیر یونیورسٹی سری نگر میں پروفیسر ہو کر آگئے۔ اس کے کچھ بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے پروفیسر اردو کی جگہ کا اشتہار ہوا۔ وہاں کے وائس چانسلر پروفیسر مجیب صاحب مجھے لینا چاہتے تھے۔ میں نے درخواست دے دی' ڈاکٹر محمد حسن نے بھی درخواست دے دی۔ سلیکشن کمیٹی ہوئی جس میں' میں نہیں گیا۔ پروفیسر سرور اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں ماہر ہو کر آئے۔ اس وقت مسعود صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لسانیات کے پروفیسر ہو کر آگئے تھے۔ مجیب صاحب اور سرور صاحب نے میری موافقت کی' مسعود صاحب نے ڈاکٹر محمد حسن کی حمایت اور میری مخالفت کی۔ مجیب صاحب نے پوسٹ کو دوبارہ مشتہر کرنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دنوں بعد مجیب صاحب ریٹائر ہو گئے اور مسعود حسین خاں جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر ہو گئے۔ وہاں سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ریڈر دہلی یونیورسٹی امیدوار ہوئے۔ معلوم نہیں کیوں اب مسعود صاحب ڈاکٹر محمد حسن کے خلاف ہو گئے تھے اور نارنگ کے حامی۔ انہوں نے مجھے اس پوسٹ کی سلیکشن کمیٹی میں ایکسپرٹ کر کے بلایا۔ نارنگ انٹرویو میں آئے' محمد حسن نہیں آئے۔ میرے علاوہ دوسرے ماہرین پروفیسر سرور اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ (پروفیسر اردو عثمانیہ یونیورسٹی) تھے۔ نارنگ لیے گئے محمد حسن رہ گئے۔
اب دلچسپ بات یہ ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں' میں پروفیسر کے سلیکشن کا ماہر مقرر کیا گیا لیکن بحیثیت امیدوار کے مسترد ہو گیا۔ جامعہ ملیہ دہلی میں میں بطور امیدوار کے نہیں لیا گیا لیکن

بعد میں اسی پوسٹ کے سلیکشن کا ماہر مقرر کیا گیا۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ پہلی بار جن ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے میرے سلیکشن کی مخالفت کی تھی، وائس چانسلر ہونے کے بعد انہوں نے مجھے اس پوسٹ کے لیے ایکسپرٹ کر کے بلایا۔

(ب) کوئی ۱۹۷۳ء کی بات ہوگی۔ امروہہ ضلع مراد آباد سے ایک زرد اخبار نگارشات کے نام سے نکلنے لگا جو مہینے دو مہینے میں نمودار ہوتا تھا۔ اس کا خاص موضوع میری اور مالک رام کی مذمت کرنا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کون اور کیوں کرتا ہے۔ نثار احمد فاروقی نے مجھ سے کہا کہ یہ اکبر علی خاں عرشی زادہ کا کام ہے۔ میں نے جواب دیا کہ وہ مجھ سے تو خفا ہو سکتے ہیں کہ میں نے ایک مضمون "نسخہ عرشی، طبع ثانی سے متعلق کچھ معروضات" شائع کی تھیں جو مولانا عرشی کے خلاف پڑتی تھیں مالک رام سے انہیں کیا شکایت ہو سکتی ہے۔

حکومت ہند نے اندر کمار گجرال کی صدارت میں ایک کمیٹی برائے فروغ اردو بنائی۔ مالک رام اور میں دونوں اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ کمیٹی نے طے کیا کہ اردو کے دو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کھولنے کی سفارش کی جائے، ایک شمالی ہند میں دوسرا دکن میں۔ دکن کے لیے تو طے تھا کہ حیدر آباد میں کھولا جائے لیکن شمال کے لیے کئی شہر زیر غور تھے رام پور، علی گڑھ، لکھنؤ وغیرہ۔ اس سلسلے میں رضا لائبریری رام پور کا معائنہ کرنے کے لیے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی گئی جس کے ممبر مالک اور میں تھے۔ ہم نے رام پور جا کر لائبریری دیکھی، شہر کے اہل اردو سے ملاقات کی، شام کو قیام کے لیے عرشی صاحب کے گھر پہنچے۔ مالک رام نے عرشی صاحب سے پوچھا "ادھر اردو کا ایک پرچہ نگارشات نکلتا ہے، آپ نے اسے پڑھا ہے؟" عرشی صاحب نے جواب دیا کہ انہوں نے اس کا نام بھی نہیں سنا۔ اس پر مالک رام نے پرچے کے شمارے نکالے ان میں سے جستہ جستہ پڑھ کر عرشی صاحب کو سنانے لگے۔ انہوں نے چن چن کر اپنی اور میری تیکھی ہجویات پڑھ کر سنائیں اور اس کے بعد یہ بم چھوڑا کہ اس پرچے کا واحد مقصد میری اور گیان چند کی برائی کرنا ہے اور یہ سب اکبر علی خاں کا کارنامہ ہے۔ اس پر اکبر علی خاں نے انکار کیا "نہیں چچا، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" عرشی صاحب نے کہا "اگر اکبر نے ایسا کیا ہے تو بہت بری بات ہے۔" انکار اور توبیخ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

پھر مالک رام نے "ناتھ رام" کی طرف سے مدیر کے نام ایک مراسلہ پڑھا جس میں ناتھ رام نے شکایت کی تھی کہ میرا فلاں مضمون خواجہ حسن نظامی کے اخبار میں شائع ہوا تھا، بعد میں مالک رام نے اسے اپنی تصنیف بنا لیا۔ مالک رام نے عرشی صاحب سے کہا "سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے میں نے اسلامیات کے متعلق یہ مضمون ناتھ رام کے فرضی نام سے لکھا تھا۔ میرے پاس مضمون گم ہو گیا۔ میں نے اکبر علی خاں کو لکھا کہ کتب خانے میں خواجہ صاحب کے اخبار میں سے تلاش کر کے اس کی نقل مجھے بھیج دیں۔ انہوں نے بھیجی صرف

انہیں کو معلوم تھا کہ "ناتھ رام" میں ہی ہوں۔ پھر اکبر علی خاں کا احتجاج "نہیں چچا میں نے ایسا نہیں کیا" اور عرشی صاحب کی پھٹکار کہ انہوں نے ایسا کیا تو بہت برا کیا۔

وہ دن اور آج کا دن نگارشات پھر کبھی شائع نہ ہوا۔ یہ اردو دنیا میں سب عمائد کو بھیجا جاتا تھا' نہ بھیجا گیا تو صرف عرشی صاحب کو۔ مالک رام نے نقوش نومبر ۱۹۶۴ء میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں عرشی صاحب کے نسخہ عرشی دیوان غالب کے مقدمے کے بعد مطالب سے اختلاف کیا تھا۔

میں ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۹ء تک محض ڈھائی سال الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر و صدر شعبہ اردو رہا۔ بعد میں حیدر آباد چلا گیا۔ ان ڈھائی برسوں میں بارہا فراق صاحب کے گھر جانا ہوا۔ وہ قسم کھا کر ہمیشہ آدھا دھڑ برہنہ رکھتے تھے۔ قمیص کے نیچے کوئی جانگیا یا پاجامہ وغیرہ نہ ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے تقاضا کیا کرتے تھے کہ ان کا کلام ایم اے کے کورس میں رکھا جائے۔ میں نے ان کے کہے بغیر غزل کے پرچے میں ان کے مجموعے "گل نغمہ" کو شامل کرلیا تھا۔ ایک شام غروب کے وقت ان کے گھر پہنچا۔ وہ بغیر پاجامہ پہنے کرسی پر اس طرح بیٹھے تھے کہ انہیں دیکھ کر مجھے جھجک سی ہوئی۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ پیچھے سے کوئی چیز آکر گری ہے۔ ان کے گھر میں جو ہندی داں چیلے لڑکے رہتے تھے ان میں سے ایک سعادت مند نے لال انگوچھا (جو پوربیوں میں بہت مقبول ہے) ان کے ستر پر پھینکا تھا تاکہ عیب برہنگی ڈھک جائے۔ اس غیرت مند نے سوچا ہوگا کہ یونیورسٹی کا ایک صدر شعبہ آیا ہے' اس کے سامنے فراق صاحب کا یوں ستر کھول کے بیٹھنا سخت بدتمیزی ہے۔ فراق صاحب تو عام تہذیبی شعور سے بالکل بیگانہ ہو چکے تھے۔ اس وقت بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں ایک لڑکا دونے میں چند جلیبیاں لاکر دے گیا۔ فراق کھاتے رہے اور پیتے رہے نشے کا عروج تھا۔ جلال کے عالم میں مجھ سے کہا۔

"میں نے سنا ہے آپ کلاس میں یہ کہتے ہیں کہ غالب بڑا شاعر نہ تھا۔"

میں نے جواب دیا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ غالب بڑا شاعر نہ تھا بلکہ یہ کہتا ہوں کہ سب سے بڑا شاعر نہ تھا۔ اس پر فراق صاحب نے میرے بارے میں جو کچھ کہا اس کا ماحصل یہ تھا کہ آپ کی شہرت ادب کی تاریخ جاننے والے کی ہے' آپ کو تنقید کا شعور نہیں۔ پھر پوچھا کہ اگر غالب اردو کا سب سے بڑا شاعر نہ تھا تو اور کون ہے۔ اگر میں یہ کہہ دیتا کہ آپ ہیں تو بات بن جاتی لیکن میری تو شامت آئی ہوئی تھی۔ میں نے جواب دیا "اقبال" مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اقبال کے خون کے پیاسے ہیں۔ بپھر گئے۔ نشہ گھمنڈ رہا تھا۔ سارے حجابات اٹھ گئے تھے۔ مقعد کے لیے جو عامیانہ لفظ ہے اس کا فراخ دلی سے استعمال کرتے ہوئے کہا۔

کوئی صورت نظر نہیں آتی
کوئی امید بر نہیں آتی

ایسا شعر کہنے کے لیے... پھٹتی ہے۔ یہ اقبال کے بس کا نہ تھا۔ پھر اسی غزل کا کوئی اور شعر پڑھا اور پھر تاثراتی تنقید کی معراج دکھاتے ہوئے "پھٹتی ہے" کا ورد کرنے لگے۔ پھر مجھ سے پوچھا اقبال میں کون سی خوبی ہے اور اس کی کون سی نظم اچھی ہے۔ میں نے جواب دیا "مسجد قرطبہ" عظیم نظم ہے اور اس میں زمان کا فلسفہ خوب پیش کیا ہے۔ انہوں نے پھر تاثراتی تنقید کا کمال دکھایا۔ مسجد قرطبہ کے کسی مصرع کو کھجا کھجا کر استہزائی ریختی والے انداز میں پڑھتے اور بزعم خود یہ سمجھ لیتے کہ انہوں نے اس مصرع کو پوچ اور لچر ثابت کر دیا۔ اس کے بعد یہ شاہکار جملے لڑھکائے۔ "اقبال کے یہاں کون سا ایسا فلسفہ ہے جو کسی چار آنے کی فلسفے کی کتاب میں نہیں مل جاتا۔ اقبال وویکانند کے گھر میں جھاڑو بھی نہیں لگا سکتا۔ اسلام' اسلام کرتا ہے' اسلام... نابدان کا کیڑا۔ مسلمان بینگن کا ٹھیلا ڈھکیلنے والے۔"

اقبال کشی کے بعد انہوں نے سوال کیا "آپ نے میری نظمیں کورس میں رکھیں؟" میں نے جواب دیا کہ "گل نغمہ" کی غزلیں کورس میں لے لی ہیں۔ آئندہ میٹنگ میں نظموں کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔ انہوں نے پوچھا "کون کون سی نظمیں لیں گے" سچ تو یہ ہے کہ میں نے فراق کی چند نظمیں پڑھی تھیں' جملہ نظموں کو دیکھ کر فیصلہ نہیں کیا تھا۔ فراق تاڑ گئے کہنے لگے "آپ نے میری نظمیں پڑھی ہوں تو بتائیں۔" ذرا دیر پہلے ان کا چہیتا رمیش دویدی آ گیا تھا۔ فراق کے اس مزاج شناس نے مجھے سہارا دیتے ہوئے کہا "آپ کے سامنے کوئی دوسرا کیسے طے کر سکتا ہے۔ آپ ہی بتائیے۔" فراق نے ہنڈولا' دھرتی کی کروٹ اور نہ جانے کس کس نظم کا نام لیا۔ وہ چپ ہوئے تو میں نے کہا "اب اجازت چاہتا ہوں' آداب عرض۔" انہوں نے جواب دیا آداب عرض۔ پھر میں ایک بار کے علاوہ فراق کے گھر نہ گیا۔ بعد میں میں نے ان کی جملہ نظمیں دیکھیں۔

اردو نثری نظم پر بیکار بحث چل رہی ہے۔ "دھرتی کی کروٹ" جیسی دوسری غیر شاعرانہ نثری نظم اور کہاں ملے گی۔

۱۰۔ مجھے آپ سے اتفاق نہیں کہ اردو میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ اردو میں تنقید نے بہت ترقی کی ہے۔ ہمارے معاصر زندہ ادیبوں میں آل احمد سرور' شمس الرحمٰن فاروقی' گوپی چند نارنگ' محمد حسن' عقیل رضوی' سردار جعفری اور ڈاکٹر وزیر آغا وغیرہ بہت اچھے نقاد ہیں۔"

ڈاکٹر گیان چند سے تو بہت سی باتیں کی جا سکتی تھیں مگر تنگیٔ داماں نے مہلت نہ دی۔ ان کے بیان کئے گئے دلچسپ واقعات بے شک "اردو ادب" میں بیش قیمت اضافہ ثابت ہوں گے۔

DR. GIAN CHAND JAIN 23 NEVADA
IRVINE CA 92606 U S A

کوئی کام وقت سے پہلے نہیں ہوتا۔ کوئی چیز نصیب سے زیادہ نہیں ملتی۔

لطف اللہ خان
۶ رفروری ۲۰۰۰ء

لطف اللہ خان

کراچی

لطف اللہ خان کو ''آوازوں کا نگہبان'' کہا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں فیض احمد فیض نے کہا۔

ذکر پھر کیجئے اس گوشہ تنہائی کا
جس میں ہر لحظہ بپا رہتی ہے اک محفل لطف
منزل نغمہ گراں' خانہ شیریں سخناں
سر بہ سر مبع سو لطف ہے یہ منزل لطف

اسی ''محفل لطف'' میں فیض احمد فیض نے اپنی زندگی کا بڑا خوبصورت وقت گزارا اور آج اسی ''منزل لطف'' میں فیض کی آواز میں فیض کا سارے کا سارا کلام مختلف ٹیپوں میں محفوظ ہے۔ اور ایک فیض ہی نہیں 'کئی سو شعراء کی آوازیں' آڈیو لائبریری میں موجود ہیں۔ مگر وہ بہت غم زدہ ہیں۔ ناقدری کے اس دور میں انہیں اپنی محنت اور اپنی ایک عمر کی کمائی ضائع لگتی ہے۔

لطف اللہ خان صاحب 2000ء میں پچاسی ویں منزل میں قدم رکھ چکے ہیں۔ وہ 25 نومبر 1916ء کو مدراس (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ بہت ذہین نوجوان تھے۔ تعلیم میٹرک تک حاصل کی اور

ابتدا ہی سے کچھ کر گزرنے کی دھن میں پتھریلی راہوں پر چل نکلے۔ ان کے والد کے انتقال کے بعد نانا کے ہاں پرورش ہوئی۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1937ء میں یہ حیدر آباد، دکن گئے۔ سال بھر معقول ملازمت ملنے کا انتظار کیا اور پھر 1938ء میں بمبئی آگئے۔ وہاں لمنگٹن روڈ پر میونسپل اسکول میں 45 روپے ماہانہ کے عوض انہیں کلرکی کی جگہ مل گئی۔ عصمت چغتائی ان دنوں ایک گرلز اسکول کی سپرنٹنڈنٹ تھیں۔ لطف اللہ خان کا رجحان افسانہ نگاری کی جانب تھا چنانچہ ایک افسانہ "بلیک آوٹ" لکھا اور عصمت کو دکھایا۔ انہوں نے بڑی تعریف کی۔ انہیں شاعری کا شوق بھی تھا۔ عدیل تخلص بھی اختیار کیا مگر اپنے بس کی بات نہ پاکر شاعری چھوڑ چھاڑ کر افسانہ نگار کی طرف توجہ دی۔ کئی افسانے لکھے جن پر مشتمل کتاب "پہلو" کے نام سے 1941ء میں شائع کی جس کا ایک نسخہ اب بھی ان کے پاس محفوظ ہے۔

لطف اللہ خان اپنے میٹرک کے امتحان میں دوبار فیل ہوئے تھے، اس لئے کہ موسیقی سے بے انتہا شغف تھا اور اس کی نہ صرف ریاضت کی تعلیم حاصل کی بلکہ مدراس ریڈیو کارپوریشن میں دو گھنٹے کلاسیکی موسیقی بھی سکھاتے تھے۔ یہ 1936-1935ء کی بات ہے۔ تقسیم ہند کے بعد لطف اللہ خان پاکستان آگئے۔ یہاں بھی 1974ء میں انہوں نے "پاکستان کی موسیقی" کے عنوان سے دو قسطوں پر مشتمل پروگرام ریڈیو پاکستان کی ورلڈ سروس سے پیش کیا۔

لطف اللہ خان کا یہ شوق ان سے ایک ایسا نادر روزگار کام کرا گیا کہ جس کی مثال پاکستان میں دور دور تک نہیں ملتی۔ انہوں نے اپنی عمر عزیز کے تقریباً پچاس سال آوازوں کی ریکارڈنگ میں اور ان کی آڈیو لائبریری بنانے میں صرف کئے۔ انہوں نے اس سے روزگار نہیں کمایا بلکہ 1948ء میں اپنی اشتہاری کمپنی Kays ایڈورٹائزنگ اینڈ اسٹوڈیوز پرائیوٹ لمیٹڈ سے کمائی ہوئی آمدنی اس آڈیو لائبریری کی پرورش پر صرف کرتے رہے۔

جون 1951ء سے قائم کی گئی اس لائبریری میں لاتعداد مشاہیر کی آوازیں محفوظ ہیں۔ 3500 کے لگ بھگ ادیبوں اور دانشوروں کی Transparancies ہیں۔ فوٹو گرافی کا یہ شعبہ بھی لائبریری میں موجود ہے۔ یہ تمام transperancies اور تصاویر انہوں نے خود بنائی ہیں۔ 40 تا 50 سال قدیم اشیاء مثلاً" امریکہ اور بھارت کے سینما پمفلٹ، ماچس کے ڈبوں کے کورز، اسٹیشنری آئٹمز، اس کے علاوہ اور دوسری بے شمار قدیم اشیاء موجود ہیں۔ انہوں نے ایک آڈیٹوریم بھی بنایا جو 24 سیٹوں پر مشتمل تھا جس میں اسکرین اور آواز کا بہترین سسٹم موجود ہے۔ پروجیکشن روم میں بیٹھ کر آپ یہ آوازیں سن سکتے ہیں اور اسکرین پر تصاویر دیکھ سکتے ہیں مگر اب لطف اللہ خان صاحب کا عزم تھک کر دم توڑ دینے کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ وہ اور ان کی محنت قوم کی بے حسی کا شکار ہوتی جارہی ہے۔

اس سے قبل کہ ان کی یہ آڈیو لائبریری اور میوزیم زمانے کی دست برد کا شکار ہو جائے۔

حکومت پاکستان اور ارباب اختیار و اقتدار کو اس لائبریری اور میوزیم کو اپنی تحویل میں لینے اور اسے قومی لائبریری اور میوزیم کی صورت میں محفوظ کرنا چاہئے تاکہ لطف اللہ خان صاحب کا یہ کارنامہ ضائع ہونے کی بجائے ان کی قوم کی اگلی نسل تک ایک ثقافتی ورثہ کی صورت میں منتقل ہو جائے۔

لطف اللہ خان صاحب نے مضامین بھی لکھے اور اپنے احباب کے خاکے بھی۔ ان کی کتب کی فہرست میں "بچپن کے واقعات" بھی ہیں۔ مطبوعہ 1991ء۔ "تماشائے اہل کرم" مطبوعہ 1996ء۔ اس کتاب میں دس مشاہیر کے خاکے ہیں جن میں جوش، فیض احمد فیض، استاد قمر جلالوی، جگر مراد آبادی، اختر حسین رائے پوری، عصمت چغتائی، ن۔ م راشد، زیڈ اے بخاری اور ان کے دیگر احباب ہیں۔ انہوں نے ان احباب کے ساتھ وقت گزارا۔ ان کی شخصیت کا قریبی مطالعہ کیا اور پھر کہانی کے پیرائے میں یہ خاکے لکھے۔

"سر کی تلاش" (1997ء) میں شائع ہوئی اور نام سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب موسیقی اور موسیقی سے شغف رکھنے والوں کی داستان ہے۔ اپنی خود نوشت انہوں نے "ہجرتوں کے سلسلے" کے حوالے سے لکھی جو 1999ء میں منظرعام پر آئی۔ اب "زندگی ایک سفر" کے عنوان سے اپنی سیاحتوں کی کہانی لکھ رہے ہیں جو یقیناً بے حد دلچسپ ہوگی کیونکہ لطف اللہ خان صاحب بہت آسان زبان لکھتے ہیں اور اتنے دلچسپ انداز میں کہ انہیں دور دراز گاؤں میں بسنے والے ان کے قارئین خط لکھتے ہیں۔ انہیں تحسینی کلمات سے نوازتے ہیں اور ان کی دوسری کتابوں کو پڑھنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

لطف اللہ خان صاحب سے 10 فروری 2000ء کے دن کی گئی ملاقات میں ان سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ میں نے ان کی آڈیو لائبریری کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کیا اور پوچھا۔ لطف اللہ خان صاحب! آپ نے اتنے چاؤ سے آوازوں کی لائبریری بنائی ہے۔ کیا اب آپ اس کام سے بالکل دست بردار ہو گئے ہیں؟

لطف اللہ خان صاحب اس ذکر سے ہی دل برداشتہ تھے بولے۔ ہاں! دست بردار ہو گیا ہوں۔ میں اب 84 سال کا ہو گیا ہوں اور اس میں بڑی بھاگ دوڑ ہے۔ لوگوں سے رابطہ کرنا۔ جا کر انہیں گھیرنا، درخواست کرنا، فون کرنا کہ بھئی آئیں، تشریف لائیں پہلی دفعہ دوسری دفعہ کئی دفعہ جیسے ہاجرہ مسرور نے ہمارے ساتھ کیا۔ کہتی ہیں آج آتی ہوں، کل آتی ہوں، آج یہ وجہ ہے، کل وہ وجہ تھی، ٹالنے والی بات۔ پھر مشکل سے جا کر ان کو لے کر آؤ پھر یہاں بیٹھ کر ریکارڈنگ کراؤ۔ ان کو چائے پانی پلا کر پھر ان کے گھر چھوڑ کر آؤ۔ پھر یہاں بیٹھ کر ان آوازوں پر محنت کرو۔ انہیں محفوظ کرو۔ تم تو خود بھی انٹرویو کرتی ہو۔ تمہیں ان کے گر نہیں معلوم کہ ان "دانشوروں" کے کتنے نخرے ہوتے ہیں۔ کچھ اچھے بھی ہوتے ہیں مگر اب یہ محنت طلب کام مجھ سے اس لئے بھی نہیں ہوتا کہ میں پچاس سال سے یہ کام کر رہا ہوں۔ اخبار والے اور دوست احباب تو مہربانی کرتے ہیں لیکن

حکومت کے کارکنان، دوسرے ادارے، کوئی تو آگے آئے۔ ان کی بے حسی سے مایوس ہو چلا ہوں۔ بددل ہو گیا ہوں حالانکہ مجھ میں اب بھی کام کرنے کی ہمت ہے، حوصلہ ہے مگر اب اسے سنبھالنے کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔ میری عمر کے پچاس سال ضائع ہوتے نظر آ رہے ہیں۔

آپ نے ارباب اختیار سے رابطہ کیا؟ میں نے پوچھا۔

وہ دکھ بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "سلطانہ حکومت کی اپنی ترجیحات ہیں۔ حکومت کا اپنا قاعدہ ہے۔ حکومت اس کی مدد کیوں کرے گی جو اس کی خوشامد نہیں کرے گا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر مدراس میں پیدا ہونے کی بجائے اللہ میاں مجھے لاہور میں پیدا کر دیتا، سیالکوٹ میں پیدا کر دیتا، گوجرانوالہ میں پیدا کر دیتا تو میری حیثیت وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔ میں کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوتا۔ آج میری محفوظ کی ہوئی آوازیں خراب ہونے والی منزل تک پہنچ رہی ہیں۔ میں بتاتا ہوں تمہیں کہ یہ جو کیسٹ ہیں یہ چالیس سال پرانے ہیں۔ ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ ختم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ٹیپ لاکھ بے حیا سہی پھر بھی اس کی ایک عمر ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ خراب ہونے والی چیز نہیں ہے۔ جب سنو تب تازہ جب سنو تب تازہ۔ مگر اب میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ان کے اندر خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ٹیپ گلنے سڑنے لگے ہیں۔ یہ سارے ٹیپ جس پر ہزاروں آئٹمز ہیں اور یہ وہ آئٹمز ہیں جن میں پرانے گانے اور کلاسک گیت جو کسی کے پاس نہیں ہوں گے۔ بعض تو جو ہیں میرے پاس وہ انڈیا میں ہیں یا کچھ مجھ جیسے سرپھرے لوگوں کے پاس ہونے چاہئیں۔ اردو ادب کے، اسلامیات کے یا کسی اور شعبے کے خاص طور پر اردو ادب کے ہزاروں آئٹمز جیسے مجنوں گورکھپوری کا دو تین گھنٹے کا انٹرویو۔ یہ سب جس کی نقل کہیں اور نہیں ہے، صرف میرے پاس ہے۔ اب ایک چیز خراب ہو گئی تو خراب ہو گئی۔ مجھے فخر بھی ہے، مسرت بھی اور دکھ بھی کہ فیض کا سارا کلام، حفیظ جالندھری کا شاہنامہ، اسی طرح جوش کا کلام جو 300 سے 400 رباعیات پر مشتمل ہے میرے پاس ہے اور اسکی کاپی کہیں نہیں ہے۔ یہ نایاب سرمایہ ہے۔ اب اس کو محفوظ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ یہ جو ریکارڈنگ میرے پاس ہے اسے Analog کہتے ہیں۔ اس Analog کو لوگ آج کل digital میں ٹرانسفر کر لیتے ہیں اور اس کا CD بنا لیتے ہیں۔ CD میں ٹرانسفر کرنے میں چیز اوریجنل حالات سے زیادہ قریب رہتی ہے۔ اب اس تمام سرمائے کو محفوظ کرنے کے لئے کم از کم دو مشینیں چاہئیں جس سے اس کو ٹرانسفر کیا جائے اور کم از کم ہزاروں ڈسک چاہئیں۔ ان کا خرچہ کوئی پانچ لاکھ روپے کے قریب بنتا ہے۔ پھر اس کام کے لئے مجھے دو آدمی درکار ہوں گے۔ اس عمر میں، میں اکیلا تو یہ کام نہیں کر سکتا۔ ہاں! اپنی نگرانی میں کرا سکتا ہوں۔"

لطف اللہ صاحب خاموش ہو گئے۔ میں نے پھر کریدا۔ بڑے big guns آپ کے دوست ہوں گے۔ آپ کے حلقے میں بڑے بڑے جغادری ادیب ہیں۔ وہ حکومت کو متوجہ کریں۔ مجھے یقین ہے یہ کام حکومت کرے گی۔ ایک طنزیہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آئی بولے۔ یہاں B.C.C.I کی

ایک فاؤنڈیشن ہے۔ لوگوں نے کہا کہ بھئی ان کو لکھو تو میں نے لکھا۔ ان کے جو سربراہ تھے انہوں نے کہا کہ صاحب آپ ہمیں خط لکھیں تو ہم پانچ لاکھ روپے آپ کو دے دیں گے۔ اسی روز میں نے ان کو خط لکھا اور جناب اسی زمانے میں وہ ریٹائر ہو گئے۔ اب جو ہمارے معاشرے کا طریقہ کار ہے کہ دوسرے صاحب ان کی جگہ آئے۔ انہیں یاد دہانی کرائی تو جواب ملا کہ یہ ہماری لائن نہیں ہے۔ ہم یہ کام نہیں کر سکتے حالانکہ یہ ان کی لائن ہے۔ فاؤنڈیشن میں ان کاموں کے لئے گنجائش ہے لیکن انہوں نے یہ جواب لکھ دیا چنانچہ ہم نے بھی دل پر پتھر رکھ لیا۔ میں تمہیں بتاؤں سلطانہ کہ میرے کام کی تعریف تو سب کرتے ہیں مگر میری محنت کو' میری لگن کے سرمائے کو محفوظ کرنے کے لئے قدم اٹھائیں تو بات ہے۔ تیں چالیس سال پہلے اس زمانے میں جب اس قسم کے equipment کم تھے میں نے اسپیکر بنا کر combine sound کر کے کام کو پھیلا دیا۔ سب لوگ آ کر تعریف کرنے لگے۔ سعود الرحمن یہاں سیکریٹری رہے ہیں' وہ میرے دوست تھے انہوں نے سنا وہ بھی آئے۔ کہا لطف اللہ سنو یہ جو تم نے کام کیا ہے' امریکہ میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے یہ کیا ہے لیکن تمہاری خصوصیت یہ ہے کہ تم نے یہ اس ملک میں رہ کر کیا ہے جہاں اس کام کو کرنے کی سہولت میسر نہیں۔ اس کی پذیرائی نہیں۔ اس کے آلات میسر نہیں وہاں اس قسم کا کام کرنا بڑی بات ہے۔

لطف اللہ صاحب سے میں نے ان کی کتاب "تماشائے اہل کرم" کے حوالے سے گفتگو کی اور ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ جو دس آدمیوں کے خاکے لکھے ہیں ان میں ان کی کمزوریاں بھی بیان کر دی ہیں۔

کہنے لگے۔ "بالکل بالکل۔ میں نے جو باتیں تحریر کی ہیں ان میں ان کی خوبیاں بھی ہیں اور کمزوریوں کا ذکر بھی ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ میں نے جو خرابیاں دیکھیں اور مجھے جو کمزوریاں نظر آئیں۔ من و عن بیان کر دیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری تحریر کی سچائی ہے کیونکہ اگر میں مصلحت برتنے بیٹھوں تو میرے لئے لکھنا ہی مشکل ہو جائے۔ گو لوگوں نے میرے سچ لکھنے کا برا مانا ہے جیسے ہاجرہ مسرور نے۔ مگر میں نے جمیل جالبی صاحب کے بارے میں لکھا اور انہوں نے برا نہیں مانا۔ وہ ہمارے نامور محقق ہیں۔ سینئر موسٹ شخصیت ہیں مگر بڑا ظرف ہے ان کا۔

کیا قصہ ہوا تھا؟ میں نے پوچھا۔

ہوا یوں کہ انہوں نے ہمیں کھانے پر بلایا اور خود سلیم احمد مرحوم کے چہلم میں چلے گئے۔ وہاں بھی جانا ان کا ضروری تھا۔ بہت دیر ہو گئی۔ بیگم ان کی پریشان تھیں اور معذرت کر رہی تھیں۔ انتظار سے پریشان ہو کر اختر حسین رائے پوری نے مجھ سے کہا۔ "لطف اللہ صاحب! چلئے چلتے ہیں اب انتظار بے کار ہے۔" میں نے کہا "تھوڑی دیر انتظار کر لیں' بیٹھ جائیں۔" جب جمیل جالبی صاحب آ گئے اور انہوں نے تاخیر کے لئے سب سے معذرت چاہی تو اختر رائے پوری نے کہا کہ آپ نے بہت دیر لگا دی۔ لطف اللہ صاحب کہہ رہے تھے کہ آؤ اب چلیں یہاں سے۔ اختر مرحوم میں

اتنی اخلاقی جرات پیدا نہیں ہوئی کہ وہ کہیں کہ خود انہوں نے یہ مجھ سے کہا تھا۔ جالبی صاحب نے کہا "دیکھیں صاحب! میں بھی پٹھان ہوں۔ میں خفا ہو سکتا ہوں آپ سے۔ (وہ ہمیشہ کہتے ہیں کہ میں پٹھان ہوں) میں نے اس پر لکھا تھا کہ یہ سن کر جمیل جالبی کا ناریل چٹخا (یہ محاورہ ہے) جب میں یہ واقعہ لکھ چکا تو میں نے من و عن جمیل جالبی کو دیا کہ میں نے تمہارے بارے میں لکھا ہے۔ اس لفظ "ناریل چٹخا" کو میں نے نرم الفاظ سے بدل دیا تھا کہ جالبی غصے میں نہ آجائیں۔ برا نہ مان جائیں۔ اب جالبی کا کردار دیکھو تم۔ انہوں نے کہا "لطف اللہ بھائی! یہ جملہ لکھئے کہ ان کا ناریل چٹخا" حالانکہ میں نے یہ اصل جملہ نہیں لکھا تھا مگر جمیل کے ذہن میں وہی لفظ آئے۔ تو اس طرح کے رویے سے کشادہ دلی کا اظہار ہوتا ہے۔ لطف آتا ہے لکھنے میں۔

"لطف اللہ صاحب! اب جو بقیہ شخصیات بچی ہیں ان پر کب لکھ رہے ہیں؟"

بھئی اب میرا موڈ نہیں ہے۔ صاف گوئی سے انہوں نے کہا۔ موڈ کی بات ہے کیونکہ میں باقاعدہ Professional Writer تو ہوں نہیں جب آمد ہوتی ہے تو لکھ دیتا ہوں' نہیں آمد ہوتی تو نہیں لکھتا۔ اس سے میری روزی تو وابستہ نہیں ہے حالانکہ میرے پاس لکھنے کو اتنا مواد ہے اور کرنے کو اتنا کام ہے کہ کیا بتاؤں کہ مجھے تو اب یہ 84 سال کی عمر بھی کم معلوم ہوتی ہے۔ کام پہلے بھی تھے اب بھی ہیں مگر کام ختم ہونے میں نہیں آتے۔ کبھی میوزک کا کام لیتا ہوں' کبھی فوٹوگرافی پر ہاتھ ڈالتا ہوں' کبھی ڈیکوریشن پر کام کرتا ہوں' کبھی چھوٹی موٹی ایجادوں پر ہاتھ ڈالتا ہوں' کبھی کچھ سیکھنے پر آجاتا ہوں۔ اس طرح میں نے اردو کمپوزنگ سیکھ لی۔ اب اپنی کتابیں خود کمپوز کرتا ہوں۔ اپنی خودنوشت اور سفرنامے جو بہت دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ لکھنا چاہتا ہوں مگر پھر سوچتا ہوں اتنے پاپڑ بیلنے سے فائدہ؟ اردو پڑھنے والے کتنے ہیں؟ اردو کی پذیرائی نہیں ہو رہی ہے۔ پہلے کالج میں اساتذہ طالب علموں کو ادب پڑھنے پر راغب کرتے تھے۔ اب ایسا نہیں۔ پہلے ماں باپ بچوں کو ذوق و شوق سے اردو پڑھاتے تھے۔ دور کیوں جاؤں خود میرے بچے کانونٹ میں پڑھے ہوئے ہیں۔ اردو بول لیتے ہیں' لکھنا نہیں جانتے۔ ہمارے زمانے میں تھی اردو کی پذیرائی' اب نہیں ہے۔ ہماری قومی زبان ہونے کے باوجود اردو کے ساتھ ہمارا سلوک کیا ہے۔ اور یہ جو میں لکھتا ہوں صرف اس لئے کہ میری تحریر سے میرے پڑھنے والے خوش ہو جائیں حالانکہ میں نہ ادیب ہوں نہ دانشور۔ بس دعا ہے کہ میرا لکھا کوئی لفظ' کوئی بات کسی کے لئے چراغ راہ بن جائے آمین۔

MR. LUTF ULLAH KHAN
75/1/1 KHAYABAN-E-SAHER
D.H.A. KARACHI PAKISTAN

مجتبیٰ حسین
دہلی

مجتبیٰ حسین ایک نام، ایک شخص اور ایک ذات نہیں بلکہ ایک انجمن اور ایک ادارے کا دوسرا نام ہے جو ادب کی کئی اصناف کو خود میں سموئے ہوئے ہے۔

کسی نے کہا "مجتبیٰ حسین ہندوستان کے مشتاق یوسفی ہیں۔" یہ بالکل اس طرح کی مثال ہے جیسے کہا جائے کہ مشتاق یوسفی ہندوستان کے دوسرے مجتبیٰ حسین ہیں۔ یہ تشبیہ نہ دی جائے تو بھی دونوں قد آور مصنفین کی حیثیت اپنی اپنی جگہ بذات خود بڑی مستحکم ہے۔

مجتبیٰ حسین کے خاکے سفرنامے اور کالموں پر مشتمل چودہ کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تحریروں میں الفاظ فقرے اور جملوں کی نشست اور پھر ان جملوں میں بین السطور ایسا طنز ملتا ہے جو دماغ کو بڑی لطافت اور ملائمت کے ساتھ شگفتہ کر دیتا ہے۔ انھیں باغ و بہار نثر لکھنے پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ مجتبیٰ حسین طنز و مزاح کے دھماکے نہیں کرتے۔ مدھم انداز میں پھلجھڑیاں چھوڑتے ہیں کہ پڑھنے والا بھی مدھم لطافت کے ساتھ مزاح اور طنز سے حظ اٹھا سکے۔ دراصل یہ انکی اپنی شائستہ اور تربیت یافتہ حس مزاح ہے جس نے انھیں یہ سلیقہ عطا کیا

ہے۔ ان کا اپنا اسلوب ہے جس نے آج انکی تحریروں کو جداگانہ شناخت بخشی ہے۔

مجتبیٰ حسین کا تعارف پڑھیے تو آپ کو حیرت ہوگی کہ اس دھان پان سے شخص نے اپنی زندگی کے ۶۳ سالوں کے سفر میں کیا کچھ ادبی کارنامے انجام دیئے ہیں اور اب بھی اسی گرم جوشی سے رواں دواں ہیں۔ ہاں بس دوستوں کو خط لکھنے میں بقول خود "کوتاہ قلم" ہیں۔

اپنے بہت پیارے دوست حسن چشتی کو (شکاگو) جنہیں میں نے "خاموش خضر" کا خطاب دیا ہے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "میری خراب ہینڈ رائٹنگ کی وجہ سے میں اکثر دوستوں کو خط نہیں لکھتا"

واقعی مجتبیٰ صاحب کی تحریر پڑھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ان کا عکس تحریر ملاحظہ کر لیں۔ لیکن ہم نے بھی چونکہ صحافت کی دنیا میں ایک طویل مدت تک ہر طرح کی تحریروں کے مطالعے سے یوں گذرے ہیں جیسے پل صراط سے گذرتے ہیں چنانچہ مجتبیٰ حسین کی تحریر پڑھ کر ایک بار اور پل صراط سے گزرنا پڑا اور ہم بخیر و خوبی گذرے تاکہ آپ کو آپ کے چہیتے ادیب مجتبیٰ حسین سے ملائیں۔

قارئین! یہ مجتبیٰ حسین ہیں جو ۱۵ر جولائی ۱۹۳۶ء کو موجودہ ریاست کرناٹک کے ضلع گلبرگہ کی تحصیل چنچولی میں پیدا ہوئے۔ لیکن ان کے تعلیمی صداقت نامے میں تاریخ پیدائش ۱۵ر جولائی ۱۹۳۳ء درج ہے جو غلط ہے۔ ان کے والد محترم مولوی احمد حسین ضلع عثمان آباد کے رہنے والے تھے اور وہ تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے دو بڑے بھائی محبوب حسین جگر، جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "ریاست" حیدر آباد اور جناب ابراہیم جلیس (مرحوم) اردو دنیا کی اہم شخصیتوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ موجودہ اردو صحافت کو ایک نیا آہنگ اور اعتبار عطا کرنے میں محبوب حسین جگر کی کوششوں کا بڑا دخل رہا ہے۔ انہوں نے ۱۹۴۹ء میں جناب عابد علی خان کی رفاقت میں روزنامہ "سیاست" کے اجراء کے ذریعہ اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔

ابراہیم جلیس ان کے دوسرے بڑے بھائی ہیں۔ ابراہیم جلیس نے برصغیر ہند و پاک کے صف اول کے افسانہ نگار اور طنز نگار کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ابراہیم جلیس ان گنے چنے ادیبوں میں سے ہیں جنہیں نہایت کم عمری میں بے پناہ شہرت ملی۔ ۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ اور پاکستان میں بھی انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۷ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔

اس خاندانی پس منظر میں مجتبیٰ حسین کا ادب سے لگاؤ ایک فطری بات نظر آتی ہے۔ ملک کی تقسیم اور سابق ریاست حیدر آباد کے خاتمہ کے وقت وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ انہوں نے ۵۳ء میں گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا۔ وہ گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج کی بزم اردو کے جنرل سیکریٹری بھی رہے اور ۵۳ء میں گلبرگہ میں ایک تاریخی

مشاعرہ بھی منعقد کیا جس میں مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، جگن ناتھ آزاد، سلیمان ادیب اور شاہد صدیقی وغیرہ جیسے اہم شاعروں نے شرکت کی۔ مجتبیٰ حسین نے گلبرگہ کے زمانہ طالب علمی میں تہذیبی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خاص طور پر ایک اداکار اور گلوکار کی حیثیت سے کالج کے طلباء میں بے حد مقبول رہے۔ خواجہ احمد عباس کے ڈرامہ "یہ امرت ہے" میں انہوں نے مزدور کا کلیدی رول ادا کیا تھا اور انعام اول کے مستحق قرار پائے۔ ۱۹۵۳ء میں گریجویشن کی تکمیل کے لیے حیدر آباد آگئے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے آرٹس کالج میں داخلہ لیا۔ گریجویشن کی تکمیل کے بعد نومبر ۱۹۵۶ء میں ان کی شادی اپنی چچا زاد بہن ناصرہ رئیس کے ساتھ ہوئی۔ اسی دوران انہوں نے ایوننگ کالج سے ڈپلوما ان پبلک ایڈمنسٹریشن کا امتحان بھی کامیاب کیا۔ اسی سال وہ روزنامہ "سیاست" سے وابستہ ہو گئے۔

لکھنے پڑھنے کا آغاز انہوں نے صحافت سے کیا اور سخت جان فشانی کے ساتھ صحافت کے پیشہ کو اپنایا۔ صحافت کے میدان میں ان کی تربیت ان کے بڑے بھائی جناب محبوب حسین جگر کے ہاتھوں ہوئی۔ ۲۷ اگست ۶۲ء سے وہ مزاحیہ کالم "کوہ پیما" کے نام سے لکھنے لگے تھے۔ مجتبیٰ حسین کا کالم دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہوتا چلا گیا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان کے اخبارات میں بھی نقل کیا جانے لگا۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی جیسے صاحب طرز ادیب اور عالم نے اپنے اخبار "صدق جدید" میں ان کے کالم کی تعریف کی تھی۔

مجتبیٰ حسین نے اپنے اصلی نام کے ساتھ پہلا مزاحیہ مضمون "ہم طرف دار ہیں، غالب کے سخن فہم نہیں" ۱۹۶۴ء میں لکھا جسے ادبی حلقوں نے بے حد پسند کیا۔ اس کے بعد سے آج تک انہوں نے مزاح نگاری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ ۱۹۶۶ء کے اوائل میں زندہ دلان حیدر آباد کے بینر تلے ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ مئی ۱۹۶۶ء کو حیدر آباد میں اردو کے مزاح نگاروں کی وہ تاریخی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی، جسے آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین اس کانفرنس کے جنرل سیکریٹری اور بھارت چند کھنہ اس کے صدر تھے۔ برصغیر ہند و پاک کی تاریخ میں مزاح نگاروں کا اس سے بڑا اجتماع کبھی منعقد نہیں ہوا تھا۔ کرشن چندر نے اس کانفرنس کی صدارت کی تھی اور مخدوم محی الدین نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ اتنے بڑے پیمانہ پر نثری ادب کو اسٹیج پر پیش کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ہزاروں سامعین نے دو دنوں تک نہایت ذوق و شوق کے ساتھ مزاحیہ مضامین کو سنا۔ اس کانفرنس میں مجتبیٰ حسین نہ صرف ایک کامیاب منتظم کے روپ میں ابھر کر سامنے آئے بلکہ ایک کامیاب مزاح نگار کی حیثیت سے بھی ان کی شہرت عام ہوئی۔ ہندوستان کے کئی شہروں میں اس طرح کے اجتماعات منعقد ہونے لگے اور دوسری زبانیں بھی اس سے متاثر ہوئیں۔ مجتبیٰ حسین سات برس تک زندہ دلان حیدر آباد کے جنرل سیکریٹری رہے اور آج بھی زندہ دلان حیدر آباد کی ساری سرگرمیوں سے ان کا ربط قائم ہے۔ ۱۹۶۸ء میں بمبئی

کی تنظیم "سرسنگار سمسد" نے حیدر آباد کے تجربے کی تقلید میں طنز و مزاح کا ایک پروگرام "قہقہہ" کے عنوان سے آراستہ کیا۔ مجتبیٰ حسین اس میں شرکت کے لیے گئے تو ہندی کے کئی مشہور ادیبوں کو انہیں سننے کا موقع ملا۔ ہندی کے ادیب اور صحافی کنہیالال نندن اور ممتاز ادیب اور ہندی رسالہ "دھرم یگ" کے ایڈیٹر۔ ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی نے سیدھی سادی زبان میں لکھے گئے ان کے مضامین کو بے حد پسند کیا اور اپنے رسالہ میں لگاتار کئی برسوں تک انہیں چھاپتے رہے اور اس طرح ہندوستان کی دیگر زبانوں میں انہیں منتقل کیا جانے لگا۔

مجتبیٰ حسین ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۲ء تک حکومت آندھرا پردیش کے محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ سے بھی وابستہ رہے۔ حکومت ہند نے جب اردو کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے "گجرال کمیٹی" تشکیل دی تو انہیں اس کمیٹی کے شعبہ ریسرچ میں کام کرنے کی دعوت دی گئی۔ ۱۰ر نومبر ۱۹۷۲ء کو مجتبیٰ حسین اپنی نئی خدمت کا جائزہ لینے کی غرض سے دہلی گئے۔ تب سے دہلی میں مقیم ہیں مجتبیٰ حسین نے دہلی میں بھی طنز و مزاح کی محفلوں کے انعقاد کی طرف توجہ کی۔ ۱۹۷۳ء میں انہوں نے ڈاکٹر خلیق انجم کے اور سدرا جوشی کے رسالے "سیکولر ڈیموکریسی" کے تعاون سے لال قلعہ کے میدان میں ایک کل ہند مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد بھی کیا۔ جسے لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ حیدر آباد کے کئی مزاحیہ شعراء اسی مشاعرے کے ذریعہ شمال میں روشناس ہوئے اور مقبولیت حاصل کی۔

اکتوبر ۱۹۸۰ء میں ٹوکیو میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی جانب سے طباعت و اشاعت کے موضوع پر ایک سیمینار اور ورکشاپ میں شرکت کے لیے ہندوستان سے کسی ایک نمائندہ کو روانہ کرنے کی دعوت دی گئی تو اس سیمنار کے لیے مجتبیٰ حسین کا انتخاب عمل میں آیا۔ یونیسکو کی دعوت پر انہوں نے لگ بھگ سوا مہینے تک جاپان کا دورہ کیا۔ ٹوکیو کی یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات نے ان کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی تقریب کا بھی اہتمام کیا۔ جاپان کے اس کامیاب دورے کی روداد انہوں نے اپنے دل چسپ سفرنامے "جاپان چلو' جاپان چلو" میں بیان کی ہے جو ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ ان کا یہ پہلا بیرونی دورہ تھا۔ ۱۹۸۴ء میں وہ "اردو مجلس" برطانیہ کی دعوت پر انگلستان گئے پھر پیرس' یورپ' امریکہ' کینیڈا' پاکستان' سعودی عرب اور سویت یونین بھی گئے جہاں انکی قابل تحسین پذیرائی ہوئی۔

جہاں تک اعزازات کا تعلق ہے یہ بات قابل غور ہے کہ مجتبیٰ حسین کو پہلا اعزاز کسی اردو تنظیم کی طرف سے نہیں بلکہ اڑیا زبان کے ادیبوں کی تنظیم "سرس ساہیہ سمیتی" کی جانب سے دیا گیا۔ اس تنظیم نے ۱۹۸۰ء میں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ اڑیا زبان میں شائع کیا۔ اور انہیں بطور خاص اٹک بلوا کر ایک خصوصی تقریب میں "ہاسیہ رتن" کے خطاب سے بھی نوازا۔ انہیں یہ اعزاز ہندوستانی ادب میں طنز و مزاح کے فروغ کے لیے ان کی خدمات کے

اعتراف کے طور پر دیا گیا۔

مجتبیٰ حسین صاحب کے قلمی سفر میں انہیں بے شمار اعزازات ملے۔ کئی تصانیف منظر عام پر آئیں جن میں تکلف بر طرف، قطع کلام، قصہ مختصر، بہر حال، آدمی نامہ، جاپان چلو، الغرض، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ، سفر لخت لخت شامل ہیں۔ آخر کار ہوئے ہم دوست جن کے اور میرا کالم (کالموں کا انتخاب) (یہ خاکوں اور سفرناموں پر مبنی ہیں) جن میں سے کئی ہندی اور دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کی گئی ہیں۔ ان کی ۲۵ سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی جریدوں نے گوشے شائع کیے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد اور رانچی یونیورسٹی میں ان پر پی۔ ایچ ڈی کے لئے کام ہو رہا ہے جب کہ افسر کاظمی کو رانچی یونیورسٹی نے ان کے مقالے "مجتبیٰ حسین بحیثیت طنز نگار" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ان کے کئی مضامین ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی نصابی کتابوں میں شامل ہیں۔

"جی مجتبیٰ صاحب سوال نمبر ۲: آپ کے سامنے ہے۔ کیا فرماتے ہیں آپ اس بارے میں؟ میں نے پوچھا۔

مجتبیٰ صاحب کا جواب ہے۔ "بیسویں صدی کے وہ چند ادیب جو اگلی صدی بلکہ اگلی صدیوں میں بھی یاد رکھے جائیں گے۔ خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، نیاز فتح پوری، پریم چند، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، قرۃالعین حیدر، ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی" (یہ صرف چند نام ہیں نثر نگاروں کے جو فوری طور پر یاد آ گئے)

۳۔ جدیدیت نے ذات کے اظہار کے لیے جو گنجلک علامتیں استعمال کیں اور جو لنگڑا لولا پیرایہ بیان اختیار کیا اس سے فکشن کی لطافت مجروح ہوئی ہے۔ خیر اب تو جدیدت بھی راہ راست پر آ رہی ہے اور کہانی میں پھر سے کہانی پن کی اہمیت کو محسوس کیا جانے لگا ہے۔

۴۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اردو کے بیشتر ادیبوں کے ہاں وہ قوت برداشت (Stamina) نہیں ہے جو اچھا ناول لکھنے کے لیے درکار ہے۔ پھر بھی اردو میں جو چار پانچ بڑے ناول بیسویں صدی میں لکھے گئے ہیں وہ بہت اچھے ہیں۔

۵۔ ذہنی نفسیاتی اور روحانی بحران سے نجات حاصل کرنے کے لیے "نظام فکر" کی تلاش تو ایک مسلسل عمل ہے جو جاری رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ بیسویں صدی میں جو واقعات رونما ہوئے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جو حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے گئے ان کے باعث بیسویں صدی کا فرد ایک بحران سے دوچار رہا۔ لگتا ہے ان ساری تبدیلیوں کے بیچ فرد کی انفرادیت کہیں کھو گئی ہے۔ مانا کہ بر اعظموں کے درمیان اب فاصلے کم ہوئے ہیں لیکن آپ کے پڑوس میں ہی اپنے ملک والے افراد اور آپ کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک فرد

سے دوسرے فرد کے رشتہ کو سمجھنے پہچاننے اور اسے استوار بنانے کا کام ہی ادب کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ لگتا ہے بیسویں صدی کے آخر میں یہ بنیادی مقصد اور سروکار پس پشت چلا گیا ہے۔

۶۔ معیاری ادب وہی ہے جو بنیادی طور پر ادب ہو اور جس کے وسیلہ سے انسان اور انسانیت کا سفر ایک بہتر مستقبل کی طرف جاری رہ سکے۔ معیاری ادب کی حیثیت ان پہیوں کی سی ہوتی ہے جن کی مدد سے سماج کی گاڑی چلتی رہتی ہے اور انسان کا سفر جاری رہتا ہے۔ جو ادب اور سفر کو جاری رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے وہ صدیوں کو چیرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اور یہی ادب "ادب عالیہ" کہلاتا ہے۔

۷۔ نثر اور بالخصوص اچھی نثر لکھنے کے لئے جس تجزیاتی ذہن کی ضرورت ہوتی ہے اس کی کمی اب بھی کردار والوں کو محسوس ہوتی ہے۔

۸۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اردو میں انگریزی الفاظ کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ جو انگریزی الفاظ اب معاشرہ میں رائج ہو چکے ہیں انہیں قبول کرنے میں کوئی قباحت بھی نہیں ہونی چاہئے۔

۹۔ اپنی زندگی کے چند اہم اور دلچسپ واقعات لکھنا بہت مشکل ہے کیونکہ جن واقعات کو میں دلچسپ سمجھتا ہوں وہ اہم نہیں ہیں اور جنہیں میں اہم سمجھتا ہوں وہ دلچسپ نہیں ہیں۔

۱۰۔ میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ اردو میں اتنا ادب نہیں لکھا جا رہا ہے جتنی کہ تنقید لکھی جا رہی ہے۔ اردو کا ہر وہ طالب علم جو ایم۔ اے یا پی ایچ ڈی کر لیتا ہے ناقد بن جانے کو ضروری تصور کر لیتا ہے۔ اور بعد میں تنقید کے ذریعہ ادب میں حسب عدم استطاعت بحران پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ہاں تنقید تو بہت لکھی جا رہی ہے لیکن اچھی تنقید نہیں لکھی جا رہی ہے۔ پھر ہمارے بیشتر نامی گرامی نقاد مغربی تنقید کی تقلید میں ایسے ایسے نظریات پیش کرنے لگے ہیں جن کا ہماری مشرقی روایات اور ہمارے معاشرہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہاں جناب! ہندوستان میں ترجمہ کا کام خاص ہو رہا ہے۔

MR. MUJTUBA HUSSAIN
200 ANKUR APPARTMENT
PATPAR GUNJ DELHI 10092 INDIA

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

محسنہ جیلانی
۵ اکتوبر ۹۹

محسنہ جیلانی

لندن

میں محسنہ جیلانی تک بڑی دیر سے پہنچی' اس لئے کہ ان کا پتا دیر سے ملا۔ محسنہ جیلانی پاکستان گئی ہیں۔ فون پر یہ بات ان کے شریک سفر' آصف جیلانی نے بتائی۔

انتظار تو گویا ان دنوں ہمارے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا۔ انتظار سے گھبرا کر دوبارہ دستک دی تو محسنہ اپنی کتاب سمیت میرے سامنے موجود تھیں۔ میری خوشی کی انتہا نہیں تھی میں نے انہیں فوراً" گلے لگا لیا۔ محسنہ نے اپنے افسانوں کا مجموعہ "عذاب بے زبان کا" میرے سامنے پیش کر دیا۔ کتنا خوبصورت سرورق' میں نے ورق گردانی شروع کر دی۔

جون 1998ء میں شائع ہونے والے اس مجموعے میں محترم محمود ہاشمی لکھتے ہیں "محسنہ' لندن میں ایک طویل عرصے سے مقیم ہیں۔ یہاں کے سائنسی' مادی اور تہذیبی مسائل سے آگہی کے ساتھ ساتھ انہوں نے مغربی روایات اور تہذیبی اقدار کے احساس کو اپنی شاعری اور اپنے افسانوں کے ذریعے تابندہ رکھا ہے۔ جذبہ واحساس کے ایجاز و اجمال کے لئے وہ شعر کہتی ہیں اور زندگی کے عمیق تجربات کو تخلیقی زندگی بخشنے کے لئے افسانے لکھتی ہیں۔

المانوی عظیم شاعر گوئٹے نے شاعری کے ساتھ فکشن کو بھی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا تھا۔ گوئٹے فکشن کو "The Life's Life" قرار دیتا تھا۔"

"ارے محسنہ! آپ شعر بھی کہتی ہیں!" مجھے حیرت تھی کیونکہ میں نے تو اب تک محسنہ کے صرف افسانے ہی پڑھے تھے۔ محسنہ کے ہونٹوں پر جھجک کے ساتھ مسکراہٹ کھیل گئی۔

"کوئی نظم، کوئی غزل تو سناؤ۔" میرا اصرار بڑھا تو محسنہ نے غزل کے چند اشعار کی سوغات مجھے عنایت کی۔ بہت خوب غزل تھی۔

پھر ہم نے محسنہ کے افسانوں پر بات شروع کی تو انہوں نے بتایا۔ بارہ برس کی تھی جب میری پہلی کہانی بچوں کے رسالے "کھلونا" (دہلی) میں شائع ہوئی۔ اس زمانے میں پٹنہ، بہار سے شائع ہونے والے ایک رسالہ میں یہ کہانی چھپی تو اس کہانی پر پہلا انعام مبلغ بائیس روپے ملا۔ یہ روپے ہمیں چاند اور سورج کی طرح لگے۔ زندگی میں ملنے والا پہلا انعام جو تھا۔ "سنجیدہ اور متین مزاج کی محسنہ زیرِ لب مسکرا رہی تھیں۔

"اچھا افسانوں کے علاوہ کوئی ناول بھی لکھا؟" میں نے پوچھا تو ان کی یادوں کی مرجھائی کلیوں میں یک دم جان پڑ گئی۔ محسنہ کی آنکھوں میں ماضی کی یادوں کے راغ روشن ہو گئے اور اس روشنی میں تصویریں واضح ہوتی چلی گئیں۔ محسنہ زیرِ لب کہہ رہی تھیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اگر مغرب کی کوئی نو عمر لڑکی ایک ناول لکھتی تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا، اس پر تبصرے ہوتے، ریویو لکھے جاتے اور یوں بیٹھے بٹھائے وہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاتی اور اس کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا۔

ایسا ہی ایک واقعہ اس پس ماندہ معاشرے کی لڑکی کے ساتھ ہوا۔ اس نے ایک ناول لکھا۔ وہ ناول لفاظی، نثری شاعری اور رومانس کا ملا جلا مرکب تھا۔ تقریباً نو باب ختم ہو چکے تھے۔ آخری باب اختتام پر تھا۔ گھر کا ماحول قدامت پسند اور زمیندار گھرانہ تھا۔ اگرچہ اہل خاندان علم و ادب کے دلدادہ تھے، شعر و شاعری کا گھر میں چرچا رہتا اور ادبی رسالے باقاعدگی سے پڑھے جاتے تھے لیکن ایک لڑکی کا ناول لکھنا اور وہ بھی رومانس سے بھرپور، یہ ایک دوسرا ہی مسئلہ تھا۔ سو ایک دن اس لڑکی نے اس ناول کو پھاڑ کر اس سے چائے بنا ڈالی۔ (خاندان والوں سے ڈر کر اور گھبرا کر) ان دنوں چائے کوئلے سے جلنے والی انگیٹھی پر بنا کرتی تھی۔ یہ ناول لکھنے والی لڑکی میں تھی۔

محسنہ چپ تھیں، کچھ اداس تھیں۔

"پھر کیا ہوا آگے بتائیں؟" میں نے پوچھا۔

پھر یوں ہوا کہ ناول تو جلا دیا مگر طبیعت لکھنے لکھانے سے باز نہیں آتی تھی۔ سو ایک کہانی لکھی۔ اس کا نام میں نے رکھا "میں زندگی چاہتی ہوں" ان دنوں میں حجاب امتیاز علی تاج سے بے حد متاثر تھی۔ کہانی میں شاعری زیادہ اور کہانی پن کم تھا۔ کہانی لکھ کر بڑے حوصلہ اور اعتماد کے

ساتھ رسالہ "ماہ نو" کو بھیج دی۔ ان دنوں "ماہ نو" باقاعدگی سے ہمارے گھر آتا تھا۔ رفیق خاور صاحب ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ دوسرے تیسرے ہفتہ ان کا خط ملا۔ کہانی اچھی ہے اگلے ماہ چھپ رہی ہے، مبارک ہو۔

خط پڑھ کر جان ہی تو نکل گئی۔ ہزاروں خدشات اور اندیشوں نے گھیر لیا۔ کہانی چھپے گی اور گھر کے سب چھوٹے بڑے خاص طور پر بڑے بھائی (جن کا خوف زیادہ تھا) وہ بھی پڑھیں گے، پھر کیا ہو گا.....؟ میں نے گھر آکر سوچا۔ اس جلتی دوپہر میں سب سے چھپ کر میں نے قلم اٹھایا اور لکھا۔

محترم ایڈیٹر صاحب! میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔ میں یہ کہانی چھپوانا نہیں چاہتی۔ مہربانی فرما کر میری کہانی واپس بھیج دیجئے۔

لیجئے جناب کہانی واپس آگئی جواب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ بڑی بے ضرر سی کہانی ہے۔ یہ واقعات اب بہت اہم ہو گئے ہیں۔ اپنی حماقت پر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ کاش! میں نے اپنا پہلا ناول نذر آتش نہ کیا ہوتا اور کہانی واپس نہ منگائی ہوتی۔ محسنہ چپ ہو گئیں۔ فضا بھی خاموش اور اداس تھی۔

"اچھا محسنہ! مزیدار سی کافی پلائیں اور پھر کچھ اپنی باتیں کرتے ہیں۔" میں نے ماحول کی کیفیت بدلنا چاہی۔ محسنہ بھی مسکرانے لگیں۔ ایک کامیاب افسانہ نگار کا یہی تو کمال ہوتا ہے۔ ہر موقع اور واقعہ پر وہ اپنی گرفت مضبوط رکھتا ہے۔ محسنہ بھی ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ وہ بتا رہی تھیں کہ علی گڑھ (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ منشی کامل اور منشی فاضل الہ آباد یونیورسٹی سے کیا اور صوبہ بھر میں اول رہیں۔ پھر لندن آئیں تو یہاں سے تدریس میں ڈپلوما لیا۔ لکھنے کا آغاز محسنہ نہال چغتائی کے نام سے کیا تھا۔ ان کی کہانیاں "کھلونا" (بچوں کا ماہنامہ) سے شروع ہوئیں اور "بانو" وغیرہ میں شائع ہوئیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے نظمیں اور کہانیں بھی لکھیں۔

آصف جیلانی سے شادی ہوئی تو پھر یہ محسنہ جیلانی کے نام سے لکھنے لگیں۔ 70 کی دہائی میں روزنامہ "جنگ" لندن میں خواتین کا صفحہ مرتب کرتی رہیں اور ہفت روزہ "مشرق" لندن کے لئے خواتین کا کالم بھی لکھا جو چھ سات سال تک جاری رہا۔

روزنامہ "نوائے وقت" کے لئے لندن نامہ لکھا۔ یہ بھی چھ سات سال تک جاری رہا۔

لندن سے شروع ہونے والے پہلے ایشیائی پروگرام خواتین کے لئے "گھر بار" میں باقاعدگی سے حصہ لیا۔ بی بی سی اردو سروس کے خواتین کے پروگرام "برگ گل" میں حصہ لیتی رہیں۔ پھر اسی نام سے دوسری خواتین کے ساتھ مل کر برطانیہ میں خواتین کی پہلی ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی ساتھ ہی مختلف تعلیمی اداروں کے لئے کتابچوں پر مبنی ترجمہ کا کام کیا اور وہ بھی تین بچوں کی تخلیق کے ساتھ ساتھ۔ محسنہ مسکرا رہی تھیں۔

پہلے مجموعے کے بعد اب کونسی کتاب آرہی ہے؟ محسنہ نے بتایا "دوسرا مجموعہ اور بچوں کے لئے منظوم قاعدہ اور بچوں کی کہانیاں زیر طبع ہیں۔"

میں نے "گفتنی" کے لئے سوال نمبر 2 آگے بڑھایا۔ محسنہ نے کہا "بیسویں صدی میں اردو ادب کی تاریخ میں موجود رہ جانے والے والی فہرست میں چند ادیبوں مثلاً" علامہ اقبال' حسرت موہانی' منشی پریم چند' کرشن چندر' عصمت چغتائی' قرۃ العین حیدر' احمد ندیم قاسمی' قاضی عبدالستار اور فیض احمد فیض کے نام نمایاں ہیں۔

سوال نمبر 3 کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا "میرے خیال میں جدیدیت نے فکشن کے فن کو لطافت اور حسن تو نہیں دیا' البتہ مجروح ضرور کیا ہے۔ داستان گوئی کی دلچسپ روایت کو ختم کرنے کی لاحاصل کوشش کی گئی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ افسانہ نگاری میں نئے نئے تجربات نہ ہوئے ہوں۔ ادیب کو ایک نئے تجربے اور اجتہاد کے حق سے محروم نہیں رکھا جاسکتا اور نہ رکھنا چاہئے۔ محسنہ بتا رہی تھیں موجودہ صدی میں اردو میں ناول کم لکھے گئے اس کا سبب زندگی کی تیز رفتاری ہے۔ ٹی وی ریڈیو نے مزاج بدل کر رکھ دیا ہے۔ زندگی کی مصروفیات نے ذہنوں سے آسودگی چھین لی ہے پھر ناول پڑھنے بھی کم جارہے ہیں۔"

سوال نمبر 5 کے جواب میں بولیں ذہنی' نفسیاتی اور روحانی بحران کا بہترین رہنما مذہبی عقیدہ ہے اور اسی کے ذریعے ان سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

وہ کہہ رہی تھیں "معیاری ادب' شاعری ہو یا نثر میرے خیال میں یہی ہو سکتا ہے کہ ایک فنکار اپنے عہد کے کرب کو عوام تک سچائی سے پہنچادے اور اپنے تجربات اور مشاہدات کو آزادی اور ایمانداری کے ساتھ عوام تک پہنچانے کے لئے شائستہ اور مہذب زبان وضع کرے۔"

محسنہ کا کہنا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان سے باہر نثر کے مقابلے میں شاعری زیادہ کئے جانے یا لکھے جانے کا سبب مقابلتاً" نثر لکھنا خون جگر کرنا ہے جبکہ شاعری ہر وہ آدمی کر سکتا ہے جو تھوڑی بہت تک بندی کر سکے اور یوں یہ عملی طور پر بے حد آسان ہے۔ نثر کے اظہار کے راستے محدود ہیں۔ وسائل اتنے زیادہ نہیں کہ نثر نگار شاعروں کی طرح اپنی تخلیق پیش کر سکے۔ پھر اس صدی میں سب لوگ اپنی جڑوں سے کٹ کر اپنی شناخت دوسری زمینوں پر کھو چکے ہیں۔ مشاعروں میں اسٹیج پر آکر اس جذبہ کی کسی قدر تسکین تو ہوجاتی ہے۔"

محسنہ اس بات سے متفق نہیں کہ فارسی اور عربی نئے علوم سے محروم زبانیں ہیں۔ ان کے خیال میں فارسی اور عربی نے نئے علوم سے فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے کہا کاش! اردو زبان بھی اپنے بنیادی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے نئے علوم سے فیض اٹھائے لیکن ہوا یوں ہے کہ مغرب نوازی میں ہم نے اپنی زندگی کے تمام شعبوں کو مکدر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کو بھی مکدر کردیا ہے۔ اردو کی ترقی اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ اپنا تشخص برقرار رکھے اور انگریزی کے الفاظ کی بھرمار

ے زبان جس طرح مسخ ہوتی جارہی ہے اس سے بچنے کی کوشش کی جائے۔

تنقید کے حوالے سے گفتگو شروع ہوئی تو محسنہ نے کہا "مجھے اتفاق ہے کہ اب اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ تنقید اس لئے ترقی نہ کر سکی کہ وہ صرف ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے اور زیر کرنے تک محدود ہو گئی ہے۔ ہمارے نقاد دھڑے بندی اور مصلحت کوشی کا شکار ہوئے اور نامعتبر ہو گئے۔

تراجم نہ ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ لوگ اصلی تخلیقات ہی نہیں پڑھ رہے تو پھر دوسری زبانوں پر کون توجہ دے گا۔ پاکستان میں خاص طور پر میڈیا نے لوگوں کو علم سے دور رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کنوئیں کے مینڈک کی طرح صرف اپنے ملک کے حالات پر لکھا اور پڑھا جارہا ہے۔ ملک سے باہر کیا ہو رہا ہے عوام کو اس سے دور رکھا جارہا ہے۔ یوں دوسری زبانوں کے ادب سے انہیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ جہاں آپ علاقائی زبانوں کی بات کرتی ہیں تو میرے خیال میں قیام پاکستان کے بعد اردو والوں کا ایسا سامراجی انداز ہوا کہ علاقائی زبانیں دب کر رہ گئیں اور آپس میں مخالفت سی پیدا ہو گئی چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ زبانوں نے ایک دوسرے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

MOHSENA JILANI
BUSH HOUSE, CENTRAL BLOCK
B.B.C. WORLD SERVICE
LONDON WC2 2B U.K.

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی
(جمیل مظہری)

مخلص محمد حسن
31-7-99 جولائی

ڈاکٹر محمد حسن

دہلی

ڈاکٹر محمد حسن کا نام اردو ادب کے جید عالموں کی فہرست میں درج ہے۔ وہ برصغیر کی ہمہ جہت شخصیات میں سے ہیں۔ ادب کی مختلف جہتوں پر انہوں نے تنہا اتنا کام کیا ہے کہ ان کی شخصیت کا دوسرا نام "کمپیوٹر" ہو سکتا ہے۔ بلا تکان لکھتے ہیں اور گھنٹوں لکھتے ہیں۔ وہ بہ یک وقت ڈرامہ نگار' مورخ' محقق' افسانہ نگار' نقاد' انشاء پرداز' معلم اور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں۔ "زنجیر نغمہ" ان کے ایک شعری مجموعے کا نام ہے۔ "راحت" کے عنوان سے ان کی یہ نظم ملاحظہ ہو۔

مت اٹھو
سر اٹھاؤ گے تو یہ پتھریلی چھت' اٹھنے نہ دے گی
رینگنے میں عافیت ہے' خیریت ہے
چار دن کی زندگی ہے' زندگی یونہی سہی
اور اسی کا نام دنیا میں راحت۔۔۔۔!

ڈاکٹر محمد حسن کو میں نے "گفتنی" کا سوالنامہ بھجوایا تو انہوں نے اس کی پذیرائی کرتے ہوئے مجھے نوازا۔ بہت تفصیل سے اپنے بارے میں لکھا۔ "گفتنی" کے سوالات کے جواب دیئے۔

بڑے دکھ سے اپنے ذاتی مسائل بھی لکھے جیسے ایک ننھا بچہ معصومیت کے عالم میں اپنے کسی دوست سے اپنے دکھ بیان کر رہا ہو۔ یہ دکھ ایک ادیب' ایک فنکار کا مقدر ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن بھی یہ جانتے ہیں۔ مندرجہ بالا نظم ان کی اسی سوچ کا مظہر ہے۔ وہ ناسازگار حالات کے درمیان بھی زندگی کرنا جانتے ہیں اور اردو ادب کے سرمائے میں اپنی محنت اور لگن سے برابر اضافہ کیے چلے جا رہے ہیں یہی قابل تحسین بات ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن خود اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں۔

"میں شہر مراد آباد کے محلہ نواب پورہ میں ۲۵ محرم ۱۹۲۶ء کے دن پیدا ہوا۔ مراد آباد کے تین چار مقتدر اور متمول گھرانوں میں ہمارے خاندان کا شمار ہوتا تھا۔ شہری اور زرعی جائیداد کافی تھی۔ پردادا منشی فدا علی کو منشی کا خطاب اور ۵۲ دیہاتوں کا اختیار ملا تھا وہ شاہجہانپور سے آکر مراد آباد بس گئے تھے۔ دادا منشی مظہر حسن کے بارے میں مشہور ہے کہ ہر ہفتے ہوادار میں بیٹھ کر نکلتے اور غربا اور مساکین کو اشرفیاں تقسیم کرتے جاتے تھے۔ میرے والد حاجی الطاف حسن بڑے مذہبی آدمی تھے اور زمینداری کے کام کاج میں نہایت ہوشیار تھے انہوں نے بھی خود اپنی کوششوں سے جائیداد میں اضافے کیے۔ جگر مراد آبادی کا آبائی مکان خریدا' کئی دیہات باغات وغیرہ خرید لیے۔ میری والدہ رضوان فاطمہ نہایت شفیق اور نرم مزاج تھیں۔ ان کی والدہ یعنی میری نانی امروہہ کی تھیں اور مقتدر شیعہ گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اب بھی میرے ننھیالی رشتہ دار شیعہ ہیں اور اسی طرح خلوص' محبت اور یگانگت قائم ہے۔ میرے نانا مراد آباد کے مشہور حکیم مقبول حسن صاحب تھے۔ مفت علاج کرتے تھے مدتوں مہاراجہ جنید کے سرکاری حکیم رہے تھے۔ عربی کے فاضل اور مراد آباد کے اہم جاگیردار تھے۔

ادب کا شوق کسی کو نہ تھا اردو ادب میں ہمارے پرکھوں میں سے کسی کا نام ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گا۔ میں نے ہائی اسکول (جو اس زمانے میں میٹرک کہلاتا تھا) ۱۹۳۹ء میں ہیوٹ مسلم ہائی اسکول مراد آباد سے کیا۔ کلاس میں بیت بازی ہوئی اس میں ہماری ٹولی غفران نامی ایک طالب علم سے ہار گئی جسے پورے کلاس سے بھی زیادہ شعر یاد تھے لہٰذا دوبارہ بیت بازی کے مقابلے کے لیے ابا میاں سے دیوان غالب حاصل کیا اور مشکل حرفوں پر ٹوٹنے والے شعر یاد کیے۔ یہ ادب سے پہلی ملاقات تھی۔

سیاست کا غلغلہ بلند تھا' کانگریس اور مسلم لیگ مل کر زمیندارہ لیگ کے امیدواروں کے خلاف ۱۹۳۷ء میں الیکشن لڑ رہے تھے۔ ہمارا خاندان زمیندارہ لیگ کے امیدوار کی حمایت کر رہا

تھا جس کے صدر ہمارے ہم وطن اور ہمارے خاندان کے پرانے دوست سر جگدیش پرشاد تھے جو وائسرائے کی کونسل کے رکن تھے۔ اسکول میں بعض اساتذہ کی گفتگو سے آزادی کا تصور ذہن میں پیدا ہو چکا تھا گو عمر ووٹ دینے کی نہ تھی مگر میری ہمدردیاں کانگریس اور مسلم لیگ کے امیدوار مولوی عبدالسلام کے ساتھ تھیں جو الیکشن ہار گئے' یہ سیاست سے پہلی ملاقات تھی۔

اخباروں میں مدینہ اور تیج' رسالوں میں غلام احمد پرویز کا "طلوع اسلام" اور نیاز فتح پوری کا "نگار" اور کتابوں میں علامہ اقبال کے شعری مجموعوں کے علاوہ علامہ مشرقی کا تذکرہ بھی خریدتا تھا اور غور سے پڑھتا تھا اور ہاں منٹو کی ادارت میں شائع ہونے والے مصور بمبئی اور "چترا" لاہور اور ادب لطیف لاہور بھی زیر مطالعہ رہتے۔

ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد میری یہ ضد تھی کہ آگے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کروں گا کیونکہ کئی ہم جماعت وہاں جا رہے تھے والد کی یہ ضد تھی کہ پہلے مراد آباد کے گورنمنٹ کالج سے انٹرمیجٹ پاس کر لو پھر علی گڑھ جانا۔ غرض اس ضدم ضدا میں دو سال کے لیے کہیں داخلہ نہیں لیا اور انٹرمیجٹ کا امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کیا۔ یہ دو سال میری زندگی کے نہایت قیمتی سال تھے جب ہر قسم کے مسلمات پر ذہن نے سوالیہ نشان لگائے اور اپنے طور پر زندگی کی اقدار اور اعتقادات کو پرکھنے کی کوشش کی۔ پہلی بار والہانہ عشق بھی کیا جو محض تقلیدی تھا اور روایتی رنگ سے اس کی آگ میں جلا' افتاد سہی' آہیں بھریں اور اس کی ناکامی کا داغ اس طرح دل پر لگا کر زندگی کو نئے معنی دے گیا۔ سیاست سے بھی دلچسپی لی۔ مارکس ازم سے تعارف ہوا' رقص و موسیقی سے دلچسپی پیدا ہوئی غرض ذہنی فضا ہی بدل گئی۔

پرائیوٹ طور پر فارسی میں منشی کا امتحان پاس کیا پھر انٹرمیجیٹ کیا اور اب علی گڑھ میں داخلہ لینے کے بجائے والد صاحب کی خواہش کے خلاف لکھنؤ یونی ورسٹی میں داخلہ لیا جو ان دنوں آزاد خیالی کے لیے مشہور تھی اور جہاں سیاسی رنگ قوم پرستی کا غالب تھا۔ ۱۹۴۲ء میں کانگریس پر پابندی لگی اور ہندوستان چھوڑ دو' تحریک چلی تو ۹ اگست کے مظاہرے میں شریک ہوا عملی سیاست میں کانگریس سوشلسٹ گروہ سے تھوڑا بہت رابطہ ہوا اور خفیہ سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگا۔

لکھنؤ نے مجھے بہت کچھ دیا یہاں ادب ہی کا نہیں سیاست' تہذیب' فنون لطیفہ' عصری آگہی کے ہر پہلو سے کچھ نہ کچھ دلچسپی پیدا ہوئی استاد پروفیسر مسعود حسن رضوی اور سید احتشام حسین جیسے ملے زمانہ پروفیسر ڈی پی مکرجی بھی تھے۔ کافی ہاؤس میں سیاست سے لے کر ادب تک اور عمرانیات سے لے کر فلسفے تک ہر موضوع زیر بحث رہتا تھا۔ قریب سے نہ سہی دور ہی سے میں اس ہمہ گیر آگہی سے مستفید ہوتا رہا۔ اردو میں ایم۔اے ۱۹۴۶ء میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ادب میں مجاز' سلام مچھلی شہری اور فراق گورکھپوری کا چرچا تھا' نت نئے تجربات ہو رہے تھے

اور نئے فکری اسالیب ابھر رہے تھے لگے ہاتھوں ایل ایل بی بھی کرڈالا۔ اسی زمانے میں جناب آل احمد سرور ریڈر ہو کر لکھنؤ یونی ورسٹی آگئے۔ ان کے طرز فکر اور طرز رہائش کے جدید طرز نے متاثر کیا۔ اس زمانے میں رسالہ "مضراب" شائع کیا جس کے چار شمارے شائع ہوئے۔

اردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد تلاش معاش شروع ہوئی سوے ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند کے بعد اردو والوں کے لیے روزگار کہاں! ذاکر صاحب سے ذرا بھی واقفیت نہ تھی یونہی ان کے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہونے پر خط لکھا اور اپنی بپتا بیان کی انہوں نے فوراً جواب دیا۔ "علی گڑھ چلے آؤ اور یہاں آکر ہندی ایم اے میں داخلہ لے لو۔" فیس وغیرہ بھی ذاکر صاحب کے ذریعے ادا ہوئی (یا معاف ہوئی) ان کے بنگلے پر ہفتوں مہمان رہا پھر ہوسٹل میں داخلہ ہوگیا یہاں جی نہ لگا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مراد آباد چلا گیا۔

یہاں کمیونسٹ پارٹی قائم کی عملی سیاست میں حصہ لیا' مراد آباد میں پہلا فرقہ وارانہ فساد ہوا تو کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے قیام امن کے لیے پمفلٹ بانٹنے کے جرم میں گرفتار ہوا جیل کی زندگی کا تجربہ ہوا رہائی ہوئی تو سر جگدیش پرشاد سے رجوع کیا وہ خاندان کے پرانے دوست تھے اور لکھنؤ کے روزنامہ "پایونیر" کے بورڈ آف ڈائرکٹر کے صدر۔ انہوں نے "پایونیر" میں امیدوار سب ایڈیٹر کی حیثیت سے تقرر کردیا پھر باقاعدہ سب اڈیٹر ہوگیا۔ ان کا آرٹ کریٹک اور فلم سیکشن کا انچارج ہوا اور اس کی کامیابی دیکھ کر میری ادارت میں پندرہ روزہ فلمی رسالہ "فلم میل" جاری کیا گیا جو تقریباً دو سال چلا۔

اس دوران ادب سے چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔ ڈراما "محل سرا" لکھا جو کافی پسند کیا گیا ریڈیو کے لیے برابر ڈرامے فیچر اور تقریریں لکھتا رہا پہلا تنقیدی مضمون "ادب' زندگی اور سماج" ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر عبارت بریلوی کی فرمائش پر رسالہ "شاہراہ" دہلی کے لیے لکھا جو اس سال کے بہترین ادب میں شامل کیا گیا۔ کچھ افسانے لکھے اسی زمانے کا ایک افسانہ رسالہ آج کل' میں چھپا کچھ انشائیہ مضامین لکھے جنہیں ادبی دنیا' لاہور میں مولانا صلاح الدین احمد نے بڑے توصیفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا رسالہ نگار لکھنؤ کے لیے ڈی سیڈے پر تعارفی مضمون پھول یا انگارے کے عنوان سے لکھا۔ لکھنؤ یونی ورسٹی میں "حلقہ احباب" قائم کیا جس کے صدر سید احتشام حسین صاحب تھے۔ اس دوران احتشام حسین صاحب راک فیلر فاؤنڈیشن کے وظیفے پر دو سال کے لیے امریکا چلے گئے اور ان کی جگہ میرا عارضی تقرر لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں ہوگیا۔ احتشام صاحب کے امریکا سے واپس آنے کے بعد میں بے روزگار ہوگیا۔ ادھر پانیر سے بھی تعلق ختم ہوگیا تھا اور "فلم میل" بھی بند ہونے والا تھا۔ تلاش معاش میں بمبئی گیا وہاں سیدین صاحب کی معرفت خواجہ احمد عباس اور راجندر سنگھ بیدی کی مدد سے فلم میں قسمت آزمائی کا ارادہ تھا کہ علی گڑھ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرار کی مستقل جگہ پر میرا تقرر

ہو گیا چنانچہ ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ جا پہنچا۔

یہاں نو برس لیکچرار رہا لکھنؤ کے مقابلے میں یہاں تگ و تاز کا میدان ذرا تنگ تھا۔ اب میری چھ کتابیں چھپ چکی تھیں۔ ادبی تنقید' اردو ادب میں رومانوی تحریک' جلال لکھنوی' ہندی ادب کی تاریخ' پیسہ اور پرچھائیں (ڈرامے) اور زلفیں زنجیریں (ترجمہ) پھر علی گڑھ میں اردو تھیٹر قائم کیا اور حیدر آباد اور نینی تال کا دورہ کیا۔ علی گڑھ کا قیام کھٹ مٹھے تجربات کا تھا۔ اس میں کچھ معاملہ علیگ اور غیر علیگ ہونے کا بھی تھا۔ علی گڑھ کے قیام کے آخری دور میں پروفیسر رشید احمد صدیقی سے جنرل ایجوکیشن ریڈنگ میٹریل پروجیکٹ کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے بڑی قربت ہو گئی وہ اس پروجیکٹ کے ڈائریکٹر تھے۔ ان سے روابط میری زندگی کی خوشگوار یادوں میں ہیں۔

۱۹۶۳ء میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ میں نے کئی نئے کورس شروع کردیے۔ مخطوطات شناسی کا کورس۔ ترجمے کا پوسٹ گریجویٹ کورس' بی اے آنرز کی سطح پر ریڈیو اور اخبارات کے لیے لکھنے (ماس میڈیا) کا کورس میرے ایما سے شروع ہوئے۔

۱۹۷۱ء میں کشمیر یونی ورسٹی سری نگر میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

۱۹۷۳ء میں ملک کا سب سے بڑا تحقیقی اعزاز جواہر لعل نہرو فیلو شپ ملا جس کے تحت "انیسویں صدی میں شمالی ہند کے ادب کے فکری اسالیب" پر کام کرنا طے پایا۔ اس سلسلے میں کام کرنے کے لیے دہلی واپس آیا اور انگلستان' جرمنی' فرانس' سوئزرلینڈ' اٹلی' پاکستان وغیرہ کی لائبریریوں اور تحقیقی اداروں کا دورہ کیا ۱۹۷۵ء میں یہ کام مکمل ہوا اور انگریزی میں رائل بک ہاؤس کراچی سے شائع ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی نے اردو پروفیسر کی حیثیت سے مدعو کیا اور میں نے اسے قبول کرلیا۔

۱۹۷۵ء سے ۱۹۹۰ء تک جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی میں اردو پروفیسر یونی ورسٹی میں صحافت' فلم' ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے لکھنے کا باقاعدہ پوسٹ ڈپلوما کورس شروع کیا۔ ادبی سماجیات' تقابلی ادب اور مختلف ہندوستانی زبانوں کے ادب سے اردو تحقیق و تنقید کے رشتے استوار کرنے کی غرض سے نئے تحقیقی موضوعات منتخب کیے اور نئے نصاب شروع کیے۔

رہی ذاتی زندگی کی تفصیل سو مختصر عرض یہ ہے کہ ۱۹۵۸ء میں روشن آرا بیگم سے شادی ہوئی۔ انہوں نے اردو اور فارسی میں ایم۔اے اور فارسی میں پی ایچ ڈی کیا مزاجوں میں تفاوت تھا لہٰذا نرم گرم گزری اور گزر رہی ہے۔

اب یونی ورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد خوابوں کی تعبیر ڈھونڈھ رہا ہوں جو کرنا چاہتا تھا اور نہ کرسکا وہ کرنے کی کوشش میں ہوں۔ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے اشتراک سے سائنس

اصطلاح کے ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں میں تراجم کا تقابلی مطالعہ کیا۔ ۱۹ زبانوں میں ان تراجم کو جمع کیا جو بعنوان "اردو کی سماجیاتی تاریخ" شائع ہوئی۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اب تک تقریباً ۸۷ کتابیں چھپ چکی ہیں۔"

"انہوں نے گفتنی" کے سوالات کے بالترتیب جواب دیتے ہوئے کہا۔

"بیسویں صدی میں اردو ادب کی تاریخ میں موجود رہ جانے والے چند نام یہ ہیں۔

فیض احمد فیض، جوش، فراق۔ شاید اختر الایمان (ممکن ہے) مجاز، جان نثار اختر اور شاید مجروح کے نام باقی رہیں۔

۳۔ فکشن کو جدیدیت نے مجروح کیا ہے سنوارا نہیں۔

۴۔ موجودہ صدی میں ناول کم نہیں لکھے گئے۔ بہت لکھے گئے ہیں اور بعض بہت اچھے بھی ہیں مثلاً اداس نسلیں۔ آگ کا دریا۔ آنگن۔ دو گز زمین۔ فرار۔ بہت دیر کردی۔ لہو کے پھول۔ ایوان غزل۔

۵۔ رہبری سب لکھنے والوں کی کسی دور میں بھی اجتماعی طور پر نہیں ہو سکی ہے نہ کبھی ہو سکے گی۔ یہ صورت حال صرف اجتماعی طور پر پورے سماج کے بہتر اور بلند تر معاشی اور ذہنی سطح کے حصول کے بعد ہی ممکن ہے (وہ بھی سارے ادیبوں کے لیے نہیں) اور یہ عمل معاشی اقتصادی بھی ہے اور سیاسی بھی۔ پورا برعظیم سردست تو ایک انتہائی قسم کی رجعت قہقہری میں، اور آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے لوٹنے کی لاحاصل کوشش میں مبتلا ہے اس کا اثر تخلیقی اضمحلال کی شکل میں ظاہر ہونا لازم ہے۔

۶۔ شاعری یا نثر میں معیاری ادب کا پیمانہ ایک ہی ہے۔ "ارتفاع"۔ تمام سطح سے جمالیاتی سطح تک پڑھنے والے کو لے جانا اور اسے بہتر زندگی کا احساس دلانا۔

۷۔ یہ مفروضہ ہی درست نہیں ہے۔ لندن، کنیڈا اور امریکا میں نثری تصانیف اور اہم تصانیف کی کمی نہیں ہے۔ لندن سے تو افسانوں کا ایک مجموعہ بھی حال ہی میں چھپا ہے جس میں لندن میں مقیم متعدد افسانہ نگاروں کے افسانے ہیں۔ مغربی جرمنی میں منیرالدین احمد، سابق چیکوسلاواکیہ میں ایک اہم تنقید نگار، اٹلی میں بوسانی مرحوم اور روم کے صدر شعبہ اردو سویڈن میں ہماری آواز، کے اڈیٹر اور سائیں سچا، ناروے میں سعید انجم اور ہرچرن چاولہ کی نثری تصانیف ہیں اور امریکا سے احمد سہیل کی کتاب کے بعض اجزا شائع ہوئے ہیں جو تنقید کے نئے دبستانوں کے بارے میں ہے۔

۸۔ یہ کلیہ نہیں ہے انگریزی میں الفاظ اردو میں اصطلاح کے طور پر بھی برتے جا رہے ہیں۔ شکوہ یہ ہے کہ انگریزی الفاظ وہاں بھی استعمال کیے جاتے ہیں جہاں کے لیے مناسب اور موزوں اردو تراکیب اور الفاظ موجود ہیں اور ذرا سی توجہ اور کاوش سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

۹۔ زندگی کے کئی واقعات ابتدا میں درج کرچکا ہوں۔

۱۰۔ تنقید میں کئی ازم کا چرچا نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ ہمارا ادب نظریات ازم کی نشاندہی سے محروم ہوتا جارہا ہے۔ پرانے سہارے ٹوٹتے جارہے ہیں اور نئے سہارے اختیار کرنے پر ایک تو حکومتوں کی پابندیاں ہیں جو جانے ان جانے مختلف دقیانوسی تصورات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ پاکستان میں دقیانوسی اسلام اور ہندوستان میں اس سے بھی زیادہ دقیانوسی ہندوازم موجود ہے۔ دوسرے امریکا نے خود بھی ایک رجعت پسندانہ رخ اپنایا ہے جو دقیانوسی تو نہیں ہے مگر رجعت پسندانہ ہے اور ہر قسم کی وسعت خیال کے منافی ہیں پھر' بتایئے۔ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

تراجم کی کمی کا ایک سبب تو یہی ہے کہ کسی تصنیف سے فکر کے چراغ نہیں جلتے اور ایسا کوئی عظیم نام ابھر بھی نہیں رہا ہے جس سے روشنی ملے۔ کچھ ہندوپاکستان کے حالات سے مایوسی اور بد دلی بھی ہے جہاں ادیبوں سے عزت چھن گئی ہے اور وہ محض وظیفہ خوار یا متمنی اور امیدوار ہوکر رہ گئے ہیں گویا۔ 'گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے' والا حال ہے۔

پاکستان کا تازہ حال احوال تو مجھے معلوم نہیں مگر ادبیات پاکستان کی ایک اکادمی جو پشتو ادبیات کے لیے وقف تھی پشاور میں اچھا کام کررہی تھی' سندھی اکادمی کی بعض مطبوعات میں نے دیکھی ہیں اب کا حال معلوم نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان علاقائی زبانوں میں دور جدید میں ایسا کون سا زبردست کام ہورہا ہوگا جس کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کیا جائے اردو میں تو پنجابی ادبیات کے ترجمے بھی نہیں آئے اور بعض ایسے ادیب بھی ابھی تک متعارف نہیں ہوئے جو فیض جیسے شاعروں کے لیے باعث فخر تھے ان سے لے کر احمد سلیم تک صورت حال یہی ہے۔

اس قسم کے دور ہر ادب میں آتے ہیں ان سے بددل ہونا بھی نہیں چاہیے۔ اگر ہمت توڑنے میں یہ لوگ کامیاب ہوگئے تو پھر کوئی مداوا ممکن نہ ہوگا۔

DR. MOHAMMAD HASAN
7 MODET TOWN
DELHI 110009 INDIA

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

کراچی

دور حاضر کے نقادان ادب میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا نام اتنا معروف ہے کہ اب ان کا تعارف کراتے ہوئے سوچنا پڑتا ہے کہ کس حوالے سے ان کی شخصیت پر بات کی جائے۔ تب ایک معتبر شخصیت کے لیے ایک دوسری معتبر ہستی کا نام سامنے آتا ہے اور وہ نام ہے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا۔ ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں۔

"صدیقی نے اپنے پرائے عصری و غیر عصری ادب و ادیبوں کے بارے میں حتی کہ مخالف خیالات کے حامی لوگوں کے بارے میں بھی انہوں نے کشادہ قلبی اور وسیع النظری سے لکھا ہے۔ ان میں جدیدیے، غیر جدیدیے، انقلابی غیر انقلابی، ترقی پسند، اسلام پسند، سکھ عیسائی ہندو مسلمان سبھی شامل ہیں۔ ان کی تنقیدی تحریریں آج کے ادب و ادیب کی تفہیم کا نہایت معتبر و مستند وسیلہ بن گئی ہیں مثلاً محمد حسن عسکری کی ادبی قدر و منزلت اور اہمیت کو حقیقی معنی میں سمجھنا ہو تو سلیم احمد کی تحریریں نہیں محمد علی صدیقی کے مضامین زیادہ کار آمد ہوں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے جوش صاحب کے شاعرانہ عظمت و منصب کو سمجھنے کے لیے مجتبیٰ حسین کے

مضامین کا مطالعہ نہیں، فی الواقع سلیم احمد کے مقالات کا مطالعہ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔"

یہ تو تھی ایک نقاد کی رائے۔ ایک معتبر افسانہ نگار، ایک شاعر اور ایک کالم نویس بھی محمد علی صدیقی کی تحریروں کی صداقت کے معترف ہیں اور وہ ہیں احمد ندیم قاسمی۔ قاسمی صاحب کا کہنا ہے کہ "محمد علی صدیقی کے قدم اپنے وطن کی مٹی پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ ادب اور زندگی کے بارے میں اس کا ایک مثبت اور توانا نقطہ نظر ہے مگر اس کا نقطۂ نظر نعرہ نہیں لگاتا، سرگوشی سی کرتا ہے اور ذہنوں میں یوں نفوذ کرجاتا ہے جیسے پھولوں اور پتوں میں سورج کی روشنی نفوذ کرتی ہے۔ ادب کے میدان میں نقادوں کی صف بہت طویل سہی مگر محمد علی صدیقی کے سے نقاد اکا دکا ہی ہیں جنھوں نے اپنے ذہن سے سوچا اور اپنے ضمیر کی روشنی میں لکھا ہے۔ یوں وہ اس طویل صف میں بھی سربر آوردہ نظر آتا ہے۔ پراعتماد پرمایہ اور پروقار۔۔۔"

سرائیکی زبان کے دانشور جناب محمد اسلم رسولپوری کی یہ رائے بھی قابل توجہ ہے کہ "جس وقت ترقی پسند اہل قلم ترقی پسندانہ تحریک کے کمزور پڑنے اور جدیدیت کے طوفان اٹھ کھڑے ہونے کی وجہ سے مایوسی اور کنفیوژن کا شکار ہوچکے تھے اور ترقی پسندانہ فکر پر ان کا یقین ڈھیلا ہوچکا تھا اور پھر رخصت پسندانہ جدیدیت کو ترقی پسند فکر کا روپ دے کر فرار کی راہ تلاش کرنے یا اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش کررہے تھے اس وقت محمد علی صدیقی نے بڑی خوداعتمادیت اور جرات کے ساتھ ترقی پسندانہ نظریئے اور خیالات کی حمایت کی اور ترقی پسندوں کا اپنی سوچ پر اعتماد بحال کیا اور ان میں لکھنے کے نئے عزم کو بحال کیا۔"

اس رائے کے بعد ڈاکٹر محمد علی صدیقی سے جو گفتگو ہوئی ہے وہ بھی خاصی معلوماتی ہے۔ میں نے ان سے سوال نامے سے ہٹ کر بھی گفتگو کی اور پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب میں آپ سے اپنے نثر نگاروں کے تذکرے "گفتنی" کے حوالے سے کچھ سوالات کرنا چاہتی ہوں۔ پہلے تو آپ کچھ اپنے بارے میں بتایئے۔ آپ کی تاریخ و جائے پیدائش کے بارے میں۔ پھر یہ کہ آپ پاکستان کب تشریف لائے۔ تعلیم کہاں حاصل کی۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی بتارہے تھے۔ "میں ۱۷ مارچ ۱۹۳۸ء کو امروہہ میں پیدا ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں امروہہ اترپردیش (یوپی، ہندوستان) سے پاکستان آیا۔ اس وقت میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ یہاں میں نے چرچ مشن سوسائٹی اسکول میں تعلیم حاصل کی جو قائداعظم کا کراچی میں آخری اسکول تھا جہاں سے وہ بیرسٹری کے امتحان کے لیے لندن گئے تھے۔ یہ بہت مشہور انگلش میڈیم اسکول تھا۔ یہاں سے میں نے میٹرک کیا اور پھر میں نے اسلامیہ کالج سے بی۔ اے کیا اس کے بعد انگریزی میں ایم اے اور مطالعہ پاکستان میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ میں نے ۱۹۵۹ء سے روزنامہ "لیڈر" میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ ۱۹۶۴ء سے "مارننگ نیوز" میں لکھنا شروع کیا تھا اور ۶۵ء سے ۹۹ء تک میں روزنامہ "ڈان" میں ایریَل (Airel) کے قلمی نام

سے کالم لکھتا رہا ہوں اور میں آج تک ڈان کے لیے لکھ رہا ہوں۔ اس طرح ۴۰ سال سے میرا تعلق انگریزی صحافت سے ہے۔ ویسے اس کے ساتھ میں اردو میں برابر لکھتا رہا جیسا کہ آپ جانتی ہیں کہ اردو میں بھی میری کچھ تنقیدی کتابیں شائع ہوئی ہیں اور انگریزی کی صورت حال کچھ یوں ہے کہ میں ہزاروں کالم لکھ چکا ہوں اور میرا خیال یہ ہے کہ میرے ادبی مضامین پر مشتمل دس بارہ کتابیں آسکتی ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب ۳۴ سال کی مدت خاصی طویل مدت ہے۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں! اردو ادب اور علاقائی ادب کے بارے میں غالباً" طویل ترین دورانیہ ہے کسی بھی ادبی صحافت سے ایک کالم نگار کے مسلسل تعلق کا۔ اس لیے کہ ۳۴ سال تک لگاتار ادب اور ثقافت پر انگریزی میں پاکستان کی حد تک تو کالم لکھا نہیں گیا جبکہ خود پاکستان کی عمر ۵۲ سال ہے۔ صفدر میر صاحب نے بھی کالم لکھے۔ پاکستان ٹائمز میں وہ سیاست پر بھی لکھتے تھے اور کلچر پر بھی لکھتے تھے۔ وہ ادب اور بین الاقوامی امور پر بھی لکھتے تھے۔ اس لیے ان کالموں کو خالصتاً" ادبی کالم نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اس عرصے میں' میں نے دنیائے ادب کی تمام شخصیات سے ملاقات کی ان کے کالموں کو بھی دیکھا پڑھا اور مجھے کچھ یہ محسوس ہوا کہ ادب کی فضا وہ نہیں ہے جو مطبوعہ الفاظ کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہے۔ مطبوعہ الفاظ کے متعلق تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ لوگ اپنے ان خیالات کا دفاع آسانی سے کرسکتے ہیں جن کو وہ صفحہ قرطاس پر منتقل کردیتے ہیں مگر میرا خیال یہ ہے کہ ادب میں بھی دیگر ممالک کی طرح کچھ مکاتب فکر ہیں۔ مکاتب فکر کی اپنی سیاست ہوتی ہے مثلاً ہمارے یہاں بہت سے ترقی پسند ادیبوں کو صرف اس لیے اہمیت نہیں ملی کہ غیر ترقی پسند نقاد تھے انہوں نے ان کو اتنا درخور اعتنا نہیں سمجھا ان کے کاموں کو اس قابل ہی نہیں سمجھا۔ آپ ظہیر کاشمیری کی مثال لیں ظہیر کاشمیری کتنا اچھا شاعر کتنا اچھا نظم گو اور کتنا اچھا نثر نگار تھا۔ میں تو انہیں بہت اچھا نقاد بھی سمجھتا ہوں (اگر وہ اصرار کرتے اپنی اس حیثیت پر) لیکن آپ دیکھ رہی ہیں کہ وہ بات نظر نہیں آرہی اپنی ادبی دنیا میں جو اتنے بڑے ادیب اور شاعر کے گزر جانے کے بعد نظر آتی ہے۔ اگر ظہیر کاشمیری جیسا شخص بھی جو ترقی پسند ادیبوں میں میرا خیال ہے کہ بہت پڑھے لکھے ادیب تھے یا ممتاز حسین صاحب کو لیں جن کے انتقال کو بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن ان کی زندگی ہی میں ایک صاحب (ڈاکٹر حنیف فوق) نے ان پر الزام لگایا تھا کہ ممتاز حسین صاحب نے حالی سے یہ جملہ غلط طور پر منسوب کیا ہے کہ خیال کی بنیاد مادہ پر ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب اس بات کی وضاحت کیجئے کہ قصہ کیا تھا؟ میرے پوچھنے پر انہوں نے کہا کہ مولانا حالی جو ترقی پسند تحریک کے ایک طرح سے باوا آدم ہیں انہوں نے اپنے مقدمہ شعرو شاعری میں لکھا ہے کہ قوت متخیلہ کی بنیاد مادہ پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ مقدمہ شعرو شاعری میں موجود

ہے۔ اب اس بات کو احتشام صاحب نے بھی دہرایا اور ممتاز حسین صاحب نے بھی اس رائے کو دہرایا۔ یہ جملہ "مقدمہ شعروشاعری" میں موجود ہے لیکن اس کے باوجود ممتاز حسین صاحب ہدف تضحیک بنے اور یہ کہا گیا کہ انہوں نے حالی کا حوالہ غلط دیا ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے ممتاز صاحب کے اس خیال کا کافی دفاع کیا اور کافی مواقع پر یہ موقف اختیار کیا کہ یہ اقتباس مقدمہ شعروشاعری سے صحیح طور پر لیا گیا ہے۔"

"کیا وجہ ہے اس طرح کی غیر مدلل مخالفانہ بحث کی؟" میں نے پوچھا۔

"محض اس لیے کہ اگر کسی شخص کی زیادہ پذیرائی ہو رہی ہے تو وہ تمام حضرات جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس شخص کے مقابلے میں ہماری کم پذیرائی ہو رہی ہے وہ خواہ مخواہ بدک جاتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے "مغضوب" سے زیادہ اچھا ادب لکھیں اور زیادہ موثر تحریریں تخلیق کریں، وہ اس کی ٹانگ گھسیٹنے میں لگ جاتے ہیں۔ یہ واقعی ایک عجیب و غریب صورت حال ہے جو ہمیں ادب میں ملتی ہے۔ اب لسانی تشکیلات کا پورا معاملہ جو صفدر میر صاحب جیسے ترقی پسند کی سربراہی میں چلا پاکستان میں پچاس کی دہائی کے آخر میں اور ساٹھ کی دہائی کی ابتدا میں وہ کیا تھا؟ وہ یہی تھا کہ مروجہ زبان میں ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ مروجہ زبان اپنے معانی کھو چکی ہے، اپنے مفاہیم کھو چکی ہے اور چونکہ یہ نظریہ امریکہ سے درآمد کیا گیا تھا اور پروفیسر حسنین نے اس کو شروع کیا تھا۔ میساچوسٹس میں INSTITUTE OF TECHNOLOGY کتنا بڑا ادارہ ہے انہوں نے زبان کے بارے میں جو بات کہی تھی وہ ہمارے لسانی تشکیلات کے وکلاء نے اردو زبان پر مسلط کر دی حالانکہ وہ ان کے خیال میں انگریزی زبان کے بارے میں بھی اتنی ہی درست تھی جتنی پنجابی، سندھی، بلوچی، انگریزی اور فرنچ کے بارے میں ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ انسانی زبان چاہے لاکھ مکمل نظر آتی ہو لیکن اس میں ابھی اتنی سکت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ یہ ہمارے مافی الضمیر کو پوری طرح ادا کر دے۔ تو میں نے اپنی کتاب "توازن" میں اس پر لکھا۔ "توازن" ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ جسے پاکستان رائٹرز گلڈ نے اپنے سب سے بڑے انعام سے نوازا۔ یہ اس سال کی سب سے اچھی کتاب تھی۔ اس کے باوجود کہ اس میں سب سے زیادہ تلخ تنقید تھی اور دلائل براہین کے ساتھ تھی۔ میں نے لکھا تھا کہ ہماری جو روایتی زبان ہے اس میں نئی نئی چیزیں شامل ہوتی رہیں گی اور ہم اسے جدید خیالات کی مرقع نگاری کے لیے بھی استعمال کرتے رہیں گے۔ ضروری نہیں ہے کہ اسے یعنی زبان کو رائندہ درگاہ کر دیں۔ اس کو آپ دریا برد کر دیں آپ کہیں کہ زبان میں کچھ ہو ہی نہیں سکتا اور میر و غالب سے بھلا ہمارا کیا تعلق؟ تو یہ بھی ہمارے نوجوان ترقی پسندوں نے جو روایت کے خلاف تھے سلسلہ شروع کیا تھا۔ تو بہرحال میرا خیال یہ ہے کہ سلطانہ مہر صاحبہ کہ ادب کی دنیا میں جو تبدیلیاں آتی ہیں اور نئے خیالات وجود میں آتے ہیں ان پر بھی ایک نقاد کی، ایک ادیب

کی گہری نظر ہونی چاہیے۔"

"ڈاکٹر صاحب آپ نے عالمی ادب کا مطالعہ کیا ہے؟ کیا آپ نے دوسری زبانوں کے ادیبوں کا ایسا رویہ پایا ہے جو اردو کے ادیبوں کا ہے؟"

"صاحب یہ بات میں نے نہیں پائی بلکہ آپ دیکھیں میں پاکستان سے واحد نمائندہ ہوں جو UNESCO کی تنظیم AICL (ایسوسی ایشن آف انٹرنیشنل لٹریری کری ٹکس) جو پیرس کا ادارہ ہے میں اس ادارہ کے اجلاس میں جاتا ہوں اور دنیا بھر کے ادیبوں سے وہاں ملاقات ہوتی ہے۔ وہاں صاف گوئی تو ہے مگر کینہ توزی نہیں ہے۔ ایلیٹ نے کہیں یہ لکھ دیا تھا ملٹن کے بارے میں کہ وہ بڑا شاعر نہیں ہے۔ پھر آٹھ سال بعد اس نے اپنا خیال تبدیل کیا اور کہا کہ ملٹن گو اچھا شاعر نہ ہو مگر وہ بڑا شاعر ضرور ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جس شخص نے بائبل کے بعد انگریزی زبان پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے اس کے بارے میں میری رائے غلط تھی۔ دوسرے یہ کہ ان کے یہاں لوگوں کے کمالات کے اعترافات ہوتے رہتے ہیں اور وہ اس کے اظہار میں کوئی سبکی محسوس نہیں کرتے کہ ان کے اسکول آف تھاٹ کا ایک کری ٹک (نقاد) نہیں لیکن بالاخر بڑا نقاد تو ہے۔ یہ ان کی ذہنی تربیت کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے کام کی تعظیم کرتے ہیں چاہے ان کا مخالف کسی اور مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہو اور اس کی وجہ سے غالباً" ان کا ادب زیادہ پھولا پھلا ہے اور دنیا میں آج آپ دیکھیں کہ فرانسیسی حکومت نے یورپین کامن مارکیٹ میں انگریزی کو پہلی زبان مان لیا ہے۔ جبکہ ایک زمانہ یہ بھی تھا کہ انگلستان کے شہر DOVER سے ۲۱، ۲۲ میل دور فرانس تھا اور وہاں ایک نئی دنیا شروع ہو جایا کرتی تھی، ایک ایسی دنیا جہاں انگریزی سمجھنے والا کوئی نہیں ملتا تھا جبکہ آج پورے مغربی یورپ کی زبان انگریزی بن گئی ہے تو اصل میں یہ اس زبان کی طاقت پر منحصر ہے۔ آج وہ کہتے ہیں کہ پیرس ایئرپورٹ پر وہ پائلٹ نہیں اتر سکے گا جو کہ انگریزی میں بات نہ کر سکے۔ میرے خیال میں مغرب کی ترقی کا راز ان کی حریت فکر ہے اور دوسروں کی مخالفانہ بات کو توجہ سے سننا، اسے برداشت کرنا اور سلیقے سے اس کا جائزہ لینا ہے۔ یہ بات ہمارے ہاں نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارا شمار شاید "بچہ قوم" میں ہو رہا ہے انسانی بچوں کی طرح قوموں کی برادری میں بھی بچے جوان اور بوڑھے ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم "بچہ قوم" نہیں ہیں۔ ہمارے قائدین کی اکثریت بچکانہ حرکتیں کرتی رہتی ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب پڑھے لکھے وہ ہیں تو ہم بھی ہیں پھر طرز سلوک میں فرق کی وجہ؟"

"اصل میں بات یہ ہے کہ جیسے ہی ہم اپنے فطری رویے پر آجاتے ہیں ہمارا پڑھا لکھا ہونا ایک طرف رہ جاتا ہے اور جو ہم ہوتے ہیں سامنے آجاتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ ہماری معاشی پس ماندگی ہے کیونکہ اگر آپ معاشی طور پر پسماندہ ہیں تو چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے

آپ کو معاشی طور پر بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور اس جدوجہد کے درمیان آپ کو دوست دشمن بنانے پڑتے ہیں اور اگر کوئی آپ کے راستے میں آگیا ہے چاہے وہ لاکھ اچھا آدمی ہو' اچھا رائٹر ہو تو آپ کو برداشت نہیں کرتے۔"

"ڈاکٹر صاحب بات جاتی ہے سیاست تک۔ ہمارے ملک میں سیاسی استحکام نہیں ہے اس کی وجہ سے معاشی استحکام بھی نہیں۔ ادیبوں نے اس کے لیے کیا کیا؟ ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ ملک میں سیاسی استحکام لائیں؟"

"دیکھیں اگر ادیبوں کا کام ملک میں سیاسی استحکام لانا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ادب کی بجائے سیاست ہی کریں اور اس میں ناکام یا کامیاب ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ جب تک ہمارے یہاں طبقاتی سیاست ہے اس وقت چند فی صد افراد ملکی معاشی وسائل پر قابض رہیں گے۔ میں اسے قبضہ گروپ کہوں گا۔ یہی گروپ ادب کی ترویج و اشاعت میں مددگار بھی ہو سکتا تھا لیکن یہ کیوں مددگار ہو کسی ایسے شعبے یا کسی ایسے ڈسپلین کی ترقی میں جس سے ان کے مفادات پر ضرب پڑے۔ ترقی پسند ادیبوں نے یہ کام کیا۔ انہوں نے غریبوں کو یہ بتایا کہ آپ کی غریبی کوئی موروثی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کے بزرگوں کو اور پرکھوں کو کسی زمانے میں غریب بنا دیا گیا تھا چنانچہ آپ اب تک غریب چلے آ رہے ہیں۔ اگر آپ منظم ہو کر کاوش کریں اور اپنی غربت کا تدارک کریں ایسی سیاست میں حصہ لیں جو آپ کی غربت کا خاتمہ کر سکے تو ادیبوں نے یہ کام تو ضرور کیا ہے کہ انہوں نے ایسا ادب لکھا ہے کہ جس میں عوام کو سیاسی طور پر زیادہ باشعور بنانے کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ بعض ادیبوں نے اس کے برخلاف ایسا ادب لکھا ہے جس میں انہوں نے سیاسی مسائل سے دلچسپی کو کم کی ہے۔ میں انہیں جدید نہیں کہتا میں انہیں "جدیدیا" کہتا ہوں۔ یہ کوئی تحقیر کا PHRASE نہیں ہے۔ بعض لوگ واقعتاً" یہی سمجھتے ہیں کہ ادب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بڑی ایمانداری سے سمجھتے ہیں بڑی ایمانداری سے لکھتے ہیں مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس خیال کے پیچھے بھی ایک سیاست ہے۔ وہ اس خیال کے ذریعے بھی ایک سیاسی گروپ کی معاونت کرتے ہیں۔ آپ یہ دیکھیں کہ جو ڈکٹیٹر پاکستان میں حکمران بنا اس کی یہ حکمت عملی رہی کہ اسپورٹس اور جاسوسی مہم جویانہ قسم کے رسالوں پر کوئی پابندی نہ ہو۔ اگر آپ نے سیاسی مسائل پر لکھ دیا تو آپ پر پابندی عائد ہو گئی لیکن وہ رسالے جو بھوت پریت اور تھرل شائع کرتے ہیں ان پر پابندیاں نہیں لگائی گئیں۔"

ڈاکٹر صاحب ہمارے یہاں جاسوسی رسالے ایک مخصوص دور میں شروع ہوئے جب سکون اور امن لوگ تلاش کر رہے تھے اور تب جیسے جاسوسی ادب لوگوں کی ضرورت بن گیا تھا۔ اب کیا ہم جاسوسی تحریروں کو ادب میں شمار کریں گے جبکہ جاسوسی ادب نے ادیب کو پاکستان میں معاشی طور پر خوشحال بھی بنا دیا ہے؟

"صاحب ویسے آپ دیکھیں مغرب میں سیڈنی شیلڈن ڈینئیل اسٹیل اور جوفرے آرچر جیسے ادیبوں کی ایک لمبی فوج ہے جن کے ناول دو دو لاکھ اور تین تین لاکھ بھی بکتے ہیں۔ ساتھ میں وہ بھی ادب ہے جو زیادہ سنجیدہ ادیب لکھتے ہیں۔ یہ ادبا ادب کے چرچ سے تعلق رکھتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ اگر جمہوریت کا خاتمہ نہ ہوا ہوتا اور سن ۵۸ میں مارشل لا کا ایک طویل دور نہ شروع ہوا ہوتا اور اس دور میں یہ فیصلہ نہ کیا گیا ہوتا کہ ادب کے ذریعے جو آگہی پھیلتی ہے اس کا سدباب کرنا چاہئے تو صورت حال مختلف ہوتی۔ اس وقت حکومت کی حکمت عملی کے طور پر ایسے جرنلزم اور ایسے ادب کو فروغ دیا گیا جسے آپ یا میں تو ادب نہیں مانتے لیکن جو پڑھنے والا ہے عام قاری اسے اس ادب نے گرفت میں لے لیا۔ اسے پہلے تو ہمارے جدیدیئے حضرات نے بھگا دیا تھا۔ اس سے میری مراد "جدید" ہرگز نہیں ہے۔ میں جدید کو اور ترقی پسند کو ایک ہی سمجھتا ہوں جو ترقی پسند ہوتا ہے وہی جدید ہوتا ہے اور جدید ترقی پسند ہوتا ہے۔ ایک تو جدت یعنی (ماڈرن) ہوتا ہے اور ایک Modernist ہوتا ہے Modernist کے لیے میرا خیال یہ ہے کہ جدیدیہ کا لفظ بہتر رہے گا۔ کیونکہ یہ اصطلاح ایک فلسفے کے تحت ہے اور انکا کام ہی یہی ہے کہ ہر چیز انحراف اور انکار کے زاویہ سے دیکھی جائے۔ چنانچہ ایک طرف وہ ادب لکھا گیا جو ہمارے جذبات کو بھڑکائے اور خوف و ہراس والے ادب سے دلچسپی پیدا کرائے۔ پاکستان کی معاشی پسماندگی کا بڑا سبب بھی اس سیاسی عمل کو روکنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ایسا ادب تخلیق کرنے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں جو تبدیلی لائے۔ بہرحال وہ ادیب جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ آگہی ضروری ہے انہوں نے آگہی پیدا کی۔ دیکھیے آپ تمام حضرات کو لے لیں میں سمجھتا ہوں کہ ایک لمبی فہرست ہے جنہوں نے ہر دور میں معاشرے کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے بہت موثر اور طاقت ور ادب لکھا ہے ان ادیبوں کے نام بلاشبہ ادب میں زندہ رہیں گے جنہوں نے اس حقیقت کو جانا ہے کہ وہ معاشرے کے سامنے جواب دہ ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب میرا خیال یہ ہے کہ ساٹھ ستر اور اسی کی دہائی میں یعنی ۸۰ء سے پہلے تک اچھا ادب لکھا گیا اب ہم محسوس کرتے ہیں کہ کچھ ٹھہراؤ آگیا ہے، جمود آگیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟؟"

"میرے خیال میں جسے آپ جمود کہتی ہیں وہ جمود نہیں ہے۔ بے شک قارئین کی دلچسپیوں میں جو فرق آرہا ہے وہ امتداد زمانہ کے ساتھ ہے۔ ادب کی پذیرائی میں کمی ہو رہی ہے اسے ہم جمود کا نام دے سکتے ہیں ورنہ ادب تو لکھا جارہا ہے اور وہ لکھا جاتا رہے گا کیونکہ ایک خاص ذوق کے ادب کی ہر ادبی حلقے کو ضرورت ہے اور وہ ادب لکھا جارہا ہے۔ ہم نوجوانی کے دور میں جو ادب پڑھتے تھے آج وہ نہیں ہے کیونکہ آج کا نوجوان ادیب اپنے تناظر میں لکھے گا۔ اب

جیسے آپ یہ ادبی تذکرہ لکھ رہی ہیں یہ بھی ادبی تاریخ کا حصہ بنے گا۔ ہمارے ہاں جو ادبی تاریخ اب تک لکھی گئی ہے وہ بالکل DYNASTIC ہے جبکہ ہمارے ہاں اس تناظر میں دیکھنے کو وہ لوگ معیوب سمجھتے ہیں جو ہمارے ادبی مورخ ہیں۔ ایک مثال لیجئے۔ آپ خواجہ منظور حسین کی کتاب پڑھیں۔ نام ہے "اردو غزل کا روپ بہروپ" اس میں انہوں نے میر' سودا' مصحفی' غالب' جعفر زٹلی اور ولی کی شاعری کو سیاسی اور سماجی پس منظر میں دیکھا ہے اور بتایا ہے کہ ان کے اشعار میں صرف گل و بلبل ہی نہیں ان کے اشعار کے پس منظر میں مرہٹے آرہے ہیں کہیں انگریز آرہے ہیں کہیں ہونگھزی آرہے ہیں اور کہیں امرا کی باہمی سازشیں اور جاٹوں کی شورشیں نمایاں ہیں۔ یہ سب کچھ غزل کے اشعار کے ذریعے نمایاں کیا گیا ہے خواجہ منظور نے ایک ایک شعر کے نیچے لکھا ہے کہ یہ شعر فلاں واقعے کے ردعمل میں آیا ہے۔ اب فرض کیجئے کہ کوئی مورخ سماجی اور معاشی تناظر کو اس سے نکال دے اور اپنی سلیٹ کو اس سے صاف کردے تو ہمارے پڑھنے کے لیے کیا رہ جائے گا؟"

"ڈاکٹر صاحب خواجہ منظور اور ان کے قبیل کے دوسرے ادیبوں کی تحریریں ہمارے ایم اے کے نصاب میں کیوں شامل نہیں کی جاتیں؟"

"میں خود آپ سے یہی سوال کرنا چاہ رہا ہوں۔ غالبا" خواجہ منظور کی کتاب میں ایک ایک شعر کے نیچے سن دیا ہوا ہے اور اس میں لکھے سن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے کون سا واقعہ مذکور ہے۔ انہی خواجہ منظور کے گھر علی گڑھ یونیورسٹی میں ترقی پسندوں کے جلسے ہوتے تھے اب آپ میر تقی میر کو ایک الم پسند' حزن پسند اور یاسیت پسند شاعر کے طور پر نہ دیکھیں بلکہ میر کو آپ دیکھیں کہ مغل ختم ہوچکے ہیں۔ مرہٹے قابض ہوچکے ہیں اور قلعے پر انگریز قابض ہونے آرہے ہیں۔ ۱۸۰۳ء میں وہ بھی دہلی پر قبضہ کرلیں گے۔ ایک ایسی ابتلا میں جو شخص بیٹھا ہوا ہو اور سلطنت کے چراغ کو گل ہوتا دیکھ رہا ہو۔ ایک نئی سامراجی طاقت کو آتا دیکھ رہا ہو اس کی شاعری میں جو حزن و ملال ہونا چاہئے تھا وہی میر کے یہاں ہے۔ ہم ان کے اس حزن ملال پر تو کچھ لکھ دیتے ہیں' بول دیتے ہیں لیکن جو اسباب تھے ان کو ہم ان کا بہت داخلی معاملہ سمجھتے ہیں۔ کوئی چیز صرف داخلی معاملہ نہیں ہوتی بلکہ خارجی ہوتی ہے۔ خارج سے آتی ہے اور خارج جب اپنے آپ کو INTERNALISE کرلیتا ہے۔ جب خارج آپ کا اندرون بن جاتا ہے تو اندرون کی جو کیفیت ہے اس کے لیے کسی ماہر نفسیات کے پاس جانا ضروری ہوتا ہے' لیکن میرے خیال میں اس کے لیے کسی سماجی مورخین کے پاس بھی جانا ضروری ہے۔ چنانچہ ہمیں ایسے ادیبوں کی تحریروں کو یعنی خواجہ منظر سمیت ان کے سیاق و سباق کے ساتھ اپنے نصاب میں شامل کرنا چاہئے لیکن ہم اپنے نصاب میں وہ چیزیں شامل کرتے ہیں جو ہمارے طالب علموں کے ذہن کند ہی رکھیں۔ ہم نے اپنی تاریخ بھی انصاف سے نہیں لکھوائی۔ مغل

دور کی تاریخ آپ دیکھیں تو مغل دور کی تاریخ حکومت نے اپنی مرضی کی لکھوائی لیکن ایک اور تاریخ بھی "INDIA TO TELL" ہے۔ اس میں بتایا گیا کہ اٹھارویں صدی کا ہندوستان اس وقت کا سب سے بڑا صنعتی ملک تھا اور تمام دنیا کی ضروریات ہندوستان پوری کرتا تھا۔ ہندوستان اس زمانے میں خسارے کی تجارت نہیں کرتا تھا۔ خسارہ تو انگریزوں کے قبضے کے بعد شروع ہوا ہے۔ ادب کی سچی تاریخ لکھنے والوں میں' میں ڈاکٹر عبدالعلیم' ظ۔ انصاری' شاعر علی سردار جعفری اور علی جواد زیدی نے بھی اس طرف توجہ دی ہے۔ لیکن کتنے لوگ ہیں جو تاریخ کو اس طرح دیکھتے ہیں آپ اختلاف کرسکتے ہیں میرے مکتبہ فکر سے لیکن کیا میرا مکتبہ فکر کلیتہ "غلط ہوگا؟ کیا آپ کا مکتبہ فکر کلیتہ" صحیح ہوگا؟ اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ مکتبہ فکر نہ ہوا خوابوں کی تعبیر ہوگئی اور گویا آپ کی خواہش کے مطابق دینے والا ادارہ ہوگیا۔"

"کیا اس طرح کی بددیانتی برتنے والے ادیبوں کو اپنے رویے کا احساس نہیں؟"

"شاید اب احساس ہورہا ہے۔ پاکستان میں ۵۲ سال میں ۲۷ سال آمریت رہی اور آمریت کے زمانے کا جو ادب ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے بے شمار حضرات نے چاہے اسے علامت کے طور پر پیش کیا ہو یا تجریدی طور پر، بہرحال رد عمل دیا ہے۔ یہ جو آج کل شعور ہے عام انسانوں میں کہ ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ ہمارے مسائل حل نہیں ہورہے ہیں۔ یہ سیاست سے زیادہ ادب کے Root سے ذہنوں میں آگہی آئی ہے۔"

"ڈاکٹر محمد علی صدیقی صاحب! اب ہم موجودہ افسانے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں کہ آج جو افسانہ لکھا جارہا ہے اس میں کوئی نیا پن ہے یا پچھلوں نے جو لکھ دیا وہی دہرایا جارہا ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ موجودہ دور میں یقیناً بہت اچھے افسانے لکھے گئے ہیں مثلاً محمد منشایاد' رشید امجد' مظہرالسلام' مسعود اشعر' انور سجاد اور خالدہ حسین وغیرہ۔ خالدہ حسین اور زاہدہ حنا بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو جدید پیرائے میں بھی اظہار کریں تو روشن خیالی ان کے ساتھ رہتی ہے۔ پھر اب افسانے کے قارئین بھی وہ نہیں رہے جو منٹو' بیدی اور کرشن کو ملے تھے۔ آج کا قاری بھی کچھ زیادہ ہی مغربی افسانہ نگاری کے زیر اثر پیچیدہ ٹیکنیک کا عادی ہورہا ہے۔ اسے اب اپنے افسانہ نگاروں کی تحریر میں وہی ٹیکنیک نظر آتی ہیں تو وہ اسے توجہ سے پرکھتا ہے مگر ہمارے جدید اور بہت زیادہ تجریدی افسانے لکھنے والے تھے ان میں آغا سہیل کو لیں جنہوں نے علامتی افسانے لکھے مگر وہ سمجھ میں آتے ہیں۔ جب تک افسانہ نگار کی اپنے اسٹائل زبان اور اسلوب پر مضبوط گرفت نہ ہو کوئی موثر تخلیق وجود میں نہیں آسکتی۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں افسانے بہت اچھے لکھے جارہے ہیں۔ شاعری بھی بہت اچھی ہورہی ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب دوران گفتگو آپ نے بتایا تھا کہ ہمارے مقابلے میں ہندوستان میں بہت اچھی تنقید ہو رہی ہے۔ میں آپ سے گزارش کروں گی کہ کچھ نام بتایئے؟"

"دیکھئے میں بتاتا ہوں گوپی چند نارنگ ہیں، شمس الرحمان فاروقی، وارث علوی، عتیق اللہ، قمر رئیس، شاہد ردولوی وغیرہ ہیں۔ جو بہت اچھی تنقید لکھ رہے ہیں۔ مجھے نثار احمد فاروقی کی کچھ کلاسک ادب کی تنقید بہت اچھی لگی مگر مقابلتا" ہمارے ہاں مجھے کچھ تھکاوٹ سی نظر آرہی ہے۔ ہمارے ہاں سال بہ سال کی تنقید کی تاریخوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مورخ اس سال شاید اس ادیب سے کچھ زیادہ ہی ناراض ہوگیا ہے۔ یا فلاں ادیب سے زیادہ خوش ہوگیا ہے۔ آپ کسی ادیب کو لاکھ ناپسند کریں لیکن اگر آپ نے کسی دور میں اسے لائق اعتنا جانا ہے تو اسے کتنی حد تک نظرانداز کریں گے؟ ان رویوں کو منہا کردیں تو ہمارے ہاں بھی بعض نقادوں نے اچھا کام کیا ہے۔ ممتاز حسین، جمیل جالبی، محمد صفدر میر، مظہر علی سید اور وزیر آغا نے اچھی تنقید لکھی ہے لیکن بڑی عجیب و غریب بات یہ ہے کہ Modern اور Progressive محققین حضرات بہت کم ہیں جو آرہے ہیں وہ بھی روایتی اسکول سے وابستہ ہیں۔ ان میں چاہے وہ گوہر نوشاہی ہوں یا خواجہ محمد ذکریا ہوں۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ توازن۔ ۱۹۷۶ء۔ پاکستان رائٹرز گلڈ انعام یافتہ۔

۲۔ کروچے کی سرگزشت (ترجمہ) ۱۹۷۹ء

۳۔ نشانات (تنقیدی مضامین) ۱۹۸۹ء

۴۔ پاکستانیات جلد اول ۱۹۹۲ء۔ ۵۔ مضامین (تنقیدی) ۱۹۹۱ء

۶۔ اشاریئے۔ ۷۔ AN ARIEL VIEWOP PAKISTAN LITERATURE

Dr. Mohammad Ali Siddiqui
A-592 Block "J" North Nazimjabad
Karachi-74700 (PAKISTAN)

افسوس ہے بندہ، منعم ہے نہ متقی
خود نما، خوش خلق ہے نہ نقد ہے
(آزاد انصاری)
محمود ہاشمی
۱۱ مئی ۱۹۹۰ء

محمود ہاشمی

برمنگھم

پتہ نہیں انہوں نے عمر کی کس منزل پر قلم سنبھالا کہ پھر ان کی جدوجہد کے قدم رکے نہیں۔ وہ لمحے لمحے سے علم کا رس نچوڑتے رہے۔ آبلہ پا بھی رہے اور سرابوں سے بھی گزرے لیکن ان کی لگن نے ان کی ذات کو علم کا سرچشمہ بنا دیا۔ اور پھر وہ مقام آیا کہ لوگوں کے لیے علم کے نایاب موتی چننے کی تحقیق کرنے والے محمود ہاشمی کی کتاب "کشمیر اداس ہے" نے ادب کے ایک طالب علم اسد ایوب نیازی کو متوجہ کیا اور انہوں نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد (پاکستان) کے شعبہ اردو میں "تحقیقی و تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے اس کتاب پر اپنا مقالہ داخل کیا۔ یونی ورسٹی نے اس مقالے کو معیاری قرار دیتے ہوئے اسد ایوب نیازی کو ایم فل کی ڈگری عطا کی۔ اس تحقیقی کام کی نگرانی ڈاکٹر صدیق شبلی نے کی۔ یوں محمود ہاشمی برطانیہ کے پہلے ادیب ٹھہرے جن کی کتاب پر تحقیقی مقالہ تحریر ہوا اور جس پر ایم فل کی ڈگری دی گئی۔ (خبر اخبار جنگ لندن)

محمود ہاشمی کا غالباً" وہ پہلا افسانہ تھا "احساس" جو ستمبر ۱۹۴۲ء کے "ساقی" کے

شمارے میں شائع ہوا پھر تسلی' اور شہنائیاں بجتی رہیں "پنچ گاؤں کی قلوپطرہ" کے علاوہ "جدید اردو شاعری میں پنجاب کا حصہ" "جدید اردو شاعری اور یوپی والے" "جدید افسانہ نویسی کا ایک اہم سال" اور "ڈرامہ انار کلی کی واپسی" ۱۹۴۷ء تک یہ سب تحریریں رسالہ "ساقی" کے ساتھ "ادبی دنیا" لاہور اور "آج کل" دہلی میں شائع ہوئیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد ناولٹ' افسانے اور مضامین بھی ان گنت ہیں۔ ادیبوں کی کتابوں کے دیباچے تقریباً" تیرہ ہوں گے۔ کتابوں پر تبصرہ اور جائزے نو۔ دس کے قریب ہوں گے۔ ادبی مسائل اور خطوط کی تعداد بھی آٹھ دس ہے۔ اخباروں اور بی بی سی لندن کی اردو سروس سے انٹرویو بھی شائع ہوئے۔

ان کی وہ تصنیفات جو ترتیب و اشاعت کی منتظر ہیں ان میں "برطانیہ کے شاعر' ہماری نئی بستی' کتابوں کی باتیں اور میری ادبی زندگی کے پانچ سال کے علاوہ بچوں کی کتابیں "ستاروں کی سیر اور بے وقوف بادشاہ" تیار ہیں۔ موخرالذکر کے لیے وہ کسی مصور کی تلاش میں ہیں جو اردو پڑھ کر ان کی تصویریں بنا سکے۔

محمود ہاشمی صاحب نے سب سے بڑا کام جو کیا ہے وہ بچوں کے لیے اردو کا قاعدہ لکھا ہے اور ساتھ ہی اردو ورک بک بھی۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا قدم' دوسرا قدم اور تیسرا قدم۔ انہوں نے اساتذہ کے لیے بھی تین حصوں میں کتابیں لکھی ہیں اردو کیسے پڑھائی جائے۔ ان کتابوں کا پہلا ایڈیشن برطانیہ میں ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشنل سروسز سٹی آف بریڈ فورڈ میٹروپولیٹن کونسل نے چھاپا تھا۔ یہ نہ صرف برطانیہ بلکہ فرانس' جرمنی' ہالینڈ' ڈنمارک' ناروے' بلجیم اور امریکہ میں مقیم اردو پڑھنے والے بچوں اور بچیوں میں بے حد مقبول ہوا۔ برطانیہ کے مشہور اخبار "ٹائمز" کے ایجوکیشنل سپلیمنٹ نے بھی اس پر ایک طویل تبصرہ شائع کیا جس میں اس کی مختلف خوبیوں کو سراہا اور پاکستان کے انگلش میڈیم اسکولوں نے بھی اس سے استفادہ کیا۔ نو کتابوں کے اس سیٹ کو پہلی مرتبہ بریڈ فورڈ کونسل نے چھاپا تھا کیوں کہ یہ "قاعدہ" پاکستان اور ہندوستان میں پڑھائے جانے والے مروجہ قاعدوں سے بالکل مختلف تھا اور ہے۔

محمود ہاشمی کا ایک بڑا کارنامہ "مشرق" اخبار بھی تھا جس کا اجراء اپریل ۱۹۶۱ء کو ہوا۔ یہ نہ صرف برطانیہ بلکہ سارے مغرب میں اردو کا پہلا باقاعدہ ہفت روزہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں محمود ہاشمی اردو صحافتی حلقے میں بابائے صحافت کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

مشرق اخبار کا اجرا کیسے ہوا اور محمود ہاشمی سات سال بعد ۱۹۶۸ء میں اس سے دست کش کیوں ہوئے یہ ایک طویل مگر بہت دلچسپ کہانی ہے اور محمود ہاشمی نے اسے "مشرق کی کہانی"

کے عنوان سے لکھا ہے۔ یہ اتنی دلچسپ کہانی ہے کہ آپ اسے ایک بار پڑھنا شروع کریں تو درمیان سے چھوڑ نہیں سکتے۔

"کشمیر اداس ہے۔" محمود ہاشمی کی ۱۹۵۰ء کی تصنیف ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۴۵ سال بعد ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ بقول ہاشمی یہ ایک رپورتاژ ہے۔ پروفیسر محمد اکرام الحق کہتے ہیں۔
"پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کے تاریخی دن وہ سری نگر کشمیر میں تھے۔ ۱۹۴۷ء کے اس ہنگامہ خیز دور میں شیخ عبداللہ کی امن فوج کے ایک کمانڈر کی حیثیت سے انہوں نے ریاست جموں و کشمیر کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ "کشمیر اداس ہے" ہاشمی صاحب کے ان ہی مشاہدات کا نتیجہ ہے۔"

کتاب کے تعارف میں مرحومہ ممتاز شیریں لکھتی ہیں۔ "کشمیر اداس ہے" اردو کا بہترین رپورتاژ ہے۔ ایک سچا رپورتاژ ہے اور اپنے مواد میں اتنا مقبول ہے کہ اس سے ایک ناول کی تخلیق ہو سکتی تھی۔ اسے محض رپورتاژ کہہ کر محمود ہاشمی صاحب نے خاکساری برتی ہے ورنہ یہ ایک اچھا خاصا افسانہ ہے۔ اس کے ایک باب "نفرت کے درمیان" کے لیے حسن عسکری اور ایک باب "پیر پنجال کے قیدی" کے بارے میں صمد شاہین نے کہا ہے کہ "اس کے تسلسل، تواتر اور ترتیب سے اس پر ایک مکمل افسانے کا گمان ہوتا ہے اور اب کشمیر اداس ہے کو اپنی تکمیل میں دیکھ کر بھی یہی احساس ہوتا ہے کہ یہ محض رپورتاژ نہیں اس سے اونچی چیز ہے۔ یہ آرٹ کی سطح پر ہے۔ کسی کتاب کی قیمت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک وقت کا آئینہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک قیمتی کتاب ہے۔"

ممتاز شیریں نے فروری ۱۹۵۰ء میں جو پیش گوئی کی تھی۔ کتنی سچی تھی کہ اس صدی میں اس پر تحقیقی کام ہوا اور اسد ایوب نیازی نے اس پر ۹۸ء میں ایم فل کی ڈگری لی۔

۲۰ اگست ۱۹۲۰ء کو پاکستان کے صوبہ بلوچستان کی ریاست قلات کے شہر مستونگ میں پیدا ہونے والے محمود بن محمد ہاشم کا آبائی شہر پوٹھ بنگش میرپور آزاد کشمیر (پاکستان) ہے۔ پنجاب یونی ورسٹی سے ایم۔ اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد پرنس آف ویلز کالج جموں اور امر سنگھ ڈگری کالج سری نگر میں لیکچرار رہے۔ مختلف اوقات میں حکومت آزاد کشمیر کے چیف پبلسٹی افسر اور حکومت پاکستان کے محکمہ تعلقات عامہ میں افسر اطلاعات رہے۔ اس زمانے میں آزاد کشمیر ریڈیو اور راولپنڈی پاکستان سے تہذیبی اور ادبی نوعیت کے پروگرام بھی نشر کرتے رہے۔

ادیب، صحافی اور ماہر تعلیم پروفیسر سلطان محمود جنہوں نے اپنے والد صاحب کے نام ہاشم کو اپنے نام کے ساتھ وابستہ کر کے ہاشمی کہلانے میں مسرت محسوس کی ۱۹۵۵ء میں انگلستان سے آئے۔ لیڈز یونیورسٹی اور برمنگھم یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویٹ اسناد حاصل کیں اور چند سال وہاں کے محکمہ تعلیم سے بھی وابستہ رہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ہاشمی صاحب نے "گفتنی" کے سوالات کے جواب خاصے معلوماتی اور دلچسپ دیئے ہیں۔ میں نے بیسویں صدی میں اردو ادب میں زندہ رہ جانے والے نام پوچھے تو انہوں نے فرمایا۔

۲۔ "اس مشکل اور تفصیل طلب سوال کا آسان اور مختصر جواب یہ ہے کہ وہ ادیب یقیناً" موجود رہیں گے جن کا ذکر آپ کی کتاب میں ہوگا۔ یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ میری نظر سے آپ کی لکھی ہوئی کتاب "سخن ور دوم" گزر چکی ہے۔ جس میں آپ نے بیرون پاکستان رہنے والے شاعروں کا ذکر کیا ہے اور کتاب کے تعارفی مضامین میں مشفق خواجہ کی یہ رائے پڑھ چکا ہوں کہ "آئندہ جب کبھی اردو کی عالمی سطح پر پذیرائی کی تاریخ لکھی جائے گی تو سلطانہ مہر کی یہ کتاب بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کی جائے گی۔"

مشفق خواجہ جو بات کہتے ہیں بہت ناپ تول کر کہتے ہیں۔

آپ کی اس کتاب کے دوسرے تعارف کنندگان میں ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسی بھاری بھرکم شخصیتیں ہیں۔ نقادانِ فن میں مشفق خواجہ کی طرح ان کا بھی بڑا نام ہے۔ ان کا کہا بھی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں کسی طرح کی حیل و حجت کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ البتہ آپ کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے اور اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کی کتابوں میں صرف ایسے معیاری اور نمائندہ ادیب ہی بار پا سکیں جن کی تخلیقات کے آئندہ زندہ رہنے کا امکان ہو۔ "سخن ور" کے نام سے جس طرح کا تذکرہ آپ لکھ رہی ہیں ایسے تذکرے، اردو ادب کی تاریخوں اور ہم عصر نقادوں کے مضامین کسی مخصوص زمانے کے ادیبوں اور شاعروں کی نشان دہی اور تعارف کا قابلِ قدر حوالہ ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اسکولوں اور یونی ورسٹیوں میں پڑھائی جانے والی نصاب کی کتابوں کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ ان میں جن ادیبوں کی نگارشات ہوتی ہیں انہیں دل لگا کر پورے طور پر کوئی پڑھے یا نہ پڑھے، لکھنے والوں کا نام اور کام ذہن میں ضرور محفوظ رہتا ہے۔ امتیاز علی تاج کے ڈرامے "انار کلی" کو تو سب جانتے ہیں۔ (اس میں کچھ کمال فلم بنانے والوں کا بھی ہے) لیکن ان کے مشہور کردار چچا چھکن سے صرف وہی لوگ واقف ہیں جنہوں نے چچا چھکن کو اپنے اسکول کے زمانے میں پڑھا ہے۔ اسی طرح رتن ناتھ سرشار اور ان کا خوجی بھی محض نصابی کتابوں ہی کے سہارے زندہ ہیں۔

زمانے اور عمر کے ساتھ پسند اور ناپسند کے معیار بھی بدلتے رہتے ہیں۔ تاہم بعض کتابوں اور مصنفوں کی چھاپ اتنی گہری ہوتی ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید سے بے نیاز ابدی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ شاعروں میں میر، غالب اور بیسویں صدی کا اقبال اور نثر نگاروں میں الطاف حسین حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" اور مرزا رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" اسی قبیل سے ہیں۔

بیسویں صدی کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کا نام ان کی زندگی میں سعادت حسن منٹو سے پہلے لیا جاتا تھا۔ آزادی کے بعد منٹو پر زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ اور وہ ان دونوں سے بڑے افسانہ نگار قرار پائے۔ صدی کے آخر آخر میں اس طرح کی باتیں بھی ہونے لگیں کہ کرشن چندر محض ایک فارمولا افسانہ نگار ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی البتہ اپنی تکنیک اور "سنجیدہ" افسانہ نگاری کی وجہ سے محترم رہے۔ میں سمجھتا ہوں آنے والے زمانے میں کرشن چندر موجود تو رہیں گے لیکن محض ایک رومانوی افسانہ نگاری کی حیثیت سے اور راجندر سنگھ بیدی سنجیدہ قارئین کی ملکیت بن جائیں گے۔

قاری کی پسند اور ناپسند کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اپنی زندگی میں منٹو "طوائف شناسی" کی وجہ سے مشہور رہے اور خوشیا' ہتک اور کالی شلوار جیسے افسانے ان کے شاہکار سمجھے گئے۔ اب جب کہ سیاست کا دور دورہ ہے ان کے وہ افسانے زیادہ پسند کئے جاتے ہیں جن پر سیاست کا سایہ ہے۔ منٹو کے ہر زمانے میں موجود رہنے کے بڑے امکانات ہیں۔ اکیسویں صدی میں کبھی تو وہ بابو گوپی ناتھ' جانکی' موزیل وغیرہ جیسے کردار اور کہانیوں کی وجہ سے زندہ رہیں گے اور کبھی ان کے "زحمت مہر درخشاں" جیسے مضامین کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا جن میں انہوں نے ان مقدموں کے کوائف لکھے ہیں جو ان پر فحش نگاری کے الزام میں لاہور کی عدالتوں میں دائر ہوئے۔ مستقبل کے قاری کو کبھی ان کے "سیاہ حاشیے" پسند آئیں گے اور کبھی وہ "گنجے فرشتے" اور "نور جہاں سرور جاں" پڑھ کر محظوظ ہوگا۔ منٹو میں بڑا تنوع اور قاری کو اپنی گرفت میں لینے کا وافر سامان ہے۔

عصمت چغتائی کو اکیسویں صدی میں اپنے انداز بیان میں بے باکی اور مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بغیر لگی لپٹی کے بات کہنے کی وجہ سے یاد کیا جائے گا۔ ان کے ساتھ واجدہ تبسم کا ذکر کرنا فیشن ہوگا۔ آئندہ صدی کی پہلی دہائیوں کے قاری کو قرۃ العین حیدر ذہنی طور پر اپنے زیادہ قریب معلوم ہوں گی اور پڑھنے کے شوقین (گو کم ہوں گے) ان کی کتابوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر پڑھا کریں گے۔

کسی زمانے میں عورتوں کے حقوق کے سب سے بڑے داعی راشد الخیری سمجھے جاتے تھے۔ اب جب کہ عورتیں خود کفیل ہیں راشد الخیری کا حوالے کے طور بھی کوئی نام نہیں لیتا۔

خود کفالت پر مجھے ممتاز شیریں یاد آ رہی ہیں جو اب تک کی اردو کی تاریخ میں واحد نقاد خاتون ہیں۔ ان کا نام اردو حلقوں میں کم ہی سننے میں آتا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "معیار" کے نام سے ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا۔ اس کے بعد منٹو کے بارے میں ان کی کتاب "نوری نہ ناری" ان کی وفات کے بعد ان کے شوہر ڈاکٹر صمد شاہین نے چھپوائی تھی۔ وہ بھی اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

بیسویں صدی کی اس نقاد خاتون کو اپنے زمانے میں تھوڑی بہت شہرت ضرور ملی لیکن ان کے اور ان کے شوہر کے ملک عدم کو سدھارنے کے بعد ان کا نام اور کام آہستہ آہستہ نظر سے اوجھل ہو رہا ہے۔ غالباً" اس پبلشر نے بھی پبلشنگ سے کنارہ کشی کر لی ہے جس نے ان کی کتابیں چھاپی تھیں۔

کون جانے اکیسویں صدی میں جب قارئین کو احساس ہو کہ انہیں ورثے میں جو ادب ملا ہے اس میں افسانہ نگاروں اور شاعروں کی تو بھرمار ہے لیکن نقاد خال خال ہیں تو ان میں سے کوئی ممتاز شیریں کی کتابیں ڈھونڈ نکالے اور انہیں وہ مقام حاصل ہو جائے جس کی وہ مستحق ہیں۔

۳۔ گستاخی معاف صرف فکشن ہی کو لطیف آرٹ کیوں کہا جائے۔ میرے حقیر خیال میں ہر آرٹ لطیف ہوتا ہے اب رہ گئی یہ بات کہ کیا فکشن کی لطافت اور حسن کو جدیدیت نے سنوارا ہے یا مجروح کیا ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ ادب یا کسی اور آرٹ فارم کی ہر تحریک اسے کسی نہ کسی صورت میں بڑھاوا ہی دیتی ہے اس سے فن کے سمندر میں مدوجزر کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ نئی نئی بحثوں کا آغاز ہوتا ہے اور یہ مہمیز بن کر اپنے زمانے کے فنکار کو اکساتی ہے کہ وہ نئی رو کا ساتھ دے یا اس کے خلاف کوئی بات کرے۔ اگر فنکار میں جان ہے تو اسے کسی طرح کی تحریک سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ ہر تحریک اپنے ساتھ لاکھ گھمن گھیریاں لائے آخر کار فائدہ مند ہی ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں جدیدیت کی رو آئی اور گزر گئی۔ ہمارے جو ادیب اس رو میں بہے وہ ایک نئے تجربے سے آشنا ہوئے۔ اس تجربے کے دوران جیسے ہم پر پہلی مرتبہ یہ انکشاف ہوا کہ ادیب کا قاری سے بھی ایک رشتہ ہوتا ہے۔ اس رشتے کی اہمیت واضح ہوئی اور اس طرح کی بحثیں عام ہوئیں کہ جدیدیت کی علامت نگاری قاری کو لکھنے والے سے جدا کر رہی ہے۔ قاری جو اپنے ادیب سے کبھی جدا نہیں ہوتا یہ بحثیں پڑھتا رہا۔ اس کے ذہن کی سلوٹیں دور ہوئیں، فہم کے کئی بند دروازے کھلے۔ اس نے افسانوں اور کہانیوں میں علامتوں اور کنایوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں کبھی کامیاب ہوا اور کبھی ناکام اور کبھی کچھ اس طرح سمجھا کہ افسانہ نگار کو بھی حیران کر گیا۔ جدیدیت کے نام پر علامت نگاری نے فروغ پایا لیکن وہ کہانی بھی زندہ رہی جس میں حقیقت نگاری اور سیدھا سادا بیانیہ تھا۔ جدیدیت نے اگر فن کو سنوارا نہیں تو مجروح بھی نہیں کیا۔ ہر تجربے کی اپنی بھی ایک اہمیت ہوتی ہے۔

۴۔ میرے خیال میں اردو میں موجودہ صدی میں کم ناول لکھنے کی سب سے بڑی وجہ غالباً" کم فرصتی رہی ہے۔ بیسویں صدی کا نصف اول بے روزگاری کا زمانہ تھا اور ہمارے اکثر افسانہ نگار جو ناول لکھ سکتے تھے روٹی، کپڑا اور مکان حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔

کرشن چندر نے جب اپنا پہلا ناول "شکست" (غالباً" ۱۹۴۳ء) لکھا تو وہ بستا" آسودگی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور آل انڈیا ریڈیو میں افسر تھے۔ اسی طرح کرشن چندر کی "شکست" کے دو تین سال بعد جب عصمت چغتائی نے "ٹیڑھی لکیر" لکھا تو وہ عصمت شاہد لطیف بن چکی تھیں اور ناول لکھنے کے لیے وقت نکالنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اوپندر ناتھ اشک نے بھی اپنا ناول "گرتی دیواریں" اس زمانے میں لکھنا شروع کیا تھا جب آل انڈیا ریڈیو اور ان کی شکنتلا سے شادی نے انہیں غم دنیا سے آزاد کر رکھا تھا اور انہیں دل جمعی حاصل تھی۔ آزادی اور قیام پاکستان کے بعد ممتاز مفتی نے اپنا ضخیم ناول "علی پور کا ایلی" لکھا تو وہ صدر پاکستان کے دفتر میں آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی تھے اور فرصت کی فراوانی تھی۔ جمیلہ ہاشمی کی شادی ایک جاگیردار خاندان میں ہوئی تھی۔ اس لیے انہیں اس طرح کا مکمل اطمینان اور سکون میسر تھا کہ وہ طول و طویل ناول نہایت یک سوئی کے ساتھ لکھ سکتیں۔ خدیجہ مستور بھی "آنگن" لکھتے وقت خاتون خانہ تھیں اور ان کے شوہر روزنامہ امروز کے چیف ایڈیٹر تھے۔ بانو قدسیہ نے بھی اپنا معرکتہ الارا ناول "راجہ گدھ" ایسے حالات میں لکھا جب امور خانہ داری کے دوران ان کے لیے وقت کی کوئی کمی نہ تھی۔ گو حالات بہت سازگار تھے۔ عزیز احمد نے اپنا پہلا ناولٹ "گریز" لکھا تو وہ حیدر آباد دکن کی شہزادی در شہوار کے پرائیوٹ سیکرٹری تھے۔ ان کے دوسرے ناول "آگ' اور ایسی بلندی ایسی پستی" وغیرہ بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد انہوں نے "شبنم" لکھا اور پھر آہستہ آہستہ وہ فکشن کی دنیا ہی سے الگ ہو گئے اور انگریزی میں تاریخی کتابیں لکھنا شروع کر دیں۔ شوکت صدیقی نے اپنا طول و طویل ناول "خدا کی بستی" لکھا تو وہ کراچی میں رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری تھے اور اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے بھی نہایت اطمینان سے ناول لکھ سکتے تھے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" اس زمانے کی پیداوار ہے جب وہ حکومت پاکستان کے محکمہ اطلاعات میں اعلیٰ افسر تھیں اور ان کی زندگی کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ان کے لیے ناول لکھنے کے لیے وقت نکالنا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اس کے بعد جب وہ پاکستان چھوڑ کر بھارت چلی گئیں تو ان کے وہ ناول سامنے آئے جس کے بعد ان کا شمار اس زمانے کے بڑے ناول نگاروں میں ہونے لگا۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ایم۔ اسلم بھی نرگس اور ناظمہ کی آپ بیتی جیسی ناول لکھ رہے تھے اس وقت وہ امیر آدمی تھے اور معلوم ہوتا ہے سوائے ناول لکھنے کے انہیں اور کوئی کام نہ تھا۔ انہوں نے بے شمار ناول لکھے۔ اسی زمانے میں قاضی عبد الغفار کے دو مختصر ناولوں "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" کا بھی بڑا چرچا رہا۔ عظیم بیگ چغتائی کے مزاحیہ ناولوں کی بھی خاصی بھرمار رہی۔

اسی زمانے کے ناول نگاروں میں نسیم حجازی کے اسلامی' تاریخی ناولوں کی بھی بڑی مانگ

رہی۔ ان کی مقبولیت دیکھ کر رئیس احمد جعفری اور محمد سعید نے بھی تاریخی ناول لکھے۔ جو مقبولیت نسیم حجازی کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہ آسکی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایم۔ اسلم کی طرح انہیں بھی ادب کے نقادوں نے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ یہ لوگ ان کے ادبی معیار پر کبھی پورے نہ اترے۔ نسیم حجازی ہمارے ناول نگاروں میں سے واحد ادیب ہیں جنہوں نے ناول لکھنے شروع کیے تو بس ناول ہی لکھتے رہے اور یہ ان کا کل وقتی کام بن گیا۔ ان کی گزر اوقات اپنے ناولوں کی آمدنی پر ہوتی تھی۔ قومی کتب خانہ لاہور ان کے اولین پبلشر تھے اور انہیں غالباً" چھ سو روپے ماہوار دیتے تھے جو اس زمانے میں ایک معقول رقم سمجھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہر چھ مہینے کے بعد حساب کر کے انہیں رائلٹی کا بقایا بھی مل جاتا تھا۔

ایک اور ناول نگار عبداللہ حسین ہیں جن کا پہلا ناول "اداس نسلیں" بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں چھپا تھا۔ اس ناول پر انہیں آدم جی ایوارڈ ملا تھا۔ اس کے بعد وہ انگلستان آگئے جہاں متعدد افسانوں کے علاوہ انہوں نے چند ناولٹ "نشیب" "وطن کو واپسی" "اور قید" لکھے۔ حال میں ہی ان کا ایک طول ناول "نادار لوگ" چھپا ہے جس کے شروع میں انہوں نے لکھا ہے کہ ان کی اس کتاب کے بارے میں نقاد چھ مہینے تک کچھ نہ لکھیں۔ (رنگ میں بھنگ نہ ڈالیں) اور قارئین کو اطمینان سے کتاب پڑھنے کا موقع دیں۔ کون سے نقاد اور کون سے قارئین؟ یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

خدا ہمارے تمام ادیبوں کو خوش فہمی کی اس طرح کی جنت میں رہنے کی توفیق دے!

ناول نہ لکھنے کی وجہ وقت کی کمی کے علاوہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے لیے پبلشر آسانی سے نہیں ملتے۔ اس کی ضخامت کی وجہ سے اس پر خرچ بہت اٹھتا ہے اور رقم کی واپسی کی فوری طور پر امید نہیں ہوتی۔ ممتاز مفتی کا ناول "علی پور کا ایلی" صرف اڑہائی سو کی تعداد میں چھپا تھا اور وہ بھی اس امید پر کہ اس پر آدم جی ایوارڈ ملے گا اور وارے نیارے ہو جائیں گے۔ (جب آدم جی ایوارڈ نہ مل سکا۔ تو نجانے پبلشر پر کیا بیتی ہوگی؟)

آج کل شاعروں کی طرح بعض افسانہ نگار بھی اپنی کتاب خود چھاپ رہے ہیں۔ وہ ناول نہیں لکھتے کیوں کہ اس کی ضخامت انہیں بھی راہ کا روڑا نظر آتی ہے۔ وہ صرف افسانے لکھتے ہیں اور جب سو ڈیڑھ سو صفحات کا مجموعہ تیار ہو جائے تو اسے خود چھاپتے ہیں۔ کوئی افسانہ اگر ذرا لمبا ہو جائے تو اسے ناولٹ کا نام دے کر اپنے ناول نگار ہونے کی صلاحیت کو تھپکیاں دے لیتے ہیں۔

سوال نمبر۵ کے جواب میں عرض ہے کہ ادیب خواہ آج کا ہو، خواہ کل کا ہمیشہ مادی بلکہ ذہنی، نفسیاتی اور روحانی بحران میں مبتلا رہا ہے اور یہ نہ صرف ادیب کا بلکہ ہر زمانے کے ہر حساس فرد کا المیہ ہے۔

اگر نظام فکر سے آپ کی مراد نظام معیشت یا سیاسی نظام ہے تو ایک ترقی یافتہ ماحول اور اس میں پروان چڑھنے والا صحت مند معاشرہ ادیب کے لئے اس لحاظ سے یقیناً" مفید ہے کہ وہ اس طرح کی سازگار فضا میں آسودگی اور اطمینان کے ساتھ اپنے نظام فکر کی آبیاری کر سکتا ہے۔

یہ سطریں لکھنے کے بعد میں نے آپ کے سوال کو دوبارہ پڑھا تو ایک عجیب مخمصے میں پڑ گیا۔ آپ کے سوال کا آخری جملہ کہ "بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے وہ (یعنی ادیب) کسی نظام فکر کی تلاش میں ہے۔ اس کی رہنمائی کس طرح ہو؟" میں نے اوپر لکھی ہوئی سطروں میں ادیب کی صرف ادبی زندگی کو مدنظر رکھا تھا۔ آپ کے سوال کا یہ آخری حصہ دوبارہ پڑھنے کے بعد محسوس ہوا کہ شاید آپ اس کی عام زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اس کی رہنمائی کی فکر میں ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو بصد احترام یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ آج کے حالات کی روشنی میں مجھے یہ سوال غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مالی اور دنیاوی لحاظ سے ہمارے آج کے ادیب خوش حالی کی جو زندگی گزار رہے ہیں اس سے پہلے کے ادیب اس سے ہمیشہ محروم رہے۔ پاکستان میں مقتدرۂ قومی زبان' اکادمی ادبیات و پاکستان بک فاؤنڈیشن' اردو ڈکشنری بورڈ' انجمن ترقی اردو' اقبال اکیڈمی' ادارۂ ثقافت اسلامیہ' پاکستان کونسل کے ضلعی ادارے اور اس طرح کے بیسیوں سرکاری اور نیم سرکاری ادارے ہیں جن میں ادیب معقول معاوضوں پر ملازم ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے دروازے بھی ادیبوں کے لیے کھلے ہیں۔ ہر روزنامہ اخبار میں ایک ادبی ایڈیشن چھپتا ہے۔ اس کے علاوہ ان اخبارات کے کالم نویس ہیں جن کی تنخواہیں بعض اوقات بڑے بڑے سرکاری افسروں سے بھی زیادہ ہیں۔ پھر مشاعرے ہیں جہاں شاعروں کو منہ مانگا معاوضہ دے کر بلایا جاتا ہے۔ مشاعرے کم و بیش سارا سال چلتے ہیں۔ کبھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کبھی کسی سفارت خانے میں اور کبھی کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کی دعوت پر ان کے اضلاع میں۔ اکثر کمشنر اور ڈپٹی کمشنر خود بھی شاعر یا افسانہ نگار ہیں اس لیے ادبی مشاغل کا یہ سلسلہ سدا بہار ہے اور شاعروں کے لیے خاصا سود مند ہے۔ ادیبوں کو سرکاری طور پر کئی مراعات حاصل ہیں۔ انھیں اعزازات سے بھی نوازا جاتا ہے' نقد رقمیں بھی ملتی ہیں۔ اکادمی ادبیات نے غریب شاعروں اور ادیبوں کے لیے ماہانہ وظائف بھی مقرر کر رکھے ہیں جنھیں "اعزازیہ" کہا جاتا ہے۔ ادیب اور شاعر کبھی سرکاری وفد کی صورت میں اور کبھی کسی ملک کے کسی ادارے کی دعوت پر مختلف ملکوں کی سیر بھی کرتے رہتے ہیں۔ آج کا ادیب مالی طور پر اتنا مستحکم ہو چکا ہے کہ وہ اپنی کتابیں خود چھاپتا ہے اور اس کی کتاب کی رونمائی بسا اوقات حکومت کا کوئی وزیر با تدبیر کرتا ہے۔ آج کے ادیب نے قلم کے زور پر اپنے آپ کو منوا لیا ہے۔

بھارت میں بھی اردو اکیڈمی نام کے متعدد سرکاری ادارے ہیں جن میں ادیب ملازم ہیں۔ وہ ادیبوں کو نقد انعامات سے نوازتے ہیں' اور ان کی کتابوں کو چھاپنے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

ممالک غیر میں جہاں اردو کے مداحوں کی نئی بستیاں قائم ہیں حکومت اردو کے ادیبوں کو ان کی کتاب چھپوانے اور ادبی تقریبات منعقد کرنے کے لے مالی امداد دیتی ہے۔

جب صورت حال یہ ہو تو محترمہ "ہمیں فکر جہاں کیوں ہو؟"

یہ وہ حال مست ادیب ہیں جن پر "روشن باطن ایام" ہے ان کے بارے میں اگر ہم اس طرح کی فکر کریں کہ حکومت انہیں کوئی پلاٹ وغیرہ الاٹ کردے تو وہ مجھے یقین ہے ہمیں گھور کر دیکھیں گے کہ یہ کون ہیں جو خواہ مخواہ دخل در معقولات کر رہے ہیں۔

(ہاشمی صاحب آپ نے تو ان چند ادیبوں کی خوش حال زندگی کا خوبصورت رخ دکھایا ہے جن کی رسائی اونچے ایوانوں تک ہے اور جنہیں تعلقات پیدا کرنے کے گر بھی آتے ہیں۔ ہم نے تو عام ادیب کی بات پوچھی ہے اسی کتاب میں ذرا ان کے حالات بھی پڑھ لیں۔ بہت ملیں گے۔)

سوال نمبر۶ کے جواب میں انہوں نے کہا "ایک زمانے میں معیاری ادب کا سب سے بڑا پیمانہ یہ تھا کہ جو کچھ لکھا جائے اس کی زبان قواعد کی پابند ہو اور فصاحت و بلاغت سے مالا مال ہو۔ ہمارے پرانے غزل گو استاد شعرا غالب و ذوق' مصحفی' داغ وغیرہ اس معیار پر پورے اترتے تھے۔ نثر نگاروں میں ڈپٹی نذیر احمد' راشد الخیری اور ان کے ہم عصر بھی زبان کی طرف بہت دھیان دیتے تھے۔ محمد حسین آزاد ان میں ایک نمایاں مثال ہیں۔ بعد میں ابوالکلام آزاد نے بھی اس میدان میں جھنڈے گاڑے۔ پھر جب عام فہم اور آسان زبان میں لکھنے کا دور آیا تو گرامر کی پابندی تو بدستور رہی لیکن فصاحت و بلاغت کے معنی بدل گئے اور انفرادی انداز بیان میں شگفتگی اور تازگی کی تلاش ہوئی۔ ہمارے ادب میں جدید افسانہ آیا تو زبان کے ساتھ ساتھ بلکہ اکثر صورتوں میں زبان سے زیادہ موضوع کو اہم سمجھا جانے لگا۔ ادب میں سچائی' حسن اور خیر کی اقدار معیاری ادب کا ہمیشہ لازمہ رہی ہیں۔ اب اس کا "روح عصر" اور اپنے زمانے کا ترجمان ہونا بھی ایک ضروری جزو سمجھا گیا۔ اور اسلوب اور موضوع میں ہم آہنگی کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ معیار یہ قرار پایا کہ کہ قلم سے جو نکلے وہ قاری کے دل میں اترے لیکن ہر قاری ذہنی طور پر اتنا بالغ اور باشعور نہیں ہوتا کہ ہر تخلیق کے ساتھ نباہ کر سکے۔ اس لیے اب ادب کا ایک پیمانہ منفی ہی سہی یہ بھی ہے کہ ادبی تخلیق جتنی معیاری ہوگی اس کے قاری اسی حساب سے کم ہوں گے۔"

سوال نمبر۸ کے جواب میں ہاشمی صاحب نے فرمایا۔ "محترمہ کیا آپ واقعی یہ سمجھتی ہیں کہ اردو میں "انگریزی زبان کے الفاظ کی شمولیت سے گریز ہو رہا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان دنوں جس کثرت سے ہمارے ادیب اور شاعر اردو میں انگریزی کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں اس سے یہ خدشہ ہے کہ آئندہ اردو کی ادبی تحریریں صرف وہی لوگ پڑھ سکیں گے جو انگریزی

سے بھی بخوبی آشنا ہوں گے۔ ہمارے ہاں انگریزی کے الفاظ سرسید اور حالی کے زمانے سے اپنائے جا رہے ہیں۔ کسی جملے میں کوئی لفظ استعمال کیا جاتا تو اسے اردو (فارسی) رسم الخط میں ہی لکھا جاتا تھا۔ اب اسے انگریزی حروف یعنی رومن رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ایک نظم نظر سے گزری اس کا عنوان تھا "آٹو بایو گرافی" اور اسے رومن حروف میں لکھا گیا تھا۔ یہ نئے زمانے کا فیشن ہے کہ اردو میں انگریزی کے لفظ لکھو اور انہیں انگریزی کی طرح رومن رسم الخط میں لکھو۔ اس صورت حال میں آپ کا یہ کہنا کہ "انگریزی الفاظ کی شمولیت سے گریز ہو رہا ہے۔" عجیب سا لگتا ہے۔

اپنے اس سوال میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "فارسی اور عربی نئے علوم سے محروم زبانیں ہیں""۔ کیا واقعی؟ محترمہ ان دونوں زبانوں میں جدید علوم اور سائنس کی کتابوں کے اتنے ترجمے ہو چکے ہیں کہ وہ اب انگریزی، فرانسیسی، اور جرمن جیسی زبانوں پر انحصار کرنے کی بجائے بہت حد تک خود کفیل ہو چکی ہیں۔ ان کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ ہم اردو میں جب کسی نئی علمی کتاب کا کسی مغربی زبان سے ترجمہ کرتے ہیں تو ہمیں عربی اور فارسی تراکیب ہی سے مدد ملتی ہے۔ نجانے آپ نے ان زبانوں کو محروم کیسے قرار دیا؟

ا۔ مجھے آپ سے مکمل اتفاق ہے کہ ہمارے ہاں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ ہمارے آج کے بیشتر نقادوں کے جو مضامین اور کتابیں چھپ رہی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض یونی ورسٹی کی تعلیم کے دائرے میں گھومتی ہیں۔ اکثر کتابیں بی اے اور ایم اے کے اردو کے طالب علموں کے امتحانات کو پیش نظر رکھ کر لکھی جاتی ہیں تاکہ انہیں پڑھ کر وہ امتحان آسانی سے پاس کر سکیں۔ تجارتی لحاظ سے یہ انداز تحریر بہت منفعت بخش ہے لیکن اس وجہ سے تنقید کے اعلیٰ معیار قائم ہونے کے امکانات بتدریج ختم ہو رہے ہیں۔ اس طرح کی کتابوں کے علاوہ جو اور تنقیدی کتابیں شائع ہو رہی ہیں وہ بھی زیادہ تر ان مقالات پر مبنی ہیں جو صاحب کتاب یا صاحبہ کتاب نے اردو میں پی ایچ۔ ڈی یا ایم فل کرنے کے لیے لکھی تھیں۔ عصری ادب اور اس کے زاویوں پر بحث کرنے والی کتابیں قریب قریب نایاب ہیں۔

نقاد کا اولین فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی تنقید سے لکھنے والوں کی رہنمائی کرے لیکن ہمارے لکھنے والے رہنمائی سے زیادہ تعریف چاہتے ہیں۔ جائز تنقید پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور نقاد کو یہ کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں کہ وہ خود افسانہ لکھ سکتا ہے اور نہ شعر کہہ سکتا ہے۔ وہ بھلا تخلیق کے کرب کو کیا سمجھے!

ہمارے ہاں رسالوں کی بڑی ریل پیل ہے لیکن ان میں تنقیدی مضامین کم چھپتے ہیں یا بالکل ہی نہیں چھپتے۔ اچھے اچھے معیاری رسالوں میں بھی کوئی تنقیدی مضمون کبھی کبھار ہی نظر آتا ہے۔ نئی کتابوں پر تبصرے ضرور چھپتے ہیں۔

قیام پاکستان اور آزادی سے پہلے رسالوں میں چھپنے والی تخلیقات پر تبصرہ رسالوں کے ایڈیٹر اور نقاد کیا کرتے تھے۔ اب یہ کام قارئین نے خود سنبھال لیا ہے یا ایڈیٹروں نے اپنے قارئین کے حوالے کر دیا ہے۔

۲۔ آپ کا کہنا درست ہے کہ تراجم نہیں ہو رہے۔ ترجمہ محنت طلب کام ہے اور اس میں طبع زاد لکھنے سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے جس کے لیے ہمارے آج کے ادیب تیار نہیں ہیں۔ اپنا لکھا ہوا تو وہ بے معاوضہ بھی چھپوانے کے لئے تیار ہیں بلکہ بعض پبلشر کو اپنی گرہ سے رقم دینے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں لیکن کسی کے لکھنے ہوئے پر اپنا نام محض بطور مترجم دیکھنا انہیں پسند نہیں۔ اس طرح ان کی نظر میں ان کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ ہم ادب سے زیادہ اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب یہ ہمارے قومی مزاج کا حصہ بن گیا ہے۔ وہ زمانے گئے جب عنایت اللہ دہلوی جیسے لوگ ترجمہ کرنے میں دلی مسرت حاصل کرتے تھے اور سعادت حسن منٹو نے خود افسانے لکھنے سے پہلے بے شمار روسی اور فرانسیسی افسانوں کے ترجمے کر کے اردو ادب کو مالا مال کر دیا تھا۔ آزادی کے بعد ایک زمانہ ایسا ضرور آیا جب معلوم ہوتا تھا کہ اردو میں ترجموں کا ایک سنہرا دور شروع ہو رہا ہے لیکن یہ دور مختصر ثابت ہوا۔ امریکی پبلشر فر -ینکلن نے اپنی مطبوعات کے ترجمے اچھے اچھے ادیبوں سے کروائے اور انہیں معقول معاوضے دیے۔ "معقول معاوضوں" کا یہ دور ختم ہوا تو ترجموں کی دنیا بھی بے رونق ہو گئی۔ جب سے بھارت میں ہندی کی تعلیم لازمی قرار پائی ہے اور اردو کا پورے کا پورا قابل ذکر سرمایہ دیوناگری رسم الخط میں منتقل کیا جا رہا ہے کبھی کبھار کوئی بھارتی ادیب ہندی سے کوئی افسانہ ترجمہ کر کے ہمیں نواز دیتا ہے یا جرمنی میں مقیم منیر الدین احمد کسی جرمن افسانے کا اردو میں ترجمہ کر دیتے ہیں اور بس۔

۳۔ آپ کے اس سوال کی آخری بات پر آپ سے اختلاف کرتے ہوئے مجھے کہنا ہے کہ یہ غلط خیال ہے کہ پاکستان میں علاقائی زبانوں پر کوئی کام نہیں ہو رہا۔ صورت حال یہ ہے کہ ہر صوبے کی زبان کی سرکاری طور پر بھی پذیرائی ہو رہی ہے۔ ہر علاقائی زبان کی اکیڈمی سرکاری سرپرستی میں قائم ہے۔ مختلف علاقائی زبانوں کے ادیبوں کی کتابوں پر انہیں اکادمی ادبیات کی جانب سے ہر سال ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔ مالی مدد کے طور پر اردو کے ادیبوں کی طرح ان کے لیے بھی ماہوار وظیفے مقرر ہیں۔ پشتو زبان اور ادب پر فارغ بخاری مرحوم اور ان کے بعض ساتھیوں نے خاصا کام کیا ہے۔ سندھ میں شیخ ایاز اور دوسرے سندھی ادیب اپنی مادری زبان کے سلسلہ میں خاصے مستعد ہیں۔ کراچی اور حیدر آباد سے غالباً سندھی رسالے بھی نکلتے ہیں۔ پنجابی میں بھی اس طرح کے کام ہو رہے ہیں۔ کچھ ہی دن ہوئے لاہور سے چھپنے والا ایک سہ ماہی رسالہ "سانجھاں" نظر سے گزرا جو اردو اور پنجابی میں چھپتا ہے۔ مشہور اخبار

"نوائے وقت" کے ادبی ایڈیشن میں بھی اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی حصہ بھی ہے۔ پنجاب یونی ورسٹی میں پنجابی زبان میں ایم۔اے تک کی سہولت میسر ہے۔ (ممکن ہے دوسری زبانوں میں وہاں کی یونیورسٹیوں میں بھی اس طرح کا کوئی تعلیمی سلسلہ ہو) منیر نیازی جیسے شاعر اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی شاعری کر رہے ہیں اور سنا ہے نہ صرف ان کی بلکہ ہمارے بعض دوسرے پنجابی شعرا کی نظمیں بھارت کی پنجاب یونی ورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں۔ پروفیسر انور مسعود بھی ہیں جو یونی ورسٹی میں فارسی پڑھاتے ہیں اور اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اردو میں اچھے شعر کہتے ہیں یا پنجابی میں۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک کے مقتدرۂ قومی زبان اور اکادمی ادبیات کے چیرمین فخرالزماں اردو سے زیادہ پنجابی میں لکھتے ہیں۔ میں پشاور کے ایک شاعر صابر حسین امداد کو جانتا ہوں جو اردو میں شاعری کرتے تھے لیکن اب صرف علاقائی زبان ہندکو میں شاعر کرتے ہیں۔ گجرات کے سلسلے میں میری معلومات کم ہیں۔ تاہم اتنا جانتا ہوں کہ کراچی سے گجراتی میں مرحوم فخر ماتری روزنامہ "ملت" نکالا کرتے تھے۔ ان کے بعد اسے ان کے فرزند انقلاب ماتری چلاتے ہیں۔ خدا کرے اب بھی چلا رہے ہوں۔"

محمود ہاشمی صاحب سے یہ طویل مگر دلچسپ ملاقات خاصی سود مند رہی ہے۔ خصوصاً ہم جیسے اردو زبان و ادب کے طالب علموں کے لیے ان کی فکر و سوچ مزید کئی سوالات کے در وا کرتی ہے۔

MR MAHMOOD HASHMI
44 HOB MOOR ROAD
BIRMINGHAM B10 9BU U.K.

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
(غالب)
مختار زمن
۳ مارچ ۱۹۹۰ء

مختار زمن

کراچی

مجھے یاد نہیں میں نے مختار زمن صاحب کو پہلی بار کب اور کہاں دیکھا۔ کراچی پریس کلب کے کسی اجتماع میں، اے پی پی کے دفتر میں یا ادیبوں کی کسی محفل میں۔ کیونکہ ان کا تعلق صحافت سے بھی رہا اور ادب سے بھی۔ مگر میں نے انہیں جب بھی دیکھا ان کے چہرے پر ایک عجب حسن دیکھا۔ ان کی مسکراہٹ میں ایک سلیقہ پایا اور ان کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تو تھی ہی پھر جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ جناب منشی فیاض علی (مشہور ناول نگار انور اور شمیم) کے داماد ہیں تو یک بہ یک یاد آگیا کہ یہ فیاض علی صاحب کے ناول شمیم کے وہ سانولے سلونے ہیرو ہیں جس نے بہ یک وقت مشرقی اور مغربی دونوں خواتین کے دلوں میں ہلچل مچادی تھی۔ تب سوچا ان سے یہ سوال پوچھوں کہ فیاض صاحب نے آپ کو دیکھ کر تو "شمیم" کا دل موہنے والا کردار نہیں تراشا؟ مگر میری ہمت نہیں پڑی۔ دو وجوہ تھیں۔ ایک تو وہ مجھ سے سینئر (تھوڑے سے سہی) صحافی تھے۔ دوم انہوں نے میری درسگاہ جامعہ کراچی میں اس زمانے میں صحافت پڑھائی تھی جب میں بھی صحافت میں ایم اے کر رہی تھی۔ گو پرائیوٹ طالبہ ہونے کی وجہ سے میں ان کی کلاسوں میں شرکت نہ کر سکی تھی۔ مگر دل ان کو

استاد تسلیم کرتا تھا۔

پھر رفتہ رفتہ میرے استاد میرے ہم عصر بن گئے۔ انہوں نے صحافتی ہڑتال کے زمانے میں مجھے دیکھا ادبی محفلوں میں ان سے گفتگو رہی۔ میں اپنے ماہنامہ روپ کے ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں اسلام آباد گئی تو ان سے کئی موضوعات پر طویل گفتگو کا موقع بھی ملا۔ پھر انہوں نے 2 دسمبر 1983ء کو مجھے اپنی کتاب "دیگر احوال یہ کہ" عنایت کی تو اس پر لکھا دنیائے ادب و صحافت کی دلیر خاتون عزیزی سلطانہ مہر کے لئے..... تو یہ مختصر سی تحریر مجھے جدوجہد کے کئی سبق سکھا گئی۔ پھر انہوں نے مجھ پر مضمون لکھا انہی صحافتی ہڑتالوں کا ذکر تھا جس میں میں نے زور و شور سے حصہ لیا اور ملازمت بھی گنوائی تھی۔

سولہ سال ہو گئے۔ میری بہت سی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ سولہ برسوں میں میری دنیا میں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ بہت کچھ چھوٹا' بہت کچھ ساتھ آیا۔ اور مجھے خوشی ہے کہ جو ساتھ آیا اس میں مختار زمن صاحب کی کتاب "دیگر احوال یہ ہے" اب تک میرے ساتھ ہے۔ وہ اس کتاب کے ساتھ اپنی اس زندگی بخش مسکراہٹ کے ساتھ موجود ہیں جس کی روشنی ان کے اندر بھی جگمگاتی ہے۔ یہی روشنی ان کے قلم سے بھی پھوٹتی ہے اور ایسی تحریروں کی تخلیق کرتی ہے جو ان کے قاری کے مغموم چہروں سے اضطراب سمیٹ کر انہیں تبسم کی کرنوں سے آسودہ کر دیتا ہے۔

تبھی ان کے بارے میں کرنل محمد خان نے لکھا کہ

"کسی تحریر میں دانش کا عنصر ہو تو اس سے روشنی ملتی ہے اور مزاح کی چاشنی بھی ہو تو سرور حاصل ہوتا ہے۔ مختار زمن کے مضامین میں ان دو میں سے ایک چیز ضرور ملتی ہے بلکہ اکثر مقامات پر دونوں یکجا پائی جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے مختار زمن جزوری طور پر یقیناً "دو آتشہ ہیں۔"

میں نے مختار زمن کی دانش کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ وہ دانش نہیں جس کی بنا پر آج کل اکثر لکھنے والے دانشور کہلاتے ہیں۔ بے شک ان کافی ہاؤس کے تربیت یافتہ دانشوروں کی باتیں سنو تو موضوع گفتگو سے ہی لرزہ طاری ہو جاتا ہے لیکن جب ان کی تحریریں پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان بے جان سطور میں نے وہ سرور شور نہ جوش و خروش ہے بلکہ مدعا ہی عنقا ہے۔ بات یہ ہے کہ بات کرنا آسان ہے' بات لکھنا مشکل ہے۔ دانشوری کا یقینی ٹیسٹ تحریر ہی ہے اور مختار زمن اس کا ہر سطر میں تحریری ثبوت دیتے ہیں حالاں کہ انہیں دانشوری کا دعویٰ بھی نہیں۔ شاید مصنوعی دانشوروں کے ہجوم میں اصلی دانشور کی یہی پہچان ہے۔

مزاح مختار زمن کی تحریروں کا بونس ہے جو ان کی خوبصورت تحریر کو خوبصورت تر کر دیتا ہے۔ ان کی عام تحریر کا ذائقہ دنیائے دسترخوان سے ایک مثال لیتے ہوئے میٹھی و مفرح فرنی کی مانند ہے اور جہاں مزاح بھی در آیا ہے وہاں مزا کچھ یوں بڑھ گیا ہے جیسے فرنی پر ورق نقرہ لگا کر کترا ہوا پستہ چھڑک دیا گیا ہو۔ لیکن ایک فرق کے ساتھ مختار زمن کا مزاح خودرو ہے اور تحریر کا جزو بدن بن جاتا

ہے۔ وہ اسے کتر کر علیحدہ چھڑکاؤ نہیں کرتے۔

مختار زمن کی تحریروں میں جہاں شوخی اور حلاوت ہے وہاں حزن و ملال کا ایسا سوز و گداز بھی ہے کہ ایک سیال مادے کی طرح دل کی پنہائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔

اپنی کتاب "دیگر احوال یہ کہ" میں انہوں نے ایک مضمون انشاجی (مرحوم) پر بھی لکھا ہے " انشاے باتیں" دیکھئے تو انہوں نے مضمون کی ابتدا کس طرح کی ہے۔

اس چھ فٹ کے خاک کے پتلے کو جسے لوگ ابن انشا کہتے تھے ہم منوں مٹی کے نیچے دبا کر' ہاتھ جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ مرنے والا مر گیا مگر اس کی یاد تازہ اور اس کی روح زندہ ہے۔ ہم روح کو نہیں دیکھ سکتے مگر سنا ہے روح ہمیں دیکھ سکتی ہے ہم جو اس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ دیکھئے وہ رہی انشا کی روح' وہ کھنچا ہوا قد' کشمش بالوں میں لہریے' گدی پر سے تقریباً" منڈے ہوئے۔ تھا تو شاعر اور دانشور مگر بال ہمیشہ چھوٹے رکھتا تھا۔ دیکھئے وہ سر ہلا رہا ہے۔ باتیں کرتے وقت سر کو ہلکے ہلکے جھٹکے دینا اس کی عادت ہے۔ موٹے تال کی عینک کے پیچھے سے اس کی آنکھیں مسکرا رہی ہیں آیئے پوچھیں تو اس سے کہ آخر راہ فرار کیوں اختیار کی؟"

اور پھر اس مضمون کی آخری سطریں دلوں کو مٹھی میں دبوچ لیتی ہیں۔

لیکن انشاجی ایسا لگتا ہے تم نے تو شب بھر قیام نہ کیا۔ رات تو ابھی بھیگی بھی نہ تھی۔ چاند تو ابھرا بھی نہ تھا۔ چکور تو بولے بھی نہ تھے۔ ابھی تو یہ حالت تھی کہ

آغاز شباب شب ہے پیارے
جانے کا یہ وقت کب ہے پیارے

سو یہ ہیں مختار زمن اپنے دوستوں کی جدائی کا غم یوں بھی سہتے ہیں کہ جب لکھتے ہیں تو پیکر تراش دیتے اس کا اور اس کی تصویر اپنے قاری کے ذہن پر کندہ کر دیتے ہیں۔ ان کا خاندانی نام ہے محمد مختار زمن' پیدائش 21 فروری 1924ء ضلع بجنور کی ہے۔

تعلیم ایم اے (انگریزی) ایل ایل بی الہ آباد یونیورسٹی سے کیا۔

پہلا مضمون شاہد احمد دہلوی کے مشہور رسالہ "ساقی" دہلی میں شائع ہوا۔ اب تک دو سو سے زائد علمی' ادبی اور فکاہیہ موضوعات پر مضامین لکھ چکے ہیں۔

خدمات :- 1940ء کے دوران تحریک پاکستان میں حصہ لیا اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔

آزادی سے دو ماہ پہلے مارننگ نیوز کلکتہ سے صحافتی زندگی کی ابتدا ہوئی اور اگست 1947ء میں ڈھاکہ آ گئے۔ 1949ء میں ریڈیو پاکستان کی نیوز سیکشن کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ 1951ء میں اے پی پی کے سیاسی نامہ نگار کی حیثیت سے کام کیا۔ 1961ء میں لندن گئے اور رائٹر خبر رساں ایجنسی سے 1965ء تک وابستہ رہے۔ واپس آنے کے بعد اے پی پی کے فارن ایڈیٹر ہو گئے۔ 1969ء میں پھر

لندن گئے اور بی بی سی میں خدمات انجام دیں۔ 1972ء میں لندن سے لوٹ کر اے پی پی کے بیورو چیف اور 1981ء سے بہ حیثیت ڈائریکٹر جنرل کام کر رہے ہیں۔

سیر و سفر:- یورپ' امریکہ' مشرق وسطیٰ' افریقہ' جنوب مشرقی ایشیا اور مشرق بعید کے ملکوں کے دورے کئے اور دنیا کے کئی مشاہیر سے ملاقات کے مواقع ملے۔

شادی' سلمیٰ زمن سے ہوئی جو سلمیٰ بنت فیاض علی مرحوم (سابق اٹارنی جنرل مشہور ناول نگار "انور" اور "شمیم" ہیں۔ فرسٹ کلاس ایم اے (انگریزی) اور سرسید گرلز کالج کی پرنسپل ہیں۔ دو صاحبزادیاں ہیں۔

تصانیف:- باتوں کی خربوزے (1973ء) اسٹوڈنٹس رول ان پاکستان (انگریزی- 1978ء) دیگر احوال یہ کہ (1983ء) طلبہ اور تحریک پاکستان (زیر طبع)

اب ان کے سامنے "گفتنی" کا سوالنامہ ہے۔

سوال نمبر2 کے جواب میں فرماتے ہیں۔ بیسویں صدی کے معروف ادیب مولوی ڈپٹی نذیر احمد' محمد حسین آزاد' الطاف حسین حالی' سرسید احمد خان' علامہ محمد اقبال' جوش ملیح آبادی' جگر مراد آبادی' نیاز فتح پوری' منشی پریم چند ہیں۔

فکشن لطیف آرٹ ہے۔ جدیدیت اب بھی باقی ہے۔ یہ ایک تجربہ تھا۔ تجربے ہوتے رہتے ہیں اور بھی ہوں گے۔ تجربوں میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ جدیدیت کے ماتحت افسانے زیادہ چلے نہیں' لہٰذا ختم ہو گئے کچھ اثر ضرور چھوڑ گئے اس لئے کہ ادب کوئی جامد شے نہیں ہے۔

ناول کم لکھے جانے کی کچھ وجوہات یہ ہیں 1- ہمہ وقتی لکھنے والوں کی کمی 2- تجربے اور تجزیے کی کمی 3- سہل نگاری 4- ناول چھپنے شائع ہونے اور قاری تک پہنچنے کا ناقص انتظام جس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ 5- قاری بھی کم اور ان کے پاس وقت بھی کم رسالہ پڑھنے میں وقت کم لگتا ہے اس لئے افسانہ کافی ہے۔ 6- معاشرے میں ناول کا فیشن زیادہ نہیں۔ 7- ناول غور و فکر چاہتا ہے اور تجربہ بھی چاہتا ہے۔ پرانے زمانے میں داستانیں لکھی جاتی تھیں۔ ناول اگلا قدم تھا لیکن داستانوں کا دور بھی ختم ہو گیا جن اور پری کے قصے پرانے ہوئے لیکن ناول کی گو سست رفتاری ہے لیکن ناامید ہونے کی ضرورت نہیں۔

ہر زمانے میں اکثر ادیب روحانی بحران میں مبتلا رہے ہیں۔ ہر زمانے ادیب بہتر زندگی گزارنا چاہتے ہیں لیکن پیٹ کے لئے بھی تو کچھ کرنا ہے۔ یورپ میں تو اب قلم ہی روزی کا ذریعہ بن گیا ہے چونکہ وہاں تعلیم' صنعتی ترقی زیادہ ہے پیشے بھی بہت ہیں۔ یورپ صنعتی دوڑ میں آگے بھی ہے ہم ابھی شروع ہی کی منزل میں ہیں۔ اس لئے ان کے برابر پہنچنے میں مشکلات در پیش ہیں۔ ان کے یہاں تعلیم زیادہ ہے اور انگریزی تو کناڈا' امریکہ' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ' انگلینڈ ہر جگہ ہوتی جاتی ہے۔ بعض افریقی ممالک میں تو یہ اولیت حاصل کر چکی ہے۔ نو آبادیاتی نظام بھی ساتھ رکھنا چاہتے کہ وہ

بنی ادب پر اثر انداز ہوا ہے۔ انگریزی نہ صرف انگریزوں کی وجہ سے بلکہ امریکنوں کی وجہ سے بھی پھیلی۔ دوسری جنگ عظیم اتحادی فتح بھی اہم ہے۔ اس سے انگریزی کا زندہ وچند ہو گیا۔

ادب کوئی امتحان نہیں کہ جس نے پاس کر لیا وہ ادیب بن گیا معیاری ادب وہی سمجھا جاتا ہے جس کو بڑے ادیب "عموماً" معیاری سمجھتے ہیں اور بڑے ادیب وہی ہیں جنہیں ملک بڑا مانتی ہے۔ محنت' تصنیفات' قلم کی قوت' لوگوں کی رائے سب ہی اپنا اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ معیاری ادب کے پیمانے شاعری میں بھی اور نثر میں بھی کوئی لگے بندھے نہیں بلکہ بعض دفعہ تو وقت کے ساتھ بدل بھی جاتے ہیں مثلاً" غالب تک کو شروع شروع میں مشکل اور مضحکہ خیز سمجھا گیا مگر وہی غالب آج صف اول میں اونچے درجے پر نظر آتا ہے۔ وقت کے ساتھ معیار بدل گیا۔ مگر ایک بات کہی جا سکتی ہے۔ ہیرا چاہے کیچڑ میں گر جائے لیکن ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے کہ اس کی چمک دمک لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہے اور پھر وہ اپنی اصلی جگہ پر پہنچ جاتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اردو میں شاعری زیادہ ہے اور نثر کم لکھی جا رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ہے کہ شاعری ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔ ہم نثر بھی لکھتے ہیں تو اس میں شعر آ جاتا ہے۔ یہ کوئی شرمندگی کی بات نہیں۔ آخر مغرب خدانخواستہ کوئی خدا تو نہیں کہ اس کی ہر بات پر امنا صدقنا کیا جائے اور واری صدقے ہوا جائے۔ ہاں مغرب میں اچھی باتیں بھی ہیں۔ مغرب نے ہمیں افسانہ لکھنا سکھایا ہے۔ مغرب سے ہم نے بہت سے اصول تنقید کے بھی لئے اس صدی میں مغرب چھایا ہوا ہے۔ صنعتی و سائنسی ترقی نے مغرب کو بلندی پر پہنچا دیا ہے اس لئے ادب میں بھی مغرب کی بہت سی باتیں اہم ہو گئی ہیں۔ کسی زمانے میں عربوں کی اہمیت تھی۔ اس وقت عربی ہی بلند و بالا تھی۔ دوسرے یہ کہ مغرب خصوصاً" انگلستان ہم پر حکومت کرتا تھا۔ اس لئے مغرب کی ہر چیز قابل توجہ سمجھی جاتی تھی۔ ہم انگریزی کے پرستار تھے۔ جہاں فرانس کی حکومت ہے وہ فرانسیسی کو بلند و بالا سمجھتے تھے مثلاً" ایک مرتبہ میں ویت نام گیا۔ وہاں کی ایک مترجم نے پوچھا کیا تم نے دنیا کے اکثر ملکوں کا سفر کیا ہے؟ میں نے کہا "ہاں" پھر اس نے کہا کہ "تم فرانسیسی تو جانتے نہیں۔ سفر کیسے کرتے ہو؟" اس کے وہاں فرانسیسی کا رعب داب تھا اس لئے ویت نام فرنچ نو آبادی تھی۔ البتہ ہمیں نثر کی طرف بہت توجہ دینی پڑے گی۔ نثر میں مغرب ہر قسم کی کتابیں لکھ رہا ہے ضروری نہیں کہ وہ ادبی ہی ہوں۔ نظم اور شاعری تو اب بہت ہی محدود ہو گئی ہے۔ اٹھارہیں صدی میں مغرب میں شاعری زیادہ تھی۔ اب تو ایسی ہے جیسے آٹے میں نمک۔ ضرورت بھی اس بات کی ہے کہ نثر کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔ آج کی دنیا نثر نگاری کے بل پر آگے بڑھتی ہے شاعری کرنا اور تخیلات کی دنیا میں کھوئے رہنا اب پرانی باتیں سمجھی جاتی ہیں۔ گو اردو میں شاعری اب بھی جاری ہے چاہے کوئی پڑھے یا نہ پڑھے۔ دیوان شائع ہوتے رہتے ہیں۔ گویا شعر کی عادت سی پڑ گئی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اردو کئی زبانوں کا مجموعہ ہے اردو کا اپنا کوئی لفظ نہیں۔ مگر یہ کہنا کہ "انگریزی

الفاظ کی شمولیت سے گریز ہو رہا ہے" کچھ زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ بغیر انگریزی کے ٹکڑا نہیں توڑ سکتے ہیں۔ اگر دس منٹ کی تقریر کریں گے تو اس میں دو تین لفظ انگریزی کے ضرور بولیں گے۔ خالص اردو تو صرف مولوی یا عالم ہی بول سکتے ہیں۔ یہ صحیح کہ انگریزی علمی زبان ہے مگر کوئی قوم خواہ چینی ہو ہندوستانی ہو عرب ہو' ترک ہو اپنی زبان نہیں چھوڑ سکتی چونکہ جس زبان میں گھر میں گفتگو ہوتی ہے اس کی اپنی اہمت ہے اردو جس طرح صرف چند صدیوں میں پھیلی پہلے دہلی پھر لکھنؤ پھر حیدر آباد پھر عرب دنیا اب کینیڈا' یورپ' انگلستان ہر جگہ پہنچ گئی۔ چونکہ اردو بولنے والے ہر جگہ پہنچ گئے کئی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جانے لگی بی بی سی اور دوسری زبانوں سے نشریات بڑھنے لگیں۔ یہ سب اردو کے مثبت نکات ہیں۔ اردو ترقی کر رہی ہے سرکاری سرپرستی کبھی نہ تھی مگر اردو پھلتی پھولتی رہی۔ آج سرکاری بھی حاصل ہو گئی اور پاکستان کی قومی زبان بھی بن گئی۔ دراصل سیاست میں بھی اردو ایک کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اگر مسلمان ہندوستان پر حملہ نہ کرتے تو شاید اردو زبان بھی وجود میں نہ آتی سرکاری کارکن اور سب سے بڑھ کر مبلغ اور صوفیانے زبان کی ترقی میں حصہ لیا۔ اس طرح اردو کی ترقی رکے گی نہیں آگے ہی بڑھے گی۔ اردو ایک جاذب ہے ہر لفظ اور ہر خیال اس میں جذب ہو جاتا ہے۔

میری زندگی میں ایسی کوئی اہم بات تو نہیں ہوئی مگر متنوع باتیں ضرور ہوئیں۔ مثلاً" کوانٹس ایئرلائنس آسٹریلیا نے ایک دفعہ دنیا کے گرد گھومنے اور سفر کرنے کا موقع فراہم کیا۔ میں جرمنی کے ولی براسٹس' انگلستان کے وزیر اور ارچ بشپ کنیٹبر بری سے ملا۔ انگلستان سے اڑ کر امریکہ' پہنچا تو نکسن سے لمبی گفتگو رہی' اٹلی میں مشہور ایکٹریس لولوبر جیڈا سے باتیں کیں' ہندوستان میں پنڈت نہرو اور پاکستان میں صدر ایوب خاں سے بات چیت کی۔ پنڈت نہرو نے کہا کہ انہیں چائے بہت پسند ہے۔ انگلستان کے وزیر صحت چارلس ہل نے کہا کہ صحت پر زور دینا چاہئے اس لئے کہ صحت ہی ترقی کی ضامن ہے۔

جب میں الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو میرے استاد پروفیسر نعیم الرحمن تھے۔ وہ نہایت شفیق اور نہایت لائق اگرچہ عربی' فارسی کے ریڈر تھے لیکن جغرافیہ' تاریخ' علم نجوم' پامسٹری وغیرہ میں بھی ورک رکھتے تھے۔ جب میں یونیورسٹی سے فارغ ہو کر رخصت ہونے گیا تو کہنے لگے "یاد رکھو خوش قسمت وہ ہے جس کا پیشہ بھی وہی ہو جو اس کا شوق ہے۔" یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ چنانچہ میں جرنلسٹ بن گیا' لکھنا پیشہ بھی ہوا اور شوق بھی۔ گو میں جانتا ہوں کہ نہ بڑا ادیب ہوں نہ بڑا صحافی مگر قلبی اطمینان دلی خوشی جو مجھے ہمیشہ حاصل رہی میری بڑی پونجی ہے۔ اس میں میری بیوی کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ایک اور بات جو اکثر دل میں رہتی ہے یہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ تبدیلیاں آتی رہیں۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ جنوبی ایشیا میں آج ہندو حکومت کل علاء الدین خلجی کا دور پھر مغل آئے' انگریز آئے وہاں لباس میں کلچر میں' تہذیب میں' طور طریقوں میں برابر تبدیلیاں آتی

رہیں۔ ہمارے لکڑ دادا ایسے نہ تھے جیسے ہم ہیں اگر تغیر نہ ہو ایک خاندان کے پاس دولت اور اقتدار رہے تو دنیا آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ظلم آج بھی ہوتا ہے مگر اچھے لوگ اب بھی ہیں حالات' بدلتے رہتے ہیں۔ ملکوں کی حدیں گھٹتی بڑھتی رہی ہیں۔ نقشے ایک جیسے نہیں رہتے۔ سرحدیں' سوسائٹیاں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ یونان کے فلسفی کہاں گئے؟ مصر کے فراعنہ کیا ہوئے؟ خود ہماری زندگی میں پہلے برما الگ ہوا' ہندوستان کے دو ٹکڑے ہوئے پھر تین ٹکڑے ہو گئے۔ اگر ایسا نہ ہو تو شاید دنیا میں اتنی دلچسپی نہ رہے۔ قبر کی سی خاموشی لوگوں کو پسند نہیں۔ اور اب تو سائنس نئی دنیا میں اور نئے ستارے دریافت کر رہی ہے سو سال بعد یا ہزار سال بعد کیا ہو گا؟ کون جانے کیا حالات ہوں گے۔ لیکن یہ سب کون کرتا ہے؟ کائنات کو دیکھ کر خدا کی ہستی پر یقین کامل ہو گیا۔

ہاں اردو ادب میں تنقید کم ہے۔ "ازم" بھی آنے جانے والی باتیں ہیں۔ البتہ اکثر "ازم" کچھ نہ کچھ اثر ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔ کمیونزم لڑکھڑا گیا لیکن مزدوروں کو اہمیت تو حاصل ہو ہی گئی۔ بے شک اردو زبان کے سامنے بہت سی مشکلات ہیں گھر گھر انگریزی ادارے کھل رہے ہیں۔ انگریزی کے الفاظ ضرورت سے زیادہ استعمال ہونے لگے ہیں مگر جب تک پاکستان قائم ہے' اردو اس کی قومی زبان ہے' چولا بدلنے کے باوجود اردو بھی قائم رہے گی۔ اردو کو نقصان تو بہت سی باتوں سے پہنچ رہا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ کیا اردو میں نقصان برداشت کرنے کی قوت موجود ہے؟ کیا اردو کے بازوؤں میں دم ہے؟ کیا اردو کا حشر بھی پالی مشین کا سا ہو گا؟ میں سمجھتا ہوں کہ اگر پاکستان قائم رہتا ہے اگر اردو قومی زبان رہتی ہے۔ اگر جمہوریت پنپتی ہے تو اردو بھی قائم رہے گی چونکہ یہ سیاست داں کی بھی ضرورت ہے' صنعت کار کی بھی اور عام آدمی کی بھی۔ مثلاً" کوئی سندھی سیاست داں' پنجاب میں سندھی میں تقریر نہیں کر سکتا کوئی پنجابی اپنی زباں میں بلوچستان میں تو نہیں بول سکتا اور کوئی سرحدی پنجاب میں پشتو میں لوگوں سے بات نہیں کر سکتا۔ اردو اس ملک کو قائم رکھتی ہے سیاست دانوں کو زباں عطا کرتی ہے۔ یہ وہ زمانہ نہیں کہ فارسی بولنے والا نادر شاہ یا مغل اپنی حکومت قائم کر لیں۔ زور بازو اہم لیکن جمہورت کے زمانے میں عوام کی بات سمجھنا اور سمجھانا اہم تر ہے۔ علاوہ ازیں اب قوم پرستی کا دور دورہ ہے کسی کو بلاوجہ ہمیشہ ڈرانا' دبانا ممکن نہیں۔ اس لئے بہتر ہو گا کہ علاقائی زبانوں کو بھی اردو کے شانہ بشانہ ترقی دی جائے

MR MUKHTAR ZAMAN
1/2 4-F NAZIMABAD, KARACHI
PAKISTAN

آپ کا بھائی

قاضی مشتاق احمد

قاضی مشتاق احمد

پونے۔ ہندوستان

ڈھاکہ بنگلہ دیش کے ادیب ارمان شمسی کے تعارف میں جیلانی بانو کے حوالے سے میں نے لکھا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے افسانے میں کیا فرق وہ محسوس کرتی ہیں۔ قاضی مشتاق کے اس مضمون میں وہ فرق نمایاں ہیں۔ ان سے ممبئی کے روزنامہ انقلاب کے مرتب ندیم صدیقی نے پوچھا تھا کہ آپ کیوں لکھتے ہیں؟ اس کا جواب قاضی مشتاق احمد نے جو دیا ہے وہ آپ پڑھیں گے تو نمایاں بات جو محسوس ہوگی وہ یہ کہ ہندوستان کا ادیب ہندی الفاظ کا استعمال گاہے بگاہے کرتا ہے اور تشبیہ و تلمیح کے لیے ہندوستانی داستانوں سے کردار لیتا ہے جیسے "میرا بائی" ۔جب کہ پاکستانی ادیب شاذ ہی میرا بائی کا حوالہ دے گا۔

تو لیجیے مشتاق احمد کا جواب پڑھیے کہ وہ کیوں لکھتے ہیں۔

یہ سوال ایسا ہے جیسے کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں سانس کیوں لیتا ہوں؟ میرا جواب ہوگا "زندہ رہنے کے لیے۔" میرے لیے لکھنا' سانس کی طرح ضروری ہے۔ اگر لکھا نہیں تو جی نہیں پاؤں گا۔ مجھے تو یہ یاد بھی نہیں کہ میں کب سے لکھ رہا ہوں' بس اتنا یاد ہے کہ جب سے

لکھنا سیکھا ہے لکھ رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں' سن رہا ہوں' محسوس کر رہا ہوں اسے لکھنا چاہیے۔ واقعات' اتفاقات' حادثات' فسادات لکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ راہ چلتے لوگ مجھ سے مخاب ہیں کہ "ہم پر کچھ لکھو" میں انہیں غور سے دیکھتا ہوں' پرکھتا ہوں اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ سب آدمی ضرور ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہر آدمی انسان بھی ہو۔ ہر انسان کے دو چہرے ہوتے ہیں ایک اصلی دوسرا نقلی۔ اس کے کھانے کے دانت اور ہوتے ہیں دکھانے کے اور۔ انسان کے روپ میں کچھ اژدہے بھی ہوتے ہیں جو اپنے دوست کو بھی بغیر ڈکار لیے نگل لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے جان دینے والے پل بھر میں ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ان آنکھوں نے کیا کیا نہیں دیکھا؟ وہ بھی دیکھا جو دیکھنا نہیں چاہیے تھا۔ انسان اگر اپنی آنکھیں کھلی رکھے اور دل کے دروازے بند نہ کرے تو وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے' سب کچھ محسوس کر سکتا ہے۔ دیکھنا اور محسوس کرنا تو خیر ایک عام بات ہے لیکن ان کے بارے میں کچھ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ اچھائیوں کے پہلو میں برائیاں نظر آتی ہیں۔ قلم سے لکھے ہوئے الفاظ اور کمان سے نکلے ہوئے تیر واپس نہیں لیے جاسکتے۔ شبد (الفاظ) شستر (ہتھیار) ہوتے ہیں۔ ان سے دل جوڑے بھی جاتے ہیں توڑے بھی جاتے ہیں۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ حقیقت کو برداشت نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ تلخ زیادہ ہوتی ہیں شیریں کم۔ ماں یہ جانتی ہے کہ کڑوی کسیلی دوائیں زبردستی پلانا اس کے بچے کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ وہ اپنے روتے پیٹتے لاڈلے کو زبردستی کڑوی دوائیں پلاتی ہے۔ لکھنے والا بھی سماج کا ایک، ذمہ دار فرد ہے۔ وہ بھی ماں کی طرح کڑوی کسیلی دوائیں پلانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ سقراط کے انجام سے واقف ہے' میرا بائی کے انجام سے واقف ہے کہ ان دونوں کو حقیقت بیان کرنے کے جرم میں زہر پینے کی سزا دی گئی تھی۔ میں کونین کو شکرپاروں میں لپیٹ کر پیش کرتا ہوں اس لیے مجھے آج تک کوئی سزا نہیں ملی۔ آنکھوں دیکھا حال اگر جوں کا توں بیان کردوں تو وہ کسی پولیس حولدار کی لکھی ہوئی ایف۔ آئی۔ آر (فرسٹ انفریشن رپورٹ) بن جائے اس لیے میں تھوڑی سی مرچ تھوڑا سا مصالحہ استعمال کرتا ہوں۔ اس لیے تلخ سے تلخ حقیقت پڑھنے والے خوشی خوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ میں نے اپنے قلم کو کبھی تلوار نہیں بنایا۔ تلوار بازی کے کرتب تو سرکس کے جوکر بھی دکھا سکتے ہیں۔ اگر میرا قلم تلوار بھی بن جائے تو میں سر کاٹنے کے بجائے اس کی تیز دھار سے ہیرے تراشوں گا۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ وہ ہیرا کسی کے سر کے تاج کی زینت بنے۔ "کوہ نور" یعنی روشنی کا پہاڑ بنے جس کی روشنی میں بھٹکے ہوئے مسافر اپنی منزل تلاش کر سکیں۔ باتوں باتوں میں اگر کام کی بات ہو جائے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ "مقصدیت" کا الزام لگے گا دیوانگی کا نہیں کیوں کے بے مقصد باتیں یا تو دیوانے کرتے ہیں یا نام نہاد دانشور۔ میرا تعلق اس قبیل سے نہیں اس لیے بس میں لکھتا چلا

جا رہا ہوں۔ دل بہلاتے بہلاتے بھٹکے ہوئے مسافروں کو سیدھا راستہ دکھانے کے لیے میں لکھ رہا ہوں۔ ”فکر معاش‘ یادِ بتاں‘ وقت رفتگاں“ اتنی سی عمر میں بھلا انسان کیا کرے؟ عمر مختصر ہے لیکن مقصد کا سفر طویل۔ میں یہ سفر طے کروں گا۔ قلم کو قندیل بنا کر اندھیری رہ گزر پر چلتا رہوں گا‘ لکھتا رہوں گا جب تک ہاتھوں میں جنبش ہے اور آنکھوں میں دم ہے۔“

قاضی مشتاق احمد نے اب تک ڈھائی سو سے زیادہ کہانیاں لکھی ہیں جو ہندوستان کے موثر جرائد یعنی شمع‘ بیسویں صدی‘ آج کل‘ اسباق‘ توازن وغیرہ میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کے چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ (۱) نصیحت کی خوشبو (۲) درد کی زبان (۳) قطرہ قطرہ (۴) ایک ہی راستہ۔

ان کے مشہور ناول ہیں۔ (۱) فٹ پاتھ کی رانی (۲) شہزادہ (۳) آزادی (۴) سہمی ہوئی بہار۔ ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے‘ایک اور سپر اسٹار عنوان ہے۔

انہیں مہاراشٹر اردو اکیڈمی نے ناول فٹ پاتھ کی رانی اور شہزادہ پر انعامات سے نوازا۔ ماہنامہ اسباق پونہ‘ گلہائے خنداں‘ رامپور‘ گونج نظام آباد نے ان کے لیے خصوصی نمبر شائع کیے۔

میں نے پوچھا۔ قاضی صاحب اپنے بارے میں کچھ بتایئے گا؟ میرے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔

”میرا پورا نام قاضی مشتاق احمد ابن الحاج میر چاہت علی ہے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۴۰ء کو ہندوستان کی ریاست مہاراشٹر کے ایک شہر جلگاؤں میں پیدا ہوا۔ پرائمری سے کالج تک کی تعلیم جلگاؤں میں حاصل کی۔ بی۔اے کی ڈگری پونہ یونیورسٹی سے معاشیات اور سیاسیات کے ساتھ حاصل کی۔ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بمبئی گیا۔ اس دوران مہاراشٹر پبلک سروس کے مقابلاتی امتحان میں حصہ لے کر کامیابی حاصل کی۔ مہاراشٹر سول سروس میں شریک ہو کر ۲۴ سال کی عمر میں بحیثیت تحصیلدار اور پھر بتدریج ڈپٹی کلکٹر اور ایڈیشنل کلکٹر کی خدمات انجام دیں۔ ۳۱ مارچ ۱۹۹۸ء کو ریٹائر ہو کر اب پونہ میں سکونت پذیر ہوں۔

میرے مطالعہ کے مطابق اردو ادب کی تاریخ میں موجود رہ جانے والے چند نام یہ ہیں۔ کرشن چندر‘ راجندر سنگھ بیدی‘ عصمت چغتائی‘ سعادت حسن منٹو اور قرۃ العین حیدر۔

آپ نے پوچھا ہے ”فکشن ایک لطیف آرٹ ہے۔ جدیدیت نے اس آرٹ کی لطافت اور اس کے حسن کو نکھارا یا سنوارا ہے یا اسے مجروح کیا ہے؟“

میرا جواب ہے ”مجروح کیا ہے۔ کسی خوب صورت چہرے پر بے حساب غازہ تھوپ دیا جائے تو اس چہرے کی خوبصورتی میں اضافہ ہونے کے بجائے وہ بدصورت ہو جاتا ہے۔ جدیدیت کے نام پر فکشن سے پہلے تو قصہ غائب ہوا پھر ”پلاٹ“ بھی غائب ہو گیا۔

جانداروں کی بجائے میزوں، کرسیوں، دیوان خانوں کو اہمیت دی جانے لگی اور فکشن کا حلیہ ہی تبدیل ہو گیا۔ بقول باقر مہدی "اردو زبان و ادب پر کسی نہ کسی کا اثر ضرور رہا تھا اور یہ تو اتنی سخت جان ہے کہ قریب المرگ ہونے کے باوجود زندہ ہے۔"

"Nothing
is more academic than modernism made frigid"

(جدیدیت کو سرد بنانے سے زیادہ کوئی اور درسی فعل نہیں ہے)

سوال نمبر ۴ کے جواب میں عرض ہے کہ "اردو پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی جا رہی ہے۔ مشرقی ہندوستان میں اردو کی بجائے ہندی کا زور ہے۔ آج سے ۱۵ سال پہلے گلشن نندہ کے ناول لاکھوں کی تعداد میں چھپ جاتے تھے۔ اور پاکٹ بکس میں ۵ ہزار کا ایڈیشن آسانی سے بک جاتا تھا۔ اب چار سو کا ایڈیشن بھی بمشکل بکتا ہے۔ مشہور پبلیشنگ ہاؤس نے اپنی طرف سے ناول چھاپنا بند کر دیا ہے۔ اکادمی اور دیگر اداروں کی مالی اعانت سے ناول چھپ ضرور جاتے ہیں بکتے نہیں۔ دلی کے ایک نامور ادارے نے مجھے بتایا کہ انہوں نے پرانے ناولوں کا ایک بڑا ذخیرہ خریداروں کے فقدان کی وجہ سے ردی میں کیلو کے حساب سے فروخت کر دیا۔ ان حالات میں نئے ناول شائع کرنے کا رسک کون لے گا؟

میری معلومات کے مطابق آج کے ادیب کے مختلف بحران میں مبتلا ہونے کی سب سے بڑی وجہ ہے بے قدری۔ اردو میں تو "پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں" کا عالم ہے۔ ادیبوں کو اپنے خون دل سے لکھی ہوئی تحریر پر نہ داد ملتی ہے نہ دام۔ بڑے بڑے رسائل نے معاوضہ دینا بند کر دیا ہے۔ خالی پیٹ نئی نئی سوجھے گی تو کیسے؟ فلم اور ٹی وی پر بھی پیشہ ور ادیبوں کا قبضہ ہے۔ کسی نئے لکھنے والے کے لیے وہاں کے راستے بھی بند ہیں۔ اسے "گھوسٹ رائیٹنگ" کے علاوہ اور کوئی چانس نہیں ملتا۔ ایک زمانے میں قلمی ناموں سے جاسوسی ناول نگاری میں پیسہ مل جاتا تھا اب یہ بھی ممکن نہیں۔ ادیب "جائے تو جائے کہاں؟ کی فکر میں ہے ادھر ظاہر ہے کہ ذہنی نفسیاتی اور روحانی بحران میں مبتلا ہے۔ بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے اعلیٰ تعلیم اور اپنے اپنے پیشے میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہے۔ ادب کم از کم اردو میں روٹی اور روزی کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ ادیبوں کو اس سلسلہ میں مناسب رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ادبی انجمنیں، ورک شاپ اور سیمیناروں کا اہتمام کریں۔ ادبا اردو کمپیوٹر میں مہارت حاصل کر کے اسے اپنی روزی کا ذریعہ بھی بنا سکتے ہیں۔ درسی اور علمی کتابوں کے لیے اس کی ضرورت ہے۔

میرے نزدیک "پڑھنے والوں کی پسند" معیاری ادب کا صحیح پیمانہ ہے۔ شاعری ہو یا نثر جو سیدھی دل میں اتر جائے وہی معیاری تخلیق ہے۔ کوئی بھی ذی ہوش قاری عامیانہ، سطحی تخلیق

کو پسند نہیں کرتا۔ ہم جن کے لیے لکھتے ہوں وہ اسے قبول کرلیں تو پھر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ لکھنے والے نے معیار کو برقرار رکھا۔ آسان زبان میں معیاری ادب وہ ہے جو غیر معیاری نہ ہو۔

سوال نمبرے کے جواب میں کہوں گا کہ شاعری Instant شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اردو میں "مشاعرہ کلچر" موجود ہے۔ مشاعروں کے ذریعے شاعر کو عوام کے سامنے اپنا فن پیش کرنے کے مواقع ملتے ہیں جب کہ نثر نگاروں کے لیے مواقع کم ہیں۔ وہ لکھ لیں تو اسے چھاپے گا کون اور چھپ بھی جائے تو پڑھے گا کون؟ اس کشمکش میں مبتلا ہونے کی بجائے شاعری کی شاہراہ پر نکل پڑنا قدرے آسان ہے۔ نثر کا میدان سنگلاخ اور سفر دشوار گزار رہے۔ کانٹوں سے الجھنے کی بجائے گلوں سے یاری میں ہی سمجھداری ہے اور پھر شاعری کے ذریعے گل رخوں تک رسائی بھی ممکن ہے۔ ساحر اور مجاز کی شاعری پر نثار ہونے والے اور والیاں بہت تھیں آج تک یہ نہیں سنا کہ کرشن چندر' بیدی یا منٹو کی تحریر پڑھ کر کسی نے کپڑے پھاڑ دیے۔

میرے خیال میں اردو زبان کے دروازے ہر زبان کے لیے کھلے ہیں۔ انگریزی کے بہت سے الفاظ تو نامعلوم طریقے سے اردو میں شامل ہو چکے ہیں یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہے کہ وہ اردو کا حصہ کیسے بن گئے؟ مثلاً" پلیٹ فارم' کیس' وارننگ' سگنل' میٹر' میٹر' لیکچرار' میوزیم' آڈیٹوریم' اکیڈمی' کمیٹی' سرٹیفکیٹ' ڈگری' ٹیلی گرام' اسٹیشن' اردو والوں نے بلا ضرورت ان کے متبادل الفاظ لانے کی کوشش بھی نہیں کی جیسے کہ ہندی میں اسٹیشن کے لیے "بھپ بھپ اڈہ" ۔ اردو بازار کی زبان ہے اور بازار کی زبان میں کسی دوسری زبان کے الفاظ کی شمولیت سے گریز ممکن نہیں۔ مغرب میں رہ کر اردو کی خدمت کرنے والے ادبا اپنی تحریروں میں انگریزی الفاظ کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور کسی نے کبھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

میری زندگی کا یہ واقعہ یادگار ہے۔ ایک بار بمبئی جاتے ہوئے کھنڈالہ گھاٹ میں میری سرکاری جیپ کا بریک ڈھلان پر فیل ہو گیا۔ اگر گاڑی ایک مٹی کے ڈھیر سے ٹکرا کر رک نہ جاتی تو شاید میں اور ڈرائیور میلوں گہری وادی میں گم ہو جاتے اور ہمارا پتہ تک نہ چلتا۔ پتہ نہیں کون سی نیکی کام آگئی۔

تنقید سے متعلق آخری سوال کے جواب میں عرض ہے کہ گوپی چند نارنگ نے لکھا کہ "تنقید کا کام قاری کو مرعوب کرنا یا اس پر سوچ کے دروازے بند کرنا نہیں بلکہ افہام و تفہیم میں مدد دینا اور سوچ کے دروازے کھولنا ہے۔"

بدقسمتی سے تنقید نگاروں نے قاری کی گتھی سلجھانے کی بجائے اسے الجھانے کا راستہ اختیار کیا ہے۔ خود تنقید نگار مختلف خانوں میں بٹ گئے ہیں۔ لوگوں نے تو غالب کے بھی پرخچے

اڑا دیے تھے۔ فراق کے بارے میں کہا تھا "وہ شاعر کم مشہور زیادہ ہیں۔" علی سردار جعفری کو شمس الرحمٰن فاروقی شاعر ہی تسلیم نہیں کرتے حالاں کہ انہیں ۱۹۹۷ء میں گراں قدر گیان پیٹھ ایوارڈ مل چکا ہے۔ فراق کو بھی ملا تھا اور قرۃالعین حیدر کی زبان کو "اینگلو انڈین" کہہ کر مذاق اڑایا گیا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا خیال ہے کہ جعفری کی شاعری "ادب اور فن کے تخلیقی اور جمالیاتی معیار پر معمولی یا اوسط کی سطح سے بلند نہیں ہو پاتی۔"

"تنقید برائے تنقید" کے عمل سے نہ عملی نہ نظریاتی ترقی ہو رہی ہے۔ اب رہا "ازم" والوں کا طریقہ کار۔ ان کی نظر میں ان کے خیالات سے متفق نہ ہونے والا ان کا دشمن ہوتا ہے اور وہ اسے پڑھنے والوں کی نظر سے گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اردو میں تراجم کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ترجمہ نگار کو کبھی برابری کا درجہ نہیں ملا اس لیے پیشہ ور یا لفظی ترجمہ نگاروں نے یہ میدان سنبھال لیا ہے اس لیے بھی تراجم اپنا رنگ نہ جما سکے اور اردو کا دامن دوسری زبانوں کے جواہر پاروں سے خالی ہی رہا۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہاں علاقائی زبانوں پر بھی توجہ دی جاتی ہے بلکہ بنگالی۔ ملیالم، کنڑ اور مراٹھی زبان کا ادب بہت مالا مال ہے۔ علاقائی زبانوں کے ادبا کو بھی ملک کے سب سے بڑے ادبی انعام گیان پیٹھ ایوارڈ سے بھی نوازا جاتا ہے۔ کسما گرج (مراٹھی) ڈاکٹر نارائین ریڈی (تیلگو) گریش کرناڈ (کنڑ) اس کی حالیہ مثالیں ہیں۔ اردو میں فراق اور علی سردار جعفری کو گیان پیٹھ ایوارڈ دے کر اردو زبان کو بھی قبولیت و مقبولیت کی سند دی گئی ہے۔"

MR. KAZI MUSHTAQUE AHMED
B/6, RAY-VENUE SOCIETY,
I.C.S. COLONY, GANESH KHIND,
PUNE-400 007 INDIA

کہ دو مجھے واسطے کہ قربتیں وہ صحبتیں

جلا دیے تھے ماہتاب کے جو میرے پیرہن بنے

مصطفیٰ کریم

۳۰ / مئی ۹۹

ڈاکٹر مصطفیٰ کریم
لندن

جنہوں نے ڈاکٹر مصطفیٰ کریم کو پڑھا ہے وہ ہماری اس بات کی تائید کریں گے کہ تعلقات عامہ کی کمی کے باوجود ڈاکٹر مصطفیٰ کریم کا نام اردو ادب میں زندہ رہ جانے والے ناموں میں سے ایک ہے۔

ان کی کتابیں گرم دن (ناولٹ) گگلہ (افسانوں کا مجموعہ) "روشن خیالی کی فکری اساس" (کائنات اور انسان کا ارتقا جدید سائنس کی روشنی میں) اور ڈاکٹر بینرجی کی سیاسی تباہی (ناول) کے بعد ۱۹۹۸ء میں شائع ہونے والا افسانوی مجموعہ "دو شاخیں لچکتی ہوئی" کی اشاعت کے باوجود ادبی رسالوں میں ان کے نام کا شور و غوغا دکھائی نہیں دیتا۔ ان کے لئے شامیں منعقد نہیں ہوتیں۔ ان کی کتابیں ایوارڈ کی نامزدگی کی فہرست میں نہیں آتیں کیونکہ ان کی "ادبی P.R" نہیں ہے۔ یہ ہمارا المیہ اور ہماری بد قسمتی نہیں تو کیا ہے۔ ہم ان زندہ لوگوں کے قدردان نہیں جو خاموشی سے اپنی زبان اردو اور ادب کے سرمایہ میں اضافہ کر رہے ہیں۔

مجھے لندن کی نامور افسانہ نگار محترمہ صفیہ صدیقی نے ڈاکٹر مصطفیٰ کریم کا پتہ دیا۔ میں نے

انہیں سوالنامہ بھیجا انہوں نے جواب کے ساتھ اپنی کتاب بھی مجھے بھیجی۔ میں نے لکھا آپ پر لکھے گئے مضامین کی فوٹو کاپی بھی بھجوایئے۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب میں لکھا:

"میرے فن پر لکھے گئے مضامین صرف تین ہیں۔ ان میں سے دو اب میرے پاس نہیں رہے۔ یہ چونکہ میری فرمائش یا استدعا پر نہیں لکھے گئے اس لئے شاید ان کی کچھ اہمیت ہے۔ تین یا چار تبصرے انگریزی میں ہیں جو میری اردو تخلیقات پر ہیں۔ آپ پوچھ سکتی ہیں کہ اتنے سارے تبصرے انگریزی میں کیوں ہیں! اس کی وجہ اگر آپ جنگ اخبار اور نیوز اخبار کا مقابلہ کریں تو سمجھ میں آجائیگی۔ سنجیدہ ادیب کو معتبر رائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی ادبی رسالے میں مجھ پر کوئی تبصرہ نہیں ہے سوائے "ابلاغ" پشاور کے۔ اس کے لئے مدیر سے دوستی اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرنا شرائط ہیں۔"

یہ پڑھ کر میرا جی کٹ کٹ گیا۔ غالب سے لے کر آج تک اردو ادیب و شاعر کو ناقدین سے شکایت رہی ہے۔ محمد حسین آزاد نے بہت زور مارا کہ اپنے استاد ذوق کو مشہور کرا دیں۔ مگر نصف صدی کے بعد بھی جسے مشہور ہونا تھا اور لوگوں کو جسے تسلیم کرنا تھا اس کی تحریر نے وہ کام کیا ہی کیا... ڈاکٹر مصطفےٰ کریم کو بھی 'وقت' کا انتظار کرنا ہے۔"

ناروے میں رہنے والے ادیب و نقاد سعید انجم نے لکھا ہے کہ مصطفیٰ کریم ایسے موضوعات پر افسانہ نہیں لکھتے۔ جو آئس کریم کی طرح منہ میں گھل جائے یا درجہ حرارت بڑھتے ہی پگھل جائے۔ وہ ایسے احساسات کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں جن کے بارے میں ہم عام طور پر بات کرنے سے ڈرتے ہیں۔ ان کے ہاں ایسی سچائیوں کا انکشاف ملتا ہے جن کو ہم صرف اپنے آپ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔"

ڈاکٹر انور سدید کی رائے ملاحظہ ہو۔

"اردو کے غیر ملکی دیاروں سے جو افسانہ نگار تھوڑے عرصے میں مقام امتیاز کو پہنچے ہیں ان میں مصطفےٰ کریم کو اہمیت حاصل ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ مغرب میں آباد ہو جانے والے ایشیائی باشندوں کے مسائل پر حقیقت افروز افسانے لکھتے ہیں اور مشرق کے قاری کو موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ یورپ کی چکاچوند سے ابھرنے والی ایشیائی چیخوں کو سن لے۔"

اب آپ کو میں ڈاکٹر مصطفیٰ کریم سے ملا دوں تو کیا حرج ہے؟

ان کا پیدائشی اور قلمی نام یہی ہے۔

۱۹۳۲ء میں شہر گیا (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی شہر ہے جہاں قبل مسیح گوتم بدھ کو گیان ملا تھا۔ چار سال کے تھے کہ والد سید فدا کریم کا انتقال ہو گیا۔ نانا قاضی علیم الدین نے ان کی اور ان کے بھائی بہنوں کی پرورش کی۔ ابتدائی تعلیم پٹنہ یا عظیم آباد میں حاصل کرنے کے بعد الہ آباد چلے گئے۔ وہاں سے انٹرمیڈیٹ اور پھر علی گڑھ سے بی ایس سی کرنے کے بعد

ڈھاکہ گئے جہاں سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لی۔ اس کے بعد چار سال تک فوج میں نوکری کی۔ اس دوران شادی ہو گئی۔ فوج کی کمیشن سے استعفیٰ دینے کے بعد انگلینڈ چلے آئے اور وہیں سے ایف آر سی ایس کیا۔ ۱۹۶۸ء میں دل کا روگ لگا بیٹھے۔ (یہ دل کا روگ شاعری والا نہیں تھا) چنانچہ مستقل طور پر لندن میں رہ جانے کا فیصلہ کیا۔ اب زندگی کی مصروفیتوں کو نئے سرے سے ترتیب دینے کا موقع آیا۔ لکھنے کی فرصت ملی چنانچہ لکھتے چلے گئے۔ ان کی تخلیقات ہند و پاک کے تمام ادبی رسالوں میں شائع ہوئیں۔ سیدہ حنا کے سہ ماہی "ابلاغ" پشاور میں ان کا ادبی گوشہ شائع ہوا۔ "ان کا کہنا ہے بیسویں صدی میں جو ادیب زندہ رہ جائیں گے اور جن کا نام اکیسویں صدی میں بھی لیا جائے گا وہ میرے خیال میں حسب ذیل ہیں۔ شعراء میں فیض' سردار جعفری۔ اخترالایمان' میراجی ۔ن ۔م۔ راشد' اور یقیناً" اقبال۔ فراق اور جوش بھی شاید اکیسویں صدی میں زندہ رہ جائیں۔ تنقید میں شمس الرحمن فاروقی وزیر آغا اور احتشام حسین۔ ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر جب کہ افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی۔ منٹو۔ کرشن چندر۔ عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی۔ رپورتاژ میں محمود ہاشمی ہیں۔

۳۔ ان کے خیال میں اردو میں جدیدیت کو جن ادیبوں نے اپنایا ان میں نہ تو علم تھا اور نہ ہی انہوں نے کسی نادر فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا تھا جو ان کی جدیدیت کی بنیاد بنتا۔ "نتیجتاً" اس کھوکھلی جدیدیت سے اردو فکشن کو غیر معمولی نقصان پہنچا ہے۔

اردو فکشن کے قاری بہت کم ہیں۔ ناول لکھنے کے لئے جس تحقیق' محنت اور لگن کی ضرورت ہے وہ اردو ادیبوں میں نہیں ہے' نیز اسے اس کا بھی خوف رہتا ہے کہ شاید اس محنت کے بعد مدتوں اس کی کتاب نہ بکے۔

۴۔ کہتے ہیں سنجیدہ ادیب ہمیشہ مادی' نفسیاتی' ذہنی اور روحانی الجھنوں میں گرفتار رہا ہے ان سے نجات ممکن نہیں۔ اس لئے رہنمائی کا سوال ہی نہیں اٹھتا ہے۔

۵۔ اور جناب خواہ شاعری ہو یا نثر وہ اسی وقت معیاری ہوتی ہے جب وہ دل پر اثر کرتی ہے اور اس اثر کا دیرپا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لئے بڑے عنوانات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اور موزوں اسلوب بھی منتخب کرنا پڑتا ہے۔

۶۔ ہندوستان' پاکستان یا اس سے باہر' تمام ملکوں میں شاعری کے مقابلے میں نثر کم لکھی جا رہی ہے۔ بقول سبط حسن مرحوم کہ اردو دنیا کی آدھی آبادی شاعر ہے۔ اس کی وجہ صدیوں پرانی ادبی تاریخ ہے۔ جس میں صرف شاعری کو ہی اہمیت دی گئی۔

۷۔ اردو کے سلسلے میں انہوں نے کہا اردو کا رشتہ ان زبانوں سے ہے جن کے درمیان یہ پھلتی پھولتی رہی ہے۔ ان ہی سے نئے الفاظ اردو میں آئینگے۔ ہزاروں میل دور بولنے والی انگریزی سے نئے الفاظ لینا اردو کے لئے ممکن نہیں۔ ایسا انگریزی زبان میں بھی نہیں ہوا ہے۔

اس زبان میں فارسی، عربی، چینی یا جاپانی زبان کے الفاظ برائے نام ہیں۔"

اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ سناتے ہوئے انہوں نے کہا "میرے فائنل ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کے وائی وا امتحان سے ایک دن پہلے میں شام کے وقت گورکی کا مشہور ڈرامہ دشمن (Enemy) دیکھنے گیا ہوا تھا۔ اسے رائل شیکسپیرین کمپنی نے پیش کیا تھا۔ ہر لحاظ سے یہ پیشکش عظیم تھی۔ میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ رات میں دیر تک اس کی بابت سوچتا رہا۔ دوسرے دن صبح میں جب امتحان دینے پہنچا تو اسی کی سوچ میں محو تھا۔ میرا رول نمبر پکارا گیا۔ لیکن مجھے کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔ جب کمرا خالی ہو گیا تو مجھے ہوش آیا اور میں نے پورٹر سے اپنے رول نمبر کی بابت دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ مجھے پکار چکا ہے اور اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ مجھے امتحان دینے کی اجازت ملی لیکن میں کامیاب نہیں ہوا۔ لیکن اس ڈرامے کا تاثر اب بھی یاد ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ نے بڑے دکھ سے کہا کہ

۸۔ "اردو ادب کی اب کوئی وقعت نہیں رہی۔ اس کی وجوہ میں "فنون اور ماہنامہ قومی زبان" کراچی میں لکھ چکا ہوں۔ اس لئے اردو ادب کے مختار بھی برائے نام اور غیر اہم ہو گئے ہیں۔ اس وقت شمس الرحمن فاروقی اور گوپی چند نارنگ کے نام ذہن میں آتے ہیں۔ شہزاد منظر مرحوم کو بھی یاد کرنا ضروری ہے۔"

چلتے چلتے محترم علی احمد فاطمی کا لکھا ایک سیر حاصل تبصرہ آپ کی خدمت میں پیش کردوں تو مناسب ہو گا کہ یہ ڈاکٹر مصطفیٰ کریم کے ناول "ڈاکٹر بنرجی کی سیاسی تباہی" پر لکھا گیا ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر مصطفیٰ کریم مغرب میں اقامت پذیر اردو کے معروف و ممتاز تخلیق کار اور دانشور ہیں۔ وہ بہ یک وقت تنقید اور تخلیق دونوں میں ہی دسترس رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر بنرجی کی سیاسی تباہی ان کا وہ طویل افسانہ ہے جو کبھی ابلاغ میں چھپا تھا اور جو بعد میں ناول کی شکل میں "ارتقا" میں شائع ہوا۔ گیارہ ابواب اور ۱۱۸ صفحات کو سمیٹے ہوئے یہ ناول سب سے پہلے صنوبر شاہ اور ڈاکٹر بنرجی جیسے کرداروں کے ذریعہ شروع ہوتا ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی زندگیاں ہیں اور اپنے اپنے سفر۔ اس سفر کے درمیان بڑے دلچسپ قسم کے واقعات اور افراد آتے ہیں۔ غلام رسول حلال میٹ شاپ کا مالک ہے اور اپنے پیر صنوبر شاہ کے تئیں بڑی عقیدت رکھتا ہے۔ صنوبر شاہ پیٹ کے مریض ہیں ابتدا وہ اپنے مرید غلام رسول کے ذریعے ڈاکٹر بنرجی کے پاس جاتے ہیں لیکن ان کا طریقہ علاج اور پھر اس کے بعد ان کا ہندو ہونا انہیں سخت ناپسند ہوتا ہے وہ نہ صرف ڈاکٹر بلکہ غلام رسول سے ناراض ہو کر اپنے دوسرے مرید عاشق جیلبی کے پاس چلے جاتے ہیں جو انہیں ڈاکٹر نعمت کو دکھاتا ہے اور شاہ صاحب کو اس لئے اعتبار آتا ہے ایک تو وہ مسلمان ہے، پوری عقیدت سے مصافحہ کرتا ہے اور پھر یہ اطمینان اور عقیدہ وہ بھی پیر ڈاکٹر بنرجی کی

لیاقت اور ان کے پیشہ کے سامنے ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیتا ہے حالانکہ ڈاکٹر نعمت نے بھی وہی تشخیص کی اور وہی طریقہ علاج اپنایا لیکن پیر صاحب پہلے ڈاکٹر سے خفا تھے اور دوسرے سے خوش۔ غلام رسول کی دنیا اجڑ گئی لیکن اس بربادی میں غلام رسول کو اپنی معاشی بدحالی کی فکر زیادہ تھی اور اس طرح معاشی حقیقت تمام طرح کے اعتقادات پر حاوی ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ پھر دو عقیدت مندوں اور مریدوں کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت آتی ہے اور پھر یہ چبھتے ہوئے جملے۔

"بھائی" ای۔۔۔ آپ خون خرابہ کرنا چاہتے ہیں۔" عاشق جہلمی ہکلائے پاکستان ہوتا تو عین ممکن تھا غلام رسول سامنے کھڑے دشمن کے سر کو دو طبق کر دیتے پھر برسوں مقدمہ چلتا رہتا اور رشوت کے سہارے وہ بچ جاتے لیکن انگلستان آکر وہ صلح جو ہو گئے۔ یہاں معمولی سی واردات پر پولیس آجاتی تھی اور قتل جیسے سنگین جرم کا مہینوں میں فیصلہ ہو جاتا تھا۔"

بنرجی ڈاکٹر ہیں اور سیاست داں بھی دونوں کے تقاضوں کے درمیان جو کشاکش ہے اس کو بھی اچھی طرح سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے پاس طرح طرح کے مریض آتے ہیں۔ ایک تو صنوبر شاہ تھے دوسرا اہم مریض جو اس ناول کا اہم کردار بھی ہے وہ ہے بومبر۔ جو جوان ہے انقلابی ہے اپنے ساتھ ایک سوڈانی عورت بھی رکھتا ہے لیکن اندر اندر نامردی کے احساس سے پریشان ہے۔ وہ شدید تناؤ میں رہتا ہے اور تناؤ کی وجہ ہے کشمیر۔ وہ ڈاکٹر سے کہتا ہے۔ "میں کشمیر آزاد کرانا چاہتا ہوں۔ مسلح جدوجہد کے ذریعہ" وہ یہ بھی سوچتا ہے کہ دنیا کی بہت بڑی آبادی بھوکی ہے اور لوگ انقلاب سے بھاگتے ہیں۔ اسی شدت احساس کی وجہ سے وہ بوکھلایا ہوا ہے۔ پورے قوم کی ہمت اور مردانگی کو ختم ہوتے دیکھ کر کوفت اور صدمہ کی وجہ سے اسے اپنی بھی مردانگی ختم ہوتی محسوس ہوتی ہے جسے دیکھ کر ڈاکٹر بنرجی سخت حیران ہوتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ مسلح جدوجہد اور نامردی میں کیا رشتہ ہو سکتا ہے؟ ارادوں کی ناتکمیلی۔ قوم کی بدحالی انسان کو نامرد بھی بنا سکتی ہے۔ یہ ایک سوال ہے جسے مصنف نے بڑے سلیقہ سے ناول کے درمیان سے ابھارا ہے۔ ڈاکٹر جو صرف ڈاکٹر نہیں ہے ایک سیاست داں بھی ہے اپنے مریض کے لئے اپنے ہی ملک و سیاست کے خلاف ایک نوجوان کی نامردی کو مردانگی میں تبدیل کرنے کے لئے وہ اپنے پیشہ دارانہ فرائض کو کس طرح نبھاتے ہیں یہ منظر بہت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ مرض کے بجائے ہندوپاک کے سیاسی حالات پر تبصرہ ہوتا ہے۔ ہرچند کہ کہیں کہیں سیاست کچھ زیادہ سی لگنے لگتی ہے تاہم مصنف نے بومبر کے کردار کو کچھ اس طرح تجسس آمیز انداز میں پیش کیا ہے کہ یہ زیادتی ناول کی تخلیق و تزئین کا حصہ بن جاتی ہے پھر وہ کہتے ہیں کہ "آپ اپنا سیکچوئل ڈرائیور کو پولیٹیکل ڈرائیور سے ملا دیا ہے۔"

اور آگے سیاسی بصیرت کے یہ جملے۔

"انگریج (انگریز) لوگ انڈیا جا کر انڈین عورت کے ساتھ سوئے اور پھر سوچے کہ انڈیا کو نکر کرلیا تو یہ ایبر ڈ ایگو ہے۔ اسی طرح انڈین مرد برما' کمبوڈیا یا سیلون جا کر کسی ناری کے ساتھ بستر میں جائے اور سوچے یہ سب ملک ہمارا گلام (غلام) ہوگیا ہے تو یہ ایک دم ایبر ڈ ر یگو ہے۔ پرانا ہسٹری میں کھو جانے کو کوئی پھائدہ نہیں ہے۔ بابا آج کا پرابلم سوچو کل جو ہو سکتا ہے اس کے بارے میں سوچو۔ "اور پھر یہ سیاسی شعور معالجہ کے ضمن میں مریض کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ "مجھے اپنی زندگی نئے سرے ترتیب دینی ہے۔" یہاں سے نہ صرف مریض کی دنیا بدل جاتی ہے بلکہ ناول کی دنیا بھی بدل جاتی ہے۔

فاطمی لکھتے ہیں کہ "یہ ناول مغرب میں بسے ایشائیوں کے ان مسائل کو لے کر لکھا گیا ہے جو اپنے اپنے ملک و علاقہ کے مذہبی سماجی اور سیاسی معاملات' تعصبات کو لے کر آج کی اس ترقی یافتہ دنیا میں اسی انداز سے جی رہے ہیں جہاں ایک طرف ڈاکٹر بنرجی اور بومبر جیسے کردار ہیں تو دوسری طرف صنوبر شاہ غلام رسول' عاشق جہلمی۔ جیسے کردار بھی ہیں اور ان دونوں کے درمیان خطا جھانسوی میں کردار اور بھی ہیں چھوٹے چھوٹے جو لمحاتی طور پر آتے ہیں لیکن ان کو بھی سلیقہ سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصطفیٰ کریم مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایسے اہم اور قیمتی ناول کی تخلیق کی۔ اس ناول کی اشاعت ہندوستان میں بھی ہونی چاہئے تاکہ پورے برصغیر کے قارئین اس سے استفادہ کر سکیں۔"

MUSTAFA KARIM
5 CAMPIOUS CLOSE
SCALBY, SCARBOROUGH Y013 08J U.K.

یہ دیسی سامراجیت سماجی، معاشرتی اور
معاشی اقدار پر ماضی میں مذہب کا ترقہ ڈال کر گل کھلاتی رہی ہے۔ اور
آج یہی سامراجیت نیشنلزم کا لبادہ اوڑھ کر گنگا جمنی تہذیبی دھاروں کا
نہ صرف مذاق اڑا رہی ہے بلکہ بعض ملیامیٹ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

محمد مظفر الدین فاروقی
۱۸ ستمبر ۱۹۹۹ء

ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی
شکاگو

ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی صحافی بھی ہیں' ادیب بھی نقاد بھی اور افسانہ نگار بھی... علامتی افسانے لکھتے ہیں چنانچہ "گفتنی" کے سوالوں میں ایک سوال اسی موضوع سے متعلق بھی ہے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنا موقف بڑے معلوماتی انداز میں بیان کیا ہے۔ جن ادباء یا شعراء نے دلائل کے ذریعے بغیر دہرائے جو بات کہی ہے میں نے ان کے موقف کو مجروح کئے بنا ان کے قارئین کے حضور پیش کرنا مناسب جانا ہے۔

ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی کے افسانے یقیناً" عام فہم نہیں ہیں۔ ان سے وہی قاری حظ اٹھا سکتا ہے جو ان کے افسانوں کے ماحول' ان کے کرداروں اور ان کی علامتوں کے تاریخی تہذیبی پس منظر سے واقف ہو اور جس کا مطالعہ بھی وسیع ہو۔ اس ضمن میں چند ادیبوں کی آراء پیش کرنا ضروری ہے تاکہ یہ محترم فاروقی کے افسانوں سے متعلق ان کے "قارئین کو کوئی رائے قائم کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکیں۔

محترم حمایت علی شاعر لکھتے ہیں۔ "ڈاکٹر مظفر فاروقی افسانے لکھتے ہیں اور افسانوں میں اپنی

خاص پہچان رکھتے ہیں۔ خاص طور پر ہندو میتھالوجی کے علامتی پس منظر کے ساتھ جو نیا افسانہ لکھا جا رہا ہے جس کا اردو ادب میں اب تک فقدان تھا۔ میں پوری ذمہ داری سے یہ بات کر رہا ہوں۔ ہمارے پاس گریک (Greek) میتھالوجی تو آئی ہے اور دوسرے حوالے بھی ہمارے یہاں آتے ہیں۔ لیکن ہندو میتھالوجی کے جو مثبت اقدار ہیں اور اس کا جو فکر انگیز پہلو ہے۔ اور اس کے جتنے بھی شیڈز (Shades) ہو سکتے ہیں جو نئی معنویت کے ساتھ نئے حقائق کے پس منظر کے ساتھ 'سیاسی' سماجی حتیٰ کہ مذہبی اور انسانی نکتہ نگاہ کی جو قسمتیں ہیں وہ اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے اردو افسانے کا ایک علامتی ماحول فراہم کرتی ہیں... وہ ہمارے مظفر فاروقی کے افسانے کی پہچان ہے اور غالباً "یہ اولین آدمی اور اولین لکھنے والے ہیں' جنھوں نے اس زاویہ سے اردو کو نوازا ہے اور اردو افسانے کو ایک Richness عطا کی ہے..."

ماہنامہ "شاعر ممبئی" کے شمارہ مارچ ۹۶ء میں پاکستان کے نامور شاعر ادیب صحافی اور سہ ماہی "اقدار" کے مدیر جناب شبنم رومانی نے لکھا ہے اردو کو شمالی امریکہ میں' بہر حال ایک نئے تجربے سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے یہاں ایک طرف آغا بابر پنجاب کے کلچر کو اپنی "سوانح حیات" میں سجا کر پیش کر رہے ہیں' جو سہ ماہی "اقدار" میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے' تو دوسری جانب محمد مظفر الدین فاروقی ہندی دیو مالا کو ایک عجیب تخلیقی شان کے ساتھ اپنے افسانوں میں ذریعہ اظہار بنے رہے ہیں یہی نہیں وہ اپنی کہانیوں میں شمالی امریکہ کو بھی لکھ رہے ہیں اور ایسی شگفتگی اور شائستگی سے لکھ رہے ہیں کہ انہوں نے ناگفتنی کو بھی گفتنی بنا دیا ہے... ان کی کہانی "چٹان" جو اقدار میں شائع ہوئی تھی اس سال کی سب سے اچھی کہانی قرار پائی۔ محمد مظفر الدین فاروقی نے "چٹان" کے ذریعے امریکی معاشرے کی اخلاقی گمراہی کو جس آسانی کے ساتھ صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے وہ اتنا آسان کام نہیں۔ ویسے چند ماہ پیشتر بھی ان کا ایک افسانہ میں نے "صریر" میں پڑھا تھا جو حیدر آباد دکن کے تاریخی پس منظر میں لکھا گیا تھا لیکن "چٹان" کی بات اور ہی ہے بالخصوص ان کے یہ آخری فقرے "دیکھو ضمیر الدین! ظلمات میں جگنو کی چمک ایک انمول شئے ہے اور جو انمول ہے وہ امانت ہے اسے احساس کے پردے پر اجاگر کرو۔" اپنے اندر انسانی نفسیات کی بنیادی قسمتیں سموئے ہوئے ہیں۔ اس خود آگاہی کے لطف سے سرشار کرتے ہیں جو جنسی بے راہ روی کی عارضی مسرت بخشنے والے لمحوں سے کہیں زیادہ دیرپا ہوتی ہے اور ہمیں دائمی خوشیوں سے ہمکنار کرتی ہے۔"

ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی کا اسلوب ہر سخن شناس سے داد حاصل کر لیتا ہے۔ کیلیفورنیا میں طب کے ڈاکٹر فیروز عالم ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر مظفر کے اسلوب تحریر پر یوں رقم طراز ہیں۔

"جادو وہ جو سرچڑھ کر بولے" کے مصداق کچھ تحریریں ایسی ہوتی ہیں جو پڑھنے والے کو مجبور کر دیتی ہیں کہ ان کے خالق کو ہدیہ تہنیت پیش کیا جائے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت "پاکستان لنک" کے تازہ شمارے میں ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی کے مضمون "حمایت علی' شاعر اور شخص" کو پڑھ کر ہوئی۔ ایسی عمدہ تحریر' اتنی نفیس زبان اور اس قدر روانی بیان بہت عرصے بعد پڑھنے کو ملا۔ مضمون کا دوسرا پیراگراف' جہاں فاروقی صاحب نے فطرت کے ہاتھوں حسن مطلق کی جلوہ نمائی کے سلسلے میں انشاء پردازی کا مظاہرہ کیا ہے' وہ اس قدر خوب صورت ہے کہ بلاشبہ مجھے کئی سال پہلے نکلنے والے نقوش کے وہ خاص نمبر یاد آ گئے جن میں کسی ایک شاعر کی شخصیت پر ہمہ پہلو مضامین شامل ہوتے تھے۔ اس قسم کے مضامین کسی بھی اشاعت کے معیار کو بلند کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔"

چلئے اب ڈاکٹر فاروقی سے ملتے ہیں۔ ان کا نام محمد مظفر الدین فاروقی۔ تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۹۳۵ء کے دن کھمم پلی اندھرا پردیش میں پیدا ہوئے۔ یہ چھوٹا سا موضع ہے جو شہر حیدر آباد دکن سے ۵۳ میل کے فاصلے پر واقع ہے ابتدائی تعلیم کوہیر اور حیدر آباد میں ہوئی۔ ۱۹۶۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم ایس سی (M.Sc) کی تکمیل کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کیمسٹری کے لیکچرار مقرر ہوئے درس و تدریس کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۴ء میں پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد ریجنل ریسرچ لیبارٹری Research Lab Reginal حیدر آباد دکن میں ۳ سال تک ریسرچ سائنٹسٹ کے عہدے پر کام کیا ۱۹۶۷ء میں اکران یونیورسٹی (Akran) اوہائیو (امریکا) کی دعوت پر امریکا آ گئے۔ ایک سال تک پوسٹ ڈاکٹر ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے وہاں کام کیا۔ بعد ازاں ہاسپل کی میڈیکل لیب سے وابستہ ہو گئے۔ اور ۲۷ سال تک ہاسپل کی بائیو کیمسٹری لیب کے ڈائریکٹر رہے۔

ادبی سفر کی ابتداء کالج کے زمانے ہی میں ہوئی۔ سائنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی کے مجلہ سائنس کی ۳ سال تک ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ حیدر آباد دکن کے مختلف رسائل میں مضامین اور افسانے شائع ہوئے۔ آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد کے اردو پروگرام "نیرنگ" سے سائنسی موضوعات پر کئی دلچسپ اور عام فہم تقاریر نشر کیں۔

امریکہ میں کئی تعلیمی' سماجی اور اردو کے ادبی اداروں سے منسلک ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی المنائی ایسوسی ایشن آف شکاگو قائم کی۔ المنائی کے صدر ہیں اور یوپی کلچرل ایسوسی ایشن آف شکاگو کے بورڈ آف ٹرسٹیز (Trustees) کے ممبر ہیں۔ گذشتہ ۱۲ سال سے یوم سرسید کے موقع پر عالمی مشاعرے منعقد کر رہے ہیں۔ ان مشاعروں میں ہند و پاک اور نارتھ امریکہ کے مشہور و معروف شعراء حصہ لے چکے ہیں۔ یوپی ایسوسی ایشن کی طرف سے ہر سال کوی سمیلن کے انعقاد میں سرگرم حصہ لیتے ہیں۔

انہوں نے ۱۹۹۰ء سے دوبارہ اردو ادب کی طرف توجہ کی ہے۔ محبوب صنف افسانہ نگاری رہی ہے۔ ان کے افسانوں میں تاریخ، اساطیر، خصوصاً "ہندو میتھالوجی اور علامتوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ مواد اور اسلوب میں انفرادیت ہوتی ہے۔ بیانیہ اسلوب کو جدید اسلوب سے ملا دیا ہے جس اسلوب سے جہاں چاہیں پوری طرح سے کام لے سکتے ہیں۔ زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ فکر و خیال میں گہرائی، حقیقت پسندی اور قدرت ہوتی ہے۔ خصوصاً" ہندوستانی معاشرے نسلی، مذہبی اور طبقاتی تعصب اور اکراہ کے ناپسندیدہ عناصر کو نہایت خوب صورتی اور فنی لوازم کے ساتھ افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔ ہند و پاک کے معیاری جرائد جیسے سب رس (حیدر آباد دکن) شاعر (ممبئی) تناظر (حیدر آباد دکن) صریر انداز افکار سب رس طلوع افکار ارتکاز آئندہ (کراچی) اور سطور (لاہور) میں اب تک ان کے تقریباً ۲۰ افسانے شائع ہو چکے ہیں۔

ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات جو مکمل ہو چکی ہیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ بلیک ہول (ڈرامہ۔ ۱ جولائی ۹۵ء) ۲۔ دینا بجو (مختصر ناولٹ ۱۵ فروری ۹۲ء)

۳۔ دو درویش ایک کہانی (۱۷ مارچ ۹۶ء) ۴۔ تکمیلن (۳۰ مارچ ۹۹ء)

اب ہم ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی کی معلوماتی گفتگو میں آپ کو شریک کرتے ہیں۔ ہم نے سوالنامہ ان کے سامنے رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

سوال نمبر ۲:۔ ہر سوال کے جواب کی پابندی عائد کر کے آپ نے بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ آپ چاہتی ہیں کہ ہم اپنی پسند، ناپسند اور تعصبات کو ظاہر کریں۔ بیسویں صدی کے وہ بڑے نام جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں انہیں گنوا دینا تو بہت آسان ہے۔ لیکن وہ بڑے نام جو بقید حیات ہیں ان سب کو پہچان لینے کا کام وہی آدمی کر سکتا ہے جو بیسویں صدی کے سارے ادب کا بغور مطالعہ کر چکا ہو۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے ادھر ۴۰، ۵۰ سال سے لکھے جانے والے سارے ادب کو نہیں پڑھا ہے۔ لہٰذا کچھ نام گنانے اور کچھ ناموں کو نظر انداز (لاعلمی کی وجہ سے) کر دینے کی غلطی کرنے کے بجائے اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کرنا پسند کرتا ہوں۔

سوال نمبر ۳:۔ روایتی یا کلاسیکی افسانہ ہماری قدیم ضخیم داستانوں کی کوکھ سے نکلا ہے۔ اس کا بدن چھریرا، مزاج چلبلا اور لباس سادہ تھا۔ اس افسانے نے افسانہ نگاری کے عصری فن کو برتا اور زبان و بیان کے حوالے سے افسانے کو عوام کے قریب کر دیا۔ پلاٹ اور کردار نگاری کے متناسب امتزاج سے وحدت تاثر پیدا کر کے کہانی کو ادب کی مقبول صنف بنا دیا۔

مجرد بیانیہ افسانے کے کچھ Limitations ہیں۔ اس سلسلے میں میرا مضمون "علامتی افسانے کا ابلاغ ... دھماکہ یا انجام" کے حوالے سے ہے۔ جو میں نے الم نشرح صاحب کے

تنقیدی مضامین کے جواب میں لکھا ہے پڑھ لیجیے۔ آپ کو پتہ چل جائے گا کہ جدید یا نئے افسانے نے افسانے کو کس انداز سے نکھارا اور سنوارا ہے۔ ویسے نئے افسانے کے بارے میں جو باتیں وقتاً" فوقتاً" لکھی گئی ہیں میں انہیں مختصراً" یہاں بیان کیئے دیتا ہوں۔

جدید افسانہ سماجی یا اخلاقی اصلاح کا دعوی نہیں کرتا۔ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کی بھول ۔ جلیوں میں نہیں بھٹکتا۔ اس کے باوجود اس میں عصری شعور بھی موجود ہے۔ سماجی زندگی کا احساس اور فرد کی ذات کا عرفان بھی ہے۔ یہ افسانہ اس سچائی اور حسن کو تلاش کرتا ہے جو تاریخ کے جبر مسلسل کے نتیجے میں فرد کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ نئے افسانے میں سیاسی' معاشرتی' جنسی اور نفسیاتی زاویوں کی بازیافت کی جاتی ہے۔ یہ افسانہ فرد کی داخلی کشمکش اور مشینی ماحول کی پیدا کردہ سماجی زندگی کی بے معنویت کو تشبیہات' کنایہ اور علامتوں کے ذریعہ بیان کر کے کہانی کو زبان و مکان کی محدودیت سے آزاد کر دیتا ہے۔ جیسے غزل کا ایک شعر جس کی عمر اس وقت تک باقی رہے گی جب تک انسانی تاریخ اس کائنات میں سانس لیتی رہے گی۔

(۲) روایتی افسانہ فرد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جو ہے اس کی عکاسی تک محدود رہا۔ جدید افسانہ نہ ایک قدم آگے جاتا ہے جو "ہے" کے ساتھ جو "ہونا چاہیے۔" اس کا بھی احاطہ کرتا ہے یعنی بحر زندگی کی سطح پر موجوں کا جو تموج ہے وہ تو ایک عینی حقیقت ہے۔ لیکن زیر سطح جو تلاطم برپا ہے اس کے عرفان کے لئے بینائی سے بڑھ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

مجھے اس جرم میں اندھا کیا ہے
کہ بینائی سے بڑھ کر دیکھتا ہوں

(رضی اختر شوق)

(یہ شعر میں نے صرف اس لئے لکھا ہے کہ بینائی سے بڑھ کر والی ترکیب میں نے اس شعر سے لی ہے) میری رائے میں جدید افسانے نے زیر سطح کی منظر نگاری کے لئے نیا اسلوب اور بالکل اچھوتا لسانی ڈھانچہ تیار کیا ہے۔

سوال نمبر ۴:۔ناول بیسویں صدی میں بہت کم ناول لکھے گئے ہیں۔ بالکل بجا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اردو میں بہت کم ناول لکھے گئے ہیں۔ بیسویں صدی سے پہلے اور بیسویں صدی۔ دونوں زمانوں میں یہ ایک حقیقت ہے۔ ادیب تخلیقی داعیہ کے زیر اثر تخلیقی عمل میں مصروف رہتا ہے۔ تخلیق کی تکمیل سے پہلے اور تکمیل کے بعد اس کا پہلا قاری خود ادیب ہوتا ہے۔ اس کے بعد ادب کو بہر حال اس کے اصل قاری تک پہنچنا ہے۔ افسانے اور شاعری ادبی جریدے قاری تک پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن ناول اور خاص طور پر ادبی ناول کو قاری تک پہنچانے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ اسے کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے۔ اردو ناول کی چھپائی اور

کاروبار میں پبلشر کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ چنانچہ یہ کام بھی ادیب کو ہی کرنا ہوتا ہے۔ یعنی ناول لکھے بھی اور اپنی جیب سے ۷۰، ۸۰ ہزار روپیہ بھی خرچ کرے۔ جب ناول چھپ کر آجائے تو اس کی آدھی سے زیادہ کاپیاں مفت تقسیم ہونگی اور بقیہ آدھی کاپیاں نکاسی کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے کسی کتاب گھر میں یا خود ادیب کے گھر میں دیمک کا انتظار کرتی ہوئی پڑی رہیں گی۔ ہے نا تشویش ناک صورت حال! میں نے ونیا ہجو کے نام سے دکن کی ایک داستان عشق لکھی ہے۔ یہ ۸۰ صفحات کا ایک مختصر ناولٹ ہے اسے کوئی جریدہ اقساط پر چھاپنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر میں اسے قاری تک پہنچانا چاہوں یا تاریخ ادب میں محفوظ کرنا چاہوں تو پھر اپنی جیب سے کم از کم ۴۰، ۵۰ ہزار روپیہ خرچ کرنا پڑے گا... آپ ہی بتائیں پھر کوئی ادیب ناول لکھ کر کیوں اپنی اوقات خراب کرے، اور پہلے سے ہلکی جیب میں ایک بڑا سا سوراخ ڈال لے۔

ایسی ہی کس مپرسی کی داستان لداخ کے ناول نگار عبدالغنی شیخ کے تعارف میں بھی پڑھئے۔)

سوال نمبر ۵:۔ یہ مسئلہ صرف ادیب کا نہیں بلکہ برصغیر کی ۹۵٪ آبادی کا ہے۔ بدقسمتی سے ادیب بھی اس ۹۵٪ آبادی میں شامل ہے۔ بقیہ جو ۵٪ آبادی ہے اسے کسی نظام فکر کی ضرورت ہے اور نہ وہ کسی نظام فکر کی متلاشی ہے۔

ہمارے پاس ایک نظام فکر ہے۔ لیکن اس کی حقانیت کا ادراک کرنے کے لئے علم و ایقان کی ضرورت ہے۔ لیکن علم تن کا غلام ہو کر ایک زہریلے ناگ کی طرح پھنکار رہا ہے اور ایقان سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اسی لئے سب کے سب انتشار فکری میں مبتلا ہیں اور وہ ۵٪ آبادی جو کسی بھی نظام فکر کو اپنی بقا کے لئے سم قاتل سمجھتی ہے ساری قوم کے ایقان پر ڈاکہ ڈال رہی ہے۔ تاکہ علم و ایقان کی تہذیب مٹ جائے اور صرف تن کا تمدن باقی رہے۔ لہٰذا ادیب کو کسی نظام فکر کی تلاش کے لئے کسی حاتم طائی کو حمام بادگرد کی خبر لانے کے لئے روانہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسے اس تخلیقی جرات کی ضرورت ہے کہ وہ چالیس چوروں کے غار کے دہانے پر کھڑے ہو کر 'کھل جا سم سم' کے الفاظ دہرا سکے۔

سوال نمبر ۶:۔ علامہ شبلی نعمانی نے شعر العجم کے دیباچے میں شاعری کی تعریف کرتے ہوئے یوں کہا ہے۔ "کچھ اشعار، شعر کے فنی معیار پر پورے اترتے ہیں پھر بھی وہ شاعری میں نہیں شمار کئے جاسکتے مثلاً"

ڈنڈے کو کھڑا کیا کھڑا ہے

ہاتھی کو بڑا کیا بڑا ہے

تو میں اس سوال کے جواب میں یوں کہوں گا کہ جو ادب پارہ ادیب کو اور قاری کو جمالیاتی حظ نہیں دے سکتا وہ ادب نہیں ہے۔ اب یہی دیکھ لیجئے اوپر لکھا گیا شعر ایک مکمل شعر ہے۔ لیکن اس کے خالق کو میٹر میں الفاظ کو مرتب کرنے کے بعد کوئی جمالیاتی حظ یا تخلیقی آسودگی

نہیں ملی ہوگی اور آپ بھی اس شعر کو پڑھ ڈالئے آپ کے احساسات میں نہ کوئی تموج پیدا ہوگا نہ قلب و دماغ کے کسی گوشے میں کوئی کرن جگمگائے گی۔ دل کی دھڑکنوں کی رفتار ویسے کی ویسے ہی رہے گی۔ قرات سے اور قرات کے بعد کوئی فرق نہیں محسوس ہوگا۔

سوال نمبر ۷:۔ بہ حیثیت مجموعی آج کے ادیب اور خاص طور پر یورپ اور امریکہ کے اردو کے ادیب کے پاس فاضل وقت بالکل نہیں ہے۔ دیار غیر میں شعر و ادب ایک باعزت پیشہ بن سکتا ہے۔ اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے اور شہرت حاصل کرنے کا مہذب ذریعہ ہے۔ امریکہ کی مثال سامنے رکھئے۔ ہر سال یہاں کے کچھ ۸، ۱۰ بڑے شہروں میں کم از کم ۲ یا ۳ بڑے مشاعرے منعقد ہوتے ہیں جن میں ۲۰۰ سے لے کر ۱۰۰۰ افراد تک شرکت کرتے ہیں۔ ہند و پاک سے نامی گرامی شعراء تشریف لاتے ہیں۔ ان کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھنا' ویڈیو میں اپنی شبیہ اور آواز ریکارڈ کروانا اور مشاعرہ گاہ کے باہر میبل پر نامی گرامی شعراء کے مجموعہ کلام کے آگے پیچھے اپنا مجموعہ کلام نمائش کے لئے رکھ دینا یہ سب کس قدر خوش کن اور نفس امارہ کی آسودگی کا سبب بن سکتا ہے۔ اب غزل کہنے کے لئے جن لوازمات کی ضرورت ہے اس پر ایک نظر ڈالئے۔ سب سے پہلے غزل کی زبان بہت محدود ہے ۲، ۴ سو الفاظ تشبیہات' اشارے اور کنایے سے واقفیت کافی ہے اور طبعیت میں تھوڑی بہت موزونیت ہو تو غزل آسانی سے کہی جا سکتی ہے۔ ایک منٹ کا وقت ملا آدھا مصرعہ جما لیا۔ پھر ایک آدھ منٹ اور ملا تو شعر مکمل کر لیا اور اس طرح ۱۵، ۲۰ منٹ کے وقت میں پانچ یا سات شعر کی غزل کہہ لی۔ غزل کہتے کہتے طبیعت اکتا گئی تو ۶، ۷ لائن کی نظم (آزاد نظم) یا نثری نظم لکھ ڈالی کبھی قطعہ مکمل کیا۔ کبھی ثلاثی اور کبھی دوہا۔ اگر وقت بالکل نہیں ہے تو ہائیکو پر ہاتھ صاف کر لیا۔ کلام میں اگر کوئی فنی سقم باقی رہ جائے تو بہت زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ کبھی ترنم سے مصرعہ کی کھینچ تان کر کے بڑا یا چھوٹا کر لیا۔ ویسے بھی امریکہ میں اور ہند و پاک میں کلام کے اصلاحی فن کار موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر اصلاح کا کام بھی کرتے ہیں اور چھپائی کا بھی۔ اصلاح بھی کر دیں گے اور کلام کا مجموعہ بھی چھاپ دیں گے۔ ہفت روزہ پاکستان لنک لاس اینجلس میں ایک مکمل صفحہ شاعری کے لئے مختص ہے۔ اس ایک صفحہ پر ہر ہفتہ کوئی ۱۰، ۱۵ شاعر چھپ جاتے ہیں۔ اب نثر نگار کی مجبوریوں پر غور کیجئے۔ سب سے پہلے اسے زبان پر غیر معمولی قدرت ہونی چاہئے۔ یہاں زبان کا مطلب ہے لغت کے سارے الفاظ کا برمحل استعمال۔ زبان پر قدرت وسیع مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کام کے لے بہت وقت دینا پڑتا ہے پھر ایک کہانی لکھنے کے لئے پلاٹ کی ترتیب' کرداروں کا انتخاب پھر کردار کے سماجی پس منظر کے لحاظ سے اس کی زبان کا ڈھانچہ تیار کرنا پڑتا ہے۔ اس کام میں کئی کئی دن لگ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ عمل کئی مہینے لے لیتا ہے یہ سب کرنے کے بعد جب کہانی ادیب کے ذہن سے نکل کر صفحہ قرطاس پر منتقل ہو جاتی ہے تو اس کا

پہلا قاری (جو خود کہانی کا خالق ہوتا ہے) اسے پاس (Pass) کرتا ہے۔ ادیب کا معیار نظر اگر اسے پاس نہ کرے تو یہ کہانی ادیب کے فائل میں کچھ دن پڑی رہتی ہے۔ پھر اس کی دوسری قرات کے بعد اس میں مناسب تبدیلی کی جاتی ہے۔ یوں ایک کہانی کی تکمیل تک کئی مہینے لگ جاتے ہیں۔ ان تمام مراحل تک پہنچانا ہوتا ہے۔ پاکستان لنک جیسے اخبار میں جہاں ایک ہفتہ میں ۱۰'۱۵ شاعر چھپ سکتے ہیں وہاں صرف ایک نثر نگار کو ہی جگہ ملے گی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ وقت اور ماحول شاعر کی پیدائش کے لئے موزوں ہے یا نثر نگاری کے لئے؟ لیکن ایک اور بات جس کی طرف میں اشارہ کرنا چاہوں گا وہ یہ کہ یورپ اور امریکہ میں اگر آپ کو ۱۰'۱۲ حقیقی شاعر مل جائیں گے تو وہیں ۴'۵ حقیقی نثر نگار بھی مل جائیں گے۔ لہٰذا میرے خیال میں یورپ اور امریکہ میں اصلی شاعر اور اصلی نثر نگار کا تناسب ٹھیک ہی ہے۔

سوال نمبر۸:۔ اس سوال کا جواب بہت تفصیل چاہتا ہے۔ میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ اردو میں جب تک علمی، سائنسی اور ٹیکنیکل مضامین نہ لکھے جائیں گے انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کو اردو میں داخل کرنا ممکن نہیں ہے۔ تخلیقی ادب موجودہ الفاظ کو اچھوتے انداز سے استعمال کر کے ان کے بطن میں نئے معنی بھر دیتا ہے۔ یعنی نیا لسانی ڈھانچہ یا سسٹم پیدا کرتا ہے لیکن ادبی زبان کے ذریعہ سے زبان میں وسعت اور نئے الفاظ کا اضافہ ممکن نہیں ہے۔

سوال نمبر۹:۔ زندگی کے دلچسپ اور اہم واقعات میں میری اپنی پیدائش سے زیادہ اہم اور دلچسپ کوئی اور واقعہ نہیں ہے ایک واقعہ سناتا ہوں جو اہم ہے، تاریخی ہے اور جس نے زندگی میں ایک اہم موڑ بھی پیدا کیا ہے۔ ۳۵ء سے ۴۷ء تک نیم آزاد مملکت حیدر آباد کے حدود کے اندر ہی قیام رہا اور ایک سال آزاد حیدر آباد کا شہری رہنے کا بھی فخر حاصل ہوا۔ قفس کے در و دیوار سے نقش غلامی مٹنے بھی نہ پائے تھے کہ فوجی شکست کے نتیجے میں پھر سے طوق و سلاسل کی جھنکار سے چونک پڑے۔ ایک نیا ہندوستان پرانے ہندوستان کی کوکھ سے جنم لے رہا تھا۔ غلام اور نیم آزاد ریاستوں کو ایک جا کر کے نئے ہندوستان کی تعمیر کی جا رہی تھی۔ اس عمل کے دوران مملکت حیدر آباد کے ۲ لاکھ شہریوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں اور لاکھوں بے خانماں، لٹے لٹائے، برباد قافلے شہر حیدر آباد کی طرف دوڑ پڑے۔ ہم بھی ایسے ہی ایک قافلے کی شکل میں حیدر آباد پہنچے تو شہر کی صاف و شفاف چمکدار سڑکوں پر ہزاروں کیچڑ اور خون میں لت پت قدموں کے نشانات کے درمیان، میں نے بھی اپنے بارہ سالہ خون آلود قدم کا نشان ثبت کر دیا۔ وہ نشان آج بھی وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ خاک و خون سے آلودہ قدموں کے نشان کبھی نہیں مٹتے۔ لیکن وہ دن بڑے ہی رومان انگیز دن تھے۔ والد مرحوم نے ہمہ اقسام کے کاروبار میں ہاتھ ڈالا۔ سرمایہ کی کمی اور کاروباری ذہنیت کے فقدان کی وجہ سے ان کے کاروبار کا دائرہ محدود ہی رہا۔ اور میں گھر کا بڑا بیٹا ہونے کے ناتے ان کا کاروبار میں ہاتھ بٹاتا رہا۔ مجبوری کی بنڈی، اسوکی،

پھل اور ترکاریوں کے ٹھیلے سنبھال کر حیدر آباد کی سڑکوں پر نکل گئے۔ کبھی کرائے کی دوکان (جہاں دال، چاول، تیل، مسالے جیسی چیزیں فروخت کی جاتی ہیں) اور کبھی لکڑی کی ٹال سجا کر ایک جا بیٹھ رہے تو کبھی کندھوں پر کپڑوں کا گٹھا لے کر گلی گلی گھوم پھر کر آواز لگا کر بیچا اور کبھی سڑک کے کنارے بیٹھ کر ضروریات زندگی کی چھوٹی موٹی چیزیں فروخت کیں۔ ایسی کایا پلٹ کہ دماغ نہ صرف چکرا گیا بلکہ آوارگی کی طرف مائل ہو گیا۔ کہاں تو وہ دن تھے تیسری، چوتھی جماعتوں میں پڑھنے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر اسکول جایا کرتے تھے اور نوکر سارا دن اسکول کی چار دیواری میں گھوڑا لئے انتظار کرتا رہتا تھا۔ اور اب! کبھی ٹپکتی چھت کے نیچے نیند اچاٹ ہو جاتی تو کبھی کھڑی دھوپ میں چھت کے اوپر نیند کا ایسا غلبہ ہوتا کہ صدیوں کی تھکن اتر جائے۔ ایسی کایا پلٹ پچھلی نسلوں کی غفلت شعاری اور آزمائش کی گھڑیوں کو نظر انداز کر کے بے پروا زندگی گذارنے کے نتیجے میں آنے والی نسلوں کے نصیب میں لکھ دی جاتی ہے۔ سو قدرت نے یہ سزا ہماری نسل کے حصے میں لکھی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر اب بھی نہ سنبھلو گے اور پدرم سلطان بود پر جمے رہو گے تو صفحۂ ہستی سے نام و نشان بھی مٹا دیا جائیگا۔

چنانچہ سنبھل گئے۔ والد مرحوم کی دور اندیشی نے راستہ تلاش کر لیا۔ ایک سال کی معاشی تگ ودو اور آوارہ گردی کے بعد اسکول کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ پھر تو اسکول اور لکھنا پڑھنا ہی اوڑھنا بچھونا بن گیا۔

سوال نمبر ۱۰:۔ اس سلسلے میں میری معلومات محدود ہیں۔ تنقید اور خاص طور پر تنقید کی مخصوص اصطلاحات کو میں نے ادب سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ کچھ تراجم میں نے پڑھے ہیں خاص طور پر جاسوسی ادب جیسے تیرتھ رام فیروز پوری لیکن کبھی ترجمے کو اصل سے ملا کر پرکھنے کا کام نہیں کیا۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے بارے میں میری معلومات صفر کے برابر ہیں لہٰذا اس سوال کے جواب میں خاموشی مناسب ہے۔"

DR MOHAMMAD M. FAROOQUI
34 WILDWOOD DRIVE SOUTH
PROSPECT HTS 1L 60070
U.S.A.

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟
ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

کراچی

کہتے ہیں طنز و مزاح اور پھکڑ پن میں بال برابر فرق ہے اور بلاشبہ طنز و مزاح لکھنے کے لئے پل صراط پر چلنا پڑتا ہے۔ قدم لمحے بھر کو ڈگمگایا نہیں کہ تنزلی کے عفریت کا منہ کھلا۔ طنز و مزاح کے پرکھ کی ایک کسوٹی بھی ہے۔ جس کے بارے میں جناب معین قریشی کی کتاب "ہر شاخ پہ....." میں محترم مشفق خواجہ اظہار خیال کرتے ہیں کہ اگر طنز و مزاح کا مقصد قہقہہ ہو تو بات لطیفہ گوئی سے آگے نہیں بڑھتی لیکن جب پڑھنے والوں کو کسی تلخی کے بغیر اور ایک خندہ لب کے ساتھ اپنے معاملات و مسائل پر سوچنے کی راہ دکھانا ہو تو ایک بلند تر سطح پر آ کر بات کرنی پڑتی ہے۔ طنز و مزاح اسی بلند تر سطح پر وجود میں آتا ہے اور اس کی بنیاد سنجیدگی و شائستگی پر ہوتی ہے۔

معین قریشی کے مضامین اس کسوٹی پر یقیناً" پورے اترتے ہیں۔ ان مضامین کے بعض جملے ادب کے کئی لطیف دبستانوں کی سیر کرا دیتے ہیں۔ وہ تلمیحات کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ ایک جملہ اور ایک سطر میں ہی کبھی آپ اپنے موجود معاشرے کی تصویر دیکھتے ہیں تو ساتھ ہی کئی ادبی کہانیاں بھی اپنے پورے پس منظر کے ساتھ اجاگر ہو جاتی ہیں۔ الفاظ انتخاب اور

ان پر مضبوط گرفت مصوری کا جادو جگاتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ایک مضمون بعنوان "کتے دو ہی اچھے" سے یہ اقتباس ایسی ہی تصویریں پیش کرتے ہیں کہ آپ بہ یک وقت خود کو غالب کے زمانے میں بھی پاتے ہیں اور فکر کی پرواز ایک ہی جست میں قاری کو مجنوں کا ہمراہی بھی بنا دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج کل انسان ایک دوسرے کے ساتھ جس طرح کا سلوک کر رہے ہیں جس وحشت اور بربریت کے مظاہر دن رات دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ ان پر انسان تو اپنی جگہ کتوں کو بھی تشویش ہے۔ اس تشویش کو ایک نوجوان شاعر نے اس طرح رقم کیا ہے۔

بھاگتے کتے نے اپنے ساتھی کتے سے کہا

بھاگ ورنہ آدمی کی موت مارا جائے گا

وجہ اس کی یہ ہے کہ کتے کا کاٹا تو چودہ ٹیکوں میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔ انسان کے کاٹے کا کوئی ٹیکہ آج تک ایجاد نہیں ہوا ہے اسی لئے غالب نے بھی کہا تھا۔

ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اردو ادب میں دو وی آئی پی کتوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک خواجہ سگ پرست کا کتا تھا جو مخمل کے قالین پر اس کے ساتھ بیٹھتا تھا اور دوسرا سگ لیلیٰ جو اپنی مالکن کی نیابت کرتے ہوئے قیس کے سینے سے لگا رہتا تھا۔ کبھی کبھار جب نجد کے شریر لڑکے قیس کو پتھر مارتے تھے تو یہ کتا اس طرح اس کے سامنے آجاتا تھا جیسے ہماری فلموں کی بری عورت آخری سین میں سینے پر گولی کھا کر اپنی جان پر کھیل جاتی ہے اور بوڑھے ہیرو کو اگلی فلم کے لئے پھر سے ہم پر مسلط کر دیتی ہے۔

15 ستمبر 1942ء معین قریشی کا یوم پیدائش ہے۔ صحافت اور سیاسیات میں ایم اے کے ساتھ ایل ایل بی کر کے قانون کی ڈگریاں یعنی اسناد لے چکے ہیں۔ ادیب فاضل' ایف بی آئی ایم (لندن) اور پی ایچ ڈی کی اسناد ان کے علاوہ ہیں۔ سندھ ایمپلائز سوشل سیکورٹی انسٹی ٹیوشن میں سینئر ڈائریکٹر ہیں۔ جامعہ کراچی کے شعبہ ابلاغ عام (ماضی کا شعبہ صحافت) سے بھی بحیثیت اعزازی پروفیسر وابستہ رہے۔ یوں "استاد" بھی ٹھہرے۔

ان کی قلمی زندگی کا آغاز 1953ء سے ہوا۔ جب یہ گیارہ سال کی عمر میں بچوں کے صفحات پر لکھتے تھے۔ اس زمانے میں اشاعت کا معیار سخت ہوتا تھا۔ معین قریشی کی تحریریں اس کڑے معیار کی کسوٹی پر کھری اترتی رہیں۔

1960ء سے باقاعدہ مزاح نگاری کا آغاز کیا اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ 1993ء میں آرٹس کونسل کراچی کی گورننگ باڈی کے ممبر اور اس کی ادبی کمیٹی کے چیئرمین رہے۔ پی ٹی وی سے ان کا ایک مزاحیہ سیریل "کہتا ہوں سچ" ناظرین نے بہت پسند کیا۔ بعد ازاں اسی عنوان سے ان کا ریڈیو کالم بھی مقبول ہوا۔ معین قریشی صاحب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں

میں بیک وقت سنجیدہ اور ہلکے پھلکے موضوعات پر لکھتے ہیں۔ ان کی تصانیف یہ ہیں۔

1- Crocodile Tears (انگریزی میں شائع شدہ مزاحیہ مضامین کا انتخاب)

2- سماجی تحفظ (بین الاقوامی تناظر میں سماجی تحفظ کے موضوع پر اردو میں پہلی اور اب تک واحد کتاب جس سے ایم اے (سماجی بہبود) اور ایم اے (سماجیات) کے طلبہ فائدہ اٹھاتے ہیں)

3- West is West (سفرنامہ برطانیہ)

4- اردو زبان و ادب (اردو ادب کا تحقیقی اور تاریخی جائزہ)

5- Social Security Scheme (پاکستان میں سماجی تحفظ کی کارکردگی کے بارے میں انگریزی تصنیف)

6- اشتہاریات (اشتہاریات کے موضوع پر اردو زبان میں پہلی بھرپور کوشش جو ایم اے (شعبہ ابلاغ عامہ) کے طلبہ کی رہنمائی کرتی ہے)

7- The Straight Path (دینی موضوعات "پرڈان" میں شائع شدہ مضامین کا انتخاب)

8- ہر شاخ پہ.... ("جنگ" اور "نوائے وقت" میں شائع شدہ مزاحیہ مضامین کا انتخاب)

9- From Here to Fraternity (سفرنامہ برطانیہ)

10- بر سبیل تبصرہ (مزاحیہ تنقیدی مضامین کا انتخاب۔ زیر اشاعت)

معین قریشی اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کی بدولت بیشتر قومی اور بین الاقوامی تنظیموں سے شیلڈز' ایوارڈز اور تعریفی اسناد وصول کر چکے ہیں۔ ان میں 1996ء-1994ء کے لئے بہترین اردو کالم نویس کا اے پی این ایس ایوارڈ اور نقد انعام (جو وزیر اعظم پاکستان نے دیا تھا) حکومت سندھ کے محکمہ ثقافت کی شیلڈ' کراچی یونیورسٹی جرنلزم المنائی ایسوسی ایشن کی طرف سے تعلقات عامہ کے شعبے میں بہترین کارکردگی کا ایوارڈ' چالیس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت سندھ کی جانب سے ایک لاکھ روپے کا نقد انعام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تعلیمی شعبے میں حاصل کردہ گولڈ میڈل' وظائف اور میرٹ سرٹیفکیٹس ان کے علاوہ ہیں' اس لئے کہ معین قریشی صاحب نے تقریباً ہر امتحان میں کوئی نہ کوئی امتیازی پوزیشن ضرور حاصل کی ہے۔ اگر ان میں سروس کے اعزازات بھی شامل کر لئے جائیں تو احساس ہوتا ہے کہ موصوف تمام عمر انعام ہی بٹورتے رہے۔ تاہم جو لوگ دوسروں میں قہقہے بکھیرتے ہیں بلاشبہ ان کا استحقاق بنتا ہے۔

معین قریشی سے سوالات کی نوعیت مختلف رہی۔ میں نے پوچھا۔ طنز و مزاح میں اتنے کم لکھنے والے کیوں ہیں؟

کہنے لگے دراصل غم انسانی فطرت سے زیادہ قریب ہے۔ انسان روتا ہوا دنیا میں آتا ہے اور رلاتا ہوا جاتا ہے۔ درد نے کہا تھا۔

شمع کے مانند ہم اس بزم میں

یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ لکھنا نسبتاً آسان ہے اور المیہ لکھنا آسان تر ہے کیونکہ قاری کا ذہن اسے قبول کرنے کے لئے پہلے سے تیار ہوتا ہے۔ مزاح نگار کو فطرت کی "خلاف ورزی" کرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ایک ایک جملہ "جننا" پڑتا ہے تب کہیں جا کر پڑھنے والے کے لب پر مسکراہٹ بکھرتی ہے اور اگر قہقہہ لگ گیا تو یہ لکھنے والے کا بونس ہے۔ کیفیت یہ ہوتی ہے کہ بقول شاعر۔

یوں ہی تو آتا نہیں ہجر میں وصال کا رنگ
زمین شور میں سبزہ اگانا پڑتا ہے

ہمارا دوسرا سوال تھا۔ پاک و ہند کے متعدد مزاح نگاروں نے ادب پر دیرپا نقوش چھوڑے ہیں۔ آج ان جیسے کتنے ہیں؟ مستقبل میں کیا یہ صنف ادب چوٹی کے قلم کاروں سے محروم ہو جائے گی؟ معین نے لمحہ بھر کو سوچا پھر کہا۔ اگر آج کی بات کر رہی ہیں تو الحمد للہ مشتاق یوسفی صاحب ہم میں موجود ہیں جو اپنی ذات میں اردو کے مزاحیہ ادب کا ایک عہد ہیں۔ شفیق الرحمن اور محمد خالد اختر بقید حیات ہیں۔ کرنل محمد خان نے حال ہی میں وفات پائی ہے دیگر مزاح نگاروں میں عطاالحق قاسمی' اظہر صدیقی' قمر علی عباسی' مختار زمن' ارشاد احمد خان اور بھارت میں یوسف ناظم' مجتبیٰ حسین' فیاض علی فیضی وغیرہ باقاعدگی سے لکھ رہے ہیں جبکہ بہت سے نو آموز بھی خاصے ہونہار نظر آتے ہیں۔

یہ باتیں اپنی جگہ' مجھے آپ کے سوال میں موجود ایک محاورے پر ایک ادبی لطیفہ یاد آ گیا۔ عرصہ گزرا کنور مہندر سنگھ بیدی ایک مشاعرے کی نظامت کر رہے تھے۔ فنا کانپوری صاحب کو مائیک پر بلاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "سامعین کرام! اب آپ چوٹی کے شاعر حضرت فنا کانپوری کو سنیں گے۔" فنا صاحب نے مائیک سنبھالا اور اپنی ریش مبارک پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "سردار جی! چوٹی کے شاعر آپ ہوں گے۔ ہم تو ڈاڑھی کے شاعر ہیں۔"

مختصر یہ کہ مزاحیہ ادب کو انشاء اللہ چوٹی کے قلم کار بھی میسر رہیں گے اور "ڈاڑھی" کے بھی۔

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

میرا اگلا سوال تھا آپ نے کن ادیبوں کو پڑھ کر یہ صنف ادب اپنائی اور آپ کب سے لکھ رہے ہیں؟ جواب ملاحظہ ہو۔

میں اس سلسلے میں اپنی کتاب "ہر شاخ پر..." کے دیباچے کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ ہم نے اس وقت لکھنا شروع کیا تھا جب شریف بچوں کی عمر واقعی لکھنے کی ہوتی ہے یعنی کوئی گیارہ بارہ

سال۔ یہ 1953ء کی بات ہے۔ جب دو پن (بچپن اور لڑکپن) گزار کر ہم نے پن (جوانی) کے خطرناک دور میں قدم رکھا تو رسم دنیا' موقع اور دستور کے عین مطابق ایک عدد محبوبہ کی تلاش شروع کردی' اس لئے کہ روٹی' کپڑا' مکان کار اور کرپشن کی طرح (بقول شاعر) عشق انسان کی ضرورت ہے۔ خوش قسمتی سے یہ محبوبہ ہمیں ایک دن راہ چلتے صدر کی ایک فٹ پاتھ پر مل گئی۔ اور وہ بھی صرف دو روپے میں۔ جی ہاں! سیکنڈ ہینڈ کتاب کی ان دنوں یہی قیمت ہوا کرتی تھی۔ اپنے وسائل سے اپنی دسترس میں آنے والی یہ پہلی کتاب شفیق الرحمن کی "لہریں" تھی۔ اس نے ذہن میں طنز و مزاح کی جو لہریں پیدا کیں وہ اب تک مرتعش ہیں۔ پھر "حماقتیں" ہاتھ آئی تو ساتھ کے عشرے میں ہم خود بھی "حماقتیں" کرنے کے قابل ہو گئے۔ ہمارے "ذوق حماقت" کو مجید لاہوری کے "نمکدان" نے جلا بخشی جو اپنے دور کا ایک معیاری مزاحیہ جریدہ تھا۔ ہماری تحریریں اس میں آنے لگیں تو یہ حال ہو گیا کہ تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا۔ 1985 میں "جنگ" میں ایک باقاعدہ کالم "برجان درویش" کے عنوان سے شروع کیا۔ اب گذشتہ دس سال سے یہی درویش "نوائے وقت" کے در پہ صدائیں دے رہا ہے۔ اسی اثنا میں متفرق تحریریں ملکی اور غیر ملکی اخبارات و جرائد میں جگہ پاتی رہیں۔ ان میں اردو پنچ' چہار سو (راولپنڈی) اردو ڈائجسٹ (لاہور) نئی عبارت (حیدر آباد' سندھ) شگوفہ (حیدر آباد' دکن) مشرق (کلکتہ) اردو ٹائمز' آواز اور عوام (نیویارک) اردو ادب (گلاسگو) کے علاوہ کراچی کے روپ' سب رس' منشور' رابطہ' ظرافت' دنیائے ادب اور صبح نو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میں نے یہ بھی پوچھا کہ آپ کی کالم نویسی ایک اچھے طنز نگار کو نہیں لے ڈوبی؟ فوراً" بولے۔ میں آپ کے اس سوال کے جواب ضمیر جعفری صاحب کے الفاظ میں دوں گا۔ "ہر شاخ پہ...." کے پیش لفظ بعنوان "مزاح کا چشمہ کوہستان نمک" میں مرحوم نے لکھا ہے "کچھ عرصے سے معین قریشی کا جھکاؤ کالم کی طرف زیادہ تھا مگر یہ دیکھ کر حیرت آمیز خوشی ہوئی کہ انہوں نے یہ مضامین فکاہی ادب کے ٹھیٹھ دھارے کے درمیان کھڑے ہو کر لکھے ہیں جن میں سے بعض کی چھاؤں برگد کے درختوں کی طرح عرصہ دراز تک گھنی اور سہانی رہے گی۔ ان کے اسلوب کو میں "سوچتی ہوئی شگفتہ انشائیہ نگاری" کا اسلوب قرار دوں گا جس میں کالم کا ذائقہ تو ضرور ہوتا ہے مگر "پھوک" نہیں ہوتا۔" کچھ یہی بات یوسفی صاحب نے اس طرح کہی "سماجی اور سیاسی حالات و حوادث کے مضحک پہلوؤں کو نشانہ بناتے وقت فقط تفنن طبع معین قریشی کا مقصود نہیں ہوتا۔ عصری مسائل پر ان کے رواں دواں تبصروں سے طنز اور "ادبیت" کے علاوہ صحافیانہ باخبری کا بھی پتا چلتا ہے۔ کافی مضامین ایسے ہیں جو دلچسپ انشائیے کی تعریف و ذیل میں آتے ہیں۔"

اب گفتگو اہل قلم کے حال احوال پر ہونے لگی۔ چنانچہ میں نے پوچھا۔ پاکستان میں اہل قلم کی اتنی بے قدری کیوں ہے؟ گھمبیرتا سے کہنے لگے۔ بے قدری اہل قلم نے "رضاکارانہ" طور پر اپنائی

ہے۔ اس میں بنیادی طور پر غیر ممالک میں منعقد ہونے والے مشاعروں اور ادبی تقریبات میں شرکت کا شوق اور کچھ مالی منفعت کے عناصر کار فرما ہیں۔ اس کے لئے بیشتر ادیب اور شاعر بے توقیری مول لیتے ہیں۔ میں تین سال قبل لندن میں تھا۔ وطن واپسی سے تھوڑی دیر قبل میں نے گلاسگو میں رہائش پذیر اپنے ایک دوست سکندر کو فون کیا۔ میرا مقصد صرف حال احوال معلوم کرنا تھا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر مجھے گلاسگو آنے کی دعوت دی کہ "یہاں آج کل پاکستان کے ایک نامور شاعر آئے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ جو پروگرام ہوں گے ان میں آپ بھی شریک رہیں۔ ہم لوگ آپس میں تھوڑا سا کنٹری بیوشن بڑھالیں گے۔ چنانچہ پانی پانی کر گئی مجھ کو "سکندر" کی یہ بات۔

کبھی جی نہیں چاہتا کہ آپ اردو کے بجائے انگریزی میں لکھیں؟ کہ قدر و منزلت تو ہے۔ سوال سن کر کہنے لگے۔ دیکھئے آپ پھر مجھے خودستائی پر مجبور کررہی ہیں لیکن میں ان ذہنی حقائق (ground realities) کو کہاں لے جاؤں کہ میری اب تک جو نو کتابیں شائع ہو چکی ہیں 'ان میں پانچ انگریزی کی اور چار اردو کی ہیں۔ ایک عرصے سے یہ سلسلہ "لسانی مساوات" کی بنیاد پر چل رہا ہے چنانچہ آنے والی کتاب اردو میں ہوگی تو انشاء اللہ 5:5 کا توازن قائم ہوجائے گا۔ میرا ہفتہ وار مزاحیہ کالم "Crocodile Tears" ایک مقامی انگریزی روزنامہ میں پچھلے 18 سال سے مسلسل شائع ہورہا ہے۔ اردو کے فکاہیہ کالم "برجان درویش" کے علاوہ "ڈان" میں "Feature Friday" کے تحت دینی موضوعات پر لکھتا ہوں۔ میری اس تخصیص کے حوالے سے یوسفی صاحب رقم طراز ہیں "معین قریشی انگریزی میں باقاعدگی سے ایک شوخ سا کالم لکھتے ہیں۔ ایک فکاہیہ کالم اردو میں' دینی موضوعات پر انگریزی میں کالم ان کے علاوہ ہے۔ وہ تین قلم بڑے سلیقے سے استعمال کرتے ہیں اور کسی بھی قلم کو یہ خبر نہیں ہونے دیتے کہ دوسرا اور تیسرا کیا رقم کررہا ہے؟ میری انگریزی اور اردو تحریروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے "ڈاڑھی" کے مزاح گو شاعر پروفیسر عنایت علی خان لکھتے ہیں "ادب کے میدان میں کم کھلاڑی ہیں جن کے "لیفٹ" اور "رائٹ" دونوں بازو یکساں خوبی سے چلتے ہیں۔"

خواتین کا ذکر آیا تو میں نے پوچھا۔ طنز و مزاح لکھنے والی خواتین اہل قلم کیوں نہیں؟ معین نے شگفتگی سے جواب دیا۔ "خواتین تو طنز و مزاح کا پسندیدہ موضوع ہیں۔ موضوع خود نہیں لکھتا' اس پر لکھا جاتا ہے۔ کوئی بھی مزاحیہ تحریر دیکھ لیجئے اس میں آپ کو صنف نازک کا ذکر کہیں نہ کہیں لطیف انداز میں ضرور مل جائے گا گویا "بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر"

DR. S.M. MOIN QURESHI SIDDIQ HOUSE, 39/1,
KHAYABAN-E-SAHAR, D.H.A. KARACHI-75500 PAKISTAN

مجھے تم سے محبت ہے۔
مقصود

مقصود الٰہی شیخ
لندن

آج ۳ر اگست ۹۹ء ہے اور میرے بھائی کی سال گرہ ۵ر اگست کو ہے۔ ابھی ابھی میں نے گفتنی کی فائل سے ایک بڑا سا لفافہ اٹھایا ہے۔ اس میں بھائی کے کوائف' میرے سوالنامے کا جواب دو تصویریں اور عکس تحریر کے لیے ان کا لکھا ایک نایاب جملہ بھی رقم ہے۔ میں نے خطوط علیحدہ کیے' پہلے ملے دو ادھورے تعارف الگ کیے' پھر ان کی تصویر دیکھی۔ وہ مسکرا رہے تھے میں بھی مسکرانے لگی۔ "اچھے بھائی ہیں آپ۔ کیا بھائی اپنی بہنوں کو ایسے ہی پریشان کرتے ہیں؟ میں نے تصویر سے پوچھا۔"

میں جب کبھی اپنے سب سے چھوٹے بیٹے وقار سعید سے یہ سوال پوچھتی ہوں تو وہ چہرے پر ڈھیر ساری شرارت بکھیر کر کہتا ہے "میں تو اپنی اماں کو پریشان کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔" اسے بچپن سے ہی تنگ کرنے کی عادت ہے۔ "وقار اتنی چائے نہ پیو۔" میں کہتی ہوں تو وہ جواب دیتا ہے میں تو پیوں گا۔" مہربانی کر کے کان کے قریب منہ لا کر شور نہ مچاؤ۔ میں تو مچاؤں گا" بالکل یہی انداز مقصود الٰہی شیخ کا میری ساتھ رہا گو کہ وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔ چار پانچ سالوں پر پھیلی ہوئی۔

۱۹۹۵ء کی بات ہے ان کا ناول "دل ایک بند کلی" "شمع دہلی" میں قسط وار چھپتا تھا۔ "شمع" میری نو عمری کا ساتھی ہے۔ پاکستان میں ہندوستانی رسالوں کی آمد پر پابندی تھی تب بھی میں شمع ادھر ادھر سے منگواتی تھی۔ اس کے ادبی حصے کی دیوانی تھی۔ اور فلمی حصے میں "بمبئی" اپنے پیارے شہر کا ذکر پڑھتی تھی۔ مقصود الہٰی شیخ کا ناول ادھورا شائع ہوا تھا مگر مجھے اس کی "سعدیہ" بھولتی نہ تھی۔ ۱۹۹۵ء ہی میں میں نے "سخن ور دوم" پر کام شروع کیا تو شمع دہلی سے ان کا پتا لے کر خط لکھا کہ شعراء کے پتے فراہم کرنے میں میری مدد کریں اور میرا سوالنامہ ان تک پہنچا دیں۔ شیخ صاحب جانے کس موڈ میں تھے کہ انہوں نے یہ کہہ کر ہری جھنڈی دکھا دیں کی "اتنی آسانی سے شعراء حضرات جواب دینے والے نہیں کہ وہ سوالنامہ بھجوائیں اور شعراء حضرات لبیک کہیں۔ پھر بھی میں چاہوں تو خود کوشش کرلوں۔"

"ہائے" میں نے ایک لمبی سانس لی۔ ظالم شخص کچھ پتے ہی بھجوا دیے ہوتے!

پھر شمع انٹرنیشنل میں رحمٰن مہدی کی ایک رپورٹ پڑھی۔ ان کی بیگم سحر مہدی کا بھی ذکر تھا۔ میں نے انہیں خط لکھا۔ تعاون مانگا اور ان دونوں میاں بیوی نے اتنا تعاون کیا کہ مجھے نہ صرف لندن کے آٹھ دس شعراء شاعرات کا تعارف بھیجا بلکہ ان کی تصویریں بھی بھجوادیں۔ اور جب میں ۱۹۹۷ء میں لندن گئی تو میرے لیے ایک شام کا اہتمام بھی کیا۔ میں ان دونوں کی محبتیں زندگی بھر نہیں بھول سکتی اور اپنی دعاؤں میں انہیں یاد رکھتی ہوں۔ کچھ پتے گلشن کھنہ نے بھی بھیجے تھے۔ ان کی بھی شکر گزار ہوں۔

پھر ۱۹۹۸ء میں جب "گفتنی" پر کام شروع کیا تو میں نے پھر مقصود الہٰی شیخ کے دروازے پر دستک دی۔ میں اس افسانہ نگار کو اپنی کتاب میں شامل کرنا چاہتی تھی۔ انہوں نے پھر بے اعتنائی دکھائی (اسے ان کی انکساری کہہ لیں) مگر خط بڑا پیارا لکھا گو وہ سارے کا سارا کمپوز تھا۔ (اجنبیت کی فضا لیے ہوئے) ان دنوں وہ ہفت روزہ راوی کی وجہ سے کچھ یاسیت میں بھی مبتلا تھے۔ خط میں محبت کا اظہار تھا۔ مجھے بہن بنایا تھا۔ انہیں میں اداس کس طرح رہنے دیتی؟ میں نے رابطہ قائم رکھا اور یوں مقصود الہٰی شیخ میرے بھائی اور ان کی بیگم فریدہ میری بھابھی بن گئی ہیں۔

مجھے یقین تھا کہ میرے بھائی تک جب میرے دل کی آواز پہنچے گی تو وہ میری محبت پر لبیک کہے گا۔

پھر یہی ہوا۔ انہوں نے نہ صرف اپنا بلکہ ش' صغیر ادیب کا ہاتھ بتاتے ہوئے ان کا تعارف بھی فراہم کیا۔ اپنی کتابیں بھیجیں۔ اور آج ۳ اگست کو جب میں یہ تعارف لکھنے بیٹھی تو مجھے یہ پتہ چلا کہ پرسوں میرے بھائی کی سال گرہ ہے۔ اس دن مجھے فون کر کے انہیں مبارک باد دینی ہے اور ان کی میٹھی آواز سننی ہے۔ بھابھی فریدہ آپ کو بھی مبارک کہ میرے بھائی کی کامیابی

کی پشت پر آپ کا ہاتھ بھی ہے۔
مقصود الٰہی کہتے ہیں ان کی تاریخ پیدائش ۵ر اگست ۳۲ء بھی ہے اور یکم اپریل ۳۴ء بھی۔ جائے پیدائش گجرات (پنجاب) جامعہ کراچی سے بی اے کیا۔ پہلی ہجرت جولائی ۷ ۱۹۴ء کو دہلی سے گجرات کے لیے تھی۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۲ء تک کراچی میں رہے۔ ۳۱ مئی ۱۹۶۲ء کو پھر کراچی سے ہجرت کی اور ۱۹۶۵ء تک لندن میں رہے۔ ۱۹۶۵ء سے بریڈ فوڈ ویسٹ یارک شائر آئے اور اب تک وہیں مقیم ہیں۔ ان کے قلمی نام بھی کئی ہوئے۔ جیسے م۔ا۔ پرویز۔ ش' م الٰہی 'مقصود نغمی جہانگیر' بڈھا راوی اور شا۔

ان کے تین افسانوی مجموعے ہیں۔ ا۔ "پتھر کا جگر" ۱۹۶۷ء اس کے ۱۹۹۳ء تک تین ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ ۲۔ "برف کے آنسو" ستمبر ۱۹۷۵ء اسکے بھی ۱۹۹۲ء تک دو ایڈیشن شائع ہوئے ہے۔ ۳۔ "جھوٹ بولتی آنکھیں" ۱۹۹۳ء میں اس کا پنجابی ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔ ۴۔ ناولٹ "دل ایک بند کلی" ۱۹۹۶ء میں ان کے فن پر قیصر تمکین 'منشا یاد' ڈاکٹر محمد علی صدیقی' محمود ہاشمی کے علاوہ محترم احمد ندیم قاسمی بھی مضامین لکھ کر انہیں خراج محبت و تحسین پیش کر چکے ہیں۔ ان کے اسلوب اور ان کی سادہ زبان کی تعریف کر چکے ہیں۔
ان کے ناول "دل ایک بند کلی" کو جب میں نے ختم کیا تو میری آنکھیں نم نہ تھیں مگر میرا دل دکھ سے بوجھل بوجھل تھا۔ جیسے سارے آنسو حلق میں اٹک گئے ہوں۔ صفحہ ۶۲ پر مقصود الٰہی نے کتنی دل نشیں پر کاری کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ "مظہر کئی بار آیا۔ ڈاکٹر نسخہ لکھ کر چھوڑ جاتا تو دوائیں مظہر ہی لاتا رہا۔ سعدیہ کا جی چاہا کاش مظہر کبھی پہلے کی طرح پھول لے کر آ جائے۔ گلاب کی کلیاں' ٹیولپ ہو یا کارنیشن۔۔ اسے یاد آیا وہ سوچا کرتی تھی کہ کارنیشن' دو محبت کے متوالے اور ان کے سنجوگ میں کوئی رشتہ ہے ضرور۔ بندھن ہے ضرور جب ہی تو شادی پر کارنیشن ہی کالروں میں سجائے جاتے ہیں۔ کارنیشن کا نام شادی کے پھول کیوں نہ ہوا جیسے ہمارے ہاں گل داؤدی ہے۔ یہاں کارنیشن کو گل شادی کیوں نہیں کہا جاتا۔"
کتنی خوبصورت بات سمجھائی ہے مقصود الٰہی نے۔ کیوں نہ کسی مالی سے کہا جائے کہ وہ گلاب اور کارنیشن' یا ٹیولپ اور کارنیشن یا گل داؤدی اور کارنیشن ملا کر ایک تجربہ کرے۔ ایک نئے پھول کی شاخ لگائے اور اس سے جو پھول تخلیق ہو اسے ہم "گل شادی" کا نام دیں۔
مقصود الٰہی کو عصمت چغتائی مرحومہ نے ۱۹۷۷ء میں ایک خط لکھا تھا (اور بھی لکھے ہوں گے) مجھے اس کی ایک کاپی ملی ہے اس خط کی عبارت بڑی اہم ہے۔ اور محفوظ رکھنے کے قابل۔
مقصود الٰہی کی زندگی میں بڑے نشیب و فراز آئے ہیں۔ ہر انسان کی زندگی میں ایسے مراحل آتے ہیں مگر دوستوں کی جانب سے لگائے گئے زخموں کے گھاؤ حوصلے توڑ دیتے ہیں۔ لیکن شیخ صاحب کے حوصلوں کو بلندی ملی کہ وہ اپنے محاذ پر ڈٹے رہے۔ بریڈ فورڈ میں انہوں نے

"پاکستان سوسائٹی" کی بنیاد ڈالی اور اپنے دوستوں کے تعاون سے ہر ماہ ادبی محفلیں منعقد کرتے رہے۔ اور یہی نہیں پاکستانیوں کے حقوق کے حصول کے لیے تن من دھن سے لگے رہے۔ ان کے خلوص و محبت کی گونج پاکستان تک پہنچی ہوئی تھی۔ کیوں کہ محترم احمد ندیم قاسمی نے ان کی جدوجہد کو سراہتے ہوئے کہا کہ "مقصود الٰہی شیخ اور ان جیسے چند مخلص لوگوں کی محنت اور کاوش سے آج انگلستان میں بالواسطہ طور پر ایک ایسا پاکستان قائم ہو چکا ہے جو جری ہے' حوصلہ مند ہے' غیور ہے' اپنی انا کا جھنڈا سربلند کئے کھڑا ہے اور ناقابل شکست ہے"

بلاشبہ قاسمی صاحب اور کراچی کے جریدے ماہنامہ "افکار" کے بانی و مدیر جناب صہبا لکھنوی کی کاوشوں کے طفیل مقصود الٰہی کا ادبی و قلمی جہاد جاری رہا۔ انہوں نے ہفت روزہ "راوی" کا اجرا کیا۔ شمارہ ۹۵۶ تک تو اسے انہوں نے شائع کیا۔ مگر انہیں کاروبار کرنا نہ آیا۔ اور نہ کاروباری ہتھکنڈے آزمانے کا انہیں سلیقہ تھا لہٰذا آخری خبریں آنے تک انہوں نے "راوی" کو احباب کے حوالے کیا کہ وہ ہی اسے جاری و ساری رکھیں۔ ایسا کرتے ہوئے انہیں کتنا دکھ ہوا ہو گا اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو بوجہ مجبوری بہ حسرت و یاس اپنے ہاتھوں دوسروں کے سپرد کر کے اپنے اختیارات بھی انہیں دیے ہوں۔ میں نے جواب سوالنامہ ان کے سامنے رکھا تو ماحول بہت گھمبیر تھا۔ فضا سوگوار ہو چلی تھی۔ میں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے ان سے بیسویں صدی میں اردو ادب میں زندہ رہ جانے والے ادیبوں کے نام پوچھے۔ انہوں نے کہا۔ "بیسویں صدی میں اردو ادب کے حوالے سے زندہ رہ جانے والے چوٹی کے ادیبوں کی ایک فہرست بنتی ہے۔ یہ سوال اکیسویں صدی کے حوالے سے سوچا جائے تو اندھیرا چھا جاتا ہے کہ اس صدی مین اردو کے پھیلاؤ کے باوجود کوئی نام بالائے بام نہ آئے گا اور بیسویں صدی کی فہرست پڑھنے والے بھی پاکستان میں سمٹے ہوئے ہوں گے۔"

ان کا کہنا ہے جدیدیت نے فکشن کو نکھارا' سنوارا ہی نہیں نتھارا بھی ہے۔" (فکشن تو ان کا پسندیدہ موضوع بھی ہے۔)

موجودہ صدی میں اردو ادب میں ناول کم لکھے جانے کی وجہ بتاتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ "نادے فی صد اردو لکھاری جز وقتی ہیں جن کے پاس وقت ہے نہ اپنے دائرے سے باہر جھانک کر ناولٹی دیکھنے کے لئے فراغت۔ وہ ایک ایسے نظام میں جکڑے ہوئے ہیں جس میں اپنا اور لواحقین کا پیٹ بھرنے سے زیادہ اہم مسئلہ کوئی اور ہے ہی نہیں۔ پھر بھی ان کا ناول نگاری میں بڑا حصہ ہے۔ (کسی بھی کتب فروش سے فہرست مل سکتی ہے) کچھ لوگ ان میں سے نیچے سے اوپر بھی گئے مگر کم ناول لکھے جانے کی اصل وجہ وہ ایک فی صد امیر زادے ہیں جنہوں نے پورے ماحول کو مرعوب کئے رکھا' اپنے اسٹیٹس سے شہرت کمیٹی اور سجا "ٹرینڈ" اور

"ییلٹ" ابھرنے ہی نہ دیا۔ اوپر سے امیر زادے اور امیرزادیاں کسی قدر نک چڑھے تھے اور ہیں۔ ایسے کہ کسی کو پاس نہ پھٹکنے دیں۔ بہر حال ان میں شمیم اور انور کے فیاض علی ایڈووکیٹ، خواب ہستی والے محمد سعید، حجاب امتیاز علی اور تھوک کے حساب سے ناول لکھنے والے ایم اسلم (جن کا ایک ہی قابل ذکر ناول نرگس ہے وہ بھی ترجمہ) مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا اور قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" سے انکار ممکن نہیں۔ یہ میدان میں نہ ہوتے تو خلاء زیادہ قدرتی طور پر، پر ہوتا اور اردو ناول نگاری کے لیے زیادہ سازگار ماحول پیدا ہوتا۔"

میں نے ان سے پوچھا تھا کہ آج کا ادیب جو مادی، ذہنی اور نفسیاتی بحران میں مبتلا ہے اس کی زندگی بہتر کس طرح ہو؟

سوال سن کر انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔ "زندگی بہتر ہوگی تو ادیب مر نہ جائے گا؟"

معیاری ادب کے پیمانے شاعری ہو یا نثر کیا ہیں؟ بولے "عالمگیر سچائی گلی سے گلوب تک۔"

"شاعری کے مقابلے میں نثر کم لکھے جانے کی وجہ؟" میرا سوال تھا۔ ان کا جواب ہے۔ وباء، نقالی، تساہل، وقتی اور سستی شہرت و نمائش۔۔"

سوال نمبر۸ سن کر انہوں نے کہا۔ "سوال ہی غلط ہے۔ انگریزی الفاظ کی خواہ مخواہ بھرمار ہو رہی ہے۔ اردو زبان میں انگریزی کے الفاظ کی شمولیت سے گریز تو نہیں ہو رہا۔ اپنی زندگی کے یادگار واقعات اور لمحوں کی راکھ کریدتے ہوئے انہوں نے کہا۔ اہم لمحات تھے وہ، جب قائداعظم سے شملہ (۱۹۴۵ء) میں ملاقات ہوئی۔ پھر ۱۹۶۳ء میں وہ مسرت ناک "چونکاہٹ" کبھی نہ بھولے گی جو پردیس میں دیس کی ایک معمولی علامت (نشانی) دیکھ کر ہوئی تھی۔ اور... انہوں نے گفتگو میں تھوڑا سا وقفہ دیا پھر کہا۔ "سب سے اہم وہ "محبت" ہے جو آج بھی دل میں مستور ہے اور دلچسپ "واقعہ" وہ ہے جب جنس بیدار ہوئی تھی۔"

تنقید سے متعلق سوال کے جواب میں ان کا فرمانا ہے "مجھے اس سوال سے جزوی اختلاف ہے۔ تنقید ہو رہی ہے بعض نقاد گروہ بندی اور خویش پسندی کا شکار نہیں اور نہ کسی "ازم" کے مارے ہوئے ہیں۔ ماضی سے تقابل کیا جائے تو تراجم کم ہو رہے ہیں کیوں کہ اس میں محنت درکار ہوتی ہے۔ بہانہ یہ ہوتا ہے کہ وقت نہیں ہے۔ دراصل لوگ تساہل پسندی کا شکار ہیں۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں میں، میرے خیال میں پہلے کی نسبت خاصا کام ہو رہا ہے (باہر رہتے ہوئے معلومات نامکمل بھی ہو سکتی ہیں)۔ اردو زبان کو زیادہ نقصان ان لوگوں نے پہنچایا ہے جو یہ زبان منہ میں لے کر پیدا ہوئے اور اس کے فروغ سے، برتری کے زعم میں، صرف نظر اس لے کر رہے ہیں کہ یہ کام سرکار کا ہے اور پھر "دوسرے لوگ" کر تو رہے ہیں۔ یہ نظریہ کتنا

بھی قدرتی اور بظاہر بے ضرر ہو اس نے اردو زبان کو بہت نقصان پہنچایا اور رد عمل یہ رہا کہ لہجے، قواعد و صحت زبان سے غفلت میں ظاہر ہو کر رہا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

آخر میں لندن میں رہنے والے نامور ادیب محمود ہاشمی کی تحریر سے ایک اہم اقتباس ملاحظہ ہو۔

مقصود الٰہی شیخ کے مجموعہ "جھوٹ بولتی آنکھیں" کے نو افسانوں میں سے چار (کہ زنجیر نہیں ٹوٹی)، (آخری ملاقات)، (توڑ دو زنجیریں) اور (ابلق) برطانیہ کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ ایک اور افسانہ "لمحوں کا بھیس" کی کہانی وطن عزیز سے شروع ہوتی ہے۔ اور برطانیہ میں ختم ہوتی ہے۔ یہ عورت کے مرد پر ظلم کی داستان ہے۔ اور اسے کلا ئمکس پر لانے کے لیے برطانیہ کے ماحول اور یہاں کے قاعدہ قانون کا سہارا لینے ہی میں آسانی بھی تھی۔ دنیا کے قریب قریب ہر ملک کے معاشرہ میں عورت کو مظلوم سمجھا جاتا ہے۔ سوائے اردو کی پرانی روایتی غزل کے جس میں محبوبہ کی سب سے بڑی صفت ہی اس کا جفا پیشہ ہونا تھا۔ ادب اور شاعری میں عام طور پر مرد کے ہاتھوں عورت کے استحصال ہی کا ذکر ملتا ہے مقصود الٰہی شیخ کا یہ افسانہ "لمحوں کا بھیس" اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ اس مین عورت ظالم ہے اور مرد مظلوم۔

اس مجموعہ کے دوسرے افسانے وطن عزیز کی مٹی سے گوندھے گئے ہیں اور یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ میں اتنے سال رہنے کے باوجود یہاں ایک بھرپور اور خاصی مستعد عوامی زندگی بسر کرنے کے باوجود صحافی اور جسٹس آف پیس (شیخ صاحب بریڈ فورڈ میں کئی سال سے جسٹس آف پیس ہیں) ہونے کی وجہ سے یہاں کی زندگی اور اس کے مسائل کو قریب سے دیکھنے کے باوجود اگر ان کی جولانی طبع اپنے اصل کرشمے اسی وقت دکھاتی ہے۔ جب بات وطن کی ہو؟ تو اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ اگر افسانہ نگار مقصود الٰہی شیخ کو برطانیہ نے اس طرح متحرک نہیں کیا۔ جس طرح یہاں مقیم ہمارے بہت سے افسانہ نگار ہوئے ہیں۔ تو نہ سہی۔ کیا ضروری ہے کہ برطانیہ میں رہتے ہوئے صرف برطانیہ ہی کی باتیں کی جائیں۔ اگر وطن عزیز کے گھر، دیواریں، گلی کوچے اور وہاں بسنے والوں کی محبتیں و نفرتیں، حسد و رقابت، خوشی اور غمی کے لمحات ذہن پر غلبہ کیے ہوں۔ اور وہاں کے پہلوان، ان کے پٹھے، میاریں، کشتیاں، بشیرے اور جھورے بھلائے سے نہ بھولتے ہوں۔ تو ان کا ذکر کیوں نہ کیا جائے۔ اس سے ان کے فن افسانہ نگاری پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بلکہ ایک طرح سے وہ منفرد نظر آتے ہیں۔

MAQSOOD ILAHI SHAIKH 24 PARK HILL DRIVE
BRAD FORD (WEST YORKSHIRE) BD 8 ODF U.K

"چونکہ تمام جنگیں انسان کے ذہن میں جنم لیتی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ امن کے دفاع کی تعمیر انسان کے ذہن ہی میں کی جائے۔"

۱۰ اکتوبر ۹۹ء

منظور الامین
فیردیو، بھارہ بن
حیدرآباد

منظور الامین
حیدر آباد دکن

میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ "ہٹلر کی لائبریری میں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں تھیں مگر اس نے ان کو پڑھا نہیں تھا کیونکہ اس نے اپنا ذہن پہلے ہی سے بغیر کتابیں پڑھے بنایا ہوا تھا۔"

یہ جملہ مجھے اس وقت یوں یاد آیا کہ منظور الامین نے اپنے عکس تحریر میں لکھا ہے "چونکہ تمام جنگیں انسان کے ذہن میں جنم لیتی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ امن کے دفاع کی تعمیر انسان کے ذہن ہی میں کی جائے"

اور دفاع کی تعمیر بغیر علم حاصل کئے نہیں ہوتی۔ اس نکتے کو منظور الامین نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا، جان لیا تھا اور ذہن پر نقش بھی کر لیا تھا چنانچہ انہوں نے اپنے کام اور روزگار کے حصول کا شعبہ بھی وہ چنا کہ نہ صرف خود اپنا علم بڑھاتے رہے بلکہ وقت کی ضرورت اور تقاضوں کے پیش نظر عوام الناس کی راہوں میں بھی علم کے چراغ روشن کرتے چلے گئے۔

منظور الامین نے مختلف کالجوں اور جامعات میں درس و تدریس تو کی ہی مگر ریڈیو اور

ٹیلیویژن کے ذریعے انہوں نے لامحدود علم بھی حاصل کیا اور خدمات بھی انجام دیں۔ دکن ریڈیو حیدر آباد' آل انڈیا ریڈیو دہلی بمبئی لکھنؤ کشمیر' جے پور اور کئی شہروں میں ٹاکس پروڈیوسر' پروگرام ایگز یکٹیو' اسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر پھر ٹیلیویژن پر ڈائریکٹر ٹیلیویژن سٹلائٹ دوردرشن دہلی لکھنؤ بمبئی حیدر آباد پھر ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل اور ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل کے عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ روزنامہ منصف (حیدر آباد) کے ایڈیٹر رہے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن کے لئے ڈرامے' فیچرز' ڈاکو میںٹریز اور سیریلز اتنے لکھے ہیں کہ اب گنتی بھی یاد نہ ہوگی۔

اپنے کیریئر کے دوران انہوں نے دودھ بھارتی کو شروع کرنے اور اس کے پائیدار قیام کی ذمہ داری نبھائی۔ ٹیلی ویژن کے بین الاقوامی اشتراک کا مشہور پروگرام SITE کو امریکی سیٹلائٹ ATS-6 کے ذریعے ملک کے چار سو 400 دیہاتوں میں دکھانے کے انتظامات اور قیام کی ذمہ داری انہی کی تھی۔ ہندوستان کے کئی اہم شہروں میں ٹی وی کا پہلا اسٹیشن قائم کرنے کے علاوہ ان کی خدمات کی طویل فہرست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خدمت انہیں ودیعت کی تھی کہ علم کی روشنی پھیلاؤ۔ سو انہوں نے علم حاصل کر کے خود کو محدود نہیں رکھا۔ اردو' انگریزی' ہندی' فارسی اور مراٹھی زبانیں جانتے ہیں۔ عربی پڑھ سکتے ہیں۔ ان کے تحریر کردہ مضامین بیسویں صدی' شاعر' ناظر' سب رس' شمع' سیاست' گیان اور ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ قلم میں روانی' سلاست اور شیریں زبانی کے ساتھ ایسی خوب صورت کاٹ ہے کہ لفظ جڑے نگینے لگتے ہیں اور ہیرے کی کنی کی طرح کھب بھی جاتے ہیں۔

ان کی یہ تین کتب اکادمی ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں۔ ۱۔ بدلتے رنگ' ۲۔ جلیس آتش دان' ۳۔ حدیث دل

سافٹ ویئر پر مبسوط کتاب زیر تحریر ہے۔ منظور الامین نثر تو لکھتے ہیں ہی شاعری بھی خوب کرتے ہیں۔ ان کا شعر خود ان کی اپنی تعریف کے لئے بھی معتبر ہے۔

اس کا کلام بحر فصاحت کہیں جسے
اپنا سکوت عالم حیرت کہیں جسے

منظور الامین امراوتی میں ۱۴ جنوری ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم ایم اے ایل ایل بی تک حاصل کی۔ ہندی ادب کا ڈپلوما کورس کیا۔ کالج میں اپنی صلاحیتوں کی بنا پر کنگ ایڈورڈ میموریل اسکالر شپ حاصل کی اپنی زمین سے پیار کرنا انہوں نے بچپن سے سیکھا ہے۔ اپنی اس محبت کا اظہار انہوں نے تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس طرح کیا ہے ان کی نظم "سلطان شہید" سے دو بند ملاحظہ ہوں۔

گھر کی طرح سے پاکیزہ ہے سرنگا پٹم
جہاں بلند کیا۔ تو نے حریت کا علم

یہ سرزمین ہے وہ جس کی پاک گردن میں
بڑی حیا سے حمائل ہے رود کادیری
یہ سچ ہے حور شمائل ہے رود کادیری

کہ جنگ گاہ میں جاتے ہیں جب بھی اے سلطاں
جیالے تجھ سے، جری تجھ سے، اور جواں تجھ سے
قدم بڑھائے ہوئے تیغے اٹھائے ہوئے
ہتھیلیوں پہ سروں کے دیئے جلائے ہوئے

تو رزم گہ انہیں اک مادر شفیق آسا
گلے لگاتی ہے خوش ہو کے پیار کرتی ہے
محبتوں کے خزانے نثار کرتی ہے

جو سن سکے کوئی سن سکتا ہے پکار اس کی
لہو بہا ہے جو سنگم پہ سرفروشوں کا
یہ وہ لہو ہے جسے گنج شایگاں کہئے
ہزار شکر کہ وہ خون رائیگاں نہ گیا

گلوں کی طرح سے مہکے چمن چمن ترا نام
سحر کو جب تری شمشیر بے نیام ہوئی
حریف کے لئے بس زندگی کی شام ہوئی

جو شمع تُو نے جلائی تھی اے شہید وطن
اسے بجھانہ سکا، قتل کوئی کر نہ سکا
اسی سے آج بھی اپنے یہاں اجالا ہے

سوال نمبر ۲ کے جواب میں منظور الامین اقبال کا نام لے کر کہتے ہیں۔ "اقبال" اس صدی کے صرف ایک معتبر شاعر اور ادیب کا نام ہے، اقبال کا یہ شعر خود اسی پر صادق آتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ نام تو آنے والی صدیوں میں بھی معتبر اور یادگار رہے گا۔

سوال نمبر ۳ کے جواب میں انہوں نے کہا۔ "جدیدیت کو ہم Zeitgeist یا روح عصر

بھی کہہ سکتے ہیں' روح عصر کسی بھی دور کے احساسات اور انداز فکر کی عکاسی کا دوسرا نام ہے'
جدیدیت بحیثیت تحریک ہمارے ادب میں پچھلے کچھ برسوں سے سامنے آئی ہے۔ ن م' راشد
نے اس موضوع پر بات بڑے پر اثر انداز میں کہی ہے "اجتہاد کا جواز صرف یہ نہیں کہ اس
سے کس حد تک قدیم اصولوں کی تخریب عمل میں آئی بلکہ یہ کہ آیا تعمیری ادب اس میں سے
کسی نئی صبح کی طرح نمودار ہوتا ہے یا نہیں' اگر یہ نہ ہو تو اجتہاد بیکار ہے۔"

"قصہ مہرافروز و دلبر" (جسے اردو زبان کی اولین افسانوی تصنیف قرار دیا گیا ہے) سے لے
کر قرۃالعین حیدر کی "پت جھڑ کی آواز" تک اردو فکشن نے بڑی منزلیں طے کی ہیں۔
فکشن دراصل ایک حساس' تخلیقی ذہن کی پیداوار ہوتا ہے۔ جو کہانی کار دور حاضر کے رجحانات
اور تقاضوں کو سمجھ کر اپنی کہانیوں میں اپنے تخیل کی روشنی لے کر' اپج' حسیت اور اخلاق کے
ساتھ جدید علم نفسیات کے مطابق جدیدت کی مثبت قدروں کی عکاسی کرتے ہیں اور جن کے
نقطہ نظر میں توازن ہوتا ہے ان کی کہانیوں میں فکشن کے آرٹ کا حسن اور لطافت برقرار رہتی
ہے آج کے فکشن لکھنے والوں کے خیالات اور افکار پچھلی نسلوں کی صدائے بازگشت نہیں۔"

اس صدی میں اردو ادب میں ناول لکھے تو گئے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر معیاری نہیں
نہ ان میں کہانی کا تانا بانا ٹھیک سے بنا گیا ہے نہ وہ ناول کی تکنیک پر پورے اترتے ہیں۔

اردو زبان میں ناول انگریزی ادبیات کے اثر سے آیا' انگریزی میں آج بھی بہترین ناول
لکھے جارہے ہیں ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں انگریزی کا چلن کم ہوتا جارہا ہے اردو
کے ادیب انگریزی سے دور ہوتے جارہے ہیں جو Inspiration انہیں انگریزی ناولوں سے
ملتا تھا اب اس کے ملنے کا سوال ہی نہیں' اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کا علم کم ہو گیا ہے
مشاہدہ کم ہو گیا ہے' نظر کی گہرائی اور گیرائی دونوں ہی کم ہو گئی ہیں ساتھ ہی تجربہ بھی کم ہو گیا۔
اس لئے اچھے ناول نہیں لکھے جارہے ہیں لٰہذا پڑھنے کو کم ہی ملتے ہیں۔ ایک اور وجہ یہ ہے کہ
آج زندگی کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ انسان سنبھلنے ہی نہیں پاتا۔ روزمرہ کی زندگی میں ریڈیو'
میگزین' اخبار' سینما اور ٹیلی ویژن بڑے پیمانے پر آ گئے ہیں نتیجہ یہ کہ پیش بین
(Prospective) ناول لکھنے والوں کے پاس نہ تو اتنا وقت ہے کہ مناسب غور و خوض اور
مشاہدے کو بر سر کار لا کر ناول لکھیں نہ قاری کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ وقت نکال کر کئی دنوں
تک ناول پڑھتا رہے' اسی لئے مختصر مختصر کہانیاں مقبول ہو رہی ہیں اور ناول نگار' ناول کی
صنف ادب کو کم برت رہے ہیں۔

۵ ایک اعلیٰ تخلیقی فنکار کو رہنمائی کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اپنا راستہ آپ بناتا ہے۔

۶۔ معیاری ادب میں دو عناصر ہوتے ہیں جو اسے مستند بناتے ہیں یعنی کلاسیکیت اور
دوامیت کا عنصر۔

☆معیاری ادب میں وہ بات ہوتی ہے جسے فارسی میں کہا گیا ہے۔ "از دل خیزد بر دل ریزد" جو دل سے نکلتی ہے اور دل میں گھر کر لیتی ہے۔
☆معیاری ادب ہر چھوٹے بڑے، خاص و عام کی پسند بن جاتا ہے۔
☆معیاری ادب ذہنی شعبدہ بازی نہیں ہوتا۔
☆معیاری ادب کی فکری رو عوام تک پہنچ جاتی ہے۔
☆معیاری ادب مشاہدات، تجربات، خیالات، الہامات کا آئینہ ہوتا ہے۔
☆معیاری ادب میں ادیب کی آواز ایک نئے افق سے آتی آواز ہوتی ہے۔
☆معیاری ادب زوال پذیر (Retrograde) نہیں ہوتا بلکہ ترقی پسند ہوتا ہے۔
۷۔ اپنے امریکہ اور انگلستان کے دوران قیام میں نے دیکھا کہ مقامی ادیب نثر بھی اچھی خاصی لکھ رہے ہیں، نوجوانوں کی حد تک اس عمر میں وہ زندگی کے جس دور سے گزرتے ہیں اس میں RomanticStreak کا غلبہ ہوتا ہے، اس کی وجہ سے نوجوان عشق اور محبت، جذبات و احساسات کے نرغے میں گھر جاتے ہیں، اور غزل اردو کی ایک ایسی صنف ہے جو ان جذبات کی خوب صورتی سے عکاسی کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ اردو میں شاعری زیادہ ہو رہی ہے نثر لکھنے کے لئے ایک خاص رجحان طبع کی ضرورت ہوتی ہے
شاعری کے بارے میں ایک بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ شعر کہنے کے لئے ہماری زبان میں معیاری لفظیات موجود ہیں، گل و بلبل، شمع پروانہ سے لے کر قفس اور آشیانہ تک جن کو شعر گو آسانی سے استعمال کر لیتے ہیں لیکن نثر لکھنے میں یہ ریڈی میڈ سہولت نہیں۔ نثر لکھنے کے لئے موضوع کی تو کمی نہیں، کمی ہے تو صاحب نظر، تخلیقی فنکاروں کی جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے بقول وکٹر ہیوگر "اس دنیا میں ہر چیز بجائے خود ایک موضوع ہے جو کسی صاحب نظر کا انتظار کر رہی ہے۔

There is a statue in every block of stone.
What one needs is a sculptor.
with foreright and a creative streak in him.

۸۔ اردو کو اگر ایک زور آور اور متحرک زبان کی طرح زندہ رہنا ہے تو اسے اپنے دروازے اور دریچے بند نہیں کر لینا چاہئیں بلکہ... انگریزی ہی پر کیا منحصر ہے اسے ہر زبان کے الفاظ اور اصطلاحات سے استفادہ کرنا چاہئے۔
۹۔ زندگی کے بے شمار اہم واقعات میں سے یہ واقعہ کبھی بھلایا نہ جا سکے گا۔ اس واقعے کے ہم بھی ایک کردار تھے اور عینی شاہد ہیں۔
کچھ برس پہلے کی بات ہے ہم لوگ سری نگر کشمیر میں نگین جھیل پر رہ رہے تھے، یہ ان دنوں

کی بات ہے جب وہاں موسم خوشگوار تھا۔ وادی پر بادلوں کے سائے تھے۔ راقم کی بیوی ایک کہانی کار اور ناول نگار ہیں۔ یہ منظر انہیں اس قدر بھایا کہ اس کے پس منظر پر انہوں نے ایک ناول لکھنا شروع کیا اور وہ تین چوتھائی سے زیادہ مکمل ہو گیا۔ جس گھر میں ہم رہ رہے تھے اس میں ایک بڑا خوبصورت لان بھی تھا وہ Cherry pink and apple blossom کا موسم تھا جب وادی میں چیری کے پیڑ گلابی رنگ پھولوں سے بھر جاتے ہیں اور سیب کے درختوں میں دور دور تک سفید شگوفے کھل اٹھتے ہیں فضا میں ہلکی ہلکی خنکی رہتی ہے اور پیلی پیلی دھوپ بدن کو ذائقہ پہنچاتی رہتی ہے' ایک ایسے ہی دن ہم دونوں لان پر بیٹھے اپنے اپنے شغل میں مصروف تھے' فضا میں ہلکی ہلکی خوشبو بکھری ہوئی تھی جی چاہا کہ گرم گرم چائے کی چسکیاں لیں' بیویاں اپنے شوہروں کے ان کے محسوسات سے واقف ہوتی ہیں اس وقت یہی ہوا' بیوی اپنے ناول کے ڈھیر سارے کاغذات لان پر چھوڑ کر اندر کچن میں چلی گئیں تاکہ چائے بنا کر لائیں۔ ادھر ہم اخبار پڑھنے میں لگ گئے... اتفاق سے گھر کے لان کے سامنے کا گیٹ کھلا رہ گیا تھا۔ سڑک پر ایک گائے کا ادھر سے گزر ہوا' اس نے سامنے دیکھا لان پر ہری ہری دوب کا شائبہ ہے' گیٹ کھلا ہوا ہے اور ایک دخل در معقولات نہ کرنے والا شخص آرام کرسی پر دراز اخبار بینی میں مصروف ہے' گائے نے ناشتہ نہیں کیا تھا اس کے لئے یہ سنہری (بلکہ ہرا ہرا) موقع تھا لہٰذا وہ خاموشی سے لان پر آ گئی لیکن اسے دوب کو دیکھ کر مایوسی ہوئی ہوگی کیونکہ ایک دن پہلے ہی ہم نے لان کے سبزے کو کاٹ چھیل دیا تھا وہ دوب نہ کھا سکی کیونکہ وہ اونٹ کے منہ میں زیرہ ثابت ہوا سامنے ان کاغذوں کے ڈھیر تھے جن پر بیوی اپنا ناول لکھ رہی تھیں ان کاغذوں کے باطن میں گائے کو گھاس اور بانس کے ریشے نظر آئے جن سے کاغذ بنتا ہے اس کے لئے یہ دعوت عام تھی' گائے نے سارے کاغذات منہ میں بھر لئے دوسرے لفظوں میں پورا ہی ناول! انہیں چباتے ہوئے یقین ہے' اس نے منہ بنایا ہوگا۔ بیوی کا ناول اس نے پسند نہیں کیا ہوگا کیوں کہ ان کے طنزیہ اسٹائل میں اس نے بیوی کے کانٹے پائے ہونگے۔ سماج پر ان کی نکتہ چینی میں گائے کو ناگ پھنی ملی ہوگی۔ باقی جہاں تک کاغذ اور اس کے اجزائے ترکیبی کا تعلق ہے وہ گائے کی مرغوب غذا ثابت ہوئی ان کاغذوں کی جگالی کرتی وہ گیٹ کی طرف مراجعت کر گئی۔

اس خاکسار نے ایک بن بلائے مہمان کو گھر کی ضیافت میں اس طرح حصہ لیتے دیکھا تو فوراً ایک جست لگائی مگر گائے گیٹ کے باہر جا چکی تھی۔ اس اثنا میں بیوی چائے کے کپ لئے گھر کے باہر نمودار ہوئیں انہوں نے اپنے شوہر کو گائے دوڑ (بروزن گھوڑ دوڑ) میں حصہ لیتے دیکھ لیا تو پیالیاں نیچے رکھ کر وہ بھی اس ریس میں شریک ہو گئیں مگر چڑیا تو کھیت چگ چکی تھی۔ اپنے ناول کا حشر ہو جانے پر بیوی کو غصہ بھی تھا اور ملال بھی' وہ چائے کی جگہ غصہ پئے جا رہی تھیں

اور خاموش تھیں۔ کچھ دیر بعد خاموشی کی یہ دیوار ڈھے گئی ہم نے بیوی کی نازک کلائی تھامی اور انہیں انگریزی ادیب اور تاریخ نویس کے رسائل کا قصہ سنایا: "کارلائل نے جب اپنی کتاب انقلاف فرانس (French Revolution) مکمل کر لی تو وہ اپنے دوست جان اسٹورات مل کے پاس گیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ کتاب پر ایک غائر تنقیدی نظر ڈالے تاکہ تحریر کی کسی بھی خامی کو دور کیا جا سکے' مل نے وہ کتاب رکھ لی۔ وہ سرما کا بڑا شدید دور تھا خوب برف ہوئی تھی اور غضب کی ٹھنڈ تھی' مل کسی کام سے گھر کے باہر گیا تو اس کی خادمہ (چیمبرمیڈ - Chambermaid) نے جو ان پڑھ تھی مل کا ڈرائنگ روم گرم رکھنے کی غرض سے آتش دان میں آگ جلائی کوئلے اور لکڑی کی کمی ہو گئی تو خادمہ نے کارلائل کی کتاب انقلاب فرانس کے سارے کاغذ آتش دان میں جھونک دیئے' کتاب جل کر خاک ہو گئی۔

اگلے دن مل کو اس سانحے کا علم ہوا۔ اسے زبردست صدمہ ہوا مگر وہ کر ہی کیا سکتا تھا' کارلائل کو اطلاع ہوئی تو وہ دنگ رہ گیا۔ کارلائل نے اپنی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے۔

"مجھے ایسا لگا جیسے میرے ان دیکھے استاد نے میری لکھی کتاب کو چاک چاک کر دیا اور مجھ سے کہا "برخوردار تم نے اس کتاب پر پوری محنت نہیں کی اس میں کئی خامیاں ہیں' جاؤ اسے دوبارہ لکھو"

میری شریک حیات رفیعہ منظور الامین کا غصہ بھی اتر گیا تھا انہوں نے محسوس کر لیا کہ ایسا خدا کے حکم سے ہوا ہے انہوں نے اپنا ناول دوبارہ لکھا جو "سارے جہاں کا درد" کے نام سے قبول عام کی سند پا چکا ہے۔"

۱۰۔ تنقید لکھنے کے لئے Analytical mind یا ایک مخصوص مزاج اور انداز فکر کی ضرورت ہوتی ہے یہ مزاج اب مفقود ہوتا جا رہا ہے' ہندوستان میں اردو زبان میں ملک کی دیگر زبانوں سے تراجم ہو تو رہے ہیں مگر کم کم' ترجمے کے لئے مترجم کا دونوں زبانوں پر عبور ہونا ضروری ہے اگر وہ عبور نہیں رکھتا تو دوسری زبان سے کما حقہ انصاف کیسے کر سکتا ہے؟ تراجم کے ذریعے بلاشبہ اردو زبان کے علمی خزانے میں اضافہ ہو سکتا ہے۔"

MR. MANZOOR UL AMIN
3-B FAIR VIEW ROAD NO. 7
BANJARA HILLS, HYDERABAD 500034 INDIA

آرائش و تشہیر کے اس دور میں یارو
خونِ دلِ عشاق بھی محتاجِ حنا ہے

نعیم ۲۲ اکتوبر ۹۹ء

پروفیسر ڈاکٹر چودھری محمد نعیم
شکاگو

بزرگوں نے کہا ہے "حرکت میں برکت ہے۔" اور درست ہی کہا ہے ہم رائٹرز فورم کی دعوت پر ۱۷ ستمبر ۹۹ء بروز جمعہ کی شام ڈھلے کینیڈا پہنچے۔ منیر پرویز عابد جعفری اور اطہر رضوی ان تین فعال شخصیتوں نے یہ ہنگامہ خیز محفلیں سجائی تھیں یعنی جشن جون ایلیا ۱۸ ستمبر ۹۹ء کو اور میر تقی میر سیمنار ۱۹ ستمبر کے دن۔ اس سیمنار کے انعقاد کے لئے اطہر رضوی سرگرم تھے حالانکہ وہ ہیں خالصتاً" غالب کے پرستار۔ انہوں نے غالب کی زمینوں اور مصرعوں پر طرحی مشاعرے کرا کے کینیڈا میں دھوم مچا دی تھی۔ یہ سیمنار بھی اپنے شرکاء کے اعتبار سے منفرد تھا۔ اس میں دہلی سے ڈاکٹر تنویر علوی ڈاکٹر ظل ہما' بھوپال سے پروفیسر آفاق احمد' شکاگو سے پروفیسر نعیم چودھری اور کراچی سے منظر ایوبی نے شرکت کی تھی۔ کینیڈا سے ڈاکٹر خالد سہیل کی نمائندگی تھی۔ اسی سیمنار میں میری ملاقات پروفیسر نعیم چودھری سے ہوئی۔ میں نے انہیں "سخن در سوم" کا ایک نسخہ اور "گفتنی" کا سوالنامہ دیا اور گذارش کی تھی کہ اپنی رائے سے ضرور مطلع کریں۔

چند دن بعد مجھے پروفیسر صاحب کی جانب سے گفتنی کے لیے تعارف اور ان کا حوصلہ افزا خط ملا۔ لکھتے ہیں۔

محترمہ! "میں نے سخن ور حصہ سوم" جگہ جگہ سے پڑھی ہے اور آپ کے کام کی ستائش بھی دوسروں سے کی ہے اور اب وہ کتاب یونیورسٹی کی لائبریری میں جمع بھی کروادی تاکہ محفوظ ہو جائے۔ اسی لئے میں نے جواب نامہ بھی بھر کر بھیجا ہے۔" پروفیسر نعیم کے تعارف کے ساتھ تصویر نہ تھی اور نہ ہی عکس تحریر۔ میں نے یاد دہانی کا خط لکھا تو جواب آیا۔ "میں تصویر بازی اور پسندیدہ شعر وغیرہ کا زیادہ قائل نہیں' اسی لئے ٹال گیا۔ خیال تھا کہ آپ بھی ٹال جائینگی لیکن آپ کے لئے کتاب کا پیٹرن اہم ہے اور میرے لئے بات بڑھانا اہم نہیں اس لئے تعمیل حکم کرتا ہوں۔"

پروفیسر نعیم کا اہم تعارف یہ بھی تھا کہ ان کا خط پڑھتے ہوئے انکشاف ہوا کہ وہ شکاگو یونیورسٹی میں اردو زبان کی تدریس اور نصابی کتابوں کی تیاری کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ اس وقت ان کے ایک مضمون "امریکا میں اردو زبان و ادب کی تعلیم ایک جائزہ" کی کچھ جھلکیاں ذہن میں ابھریں جو میں نے پڑھ رکھا تھا اور رسالہ محفوظ کر لیا تھا۔ یہ مارچ ۸۲ء کا رسالہ "اردو دنیا" تھا جو شکاگو سے شائع ہوا کرتا تھا۔ میں نے فوراً" اپنی کتابوں اور جرائد کی الماری سے وہ رسالہ ڈھونڈھ نکالا مضمون کا ایک حصہ کٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کی فوٹو کاپی پروفیسر نعیم کو روانہ کی کہ اسے موجودہ درست معلومات کے مطابق (up todate) کر دیں۔

حالانکہ میں چودھری نعیم سے یا ان کے کام سے بالتفصیل متعارف نہیں تھی مگر جی کہہ رہا تھا کہ اس مضمون کے مصنف وہی ہیں اور میرے حوصلوں کو پر لگ گئے جب نعیم صاحب کا فون آیا۔ انہوں نے اس مضمون میں کچھ اضافہ کیا ہے۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے آپ جو اہم کام کر رہی ہیں اس کے پیش نظر ہمارا فرض ہے کہ تعاون کریں۔ انہوں نے بذریعہ فیکس یہ معلومات اور مکمل مضمون فراہم کیا جو یقیناً" بقول ان کے مضامین کے انبار میں کہیں پڑا تھا۔ مارچ ۸۲ء کے اس مضمون میں اردو سے متعلق بیش بہا معلومات ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"امریکہ میں اردو زبان کی تعلیم کی ابتداء پنسلوینیا یونیورسٹی میں ہوئی۔ صحیح تاریخ کا تو علم نہیں۔ غالباً" دوسری جنگ عظیم کے فوراً" بعد ہندوستان کی کلاسیکی زبان سنسکرت کی تعلیم تو عرصہ سے متعدد یونیورسٹیوں میں ہوتی چلی آ رہی تھی' لیکن برصغیر کی جدید زبانوں کی طرف توجہ سب سے پہلے پنسلوینیا ہی میں دی گئی۔ وہاں پروفیسر بنڈر ہندی' اردو اور برج بھاشا پڑھاتے تھے جو اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ کافی عرصہ بعد انہوں نے اردو کا ایک تعلیمی نصاب بھی شائع کیا جو بعض وجوہ سے زیادہ مقبول نہ ہو سکا۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں کیلیفورنیا یونیورسٹی' برکلے میں اردو کی تعلیم شروع ہوئی۔ اسی سال روس نے اسپوتنک چھوڑ کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور

امریکی حکومت کو احساس ہوا کہ سائنس کی تعلیم میں روس امریکہ سے بہت آگے نکلا جا رہا ہے تو طرح طرح کے تعلیمی پروگرام شروع ہوئے۔ اسی سلسلے میں ایک پروگرام غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کا بھی تھا جس کو قومی دفاع کا ایک اہم حصہ مانا گیا۔ اس پروگرام میں اردو کو بھی خاص اہمیت ملی۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک بڑی تیزی سے اس پروگرام کو روبہ عمل لایا گیا۔ لاکھوں ڈالر خرچ کئے گئے۔ متعدد یونیورسٹیوں میں جنوبی ایشیائی دراسات کے مراکز کھلے۔ طلباء کو خاص وظیفے دیئے گئے اور طرح طرح کے نصابات بھی تیار کئے گئے۔ ساتویں دہائی میں سرکاری امداد گھٹنی شروع ہوئی اور بہت سے پروگرام تعطل میں آ گئے۔ اب صورت حالات یہ ہے کہ کم از کم مندرجہ ذیل جامعات میں اردو کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہے۔

۱۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی۔ برکلے۔ ۲۔ اریزونا یونیورسٹی۔ ٹوسان ۳۔ وسکاسن یونیورسٹی۔ میڈ ۔سن ۴۔ منی سوٹا یونیورسٹی۔ مینا پولس ۵۔ شکاگو یونیورسٹی۔ شکاگو ۶۔ ہارورڈ یونیورسٹی۔ کیمبرج

ان اداروں میں اردو کے مختلف مداج کے کورس پابندی سے پڑھائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک) ڈیوک یونیورسٹی (ڈرہم) کنساس اسٹیٹ یونیورسٹی (من ہاٹن) اور پنسلونیا یونیورسٹی (فلاڈلفیا) میں بھی اردو کی تعلیم کا کسی نہ کسی شکل میں انتظام ہے (میں نے یہ فہرست یادداشت سے تیار کی ہے اس لئے ممکن ہے ایک آدھ نام چھوٹ گیا ہو)

۱۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی۔ برکلے۔ یہاں اردو کی تدریس کے ذمہ دار پروفیسر بروس پرے (PRAY) ہیں۔ آپ لسانیات کے ماہر ہیں اور اردو گرامر کے مختلف پہلوؤں پر مقالے شائع کر چکے ہیں۔ آپ کو عروض سے بھی خاص دلچسپی ہے۔ آپ کے اہتمام میں کئی برس سے ایک پروگرام جاری ہے جس کے تحت ہر سال منتخب امریکی طلباء کا ایک گروپ لاہور میں اردو زبان سیکھنے کے لئے چلا جاتا ہے۔ یہ اپنی طرح کا واحد پروگرام ہے اور بہت کامیاب بھی۔ پہلے یہ طلباء صرف تین ماہ کے لئے جاتے تھے اب یہ پروگرام نو ماہ کا ہوتا ہے۔

۲۔ اریزونا یونیورسٹی' ٹوسان۔ یہاں پروفیسر لنڑلی فلیمنگ (FLEMM NG) پڑھاتی ہیں۔ آپ نے وسکاسن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ آپ کا مقالہ سعادت حسن منٹو کی کہانیوں پر تھا' جو پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نگرانی میں تیار کیا ہوا تھا۔ یہ مقالہ اب کتابی شکل میں برکلے سے شائع ہو چکا ہے' نام ہے ANOTHER LONELY VO CE۔ آپ کو افسانہ اور ناول سے خاص دلچسپی ہا چنانچہ آپ کی زیر نگرانی دو طالبات اردو افسانہ کے مختلف پہلوؤں پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھ رہی ہیں۔

۳۔ وسکاسن یونیورسٹی۔ میڈ ۔سن۔ یہاں اردو کی تعلیم کی ابتدا دہلی کے خواجہ احمد فاروقی صاحب نے کی تھی مگر اس کو استحکام پروفیسر گوپی چند نارنگ نے دیا۔ نارنگ صاحب نے ایک نصابی کتاب اور متعدد دوسرے تدریسی رسائل بھی تیار کئے تھے۔ آپ کے جانے کے بعد یہاں

ڈاکٹر محمد عمر میمن کا تقرر ہوا۔ آپ اردو' فارسی اور عربی کے عالم ہیں۔ امام ابن تیمیہ پر مقالہ لکھ کر UCLA سے ڈگری لی ہے جو کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ بحیثیت افسانہ نگار آپ پاکستان میں ہی شہرت پا چکے تھے اور جدید اردو افسانہ میں آپ کو خاص درجہ حاصل ہے۔ آپ کی زیر نگرانی ایک طالبہ نے غالب پر مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کر لی ہے۔ آپ نے عبداللہ حسین' انتظار حسین بلراج مینرا اور دیگر افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے تراجم شائع کئے ہیں۔ ایک کانفرنس اقبال پر اور ایک دوسری کانفرنس اردو غزل اور ناول پر منعقد کی اور دونوں میں پڑھے گئے مقالات کو کتابی شکل میں الگ الگ شائع کیا ہے۔ موخر الذکر کانفرنس اپنی قسم کی پہلی کانفرنس تھی جو امریکہ میں ہوئی۔ اس میں شرکت کے لئے ہندوستان سے شمس الرحمٰن فاروقی اور پاکستان سے جیلانی کامران بھی آئے تھے۔ آج کل آپ مشہور افسانہ نگار انتظار حسین پر ایک مجموعہ تیار کر رہے ہیں جو "جرنل آف ساؤتھ ایشین لٹریچر" کے خاص نمبر کے طور پر شائع ہو گا۔

۴۔ منی سوٹا یونیورسٹی' مینا پولس۔ امریکہ میں اردو کی تعلیم کا کام کرنے والوں میں سرفہرست نام پروفیسر عبدالرحمٰن بارکر (BARKER) کا ہے جو منی سوٹا میں صدر شعبہ ہیں۔ لسانیات کے ماہر اور غیر معمولی شخصیت کے حامل پروفیسر بارکر نے اردو کا ایک تعلیمی نصاب تیار کیا ہے جو ہر پہلو سے مکمل اور جامع ہے۔ یہ نصاب پانچ کتابوں پر مشتمل ہے اور کئی کتابوں کے متعدد حصے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:۔ ابتدائی اردو۔ اردو اخباری زبان۔ نقش دلپذیر۔ اردو اخباری زبان کی الفاظ شماری۔ بزم نو اس کام میں ہندوستان اور پاکستان کے بعض نوجوان اساتذہ بھی شامل تھے مگر اصل ذمہ داری اور نگرانی آپ کی ہی تھی۔ اس کے علاوہ آپ نے بلوچی زبان کا نصاب بھی تیار کیا ہے۔ آپ کے اردو نصاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ساتھ استعمال کے لئے ٹیپ ریکارڈنگ بھی مہیا کی گئی ہے۔ بارکر صاحب کو پرانی کتابوں کا بھی شوق ہے اور آپ کی نجی لائبریری میں اردو مخطوطات اور نوادر کا خاصا بڑا ذخیرہ ہے۔ اتنا بڑا ذخیرہ برصغیر کے باہر شاید ہی کسی نجی لائبریری میں ہو۔ ان نوادر میں سے بعض پر اب بھی کام ہو رہا ہے۔ آج کل آپ کی زیر نگرانی ایک طالب علم نظیر اکبر آبادی پر مقالہ لکھ رہا ہے۔

منی سوٹا میں بارکر صاحب کے علاوہ پروفیسر ساجدہ علوی بھی اردو کا کام کر رہی ہیں۔ آپ تاریخ کی ماہر ہیں اور اردو کے کورس کے علاوہ تاریخ کے کورس بھی پڑھاتی ہیں۔

۵۔ شکاگو یونیورسٹی۔ شکاگو۔ یہاں راقم الحروف کام کرتا ہے میں نے ۱۹۵۷ء میں برکلے میں بحیثیت اسسٹنٹ کے اردو کی تدریس کا کام شروع کیا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں شکاگو میں تقرر ہوا۔ تب سے یہاں ہوں۔ میں نے اردو کی دو نصابی کتابیں تیار کی ہیں۔ ایک کا نام ہے۔ "انٹروڈکٹری اردو" دوسری کا نام ہے "ریڈنگز ان اردو" ۔ یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ شکاگو سے تین

طلباء اردو میں پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر کارلو کپولا (COPPOLA) کا "ترقی پسند تحریک" کے موضوع پر تھا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر برائن سلور (SILVER) کا "غالب کے تشبیہات و استعارات" پر تھا اور تیسرا مقالہ "اردو اور ہندی کے قصے" کے موضوع پر تھا جو ڈاکٹر فرین پر پچٹ (PRECHITT) نے تیار کیا۔ ڈاکٹر کپولا آج کل مشی گن کی۔ او کلینڈ یونیورسٹی میں تقابلی ادبیات پڑھاتے ہیں اور ساحر، مجاز، فیض، احمد علی وغیرہ پر مضامین شائع کر چکے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں کپولا اور میں نے انگریزی رسالہ "MAHFIL" کے نام سے نکالنا شروع کیا تھا یہ آگے چل کر JOURNAL OF SOUTH ASIAN LITERATURE کہلایا جو اب مشی گن سے شائع ہوتا ہے۔ اب کپولا صاحب اس کے مہتمم ہیں۔ اس میں اردو ادب سے متعلق مضامین انٹرویوز اور تراجم برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ۱۹۸۱ء سے میں نے ایک نیا رسالہ نکالنا شروع کیا ہے جس کا نام ہے ANNUAL OF URDU STUDIES یہ تمام تر اردو سے متعلق ہے اور سال میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا شمارہ مارچ ۸۲ء میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر برائن سلور آج کل ہارورڈ یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں آپ ستار نواز بھی ہیں اور ہندوستانی موسیقی پر مقالات شائع کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر فرین پر پچٹ نے گزشتہ دنوں ایک بہت اہم کتاب شائع کی جو انگریزی زبان میں شائع شدہ اردو ادب سے متعلق کتابوں، مقالوں اور تراجم کی جامع فہرست ہے اور جس کے اندراجات کئی سو کی تعداد میں ہیں۔ آپ نے اردو عروض پر بھی ایک کتاب تیار کی ہے جو ابھی شائع نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر پر پچٹ نے سنسکرت اور ہندی کا مطالعہ بھی کیا ہے آج کل منی سوٹا میں عارضی طور پر اردو پڑھائی جاری ہے۔ میرے ایک اور شاگرد آج کل اکبر الہ آبادی پر مقالہ لکھ رہے ہیں۔

۶۔ ہارورڈ یونیورسٹی۔ برسوں پہلے ایک غیر معمولی ہندوستانی جناب اوزائی درانی امریکہ آئے تھے اور یہاں انھوں نے اپنی ایجاد اور کاروباری کمال سے لاکھوں کمائے۔ آپ اردو کے پرستار تھے علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ آپ کی وفات ۱۹۶۴ء میں ہوئی۔ اپنی وصیت میں آپ نے نصف ملین یعنی پانچ لاکھ ڈالر کی رقم ہارورڈ یونیورسٹی کو دی تھی جس سے وہاں اردو زبان کی تعلیم کا کام شروع ہوا۔ ۱۹۶۶ء میں ایک پروفیسرشپ INDO ISLAMIC STUDIES کی قائم ہوئی جس پر بین الاقوامی شہرت کی حامل جرمن مستشرق ڈاکٹر انا ماری شمل (SCHIMMEL) کا تقرر ہوا۔ آپ ماہر اسلامیات ہیں اور تصوف آپ کا محبوب موضوع رہا ہے۔ اردو کے علاوہ ترکی، عربی، فارسی اور سندھی میں مہارت تامہ رکھتی ہیں۔ آپ کی تصنیفات کی فہرست طویل ہے۔ خاص اردو کے تعلق سے ایک کتاب غالب پر اور دوسری خواجہ میر درد پر شائع کی ہے۔ ایک مختصر تاریخ ادب

اردو بھی آپ نے شائع کی جو ابتدائی دور سے شروع ہو کر اقبال کے ذکر پر ختم ہوتی ہے۔ خود اقبال پر آپ کی متعدد تصانیف جرمن اور انگریزی میں ہیں جن میں سے ایک
GABRIEL S WING انتہائی وقیع خیال کی جاتی ہے۔ آپ کے مددگار کی حیثیت سے گزشتہ چھ برس سے ڈاکٹر برائن سلور بھی کام کر رہے ہیں۔ ان دونوں کی موجودگی نے ہارورڈ کو اردو دراسات کا خاص مرکز بنا دیا ہے۔ "درانی فنڈ" کے اہتمام میں کتابوں کی اشاعت کا پروگرام بھی ہے اور اب تک ایک کتاب شائع ہو چکی ہے جس کے مصنف لندن یونیورسٹی کے پروفیسر رالف رسل اور علی گڑھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر خورشید الاسلام ہیں اور جو میر، سودا اور میر حسن کی شاعری کا جامع مطالعہ ہے... اس کا نام ہے۔"

THREE MUGHAL POETS مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ کچھ اور لوگوں کا ذکر بھی یہاں ضروری ہوگا۔ ان میں سب سے اہم نام ڈاکٹر عبدالعظیم کا ہے جو آج کل علی گڑھ میں لسانیات کے صدر شعبہ ہیں۔ آپ نے کئی سال کیلی فورنیا یونیورسٹی برکلے اور کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک میں پڑھایا اور اردو کی "نصابی کتابیں بھی تیار کی ہیں۔ شکاگو میں مجھ سے پہلے جناب حفظ الکبیر قریشی آ گئے تھے اور میرا ان کا کچھ عرصہ ساتھ بھی رہا۔ آپ نے بھی نصابی کتابیں تیار کی ہیں۔ قریشی صاحب ایک عرصہ ہوا تدریسی کام چھوڑ چکے ہیں، لیکن اردو زبان اور ادب سے ان کا غیر معمولی شغف اب بھی انہیں مصروف رکھتا ہے۔ ان کا قیام ٹورانٹو، کناڈا میں ہے۔ ڈیوک یونیورسٹی میں ڈاکٹر معظم صدیقی بھی اردو کا کام کر رہے ہیں آپ فارسی اور عربی کے ماہر ہیں۔ تصوف خاص موضوع ہے اور آپ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ مرزا عبدالقادر بیدل پر تھا جس پر آپ کو کیلی فورنیا یونیورسٹی سے ڈگری ملی تھی۔

امریکی جامعات میں اردو کا الگ شعبہ کہیں نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہی ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ برصغیر کی زبانوں کے ساتھ اردو کی تعلیم کا انتظام جنوبی ایشیائی دراسات SOUTH ASIAN STUDIES کے پروگرام کے تحت کر دیا ہے مثلاً" شکاگو یونیورسٹی میں شعبہ کا نام ہے SOUTH ASIAN LANGUAGES
AND CIVILIZATIONS. اور اس میں اردو کے علاوہ سنسکرت، ہندی، بنگالی اور تامل کی تعلیم پابندی سے دی جاتی ہے۔ چونکہ اردو کے لئے طالب علم سب سے کم تعداد میں آتے ہیں اس لئے صرف ایک ہی پروفیسر تقرر کیا گیا ہے۔ اردو زبان کی ابتدائی تعلیم دو سال میں مکمل ہوتی ہے۔ تیسرے سال سے خاص موضوعات پر کورس شروع کئے جاتے ہیں جن کا سلسلہ دو سال چلتا ہے۔ زیادہ تر طلبا دو سال کے بعد ہی فارغ ہو جاتے ہیں، کیونکہ ان کا تعلق دوسرے شعبہ جات سے ہوا ہے اور وہ اردو محض معمولی ریسرچ کے کام کے لئے سیکھنا چاہتے ہیں۔ جن طلباء کو اردو سے خاص دلچسپی ہوتی ہے وہ چار پانچ برس پڑھتے ہیں اور ان کو اردو

ادب کے علاوہ کئی دیگر مضامین بھی پڑھنے ہوتے ہیں مثلاً" تاریخ' تقابل ادبی' ادبی تنقید و تحقیق کے اصول اردو کے علاوہ فارسی یا عربی بھی سیکھنی پڑتی ہے اور جرمن اور فرنچ بھی۔ جب تمام لازمی کورس پورے ہو جاتے ہیں تب ایک جامع امتحان ہوتا ہے۔ اس میں کامیابی کے بعد مقالہ کے موضوع کی منظوری کی منزل آتی ہے جس کے بعد طالب علم مقالہ لکھنا شروع کرتا ہے۔ چنانچہ پورے عمل میں پانچ سات برس لگ جاتے ہیں۔ عموماً" اس سے زیادہ ریسرچ کے سلسلے میں طالب علم ہندوستان یا پاکستان جا کر وہاں کے اساتذہ اور لائبریریوں سے استفادہ کرتے ہیں اور واپس آکر اپنا مقالہ لکھتے ہیں۔ جب مقالہ مکمل ہو جاتا ہے تو پھر ایک اور امتحان ہوتا ہے' جس میں کامیابی کے بعد ڈگری دی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں اردو کتابوں اور رسائل کے خاصے بڑے ذخیرے بھی ہیں جن میں زیادہ تعداد ان مطبوعات کی ہے جو ۱۹۶۴ء سے LAW 480 Public کے تحت ہندوستان اور پاکستان سے آتے رہے ہیں۔ ان مطبوعات کی خریداری ان مقامی رقوم سے ہوتی ہے جو ہندوستان اور پاکستان امریکہ' سے ملے ہوئے بعض امدادی قرضوں کی ادائیگی کے سلسلے میں دیتے ہیں۔ اب یہ رقوم ختم ہوتی جا رہی ہیں اور اس کا امکان ہے کہ یہ سلسلہ بالکل ہی بند ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو بہت کم لائبریریاں اردو مطبوعات جمع کر سکیں گی۔ یہ مضمون محض یادداشت سے لکھا گیا ہے اس لئے ممکن ہے بعض نام اور کام مذکور ہونے سے رہ گئے ہوں' اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

پس نوشت اکتوبر ۹۹ء

"ظاہر ہے گذشتہ سترہ اٹھارہ برس میں بہت کچھ بدل گیا ہے۔ ایری زونا یونیورسٹی اور منی سوٹا یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم کا وہ انتظام اب نہیں ہے اگرچہ موخرالذکر میں کچھ ترقی کی امید ہے۔ اس کے برخلاف کولمبیا یونیورسٹی اور پنسلوینیا یونیورسٹی میں پہلے سے بہت بہتر انتظام ہے۔ مزید یہ کہ نارتھ کیرولینا اور ٹکساس میں بھی اردو باقاعدہ پڑھائی جاتی ہے۔ (ورجینیا یونیورسٹی میں بھی) چنانچہ پانچ نئی جگہوں پر اردو زبان اور ادب کے مطالعہ اور تدریس کا اہتمام ہو چکا ہے۔ اس دوران طلباء کی تعداد اور نوعیت بھی بدلی ہے۔ اب وہ لوگ بڑی تعداد میں پڑھنے آتے ہیں جن کے لئے اردو ان کے یا ان کے والدین کے کلچر کی زبان ہے۔ امریکہ اور یورپ میں اردو کی تدریس اور اس میں ادبی اور تحقیقی پیش رفت کا سب سے بہتر ماخذ ANNUAL OF URDU STADUIES ہے جو پروفیسر محمد عمر میمن وسکانسن یونیورسٹی سے نکال رہے ہیں۔ اس کے نئے پرانے شماروں سے پتہ چل سکتا ہے کہ گذشتہ دو دہائیوں میں امریکہ اور یورپ میں اردو کے تعلق سے کیا مطبوعات' سیمنار' کانفرس وغیرہ ہوئے اور آئندہ کیا امید کی جا سکتی ہے۔"

اب ہم پروفیسر نعیم سے ان کے بارے میں کچھ گفتگو کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا۔ "میرا نام چودھری محمد نعیم ہے۔ جائے پیدائش بارہ بنکی (یو۔پی) ہندوستان اور تاریخ پیدائش اسکول اور پاسپورٹ کے مطابق ۶ جون ۱۹۳۶ء ہے مگر گھر کی روایت کے مطابق ۱۴ دسمبر ۱۹۳۴ء کہی جاتی ہے۔ ابتدائی تعلیم بارہ بنکی میں ہوئی۔ بی اے اور ایم اے (اردو) لکھنؤ یونیورسٹی سے کیا۔ لسانیات میں مزید تعلیم کے لئے پونا گیا' وہاں سے ستمبر ۵۷ء میں برکلے' کیلیفونیا آگیا یہاں لسانیات میں ایم اے کیا۔ ۶۱ء میں شکاگو آگیا جہاں شکاگو یونیورسٹی میں اردو زبان کی تدریس اور نصابی کتابوں کی تیاری کی ذمہ داری سنبھالی۔ تب سے شکاگو یونیورسٹی ہی میں ہوں اور بشرط حیات یہیں سے دو سال میں ریٹائر ہو جاؤنگا۔ میرے شعبہ کا پورا نام ہے "جنوبی ایشاء کی زبانوں اور تہذیبوں کا شعبہ۔" یہاں ابتدائی مدارج سے لے کر اعلیٰ تک اردو زبان اور ادب کی تعلیم کا کام مجھ ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ یہ وضاحت اس لئے کر دی کہ لوگوں کو یہ گمان نہ ہو کہ یہاں الگ اردو کا شعبہ ہے۔

پی ایچ ڈی کرنے والے جن طلباء سے میرا تعلق رہا ہے ان میں سے تین کا نام لینا میں یہاں ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ انہوں نے اردو کے تعلق سے خاص اہم کام کیا ہے۔ ڈاکٹر کارلو کپولا' مشی گن کی اوکلینڈ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ انہوں نے "ترقی پسند ادبی تحریک" پر کام کیا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں جب وہ طالب علم تھے تو ہم دونوں نے مل کر ایک رسالہ نکالنا شروع کیا تھا جس کا نام "محفل" تھا لیکن جس کی زبان انگریزی تھی۔ اس میں ہندوستان' پاکستان' بنگلہ دیش' سری لنکا وغیرہ کی زبانوں سے تراجم اور وہاں کے ادب کے بارے میں مقالے ہوتے تھے۔ کچھ سال کے بعد اس کا نام بدل کر JOURNAL OF SOUTH ASIAN LITERATURE کر دیا گیا۔ یہ رسالہ اب بھی نکل رہا ہے اگرچہ پابندی کے ساتھ نہیں۔ ڈاکٹر برائن سلور نے غالب پر مقالہ لکھا تھا اور اب وہ "وائس آف امریکا" کی "اردو سروس" کے مہتمم ہیں۔ ڈاکٹر فرانس پر پچٹ نے اردو اور ہندی کے قصوں پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا تھا جو شائع ہو چکا ہے۔ یہ آج کل کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور کئی اور تحقیقی کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انتظار حسین کے ناول "بستی" کا ترجمہ بھی کیا ہے اور جدید پاکستانی شعراء کی نظموں کے تراجم بھی کیے ہیں۔ اب "دیوان غالب" کی انگریزی میں شرح لکھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

JSAL کی ادارت اور اشاعت سے میں ۱۹۷۸ء میں الگ ہو گیا تھا۔ تین سال بعد "سال نامہ دراسات اردو" یا ANNUAL OF URDU STUDIES کے نام سے ایک مخصوص رسالہ اردو کے تعلق سے ترتیب دینا شروع کیا۔ دس سال میں سات شمارے نکالنے کے بعد اسے بند کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد ہی پروفیسر محمد عمر میمن نے اسے دوبارہ

جاری کیا اور پہلے سے کہیں بڑھ کر آب و تاب کے ساتھ اب وہ اسے پابندی سے شائع کر رہے ہیں اور ہر شمارہ پہلے سے بہتر ہوتا ہے۔

میں نے شاعری بھی کی ہے اور افسانے بھی لکھے ہیں' لیکن قدرت نے دونوں کی واقعی صلاحیت سے محروم رکھا ہے اس لئے جلد ہی تائب ہو گیا۔ اب بس اردو ادب اور اردو کلچر کے تعلق سے تحقیقی مضامین لکھتا ہوں یا پھر ہندی اور اردو سے تراجم کرتا ہوں۔

۲۔ ادب کی تواریخ تو ناموں کی فہرستیں ہوتی ہیں۔ ان میں سینکڑوں نام باقی رہیں گے۔ البتہ نئی صدی کے سنجیدہ تخلیق کار اپنے اپنے طور پر اس صدی کے مخصوص ادیبوں کی بازیافت کرتے رہیں گے۔ ظاہر ہے اقبال کا نام تو زندہ جاوید ہو چکا۔ دوسرے ناموں میں غالباً" یہ نام بہتوں کے لئے عرصہ تک سرفہرست رہیں: منٹو' فیض' راشد' انتظار حسین' قرۃ العین حیدر' ظفر اقبال' میراجی' نقادوں میں محمد حسن عسکری اور شمس الرحمٰن فاروقی۔

۳۔ اگر فکشن لطیف آرٹ ہے تو نظم بھی کثیف آرٹ نہیں۔ رہی بات جدیدیت اور ترقی پسندی کی' تو ان بحثوں میں پڑنا میرے جیسے منشیوں کے لئے مناسب نہیں۔

۴۔ تعداد میں تو اس صدی میں ناول نگاری گذشتہ صدی سے کہیں آگے پہنچ گئی ہے۔ غالباً" آپ کی مراد اچھے ناولوں سے ہے۔ تو یہ ضرور ہے کہ اردو میں یاد رہ جانے والے ناول بہت کم ہیں۔ ناول نگاری محنت چاہتی ہے۔ زندگی کا بھرپور تجربہ ہو' زبان بلکہ زبان کی مختلف سطحوں کا بخوبی اندازہ ہو اور ان پر عبور بھی ہو' تب تو ناول لکھا جا سکتا ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ بیشتر ناولوں میں زبان ابھی تک بری طرح شعر بلکہ غزل سے متاثر ملتی ہے۔ ایک دشواری یہ بھی ہے کہ سماج کو سمجھنے کے لئے ہمارے ادیب اور دانشور انگریزی استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے معاشرے کو ایک زبان کے ذریعے سمجھتے ہیں اور دوسری کے ذریعے اپنی سمجھ کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی حال ان کے قاریوں کا ہے۔ چنانچہ ابلاغ تو دور رہا محض اظہار بھی نہیں ہو پاتا۔

۵۔ بھئی' یہ بحران وحران تو ہر زمانے میں ہوتا ہے اور ہوتا رہیگا۔ رہی بات رہنمائی کی' تو اس کا جواب میاں نواز شریف اور اٹل بہاری باجپائی قسم کے لوگ بہتر دے سکتے ہیں۔

۶۔ جو چیز اچھی لگے وہ معیاری ہے۔ وہ چیز مجھے کیوں اچھی لگتی ہے اس کا جواب بہت کچھ اس پر منحصر ہے کہ صبح چاۓ اچھی ملی تھی کہ خراب۔

۷۔ نثر محنت چاہتی ہے اور نظم بھی۔ لیکن نظم میں تھوڑی محنت ہی مشاعرہ کی معراج تک پہونچا دیتی ہے۔ پھر یہ کہ نثر میں صرف دو مصرعوں سے کام نہیں چلتا۔ تیسرے یہ کہ نثر کے قاری آسانی سے نہیں ملتے۔ نظم یا غزل سننے والے تو عید بقرعید بھی مل جاتے ہیں۔

۸۔ اچھی تحریر میں ہر لفظ بلیغ ہو گا خواہ وہ انگریزی سے مستعار ہو یا عربی سے۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے یہاں الفاظ انگریزی سے اٹھا لئے جاتے ہیں لیکن جن تحریروں میں وہ الفاظ انگریزی میں

آتے ہیں ان تحریروں کا اردو میں ترجمہ شاذ ہی ہوتا ہے۔ بلکہ اب تو یہی صورت حال عربی اور فارسی الفاظ کی بھی ہوتی جا رہی ہے کیونکہ نیا اردو داں طبقہ فارسی اور عربی دونوں سے ناواقف ہوتا ہے اور اپنے پرانے ادب کو بھی نہیں پڑھتا یا پڑھاتا۔

۹۔ میری زندگی انتہائی غیر دلچسپ گذری ہے۔

۱۰۔ جی ہاں' ان سب باتوں سے اردو زبان اور ادب کو نقصان پہونچ رہا ہے۔

DR CHAUDHRI M NAEEM
5402 S DORCHESTER AVE
CHICAGO IL 60615-5309 U S A

"دوستی مذہب ہے۔ یہ دنیا میں نہایت شیریں، خوبصورت اور متبرک چیز ہے یہی چیز ہمارے زندہ رہنے کے لیئے ایک کشش رکھتی ہے۔" ایپی قورس (EPICURUS)

(دستخط)۔ آئش جولائی شنابو ے۔ جرمنی

نعیمہ ضیاءالدین

آئزن برگ۔ جرمنی

میں نے "شمع" نئی دہلی اور "شاعر" بمبئی میں نعیمہ کے افسانہ پڑھے تو نعیمہ سے گفتگو کے لئے دل بے قرار ہو گیا۔ نعیمہ کے افسانوی مجموعہ "منفرد" میں بانو قدسیہ کہتی ہیں.... نعیمہ عموماً ہجرت کی کہانی کہتی ہے۔ یہ کہانی کبھی تارکین وطن سے متعلق ہوتی ہے اور کبھی مقامی لوگوں کی نگاہ سے گھر اترے مہمانوں کو دیکھتی ہے۔

مدیر ماہنامہ "انشاء" کلکتہ ف۔ س اعجاز کی رائے ہے کہ "زندگی سے تفصیل چننا اور ادب کو دے دینا یہ ایک کرشماتی عمل ہے جس پر کم ہی افسانہ نگاروں کو قدرت حاصل ہوتی ہے۔ نعیمہ ضیاء الدین نے حقیقت کا جگر چیرنے کی صلاحیت اور تخلیقی اپج سے اچھا کام لیا ہے۔"

نعیمہ کی ہم عصر لندن کی افسانہ نگار صفیہ صدیقی کا کہنا ہے.... "نعیمہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کو زبان پر عبور حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی موضوع پر بھی اپنا قلم اٹھاتی ہیں تو ایک خوبصورت تحریر وجود میں آجاتی ہے۔"

یہ درست بھی ہے۔ "گفتنی" کے سوالوں کے جواب نعیمہ کے گہرے مشاہدے اور زبان پر

عبور کے گواہ ہیں۔ 1998ء میں نعیمہ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "منفرد" شائع ہوا ہے۔ اس پر اردو مرکز لاس اینجلس کی جانب سے ایک گراں قدر رقم کا "احمد اڈایا" ایوارڈ دیا گیا ہے۔ نعیمہ 2 فروری 1945ء کو ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ کئی سالوں سے جرمنی میں مقیم ہیں اور دیگر کاموں کے علاوہ اردو زبان و ادب کی بقاء کے لئے جہاد میں بھی مصروف ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

"اردو ادب کی تاریخ میں موجود رہ جانے والے ادیبوں کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ جائزہ پیش ہے لیکن اس سے قبل یہ بیان بھی ضروری ہے کہ کون سے ادباء کا تذکرہ کیا جائے۔ آیا جینوئن اسماء کا ذکر احاطہ تحریر میں لایا جائے یا صرف "پی آر" کا معاملہ پیش نظر ہو......؟ عصر حاضر میں پی آر کی وباء نے راست گوئی کو مکمل طور سے صاحب فراش کر دیا ہے۔ سچ کیا ہے اسے صرف سوچ تک محدود نہیں رکھنا چاہئے بلکہ زبان یا قلم کے ذریعے اس کا اظہار کرنا چاہئے۔"

تاریخ میں شاعری کے حوالے سے مستند اسماء غالب اور اقبال ہیں۔ میر' حالی' جوش' ن م راشد' میراجی' فیض' ساحرلدھیانوی' اختر الایمان' احمد فراز' پروین شاکر اور ابن انشاء ہیں۔ نثر نگاروں میں پریم چند' کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی' سعادت حسن منٹو' عصمت چغتائی' خواجہ احمد عباس' عظیم بیگ چغتائی' شفیق الرحمن' اے حمید' قرۃ العین حیدر' بانو قدسیہ' اشفاق احمد' ڈاکٹر وزیر آغا' احمد ندیم قاسمی' رام لعل' جوگندر پال' منشا یاد' قیصر تمکین اور عبداللہ حسین ہیں۔ لیکن یہ اسماء میری پسند یا خوش فہمی بھی ہو سکتے ہیں۔ حقیقت کی زبان میں ایک تحریر سے آپ کو آشنا کرانا ضروری ہے۔ جاوید چودھری ایک اچھے کالم نگار ہیں۔ ان کے اخبار "جنگ" میں تحریر سے اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

"بیگم سرفراز اقبال' پاکستان میں ادب' آرٹ اور دانش کی تاریخ ہیں۔ فیض صاحب سے لے کر پروین شاکر تک اور صادقین سے ابن انشاء تک شاید ہی کوئی نامور ادیب شاعر' موسیقار' مصور' صحافی اور سیاستدان ہو جس نے ان کے در حسن اور دہلیز اخلاق پر دستک نہ دی ہو۔ چند روز قبل بیگم سرفراز اقبال کو راولپنڈی کی ایک یونیورسٹی نے ان لوگوں کی ذاتی زندگی پر لیکچر دینے کی دعوت دی جن کے ساتھ ان کی رفاقت رہی۔ بیگم صاحبہ نے گفتگو کے لئے فیض احمد فیض' صادقین' ابن انشاء' محمد طفیل (نقوش) علی احمد تالپور' قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی کا انتخاب کیا۔ جب ان پر بات شروع ہوئی تو سرفراز اقبال یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ ایم ایس سی لیول کے زیادہ تر طلبہ اور طالبات ان ساتوں شخصیات کے بارے میں ذرا بھی نہیں جانتے تھے۔ چند طالب علم فیض صاحب' ابن انشاء اور شہاب صاحب کے نام سے تو واقف تھے لیکن وہ بھی یہ تمیز نہ کر سکتے تھے کہ ان میں شاعر کون تھا اور ادیب کون جبکہ پورے ہال میں ایک بھی نوجوان ایسا نہ تھا جو صادقین' احمد علی احمد تالپور یا محمد طفیل (نقوش) کے اسمائے گرامی سے واقف ہوتا....."

تیسرے سوال کے جواب میں جدیدیت سے مراد اگر مبہم' بے ترتیب نثر یا بے چرگی کی کیفیت پر مبنی بے تاثر گنجلک پن ہے تو اس طرز کا تخلیق اظہار' افسانے یا کہانی کے داخلی تاثر سے عاری ہونے کی بنا پر مجموعی طور سے اردو افسانے کی مقبولیت کو نمایاں انداز سے مجروح کرنے کا سبب بنا ہے۔ افسانے میں بنیادی عوامل کے لحاظ سے واقعہ' کردار' مکالمے اور کہانی پن کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ طرزِ بیان' جمالِ احساس و فکر' زبان کا مرصع و دلنشین ہونا' بیان کی روانی میں چونکا دینے کے عناصر پایا جانا یہ سب بعد کی چیزیں ہیں۔ کہانی جب کہانی نہ لگے تو اسے فنکار کی فنی خامی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جدید افسانے نے کہانی کا جو حشر کیا ہے' اس کے لئے شمس الرحمٰن فاروقی نے عمدہ تبصرہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں.... ''کہانی مرچکی ہے۔ اب اس کے کفن دفن کا انتظام کرنا چاہئے اور آج کے افسانہ نگاروں کو بھی اس کے ساتھ دفنا دینا چاہئے۔'' اگر مندرجہ بیان کے باوصف بھی کچھ قلم کار تجریدی رویے یا جدیدیت پسندی کے زعم میں مبتلا ہیں تو اسے ان کی کوتاہ نظری کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرز کے افسانے یا افسانہ نگاروں کا کہیں کوئی مستقبل نہیں۔ مشہور ناقد کلیم الدین نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ''چھٹی دہائی کے بعد ادب کی تخلیق ہی نہیں ہوئی۔ جو کچھ لکھا گیا ہے یہ ادب نہیں ہے۔''

سوال 4 کے جواب میں عرض ہے کہ جہاں تک ادب کے میدان میں ناول نگاری کا تعلق ہے' اس کی تخلیق میں کمی ضرور آئی ہے۔ عصرِ زمانے کی تیز رفتار دوڑ میں وقت کی عدم دستیابی ہے۔ جبکہ ظاہر ہے ناول نگار سنجیدہ' دقیق اور غیر معمولی ارتکاز کا طالب موضوع ہے۔ پھر اس میں عدم دلچسپی کی وجہ ایک حد تک جدیدیت کے بے ہنگم اور لغو فلسفے کی بھیڑ چال کی طرز پر تقلید کا رویہ بھی کہلا سکتا ہے۔

ہمارے ہاں مغرب سے براہ راست متاثر ہونے یا پیروی کرنے والوں کا ایک بڑا طبقہ پایا جاتا ہے۔ بقول کلیم الدین ''اردو ناول نے حقیقت نگاری کے امکانات کو پورے طور کھنگالا بھی نہ تھا کہ جدت کے اسطوری اور علامتی تصورات کے سوکھے بادلوں تلے حقیقت نگاری کا سورج گہنا گیا۔''

ایک اور بڑی وجہ موجودہ دور میں سیٹلائٹ اور کمپیوٹر کی بے پناہ ترقی ہے جس نے ناقابلِ یقین حد تک حقیقت نگاری کی مروجہ دستوری شرحیں تبدیل کر ڈالی ہیں۔ مکان و زمان کے تصورات' امنگیں' ولولے' تجسس کی فطری پیاس' فلسفہ و مناظر جگانے والی حسیات یا جذباتی و ذہنی تصادمات کا عمل دخل' نیز انسانی ازلی و ابدی رشتوں کی ہمہ گیری کا انمٹ تاثر ان سب پر کاری ضرب لگی ہے۔ تاہم چند بلند فکر ادیبوں کو ابھی بھی شوق بلند خیالی ہے۔ وہ ایک خاص قسم کے جذبہ جنوں میں مبتلا ہو کر صلے اور ستائش کی تمنا سے بے نیاز برابر تخلیقی فن کے نگار خانے سجائے رکھتے ہیں۔ ایسے ہی وسیع النظر فنکاروں میں ایک نام مستنصر حسین تارڑ کا ہے۔ ان کا ناول ''راکھ'' اس عشرے کی بلند پایہ تصنیف کہلانے کی مستحق ہے۔

معیاری ادب کیا ہے...؟ اس کا تعین بے حد دشوار ہے۔ میزبان ' ترازو' کسوٹی پیمانہ وغیرہ کی وضع کا باعث کون ہوگا یا کس سطح کو چھونے والے گراف کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ہاں یہ ہے۔ ادب کے معیار سے مراد اردو ادب کی مین اسٹریم میں شمولیت فرض کیا جائے تو اردو زبان میں اکثر عالمی معیار کے افسانے لکھے گئے ہیں۔ شاعری کے حوالے سے تو خیر فیض ایسے بلند قامت شاعر نے اردو ادب کو مالا مال کر ہی رکھا ہے۔ دراصل ہمارے ہاں لکھنے والوں کو بعض بے جا قسم کے رویوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ جانب داری' گروہ بندی' منفی تنقید نگاری' خاص قسم کا تعصب' ان تمام رجحانات کے سبب متعدد جینوئن قلم کاروں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے جوہر اور اپنے ہی خول میں سمٹ کر اظہار کے نئے وسیلوں اور ذہنی سطح پر تجربات کے نئے گل کھلانے سے قبل ہی خاموشی کی چار دیواری میں پناہ حاصل کر لینے کو عافیت گردانتے لگتے ہیں۔ معیاری ادب ہمیشہ سے روشن خیالی اور جائز و مخلصانہ تنقیدی نقطہ نظر کی فضا میں پنپ سکا ہے۔

شاعری کی ہمہ گیر بہتات اور نثری تخلیق کی جانب عدم توجہی کے اسباب کا جواب آپ کے اس سوال ہی میں پوشیدہ ہے یعنی وقت کی کمیابی۔

مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے تحت شائع ہونے والے "اخبار اردو" کے جائزے کے مطابق تو اردو زبان میں نئے الفاظ کی شمولیت کا گراف خاصا بلند ہے' جس میں انگریزی کے نئے الفاظ بھی شامل ہیں۔ مئی 1999ء کے شمارے میں محمد اسلام نشتر کے مضمون "سائنسی ادب" کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ "اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے جس کے اندر اپنائیت' قبولیت اور انجذاب کی فطری صلاحیت پائی جاتی ہے" آگے مزید کہتے ہیں.... آج دنیا بھر میں اردو ادب میں ایسے نئے نئے الفاظ اور روزمرہ محاورات شامل ہو رہے ہیں جو سائنس الاصل ہیں۔ یہی ادب کل اردو کا نمائندہ ادب ہوگا۔"

اردو ادب میں تنقیدی رویے کے سلسلے میں ایک طویل بحث کی ضرورت ہے۔ آخر کیوں ہمارے ہاں تنقید برائے ترقی کے بجائے تنقید برائے تغزل کی ریت جڑ پکڑتی چلی گئی۔ اس کے بڑے اسباب و عوامل کون سے تھے۔ اس طرز کے بیشتر سوالات کے جواب میں عصر حاضر کے ایماندار' غیر جانبدار و بلند خیال تبصرہ نگاروں میں سے سرفہرست' تنقید نگار قیصر تمکین کے ایک مضمون کا ذکر ضروری ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق "عام طور پر تبصرہ نگار' ادبی و نظریاتی کتابوں کا مطالعہ اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی سرکاری کارندہ' ذہنی ہسپتال کا معائنہ کرے۔ مریضوں کو کٹہرے' جالیوں' سلاخوں اور کھڑکیوں یا فاصلوں سے دیکھ کر جائزہ پیش کر دے۔ ادبی تنقید و تبصرے کے لئے تخلیق یا کتاب کے ماحول کا حصہ بن جانا اور اپنا فرض ایمانداری سے نبھانے کے لئے کرداروں یا دلیلوں سے باقاعدہ ہاتھاپائی کی ضرورت ہوتی ہے۔"

ایک مخصوص طرز فکر سے متاثر افراد تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ کتابیں لکھنے والے دراصل

ذہنی مریض ہوتے ہیں۔ قیصر تمکین ہی کے خیال کے مطابق "ادب کی دنیا میں صاحب ثروت اپنے اکھاڑے یا دبستان بناتے ہیں۔ راجاؤں و جاگیرداروں کی طرح ان کے بھی علاقے یعنی وسائل ہیں۔ ان کا اپنا نظام انصاف و بغاوت ہے 'سزائے جرم کا طریقہ ہے۔ جن لوگوں کو آپ دانشور سمجھتے ہیں وہ خود پست ترین گروہ بندیوں میں مبتلا ہیں۔ مغرب میں حلقہ بندی یا گروہ بندی بہت کم ہے۔ سبب اس کا وہی ہے کہ وہاں تعلیم عام ہے۔ وہ اپنے اوپر ہنستے ہیں' سفاکارانہ انداز میں اپنی کمزوریوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حقیقی فنکار وہی ہے جو پہلے خود تنقید کرے۔ اردو ادب میں ایسے کتنے نام ہوں گے کہ ہم تنقید کی تاریخ مرتب کر سکیں۔ تنقید کے حوالے سے وسیع تناظر میں بات کرنے کے لئے ہمیں پہلے مختلف ادوار میں لکھے گئے ادب کی صورتحال' تواتر سے تغیر پذیر مفاہیم کی نشاندہی' نیز اردو ادب میں افسانے یا شعر کی تاریخ کو بھی پرکھنا ہوگا۔ ایک وقت تھا کہ جب محض 'فہم اور دلائل پر مبنی ادب کو کلاسیکی ادب میں شمار کیا جاتا تھا۔ تخیل نگاری' جذباتیت وغیرہ محض فراریت کی علامات تھیں جن کا دخل ادب کی بلندی فکر کو گھٹا دیتا تھا۔ تخلیق کی ادبی قامت کی شناخت اگرچہ وقت کرتا ہے اور زمانے سے بہتر کوئی دوسرا ناقد نہیں جس کو تعصب کی عینک اتار کر تنقیدی داخلیت کے شعور سے سرشار ہو کر نتیجے کا اعلان کرنا ہے۔" تاہم آپ کے سوال میں بین اسطور تاثیر کے زیر اثر جس علمی و تحقیقی معیار تنقید کی نشاندہی کی گئی ہے' اس کے بارے میں وضاحت کے لئے پھر ایک بار قیصر تمکین کا ہی سہارا لینا پڑے گا۔ ان کا خیال اگرچہ تلخ ترین ہے لیکن حقیقت پر مبنی ہے۔ درج بالا مضمون میں ہی آگے چل کر وہ کہتے ہیں "علاقائی زبانوں میں (پاکستان کراچی یا گرد و نواح میں) جو ادب تخلیق ہو رہا ہے' اس میں مقامیت ہی نہیں' افسوسناک حد تک ذاتی رقابتوں اور سازشوں کا زور واضح ہے۔"

پاکستانی طرز حیات میں کہ جہاں بے یقینی' سازشیں' مصلحت پسندانہ رویے اور بے پناہ خود غرضی کا عمل دخل سیاست کو عوام کی روزمرہ زندگی سے لے کر کھیل اور ادب جیسے معصومانہ نیز زندگی کی جمالیاتی قوتوں کو بڑھاوا دینے والی سرگرمیوں پر بھی حاوی کر ڈالے' وہاں مجموعی ترقی تھم جاتی ہے۔ کل معاشرتی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگتا ہے۔ ظاہر ہے ادب بھی تو اسی معاشرے کا ایک حصہ ہے اسے نقصان پہنچانے سے کیونکر محفوظ رکھا جاسکتا ہے!

MRS. NAEEMA ZIAUDDIN
AM KALBS KOPF-1
63263 NEU-ISENBURG GERMANY

برصغیر میں اب سیاسی طور پر ہندوستان، پاکستان اور بنگلادیش کے نام سے تین الگ الگ مملکتیں ہیں۔ مگر اُردو تہذیب کے نام سے ایک ہمہ گیر تہذیب ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ گویا سیاسی طور پر تین مملکتیں ہیں، جن کی اپنی جغرافیائی حدود ہیں۔ لیکن اقلیمِ اُردو ایک ہے، جس کی کوئی حد بندی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس پر کسی قسم کی بندش ہے۔ اب تو بیرونی ممالک میں بھی اُردو کے اثرات بڑی تیزی سے مرتب ہو رہے ہیں۔

(از دیباچہ، تاریخِ ادبیاتِ اُردو، ص ۱۲)

ابوسعید نورالدین
۱۳ر جولائی، ۱۹۹۶ء

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین

ڈھاکا

16/اکتوبر ۶

محترم بزرگ ڈاکٹر ابوسعید نورالدین کا تعارف گو طویل ہو گیا ہے لیکن اس میں بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے۔ بہت سے انکشافات ہیں۔ ایک طرح سے یہ ایک دستاویز ہے جس کی اشاعت کبھی کبھی ہی وجود میں آتی ہے اور قارئین تک حقائق پہنچتے ہیں۔ ویسے بھی ڈاکٹر صاحب کی تحریر ایک تبرک ہے ہم سب کے لئے۔ عطیہ ہے ان کی محبتوں کا اور شفقتوں کا جس سے ہم فیضیاب ہو رہے ہیں۔

مجھے خوشی ہے اور میں ڈاکٹر صاحب کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے "گفتنی" کے لئے گزارش پر اپنا قیمتی وقت صرف کر کے اپنے پڑھنے والوں تک یہ قیمتی معلومات اور اپنی ادبی فکر پہنچائی۔

سلطانہ مہر

"ابوسعید نورالدین میرا پیدائشی نام بھی ہے اور قلمی نام بھی۔

ولادت یکم فروری 1929ء بہ مقام پانچرخی، تھانہ نندائل، ضلع میمن سنگھ، بنگلا دیش میں ہوئی۔

میں دس ماہ کا شیر خوار بچہ تھا کہ والدہ شکور النساء کا انتقال ہو گیا۔ ان کی شکل تک یاد نہیں۔ بڑی بہن حلیمہ خاتون اور سوتیلی ماں نے پرورش کی۔ پڑھنے لکھنے کے قابل ہوا تو حسب دستور ایک قاری صاحب سے قرآن پاک کا درس لیا۔ پھر گھر ہی کے مکتب میں ڈھائی سال تک تعلیم پائی۔ استاد ابو طالب سے بنگلا اور حساب کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ گاؤں کے اور بھی بہت سارے بچے میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ مگر ان کی تعلیم وہیں ختم ہو گئی۔ کوئی بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ مکتب کی تعلیم کے ساتھ والد بزرگوار مولوی عبدالحکیم کے سایہ عاطفت میں عربی' فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ رائج الوقت انگریزی طریقہ تعلیم اختیار کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ اس زمانے میں ہر جگہ بزرگوں کا فیصلہ مقدم ہوتا تھا۔ مجھے پڑھنے کا شوق تھا چنانچہ اللہ کے فضل و کرم اور اپنی محنت سے میں نے شیرپور سینئر اسلامیہ مدرسہ سے (جہاں میں تیسری جماعت میں داخل ہوا تھا) 1944ء مین دسویں جماعت یعنی "فاضل" کے فائنل امتحان میں درجہ اول میں کامیابی حاصل کی۔ علم دین وہ دولت ہے' جس کے لئے علامہ اقبال جیسے عظیم فلسفی شاعر نے بھی اپنی زندگی کے آخری ایام میں بڑے افسوس کا اظہار کیا کہ مواقع میسر آنے کے باوجود وہ علم حاصل نہ کیا اور اپنی عمر عزیز کو مغربی علوم کی تحصیل میں ضائع کیا۔ ان کے والد محترم شیخ نور محمد انہیں دینی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ مگر استاد گرامی قدر مولوی سید میر حسن کے کہنے پر انگریزی طرز تعلیم اختیار کیا کہ دنیا کی مادی زندگی میں اوپر چڑھنے کا زینہ گویا وہی ہے۔ اعلیٰ تر تعلیم انہوں نے یورپ میں حاصل کی۔ وہاں انہوں نے مغربی فلسفہ کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا جسے انہوں نے بعد میں بے کار کی مشق اور فضول قیل و قال سے تعبیر کیا۔

اس زمانے میں ایک طالب علم حسین احمد کے بارے میں سنا کہ وہ "فاضل" کے بعد اسلامک انٹرمیڈیٹ کالج میں داخلہ لے گا۔ مجھے تائید غیبی سے ایک رہنمائی مل گئی۔ میری بھی خواہش اعلیٰ تعلیم کے حصول کی تھی چنانچہ فاضل کا رزلٹ نکلا تو والد کے سامنے اپنا منصوبہ پیش کیا۔ پہلے تو وہ راضی نہیں ہوئے۔ ضد کرنے پر رضامند تو ہوئے' مگر شرط عائد کی' پہلے تم دینی تعلیم مکمل کر کے "ٹائٹل" "ممتاز المحدثین" کا امتحان پاس کر لو' پھر جو جی چاہے' کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ لہٰذا' والد صاحب مجھے "ٹائٹل" پڑھنے کے لئے مدرسہ عالیہ سلہٹ بھیجنا چاہتے تھے۔ جبکہ میں کلکتہ جانے کا خواہشمند تھا۔ چنانچہ میرے اصرار پر وہ راضی ہو گئے۔ جولائی' 1944ء کو میں کلکتہ پہنچا۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخلہ لیا۔ دو سال پڑھنے کے بعد 1946ء کے وسط میں دورہ ختم کیا' اور درجہ دوم میں ممتاز المحدثین کی سند حاصل کی۔ عربی میں تھوڑی بہت دستگاہ حاصل ہو گئی تھی۔ اس لئے بیشتر پرچے میں نے عربی میں ہی حل کئے اور کچھ اردو میں۔ اس زمانے میں میری اردو کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس بات کا زیادہ احساس بھی نہ تھا۔ گو کہ روانی سے لکھ لیتا تھا۔ مادری زبان بنگلا ہے۔ لوگوں سے عام بات چیت بنگلا ہی میں ہوتی ہے۔ لہٰذ' ہر لحاظ سے میری اردو اس زمانے میں

بڑی ناقص تھی۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ کے اساتذہ بڑے اونچے پایہ کے عالم اور اپنے اپنے موضوع کے ماہر تھے۔ مجھے فخر محسوس ہوتا ہے کہ ان جیسے باکمال ارباب فن سے کسب فیض کیا۔ ساتھ ساتھ آج اس بات کی صحیح قدروقیمت معلوم ہوتی ہے کہ والد کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ دل سے نہ چاہنے کے باوجود دینی تعلیم کی تکمیل کے لئے انہوں نے مجھے کلکتہ بھیجا۔ چونکہ میرا ارادہ 'اسلامک انٹرمیڈیٹ میں داخل ہونے کا تھا' اس لئے نجی طور پر' بالخصوص انگریزی میں اپنی صلاحیت بڑھاتا رہا۔ اس سے قبل ایک مرتبہ چھٹیوں میں اپنے پرانے ہندو ٹیچر سدھانگشو بابو سے' جن کا گھر ہمارے اپنے گھر سے زیادہ فاصلہ پر نہ تھا' انگریزی اور حساب پڑھتا رہا۔ کچھ دنوں کی محنت سے ان دونوں پرچوں کی تیاری اچھی ہو گئی۔ جولائی' 1946ء میں ڈھاکا جاکر اسلامک انٹرمیڈیٹ کالج میں داخلہ لیا تھا۔ گھر سے روانہ ہوا تو کئی روز کی مسلسل بادوباراں کے سبب چاروں طرف جل تھل تھا۔ طوفان نوح کا سا سماں۔ وفور شوق سے اسی حالت میں ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے میں سامان سفر پکڑ کر روانہ ہو گیا۔ غفار گاؤں کے ریل اسٹیشن' جو کوئی دس میل کی فاصلہ پر ہے' پیدل اور کشتی میں پہنچنا تھا۔ اور کوئی سواری نہیں تھی۔ بیچ راہ پر برہما پترا ندی۔ سیلاب کے پانی سے تینوں شاخیں ایک ہو گئی تھیں' اور کشتی کا راستہ بے حد لمبا ہو گیا تھا۔ ندی میں طغیانی بھی غضب کی تھی۔ بڑی مشکل سے ندی پار کر کے جب ریل اسٹیشن پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ معلوم ہوا' ڈھاکا شہر میں زبردست قسم کے ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں۔ لوگوں نے منع کیا' ہرگز ادھر کا رخ نہ کرنا۔ جان کا خطرہ ہے۔ چنانچہ بہ حالت مجبوری مخالف سمت کی گاڑی میں بیٹھ کر سراج گنج پہنچ گیا۔ وہاں بھی ایک اسلامک انٹرمیڈیٹ کالج قائم تھا۔ شہر اجنبی نہ تھا۔ وہاں پہنچ کر وہاں کے اسلامک انٹرمیڈیٹ کالج میں داخلہ لیا۔ انٹرمیڈیٹ کے فائنل میں (سابق مشرقی پاکستان کے) صوبہ بھر میں درجہ اول میں دوم آیا۔ ایک سال کے بعد میٹرک کے دو پرچوں کا امتحان دیا اور دو سال کے بعد انٹر کے فائنل میں امتیاز کے ساتھ پاس ہوا اور فرسٹ گریڈ سرکاری وظیفہ کا مستحق قرار پایا۔ یہ میرے لئے اعزاز کا باعث بنا۔ میں نے اسلامک انٹرمیڈیٹ کا امتحان 1948ء میں پاس کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ڈھاکا یونیورسٹی گیا۔ پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ چاروں طرف نیا جوش اور نیا ولولہ تھا۔ میں بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اردو میں بی۔ اے۔ آنرز' پھر ایم۔ اے۔ کرنا چاہا۔ مگر اس وقت تک یونیورسٹی میں اردو میں آنرز کورس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہم چند طالب علم جو مدرسہ عالیہ کلکتہ اور اسلامک انٹرمیڈیٹ کالج' سراج گنج میں ایک ساتھ پڑھ چکے تھے' اکٹھے ہوئے اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کے پاس گئے' جو اس زمانے میں صدر' شعبہ اردو وفارسی تھے۔ ہم سب ہی اردو بی۔ اے' آنرز کورس میں داخلہ لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہمدردی کے ساتھ ہماری بات سنی اور یونیورسٹی کو اپنا ایک مکمل منصوبہ بنا کر پیش کیا' جس میں اردو کی تدریس کے لئے متعدد نئے اساتذہ کا تقرر بھی شامل تھا۔ وہ اس زمانہ میں آرٹس فیکلٹی

کے ڈین اور اکاڈمک کونسل کے رکن بھی تھے۔ لہٰذا' ان کی کوششوں سے ان کا وہ منصوبہ بہت جلد پاس ہوگیا اور ہم سب امیدوار بی۔ اے۔ آنرز کے سال اول میں داخل ہوگئے۔ ہم کوئی پندرہ سولہ طالب علم تھے۔ آنرز کورس کے ساتھ قاعدے کے لحاظ سے اختیاری طور پر دو اور ذیلی مضامین لینے پڑتے تھے' جو پہلے دو سال میں ختم کرکے پاس کرنے پڑتے تھے۔ ان دو ذیلی مضامین کے لئے میں نے فارسی اور فلسفہ کا انتخاب کیا۔ کسے معلوم تھا' اس انتخاب سے میرے لئے آگے چل کر کئی راہیں کھلیں گی۔ فارسی میں نے مدرسے کی تعلیم کے دوران فاضل تک پڑھی تھی۔ فارسی اور فلسفہ کا امتحان 1950ء میں منعقد ہوا۔ میں نے اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ اردو میں نے بی اے آنرز اور ایم۔ اے دسمبر 52ء میں امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ڈھاکا یونیورسٹی سے اردو میں بی۔ اے آنرز کے ساتھ ایم۔ اے کرنے والوں کا پہلا بیچ ہمارا ہی تھا۔ اس لئے ہمیں اس میں اولیت حاصل ہے۔ ایم۔ اے۔ کا امتحان پاس کرنے کے بعد نتیجہ کے انتظار میں ابھی اپنی اقامتی رہائش گاہ فضل الحق مسلم ہال ہی میں تھا کہ کراچی سے نکلنے والے انگریزی روزنامہ "ڈان" میں 1953ء کے اوائل میں ایک اشتہار دیکھا۔ اس میں اقبال اکاڈمی پاکستان' کراچی کی جانب سے علامہ اقبال پر ریسرچ کرنے کے لئے امیدواروں سے درخواستیں طلب کی گئی تھیں۔ اہم شرائط میں' امیدوار کو فلسفہ یا فارسی میں ایم۔ اے۔ پاس ہونا چاہیے تھا۔ کسی دوسرے مضمون میں ایم۔ اے ہو تو بی۔ اے۔ کی سطح پر فلسفہ اور فارسی کے مضامین لازمی قرار دیئے گئے تھے۔ متبادل یعنی دوسری شرط پر میں پورا اترتا تھا۔ میں نے اگرچہ ایم۔ اے۔ اردو میں کیا تھا' لیکن بی۔ اے۔ آنرز میں' فلسفہ اور فارسی میرے ذیلی مضامین تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسلامیات میں مدرسہ عالیہ کلکتہ سے میں ممتاز المحدثین کا سند یافتہ تھا۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے' علامہ اقبال کے فلسفہ آمیز کلام کا دو تہائی حصہ فارسی میں ہے۔ ان کے کل پندرہ ہزار اشعار میں سے نو ہزار فارسی میں ہیں۔ باقی صرف چھ ہزار اشعار اردو میں ہیں۔ لہٰذا' ظاہر ہے کہ ان کی تعلیمات کو بہ احسن وجوہ گرفت میں لانے کے لئے ان چاروں شعبوں یعنی عربی میں اسلامیات' اردو ادبیات' مغربی اور اسلامی فلسفہ اور فارسی ادبیات پر تھوڑا بہت عبور رکھنا ضروری تھا۔ بہرحال' جو مقدر تھا' قدرت نے اس کے لئے تمام وسائل میرے لئے پہلے سے مہیا کردیئے۔ اب ذرا پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں تو پتا چلتا ہے' زندگی کے مختلف مراحل پر جو امور پیش آئے' وہ دراصل اسی کے ایما پر آئے' اور غالباً" ان ہی وجوہ کی بنا پر مذکورہ اشتہار میں فلسفہ اور فارسی کی قید لگائی گئی تھی۔ چنانچہ' میں نے درخواست بھیج دی۔ میری دانست میں سابق مشرقی پاکستان سے میرے علاوہ اور کوئی طالب علم وہ شرائط پوری نہ کرسکتا تھا۔ یونیورسٹی بھی اس زمانہ میں ایک ہی تھی۔ یہاں سے اگر ایک طالب علم کا بھی انتخاب ہوا' تو یقیناً" وہ میرا ہی نام ہوگا۔ اکاڈمی میں کل دو ہی ریسرچ فیلو لئے جانے والے تھے۔ ایک مغربی پاکستان سے اور دوسرا مشرقی

پاکستان سے۔ اگست' 1903ء کے شروع میں خط موصول ہوا کہ میرا انتخاب ہو چکا ہے' اور جلد از جلد مجھے کراچی پہنچ کر اقبال اکاڈمی میں رپورٹ کرنی ہے۔ خط ملنے پر خوشی کی انتہا نہ رہی اور 13' اگست 1903ء کو ایم۔ ایم۔ اصفہانی کی ڈکوٹا ایئرلائنز سے کراچی روانہ ہو گیا۔ میں نے علامہ اقبال پر اپنی ریسرچ کا موضوع اپنے استاد ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی کی صلاح پر' "اسلامی تصوف اور اقبال" کا انتخاب کیا تھا۔ وہ چونکہ علامہ پر درک رکھتے تھے اور ان کی کتاب "سیرت اقبال" لوگوں میں کافی مقبول تھی' اس لئے ان کی تجویز کو بلا سوچے سمجھے میں نے قبول کر لیا۔ اس پر ابھی تک کسی نے کام نہیں کیا تھا۔ اقبال اکاڈمی کونسل کی منظوری کے بعد میں نے فورا" اس پر کام شروع کر دیا۔ اقبال اکاڈمی چونکہ ابھی ابھی قائم ہوئی تھی' اس لئے اس میں کتابوں کا ذخیرہ بالکل نہیں تھا۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال پر کتابیں بہت کم لکھی گئی تھیں۔ گنی چنی کچھ کتابیں جو لکھی گئی تھیں' وہ بھی اکاڈمی کی لائبریری میں موجود نہ تھیں۔ اکاڈمی کے پہلے ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد رفیع الدین بھی نئے نئے آئے ہوئے تھے۔ میں بھی اولین ریسرچ فیلو تھا۔ اسی کم مائیگی اور ناتجربہ کاری کے عالم میں جہاد زندگی کا آغاز ہوا۔ نیشنل لائبریری میں جو کتابیں دستیاب ہوئیں' ان سے میں نے استفادہ کیا۔ باقی کتابیں' کھلے بازار سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر میں نے خود اپنے پیسے سے خریدیں۔

جیسا کہ ریسرچ کے موضوع سے ظاہر ہے' اس کا پہلا حصہ اسلامی تصوف تھا۔ اس کا مطلب یہ ٹھہرا کہ علامہ اقبال کے فلسفہ حیات "خودی" سے متعلق پہلے تصوف کی تاریخ کی تدوین کی جائے' جس کا گہرا تعلق ادبیات فارسی سے ہے۔ اس سلسلے میں پہلے میں ڈاکٹر غلام سرور' صدر شعبہ فارسی' اردو کالج' کراچی سے جا کر ملا۔ ریسرچ کے بارے میں بات چیت کی۔ انہوں نے بتایا میں اس معاملہ میں آپ کی اعانت کر سکتا ہوں۔ میں تصوف کے حوالے سے علی گڑھ یونیورسٹی سے لیکر اب تک بڑی کلاسوں میں فارسی ادبیات کا درس دیتا آیا ہوں' جن میں علامہ اقبال کا کلام بھی شامل ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے مشورہ دیا کہ مقالہ آپ پی' ایچ' ڈی کی ڈگری کے حصول کے لئے لکھیں۔ ورنہ ریسرچ کا مصرف کیا رہے گا۔ میں نے کہا میرا منشا بھی تو یہی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ میں دراصل اردو کا طالب علم ہوں۔ ڈگری لینا ہے تو اردو ہی میں لینا پڑے گی۔ لیکن کراچی یونیورسٹی ابھی نئی نئی قائم ہوئی ہے' اور اس میں ابھی تک اردو کا شعبہ ہی نہیں کھلا۔ ڈاکٹر غلام سرور نے رائے دی' اس سلسلہ میں آپ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم سے رجوع کریں۔ ممکن ہے' کوئی انتظام ہو جائے۔ چاہے شعبہ کاغذ پر ہی رہے۔ چنانچہ میں ان سے جا کر ملا اور اپنا مقصد بتایا۔ مولوی صاحب سے میں اس سے قبل کئی مرتبہ مل چکا تھا۔ اپنی پیرانہ سالی اور انجمن ترقی اردو میں دیگر مصروفیات کے پیش نظر پہلے تو وہ پس و پیش کرتے رہے مگر میرے اصرار پر آخر کار وہ آمادہ ہو گئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا' اور فورا" جا کر وائس چانسلر کو خوش خبری سنائی۔ انہوں نے سن کر اپنا حکم صادر کر دیا اور ضابطہ کے مطابق دفتری کارروائی شروع ہوئی۔ چند ہی روز میں اسکیم

منظور ہوگئی۔ اس طرح کراچی یونیورسٹی میں میرا داخلہ ہوگیا' اور اردو کا شعبہ کھولنے کا' کاغذی ہی سہی' گویا میں ہی سبب بنا' جیسا کہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں 1948ء میں اردو میں بی۔ اے۔ آنرز کا کورس شروع کرانے کا محرک میں ہی ہوا تھا۔ یہ سب باتیں اب قصہ پارینہ بن چکی ہیں۔

علم تصوف مولوی عبدالحق صاحب کا موضوع نہ تھا۔ اس لئے اس سے انہیں مطلق دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی اقبالیات سے انہیں کوئی خاص لگاؤ تھا۔ اس لئے ان ہی کی اجازت خاص سے میں ڈاکٹر غلام سرور کے زیر ہدایت ریسرچ کا کام کرنے لگا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے' جو یونیورسٹی کی جانب سے میرے باضابطہ راہنما تھے' ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ مل کر ان کو کام کے بارے میں آگاہ کرتا تھا۔ ریسرچ کے موضوع سے باہر اردو علم وادب کے دیگر موضوعات پر بھی گفتگو ہوتی تھی۔ وہ میرے ساتھ بڑی شفقت ومحبت سے پیش آتے تھے' اور ان کا رویہ ہمیشہ ہمدردانہ ہوتا تھا' بالخصوص اس لئے کہ میرا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ بہ طیب خاطر میری باتیں سنتے اور اپنی سناتے تھے۔ برصغیر کی اتنی بڑی ادبی شخصیت کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے میں دل میں فخر محسوس کرتا تھا۔ انجمن ترقی اردو کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے برصغیر کے بڑے بڑے زعما کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا اور اردو کے جائز حقوق کو منوانے کے لئے بحث وتمحیص میں حصہ لینا ان کا معمول رہا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت بڑی پرکشش اور عظمت کی حامل تھی۔

اقبال اکاڈمی کے وظیفہ کی معیاد اصل میں دو سالوں کے لئے تھی۔ وقت کے اندر ہی میں نے مقالہ مکمل کرلیا تھا۔ مگر اس پر نظرثانی کا کام باقی تھا۔ اس لئے میری درخواست پر اکاڈمی نے مدت میں مزید چھ ماہ کی توسیع کردی تھی۔ اردو ٹائپ عام نہ تھا۔ یہ بہ ہزار وقت بہرحال' کام پورا ہوا تو گائڈ کی اجازت سے ضابطہ کے مطابق مقالہ فروری' 1956ء میں یونیورسٹی میں داخل کردیا۔ ممتحن کا بورڈ ملک اور بیرون ملک کے مندرجہ ذیل ممتاز دانشور اور ماہرین اقبالیات پر مشتمل تھا۔

1- بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق' اعزازی صدر' شعبہ اردو' کراچی یونیورسٹی' کراچی۔

2- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' پنجاب۔ فکر اقبال اور حکمت رومی کے مصنف۔

3- ڈاکٹر یوسف حسین خان' عثمانیہ یونیورسٹی' حیدر آباد دکن اور روح اقبال کے مصنف۔

4- ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے' سابق سفیر مصر در پاکستان' جنہوں نے علامہ اقبال کے شعری مجموعوں کا عربی میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کسی وجہ سے مقالہ کی منظوری میں بڑی تعویق پیش آئی اور ڈگری ملنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ ریسرچ کے سلسلے میں' جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے' میں ہر ہفتہ ایک دو مرتبہ مولوی صاحب سے بالعموم صبح کے اوقات میں جبکہ وہ اخبار بینی سے فارغ ہوچکے ہوتے ملنے جایا کرتا تھا۔ ایک آدھ گھنٹہ بیٹھ کر واپس آنے لگتا تو قومی زبان کے اس وقت کے نائب مدیر جناب مشفق خواجہ سے بھی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اس طرح ان سے گہرے دوستانہ روابط ومراسم پیدا

ہوئے۔ آج وہ اپنے مخصوص مزاحیہ کالم کی وجہ سے اردو ادب کی دنیا میں ایک نہایت بلند مقام حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے بابائے اردو پر ایک مضمون لکھنے کے لئے مجھ سے فرمائش کی تھی۔ چنانچہ "حیات عبدالحق: چند اہم پہلو" کے عنوان سے میں نے ایک طویل مضمون لکھا، جسے انہوں نے اردو کالج میگزین۔ "برگ گل" بابائے اردو نمبر 1963ء میں چھپوا دیا۔ چونکہ علامہ اقبال پر میرے تحقیقی کام کا بابائے اردو سے بہت قریبی تعلق رہا ہے، اس لئے ان کے حوالہ سے وہ تمام تلخ باتیں جو میرے ساتھ پیش آئیں، بلا کم و کاست مذکورہ مضمون میں کسی کا نام لئے بغیر قلم بند کر دیں، جن کا اعادہ یہاں غیر ضروری ہے۔ بہر حال، تمام مراحل طے ہونے کے بعد دسمبر، 1958ء میں صدر ایوب خاں کے ہاتھوں کنٹری کلب روڈ پر واقع کراچی یونیورسٹی کے نئے کیمپس میں مجھے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری تفویض ہوئی۔ ان دنوں پاکستان میں نیا نیا مارشل لاء نافذ ہوا تھا۔ پورے فوجی یونی فارم میں اس وقت کے صدر ایوب خان کا کرو فر اور طمطراق دیکھنے کا تھا۔ گزشتہ کئی سال یعنی یونیورسٹی کے قیام کے بعد سے مختلف وجوہ کی بنا پر کوئی کانوکیشن نہیں ہو پایا تھا۔ اس لئے ڈگریاں وصول کرنے والے طلباء و طالبات کی کثرت تھی۔ سب کو ڈائس پر جا کر صدر کے ہاتھ سے ڈگریاں حاصل کرنا اور ان سے ہاتھ ملانا بہت دشوار تھا۔ اس لئے وہ تمام طلبا اور طالبات جلوس کی شکل میں انہیں سلام کر کے ڈائس کے سامنے سے ہو کر گذر گئے تھے۔ ڈگریاں انہیں بعد میں یونیورسٹی کے دفتر سے وصول کرنی پڑیں۔ میں چونکہ پی ایچ ڈی کی ڈگری وصول کرنے والا واحد طالب علم تھا اس لئے میں نے اپنی ڈگری ڈائس پر جا کر وصول کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ طلباء و طالبات کے اس جم غفیر میں میری ہونے والی بیوی۔ رضیہ بھی تھیں، جن کو ایم۔ اے۔ اکنامکس اور بی۔ ایڈ۔ کی دو دو ڈگریاں ایک ساتھ وصول کرنی تھیں۔ مگر اس وقت ان سے جان پہچان مطلق نہ تھی۔ بعد میں 5 فروری، 1960ء کو ایک دوست کے توسط سے میری ان سے شادی ہوئی۔

میری ادبی زندگی کا آغاز یوں ہوا، اور شاید اوروں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہوگا کہ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے لئے مقالہ لکھتے لکھتے لکھنے کی کچھ عادت سی پڑ گئی۔ بعد ازاں 1954ء میں بنگلا افسانہ اور ناول نگار ابوالکلام شمس الدین، جن کا پچھلے سال اپنے وطن بارسیال میں انتقال ہو چکا ہے، اسلامیہ کالج، کراچی میں بنگلا کے لکچرار مقرر ہو کر کراچی گئے۔ تو انہوں نے شروع شروع میں مارٹن روڈ کوارٹرس میں میرے ساتھ قیام کیا۔ ان کے کہنے پر ان کے کچھ بنگلا افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جو سرکاری رسالہ "ماہ نو" کراچی میں شائع ہوئے۔ اس زمانہ میں رفیق خاور اس رسالہ کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے بھی زبان و بیان میں کچھ اصلاح دی۔ اس سے میری اردو کو جلا ملی۔ یہ بات لکھتے ہوئے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ دوسرے لکھنے والوں کے کچھ اور منتخب بنگلا افسانوں کا بھی میں نے اردو میں ترجمہ کیا، جو اسی رسالہ میں چھپے۔ اس سے اردو کی ادبی دنیا میں رفتہ رفتہ قدم جمانے کا موقع ملا۔

میں اگست ' 1953ء میں اقبال اکاڈمی پاکستان کا فیلو بن کر کراچی گیا' اور جولائی ' 1962ء میں کوئی نو سال قیام کرکے ڈھاکا واپس آیا۔ اس میں طالب علمی کا اور پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن (پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی۔) میں ملازمت کا زمانہ شامل ہے۔ اس عرصہ میں دیگر موضوعات پر بھی مضامین لکھے۔ اسی زمانہ میں یعنی 1959ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا مقالہ "اسلامی تصوف اور اقبال" بھی کتابی شکل میں اقبال اکاڈمی پاکستان ' کراچی سے شائع ہوا۔ اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ پہلے ایڈیشن پر مجھے ' مجلس ترقی ادب ' لاہور سے نقد انعام بھی ملا تھا۔ طبع سوم میں ترمیم اور اضافے شامل ہیں۔

میری ساری ادبی زندگی کا ماحصل دراصل اپنی ضخیم اردو کتاب "تاریخ ادبیات اردو" ہے ' جو برصغیر کے مشہور اردو محقق اور دانشور ڈاکٹر وحید قریشی کے زیر نگرانی مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ' لاہور ' پاکستان سے 1997ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت میں پنجاب کی صوبائی حکومت کی مالی اعانت شامل ہے۔ کتاب بڑی ہے۔ دونوں جلدیں ملا کر کل ضخامت 1066 صفحات پر محیط ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے دوران گزرے سانحات کو رقم کرنا بھی ضروری ہے۔ کتاب تو میں نے 1962ء میں لکھ لی تھی ' لیکن اس کے اشاعت پذیر ہونے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ اس زمانہ میں میرا تبادلہ ڈھاکا ہو گیا تھا ' اور یہیں مستقلاً قیام پذیر تھا۔ یہاں اس نوع کی کتاب چھپوانے کے وسائل بالکل معدوم تھے۔ اس کے علاوہ میں چاہتا تھا کہ کتاب کوئی بڑے اشاعتی ادارہ سے چھپے۔ کراچی اور لاہور کے کئی اداروں سے خط و کتابت کے ذریعہ روابط قائم کئے۔ آخر اردو اکیڈمی سندھ ' کراچی نے اپنی آمادگی ظاہر کی۔ اس کے پروپرائٹر علاء الدین خالد نے کتاب کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار کیا۔ شرائط طے ہونے کے بعد کام شروع ہوا۔ یہ سنہ 1971ء کے پرآشوب ایام تھے۔ جن حصوں کی کتابت ہو جاتی تھی ' ہوائی ڈاک سے میرے پاس پہنچ جاتے تھے۔ میں پروف دیکھ کر پھر اسی طرح واپس کر دیتا تھا۔ 16/ دسمبر ' 1971ء کے قبل تک کوئی آدھی کتاب کی کتابت اور پروف ریڈنگ کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ اس تاریخ کے بعد وہ باب ناگہانی ہمیشہ کے لئے مسدود ہو گیا۔ اب کہاں میں اور کہاں کتاب کا چھپنا۔ حتیٰ کہ خط و کتابت کا راستہ بھی بند ہو گیا۔ کوئی تین سال کے بعد راستہ کھلا تو اولین فرصت میں علاء الدین خالد کو خط لکھا۔ انہوں نے بھی فوراً جواب دیا اور اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ لکھا۔ جب آپ زندہ اور صحیح سلامت ہیں تو انشاء اللہ کتاب ضرور چھپے گی۔ 1977ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اقبال اکاڈمی پاکستان سے مل کر علامہ اقبال پر انٹر نیشنل کانگریس منعقد کی تو مجھے بھی اس میں شرکت کا موقع ملا۔ واپسی پر ایک ہفتہ کیلئے کراچی ٹھہرا۔ دیرینہ دوست مشفق خواجہ نے میری خاطر غالب لائبریری ' ناظم آباد میں ایک استقبالیے کا انتظام کیا تو میری درخواست پر علاء الدین خالد کو بھی مدعو کیا۔ وہاں روبرو تفصیلی بات ہوئی۔ کہا ' آنے سے پہلے کام کا جائزہ لیا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ انشاء اللہ باقی حصہ کی کتابت کا کام پھر سے جلد شروع کر دیا جائے گا۔ لیکن ان کا وہ وعدہ کبھی پورا نہ ہوا۔ خط و کتابت جاری رہی۔ خطوط کے جواب

میں وہ امیدیں بھی دلاتے رہے۔ شاید کوئی مجبوری ہوگئی تھی کہ وہ وعدے کے پابند نہ رہ سکے۔ کتابت شدہ مواد کے ساتھ مسودہ واپس مانگا تاکہ کوئی متبادل انتظام ہوسکے۔ مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ مایوسی ہوئی۔

خوش قسمتی سے مسودہ کا ایک ٹائپ کیا ہوا نسخہ میرے پاس باقی رہ گیا تھا۔ جلدی سے درست کرکے ایک خط کے ساتھ جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو بھیجا تو انہوں نے فوری طور پر مثبت جواب دیا۔ لکھا "ذرا وقت دیجئے۔ میں پورا مسودہ دیکھ لوں' اس کے بعد بتاؤں گا۔" میں ان دنوں اپنی ڈاکٹر بیٹی کے پاس لندن میں تھا۔ ایک ماہ کے بعد خط آیا کہ سب ٹھیک ہے۔ یہ کتاب مغربی پاکستان اردو اکیڈمی چھاپے گی۔ آپ علاء الدین خالد کو صاف صاف لکھ دیں کہ وہ ہرگز کتاب نہ چھاپیں۔ میں نے اس پر عمل کیا۔ مجھے بے حد خوشی تھی کہ ڈاکٹر وحید قریشی جیسے ماہر فن اور استاد الاستاد نے کتاب کا پورا مسودہ دیکھ کر اسے اپنے ہاں سے شائع کرنے کے لئے منظور فرمایا تھا۔ طبع ہونے سے پہلے کچھ اور ماہرین نے بھی مسودہ دیکھا اور اچھی رایوں کا اظہار کیا' مثلاً" باقر رضوی نے بالخصوص اشعار کے اقتباسات کے حوالے سے پورے مسودہ پر نظر دوڑائی۔ اس اثنا میں ایک حادثہ پیش آگیا۔ وہ یہ کہ کمپیوٹر کے ذریعہ کمپوز شدہ پورا مواد تیار رکھا ہوا تھا کہ ایک دن طلب کرنے پر وہ نہیں ملا۔ بہت تلاش کیا گیا' لیکن وہ نہ ملنے کا تھا نہیں ملا۔ سب کو تعجب ہوا کہ آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ کمپیوٹر کمپوزنگ اور دو تین دفعہ کی پروف ریڈنگ میں کافی اخراجات آئے تھے' وہ رائگاں گئے۔ افسوس ہوا۔ مگر کیا کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ از سر نو پورا کام احتیاط سے کیا گیا۔ پھر مالی مشکلات کا سامنا ہوا۔ اس پر قابو پانے کے لئے اور وقت صرف ہوا۔ آخر وسط 1997ء میں کتاب منظر عام پر آسکی۔ اس طرح گویا کتاب کے لکھنے اور شائع ہونے میں کوئی 35 سال کا وقفہ ہوگیا۔ اس طویل عرصہ میں اردو علم وادب کے حوالے سے جو تحقیقات ہوئیں اور نئے نئے گوشے سامنے آئے' وہ اس میں شامل نہ ہوسکے۔ زندگی میں دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئی تو انشاء اللہ اس کمی کو پورا کردیا جائے گا۔

ڈاکٹر ابو سعید نور الدین صاحب وہ مسودہ بطور خاص چوری ہوگیا ہوگا۔ ہم "مسلمانوں" کے ہاں ایسے چوری کے کام بڑے اہتمام سے ہوتے ہیں۔ رہزن کے لئے دعا کیجئے کہ اسے نظیر اکبر آبادی کا یہ مصرعہ یاد آجائے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا' جب لاد چلے گا بنجارہ (سلطانہ مہر)

ایک ہی وقت میں میرے دوست ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی کسی خاص تحریک کے ماتحت ایک ہی موضوع پر کتاب لکھی تھی۔ ان کے لئے تمام وسائل موجود تھے' اور وہ خود بھی پاکستان میں ہیں۔ اس لئے ان کی وہ کتاب بہت پہلے چھپ گئی۔ وہ اس معاملے میں بڑے خوش قسمت ہیں۔

او چمن زادے' چمن پرورده من دمیدم از زمین مرده

ہم دونوں میں بہت فرق ہے۔ پھر بھی اب ماشاء اللہ دونوں کتابیں بازار میں ہیں۔ فرق البتہ اتنا ضرور رہے گا' ان کے پیش کرنے کا انداز اپنا اور میرا اپنا۔ ماحول ان کے لئے بدرجہا زیادہ سازگار ہے۔ اس دوران میں ہندوستان کے ڈاکٹر انصار اللہ نے بھی "تاریخ اقلیم ادب" کے نام سے دو جلدوں میں تاریخ ادبیات اردو کے موضوع پر اور ایک کتاب لکھی۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے ایک مضمون سے معلوم ہوا' وہ اس کا اور اس نوع کی تمام کتابوں کا تفصیلی جائزہ لیکر ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں۔ وہ آج کل امریکا میں ہیں۔ اور بزرگ ترین اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ امید ہے' ان کا وہ جائزہ بھرپور ہوگا۔ اس سلسلے میں صدق دل سے میں اعتراف کرتا ہوں کہ تاریخ ادبیات اردو کے موضوع پر کتابیں لکھنے والوں پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں' جن سے عہدہ برآ ہونا کوئی آسان کام نہیں۔ بعض لوگ اس معاملے میں بری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ کچھ مثالیں ہمارے سامنے ہیں' جن سے ہم سب کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔ کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالقیوم نے اس موضوع پر 60ء کی دہائی میں قلم اٹھایا اور پہلی قسط کے طور پر اردو نثر پر کتاب لکھ کر شائع کی۔ مشفق خواجہ نے اسے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا' اور ایسی خامیوں کی طرف انگشت نمائی کی کہ کتاب بالکل بے کار ہو کر رہ گئی۔ پروفیسر عبدالقیوم کو پھر آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایک دم خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ جس پرچے میں وہ تبصرہ چھپا تھا' اس کا تراشہ مشفق خواجہ نے مجھ کو بھیجا تھا۔ باخبر لوگوں کو معلوم ہے' برصغیر کے مایہ ناز اور مشہور گہوارہ علم وادب علی گڑھ یونیورسٹی کو ایک مرتبہ تاریخ ادبیات اردو پر ایک مستند اور ہر لحاظ سے مکمل کتاب کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوئی' اور اسے بہ احسن وجوہ پورا کرنے کے لئے استاد الاستاد پروفیسر آل احمد سرور کی سربراہی میں ایک اعلیٰ سطح کا بورڈ قائم کیا گیا۔ صلاح مشورہ کے بعد ارکان بورڈ میں سے ہر ایک کو الگ الگ حصوں کی ترتیب کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ایڈیٹنگ کی ذمہ داری چیئرمین نے خود اپنے پاس رکھی۔ طویل مدت میں محنت شاقہ سے کتاب مرتب ہو گئی اور بڑی شان وشوکت کے ساتھ وہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ جس کتاب کے لئے اتنا اہتمام کیا گیا' اسے قبولیت عامہ کا شرف حاصل ہونا فطری طور پر متوقع تھا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ تحقیق وتنقید کے مرد مجاہد رشید حسن خان نزدیک ہی تھے۔ اس اہم کتاب پر ان کی نظر پڑی اور اپنی جولانی طبع دکھائی۔ مختلف نامور اساتذہ فن کی پیدا کردہ شترگربہ گیوں پر سے پردہ اٹھایا۔ ارباب دانش وبینش کی لغزشوں کا ایسا احساس دلایا کہ وہ کتاب سرکولیشن سے واپس منگوانے پر مجبور ہوئے۔ سب کیا کرایا کام اکارت گیا اور کتاب ہمیشہ کے لئے صندوق کے اندر قفل بند ہو گئی۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کا مقام ہے۔ سلطانہ مہر) اس ضمن میں رشید حسن خان نے کچھ اصول بھی مرتب کئے' جو بہت معقول اور کارآمد ہیں۔ میں نے اپنی کتاب پر نظر ثانی کے وقت ان اصول کا حتی المقدور لحاظ رکھا۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے' انسان کا کیا ہوا کوئی کام بھی ہر لحاظ سے کبھی بے عیب نہیں ہوتا۔ کتنا بڑا افلاطون ہی کیوں نہ ہو' کچھ نہ کچھ

خامیاں ضرور در آتی ہیں۔ اس لئے یہ دعویٰ کرنا کہ میری کتاب "تاریخ ادبیات اردو" ہر قسم کے عیب اور اغلاط سے پاک ہے، حقیقت کو جھٹلانا ہے۔ بہر حال اس سلسلے میں مزید بحث عبث ہے۔ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کتاب کی کوئی قدر و قیمت ہے کہ نہیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا "تاریخ ادبیات اردو" کی اشاعت سے ایک سال قبل فروری، 1996ء میں "مہاکوی اقبال" (شاعر اعظم اقبال) کے نام سے علامہ اقبال کی حیات، کارناموں اور افکار پر 416 صفحات پر مشتمل میری ایک اور کتاب "علامہ اقبال سنگ سہ" ڈھاکا کی جانب سے شائع ہوئی۔ کتاب اگرچہ بنگلا زبان میں لکھی گئی ہے لیکن اردو اور فارسی ادبیات سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے یہ بجا طور پر جواز پیدا ہوتا ہے کہ یہاں اس کا بھی ذکر کیا جائے۔ اس میں علامہ اقبال کی زندگی کی مہد سے لحد تک جملہ باتوں، واقعات اور خیالات کا بالاختصار سمیٹنے کی میں نے حتی الوسع کوشش کی، تاکہ اردو اور فارسی سے کوئی بھی نابلد شخص انہیں کامل طور پر سمجھ سکے۔ بنگلا دیش میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے، جو اقبال کو جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ مگر زبان حائل بنی ہوئی ہے۔ اب امید ہے، میری یہ کتاب ان کی وہ تشنہ کامی بہت حد تک دور کر سکے گی۔ میری زندگی میں ایسی کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے، جو دوسروں کے لئے سبق آموز ہو۔ تاہم یہ مختصر سا خاکہ اس لئے قلم بند کیا کہ ممکن ہے، اس سے کبھی کسی کا کوئی مصرف نکلے اور میرے حالات زندگی کے بارے میں تلاش و جستجو کی لایعنی کوشش میں نہ پڑنا پڑے۔ میں درحقیقت اپنی ادبی زندگی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ میں نے اب تک جو تھوڑا بہت کام کیا، محض شوقیہ کیا۔ البتہ یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ ادب کی تخلیق خواہ کسی معیار ہی کی نہ ہو، ہمیشہ شوقیہ کی جاتی ہے اور کی جانی چاہیے۔ اسی لئے میں نے اپنی ناچیز تحریروں اور نگارشات کو "قلمی کاوشیں" کا نام دیا۔ گویا اپنے ادبی ذوق و شوق کی تسکین کے لئے خامہ فرسائی کرتا رہا۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی نکلے۔ علاوہ بریں، لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھنے سے "کار خیر" کے سوا وقت بھی اچھا کٹ جاتا ہے، اور انسان بہت سی فضولیات سے بچ جاتا ہے۔ البتہ اس بات کا احساس ضرور ہے کہ خالص بنگالی نژاد ہونے کے باوجود میں نے اردو پڑھنے لکھنے سے گہری دلچسپی لی اور کچھ خدمات انجام دے کر اردو کی ادبی دنیا میں اپنے لئے ایک چھوٹا سا مقام پیدا کیا، جس کی بنا پر مجھے بین الاقوامی سطح پر کئی کانفرنسوں اور سیمناروں میں شرکت کے مواقع فراہم ہوئے۔ (ڈاکٹر ابو سعید نور الدین محترم۔ میں آپ کو اور آپ کی لگن وجدوجہد کو سلام کرتی ہوں۔ سلطانہ مہر)

ڈاکٹر صاحب نے کئی مضامین اور مقالات لکھے ہیں جو مختلف اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی کئی بین الاقوامی سیمناروں میں شرکت کی۔ انہوں نے لکھا کہ میں نے بنگلا افسانوں اور ایک ناولٹ کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے۔ ان کے نام ہیں۔

1- سیلاب، اصل ابوالکلام شمس الدین اشاعت، ماہ نو، کراچی، مارچ 1954ء

2- دیرینہ آرزو' اصل ابوالکلام شمس الدین' ماہ نو' کراچی' دسمبر 1956ء
3- آشیانہ (ناولٹ) افکار' کراچی' دس سالہ نمبر' 1900ء- کسی طرح عذیر احمد کے نام سے ایک غیر ادبی شخصیت کے ہاتھ لگ گیا اور ادیب بننے کے شوق میں اپنے نام سے چھپوادیا- دریافت کرنے پر معلوم ہوا' مدیر صہبا لکھنوی کو علم نہ تھا- وہ میرے دوست ہیں- افسوس کا اظہار کیا-
4- پدما گوکھرو (ایک عجیب الخلقت سانپ) اصل نذر الاسلام اشاعت' ماہ نو' کراچی-
5- رقیہ' اشاعت ماہ نو' کراچی-
6- بنگلا افسانوں کے کچھ اور ترجمے' جو 1954ء تک ماہ نو' کراچی میں طبع ہوئے' تلف ہو گئے- وہ اس طرح کہ بنگلا ادیب مصطفیٰ ہارون' جو عموماً" اردو افسانوں' ناولوں اور ڈراموں کا بنگلا میں ترجمہ کرتے ہیں' کبھی کبھی مجھ سے ملنے آتے تھے- ایک دن حفیظ آباد کالونی میں میری رہائش گاہ پر آئے اور وہ سارے ترجمے واپسی کی شرط پر مجھ سے لے گئے- پھر کبھی نہ تو وہ آئے اور نہ ہی وہ واپس کیئے- (آپ پھر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ لیجئے کہ اللہ ہی بہتر جزا و سزا دینے والا ہے- سلطانہ مہر)
7- انگریزی مضامین اور مقالے سات عدد لکھے-
8- بنگلا مضامین اور مقالے' بارہ عدد لکھے-

حصول تعلیم کے بعد روزگار کے لئے کہیں نہ کہیں کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے- والد کا خیال تھا' دینی تعلیم ختم کر کے گھر کی روایت کے مطابق کسی دینی درسگاہ میں مدرسی کی جائے- مگر میں اس سے انحراف کر کے اور آگے بڑھنا چاہتا تھا- جیسا کہ پہلے ذکر کیا' یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی- ارادہ تھا' کسی تعلیمی ادارہ میں ملازمت کرلوں گا- اس لئے سرکاری ملازمت کے لئے مقابلہ کے امتحانات میں نہیں بیٹھا- فروری 1956ء میں کراچی یونیورسٹی میں پی- ایچ- ڈی- کا مقابلہ داخل کرنے کے بعد کسی عارضی ملازمت کی تلاش ہوئی- ایک دوست کے مشورہ پر پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے سابق سیکریٹری شیخ اعجاز احمد کے نام ایک نجی خط بھیجا- بعد میں پتا چلا' وہ علامہ اقبال کے سگے بھتیجے تھے یعنی علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے صاحبزادے- میں ان سے ذاتی طور پر بالکل واقف نہ تھا- بہر حال مجھے ملازمت مل گئی کیونکہ وہ میرے کام سے واقف تھے- 1962ء میں ایک سرکاری حکم کے مطابق کارپوریشن دو حصوں میں تقسیم ہوئی- میرا تعلق چونکہ مشرقی پاکستان سے تھا' اس لئے تبادلہ ڈھاکا ہو گیا- اس زمانہ میں میں "تاریخ ادبیات اردو" لکھنے میں مصروف تھا- اس لئے یکایک تبادلہ ہوجانے سے کچھ مشکلات پیش آئیں- ڈھاکا میں تمام ضروری کتابیں ملنی دشوار تھیں- پھر بھی حکم حاکم اپنی جگہ بہ جا تھا- اللہ کا نام لے کر کہہ کر بوریا بستر اباندھا اور ڈھاکا چلا آیا- کتاب کا باقی ماندہ حصہ یہیں ختم کیا-

1968ء میں انتظامیہ ہی میں سینئر آفسر کے طور پر ترقی ملی- بنگلا دیش بننے کے بعد مشرقی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن پیداواری لحاظ سے نو حصوں میں تقسیم ہوا' تو میرا تقرر بنگلا دیش اسٹیل

کارپوریشن کے سیکریٹری کی حیثیت سے ہوگیا۔ 1976ء میں اسٹیل کارپوریشن انجینئرنگ کارپوریشن کے ساتھ ضم ہوا تو متحدہ بنگلادیش اسٹیل اینڈ انجینئرنگ کارپوریشن کا سیکریٹری بھی میں ہی رہا۔ گویا میں شروع سے آخر تک ایک ہی صنعتی ترقیاتی ادارہ کے ماتحت ایک عہدہ سے دوسرے عہدہ میں گشت کرتا رہا۔ کبھی باہر جانے کا ارادہ نہیں کیا۔ میری وفاداری ایک ہی کام کے ساتھ استوار رہی۔ اس طرح عمر کے 57 سال پورے کر کے یکم فروری 1986ء کو نوکری سے سبکدوش ہوا۔

ایک مرتبہ حج اور دو مرتبہ عمرہ کے لئے حرمین شریفین کی زیارت کی سعادت حاصل کر چکا ہوں اب میں مختصراً" آپ کے ادبی سوالات کے جواب میں عرض کروں گا کہ بیسویں صدی عیسوی میں تاریخ ادبیات اردو میں موجود رہ جانے والے چند ادیبوں کے ناموں کے سلسلے میں عرض ہے کہ میں نے اپنی کتاب میں، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اور دوسرے مورخین نے حال میں اس نوع کی جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں وہ تمام نام شامل کئے ہیں۔ فہرست کافی طویل ہے۔ میں اپنی کتاب میں بیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے لیکر آخر تک صرف ان ہی نمائندہ نثر نگاروں اور شاعروں کو شامل کیا ہے، جن کا ادبیات اردو کے ارتقا میں نمایاں حصہ رہا ہے، اور جن کی وجہ سے مختلف رجحانات اور میلانات وجود میں آئے ہیں۔ تاہم، اس انتخاب میں کمی بیشی کی گنجائش ہے۔

یہ سوال کہ جدیدیت نے فکشن جیسے لطیف آرٹ کی لطافت کو نکھارا ہے یا مجروح کیا ہے، تو اس کا جواب میرے خیال میں یہ ہے کہ سب کو معلوم ہے کہ ادب پہلے وجود میں آتا ہے، اور تنقیدی نظریہ بعد میں۔ لہٰذا یہ فطری امر ہے کہ اس صورت میں آخر الذکر اول الذکر کو نہ تو نکھار سکتا ہے اور نہ ہی مجروح کر سکتا ہے۔ جدیدیت اردو ادب کی کوئی باقاعدہ تحریک نہیں کہ وہ ادب پر اثر انداز ہوسکے۔ اسے ہم زیادہ سے زیادہ بقول آل احمد سرور کے ایک میلان یا رجحان کہہ سکتے ہیں، وہ بھی بہت ہی ہلکا سا، جس کی کوئی مابہ الامتیاز لوازمات یا خصوصیات گنائی جاسکیں۔ اس کا کوئی جامع منشور بھی کسی نے وضع نہیں کیا کہ قلم کار شعوری طور پر اس کا اتباع کر سکیں۔

یہ کہنا کہ موجودہ صدی میں اردو ادب میں ناول بہت کم لکھے گئے ہیں، درست نہیں۔ درحقیقت اردو ناول نگاری کا آغاز اور عروج سب اسی رواں صدی ہی میں تو ہوا۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں ڈپٹی نذیر احمد اور سرشار کے ذریعے قدیم داستان کی کوکھ سے نیم ناول قسم کی صنف ادب کا آغاز ہوا اور پوری بیسویں صدی پر اس کا اثر برقرار رہا۔ اس صدی میں بہت ناول لکھے گئے۔ اکیسویں صدی عیسوی بہت جلد شروع ہونے والی ہے۔ اس میں ناول نگاری کی صورت حال کیا رہے گی پیشگی کچھ کہنا مشکل ہے۔ اصناف ادب یکے بعد دیگرے وجود میں آتی اور مٹتی جاتی ہیں۔ اردو ناول نے کوئی سو سال کے قریب حکمرانی کی ہے۔ ممکن ہے، اگلی صدی میں اس کی اہمیت کم ہوجائے۔

نثر ہو کہ شاعری، معیاری ادب کا ایک پیمانہ تو وہی ہے، جو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ والی "ساختیات"

کے اصول پر پورا اترتا ہو، جس کا لسانی پہلو مسلمہ قواعد وضوابط اور علم عروض کی مقتضیات کو کماحقہ پورا کرتا ہے۔ دوسرا اہم پیمانہ یہ ہے کہ نثر یا نظم میں جو پیغام دیا گیا ہو، وہ اعلیٰ پایہ کا اور انسان کی عالمی اقدار کا حامل ہو، جن کی بنا پر دونوں اصناف ادب نقش جاوداں کا درجہ حاصل کر سکیں۔ حافظ سعدی، رومی، میر، غالب، اقبال، سرسید، حالی، شبلی، مشتاق احمد یوسفی، مشفق خواجہ وغیرہ کے ادب پارے اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

میری زندگی کا اہم واقعہ یہ ہے 1977ء میں انٹرنیشنل کانگریس علامہ اقبال بڑی شان و شوکت سے لاہور میں منعقد ہوئی۔ میں بھی مدعو تھا۔ میں نے "خودی" پر اپنا مقالہ پڑھا۔ مقالہ یوں تو خاصا طویل تھا۔ مگر حسب دستور کانفرنس میں اس کا خلاصہ پڑھ کر سنایا۔ کانگریس کی تقریبات ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں منعقد ہوئیں۔ ساری دنیا سے آئے ہوئے مندوبین کو بھی وہیں ٹھہرایا گیا۔ تقریبات تین دن جاری رہیں۔ آخری دن سہ پہر کو لاہور شہر کے اہم تاریخی مقامات کی سیر کا پروگرام بنایا گیا۔ روانگی سے چند منٹ پہلے ہر ایک کے پاس رقعہ آیا کہ باہر جانے سے قبل سب نیچے ہال میں اکٹھے ہو جائیں۔ ایک اہم معاملہ پر فیصلہ کرنا ہے۔ نیچے ہال میں جاکر دیکھا، ڈائس پر تین حضرات تشریف فرما تھے۔ صدارت کی کرسی پر پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ان کے دائیں بائیں جانب دو سرے صاحبان، جن کو میں نہیں جانتا تھا۔ ان میں سے ایک صاحب اٹھ کر مائک کے سامنے گئے اور مختصر سی تقریر کے بعد کہا "ابھی ابھی ہم لوگوں نے طے کیا، علامہ اقبال کو پس مرگ نوبل انعام دلوانے کے لئے اس بین الاقوامی کانگریس کی جانب سے سفارش بھیجی جائے۔ تجویز کی حمایت میں انہوں نے اور کچھ کہا اور اطلاع دی کہ اس کے نتیجے میں جو خطیر رقم وصول ہوگی۔ اس کا ایک ٹرسٹ قائم کیا جائے گا کیونکہ علامہ اقبال کے صاحبزادہ ڈاکٹر جاوید اقبال (جو سامنے کی رو میں صوفے پر عین ڈائس کے بالمقابل بیٹھے ہوئے تھے) اور صاحبزادی محترمہ منیرہ اقبال کو اس رقم کی ضرورت نہیں۔ ان سے اس بارے میں صلاح مشورہ کرلیا گیا ہے۔" اس کے بعد اور دو صاحب یکے بعد دیگرے مائک کے سامنے گئے اور تجویز کی تائید میں پر زور تقریریں کیں۔ اس طرح تمام انتظامات مکمل کر کے تجویز قرارداد کی شکل میں پاس کرنے کے لئے ہاؤس کے سامنے پیش ہونے والی ہی تھی کہ مجھ سے رہا نہ گیا۔ کیونکہ مجھے بڑی شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ٹھیک نہ ہوگا۔ میں ہال کے ایک کونے میں ذرا دور بائیں جانب بزعم خود گوشہ عافیت میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ اٹھایا کہ مجھے کچھ کہنا ہے۔ اجازت ملنے پر میں ڈائس پر گیا۔ ذرا جذباتی ہو گیا تھا اور مجھے اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے فوری طور پر موزوں الفاظ مل نہیں رہے تھے۔ اسلئے کہ پہلے سے سوچنے کا کوئی موقعہ نہ ملا تھا۔ جذبات پر قابو پانے کے لئے مائک کو ایک ہاتھ سے زور سے پکڑا، اور انگریزی میں کہا میں یہاں آیا ہوں، قرارداد کی تائید میں کچھ کہنے کے لئے نہیں، بلکہ اس کی مخالفت کرنے کے لئے۔ لوگوں کا کیا رد عمل ہوتا ہے، دیکھنے کے لئے، ذرا توقف کیا۔ ہال پر ایک نگاہ وزدانہ ڈالی تو دیکھا، سب کے چہروں

پر حیرت واستعجاب طاری تھا کہ ایک تقریباً" طے شدہ امر پر یہ گم نام شخص کیا بولنا چاہتا ہے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور کہا' جہاں تک میں نے علامہ اقبال کا مطالعہ کیا اور ان کے فلسفہ حیات کو سمجھا' میرے خیال میں' آج اگر وہ زندہ ہوتے تو خودی کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے انھیں یہ دریوزہ گری ہرگز گوارہ نہ ہوتی۔ ساتھ ہی میں نے اس واقعہ کا بھی حوالہ دیا کہ 10 جنوری' 1938ء کو حیدر آباد ریاست نظام کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری نے علامہ اقبال کی خدمت میں ریاست کی جانب سے ایک ہزار روپئے کا ایک چیک بھیجا تھا تو اسے یہ کہہ کر انھوں نے واپس بھیج دیا تھا کہ۔

غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

اسی طرح اس سے قبل 1913ء میں بھی دکن کے مہاراجہ سر کرشن پرشاد نے ان کے اعزاز میں ایک ماہانہ وظیفہ مقرر کرنے کی تجویز پیش کی تھی' تو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ سبب ایک ہی تھا۔ فقر غیور!۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات نے 1931ء میں یوم اقبال کے موقع پر اقبال کی خدمت میں روپیوں کی تھیلی پیش کرنے کی تجویز پیش کی تھی تو وہ بھی انہوں نے بہ لطائف الحیل مسترد کردی تھی۔ رابندر ناتھ ٹیگور کو جب نوبل پرائز ملا تو کسی نے ان سے اس کا ذکر کیا تھا۔ مگر انہوں نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ میں نے اپنے موقف کی تائید میں علامہ کا یہ شعر پڑھا۔

اے طائر لا ہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں' کوتاہی!

پورا ہال جو ماہرین اقبالیات پر مشتمل مندوبین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا' گونج اٹھا اور سب نے بہ ایک آواز میرے ساتھ وہ شعر پڑھا۔ اس کے بعد اسی مفہوم کا دوسرا شعر بھی یاد آیا۔

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں' وہ سروری کیا ہے!

چنانچہ ان شعروں سے ہال دیر تک گونجتا رہا اور سب کو اپنا ہم خیال بنا کر میں چپکے سے ڈائس پر سے واپس آگیا۔ اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر دیکھا' ڈائس پر بیٹھے ہوئے حضرات نے ایک دوسرے سے سرگوشی میں کچھ بات کی۔ پھر ان میں سے ایک صاحب اٹھ کر آہستہ سے مائک کے سامنے گئے اور بزبان حال گویا یہ مانتے ہوئے کہ قصہ ختم' اعلان کیا' ڈاکٹر ابو سعید نور الدین کی تقریر کے بعد مجوزہ قرارداد بے کار ہوگئی۔ اب اسے ہم ہاؤس کی اجازت سے واپس لیتے ہیں۔ سب سیر کو چلئے۔ باہر بسیں آپ کے لئے تیار کھڑی ہیں۔

آخری سوال کے سلسلے میں عرض ہے کہ تنقید ادب کے ساتھ چلتی ہے۔ ادب پہلے وجود میں آتا ہے اور تنقید بعد میں۔ اردو میں تنقیدی ادب تاریخی طور پر رواں صدی کے آغاز سے معرض وجود میں آیا۔ یہ حالی اور شبلی کے دور جدید کی پیداوار ہے۔ تنقید کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ ادب پاروں

کے محاسن و معائب کی نشاندہی کر کے ادیب کی راہنمائی کی جائے اور ادب کی پیش رفت کو صحیح سمت کی طرف موڑا جائے۔ مگر ہر کسی نے ایسا نہیں کیا۔ کسی نے تو اس قدر تعریف و توصیف کی کہ محاسن ہی محاسن نظر آئے اور معائب بالکل او جھل رہے، اور کسی نے ایسی سخت گیری کی کہ صرف معائب ہی معائب نمودار ہوئے اور محاسن پر پردہ پوشی کی گئی۔ یہ عمل اعتدال کے خلاف رہا۔ اس نوع کی تنقید تعمیری کی بجائے تخریبی ہوتی ہے۔ چنانچہ میں یہ تو نہیں کہوں گا، عصرِ رواں میں تنقید عنقا ہو گئی بقول کلیم الدین کہ "تنقید اب معشوق کی موہوم کمر کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔"

میرے نزدیک یہ صحت مندی کی علامت ہے کہ اردو میں آج کل تراجم زیادہ نہیں ہو رہے ہیں۔ تراجم کی ضرورت دراصل ادب کی ابتدائی حالت میں زیادہ رہتی ہے۔ اردو ادب اب ماشاء اللہ اتنا ترقی یافتہ ہو چکا ہے کہ ترجمے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی۔ ہر شعبہ حیات میں اب ادب وافر مقدار میں مہیا ہو چکا ہے۔ پاکستان میں علاقائی زبانوں پر جو کام ہو رہا ہے، وہ میرے خیال میں کافی ہے۔ زیادہ زور بلکہ اردو پر دینا چاہیے۔ تمام صوبوں میں اردو کی تعلیم رائج ہے۔ ذرا اور توجہ کی ضرورت ہے۔ تمام سرکاری دفاتر میں اگر اردو یکساں طور پر استعمال ہوتی، تو بہت ہی اچھا ہوتا۔ البتہ برصغیر کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا، اردو کو بہت نقصان ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں جو کہ اردو کا اصل جنم بھوم ہے، اردو کو بالکل نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ ابتدائی اور ثانوی مدارج میں اردو پڑھائی نہیں جاتی۔ یونیورسٹی کی سطح پر ابھی تک تعلیم جاری ہے۔ ریسرچ کا کام بھی ہوتا ہے۔ مگر اس طرح کب تک چل سکتا ہے۔ ایک وقت ایسا آسکتا ہے، جب اعلیٰ مدارج میں طالب علم ہی نہیں ملیں گے۔"

From Dr.AbuSayeedNooruddin, 8, Jasimuddin Ave., Sector 3,
Ullara Model Town, Dhaka-1230, Bangladesh

پس نوشت

محترم ڈاکٹر ابو سعید نور الدین کا مسودہ موصول ہونے کے بعد میں نے 16 اکتوبر 99ء کو ان کا تعارف لکھ لیا تھا پچھلے دنوں مجھے 11 فروری 2000ء کا لکھا ہوا ان کی اہلیہ محترمہ رضیہ نور الدین کا خط لاس اینجلس ہوتا ہوا مارچ کے آخر میں کراچی میں موصول ہوا کہ 23 دسمبر 1999ء کو ڈھاکا میں ڈاکٹر ابو سعید نور الدین کا حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) انہوں نے خط میں یہ بھی پوچھا ہے کہ ڈاکٹر مرحوم نے جو مسودہ معہ تصویر ارسال کیا تھا کیا وہ تعارف چھپ چکا ہے؟ ڈاکٹر صاحب کا مسودہ میرے پاس محفوظ ہے میں نے اسے مختصر ضرور کیا ہے مگر مسودہ کے متن میں اپنی جانب سے کوئی تبدیلی نہیں کی۔ (سلطانہ مہر)

جائیں گے ہم بھی خواب کے اس شہر کی طرف
کشتی پلٹ تو آئے مسافر اتار کے

وزیر آغا
۱۸ دسمبر ۹۶

ڈاکٹر وزیر آغا

(سرگودھا)

کوئی مجھ سے پوچھے کہ مشک کیسی ہوتی ہے؟ تو میں اس کا تعارف کراتے ہوئے آسانی سے کہہ دوں گی کہ ہرن کی ناف میں ہوتی ہے اور اس کی شکل اور رنگ و روپ کا خاکہ یہ ہے لیکن اگر کوئی پوچھے کہ اس کی خوشبو سے متعارف کراؤ تو میں پوچھنے والے کی ظرافت طبع سے محظوظ نہ ہو سکوں گی کہ مشک کی خوشبو کو متعارف کرانے کے لئے تو فرانس کی ایجاد کردہ ساری خوشبوئیں بھی شرما شرما کر مشک ہی کے آنچل میں منہ چھپانے میں عافیت جانیں گی۔

چنانچہ اس وقت میں دور حاضر کے مشہور نقاد' نامور شاعر' نثر نگار محترم وزیر آغا کی محفل میں ہوں۔ چاہتی ہوں کہ کچھ کہوں مگر وہی مسئلہ کہ مشک سے تو آپ واقف ہیں اس کی خوشبو کو میں کیونکر متعارف کراؤں؟

چلئے آپ ہی اس خوشبو سے مشام جاں کو معطر کرنے کے لئے اسے گرفت میں لینے کی سعی کریں۔

سوال نمبر ا کے جواب میں۔

وزیر آغا، وزیر کوٹ، سرگودھا میں 18 مئی 1922ء کو پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے (معاشیات) 1943ء میں کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری (اردو) 1996ء میں حاصل کی۔ کہتے ہیں میں نے ملازمت نہیں کی۔ پیشہ آبا سوداگری تھا۔ میں نے کاشتکاری کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ عرصہ "ادبی دنیا" کا شریک مدیر رہا۔ 1966ء میں "اوراق" نکالا۔ زندگی بھر ایک چھوٹے سے گاؤں میں پڑا رہا۔ پرندوں، درختوں، بادلوں اور ستاروں کی معیت میں زندگی گزار دی۔ ان سے بہت کچھ سیکھا۔

سوال نمبر 2 کے جواب میں کہتے ہیں۔

ابھی ایسا کہنا قبل ازوقت ہے۔ تاہم اقبال، میراجی اور مجید امجد زندہ رہیں گے، اس بات کا مجھے کامل یقین ہے۔

سوال نمبر 3 کے جواب میں۔

جدیدیت نے بالخصوص نظم پر اپنے گہرے اثرات مرتسم کئے ہیں تاہم اس نے فکشن کے اسلوب اور زاویہ نگاہ کو بھی بدلا ہے۔ اس میں تازگی اور بوقلمونی کی آمیزش کی ہے اور کلیشے سے بچنے کی راہ دکھائی ہے۔ علاوہ ازیں "ایک معنی" کی جبریت سے اسے آزاد کر کے اس کے کثیر المعنیاتی رخ کو شوخ کیا ہے۔ بے شک جدیدیت نے فکشن کے حسن کو نکھارا اور سنوارا ہے۔

سوال نمبر 4 کے جواب میں۔

اردو والوں کا عام رجحان مختصر نویسی کی طرف رہا ہے اس لئے غزل، دوہا، رباعی، قطعہ، گیت، ماہیا، مختصر افسانہ اور انشائیہ انہیں مرغوب ہیں۔ ماضی میں دانش کیپسول میں بند کر کے محفوظ کرنے کا رویہ بہت مقبول تھا۔ ضرب الامثال کی صورت میں چنانچہ ناول نویسی پس پشت جا پڑی۔ ابتداً جو ناول نما تخلیقات سامنے آئیں ان میں بھی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو ایک ڈور میں پرونے کا رویہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ مگر اب بیسویں صدی میں مغربی اثرات کے تحت ناول نویسی کا رجحان منظر عام پر آنے لگا ہے۔ اگر ہمارے ہاں فلم انڈسٹری کا معیار بہتر ہو جائے اور وہ اردو ناولوں کو فلمانے میں بھی دلچسپی لے تو اس سے ناول نویسی کو فروغ ملے گا۔ آج کے زمانے میں سارا قصہ طلب اور رسد کا ہے۔

سوال نمبر 5 کا جواب۔

یہ بات درست ہے کہ آج کا ادیب ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔ اس کے سامنے ایک دنیا مر رہی ہے اور دوسری ابھی منصہ شہود پر نہیں آئی۔ لہٰذا وہ دو کناروں کے درمیان خود کو معلق محسوس کر رہا ہے مگر اس بحرانی صورتحال ہی میں اسے روحانی چکا چوند سے آشنا ہونے کا موقع بھی ملا ہے۔ اگر وہ سبک ساران ساحل کی طرح کسی ایک کنارے سے چمٹ جائے تو تخلیقی طور پر بانجھ ہو جائے۔ سو یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کا ادیب مادی، ذہنی اور نفسیاتی بحران میں مبتلا ہے مگر یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ

روحانی بحران میں بھی مبتلا ہے کیونکہ اگر وہ روحانی بحران میں مبتلا ہوتا تو تخلیقی طور پر اتنا فعال نہ ہوتا۔ بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے ادب میں ایک روحانی نشاۃ الثانیہ کے جو شواہد ملتے ہیں وہ اس بات پر دال ہیں کہ آج کا ادیب روحانی اور تخلیقی سطح پر بہت آگے آگیا ہے۔ اس روحانی پیش رفت میں دیگر علوم بالخصوص طبیعیات اور حیاتیات میں ہونے والے Breakthroughs کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ رہا "ادیب کی رہنمائی کس طرح ہو" کا معاملہ تو یہ سوال ہی غلط ہے۔ ادیب "رہنمائی" کے تابع ہو کر ہمیشہ تخلیقی منصب سے محروم رہا ہے۔ مارکسی ادبا کی کارکردگی کو پیش نظر رکھیں تو بات آئینہ ہو جاتی ہے۔ مارکسی ادبا میں سے وہی ادیب کسی حد تک کامیاب ہوئے جنہوں نے پارٹی لائن کی "رہنمائی" سے انحراف کیا۔

سوال نمبر 6 کے جواب میں۔

معیاری ادب کا ایک ہی پیمانہ ہے یعنی کیا وہ جمالیاتی حظ بہم پہنچانے میں کامیاب ہے؟ مگر خود جمالیاتی حظ کے پھیلتے ہوئے آفاق کو نظر میں رکھ کر اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جمالیاتی حظ محض حواس خمسہ کی سطح پر پیش آنے والے تجربات یعنی of Senses Experience کے علاوہ ذہن کی سطح پر پیش آنے والے تجربات یعنی of Mind Experience سے بھی منسلک ہے۔ موخر الذکر کی حیثیت نیوکلیس کی سی ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ کوئی تخلیق اپنے اس عمل میں کامیاب ہے تو اس سلسلے میں "وقت" ہی سب سے بڑا پارکھ ہے۔ ایک معین عرصے کے بعد جب وقت کی کارفرمائی کا آغاز ہوتا ہے تو غیر معیاری ادب منسوخ ہو جاتا ہے اور معیاری ادب جگمگانے لگتا ہے۔

سوال نمبر 7 کا جواب

یہ پاکستان اور ہندوستان سے باہر کا مسئلہ نہیں ہے خود پاکستان اور ہندوستان کے اندر بھی نثر کے مقابلے میں شاعری زیادہ ہو رہی ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ برصغیر کے رہنے والے طبعاً جذباتی ہیں۔ ان کی آنکھوں کی چلمنوں کے پیچھے ہمیشہ سے آنسوؤں کا سیلاب رکا کھڑا رہا ہے۔ لہٰذا وہ ایک ایسی صنف کو پسند کرتے ہیں جس میں وہ خود کو انڈیل سکیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ طبعاً آرام طلب ہیں اور "رکنے" کو "چلنے" پر ترجیح دیتے ہیں۔ شاعری "رکنے" کی صورت میں وجود میں آتی ہے۔ نثر چلنے' دیکھتے چلے جانے یعنی ایک طرح کی سیاحت کا پیمانہ ہے' لہٰذا اس میں جان مجنوں کو دو گونہ عذاب کا سامنا ہوتا ہے یعنی ایک تو سفر کیا جائے' چیزوں کو غور سے دیکھا جائے' کرداروں کے اندر کی دنیا میں غواصی کی جائے' دوسرے اپنے ان تجربات کو قلمبند بھی کیا جائے اس لئے ہمارے ادبا کا زیادہ تر رجحان نثر کے بجائے شاعری کی طرف رہا ہے۔ مگر اب بیسویں صدی کے ربع آخر میں صورت حال تیزی سے تبدیل ہونے لگی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں تو خاصی تبدیلی آگئی ہے ان ممالک سے باہر بھی یہ تبدیلی زود یا بدیر ضرور آجائے گی۔

سوال نمبر8 کے جواب میں۔
بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ اردو میں انگریزی الفاظ کی آمیزش ضرورت سے زیادہ ہے۔ باہر کی زبانوں کے الفاظ کو کسی بھی زبان کے اندر آنے کے لئے ریاضت کرنا پڑتی ہے۔ انہیں اپنا لباس، لہجہ اور مفہوم ایک حد تک بدلنا پڑتا ہے تاکہ وہ اس زبان کی ثقافت سے ہم آہنگ ہو سکیں جس کے اندر وہ داخل ہونے کے متمنی ہیں۔ مگر اردو زبان اور ادب نے اپنے دروازے مفلس کے ہاتھوں کی طرح کھول رکھے ہیں۔ "انگریزی الفاظ کا دان دو بابا خدا تمہارا بھلا کرے گا" اگر اردو زبان اور ادب کی دریا دلی کا یہی عالم رہا تو سوپچاس برس کے بعد اردو زبان کو پہچاننا بھی مشکل ہو گا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ انگریزی یا دیگر غیر ملکی زبانوں کے الفاظ کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ان کا داخلہ اسی طرح ہو جیسے اردو کے معاملے میں ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے۔ عذر کی صورت پیدا نہیں ہونی چاہئے جیسی ان دنوں پیدا ہو گئی ہے۔
سوال نمبر9 کے جواب میں۔
اہم ترین واقعہ تو یہ ہے کہ میں اس دنیا میں وارد ہوا جبکہ میرا اس اولمپک دوڑ میں صبا رفتار حریفوں سے مقابلہ تھا۔ دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ میں کالج کے ایام میں اچانک شعر کی دیوی سے روشناس ہوا۔ تیسرا واقعہ یہ ہے کہ میں نے شہر کے بجائے گاؤں میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ان اہم ترین واقعات کے ساتھ کچھ غیر اہم واقعات بھی ایسے تھے جو لوح دل سے مٹائے نہیں مٹتے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ لوح دل پر لکھے نہیں گئے بلکہ اس پر کھد گئے ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے۔
یہ آج سے کم و بیش بیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ ان دنوں مجھے شکار کا شوق جنوں کی حد تک تھا اور میں ہر تیسرے چوتھے روز اپنے گاؤں سے کئی میل دور ایک جھیل پر مرغابی کے شکار کے لئے جایا کرتا تھا۔ دسمبر جنوری کی منجمد کر دینے والی سردی میں رات کے پچھلے پہر بیدار ہونا اور بندوق کاندھے سے لٹکائے میل ہا میل پیدل سفر کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ میں پو پھٹنے سے پہلے ہی جھیل کے کنارے جا پہنچا اور ایک جھاڑی کی اوٹ میں کھڑے ہو کر مرغابیوں کا انتظار کرنے لگا ایسے وقت میں مرغابیاں جیٹ ہوائی جہازوں کی طرح آتی ہیں اور جھیل کے صاف شفاف رن وے پر لینڈ کرتی چلی جاتی ہیں۔ جب وہ نیچے آ رہی ہوں تو انہیں بندوق کا نشانہ بنانا نسبتاً" آسان ہوتا ہے مگر نہ نجانے کیا بات ہوئی کہ اس روز قدرت کے یہ جیٹ ہوائی جہاز قدرے تاخیر سے آئے۔ تاہم وہ بڑی تعداد میں آئے اور ان کے پروں کی جھنکار ایک سرمدی نغمے کی طرح ساری فضا پر چھا گئی۔ تب نیل سروں کی ایک ڈار نے میرے نہایت قریب آکر پانی میں اترنے کے لئے اپنے زاویے کو ذرا تبدیل کیا اور ابھرتے ہوئے سورج کی ایک نٹ کھٹ شعاع نے اس پر زرد رنگ کی پچکاری چھوڑ دی اور پوری ڈار ایک نقرئی جھالر میں تبدیل ہو کر جھیل کی سطح سے جا ٹکرائی۔ معاً" مجھے محسوس ہوا کہ چاروں طرف ایک سحر طراز روشنی پھیل رہی ہے۔ جھیل کی سطح

چاندی کا ایک تھال سا بن گئی ہے جس پر مرغابیاں سونے کی ڈلیوں کی طرح جابجا بکھر گئی ہیں۔ ایسا دلربا منظر میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی عنکبوت کے سنہری جال میں جکڑ دیا گیا ہوں اور بندوق کی لبلبی دبانے کی مجھ میں سکت ہی باقی نہیں رہی۔ تب میں سوچنے لگا کہ قدرت نے آج کس فراخ دلی سے میرے سامنے رنگ و نور کی ایک چادر سی پھیلا دی ہے اور میں ہوں کہ اس نورانی چادر کو خون کے دھبوں سے داغدار کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بس وہ دن اور آج کا دن میں نے پھر کبھی کسی پرندے کو بندوق کا نشانہ نہیں بنایا بلکہ نشانہ بنا ہی نہیں سکا۔ مجھے شکار کا بے حد شوق تھا اور اس لئے میں نے متعدد بار اس واقعے کو بھول جانے کی کوشش کی تاکہ میں اپنے مشغلے کو جاری رکھ سکوں لیکن کہاں؟ کیونکہ ہر بار جب میں بندوق کو چھوتا تو میری چشم تصور کے سامنے وہی سحر طراز روشنی امڈتی چلی آتی جس پر مرغابیوں کی ایک ڈار کسی سنہری جھالر کی طرح چمک رہی ہوتی اور میں گھبرا کر بندوق کو یوں پرے پھینک دیتا جیسے میرے ہاتھوں نے لوہے کی تپتی ہوئی سلاخ کو چھو لیا ہو لیکن پھر آہستہ آہستہ میں نے شکار اور شکار کے ساتھ ساتھ اس روز کے دلربا منظر کو بھی اپنے ذہن سے خارج کر دیا مگر لاشعور سے شاید یہ واقعہ پوری طرح محو نہ ہو سکا کیونکہ پچھلے دنوں ایک نظم لکھتے ہوئے جب یہ چند مصرعے نوک قلم سے ٹپکے تو مجھے برسوں پرانے اس واقعے ہی کی یاد دلا گئے۔ یہ گویا اس بات کا ثبوت تھا کہ لاشعور نے اس واقعہ کو فراموش نہیں کیا۔

جب آنکھ کھلی میری' دیکھا کہ ہر ایک جانب
زرتار سی کرنوں کا اک زرد سمندر تھا
اور زرد سمندر میں چاندی کی پہاڑی پر میں پیڑ تھا سونے کا
شاخوں میں میری ہر سو' جھنکار تھی پتوں کی
اڑتی ہوئی چڑیوں کی یا آگ کی ڈلیوں کی
اک ڈار سی آئی تھی اور مجھ میں سمائی تھی
قدموں کے تلے میرے' زنجیر تھی لمحوں کی
میرے زرہ بکتر سے' جو کوندا لپکتا تھا
تاروں کے جھروکوں تک پل بھر میں پہنچتا تھا
میں جسم کے مرقد سے' باہر بھی تھا' اندر بھی
میں خود ہی پہاڑی تھا اور خود ہی سمندر بھی!
سوال نمبر 10 کے جواب میں۔

یہ کہنا کہ اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے ایک ایسا بیان ہے جو عدم واقفیت کا زائیدہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ پچھلی نصف صدی کے دوران اردو تنقید میں بڑی پیش رفت ہوئی ہے۔

نظری سطح پر ہمارے ناقدین نے خود کو بیسویں صدی کی ادبی تھیوری سے ہم آہنگ کیا ہے اور یوں ازم کی سطح سے اوپر اٹھ کر امتزاج کی سطح پر آگئے ہیں۔ تنقید کے سلسلے میں ہمارے ناقدین نے نقد و نظر کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ دوسری طرف اردو کے قارئین نے تنقید کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کیا ہے۔ انہوں نے اخباری مضامین یا تقریباتی مضامین ہی کو تنقید سمجھ لیا ہے اگر وہ اردو کی اچھی تنقید پڑھنے کے لئے وقت نکال سکیں تو وہ دیکھیں گے کہ اردو تنقید کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ تنقید اور تخلیق کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ جس دور میں تخلیق کا معیار اونچا ہو، تنقید کا معیار بھی اونچا ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ تنقید کا اونچا معیار ہی تخلیق کو معیاری سطح پر لانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ خود تنقید بھی تخلیقی سطح پر نظر آرہی ہے مگر اس کے لئے جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا کہ تنقید کو کھلے دل کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔

DR. VAZIR AGHA
RAILWAY ROAD, SARGODHA PAKISTAN

نگر ڈھنڈورا پیٹتی پھرا گئی ہے یار
ہر بیت بڑی پُر زور ہے دل پر کرتی وار
دس فروری ۱۹۹۹ء ہرچرن چاولہ

ہرچرن چاولہ

ناروے

"فکشن" کے تو معنی ہی من گھڑت بات اور جھوٹے قصے کے ہیں یا جھوٹ کہنے کے فن کی مشق ہے۔ لیکن اس مشق نے کیا کیا دلنشین داستانوں اور کہانیوں کو جنم دیا کہ لوگ حقیقت کو بھول کر اسی کے گرویدہ ہو گئے۔ اور پھر یہی مشق انسانی نفسیات کی گراہیں کھولنے کا فن بھی بن گئی اور ادب کا ایک لازمی جزو افسانے کی شکل میں بن کر سامنے آئی۔

دیکھا جائے تو افسانے میں ایک پر فریب فضا ہی ہوتی ہے کہانی کہنے والا واقعات اور حالات کو کچھ ایسے انداز سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والا خود کو انہی واقعات کا ایک کردار جان کر خود کو اسی فضا کا ایک فرد سمجھنے لگتا ہے یہی ایک کامیاب افسانہ نگار کا فن ہے کہ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اب تک ہرچرن چاولہ نے چار اصناف ادب یعنی افسانہ 'ناول' سفرنامہ اور یادنگاری پر اپنا زور قلم صرف کیا ہے اور کامیاب رہے ہیں۔ جن میں ان کے سات افسانوی مجموعے اردو میں ' ایک

ہندی، ایک پنجابی اور دو انگریزی میں۔ تین ناول ایک پاکستان کا سفرنامہ اور ایک البم (یادیں) کے علاوہ کچھ تراجم "ناروے کے بہترین افسانے" ڈینش مشہور ادیب ایچ سی آندرسن کی منفی جل پری، اور نوبیل انعام یافتہ ناروے جین ادیب کنوت ہامسن کا ناول "وکٹوریہ" وغیرہ کی صورت میں شامل ہیں۔

ناروے اور بھارت کے بیچ ایک ادبی پل کی تعمیر کے سلسلے میں اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی زبانوں سے چنی ہوئی ان کی 61 کہانیوں کی ناروے جیئن زبان میں India for teller (telss India نام کی انتھولوجی کی اشاعت ایک دوسرا قابل ذکر کام ہے۔ ناروے اور بھارت کے چیدہ ادب کے تراجم کے ذریعے آوان پروان (exchange) کا یہ خوبصورت سلسلہ پہلی بار چاؤلہ صاحب کے ہاتھوں سرانجام ہو پایا ہے۔

آئندہ سالوں میں ان کی زیر اشاعت کتابوں کی تعداد چھ کے ہندسے سے اوپر جا رہی ہے۔

ہرچرن داس ان کا نام ہے۔ ادبی دنیا میں ہرچرن چاؤلہ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ 9 جون 1925ء کو داؤد خیل ضلع میانوالی (جو اب پاکستان میں ہے) میں پیدا ہوئے۔ یہی ان کے پرکھوں کا مقام بھی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ سے انہوں نے گریجویشن کیا۔ کسب معاش کے سلسلے میں پوسٹ آفس ریلوے اور فلم انڈسٹری میں ملازمتیں کیں۔ مدھوکر پکچرز بمبئی میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور اب اوسلو (ناروے) کی کیمون لائبریری میں اردو، ہندی اور پنجابی زبان کے صلاح کار (ایڈوایئزر) ہیں۔ اس طرح ہرچرن چاؤلہ نے اپنے آپ کو محض کسب معاش کے حصول اور اپنی تسکین کے لئے افسانے لکھ کر انہیں شائع کروانے کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے وطن اور ناروے کے بیچ ادبی پل تعمیر کرنے کی غرض سے خود کو اردو، ہندی ادب سے بھی جڑا رکھا ہے۔ 1971ء میں بہتر مستقبل کی تلاش میں ان کا سفرنامہ شروع ہوا یہ سفر جو بعد میں کچھ سیروں کی شکل اختیار کر کے 25 ممالک تک پہنچنے کے بعد جس طرح آج تک جاری ہے اسی طرح 1948ء میں ان کا ادبی سفر بھی سردار دیوان سنگھ مفتون کے دھڑلے دار اور مشہور زمانہ رسالہ ریاست، میں اپنے پہلے افسانے کی اشاعت سے شروع ہو کر آج تک ہند و پاک کے معیاری ادبی جریدوں میں چھپنے والی تخلیقات کی صورت میں جاری ہے۔

اپنی بے گھری کے دکھ کا اظہار مندرجہ ذیل سطروں سے اس طرح کرتے ہیں۔

"بھگوڑا مجبور ہوتا ہے۔ اپنے دیش میں مرتا ہے کہ غریب ہوتا ہے۔ باہر ہوتا ہے کہ غریب الوطن ہوتا ہے۔"

ہرچرن جی سات سمندر پار وطن سے دور دیار غیر میں پہنچنے کی کوششوں میں غلطاں تارکین کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"کچھ پودے ایک دفعہ جڑوں سے اکھڑ جائیں تو دوسری جگہ مشکل سے ہی جڑ پکڑ کر replant

ہو پاتے ہیں۔ یہی تارکین وطن کی پہلی نسل کے ساتھ ہو رہا ہے۔ تیسری یا چوتھی نسل شاید اپنا سب کچھ بھلا کر اور یورپی ممالک کے رنگ میں رنگ کر با ہر رچ بس جائے مگر پہلی نسل ہمیشہ دو دو کشتیوں میں سوار رہے گی۔ ان حالات اور نئے ماحول میں حساس ادیب کے قلم سے کچھ اور ہی قسم کے افسانے تخلیق ہوں گے۔ ایسی کہانیاں صرف وہی ادیب تحریر کر سکتا ہے بہ نسبت اس ادیب کے جو اپنے وطن اور اپنے گھر میں رہ رہا ہے۔ کیونکہ وہ بے گھری کے دکھ 'اپنوں سے جدائی' زبان کی آویزش 'نئی جگہ پر نئی زندگی کو نئے انداز اور نئے سرے سے شروع کرنے کے مسائل 'اجنبی ماحول اور اجنبی چہروں میں گھرا نہیں ہوتا۔"

گفتنی کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے ہرچرن کہتے ہیں "بیسویں صدی کے بعد اردو شعرو ادب میں شاید ہی دو چار نام زندہ رہ سکیں گے۔ فکشن میں پریم چند 'منٹو اور بیدی وغیرہ تو زندہ رہیں گے ہی۔ آنے والے وقت کی چھانٹی سے دو چار نام اور بھی نکل کر سامنے آسکتے ہیں مثلاً" قرۃ العین حیدر۔ شاعری میں بھی یہی حال رہے گا۔ فیض اپنی گہرائی اور گیرائی کی وجہ سے اور ساحر اپنی مقبول عام شاعری کی وجہ سے یاد رہ جائیں گے۔

ان کی رائے میں جدیدیت نے ہمیں بڑی خوبصورت تخلیقات بھی دی ہیں۔ بات کہنے کا ایک نیا انداز عطا کیا ہے اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں مگر جدیدیت کے نام پر بہت جلد ناموری حاصل کرنے کے لالچ میں کچھ لوگ شعروادب کی اونچی چوٹیوں کو جلد از جلد سر کرنے کے لئے اتنے تیز دوڑ پڑے تھے کہ ان کی ٹانگیں لڑکھڑا کر لفظوں کے بریک ڈانس قسم کے نمونے پیش کرنے لگی تھیں جس نے فن وادب کو کافی مجروح کیا اسی لئے کئی لکھنے والوں کو واپس اپنی پرانی ڈگر پر لوٹنا پڑ گیا۔ اور یہ تحریک دم توڑ گئی۔

ہرچرن کے خیال میں اردو ادب میں ناول کم تو ضرور لکھا گیا ہے مگر کچھ اچھے اور قابل ذکر ناول بھی منظر عام پر آئے ہیں اور انہوں نے قارئین کو چونکا دیا ہے۔ زمانہ کی تیز رفتاری بھی War and Peace قسم کے محنت طلب اور طویل ناولوں کی راہ میں حائل ہوئی ہے۔

ہرچرن بھی اس سے اتفاق رکھتے ہیں کہ فی زمانہ روٹی روزی کا چکر ہی قلم کار کو نہ صرف مادی ' ذہنی اور نفسیاتی کرب میں مبتلا رکھتا ہے بلکہ اس کی روح تک کو زخمی کر دیتا ہے۔ وہ بہتر زندگی کی تلاش میں بہترین نظام کی رہنمائی تو کر سکتا ہے مگر عملی طور پر خود بے بس ہے کیونکہ وہ خود محض ایک ایسا مہرہ ہے جسے دوسرے ہاتھ آگے بڑھانے یا پیچھے ہٹانے کا کام کرتے ہیں یعنی سیاست دان ہاتھ۔

ان کا کہنا ہے معیاری ادب کے پیمانے معنی آفرینی میں پنہاں ہیں یعنی ایسا ادب جو اپنے متن میں معنی کے وجود اور امکان کے بارے میں فطری اور ذہنی احساس دلائے۔ جو آپ کے اندر کہیں ٹن سے کوئی گھنٹی بجائے جس کی ٹنکار دیر تک ذہن ودل کے تاروں پر بجتی محسوس ہوتی رہے۔

اگلے سوال کے جواب میں ہنس کر بولے۔ "معاف کیجئے میرے ایک دوست کہتے ہیں۔ میں

ٹائیلٹ میں بیٹھتا ہوں تو مجھ پر اشعار نازل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ گھومتے پھرتے ایک شعر یہاں ایک وہاں ہو گیا۔ جہاں آٹھ دس شعر جمع ہو گئے غزل حاضر۔" وقت اور جرات کی کمی بھی شعراء پیدا کرنے کا ایک سبب ہو سکتی ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ باہر اچھی شاعری نہ ہو رہی ہو۔ کچھ لوگ بہت اچھی شاعری کر رہے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف نثر (مضمون' خاکہ' انشائیہ یا افسانہ) وقت اور محنت طلب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہد احمد دہلوی مدیر "ساقی" نثر نگار کی محنت کو نہ صرف سراہتے بلکہ مناسب معاوضہ بھی دیتے تھے۔ لکھنے والے کے لئے ہند وپاک سے باہر موضوعات بے شمار ہیں۔ نئی زندگی' نیا معاشرہ' نیا ماحول' نئی زبان' امتیازی سلوک' جنریشن گیپ' پرانے اور نئے کی سوچ میں فاصلہ۔ کتنے نئے نئے موضوعات ہیں جو باہر رہنے والے تخلیق ہو رہا ہے۔ جسے صرف باہر رہنے والا شاعر یا ادیب ہی لکھ سکتا ہے کیونکہ وہ ہی ایسے مختلف حالات سے نبرد آزما ہوتا ہے۔

ایک عمر کے بعد جب لکھنے والے کے پاس مزید کہنے کو کچھ نہیں رہ جاتا تو وہ خود کو دہرانے لگتا ہے مگر باہر رہنے والا قلم کار بے شمار نئے نئے تجربات اور موضوعات سے گھرا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے پاس matter کی کمی نہیں ہوتی۔ یورپی ممالک کی تیز رفتار بھاگتی دوڑتی زندگی میں وقت کی کمی ہوتی ہے اور خاص طور پر اصناف نثر کے لئے اور بھی زیادہ۔ اس لئے نثر کم لکھی جا رہی ہے اور شاعری زیادہ ہو رہی ہے۔

اردو زبان کے سلسلے میں عرض کروں کہ اردو زبان اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے بڑی فراخ دلی سے ہر زبان سے الفاظ نہ صرف لیتی رہی ہے بلکہ دیتی بھی رہی ہے۔ خود انگریزی نے کچھ الفاظ اردو سے مستعار لئے ہیں۔ عالمگیر' علمی انگریزی زبان کے کچھ خاص خاص الفاظ کی شمولیت اردو کو اور زیادہ امیر کرتی ہے مگر خواہ مخواہ بلا ضرورت انگریزی الفاظ ٹھونسنا مناسب نہیں جبکہ اردو میں ان کا متبادل موجود ہو۔ یہی حال تو اردو کے ساتھ پنجابی والے پنجابی الفاظ واڑ واڑ (گھسیڑ) کر رہے ہیں۔ جیسے "میں نے اس کی کنڈ لگا دی ہے۔" میں نے تمہارا خط ٹانواں ٹانواں پڑھ لیا ہے۔ "وہ شنکھر دو پہریں آیا تھا۔" اب ڈھونڈتے پھریئے ڈکشنریوں میں "کنڈ" ٹانواں ٹانواں اور شنکھر کے معنی اور اپنا سر دھن ڈالئے۔

میری زندگی کے یہ واقعات آج تک نہیں بھلائے گئے۔

■ لڑکپن میں کالا باغ (ضلع میانوالی) پاکستان میں' سندھ کنارے لڑکوں کے ہجوم میں میرا ایک لڑکے سے شعری مقابلہ اور میری ہار' میرا بڑے بڑے غالب' اقبال اور محروم جیسے شعراء کے اشعار پڑھنا اور اس کے فلمی گانوں کے اشعار سنانا۔

■ داؤد خیل ضلع میانوالی کے اپنے مڈل اسکول میں تیسری اور چوتھی جماعت میں میرے استاد محمد خان کا حساب کے پیریڈ میں بھی بار بار مجھ سے کسی نظم سننے کی فرمائش کر بیٹھنا۔

■ میرے افسانہ گھوڑے کا کرب (گھوڑا جو ایمان دار' محنتی تارک الوطن کی علامت ہے) کا بے

انتہا مقبولیت اور شہرت حاصل کرجانا اور بلغاریہ کے بین الاقوامی کہانی مقابلے میں اچانک اول انعام لے آنا۔

■ ہماچل کے ایک پہاڑی گاؤں سے واپس آئے ہوئے ہم دو دوستوں کا گھنے جنگل میں ندی کنارے ایک جھونپڑی میں ایک پہاڑن کے ساتھ رات گزارنا۔ مدتوں بعد آج جب ہم سوچتے ہیں کہ آبادی سے میلوں دور گھور گھنے اور سنسان جنگل کی کالی اندھیری رات میں اکیلی جوان اور خوبصورت عورت کہاں سے اگ آئی تھی تو ہم کانپ کانپ جاتے ہیں۔

تنقید کی کمی کے ضمن میں میرا کہنا ہے کہ نقاد سے آج کا ہر ادیب اور شاعری شاکی ہے۔ نظریات نے بے شمار کروٹیں بدلی ہیں مگر ہر کروٹ نے ہمیں نئے ذائقے سے روشناس کرایا ہے مگر پھر وہ کچھ عرصے بعد پرانا لگنے لگا ہے۔

پاکستان کی علاقائی زبانوں میں تراجم کے بارے میں میری جانکاری بہت کم ہے مگر ہندوستان میں ساہتیہ اکیڈمی اور نیشنل بک ٹرسٹ اپنے "آدان پردان" (exchange) کے تحت مختلف زبانوں کی اولا بدلی تراجم کے ذریعے کرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک کڑی خود میرے ناول "بھٹکے ہوئے لوگ" کو نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے ہندی اور انگریزی میں کتابی صورت میں چھاپنے کی منظوری کی ہے۔

MR. HERCHARAN CHAWLA
HELSETHELLINGA-27
1353 BAERUMS VERK NORWAY

محمد یعقوب نظامی
بریڈ فورڈ

فروری ۹۹ء کی ایک خنک شام میں مجھے اپنی ڈاک میں یہ خط ملا۔

محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ۔ آداب و تسلیمات

ہفت روزہ "راوی" بریڈ فورڈ میں آپ کا ایک خط شائع ہوا جس میں آپ نے اردو کی خدمت کرنے والوں کے پتے حاصل کرنے میں دلچسپی ظاہر کی ہے۔ آپ کے اس خط سے قبل مجھ سے آپ کا مختصر تعارف آپ کی کتاب "سخن ور" کے ذریعے ہو چکا تھا۔ اس کا سبب جرمنی میں مقیم "حیدر قریشی صاحب" ہیں۔ قریشی صاحب سے متعارف مجھے محترم محمود ہاشمی صاحب نے کروایا تھا اور ہاشمی صاحب سے تعارف ان کی سدا بہار ادبی تخلیق "کشمیر اداس ہے" کے ذریعے ہوا جو اردو ادب کا سب سے خوب صورت رپور تاژ ہے۔"

یعقوب نظامی کی مصروفیات کافی ہیں اور سوالنامہ انہیں محمود ہاشمی صاحب کے توسط سے ملا پھر بھی انہوں نے فوراً جواب سے نوازا۔ انہی دنوں انہیں پاکستان بھی جانا تھا لیکن جانے سے پہلے انہوں نے اپنی کتاب "پاکستان سے انگلستان تک" بھجوائی اور پاکستان سے واپسی پر

تصویریں بھجوانے کا وعدہ کیا اور پورا بھی کیا۔ لکھا تھا۔

"میں بمعہ فیملی پاکستان کی سیاحت کے بعد تازہ دم ہو کر واپس انگلستان آگیا ہوں۔ آتے ہی حسب وعدہ اپنی تصویر اور حضرت علیؓ کا ایک قول اپنے دستخطوں کے ساتھ ارسال ہے۔ محترم ہاشمی صاحب سے فون پر بات ہوئی ہے وہ بھی چند دنوں تک آپ کو اپنی تحریر ارسال کر دیں گے۔ میری کتاب پر آپ نے جو رائے دی اس کا بہت بہت شکریہ۔ ان دنوں میں اپنی دوسری کتاب جو اسی کتاب کا حصہ دوئم ہو گا لکھ رہا ہوں۔ امید ہے اگلی صدی کے آغاز پر کتاب منظر عام پر آجائے گی۔ بیرون ملک اردو کے خدمت گاروں کے لیے بہت ہی دشواریاں ہیں جن میں کتابوں کی مارکیٹ سے لے کر قاری کو کتاب پڑھانے تک کی دشواریاں شامل ہیں۔ ایسے میں کبھی جی چاہتا ہے کہ لکھنے لکھانے کا کام چھوڑ کر کوئی اور کام کیا جائے لیکن اب تو یہ عادت کچھ یوں ہو گئی ہے کہ۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

یعقوب نظامی کا آبائی وطن مقبوضہ کشمیر (ہندوستان) کا ایک چھوٹا سا گاؤں سلواہ ہے جو ضلع پونچھ کی تحصیل مہنڈر میں واقع ہے۔ بہت سے دوسرے کشمیریوں کی طرح ان کے خاندان کو بھی بار بار ہجرت کے عمل سے گزرنا پڑا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد ہجرت نے ان کے خاندان کو تقسیم کر کے رکھ دیا۔ ان کے والدین اور دو بھائی میرپور میں ہیں جب کہ دوسرے دو بھائی گجرانوالہ میں آباد ہوئے۔ ہجرت نے یعقوب نظامی کی تعلیم کو بھی متاثر کیا۔ پرائمری تعلیم اپنے آبائی گاؤں میں حاصل کی۔ مڈل تک گجرانوالہ میں 'اور ثانوی اسکول سے میر پور آزاد کشمیر میں تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے۔ پھر میرپور کے ڈگری کالج میں پڑھتے رہے۔ ۱۹۸۲ء میں فلسفہ اور نفسیات کے مضامین کے ساتھ بی۔اے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا۔ دسمبر ۱۹۸۲ء میں منگیتر بن کر انگلستان آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

ان کی بیگم شمیم اختر خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور کیمسٹری میں بی ایس سی آنرز کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بریڈ فورڈ میں لیکچرار کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ شمیم نظامی کے کردار کی ایک خوبصورتی یہ بھی ہے کہ وہ انگلستان میں پیدا ہوئیں' یہیں پرورش پائی اور یہیں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اپنی تہذیب و اقدار سے وابستہ رہیں۔ ان کی صاحبزادیاں غنیہ 'شمائلہ' سعدیہ اور بیٹے خرم اپنے والدین کی راہ پر گامزن ہیں۔

یعقوب نظامی ایک علمی ادبی و دینی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انگلستان آنے کے بعد انہوں نے بڑی جدوجہد کی اور اپنا مقام آپ بنایا۔ پہلے بریڈ فورڈ کی کونسل برائے مساجد کے تحت ایڈوائزر ورکر بنے۔ پھر آپ نیشنل ہیلتھ اسکاٹ لینڈ سے وابستہ ہو کر یارک شائر کی فیکٹریوں میں کام کرنے والے ایشیائیوں کی صحت کے بارے میں سروے پر مامور ہوئے۔ اس

کے بعد پاکستان کمیونٹی سینٹر بریڈ فورڈ میں بطور ایڈوائزر کام کیا۔ ۱۹۸۷ء میں شیفیلڈ سٹی کونسل میں بحیثیت مترجم ملازمت اختیار کی۔ پانچ سال تک کام کرنے کے بعد ستمبر ۱۹۹۲ء میں مانچسٹر سٹی کونسل کے ترجمہ کے شعبے میں بحیثیت ڈپٹی مینجر تعینات ہوئے اور تاحال اسی عہدے سے وابستہ ہیں۔

نظامی بتاتے ہیں کہ "میری خوش قسمتی ہے کہ برطانیہ آنے پر مجھے ان دفاتر میں کام کرنے کا موقع ملا جو براہ راست ایشیائی لوگوں کو سروس فراہم کرتے ہیں۔ وہاں کام کرنے سے دیسی لوگوں کے مسائل کھل کر میرے سامنے آئے۔"

یہی مسائل تھے جنہوں نے یعقوب نظامی کو برطانیہ میں آباد ایشیائی تارکین وطن کی تاریخ مرتب کرنے پر اکسایا اور پھر یعقوب نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنے شب و روز ایک کر دیئے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی کتاب آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ بھی بنے۔

برطانیہ میں آباد ایشیائی تارکین وطن کی یہ تاریخ ۱۶۰۰ء سے لے کر سن ۱۹۹۵ء کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ستمبر ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اشاعت دوم ۱۹۹۷ء میں عمل میں آئی اور اب یعقوب اس کتاب کے دوسرے حصے پر کام کر رہے ہیں۔

یہ کتاب اتنی معلوماتی اور اتنی دلچسپ ہے کہ اس کا ہر موضوع پڑھنے والے کو محو حیرت کرتا جاتا ہے۔ واسکوڈی گاما کی برصغیر میں آمد سے لے کر کیا ہم برطانیہ سے واپس چلے جائیں گے۔۔؟ کے باب کے درمیان واقعات کی ایسی رنگا رنگی ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

"بھک منگ ایشیائی اور گودیاں' برطانیہ میں اردو کے اولین استاد' برطانیہ میں پہلی ادبی تنظیم اور برطانوی شاہی حمام کے منتظم شیخ محمد دین تک کوئی قصہ پڑھ لیجئے دلچسپی تو اپنی جگہ ہے۔ حیرت بھی ہے اور عبرت بھی۔ مثلاً" منشی سعید ۱۷۷۷ء میں انگلستان آئے۔ یہاں ایک اسکول میں اردو فارسی اور عربی پڑھاتے رہے۔ اسکول سے تنخواہ کم ملتی تھی اس لیے انہوں نے پرائیوٹ ٹیوشن پڑھانے کا فیصلہ کیا اور ۵ نومبر ۱۷۷۷ء کے "ڈیلی ایڈورٹائزر" میں اشتہار دیا کہ اردو فارسی سیکھنے والے لوگ ان سے رابطہ قائم کریں۔

برطانیہ کی پہلی ادبی تنظیم کیمرج میں "اردو مجلس" کے نام سے قائم ہوئی۔ پھر لندن کے چند دوستوں نے غم زمانہ سے فرصت پانے کے لیے "بزم تفریح" منعقد کی۔ پھر شمالی انگلستان کی پہلی ادبی تنظیم لیور پول میں ڈاکٹر غلام عباس نے ۱۹۳۷ء میں قائم کی جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی محمد انور کی سرپرستی میں بزم ارباب ذوق' کے نام سے قائم ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ نایاب تصاویر بھی ہیں۔ یہ ادبی البم بلاشبہ ایک ایسا خزانہ ہے جس سے برطانیہ ہی نہیں یورپ

اور امریکا کے اردو پڑھنے والوں کو بھی استفادہ کرنا چاہیے۔

اب آیئے یعقوب نظامی سے ان سوالات پر بھی گفتگو کریں جو ان کے لیے مشکل تھے مگر یعقوب کا علمی پس منظر بھی معمولی نہیں۔ انہوں نے کیا جواب دیے ہیں ملاحظہ ہوں۔ خیال رہے کہ سوالات ترتیب سے نہیں ہیں انہوں نے کہا۔

"اردو کے "خدمت گاروں" کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ولی دکنی سے لے کر آج تک کے شعرا سوائے میر تقی میر، مرزا اسد اللہ غالب، علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال، فیض احمد فیض اور چند ایک دوسرے ناموں کو چھوڑ کر سب ایک ہی روش پر لکھتے جا رہے ہیں۔ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سارے کا سارا قافلہ ایک دائرے میں سفر کر رہا ہے اور وہ سفر بھی محبت، پیار اور اسی دنیا کی باتوں کا سفر ہے۔ آج کے بعض شعرا کے شعر سن کر پرانے شعرا کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ لیکن کمال حیرت کی بات ہے کہ ایسے شعرا سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنے آپ کو "جدید لہجے کا شاعر" کہلواتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے خیال کے مطابق اس جہاں سے چلے جانے والے شعرا کے کلام کو اپنے نام سے منسوب کر کے ان کے خیالات کو دور جدید کے لوگوں تک پہنچانا ہی جدید لہجہ کی شاعری ہے۔ ہماری شاعری محبت، پیار، افسردگی، غم جاناں، غم دنیا اور غم روزگار سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ ابتدا سے آج تک ان ہی موضوعات پر شاعری ہو رہی ہے۔

نثر کی تاریخ کافی کٹھن مراحل سے گزری ہے۔ اس صدی میں نثر کے مختلف موضوعات پر لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مشرقی معاشرے میں رہتے ہوئے سعادت حسن منٹو نے "ٹھنڈا گوشت" اور عصمت چغتائی نے "لحاف" جیسے افسانے لکھ کر موضوعات کا رخ جنس یعنی Sex کی طرف موڑا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھا کر نام پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے۔ چوں کہ یہ موضوع بھی جدت پیدا کرنے کی بجائے فیشن بن گیا تھا اور فیشن تو آئے دن بدلتے ہی رہتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دائروں کا سفر ہے تو پھر اس کا حل کیا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے اردو کی دنیا سے نکل کر انگریزی ادب اور دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے رائٹرز اور شاعروں کا جائزہ لینا ہوگا۔ یہ لوگ بھی محبت، پیار اور اس دنیا کی باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن اب وہ موضوعات سے نکل کر پوری کائنات کے بارے میں لکھ رہے ہیں۔ اب ان کے ادیب "سپر مین" اور دوسرے سیاروں کی مخلوق "سٹار ٹریک" جیسے اچھوتے موضوعات پر لکھ کر انسانی ذہن کو حرکت میں لا کر انہیں یہ باور کروا رہے ہیں کہ

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

ان تحریروں سے متاثر ہو کر سائنس دانوں نے عملی کام کیے جن سے دنیا میں سائنسی اور

صنعتی انقلاب برپا ہوا۔ جب میں ان خطوط پر سوچتا ہوں تو پھر میں کہتا ہوں کہ اردو کے شاعر اور ادیب ابھی تک لکیر کے فقیر ہیں اور وہ اسی دائرے میں چکر لگا رہے ہیں جہاں سے اردو کے ہراول دستے نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

ترقی یافتہ ممالک کے ادیبوں نے جب دائروں سے نکل کر کائنات کے دوسرے سیاروں کی طرف سفر کا آغاز کیا تو ان کی پیروی میں ان کی قومیں بھی دائروں کے سفر سے نکل آئیں۔

برطانیہ میں اس وقت تقریباً" دو سو کے قریب شعرا اور شاعرات ہیں۔ بہت سے شاعروں نے دولت کے بل بوتے پر اپنے اپنے دیوان بھی شائع کروا رکھے ہیں۔ بلکہ یہاں کے ایک میاں بیوی جو خوش قسمتی سے دونوں شاعر ہیں بہ یک وقت دو دو یعنی کل چار دیوان شائع کروائے ہیں۔ یہاں برطانیہ میں اردو کتابوں کو خریدنے کا رجحان بہت کم ہے اس لیے یہ کتابیں تحفے میں دے کر مہمان پر ادبی رعب گانٹھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن شاعروں کی مالی حالت قدرے تپلی ہے انہیں اس کار خیر کے لیے یہاں کی آرٹ کونسلیں مالی مدد دیتی ہیں۔ بہت سے شاعروں کی ایک سے زائد کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ برطانیہ کے تقریباً" ہر شہر میں جہاں اردو کے شیدائی رہتے ہیں انہوں نے ادبی تنظیمیں بھی بنا رکھی ہیں وہاں پر اختتام ہفتہ مشاعرے اور کتابوں کی تقریب اجرا بھی منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ جب کہ اس کے مقابلے میں نثر نگار تو چند ایک ہیں۔ یہاں برطانیہ میں محمود ہاشمی (مصنف کشمیر اداس ہے) کے علاوہ رضا علی عابدی (جرنیلی سڑک والے) قیصر تمکین' مقصود الٰہی شیخ' جیتندر بلو' ڈاکٹر مصطفیٰ کریم' شاہدہ احمد اور صفیہ صدیقی جیسے لوگ "مین سٹریم" سے دور رہتے ہوئے اچھے افسانے لکھ رہے ہیں۔ میرے خیال میں نثر میں اس لیے کم لکھا جا رہا ہے چوں کہ یہ بہت محنت طلب کام ہے۔ ملک ملک دیس دیس کی باتیں جمع کر کے خون پسینہ ایک کر کے کتاب مرتب ہوتی ہے۔ نثر لکھنے کے لیے بیٹھ کر محنت سے کام کرنا پڑتا ہے جب کہ شاعری تو لوگ چلتے پھرتے گھومتے لیٹے بیٹھے کر لیتے ہیں۔ ہمارا قومی سانحہ ہے کہ پوری قوم محنت سے کتراتی ہے۔ سہل پسند ہے اور پھر فوری اس کا صلہ بھی مانگتی ہے۔ شاعر تو مشاعروں میں واہ واہ اور مکرر مکرر کے الفاظ سن کر محظوظ ہو جاتے ہیں جب کہ نثر نگار ان تمام عوامی محفلوں سے محروم ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں سہل پسندی کی وجہ سے شاعروں کی بہتات ہے۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے وہ ہمارے ارد گرد اتنے بکھرے پڑے ہیں کہ ان کا شمار کرنا ہی مشکل ہے۔

ہمارا قومی سانحہ ہے کہ لوگ کتابیں' اخبارات اور رسالے خریدنے کے قائل نہیں۔ جب کتابیں' رسالے اور اخبارات خریدے نہ جائیں گے تو اس میں مالی جمود طاری ہو جائے گا۔ جب مالی بحران ہو گا تو ادیب بھی ذہنی' مالی اور مادی پریشانیوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ آج کا یورپی اور امریکی ادیب خوش حال زندگی بسر کر رہا ہے کیوں کہ یہاں کے لوگ مانگ کر پڑھنے کے عادی

نہیں اور پھر اس قوم میں لاکھ برائیاں سہی لیکن یہ ادب اور علم دوست قوم ہے۔ اسی علم دوستی نے انہیں کامیابیوں کی معراج عطا کی ہے۔ اس کا حل یہی ہے کہ لوگوں کو کتابیں خرید کر پڑھنے کا عادی بنایا جائے تاکہ کتابیں فروخت ہوں اور ادیب بھی مالی پریشانیوں سے نکلیں۔

مالی بحران کی وجہ سے اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ چوں کہ نقاد حضرات کو بھی اپنے بیوی بچوں کو پالنا ہوتا ہے۔ برصغیر سے یورپ امریکہ آنے والے نقاد جس کے ہاں کھانا کھائیں گے، جو کوئی سیرو سیاحت کروائے گا اس کی تعریفوں کے پل باندھیں گے۔ اگر نقاد حضرات مالی بحران میں مبتلا نہ ہوں تو وہ آزادی سے لکھ سکتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں مشہور ادیبہ، شاعرہ اور کالم نگار کشور ناہید جب برطانیہ آئیں تو انہوں نے مالی مفاد کے بدلے یہاں کے چند بااثر لوگوں کو ادیبوں کی صف میں کھڑا کرنے کی کوشش کی جن کا ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ کشور نے اپنی اس غلط بات کو منوانے کے لیے روزنامہ جنگ لندن میں ایک کالم بھی لکھا۔ جب نقادوں اور ادیبوں کا یہ حال ہوگا تو پھر ادب میں فروغ کیسے ممکن ہوگا۔

جہاں تک اردو میں انگریزی کے استعمال کی بات ہے۔ یہ تو آپ جانتی ہی کہ اردو دوسری زبانوں کے مجموعے کا نام ہے جس میں فارسی، عربی، سنسکرت وغیرہ کے الفاظ ہیں لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اردو میں انگریزی کے بھی بہت الفاظ اس طرح استعمال ہوتے ہیں کہ اب ہمیں شک سا ہونے لگتا ہے کہ آیا یہ اردو کا لفظ ہے یا انگریزی کا!

پاکستان اور ہندوستان میں موجود لکھی جانے والی اردو کا جائزہ لیں تو اس میں انگریزی کا استعمال اس کثرت سے ہو رہا ہے کہ ہم انگریزوں کے ملک میں بسنے والوں کو بھی اردو کی بے چارگی پر ترس آتا ہے۔"

M.Y. NIZAMI
16 HARTINGTON TERRACE
BRADFORD WEST YORKS
BD7 2HW. U.K.

رو میں ہے رخشِ عمر......

خاندانی نام	فاطمہ
قلمی نام	سلطانہ مہر
مقام و تاریخ پیدائش	بمبئی۔ 6 اپریل 1938ء
تعلیم	ایم۔اے (صحافت) کراچی یونیورسٹی
پہلا افسانہ	6 ستمبر 1953ء میں روزنامہ "انقلاب" بمبئی میں شائع ہوا۔
صحافت	روزنامہ "انجام" کراچی 1965ء تا 1967ء
	روزنامہ "جنگ" کراچی 1967ء تا 1979ء
	مدیرہ اعلیٰ ماہنامہ "روپ" کراچی 1980ء تا 1990ء
تصانیف	1۔ "داغِ دل" (ناول 1962ء)
	2۔ "تاجور" (ناول 1966ء)
	3۔ "ایک کرن اُجالے کی" (ناول 1969ء)
	4۔ "جب بسنت رت آئی" (ناول 1972ء)
	5۔ "آج کی شاعرات" (تذکرہ 1973ء)
	6۔ "بند سیپیاں" (افسانے 1976ء)
	7۔ "اقبال دور جدید کی آواز" (تالیف- 1977ء)
	8۔ "سخن ور" حصہ اول (تذکرۂ شعراء 1979ء) تیسرا ایڈیشن 2000ء
	9۔ "دھوپ اور سائبان" (افسانے 1980ء)
	10۔ "دل کی آبروریزی" (افسانے 1988ء)
	11۔ "ساحر کا فن اور شخصیت" (تالیف 1989ء)
	12۔ "سخن ور" حصہ دوم (بیرون پاکستان بسنے والے شعراء و شاعرات کا تذکرہ 1996ء)
	13۔ حرفِ معتبر۔ کلام کا مجموعہ (1996ء)
	14۔ "سخن ور" حصہ سوم (پاکستانی شعراء و شاعرات کا تذکرہ (1998ء)
	15۔ سخن ور چہارم (شعراء و شاعرات کا تذکرہ) 2000ء
	16۔ "گفتنی اول" (نثر نگاروں کا تذکرہ) 2000ء
زیر تصنیف:	"اردو ادب میں خواتین کا حصہ"

نیابت
ابراہیم جلیس

محترم ابراہیم جلیس کی ادارت میں، میں نے انجام (کراچی) میں کام کیا تھا۔ غالباً 1970ء میں میرے ناول کی تقریب میں انہوں نے ان خیالات کا اظہار کیا تھا جو ذیل میں درج ہیں۔ میرے ادبی سرمائے میں یہ ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ سلطانہ مہر

☆

ایک بار کسی نے مجھ سے پوچھا تھا "اگر کوئی خاتون بیک وقت صاحب طرز ادیبہ، گل فشاں شاعرہ، شعلہ ریز مقررہ اور بڑی اصول پرست صحافی ہو تو اسے کیا کہہ کر پکارا جائے کہ اس کی چاروں حیثیتیں صرف ایک نام سے ظاہر ہو جائیں؟

تو میں نے جواب دیا تھا "میرے علم اور مشاہدے میں ابھی تک تو ایسی جامع حیثیات شخصیت کا نام سلطانہ مہر ہی ہے۔ آگے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

سلطانہ مہر سے میرا باقاعدہ تعارف اس وقت ہوا جب میں نے روزنامہ "انجام" کی ادارت سنبھالی تھی۔ سلطانہ مہر پہلے ہی سے اس اخبار سے وابستہ تھیں اور خواتین کے صفحے کی مرتبہ تھیں۔ وہ غالباً دوسرا دن تھا۔ سلطانہ مہر اپنا کوئی مضمون مجھے دکھانے لائیں۔ بظاہر تو اس لیے کہ میں دیکھ لوں کہ آیا وہ مضمون اخبار کی پالیسی کے مطابق ہے یا نہیں مگر اصل میں جیسے وہ اپنی انشاء پردازی سے مجھے مرعوب کرنے آئی تھیں۔ ان کے تیور بالکل غالب جیسے تھے کہ "دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا" مضمون کی سطریں میں نے پڑھیں۔ الفاظ متعین، معانی بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی لفظ کے دریچے سے عصمت چغتائی جھانک رہی ہیں، تو کسی سطر کے نطق میں ہاجرہ مسرور کے لہجے کا لوچ۔ انداز بیاں کے آنچل کی اوٹ میں قرۃالعین حیدر کا رخ رنگین تو اسلوب کے قرطاس پر کرشن چندر کے قلم کی سرسراہٹ۔

"آپ دلی، لکھنؤ یا یوپی کے کس شہر کی رہنے والی ہیں......؟"

ان کی ذہانت جیسے فوراً قلب تخن تک پہنچ جاتی ہے، بولیں "میں میمن فرقہ سے تعلق رکھتی ہوں اور میری مادری زبان گجراتی ہے۔" میں نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا تو چہرے پر رخ اردوئے معلی برس رہی تھی۔ مادری زبان تو گجراتی ہے لیکن لہجے میں عہد مرزا ہادی رسوا کا لکھنؤ گونج رہا تھا۔ میری بڑی سبکی ہو رہی تھی۔ آخر میں ایڈیٹر تھا اور وہ میری ماتحت ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر لیکن وہ جیسے اپنی قابلیت سے مجھے مرعوب کرنے آئی تھیں۔ میں نے برامنہ بنا کر پوچھا۔

"جب آپ اتنی لائق و فائق ہیں تو مجھ نالائق ترین خلائق کو اپنا یہ مضمون کیوں دکھانے لائی ہیں۔"

جواباً بڑی فتح مندی کے لہجے میں بولیں "میں کاٹھیاواڑ کے مشہور تاریخی گاؤں ویراول کی رہنے والی ہوں جہاں سومناتھ کا مشہور زمانہ مندر ہے۔ میں نے بچپن میں اصلی سومناتھ کے بت دیکھے تھے۔ بڑی ہو کر ایک بت آپ کا بھی دیکھا تھا۔" میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"مگر میرا بت آپ سے نہیں ٹوٹ سکے گا اور آپ جانتی ہیں کہ میرا نام ابراہیم بھی ہے۔" اس ہلکی سی جھڑپ سے ہم دونوں کو پتا چل گیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں اور اسی ڈر کا سیاسی نام "پرامن بقائے باہمی" بھی ہے اس لیے ہم دونوں نے دوستی ہی میں مصلحت جانی۔ انہوں نے بت شکنی کا ارادہ ترک کر دیا اور میں نے قراقرم کی چوٹی سے سلطانہ مہر کو دیکھنا چھوڑ دیا۔

سلطانہ مہر ایک اچھی ادیبہ ہونے کے علاوہ سیاسی طور پر بڑی باشعور باضمیر اور بڑے مضبوط کردار کی خاتون ہیں۔

صرف ایک اچھا انسان ہی اچھا ادیب، اچھا شاعر، اچھا صحافی اور فنکار ہو سکتا ہے۔ میں تو جب بھی سلطانہ مہر سے ملتا ہوں مجھے یہی محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے بہ یک وقت کوئی مرصع غزل پڑھ لی ہے۔ کسی معیاری ناول کا مطالعہ کیا ہے، کوئی نشاط انگیز کالم میری نظر سے گزرا ہے یا کوئی اثر انگیز افسانہ میرے دل میں اتر گیا ہے۔

بچپن میں سومناتھ کے بت دیکھنے والی لڑکی ادب کے مندر میں اب خود ایک بت بن گئی ہے۔

سلطانہ مہر اردو کے رشتے سے پاکستان کو دور دراز کے ملکوں سے
جوڑے رکھنے کی کوشش و سرخوشی میں مگن ہیں۔ اللہ سلطانہ
مہر کو ہمیشہ خوش رکھے اور ان کے قلم کو زیادہ سے زیادہ معتبر و
باوقار بنائے۔ (آمین)
ڈاکٹر فرمان فتح پوری